

نیا دور

جلد ۴۴ | نمبر ۱ و ۲

اپریل مئی ۱۹۸۹ء

ایڈیٹر : —— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : —— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر : —— ۴۳۰۵۹
رہائش ۷۴۳۴۸
جوائنٹ ایڈیٹر : —— ۴۷۱۰۸

پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ : یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
زرِ سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط وکتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیادور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیادور، [illegible] ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

عنوانات

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۴ | نمبر ۱ و ۲

اپریل مئی ۱۹۸۹ء

اڈیٹر ——— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ اڈیٹر ——— شاہنواز قریشی

فون } اڈیٹر ——— ۴۴۳۵۹
مکان ۴۴۳۴۱
جوائنٹ اڈیٹر ——— ۴۷۱۰۸

نگراں : اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ : یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
زر سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : اڈیٹر نیادور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۲، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : اڈیٹر نیادور، انفارمیشن بلڈنگ ... ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

اپنی بات

گزشتہ ماہ اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کا انتقال ہوگیا۔ بہوگنا جی اتر پردیش کی سیاست میں ہمیشہ فعال اور نمایاں رہے۔ ان کی شخصیت تمام شمالی ہندوستان میں ایک ہر دلعزیز شخصیت تھی۔ خاص طور سے اقلیتوں میں تو وہ بے حد مقبول تھے۔ اقلیتوں کے مسائل پر ان کی نظر بھی گہری تھی اور ان کے مسائل کے حل کے سلسلے میں وہ ہمیشہ خلوص دل سے سرگرم عمل رہے۔ اردو زبان کی اہمیت اور قوت سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے اردو کو اس کا وہ مقام دینے جانے پر ہمیشہ زور دیا جس کی وہ مستحق ہے۔ جب وہ اتر پردیش کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری تھے تو انھوں نے پردیش کانگریس کمیٹی کی جانب سے ایک اردو ہفتہ وار "جدید شاہراہ" کی اشاعت بھی شروع کی تھی۔

وہ ایک فعال ایڈمنسٹریٹر بھی تھے اور اپنی اس صلاحیت کو انھوں نے بطور وزیر اعلیٰ پوری طرح استعمال بھی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ انتہائی چاق و چوبند اور چوکس نظم و نسق کی شکل میں دیکھنے کو ملا۔

ان کی یادداشت بھی غضب کی تھی جس سے ایک بار مل لیتے تھے اس کا نام انھیں یاد رہتا تھا جس کا اظہار اکثر بھرے مجمعوں اور جلسوں میں ہوتا تھا، جب وہ لوگوں سے ان کا نام لے کر مخاطب ہوتے تھے۔

بہوگنا جی کے انتقال سے ہماری سیاسی، سماجی اور قومی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا بظاہر پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

○ اردو کے مشہور و معروف ناول نگار نسیم انہونوی بھی گزشتہ دنوں داغ مفارقت دے گئے۔ نسیم صاحب ایک طویل عرصہ سے اردو صحافت و ادب کے میدان میں سرگرم عمل تھے۔ ان کا رسالہ "حریم" آج بھی مقبول ہے اور ان کی ناولیں آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ عام لوگوں کے لیے لکھتے تھے چنانچہ انھیں قارئین کا ایک وسیع حلقہ ملا۔ وہ ادب میں تجربے، ترقی پسندی اور جدیدیت وغیرہ کی بحثوں میں کبھی نہیں الجھے۔ ان کی ناولیں تفنن طبع کے ساتھ ساتھ اصلاحی پہلو کی حامل بھی ہیں اور بڑی تعداد میں فروخت ہوتی رہی ہیں۔ خاص طور سے "تمنا"، "کہکشاں" اور "نجم السحر" جیسی ناولیں تو بے حد مقبول ہوئیں اور ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

نسیم صاحب کے اشاعتی ادارے نسیم بک ڈپو نے بھی اُردو کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ ان کی شخصیت لکھنوی مزاج و تہذیب کا پیکر تھی۔ وہ ایک انتہائی نستعلیق انسان تھے، جو سادگی اور سلاست ان کی شخصیت میں تھی، وہی ان کی تحریروں کا بھی خاصہ تھی۔

○ معروف اردو شاعر سید رونق رضا بھی گزشتہ دنوں چل بسے۔ وہ ایک کم سخن اور مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ خلوص، شرافت، دردمندی، سنجیدگی اور متانت کا پیکر تھے۔ ندا فاضلی نے کہا ہے ؎

شرافت، آدمیت، دردمندی
بڑے شہروں میں بیماری سے بچئے

وہ شرافت، آدمیت اور دردمندی، جسے بڑے شہروں اور آج کی صنعتی تہذیب میں بیماری سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے شعری لہجہ میں بھی متانت، نرم آہنگی، احتیاط اور دھیمے پن کا انداز نمایاں ہے۔ نئی حسیت اور عصری شعور کا پرتو بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "آئینے اکیلے ہیں" کچھ عرصہ قبل شائع ہوا تھا۔

ادارۂ نیا دور ان شخصیتوں کے سانحۂ ارتحال پر سوگوار ہے اور ان کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

ایڈیٹر

غزلیں

مظفر حنفی
۳۵۸-۳ بٹلہ ہاؤس
جامعہ نگر
نئی دہلی ۔ ۲۵

غریب دل مرا پھر نرغۂ خرد میں ہے
چراغِ صبح نکیلی ہوا کی زد میں ہے

پھلوں پہ میرے پڑوسی کا حق نکل آیا
اگرچہ شاخِ ثمربار میری حد میں ہے

تو شرمسار رہو گے سدا زمانے میں
ذرا تمیز اگر تم کو نیک و بد میں ہے

عجیب فتح ہمارے نصیب میں آئی
کہ ریت مالِ غنیمت، لہو رسد میں ہے

تمہارے قامتِ بالا پہ ہم بھی نازاں ہیں
ہمارا شانہ بھی شامل تمہارے قد میں ہے

خیال یہ بھی نظریے کا ہم خیال نہیں
یہ قافیہ بھی سبب میں نہیں وتد میں ہے

شمارِ سُود و زیاں کیا کریں مظفر ہم
کہ شعر گوئی ہماری نشے کی مد میں ہے

نشتر خانقاہی
کوٹھی جمال سنگھ
جہاں آباد ۔ بجنور

بھول کر بھی اب نہ اس بُت کا سراپا سوچنا
آئینے کے سامنے اپنا ہی چہرہ سوچنا

گفتگو میں اس کی مرضی کے مطابق بولنا
اور تنہائی میں اس ظالم کا رتبہ سوچنا

رُوبرو جب تک رہیں اپنوں سے رہنا بدگماں
جب بچھڑ جائیں تو سب اپنوں کو پیارا سوچنا

تشنہ لب سونا مگر خوابوں میں دریا دیکھنا
درمیاں ساگر کے رہنا، خود کو پیاسا سوچنا

آدمی اور انجمن کے بیچ نسبت ڈھونڈنا
بھیڑ میں خاموش رہنا، گھر میں کیا کیا سوچنا

بیٹھ جانا بوند پڑتے ہی بتاشے کی طرح
پھر بھی اپنے آپ کو پتھر کا ٹکڑا سوچنا

دوست بس اپنا ہے لیکن ہم سخن میرا بھی ہے
اس تناظر میں کبھی اس کو دوبارہ سوچنا

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ہیرو بازی گوہاٹی (آسام)

عارف کی متغزلانہ شاعری
ایک
انتقادیاتی مطالعہ

غزل سے متعلق کلیم الدین احمد کی رائے کہ "غزل نیم وحشیانہ صنف شاعری ہے" خاص مورد الزام رہی ہے اور ان کا یہ فرمانا کہ اردو میں تنقید کا وجود اقلیدس کا فرضی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر ...... " اردو کے بے بضاعت و بے ادبانی بصیرت ادبا ناقدین کو ہنوز غیظ و غضب سے بھرپور کر دیتا ہے کہ وہ کذا و کذا پر اتر آنے ہی کو انتقاد اعلیٰ سمجھنے لگتے ہیں۔ نور علیٰ نور" ڈاکٹر مفتی اور منچلنے ان جیسے ہی دل و دماغ کے حامل کتنے ہی اردو والے اس بات پر تڑپ اٹھے کہ "اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں ہے" جذباتی اچھل کود تو بہت ہوئی مگر آج تک کوئی اردو کا ادیب یہ نہیں بتا سکا ہے کہ "عالمی ادب" کا مفہوم کیا ہے نیز یہ اصطلاح کیا با معنی بھی ہے؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم معیاری انتقادیات سے ہنوز بے گانہ ہیں۔ نا آشنائے محض ہیں۔

غزل کس کو کہتے ہیں، ریزہ خیالی سے کیا مراد ہے، اچھا شعر کس کو کہا جائے وغیرہ سوالات سے کیا ہم کبھی مخاطب ہوئے ہیں؟ غزل چند اشعار کا مجموعہ ہوتا ہے جس کا پہلا شعر ہم قافیہ و ہم ردیف دو مصرعوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مطلع کی اصطلاح کو معرض وجود میں لایا۔ مطلع چوں کہ طلوع سے مشتق ہے لہٰذا اس کو تصبیرتی اعتبار سے کلیم طور کی طرح متجلی ہونا چاہیئے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعر کس کو کہتے ہیں؟ شعر کہنا آسان بھی ہے اور نہایت مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ کوئی مترنم طبع شخص گنگناتے ہوئے عالم تحدروم میں بھی شعر سازی کر سکتا ہے۔ مشکل اس لیے کہ ہم صحیح طور پر شعر کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ اچھا شعر سلسلہ در سلسلہ محیط منتہائے خیال و جذبہ (SERIES OF CLIMAXES) کے ادغام و وصال کے نکتہ عروج سے شروع ہونے والا تاثر اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ مثال کے لیے عارف ہی کا ایک شعر لیا جائے۔

"جب ذرہ آفتاب ہے قطرہ ہے ایک بحر
پھر آدمی کو اس سے تو چھوٹا نہ جانیئے"

جو ذرہ میں ہے وہ آفتاب میں ہے، قطرہ اور بحر میں کیا فرق ہے یہی تو کہ ایک عالم صغیر ہے اور دوسرا عالم کبیر۔ غرض کہ ذرہ و آفتاب، قطرہ و بحر سے متعلقات پر پورا ذہن صرف ہے اور دل ہے کہ وجدان کا حامل ہو کر دونوں کو ایک ہی سے عبارت سمجھتا ہے۔ غالب کہتا ہے۔

" جلوہ کن فرصت مدہ یک ذرہ کم ترنیستم
حسن بہ ایں تابناکی آفتابی بیش نیست "

ایک اچھے شعر خیال میں جذبے کی تڑپ الفاظ کی کار آگہانہ در و بست مسلکات ذہنی و قلبی کا ابھار، ساز دل کو چھیڑنے والی مضراب، ذہن کو شعور و ادراک کی صد آتشیں صہبا وغیرہ اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں تین سوالوں کا جواب ملتا ہے یعنی کیا کیا ہے۔ کیسے کہا ہے۔ اور کیوں کہا ہے؟ کیا کیسے اور کیوں" سے تشکیل ہونے والی تثلیث برہما، وشنو، مہیش کی تثلیث سے خاصی مماثلت رکھتی ہے۔ وید میں جس طرح یہ تینوں "اوم" (ॐ) کے تحت آجاتے ہیں اور ذات واحد میں تبدیل ہو جاتے ہیں بالکل

اسی طرح "کیوں" "کیا اور کیسے" ذات واحد بہ شکل شعر جلوہ در جلوہ متوصل و مدغم ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے فراق کا یہ شعر۔

" خدا کو اہلِ جہاں جب بنا چکے تو فراق
پکار اٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے"

اس شعر کے پس منظر میں تاریخ مذاہب، علم بشریات وغیرہ کے نکات و انکشاف نظر آتے ہیں۔ دینی اعتقاد سے صرف نظر کرتے ہوئے۔ یہی پتہ چلتا ہے کہ خود انسان ہی نے اپنے تصور سے جو علوئے منزل پر پہنچ کر الہام و وجدان سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ فنکاری کا معجزہ پیش کیا۔ ایک مجسمہ تعمیر کیا۔ وہ مجسمہ فنکاری کا وہ شاہکار تھا کہ اس مجسمے کے بنانے والے یہ پکار اٹھے کہ اس نے ہمیں بنایا ہے۔ بہت عالمانہ شعر ہے "کیا" کے تحت ہے "خدا کی تاریخ" "کیسے کہا ہے" اس نکتہ کو معراج تخیل پر گرفت میں یعنی شعری گرفت میں لایا گیا۔ "کیوں" کا جواب بھی مشکل نہیں ہے۔ شاعر کا مدعا یہی تو ہے کہ وہ اپنے خیال کی ترسیل کرے۔ بڑا لاجواب شعر ہے۔ فراق ہی کا ایک شعر اور دیکھئے۔

" ایک کو ایک کی خبر منزل شوق میں نہ تھی
کوئی بھی اہل کارواں شامل کارواں نہ تھا"

نفسی نفسی کا عالم، انتشار کی کیفیت، کی عکاسی اس سے بہتر ہونا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر فانی بدایونی کا ایک فارسی شعر ملاحظہ ہو۔

" در شباب و شیب چشم دل ز غفلت وا نشد
گردش ایام گوئی جنبش گہوارہ بود"

فانی کا محولہ فوق شعر شاعر کی محرومی و مایوسی کے عالم کو مع متعلقات قاری کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ متصوفانہ شعری پس منظر کے حامل اشعار بھی ایسے ہی محاسن کی جلوہ گری، رنگ و آہنگ معنوی نیز صوتی و صوری پیکریت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ مثال کیلئے اصغر گونڈوی کا یہ فارسی شعر۔

" در حریمش امتیاز این و آں بے سود بود
جان مشتاقاں بہ سیر لود ہم نابود بود"

آصغر کی اس غزل سے متاثر ہو کر اقبال نے دو اشعار کہے (جو ہنوز ان کے کسی مجموعہ کلام نیز باقیات اقبال وغیرہ میں دستیاب نہیں ہیں) اور اصغر کو پیش کیے۔

" من درون سینہ خود سومناتے ساختم
آستان کعبہ را دیدم فسر سود بود"
چشم آدم آں سوئے افلاک نوائش ہم نیافت
از غبار مہر و ماہ اندیشہ گرد آلود بود"

کیا محولہ فوق اشعار بڑے کینوس پر محیط نہیں معلوم ہوتے بلا شک و شبہ ان کا حیطہ معنوی وسیع بھی ہے اور دلکش بھی۔

عارف صاحب اس رمز شعری سے بھرپور واقفیت رکھتے ہیں۔ ان ہی کے الفاظ میں۔ "... اس کا (شعر کا) کینوس بہت وسیع ہے۔ ایک شعر میں پوری کائنات کو سمو دینے والا وصف غیر معمولی کارنامہ ہی کہا جا سکتا ہے ..." یہ بات ضرور ہے کہ میں نے اپنی روایت کے ساتھ ترقی پسندی اور جدیدیت کے مثبت پہلوؤں کو اپنی شاعری میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے مثال کے طور پر۔

" حیات روز نئے رنگ میں نمایاں ہے
جو اک چراغ بجھا سیکڑوں چراغ جلے"

دوسرا شعر ملاحظہ کیجئے۔

رو یا نہ جائے اور ہنسیں تو ہنسا نہ جائے
وہ گردش زمانہ ہے کچھ بھی کہا نہ جائے

(شاعر ۹/۵۵ - ۱۰ "گوشۂ عارف")

خوب بہت خوب۔ رائے بھی صائب ہے اور اشعار بھی قابل داد ہیں اور ان کو "تحسین ہنرشناس" ہمیشہ ملتی رہے گی۔ اچھی چیز ہمیشہ اچھی رہتی ہے اچھے خیالات و تصورات کے شعری پیکر بھی مرور ایام کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔ جدیدیت کی بات کرنے والوں کا مبلغ علم مشکوک محض معلوم ہوتا ہے۔ دلیل کم نظری تھت جدید و قدیم۔

تصرف میں پروان چڑھی طبیعت غم دل سے بھی آشنا ہوتی

ہے اور غمِ دوراں سے بھی بھرپور ہمدردی و ہم سوزی رکھتی ہے۔ لہٰذا عارف صاحب کے یہاں گردشِ زندگی کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔

چاہیں تو آج زہر بھی خالص نہ مل سکے
انساں کا خون دیکھیے انساں کی جان سے

اس سے بڑھ کر دشمنِ انسانیت دیکھا نہیں
آدمی سے اب ڈبہ و شیطان کا خطرہ نہیں

شائستہ زمانے کا کیا دورِ نفاست ہے
باطن میں عداوت ہے ظاہر میں محبت ہے

ہاں شیش محل دیکھیے اچھے ہیں بہت اچھے
سائے میں انھیں کے اک دنیا ہے جو بے گھر ہے

اک خون کا سیلاب ہے اک آگ کا دریا
جو امن کی دھرتی تھی وہ مقتل کی زمیں ہے

گردشِ کی اس آئینہ داری کو آشوبِ عصر یا کربِ آگہی ایسی اصطلاحات مجھے ناکافی معلوم ہوتی ہیں، ان کی جگہ سماجیاتی آگہی کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مخفی مباد، سماجیاتی آگہی احتجاجی زیریں رو (UNDER CURRENT) ضرور شامل آہنگ ہوتی ہے۔ بالخصوص اس شاعری میں جس کا قلبی سرچشمہ تصوف ہوتا ہے۔ عارف صاحب صرف تخلص ہی سے عارف نہیں ہیں۔ ان کو سلوک، احسان نیز عبودیت کو محیط تصوف کا عرفان وراثت میں ملا ہے۔ مزید برآں محولہ اشعار نیز اسی نوعیت کے بے شمار اشعار عارف کی غزلیات میں ملتے ہیں اور ان کے تصورات و خیالات کو انسان دوستی کے نصب العین پر استوار اشتراکیت ملتزمات سے بھی عبارت کہا جا سکتا ہے۔ "ترقی پسند" اصطلاح گھسی پٹی ہو کر معنی و مطلب سے عاری ہو چکی ہے۔

ان کے ہاں انسان دوستی کا جذبہ پرخلوص جذبہ ہے، نعرہ بازی نہیں ہے۔ وہ قافلۂ حیات کو اس منزل پر لیجانے کی تڑپ رکھتے ہیں جہاں ایک جہانِ نو کی تشکیل کے لیے انقلابی اقدامات شروع ہوتے ہیں۔ انقلابی اقدامات اور بغاوتی اقدامات میں ممیز فرق ہے، جس کو جوش ملیح آبادی بھی نہیں سمجھ سکے۔

" انقلاب آئے ہیں جس وقت بھی اس دنیا میں
اہلِ حق کھیلتے ہنستے ہوئے مصلوب ہوئے"

"طوفاں بدوش آئے ہیں جھونکے نسیم کے
صبحِ بہار جیسے کوئی سانحہ سا ہے"

اہلِ حق کا مصلوب ہونا نیز ان کی تصلیب کو انقلاب سے منسلک کر دینا معمولی بات نہیں ہے۔ منصور و سرمد کی یاد بھی قاری کے دل میں کروٹ لینے لگتی ہے۔ سرمد کے شہید کیے جانے کے ۳۰ ۳۵ سال کے قلیل عرصہ ہی میں مغلیہ سلطنت پاش پاش ہوگئی۔ بھگت سنگھ، اشفاق اللہ، رام پرساد بسمل وغیرہ کی قربانیاں بالآخر رنگ لائیں اور ۱۹۴۷ء عیسوی میں برطانوی حکومت کا ہندستان پر جابرانہ تسلط ختم ہو گیا۔ ہندستان کی سابق وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو سفاکانہ طور پر گمراہ نوجوانوں نے شہید کر دیا۔ ان کی شہادت سے ہندستان کو جو نقصان پہنچا ہے اور سوگوار ملک نے جو خون کے آنسو بہائے ہیں، ہماری تاریخ میں ایک المناک باب کا اضافہ کرتے ہیں مگر اس باب کے بعد دوسرا باب ہماری ظفریابی کا باب ہوگا بقول کیفی اعظمی۔

اعلانِ حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد

عارف کہتے ہیں۔

ڈوبنے والے سے طوفاں کی حقیقت مت پوچھ
ڈوبنے والا ہی ساحل کا پتہ دیتا ہے
اک صبحِ نو کی شوخ کرن کی امید میں
رکھتا ہوں ذہن و دل کا دریچہ کھلا ہوا

"منصور کا وہ دور تھا، یہ میرا دور ہے
ظلم و ستم سے وقت کے مصلوب میں بھی ہوں"

"زندگی کتنی تڑپتی ہے اجالوں کے لیے
یہ ندامت کے اندھیروں سے نکالی جائے"

بکھراؤ کے بغیر نہ مانیں گے کیا کبھی
چیخوں کی جن کے شیش محل میں صدا نہ جائے"

"..... آپ نے جو یہ کہا کہ میں غزل کے بجائے نظم کی طرف زیادہ توجہ کرتا تو زیادہ کامیاب رہتا تو یہ مجھے تسلیم لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میری نظم اور غزل دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ نظم و غزل ہی کا فرق رہے گا اور بس ....." (شاعر۔ بمبئی، "گوشہ عارف")

گستاخی معاف، سوال اور جواب دونوں نا درست ہیں۔ مدیر "شاعر" کے استفادے سے یہ جواب عبارت ہے لہٰذا ایک غلط فہمی نے دوسری غلط فہمی کو پیدا کیا ہے۔ غزل کی ماہیت کو پوری طرح نہ سمجھنے والے اسی نوعیت کی غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شری اربندو جو بیسویں صدی کے معروف سنیاسی اور فلسفی سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی ایک تصنیف (FUTURE POETRY) (شاعری مستقبل) میں ایک بڑے نکتے کی بات کہی ہے کہ ہر بڑی شاعری علوئے روحانی و شعری سے ہمکنار ہو کر سوتر یا منتر (सूत्र, मन्त्र) میں کشید ہو جاتی ہے یعنی اس میں زیادہ الفاظ نہیں ہوتے۔ منترا اور سوتر دونوں بنایت مختصر ہوتے ہیں، غزل کا شعر بھی اس سطح تک پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ غزل کا شعر دراصل شاعری کا جوہر (QUINTESSENCE) ہوتا ہے۔ شعر یعنی اچھا شعر وہ دل ہوتا ہے جو بالقوۃ کائنات ہے

"سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

یہ حقیقت ہے کہ عارف کی شاعری کے جوہر کھلتے ہیں تو غزل ہی میں کھلتے ہیں۔ ان کی ہر غزل میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو وسعتِ کائنات کے حامل ہوتے ہیں بلکہ ان کے ہاں ایک اور دلکش خوبی بھی پائی جاتی ہے جس کو شعری ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت ہی دیکھ سکتی ہے۔ اس خوبی کو "وحدت تاثر" (UNITY OF IMPRESSION) کہا جا سکتا ہے۔ کوئی ایک غزل اٹھائیے اور گہری نظر سے دیکھئے۔ مثال کے طور پر، پانچ اشعار پر مشتمل "شاعر" شمارہ عارف مشمول یہ غزل دیکھئے۔

جنوں کے ساتھ چلے آگہی کے ساتھ چلے
تری تلاش تھی ہم کو کسی کے ساتھ چلے
خود اپنی راہ نکالے تلاشِ منزل میں
وہ راہ رو ہی نہیں جو سبھی کے ساتھ چلے
سپردِ مرگ کیا کیسی بے وفا نکلی
تمام زندگی جس زندگی کے ساتھ چلے
بتائیں ہم اسے منزل جو راستہ بھولا
ہمارے ساتھ وہ آئے خوشی کے ساتھ چلے
جنونِ عشق میں منزل کو جا لیا ہم نے
بھٹک کے رہ گئے جو آگہی کے ساتھ چلے

محولہ غزل کو آپ نظم بھی کہہ سکتے ہیں۔ عنوانات، جنون و آگہی مرگ و زیست، جادہ و منزل عشق و جنوں وغیرہ ہو سکتے ہیں ایک عنوان پسند کر لیجئے اور آپ اسی غزل کو بطور نظم پیش کر سکتے ہیں۔ یہ خوبی قابل رشک خوبی ہے۔ تعجب ہے کہ ابھی تک کسی ناقد نے اس پر توجہ صرف نہیں کی ہے۔

الغرض عارف صاحب ایک بیدار مغز، ہمدردی و ہم سوزی سے حامل دل والے شاعر ہیں۔ اردو شاعری کے جملہ محاسن اشاریت و رمزیت، ایجاز و اختصار، سوز و گداز، رنگ و آہنگ، حب الوطنی، انسان دوستی، فنکارانہ آگہی وغیرہ ان کے ہاں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان کا لفظیات (DICTION) آج کل کے روزمرہ سے عبارت ہے۔ گنگا جمنی ثقافت میں پروان چڑھی زبانِ اردو میں عارف صاحب کی شاعری کو ممتاز جگہ حاصل رہے گی۔

"ستارہ در خشید و ماہ مجلس شد۔"

...

ایم۔ کٹھیاوی راہی
[illegible]
[illegible] گورکھپور

دو غزلیں

چاند نگریا دھوکا دے گی، شاعر کو معلوم نہ تھا
نظم و غزل کی جوت جلے گی، ایسا تو مقسوم نہ تھا

شہرِ ستم میں رہنے والے جانے کہاں روپوش ہوئے
ہاتھ میں سب کے تیغِ ستم تھی جہاں کوئی مظلوم نہ تھا

دل دے کے چاہت پا لیتا، چاہت دے کے کربِ جہاں
لیکن وہ نادان نہیں تھا، میں بھی کچھ معصوم نہ تھا

لفظوں کی اک بازی گری تھی دیدہ وروں کے جلسے میں
صفحہ صفحہ حرفِ غلط تھا، واضح کوئی مفہوم نہ تھا

میر و غالب، آتش و مومن جیسے تیسے شاد ہوئے
اپنی طرح اس دور میں کوئی ایسا تو محروم نہ تھا

دنیا کا دستور جدا ہے، منصف بھی مجبور ہوئے
دل کا لکھا اے راہی صاحب کاغذ پر مرقوم نہ تھا

اب کسی آنکھ میں آنسو نہیں آنے پاتا
قیس کے گھر میں بھی آہو نہیں آنے پاتا

بھیج دے خط کہ تجھے ہم سے کوئی کام نہیں
کھول کر اب جو یہاں تو نہیں آنے پاتا

درد کا رنگ ہی لے آتا ہے ہر رنگ میں وہ
لے کے اب پیار کی خوشبو نہیں آنے پاتا

اوپر اوپر ہی نظر آتا ہے آسیب نظر
کیوں تری آنکھ میں جادو نہیں آنے پاتا

لوحِ امکاں پہ نہ آنے کی عبارت لکھ دی
زندگی کا کوئی پہلو نہیں آنے پاتا

بارشیں بھیج خدایا کہ شجر جلتے ہیں
اس تپش میں کوئی جگنو نہیں آنے پاتا

محمد اسحاق صدیقی
۵۰۸، گوئن تالاب لکھنؤ ۱۸



اگر آپ دنیا کے نقشے یا گلوب پر نظر ڈالیں تو یہ دیکھیں گے کہ بحر اٹلانٹک کے ایک طرف یورپ اور افریقہ واقع ہیں اور دوسری طرف شمالی اور جنوبی امریکہ۔ ان براعظموں کے آمنے سامنے کے ساحل اتنے ملتے جلتے ہیں کہ اگر انھیں ایک دوسرے کے قریب لایا جائے تو یورپ اور افریقہ شمالی اور جنوبی امریکہ سے بڑی خوبی کے ساتھ جڑ سکتے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے یا کبھی ایسا ہی تھا۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش الفریڈ ویگنر (ALFRED WEGENER) نے کی۔ جرمنی کے اس مشہور عالم اور طبقات الارض کے ماہر نے برسوں کی تحقیق کے بعد ۱۹۱۲ء میں یہ نظریہ پیش کیا کہ موجودہ براعظم ہمیشہ سے اپنی اپنی جگہ قائم نہیں رہے ہیں بلکہ جگہ بدلتے رہے ہیں۔ چنانچہ کبھی یورپ اور افریقہ شمالی اور جنوبی امریکہ سے جڑے ہوئے تھے۔ پھر وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور آہستہ آہستہ سرک کر موجودہ مقامات پر پہونچے پہلے کے سائنداں اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے رہے، لیکن گذشتہ ۵۰ سال میں اس نظریے کی تائید میں اتنے ثبوت فراہم ہو گئے کہ اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

افریقہ کے مغربی ساحل اور جنوبی امریکہ کے مشرقی ساحل کی ظاہری مشابہت کے علاوہ دونوں براعظموں کی چٹانوں کی بناوٹ اتنی ملتی جلتی ہے کہ ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ وہ کبھی ملی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ بحر اٹلانٹک کی تھاہ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دو سینٹی میٹر سالانہ کی رفتار سے پھیل رہا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ اسی رفتار سے پھیلتا رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ اب سے تقریباً ۲۵ کروڑ سال پہلے جنوبی امریکہ افریقہ سے جڑا ہوا تھا۔

جانوروں کی گواہی حیوانات کی تقسیم سے بھی براعظموں کے جڑے ہونے کا ثبوت ملتا ہے مثلاً بندر کی متعدد اقسام جو افریقہ اور جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ براعظم کبھی جڑے ہوئے نہیں تھے تو افریقہ کے بندر امریکہ کیسے پہونچ گئے جبکہ دونوں کے درمیان بحر اٹلانٹک حائل ہے۔

میٹھے پانی میں رہنے والی مچھلیوں کی جو قسمیں جنوبی امریکہ میں پائی جاتی ہیں وہی افریقہ میں بھی ہوتی ہیں مثال کے طور پر الیکٹرک ایل (ELEC-TRIC EEL) جو کرنٹ مارتی ہے اور لنگ فش (LUNG FISH) جو دلدل کے گندے پانی سے ناک باہر نکال کر ہوا میں سانس لیتی ہے۔ اگر کبھی یہ براعظم جڑے ہوئے نہ تھے تو دونوں جگہ ایک جیسی مچھلیاں کیسے وجود میں آ گئیں؟

شترمرغ افریقہ کا مشہور نہ اڑ سکنے والا پرندہ ہے۔ اس کی ایک قسم جنوبی امریکہ میں بھی ہوتی ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ دونوں کے پیٹ میں ایک جیسے کیچوے (TAPE WORM) پائے جاتے ہیں جو کسی اور جانور کے پیٹ میں نظر نہیں آتے۔ یہ ناممکن ہے کہ قدرت نے دونوں جگہ ایک ہی طرح کے پرندے اور ان کے پیٹ میں ایک ہی طرح کے کیڑے پیدا کیے ہوں۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ جب افریقہ اور جنوبی امریکہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو ان کے جانور بھی بٹ گئے۔

گونڈوانا لینڈ ویگنر نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ کبھی انٹارکٹیکا جنوبی

امریکہ، آسٹریلیا اور ہندستان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور سب کے سب قطب جنوبی کے گرد جمع تھے۔ براعظموں کے اس مجموعے کا نام اس نے وسطی ہندستان کی ایک قدیم حکومت کے نام پر گونڈوانا لینڈ (Gondwana Land) رکھا۔

اب سے تقریباً بیس کروڑ سال پہلے قطب جنوبی پر سب سے بڑے برفانی دور کا آغاز ہوا۔ برف کے ریلے میں بہی ہوئی بڑی بڑی چٹانوں (Boulders) پتھروں، مٹی اور چٹانوں پر پتھروں کی رگڑ کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گلیشیروں (برف کے دریاؤں) نے قطب جنوبی سے پھیل کر خطِ استوا تک جنوبی امریکہ کو ڈھانپ لیا تھا مغربی آسٹریلیا اور ہندستان بھی برف کی اس لپیٹ میں آگئے تھے لیکن خط استوا تک برف کا پھیلنا اس لیے ناممکن ہے کہ وہاں سورج کی کرنیں سیدھی پڑنے کی وجہ سے شدید گرمی ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ براعظم جہاں اب ہیں پہلے وہاں نہیں تھے بلکہ سب کے سب قطب جنوبی کے گرد جمع تھے، جہاں سورج کی کرنیں ترچھی پڑتی ہیں اس لیے وہاں برف کا جمنا اور شمال کی طرف آہستہ آہستہ پھیلنا ممکن تھا۔

نباتات کے ثبوت جب گلیشیروں کی برف آہستہ آہستہ پگھل گئی تو پتھریلی زمین پر ایک خاص قسم کے پودے اُگ آئے جنھیں ٹنگ فرن (Tongue Fern) یا گلاسوپٹیرس (Glossopteris) کہتے ہیں۔ یہ شدید سردی کا مقابلہ کرنے والا ایک سخت جان پودا ہے، جس کی پتیاں زبان سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اسی پودے کے جنگلوں کے زمین کے نیچے دفن ہونے سے کوئلہ بنا۔ اس کے پتھرائے ہوئے نمونے (کوئلے کی شکل میں) اینٹارکٹیکا، آسٹریلیا، ہندستان، جنوبی امریکہ (ارجنٹائنا۔ برازیل) اور وسطی افریقہ میں ملے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پودا ہزاروں میل تک پھیلے ہوئے بحرِاعظم کو پھاند کر دوسرے براعظموں میں نہ پہونچ گیا ہوگا۔ ایسا تو تبھی ہو سکتا ہے جب یہ براعظم ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔

منجمد مقناطیسیت براعظموں کے متحرک ہونے کا جدید ثبوت منجمد مقناطیسیت (Fossil Magnetism) ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ چٹانیں دو طرح سے بنتی ہیں، گرم لاوے کے ٹھنڈا ہو کر جمنے سے اور سمندر کی تھاہ میں مٹی اور سنگریزوں کے تہ نشیں ہونے سے دونوں میں مقناطیسیت کے حامل لوہے کے خوردبینی ذرے تیرتے رہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ گرم لاوا یا گیلی مٹی سخت ہو کر چٹانوں کا روپ اختیار کرے لوہے کے یہ ذرے قطب نما کی سوئیوں کی طرح مرتب ہو جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ذرہ شمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان مقناطیسی ذروں کی مدد سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ جن چٹانوں میں وہ پائے جاتے ہیں وہ کس زمانے میں اور کہاں بنی تھیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی چٹانوں کے مقناطیسی تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ اب سے تقریباً ۱۵ کروڑ سال پہلے وہ خطِ استوا کے قریب تھا اور وہاں سے کھسکتے کھسکتے موجودہ مقام پر پہونچ گیا۔ اسی طرح ہندستان کی چٹانوں میں پائے جانے والے مقناطیسی ذروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب سے ۷ کروڑ سال پہلے ہمارا ملک خطِ استوا کے جنوب میں تھا۔

مختلف ملکوں کی چٹانوں میں مقناطیسیت کی کھوج بین سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زمین کا شمالی مقناطیسی قطب مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر تھا مثلاً ایک زمانے میں وہ ہوائی جزیروں کے پاس (بحرِ پیسفک میں) تھا اور پھر جاپان ہوتا ہوا کمچٹکا (Kamchatka) پہونچ گیا۔

جدید تحقیقات جدید تحقیقات کے مطابق براعظموں کے سرکنے کی وجہ سے بحرِاعظموں کی صورتیں بھی بدل جاتی ہیں۔ پہاڑوں کے نئے نئے سلسلے پیدا ہوتے ہیں اور ناپید ہو جاتے ہیں۔ جوالامکھی پہاڑ وجود میں آتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔ سمندر کی تھاہ سے نئے نئے جزیرے ابھرتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ جب براعظم ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہیں تو زلزلے آتے ہیں۔ براعظموں کے سرکنے سے ان کی آب و ہوا بدل جاتی ہے۔ اور اس کا اثر نباتات و حیوانات کے ارتقا پر پڑتا ہے۔ یہ سب کیوں اور کیسے ہوتا ہے۔ اسے جاننے کے لیے زمین کی اندرونی بناوٹ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

جب زمین سورج سے الگ ہوئی تو وہ گرم گیسوں کا بنا ہوا ایک گولا تھی جو آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوا۔ اس کی سطح پر جو پپڑی پڑی اسے زمین کا پوست یا کرسٹ (Crust) کہتے ہیں۔ زمین کی یہ اوپر والی پرت چٹانوں کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے مل کر بنی ہے جنھیں پلیٹ (Plate) کہتے ہیں (انھیں "قطعہ ارض" کہہ سکتے ہیں) ایسے آٹھ بڑے اور بارہ سے زیادہ چھوٹے ٹکڑے ہیں جو مختلف سمتوں میں پگھلے ہوئے مادے کی اس پرت

پر تیر رہے ہیں جسے منٹل (MANTLE) کہتے ہیں۔ ان پلیٹوں کے تیرنے یا کھسکنے کی رفتار سالانہ ایک سینٹی میٹر سے لے کر پندرہ سینٹی میٹر تک ہے۔

ان پلیٹوں میں سے بعض پر براعظم واقع ہیں اور بعض پر بحرِاعظم جب ایسی دو پلیٹیں آپس میں ٹکراتی ہیں جن پر بحرِاعظم واقع ہیں تو ایک دوسرے کے سامنے والے کنارے کے نیچے داخل ہو جاتی ہے جس سے سمندر کی تھاہ میں کھائی پیدا ہو جاتی ہے۔

جب کسی جگہ پوست (اوپر والی پرت) کی چٹان پگھلے ہوئے مادے میں ڈوب جاتی ہے تو اس کا مادہ بھی گرم ہو کر پگھل جاتا ہے اور جب اس پر دباؤ بڑھتا ہے تو سمندر کی تھاہ چٹخ جاتی ہے اور جا بجا پگھلا ہوا مادہ سمندر کے نیچے سے ابل کر اوپر آتا ہے اور جوالا مکھی پہاڑوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر اندر والا مادہ ابل ابل کر عرصے تک اوپر آتا رہتا ہے تو سمندر کی تھاہ میں چھپے ہوئے جوالا مکھی پہاڑ بڑھتے بڑھتے پانی کی سطح پر ابھر آتے ہیں اور جوالا مکھی پہاڑوں کی ایک کمان بن جاتی ہے۔ جزائر کیریبین (CARIBBEAN ISLANDS) جزائر الیوشین (ALEUTIAN Is.) فلی پائن (PHILIPPINE) اور ایسٹ انڈیز (EAST INDIES) کے جزیرے اسی طرح بنے تھے۔

جب ایسی پلیٹ جس پر براعظم واقع ہیں (اس کا بیشتر حصہ گرینائٹ۔ ہلکے مادے کا بنا ہوتا ہے) ایسی پلیٹ سے جا ملتی ہے جس پر بحرِاعظم واقع ہیں (وہ بیسالٹ۔ بھاری مادے۔ کی بنی ہوتی ہے) تو برّی پلیٹ بحری پلیٹ پر چڑھ جاتی ہے۔ اس ٹکر سے بحری پلیٹ کی وہ چٹانیں جو سمندر کی تھاہ میں کروڑوں سال تک دریاؤں سے بہہ کر آنے والی مٹی کے جمع ہونے سے بنی تھیں کھرچ جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں برّی پلیٹ کے کنارے بحری پلیٹ کا کھرچا ہوا مادہ سمٹ کر جمع ہونے سے لہرنما پہاڑ۔ (FOLDED MAUNTAINS) بن جاتے ہیں۔ جب بحری پلیٹ، برّی پلیٹ کے نیچے چلی جاتی ہے تو وہ اوپر والی پلیٹ کے دباؤ سے زمین کے پگھلے ہوئے مادے میں دھنس کر پگھلنے لگتی ہے جس سے آگے چل کر جوالا مکھی پہاڑوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو براعظم ٹکراتے ہیں۔ چونکہ دونوں کا مادہ یکساں ٹھوس ہوتا ہے اس لیے ایک دوسرے کے اوپر یا نیچے نہیں جا سکتا۔ اسی لیے دونوں کے کناروں کا مادہ اوپر اٹھ کر کے پھٹے پہاڑوں کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

زمین کے پرانے نقشے ماہرین طبقات الارض نے زمین کے مختلف زمانوں کے نقشے بنائے ہیں جن کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سطح زمین کی صورت برابر بدلتی رہی ہے۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ اب سے تقریباً ۵۰ کروڑ سال پہلے سطح زمین پر صرف چار پلیٹیں تھیں جن میں سے تین پر خطِ استوا کے دونوں طرف تین براعظم واقع تھے، شمالی امریکہ، یورپ اور ایشیا (لیکن موجودہ براعظموں سے بہت چھوٹے) زمین کے جنوبی نصف کرے میں باقی براعظم ایک چوتھی پلیٹ میں سمائے ہوئے تھے۔

اب سے تقریباً ۳۰ کروڑ سال پہلے شمالی اور جنوبی پلیٹیں ایک دوسرے کے قریب آنا شروع ہوئیں اور ان کے ملنے سے ایک بہت بڑا براعظم بن گیا جس کا نام پین جیا (PANGEA) رکھا گیا ہے۔ یہ نام یونانی زبان سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں "کل براعظم"۔

اس زمانے میں "پین جیا" کو گھیرے ہوئے بحرِاعظم میں جو ننھے ننھے حیوانات پائے جاتے تھے ان کے مرنے اور تہہ نشین ہونے کے بعد ان کے جسم کا روغن پٹرول میں تبدیل ہو گیا۔ اسی طرح بحرِاعظم کے کنارے خشکی پر دلدلوں میں اگنے والے بڑے بڑے پیڑ زمین میں دفن ہونے کے بعد کوئلہ بن گئے۔

یہ وہ دور تھا جب زمین پر جل تھلے جاندار (AMPHIBI-AUS) پائے جاتے تھے جن میں سے بیشتر کی انواع ناپید ہو گئیں اور صرف مینڈک (FROG) اور ان کے قریبی رشتے دار ٹوڈ (TOAD) اور سیلامینڈر (SALAMANDER) وغیرہ باقی رہ گئے۔ ان کے بعد پیٹ کے بل رینگنے والے جانور (REPTILES) نمودار ہوئے۔ اب سے تقریباً ۲۰ کروڑ سال پہلے مذکورہ بالا واحد براعظم ٹوٹنا شروع ہوا اور اس کے دو حصے ہو گئے۔ زمین کے جنوبی نصف کرے میں گونڈوانا لینڈ (GOND-WANA LAND) وجود میں آیا جس میں جنوبی امریکہ، افریقہ، عرب، ہندستان، آسٹریلیا، انڈونیشیا اور انٹارکٹیکا سمائے ہوئے تھے۔

گونڈوانا لینڈ کے مقابل شمال میں ایک دوسرا براعظم تھا جس میں

شمالی امریکہ، یورپ اور ایشیا شامل تھے ۔ یہ سب کے سب گرین لینڈ کے گرد جمع تھے ۔ اس قطعۂ ارض کا نام لوریشیا (LAURASIA) رکھا گیا ۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ اب سے تقریباً ۲۵ کروڑ سال پہلے مذکورہ بالا براعظم ٹوٹنا اور سرکنا شروع ہوئے ۔ شمالی امریکہ مغرب کی طرف چلا گیا ۔ یورپ اور ایشیا مشرق کی طرف کھسک گئے ۔ افریقہ کا بیشتر حصہ اپنی جگہ برقرار رہا ۔ جنوبی امریکہ مغرب کی طرف اور آسٹریلیا شمال کی طرف انٹارکٹکا کا ساتھ چھوڑ کر چل دیئے ۔ وہ اپنی اپنی جگہ سے آہستہ آہستہ کھسکتے رہے یہاں تک کہ براعظموں کی موجودہ صورت پیدا ہوئی لیکن یہ نقشہ بھی عارضی ہے ۔ براعظم اب بھی سرک رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی آئندہ صورت کیا ہوگی ۔

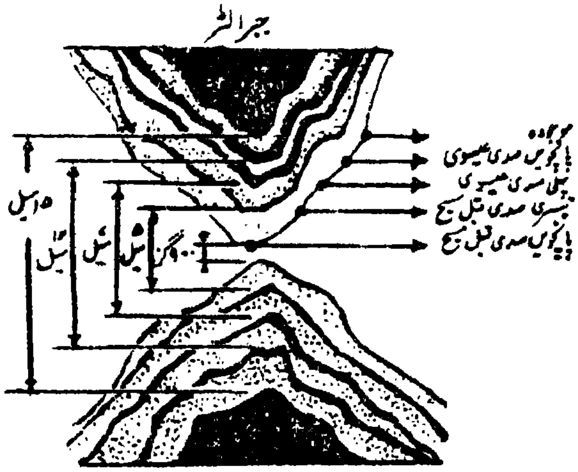
براعظموں کے ٹوٹنے اور سرکنے کا اثر زندگی کے ارتقاء پر پڑا ۔ جب الگ الگ براعظموں کی جگہ صرف ایک براعظم تھا تو جانور ایک حصے سے دوسرے تک گھوم پھر سکتے تھے اور ان کی نئی نئی قسمیں پیدا ہونے کے امکانات کم تھے لیکن جب واحد براعظم ٹوٹ گیا اور خشکی کے قطعے ایک دوسرے سے دور ہو کر مختلف آب و ہوا کے خطوں میں جا پہنچے تو وہاں کی آب و ہوا اور ماحول کے مطابق نئی نئی قسمیں وجود میں آگئیں، مثلاً افریقہ میں ہاتھی اور شمالی امریکہ میں گھوڑے کی ابتدائی اقسام نمودار ہوئیں ۔ جنوبی امریکہ میں آرماڈیلو (ARMADILLO) اور آسٹریلیا میں مارسوپیل (MARSUPIAL) پیدا ہوئے یعنی وہ جانور جو اپنے بچوں کی پرورش اپنے پیٹ کے باہر تھیلی میں کرتے ہیں ۔ ایسے جانوروں میں کنگارو سب سے مشہور ہے ۔

براعظموں کا حال اور مستقبل براعظموں کے سرکنے کا عمل اب بھی جاری ہے ۔ براعظموں اور جزیروں کے باہمی فاصلے کئی بار ناپے گئے ہیں اس پیمائش سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی جگہ بدلتی رہتی ہے ۔ مثال کے طور پر آبنائے جبرالٹر وسیع ہو رہی ہے ۔ پانچویں صدی قبل مسیح اس کی چوڑائی ۹۰۰ گز تھی ۔ اس کے دو سو سال بعد وہ ۵ میل ہو گئی ۔ سنہ عیسوی کے آغاز میں اس کی چوڑائی ۱۲ میل تھی اور اب ۱۵ میل ہے ۔ گزشتہ ۲۴۰۰ سال میں آبنائے جبرالٹر کی چوڑائی میں ۱۴ میل کا اضافہ ہوا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ اور افریقہ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں ۔

ان کی جدائی کی رفتار کا اندازہ ۱ انچ سالانہ کیا جاتا ہے ۔



افریقہ و جنوبی امریکا کی جدائی



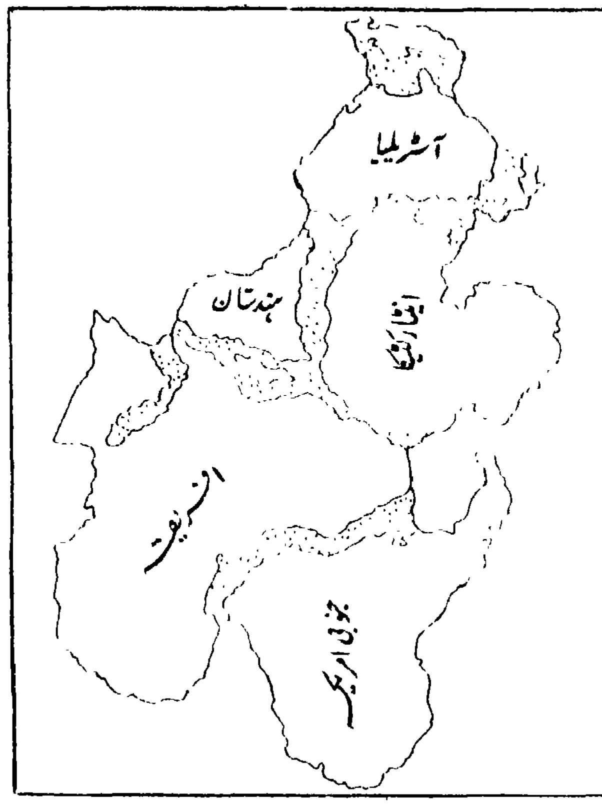
جبرالٹر کی وسعت میں اضافہ

بحیرۂ احمر (REDSEA) سالانہ ایک سینٹی میٹر کی رفتار سے چوڑا ہو رہا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ افریقہ اور ایشیا بھی الگ ہو رہے ہیں ۔

کیلیفورنیا شمالی امریکہ سے جدا ہو رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے ٹوٹ کر جزیرہ بن جائے لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو اس میں لاکھوں یا کروڑوں سال لگیں گے ۔

کناڈا کے شمال کے جزیروں پر نظر ڈالیے ۔ آپ محسوس کریں گے کہ گرین لینڈ اور بعض آئی لینڈ کو آسانی سے ملایا جا سکتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب جزیرے آپس میں ملے ہوئے تھے اور رفتہ رفتہ علاحدہ ہو گئے ۔ پیمائش کرنے سے پتہ چلا ہے کہ گرین لینڈ مغرب کی طرف سرک

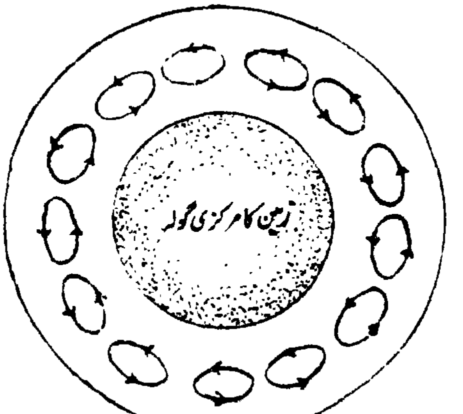
رہا ہے۔ برطانیہ قطب شمالی کی طرف جا رہا ہے اور آسٹریلیا قطب جنوبی کی طرف۔ پالی نیشیا کے جزیرے منتشر ہو رہے ہیں اور یہی دنیا کے دوسرے جزیروں کا ہے۔ لیکن ان کے سرکنے کی رفتار سال میں آدھ انچ سے زیادہ نہیں۔



جس طرح ایک نجومی انسان کا ہاتھ دیکھ کر اس کا مقدر بتاتا ہے ویسے ہی ماہرین طبقات الارض افریقہ پر پڑی ہوئی دراروں کو دیکھ کر اس کے مستقبل کا حال بتاتے ہیں۔ ملاگاسی (میڈاگاسکر) افریقہ سے جدا ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ آئے گا جب ملاگاسی کی طرح شمالی لینڈ بھی جدا ہو کر مشرق میں ایک جزیرہ بن جائے گا۔ اس کے بعد نیاسا کی باری آئے گی پھر کیپ آف گڈ ہوپ (راس امید) کا صوبہ الگ ہو جائے گا۔ اخیر میں کالاہاری کے ریگستان کی باری آئے گی اور وہ ایک جزیرہ بن جائے گا۔

براعظم کیوں سرکتے ہیں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جو براعظموں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے ہزاروں میل دور پہنچا دیتی ہے غالباً اس کا سبب حرارت کی رَو کے چکر (CONVECTION CURRENT) ہیں جو زمین کی درمیانی تہہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسے یوں سمجھئے کہ جب کسی برتن میں پانی گرم کیا جاتا ہے تو پہلے نیچے کا پانی گرم ہوتا ہے یہ گرم پانی برتن کے بیچ میں اوپر کو اٹھتا ہے اور جب نسبتاً ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو دائیں بائیں مڑ کر برتن کے کنارے کنارے نیچے کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ پانی ابلنے لگتا ہے گرم پانی کے اس چکر کو "حرارت کی رَو" کہتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی چکر زمین کی درمیانی تہہ میں پیدا ہوتے ہیں جس پر براعظم تیرتے ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ زمین جس مادے کی بنی ہے وہ پہلے اندر سے باہر تک یکساں کثافت کا تھا۔ یعنی ہلکے اور بھاری مادے میں فرق نہ پیدا ہوا تھا رفتہ رفتہ بھاری مادے تہہ نشیں ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سب سے بھاری مادہ سب سے نیچے یعنی زمین کے مرکزی گولے میں پایا جاتا ہے۔ جسے انگریزی میں کور (CORE) کہتے ہیں۔ اس سے ہلکا اس سے اوپر زمین کی درمیانی تہہ میں پایا جاتا ہے جسے مینٹل (MANTLE) کہتے ہیں اور سب سے ہلکا سب سے اوپر زمین کے پوست میں پایا جاتا ہے جسے کرسٹ (CRUST) کہتے ہیں۔ پہلے زمین کا مرکزی گولا چھوٹا تھا اور



حرارت کی رَو کے چکر

درمیانی تہہ بڑی۔ اس درمیانی تہہ میں حرارت کی رو کے کئی بڑے بڑے چکر تھے۔ جب اس تہہ کا بھاری مادہ مرکزی گولے میں منتقل ہوا تو مرکزی

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

غزلیں

اقبال متین

بی - ۲۰

۱۰۰، ٹکاٹرن کالونی

پوچیرپلہ (اے پی)

کیا حسیں رات بنادی تو نے
چاندنی مجھ کو پلادی تو نے"

میں نے ہنس ہنس کے چھپائے آنسو
مجھ کو جینے کی دُعا دی تو نے

کس سے کہتا کہ میں تیرا ہی تو تھا
کچھ نہ کہنے کی سزا دی تو نے

میں تجھے دیکھ کے رو بھی نہ سکا
لو چراغوں کی بڑھا دی تو نے

کیسا یہ ہُو کا سماں ہے سرِ شام
دل میں کیا راکھ اُڑا دی تو نے

تجھ سے جب بارِ امانت نہ اٹھا
وہ امانت ہی اٹھا دی تو نے

یہ بھی کیا طرزِ وفا ہے کوئی
رات لمبی تھی گھٹا دی تو نے

شہر سنسان تھا اقبال متین
رات کس کس کو صدا دی تو نے

صلاحُ الدین نیّر

۱۱-۳-۴۴۳ نیو ملے پلی

حیدرآباد

ہر ایک ذرّہ، بارِ خلافت سے ڈر گیا
اک میں ہی تھا کہ تیرے مقابل ٹھہر گیا

دامن پہ بھیگی پلکوں کی تحریر چھوڑ کر
وہ شخص جاتے جاتے بھی احسان کر گیا

تازہ ہوا قریب سے گزری تو تھی مگر
تنکوں کی طرح میرا نشیمن بکھر گیا

گردش میں اک زمانے سے کس کی نگاہ ہے
خالی ہوا گلاس تو پیمانہ بھر گیا

تم مسکرا کے ایک طرف ہو گئے مگر!
الزام سارا زلفِ پریشاں کے سر گیا

وہ بھی کبھی تھا اپنے قبیلے کا آدمی
کل تیری انجمن سے جو باچشمِ تر گیا

اب تک بھی جس کو چھونے کی نیّر ہے آرزو
وہ لمحۂ عزیز نہ جانے کدھر گیا

کوثر جائسی
۱۰۲/۹۵ کرنیل گنج کانپور

معتبر صاحبِ فن شاعر

حضرت شارق ایرانی

ماضی قریب یعنی ۴ فروری ۸۶ء کو حضرت شارق ایرانی کا انتقال ہوگیا اور کانپور کی ادبی فضا سوگوار ہوگئی۔ شارق صاحب کی وفات اربابِ ذوق اور صاحبانِ علم و فن کے لیے بڑا حادثہ ہے۔ موصوف کی سیرت ان کا رکھ رکھاؤ امتیازی شان کا حامل تھا۔ تقریباً چالیس سال سے اُن سے آشنا ہوں بربنائے قربت ان کی شخصیت کو پرکھنے اور سمجھنے کا کافی موقع ملا وہ صاحبِ کمال ہونے کے باوجود انتہائی منکسر مزاج، وضع دار اور متوکل شخص تھے۔ غیبت و حسد سے ان کا دامنِ انسانیت ہمیشہ پاک رہا۔ وہ ایک باخبر اور صاحبِ فکر شاعر تھے۔ فنی مسائل پر کامل دسترس رکھتے تھے ان کا مزاجِ شاعری ہموار سنجیدہ اور متین تھا۔ دنیائے تصوف میں اُن کی رسائی تھی اور زمانے کے معروف پاک نفس صاحب بصیرت پابندِ شریعت صوفی الحاج حضرت شاہ نثار احمد رحمتہ اللہ علیہ سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ زیادہ حصہ فرصت کا شارق صاحب ان کی خدمت میں گزارتے۔ وہاں رموزِ باطنی اور دینی حقائق کا جو درس ہوتا اس سے حسبِ استطاعت فیضیاب ہوتے۔

وہ جگر مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ اور جگر صاحب حضرت اصغر گونڈوی جیسے تصوف آشنا شاعر کے تربیت یافتہ تھے جگر صاحب اصغر گونڈوی کی صوفیانہ زندگی اور ان کی شاعری کے دلدادہ تھے اصغر صاحب کا رنگِ تغزل مجاز و حقیقت کا امتزاجی نقش ہے جس میں مجازی رنگ سے زیادہ رنگ حقیقت کی کارفرمائی ہے

جگر صاحب فیضِ اصغر سے مجاز کی سرحدیں پار کرکے دائرۂ حقیقت میں جا پہنچے ہیں۔ جگر صاحب کی ایک غزل کے یہ شعر دیکھیے جو مجاز و حقیقت دونوں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہیں ؎

ترے جلووں میں گم ہوکر خودی سے بے خبر ہوکر
تمنا ہے کہ رہ جاؤں ز سرتاپا نظر ہوکر
لطافت مانعِ نظارۂ صورت سہی لیکن
دھڑکتا دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہوکر
یہاں تک جذب کرلوں کاش تیرے حسنِ کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہوکر

اس کے بعد مقطع میں وہ اصغر صاحب کی باطنی عظمت کا بیان یوں کرتے ہیں ؎

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کا شانۂ اصغر
جو بیٹھو با ادب ہوکر تو اٹھو باخبر ہوکر

اصغر صاحب کے حسنِ کلام اور رنگینِ تغزل کا اعتراف بڑے عقیدت مندانہ انداز میں کرتے ہیں ؎

کیونکر بہار شعر سے ٹپکے نہ اے جگر
رنگِ کلامِ حضرتِ اصغر نظر میں ہے

عرض حال میں شارق صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ میں ازاول تاآخر حضرت جگر مرادآبادی کا شاگرد رہا ہوں۔ اس اعلان سے یہ متوقع ہے کہ وہ فن شعر میں مشورہ لینے کے علاوہ جگر صاحب کے اندازِ شعر کی بھی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن یہ عجب معاملہ ہے کہ

استاد فنی و لسانی قیود کی اکثر جگہ پابندی نہیں کرتے اور شارق صاحب استاد کے برعکس زبان و محاورات کے معاملے میں انتہائی پابند اور محتاط نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ جگر صاحب کے بجائے وہ اصغر صاحب کے رنگ کلام سے متاثر معلوم ہوتے ہیں آگے چل کر میں بطور ثبوت ایک تقابلی خاکہ اشعار شارق و اصغر کا پیش کروں گا۔ عرض حال میں شارق صاحب نے اپنے کلام کے بارے میں حد سے زیادہ انکسار سے کام لیا ہے اور یہ شیوہ ایک بالغ نظر اور شریف النفس انسان کا ہونا ہی چاہیے پھر بھی اس سے قطع نظر کر کے جب ہم ان کے مجموعۂ کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس بلند درجے کے شاعر ہیں۔ پختگی کلام اور فنی استحکام کی بلند سطح پر ان کی غزلیں نظر آتی ہیں انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور قطعات بھی لیکن ان کا شاعرانہ منصب غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں عام طور پر اصغر کا فیض تغزل نظر آتا ہے اس کے ثبوت میں اصغر صاحب اور شارق صاحب کے اشعار پیش کرتا ہوں۔ ان میں مضمون کی مکمل مطابقت نہ ہو لیکن انداز گفتگو اور مطمح نظر وہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ردائے لالہ و گل پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے (اصغر گونڈوی)

گل و لالہ پر ہے تری نظر ترے ذوق دید کو کیا خبر
کہ ابھی لباس بہار میں کوئی گلستاں سے گذر گیا (شارق)

غضب ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا (اصغر)

آہ نازک ہے بہت رشتۂ محویت عشق
آمد و شد بھی نفس کی ہے یہاں بے ادبی (شارق)

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر لیے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا (اصغر)

جمال یار جب آرائش مجاز کرے
کسے مجال کہ سجدے سے احتراز کرے (شارق)

میری محرومی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا
قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے (اصغر)

جیسے تسکین دے رہا ہے کوئی
کون میرے دل تباہ میں ہے (شارق)

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے (اصغر)

اسیر الفت صیاد ہوں غم راحت جاں ہے
قفس ہی میں نشیمن ہے قفس ہی میں گلستاں ہے (شارق)

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ کو ذوق عریانی
کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو (اصغر)

مجھے قبول نہیں ظرف عشق کی خامی
مرے جنوں کی ہے توہین شغل جامہ دری (شارق)

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے
ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے (اصغر)

ہمارے حفظ نشیمن کے حوصلے دیکھے
قریب سے تو کبھی برق بے اماں گزرے (شارق)

اٹھے عجب انداز سے وہ جوش غضب میں
چڑھتا ہوا اک حسن کا دریا نظر آیا (اصغر)

تمتما اٹھے عارض حسن پر بہار آئی
کر گیا حسیں ان کو اور بھی عتاب ان کا (شارق)

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی (اصغر)

لب پر ہے ان کے موج تبسم
ایسے میں کس کو تاب نظر ہے (شارق)

اصغر صاحب منفرد صناع ہیں ان کے کلام کی شادابی رعنائی انھیں دوسرے ہم عصر غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ تقابلی خاکہ اشعار کا اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اندازہ ہو جائے کہ شارق صاحب مضامین اور بیان میں اپنے استاد جگر مرادآبادی سے نہیں بلکہ اصغر صاحب سے قریب ہیں۔

جگر مراد آبادی کا تغزل مستی و سرشاری اور رندانہ بیباکیوں کے علاوہ ایک خاص لہجہ عاشقانہ رکھتا ہے۔ انھوں نے حُسن کی ہر ایک ادا کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ حسن سے بے جھجک اظہارِ شوق کرتے ہیں مثلاً

وہ مری عرضِ شوق پر منھ سے تو کچھ نہ کہہ سکے
چہرے پہ رنگ آگیا ہاتھ مرا دبا دیا

عرضِ غم نہ کر اے دل دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ اُدھر کر کے سُن لیا جواب اُن کا

یا۔ آستینوں کا وہ چڑھا لینا
گوری گوری کلائیاں توبہ وغیرہ۔

اصغر صاحب کے یہاں محبوب سے کھل کھیلنے کا انداز نہ ملے گا وہ معاملاتِ حسن و عشق کے بیان میں ایک تہذیبی رکھ رکھاؤ رکھتے ہیں۔ صوفیانہ بے نیازی کی شان اُن کے اشعار عاشقانہ میں نظر آتی ہے۔ شارق صاحب بھی طبعاً محتاط اور درویشانہ طرزِ زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنے استاد جگر صاحب کی طرح گوری گوری کلائیاں کیسے لکھ سکتے ہیں۔ جبکہ ان کی حیا جزوِ ایماں ہے۔ اس لیے جگر صاحب کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی وہ شوخ رنگ تغزل کی طرف رجوع نہ ہوئے۔ اور مزاجی تطابق و توافق کے زیر اثر اصغر صاحب کے سنجیدہ اسلوب کو اپنایا۔

آپ شارق صاحب کا مجموعۂ کلام "گل ریز" از اول تا آخر پڑھ جائیے کہیں بھی جگر کی رندانہ شوخی اور عاشقانہ بیتابی کا ہیجان نہ ملے گا۔ اگر ڈھونڈنے سے دو ایک شعر مل بھی جائیں تو وہ استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔

شاعر کی افتادِ طبع اور رنگِ کلام کا اندازہ نقوشِ فکر و خیال کی مجموعی صورت سے ہوتا ہے۔ یہ وضاحت ہمیں شارق صاحب کے اشعار کو پرکھنے اور سمجھنے اور ان کا درجہ متعین کرنے میں مفید ہوگی۔ میں نے شارق صاحب کے مزاج اور طرزِ سخن گوئی کی طرف جو اشارے کیے ہیں، کوئی بھی باذوق یا فطری شاعر "گل ریز" کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی تائید یقیناً کرے گا۔

اب میں شارق صاحب کی غزل گوئی کے وہ نقوش سامنے لانا چاہتا ہوں جو اِن کا فطری رجحان اور شاعرانہ کمال کا مظہر ہے۔ جسے تقلید نہیں بلکہ تخلیقی جوہر کہنا چاہیے۔ ان کے کلام میں پختگی اور فنی صلاحیت جگہ جگہ تقاضائے نظر کرتی ہے۔ شارق صاحب کی شاعری قنوطیت اور یاس انگیزی سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔ ان کی غزلوں میں عشقِ حقیقی اور محبتِ مجازی دونوں کے کوائف و حقائق جلوہ گر ہیں لیکن زیادہ تر رجحان عشقِ حقیقی اور مسائلِ تصوف کی طرف ہے۔ صالح روایات کا سرمایہ اُن کی غزلوں میں وہی ہے جو ترکے کے طور پر فارسی شاعری اور اردو کی اعلیٰ ترین غزلیہ شاعری سے متاخرین کو دستیاب ہوا ہے۔ شارق صاحب کی غزلوں میں جو جواہر پارے ہیں ان کی شان ملاحظہ ہو جہاں خود ان کا لہجہ اور ان کا اپنا مزاج اُبھر کر سامنے آتا ہے ؎

یہ رنج سہہ نہ سکیں گے ہم التفات کے بعد
حیات موت ہے ترکِ تعلقات کے بعد
ادائے ساقیٔ میخانہ حرفِ وعظ نہیں
ملے گا جام ہزاروں تکلفات کے بعد
ہمارے واسطے جلووں کو تو نے عام کیا
ہمیں سے پردہ ہے تخلیقِ کائنات کے بعد

یہ پوری غزل یہی شان اسلوب رکھتی ہے۔

مرجھائے ہوئے پھول کی تقدیر ہوں لیکن
کھٹکے جو کسی دل میں وہ کانٹا تو نہیں ہوں

اِس شعر میں اظہارِ تشنگی کے باوجود اخلاقی معیار کی حفاظت کی تاکید ہے کہ انسان کسی حال میں ہو لیکن دل آزاری اس کا شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔ علامہ اقبال نے انتہائے جنوں میں بھی حفظِ راز کی شان نمایاں کی ہے فرماتے ہیں ؎

باچنیں زورِجنوں پاسِ گریباں داشتم
درجنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

اس مضمون کو شارق صاحب نے یوں لکھا ہے ؎

مجھے قبول نہیں ظرفِ عشق کی خامی
مرے جنوں کی ہے توہین شغلِ جامہ دری

اردو میں یہ اکتساب کبھی ہو تو قابلِ ستائش ہے فارسی کے دوش بدوش اردو کو لے آئے ہیں۔ اشعار کی توضیح و تشریح کیفیاتِ شعری کو لفظوں میں منتقل کرنے پر قادر نہیں۔

شعر پڑھ کر یا سن کر باذوق شخص جس عالم میں کھو جاتا ہے اس کا مکمل اظہار وہ کرے تو کیونکر شعر جس فضا میں مرتب ہوتا ہے وہ ایک طلسمی عالم ہوتا ہے۔ جہاں تعین حقائق مشکل ہے، اگر وہ شاعر کی تخیلی دنیا میں رسائی بھی حاصل کرتا ہے تو وجدان کی لہریں اسے ایک مقام پر رہنے نہیں دیتیں۔ یہیں سے استعارہ و رمز و کنایہ کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ انھیں اجزا کی قوت سے تفہیمی امکانات رونما ہوتے ہیں اب باذوق قاری کے ظرف قبولیت پر منحصر ہے کہ وہ شعری صداقتوں کا عرفان حاصل کرلے۔ کچھ اور اشعار شارق صاحب کے ملاحظہ فرمائیں جن کی خوبیوں کا اندازہ صاحبِ ذوق کو ہو سکتا ہے ؎

قیس کی خاکِ سر دیں شائبۂ جنوں تو ہے
دوش ہوائے نجد پر رقصِ غبار ہی سہی
حسن سے مجھ کو کام ہے کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو
جلوۂ طور اگر نہیں روئے نگار ہی سہی

یہاں روئے نگار لباسِ مجاز میں جمالِ حقیقت دکھا رہا ہے اور بقولِ عارفانِ کامل دیارِ مجاز سے گزر کر ہی عاشق کی رسائی منزلِ حقیقت تک ہو سکتی ہے۔ غالب کی غزل کا مطلع ہے ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

اسی زمین میں شارق صاحب کی فکرِ کامل کے نمونے دیکھیے ؎

فریبِ شادمانی سے طبیعت شادماں کیوں ہو
قفس کا نام تہذیبِ چمن میں آشیاں کیوں ہو

عصرِ حاضر کے فریبِ تسکین پر کتنی بھرپور چوٹ ہے اور فنکارانہ صناعی کے ساتھ اسی کو استادی یا قادر الکلامی کہتے ہیں ؎

یہ سیلِ اشک یہ ہنگامۂ آہ و فغاں کیوں ہو
محبت ہے تو پھر اس کی جفا دل پر گراں کیوں ہو

مضمون نیا نہیں ہے لیکن بیان کی گرمی اور زبان کی پرکاری ذہنِ قاری میں جگہ بناتی ہے ؎

یہ نظارہ کبھی غیرت گوارا کر نہیں سکتی
ہمارا آشیاں ہوتے ہوئے برق تپاں کیوں ہو

یہ بات تو کائنات میں تنظیمِ مشیت پر تنقید کی حیثیت رکھتی ہے یعنی بہار ہے تو خزاں کیوں ہے شادی ہے تو غم کس لیے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا جواب سوا خاموشی اور کیا ہے لیکن زنجیرِ جبر میں جکڑا ہوا انسان یہ سوال کرتا ہی رہے گا۔ آگے کہتے ہیں ؎

نری بخشی ہوئی جب زندگی ہے خالقِ عالم
تو پھر اک اک نفس پر زندگی کا امتحاں کیوں ہو

اس شعر میں بندے کا شکوہ اپنے خالق سے عجب انداز رکھتا ہے۔ امتحاں کیوں ہو میں استفہام بڑی معنویت کا حامل ہے اس موقع پر علامہ اقبال کا شعر جوان کے مشہور مسدس جوابِ شکوہ میں ہے یاد آیا ؎

شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تونے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تونے

مندرجہ ذیل اشعار بھی حسنِ سخن کی تصویر ہیں ؎

جمالِ یار کی تنویر مدھم ہوتی جاتی ہے
فراست جتنی بڑھتی ہے نظر کم ہوتی جاتی ہے
چمن کی صبح میں لاکھوں حیات افروز جلوے ہیں
یہ کیوں تیری نظر محدودِ شبنم ہوتی جاتی ہے

شعر آخر میں بڑی بصیرت افروز بات کہی گئی ہے۔
یہی بات قولِ غالب میں دیکھیے ع

کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

غالبؔ نے پہلے مصرع میں آزارِ حسد کی دوا تجویز کی تھی۔ لیکن میں نے یہاں صرف دوسرے مصرع سے معنوی تاویل کی ہے۔ جو شارقؔ صاحب کے شعر کے ایک پہلو کی وضاحت کرتا ہے۔

یہ بھی شعر دیکھئے حسنِ بیان کا نادر مرقع ہے ؎

اب بُت پرستیوں پہ کیوں برہمی ہے اتنی
کس نے کہا تھا تجھ سے جانِ مجاز ہو جا

اور پھر مشاہدۂ جمال کو عبادت کے درجے تک پہنچاتے ہیں ؎

ہر پنکھڑی جب اس کا جلوہ بنی ہوئی ہے
دامانِ گل پہ شارقؔ محوِ نماز ہو جا

ملتی رہیں اے کاش یونہی اُن سے نگاہیں
بے نقط و بیاں لذتِ پیغام بہت ہے

سرمایۂ کونین دو عالم کو مبارک
عاشق کو تری یاد ترا نام بہت ہے

کسے خبر ہے کہ کتنے معاملاتِ حسین
مری نظر ترے عارض کے درمیاں گزرے

دیکھا آپ نے بیانِ حسن و عشق پر متانت کے کتنے باوقار پردے پڑے ہوئے ہیں اور یہ ہے شارقؔ صاحب کا مزاج جس کا تعارف میں نے ابتدائی سطور میں کر دیا ہے۔

کہیں کہیں غزلوں میں شارقؔ صاحب کا لہجہ پُرشکوہ اور بلند آہنگ ہو گیا ہے لیکن یہ مقام وہ ہے جہاں زمینِ غزل ردیف و قوافی کی پابندی سے بوجھل صوت کی حامل ہو جاتی ہے ورنہ عموماً ان کی غزلیں خشک و بے کیف نہیں خود ان کا کہنا ہے ؎

غزل وہی ہے جو ہو شاخِ گل فشاں کی طرح
اثر ہو جس میں جمالِ پری رُخاں کی طرح

یعنی سبک اور گوارا تراکیب کے ساتھ زبان میں نرمی اور شیرینی ضروری ہے جو صنفِ غزل کا مخصوص تصور ہے۔ مزید یہ کہ غزل میں حسن و محبت کے دلکش مضامین غزل کو دوسری اصناف سے ممتاز کرتے ہیں۔ حُسن و محبت کے علاوہ اخلاقی و سیاسی مضامین بھی زینتِ غزل بنتے ہیں لیکن ان میں شعریت نہ پیدا ہو تو واعظانہ کلام کی شان نمایاں ہوتی ہے ایسے روکھے پھیکے اشعار کا وجود غزل جیسی صنفِ حسین و جمیل پر فنکارانہ ظلم ہے آج کل جدید غزل کے علمبرداروں کے یہاں بنامِ غزل نظم انگڑائیاں لیتی ہے۔ ابہام ناروا اور منظر نگاری کے بھی سہارے لیے جاتے ہیں۔

خیر یہ بھی سہی روحِ تغزل تو باقی رہے۔ خارجیت اور داخلیت کا امتزاج اگر حسنِ اتفاق سے راس آجائے تو اسے اعجازِ سخن سمجھنا چاہیے افسوس تو یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے تا ایں دم معیارِ سخن کی ایسی صورتیں سامنے آئی ہیں کہ میرؔ و غالبؔ و مومنؔ کے اسالیب کو اختیار کرنے والے شعراء کی منزلت معرضِ خطر میں پڑ گئی ہے۔

شارقؔ صاحب اپنے بزرگوں کی روایات کو اپنائے ہوئے آبیاری کشتِ سخن میں مصروف رہے اور غزل گوئی کا حق ادا کرتے کرتے زندگی کی آخری منزل سے گذر گئے۔ موجودہ دور میں ان کی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں پر منصفانہ رائے دینے والے کم ہی ملیں گے۔ لیکن ملیں گے ضرور یہ سرمایۂ کلام ضائع نہیں جائے گا۔

قدرت ہمیشہ انواعِ داقدار کی حفاظت کا سامان کرتی رہی ہے اور یقیناً مستقبل میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ جناب شارقؔ ایرایانی کی بلند پایہ شاعری انھیں حیاتِ دوام بخشے گی اور وہ ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے مانے اور پہچانے جائیں گے۔ آیئے میری اس ہرزہ سرائی کے بعد کچھ منتخب اشعار شارقؔ صاحب کے ملاحظہ فرمائیے جو میرے دعوے کی تصدیق کریں گے ؎

سمجھ رہے تھے کہ آساں ہے عشق کی منزل
حواس اڑنے لگے گردِ کارواں کی طرح

سخن شناس نہ ہوں جس مقام پر شارقؔ
وہاں ہیں شعر و غزل جنسِ رایگاں کی طرح

تباہ کر کے رہے گی خرد کی حیلہ گری
کہ عہدِ نو ہے شکارِ کمالِ بے بصری
بھٹک رہا ہے بشر فلسفے کی راہوں میں
نہاں ہے فکر و نظر سے حقیقتِ بشری

یہ جمالِ شب یہ حسیں فضا، مرے دل سے کون یہ کہہ گیا
کہ حجابِ ماہ و نجوم میں کوئی مستِ ناز ضرور ہے
کیسے خبر ہے کہ کتنے معاملاتِ حسیں
مری نظر ترے عارض کے درمیاں گزرے

مانا بہت سبک ہوں جہاں کی نگاہ میں
کیا کم ہے یہ کہ بارِ کسی پر نہیں ہوں میں
کافی ہے عمر بھر کے لیے اک نگاہِ ناز
محتاجِ التفاتِ مکرّر نہیں ہوں میں
شارقؔ کمالِ فن کی ابھی تک ہے آرزو
جو خود فریب ہو وہ سخن ور نہیں ہوں میں

جو سازِ حقیقت میں تھے آرمیدہ
میں سنتا ہوں وہ نغمۂ ناشنیدہ
نسیم آکے چپکے سے کیا کہہ گئی یہ
چمن کا چمن ہے گریباں دریدہ

رسوائی نگاہِ محبت نہیں قبول
جلوؤں کا بے پناہ تقاضا ہی کیوں نہ ہو

یونہی تخاطب بیگانگی رہے قائم
خدا کرے کہ وہ میری نظر نہ پہچانے
عشق آثار و نشانات کا پابند نہیں
سجدہ کیا ہے جو ترا نقشِ کفِ پا ملنے

رفعت ہے اس کی دسترس دو جہاں سے دور
ہم فکرِ آستاں ہیں وہ ہر آستاں سے دور
قسمت کہاں کہ پھولوں سے دامن کو بھر سکوں
ہیں گلستاں میں رہ کے بھی ہوں گلستاں سے دور

ملاحظہ فرمایا آپنے شارقؔ صاحب کا رنگِ تغزّل جس میں فنی استحکام کے ساتھ ساتھ خوشگوار اسلوب بیان اور معتبر زبان کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ ناہمواریوں اور رکاکت کا پورے کلام میں نشان نہ ملے گا۔ میرا یہ مختصر مضمون اور سمٹا ہوا انتخابِ اشعار دراصل ایک ادبی تحریک ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ نظر اور صاحبانِ فن اس طرف توجہ فرمائیں اور شارقؔ صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈال کر ادبی دیانت کا ثبوت پیش فرمائیں جو دوسرے باصلاحیت شعراء کے لیے باعثِ حوصلہ افزائی ہو۔ ادب و شعر کی دنیا میں تخلیقی مظاہرہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ کمالِ فن کے پرکھنے والے کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں اپنی قیمتی رائے سے دنیائے ادب کو آگاہ کریں۔

★

سرکتے براعظم : صفحہ ۱۳ کا بقیہ

گولے کی جسامت بڑی ہوگئی اور درمیانی تہہ چھوٹی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درمیانی تہہ میں حرارت کی رو کے جو بڑے بڑے چکر تھے وہ کئی حصوں میں بٹ گئے اور چھوٹے چکر وجود میں آگئے۔ جیسے جیسے درمیانی تہہ کا بھاری مادہ مرکزی گولے میں منتقل ہوتا گیا (یا یوں کہئے کہ درمیانی تہہ پتلی ہوتی گئی) حرارت کی رو کے چکروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اب زمین کی درمیانی تہہ میں ایسے ۳۱ چکر ہیں۔ ان چکروں کے ذریعہ درمیانی تہہ کا مادہ جب گردش کرتے ہوئے اوپر کو آتا ہے، تو زمین کے پوست میں (جو ہلکے مادے کا بنا ہے) کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اس کھنچاؤ کی وجہ سے براعظم ٹوٹ جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں لیکن اس تبدیلی میں کروڑوں سال لگتے ہیں۔

•••

عشرت ظفر
روزنامہ "انوار قوم"
۱۰۵/۶۵۴ فہیم آباد۔ کان پور

محمد علی جوہر

دیکھنا ہے پھر مجھے فکرِ فلک رس کا جمال !
کیوں نہ دل کی آگ سے دستِ سخن روشن کروں
مہر برلب ہے فضا کا شہر چھایا ہے جمود
چھیڑ دوں ساز محبت نغمۂ ہستی سنوں
نام اس مردِ مجاہد کا ہے پھر وردِ زباں
کانپ اٹھا جس کی صدا سے آمریت کا جنوں
جوہرِ شمشیرِ حق پوشیدہ تھا تقریر میں
گرچہ ظاہر نہیں تھا وہ مانندِ بحرِ پرسکوں
اس کے دم سے تھی چمک آئینۂ احساس میں
ہر رگِ انسانیت میں دوڑتا تھا مثلِ خوں
جانِ ملک و قوم فخرِ مشرق و مغرب تھا وہ
کر دیئے اس نے انانیت کے پرچم سرنگوں
رزم گہ میں صورتِ تیغِ یداللّٰہی رہا
حسنِ شمعِ بزم تھا اس کے عزائم سے فزوں
عکسِ اخلاقِ محمد اس کا طرزِ گفتگو
ریزہ ریزہ جس سے ہو جاتا ہے باطل کا فسوں
کٹ گئی زنجیر لیلائے وطن کے پاؤں کی
صرف کام آیا اسی کا شعلۂ سوزِ دروں
ہے لبوں پر نغمہ سنجانِ چمن کے اس کا نام
میں بھی عشرت قولِ شاعر آج دوہراتا چلوں
"عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں"

شاہد ساگری
ندیم اسٹورس ۱۱ قاضی کیمپ
بھوپال

تضمین بر غزل میر انیس

غزل میں ڈھال کے احساس کے نگینوں کو
فسانہ دل کا سناتے ہیں مہ جبینوں کو
تلاشِ نور میں کرتے ہیں چاک سینوں کو
"سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو"

ہمیں تو مار ہی ڈالا ہے اس فقیری نے
یہ دن دکھائے زمانے کی سخت گیری نے
نکما کر کے ہی چھوڑا غمِ اسیری نے
"یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو"

اتر رہے ہیں مرے ذہن و فکر میں اشعار
بطورِ خاص ملی مجھ کو قدرتِ اظہار
کھلا رہا ہوں میں بنجر زمین میں گلزار
"لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو"

ازل سے اُلفتِ آوارگی ہے فطرتِ دل
تلاش کرتا ہی رہتا ہے شوق کی منزل
بہ فیضِ درد ملا اس کو جذبۂ کامل
"بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جب زمینوں کو"

غمِ زمانہ کو شاہد سمجھئے اپنا غم
یوں ہی تو منزلِ مقصود ہوگی زیرِ قدم
بہم ہیں گلشنِ ہستی میں شعلہ و شبنم
"خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"

نیرادروی
[illegible]
[illegible]



ڈاکٹر حکم چند نیر نے علیم سرور کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک اصولی بات بتائی کہ ——

" شاعری میں جب فکر جذبہ بن کر اور تجربہ جمالیاتی احساس کا روپ دھار کر نمودار ہوتا ہے تو شاعری زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار حالات و تجربات کا سچا جمالیاتی احساس فراہم کرتی ہے "

میں نے اسی اصول پر علیم سرور کی شاعری کو پرکھا اور ان کے کلام کا جائزہ لیا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ یہ اصول سرور کی شاعری پر پوری طرح منطبق ہے، ان کا کلام گہری فکر کا نتیجہ اور جذبات محبت کا ترجمان ہے۔ ان کے ہاں طرز بیان کا حسن اپنی تمام رعنائیوں اور شادابیوں کے ساتھ موجود ہے، عشق و محبت کا لذت انگیز ذکر چھڑے اور شاعر سطحیت سے دامن بچالے جائے یہ اس کے کمال فن کی دلیل ہے، سرور اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

زندگی جب محبت کے کوچے میں قدم رکھتی ہے تو بہار و خزاں، شعلہ و شبنم شیشہ و سنگ، عنایت و شکایت، پھول اور انگارے جیسے متضاد عناصر سے مرکب حالات و واردات سے دوچار ہوتی ہے، زندگی ایسے دور سے گذرتی ہے کہ درد بھی ہے اور سکون بھی، غم بھی ہے نشاط بھی، شکایتیں بھی ہیں اور کرم فرمائیوں کا اعتراف بھی انھیں کیفیات و واردات کی نفسیاتی تحلیل و تجزیہ اور تفسیر و بیان غزل کی روح ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ یا تو اس کے یہاں اتنی سرمستیاں اور سرشاریاں نظر آنے لگیں گی کہ سطحیت و رکاکت کی حد کو پار کر جائے یا فکر و ادراک میں قوت پرواز نہیں تو خیالات و تصورات کی بھول بھلیوں میں شاعر خود کھو جائے گا اور ترسیل کی ناکامی اس کے فکر و فن کی آبرو خاک میں ملا دے گی۔ اسی لئے غزل کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آج جتنی اردو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان میں ۵، فیصد غزلوں کے مجموعے ہوتے ہیں کیوں کہ اس سے زیادہ سہل کوئی صنف نہیں، ادب کے بازار میں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی ادیب یا نقاد ان دیوانوں کی ورق گردانی کی زحمت اٹھاتا ہے اور در خور اعتنا سمجھتا ہے، غزلوں پر غزلیں پڑھتے جائیے کہیں بھی کیفیت سے آپ کا سابقہ نہیں پڑیگا کہ آپ شعر کی گہرائیوں اور معنویت کی پہنائیوں میں کھو جائیں۔

محبت ایک پاکیزہ جذبہ کا نام ہے، اس لئے طرز اظہار و بیان بھی پاکیزہ ہونا چاہیئے مگر بات بادہ و ساغر کہے بغیر نہیں بنتی اس لئے کبھی کبھی اچھا شاعر بھی بہک جاتا ہے، اس دشوار گذار اور نازک راہ پر وہی شاعر کامیابی سے گذر سکتا ہے جس کا کمال فن شعور و ادراک کی توانائیوں سے بہرہ ور ہو، الفاظ اور زبان و بیان پر اس کی گرفت مضبوط ہو ابتذال و رکاکت کی حدود سے واقف، ذوق سلیم اور وجدان صحیح کا مالک ہو، اس سلسلہ میں کامیاب ہونے والے شاعروں میں علیم سرور کا نام بے تکلف لیا جا سکتا ہے۔

ان کے کلام میں تغزل اپنی تمام رعنائیوں اور شادابیوں کے ساتھ موجود ہے پاکیزگی خیال کے ساتھ طرز ادا کی پاکیزگی نے ان کی شاعری کو چار چاند لگا دیتے ہیں، سرور کی شاعری صحیح معنوں میں غزل کی شاعری ہے اور غزل کی لغوی اور اصطلاحی تعریف اس پر صادق آتی ہے اس لئے ان کا دیوان واردات محبت کا چمن زار ہے جس میں ہر رنگ کے پھول ہیں، ان کا ہر شعر داستانِ محبت کے کسی نہ کسی پہلو کی نشاندہی کرتا ہے آغاز محبت سے انجام تک کی ایک جھلک میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ان کی شاعری میں تغزل کی پوری دلکشی موجود ہے۔ داستانِ محبت کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے سرور کو یہ احساس ہے کہ اس آغاز کا کوئی انجام نہیں ہوتا وہ کہتے ہیں ؎

تمام عمر وہ قصہ نہ ہوگا ختم کبھی　　　تم اک نظر سے گئے جسکی ابتدا کر کے

یہ آغاز قطعی فطری ہے محبت کی ابتدا صرف ایک نظر ہی سے ہوتی ہے، لیکن آغاز محبت کی سرشاری و سرمستی اور کیف و نشاط کا عالم یہ ہوتا ہے کہ انجام کی فکر کہیں

گذر نہیں ہوتا، مستقبل کے خطرات کا تصور بھی نہیں ہوتا، ایک نشہ سا سارے وجود پر چھا جاتا ہے، سرور کہتے ہیں ؎

یں محو عرضِ حال، وہ محوِ سکوت شوق　　انجام چھوڑیئے، ابھی آغاز دیکھیے

محوِ سکوت شوق "کے ساتھ" ابھی آغاز دیکھیے "میں جو کیف و سرور، جذبات کی شوریدگی اور معنویت کی وسیع دنیا ہے اس پر غور کیجئے، کتنا سرشارانہ انداز بیان ہے اور کتنا تیکھا تیور ہے؟ اجمال تفصیل سے، ابہام تشریح سے کہیں زیادہ حسین اور خوبصورت ہے کچھ نہ کہتے ہوئے سب کچھ کہہ دیا،

محبت زیادہ دیر تک یکطرفہ نہیں رہتی، آغاز محبت کی کیفیتیں اور سرشاریاں ایک طوفان جذبات بن کر دونوں دلوں پر چھا جاتی ہیں، سرورؔ فطرت انسانی کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں ؎

خود حسن کو تلاش تری اک نظر کی ہے　　دیوانے! تیری شان بھی دیوانہ گری ہے

ناز و نیاز کی حد بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں، یہ آگ ایک دل میں سلگتی ہے تو دوسرے دل میں اس کا دھواں اٹھتا ہے یہ قانون فطرت ہے، سرورؔ اس راز سے واقف ہیں اس لئے "دیوانہ" کو "دیوانہ گر" کا مقام بلند دے سکتے ہیں۔

محبت کا آغاز ہمیشہ ایک سمت سے ہوتا ہے چاہے وہ لمحہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، لیکن پہلے مرحلہ پر یکطرفہ محبت کا یہ احساس بڑی شدت سے جاگتا رہتا ہے شکوک و شبہات کی تاریکیوں میں مستقبل کھویا ہوا رہتا ہے، سرور کہتے ہیں ؎

نازک بہت تھا مرحلۂ ابتدائے عشق　　دے آئے تھے دل انکو انھیں بچھا کے ہم

مگر یہ راز زیادہ دیر تک راز نہیں رہتا، محبت دبے پاؤں ایک دوسرے خانۂ دل پر بھی اپنا قبضہ جما لیتی ہے اور جب دو دلوں نے ایک ساتھ شاہراہ محبت پر قدم بڑھا دیا تو گرد و پیش کے ہزاروں خطرات کا احساس کئے بغیر قدم آگے ہی بڑھتا جاتا ہے، شک و شبہ کی نگاہیں پیچھا کرتی ہیں لیکن عمر کا زمانہ وہ ہے جب ہوش سے زیادہ جوش اور حالات سے زیادہ جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے نئی نئی عمریں، شباب و شعر کی نئی نئی کہانی کا آغاز کئی خطرات کو جنم دیتا ہے لیکن یہ احساس بہت دیر میں ہوتا ہے، سرور نے بتایا ؎

رسوائیوں کی سمت نہ تھی فرصت نظر　　کچھ تم نہ سنتے تھے کچھ ہم نہ نے

محبت اور رسوائی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اب احتیاط کی منزلیں شروع ہوتی ہیں، بے اعتنائیوں کے مرحلے آتے ہیں، اظہار بے نیازی کے ساتھ شکوہ و شکایت تک بات آجاتی ہے لیکن خلوص و محبت کی شوریدگی میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے، شکوہ کے بجائے تشکر و امتنان کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو خلوص و محبت کی سب سے کھری کسوٹی ہے، اس لئے سرور بھی بڑے فطری انداز میں ہم کو یہ روداد سناتے ہیں ؎

اس بات پہ دل شکر سے معمور نہ کیوں ہو　　جو بات بھی ان کی بے شکایت بھری ہے

شکایت تعلق کی علامت ہے، سرور اس راز سے واقف ہیں اس لئے شکوہ و شکایت سے کبیدگی نہیں محسوس کرتے بلکہ اسے محبوب کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتے ہیں کیوں کہ شکوہ و شکایت سے ربط و تعلق کا اعتراف تو ہے، غیروں سے شکایت کون کرتا ہے؟ لیکن عشق کو بھی وہ اپنے مقام سے نیچے اترنے نہیں دیتے حسن کا مقام ضرور بلند ہے اور بہت بلند ہے لیکن عشق بھی اپنی خودی کو فراموش نہیں کر سکتا، نگاہ کرم کا وہ سوالی بن سکتا ہے لیکن حقیر و ذلیل بن کر نہیں بلکہ خودداری کے جوہر کے ساتھ، پستی کا بلندی سے، خزاں کا بہار سے ربط و تعلق ممکن ہی نہیں، محبت کی شان اور عشق کا مقام اس سے بلند و برتر ہے، سرور کہتے ہیں ؎

بس اک نظر کے لئے یوں لئے ہوں کاسۂ دل　　کہ جیسے مانگے کوئی بھیک جام جم لے کر

جام جم لے کر بھیک مانگنے والا بھی اپنا ایک مقام رکھتا ہے، محبت میں یہ احساس فنا ہو جائے تو حسن کی آبرو پر حرف آجائے، یہ محبت نہیں محبت کی توہین ہے محبت کی ارتقائی منزلوں میں بدگمانیاں بڑھتی ہیں، دوریاں پیدا ہوتی ہیں، دونوں طرف احتیاط کے تقاضے بڑھتے ہیں، تعلق پر بے تعلقی کے پردے ڈالے جاتے ہیں دل کے تقاضے کچھ اور ہیں اور طرز عمل اس سے مختلف اور جداگانہ، سرور کہتے ہیں ؎

ہزاروں بار میری خیریت پوچھی بہ غیر دل سے　　مگر کترا گئے جب سامنا ہونے کا وقت آیا

دوسروں سے خیریت پوچھنا اور سامنا ہونے پر کترا جانا گو کہ ایک لذت انگیز واردات محبت ہے، مگر یہ طرز عمل مجبور کرتا ہے کہ دوسری طرف سے طرز عمل بدلے خودداری کو ٹھیس نہ لگے لیکن شرط یہ ہے کہ راہ وفا سے قدم بھی نہ ہٹے، سرورؔ نے کہا ؎

وفا کی لاج بچانے کے واسطے ہمدم　　دیا ر دوست سے گذرا ہوں بے وفا کی طرح

پھر محبت میں اس سے بھی سخت مقام آتے ہیں، یاس و نامرادی دل و دماغ پر چھا جاتی ہے، دماغ الجھا الجھا، دل بجھا بجھا سا رہتا ہے، لب بند، زبان خاموش یہ مجبوری حالات کتنی کربناک ہے، سرور کی زبان سے سنئے ؎

پ ہوں سامنے' اور آپ سے کچھ بات نہ ہو — دشمنوں کو بھی یہ مجبوریِ حالات نہ ہو

درد و کرب کے یہ لمحات دل کا سکون لوٹ لیتے ہیں، آرزوؤں کا دم گھٹنے لگتا ہے، مایوسیوں کا گھنا اندھیرا ہر طرف چھا جاتا ہے، زندگی بے کیف ہو کر رہ جاتی ہے، یاس و قنوطیت مرگِ مسلسل کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو گزرے ہوئے دنوں کی یاد آتی ہے، سرور کہتے ہیں ؎

نصیب آرزو اب ہم نشیں! مرگِ مسلسل ہے — جو دن تھے زندگی کے ان کی گلیوں میں گزار آئے

خود رفتگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آدمی اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتا ہے ؎

بس ایک بار ملی تھی دیارِ جاناں میں — پھر اس کے بعد نہیں مجھ کو زندگی کی خبر

محبت میں مکمل یاس کفر ہے، مایوسیوں کے گھنے اندھیرے میں بھی امید کی ایک ننھی سی کرن ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہتی ہے، سرور محسوس کرتے ہیں کہ حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں آخر ایک دن یہی کرن تمناؤں کا روشن آفتاب بن کر چمکے گی، قدم قدم پر یہ احساس یقین بن کر جاگتا رہتا ہے جیسے اندھیری رات میں جگنو کی چمک، جگنو کے وجود کی غمازی کرتی رہتی ہے، بظاہر حالات ناسازگار ہیں لیکن باطن میں امید کی کرن بھی یہی کہیں چھپی ہوئی ہے سرور کہتے ہیں ؎

جدھر وہ محوِ سخن ہیں' ادھر ہی سب کچھ ہے — جدھر ہے روئے سخن' اس طرف نظر بھی نہیں

باتیں کسی اور سے ہوں اور روئے سخن کسی اور طرف، اس لذت سے وہی واقف ہو سکتا ہے جو محبت آشنا ہے، امید کی کرن اسی طرزِ عمل سے پھوٹتی ہے اور یہی جینے کا حوصلہ دیتی ہے، بالآخر کرم کا آغاز ہوتا ہے، الطاف و عنایات کی پھوار پڑنے لگتی ہے، سرور اس مقام و منزل سے پہلے ہی واقف تھے مگر اس کا اظہار اس وقت کرتے ہیں جب الزامِ محبت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے، محبت کی یہ روداد خود ان کے لفظوں میں سنئے ؎

سب کو الزامِ محبت پہ تعجب کیوں ہے — ہم تو آگاہ تھے آغازِ کرم سے پہلے

محبت جب یاس کی دلدل سے نکل کر آگے بڑھتی ہے تو اس میں نیا جوش اور نئی تازگی ہوتی ہے، اور یہ کیفیت اس طرح دل و دماغ پر چھا جاتی ہے کہ پورا وجود اس میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، سرمستی و سرشاری جنوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے کیوں کہ جوشِ مسرت کا یہی تقاضا ہے سرور نے کہا ؎

الٰہی! جیب و گریباں کی خیر ہو کہ جنوں — اٹھا ہے سایۂ زلفِ حسیں میں دم لے کر

مسافر جب کڑی دھوپ میں چل کر کسی گھنے سایہ میں دم لے کر پھر سفر کا آغاز کرتا ہے تو قدرتی طور پر اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے کیوں کہ اس میں ایک نیا جوش اور نئی امنگ پیدا ہو جاتی ہے مسرور اس فطرتِ انسانی سے واقف ہیں، زلفوں کی گھنی چھاؤں سے نکلنے پر کیف و سرور کا جو عالم ہے اس پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں اتراتے ہیں، لطف لیتے ہیں اور خود فراموشی میں خود سے ہی سوال کرتے ہیں ؎

کل رات جو میں گذرا، اک نور کا تڑکا تھا — مسرور بتاؤ تو وہ کس کی گلی ہو گی ؟

"مسرور بتاؤ تو وہ کس کی گلی ہو گی" ابہام نے شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ؟

آغازِ کرم دیکھ کر تمناؤں نے پاؤں پھیلائے، جرأت بڑھی، تو اظہارِ تمنا کا کتنا فطری اسلوب اختیار کرتے ہیں، محبوب سے کہتے ہیں ؎

بس ایک تمنا ہے جس کے دلِ ویراں میں — سوچو تو ذرا کتنے نازوں کی پلی ہو گی

اظہارِ تمنا کے بعد خالقِ محبت کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور منت مانتے ہیں ؎

مراد مانگی ہے پوری ہوئی اگر مسرور — چلیں گے کعبہ کو پہلو میں اک صنم لے کر

معلوم نہیں مسرور نے اپنی یہ منت پوری کی یا نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی قسمت جاگی اور ان کی مراد پوری ہوئی اور اسی پر ان کی داستانِ محبت تمام ہو جاتی ہے، مسرور کہتے ہیں ؎

آگئی نیند اسے تقدیرِ تمنا جاگی — اس نے زانو پہ مرے رکھ دیا سر آخرِ شب

میں نے ایک سرسری مطالعہ کے بعد مسرور کے یہ اشعار نوٹ کئے ہیں جن کی ترتیب سے ایک داستانِ محبت مرتب ہوتی ہے، مسرور کی پوری شاعری اسی داستانِ محبت کے مختلف اجزا کو خوبصورت الفاظ و بیان کا قالب عطا کرتی ہے، ان کا طرزِ اظہار دلوں کو چھو لینے والا اور جذبات و احساسات کو جگا دینے والا ہے، اس کہانی میں واردات و کیفیات کے جتنے نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ اور پیچ و خم آتے ہیں ان کی نہایت خوبصورت اور پاکیزہ ترجمانی کرتی ہے، اس میں درد و غم اور سوز و گداز کے مرقعے بھی ہیں، نشاط و انبساط اور کیف و سرور کی حسین تصویریں بھی، یاس و نامرادی کے تلخ لمحات بھی آئے ہیں اور کامرانی و شادمانی کی لذیذ ساعت سعید بھی، اس میں غمِ فراق کی کڑی دھوپ بھی ملتی ہے اور زلفِ عنبریں کی سکون بخش ٹھنڈی چھاؤں بھی، غرضیکہ ان کے کلام میں ایک پاکیزہ محبت کی پاکیزہ ترجمانی ہے اور محبت کے تمام فطری جذبات و احساسات، واقعات و واردات کی صحیح اور خوبصورت عکاسی ہے اور داستانِ محبت کے وہ تمام ضروری اور اہم عناصر ہیں جن سے مل کر ایک داستانِ محبت وجود میں آتی ہے اس لئے میں مسرور کو شاعرِ محبت کہتا ہوں اور درحقیقت یہی غزل کی شاعری ہے، انھیں واردات و کیفیات کا بیان تغزل کی جان اور اردو غزل کی آبرو ہے ●

غزلیں

نصیر پرواز
N2/1092/8
گووند پورا - بھوپال

مرے قریب سے جب بھی کوئی زمانہ گیا
سُنا کے مجھ کو مری ذات کا فسانہ گیا

بدن کا عکس بنے راستے کے سناٹے
لہو بجھا تو وہ اندازِ خسروانہ گیا

گزر گئے کئی ہجر و وصال کے موسم
تری نظر سے مگر رنگِ آشنا نہ گیا

کسی نے چھُو کے نہ دیکھی بدن کی شادابی
میں وہ صدا ہوں جسے پاس سے سُنا نہ گیا

میں ذرّہ ذرّہ سرِ خاک مضطرب بکھرا
مرے عمل سے مگر جذبۂ انا نہ گیا

زمیں کو چھونے لگیں گھر کی اونچی دیواریں
تری نگاہ کا وہ لطفِ دلبرانہ گیا

کہیں بھی لے کے چلو اب نہیں کوئی خواہش
خیال و خواب کا وہ دل نشیں زمانہ گیا

خود اپنے آپ کو ہم اجنبی سے لگنے لگے
ہمارے گھر سے ہمارا ابھی آب و دانہ گیا

حیات ڈوبتی سانسوں میں کھو گئی پرواز
کوئی بھی تیر ترے ظلم کا خطا نہ گیا

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ

وہ نظر چپکے چپکے بلاتی رہی
اس کی آنکھوں سے آواز آتی رہی

باس مہندی کے پھولوں کی آتی رہی
اس کی یادوں کی خوشبو ستاتی رہی

میری آنکھوں میں پانی چمکتا رہا
اک شکارے میں وہ دف بجاتی رہی

ہم کہ اس کے وفادار رقاص تھے
زندگی انگلیوں پر نچاتی رہی

صبحِ تازہ کی ہر زعفرانی کرن
ریشمی وادیوں کو جگاتی رہی

بال چاندی میں تبدیل ہوتے گئے
چاندنی اپنے پردے گراتی رہی

چڑھتے سورج نے لمحوں میں پگھلا دیئے
بے حسی برف کے پل بناتی رہی

ہم چراغوں کے چہرے سجاتے رہے
سامنے کی ہوا آتی جاتی رہی

پاسباں جم کے تسنیم دیکھا کیے
اور نفرت گھروں کو جلاتی رہی

عرفان عباسی
۱۹/۱ باغ منو۔ نیا گاؤں
لکھنؤ



چودھری پربھان شنکر سروش اناوی

• قدرے دبلی قامت۔ بھرا بھرا دوہرا اور گٹھا جسم۔ سڈول بازو۔ چہرہ پر متانت وسنجیدگی کی تہیں۔ روشن اور مسکراتی آنکھیں۔ پتلے اور بھینچے ہونٹ ان پر ہمہ وقت معصوم سی مسکراہٹ نرم وشیریں لہجہ۔ نپے تلے الفاظ۔ گفتگو میں رس۔ چال ڈھال میں سلامت روی۔ برتاؤ میں یگانگت۔ موزوں شیروانی۔ ٹوپی اور تنگ موہری کے پاجامے میں ملبوس۔ یہ تھے چودھری پربھان شنکر سروش اناوی۔ وضع داری ان کا حصہ تھا اور ٹوٹ کر ملنا، اخلاق ومروت کا گرویدہ بنا لینا ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو۔ وہ اردو شعر اردو ادب کی اس نسل کی آخری نشانیوں میں تھے جو زبان کی تہذیب۔ آداب مجلس اور شائستگی اور متانت کا نمونہ تھی۔ ان قدیم اقدار کے دلدادہ تھے جو اب زینت طاق نسیاں بن چکی ہیں۔

سروش ضلع سیتاپور سے ضلع اناؤ منتقل ہونے والے علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز کایستھ خانوادے کے معزز فرد نامور شاعر وقانون داں چودھری جگت موہن لال رواں (متوفی ۱۹۳۴ء) کے گھر اپریل ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے اور علمی و ادبی ماحول میں پرورش پاکر پروان چڑھے۔ ابتدائی سے ہائی اسکول تک تعلیم اناؤ میں حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ بی۔ این۔ ایس۔ ڈی کالج کانپور سے کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر فارسی وانگریزی میں ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کرکے اناؤ میں وکالت شروع کی جلد ہی ضلع کے ممتاز وکلاء میں شمار ہونے لگے۔

کایستھ گھرانوں کی روایتی علم وادب دوستی، محبت اور گہرے لگاؤ کے ساتھ ذوق سخن انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ والد ماجد چودھری جگت موہن لال رواں اپنے دور کے مشہور، مقبول قادرالکلام اور مایہ ناز شاعر تھے۔ تمام اصناف شاعری پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے اور نامور استاد مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ استاد کو ان کی غیر معمولی صلاحیتوں پر بڑا ناز تھا انھوں نے اپنے عزیز ترین شاگردوں کا ذکر یوں کیا تھا۔

جوشؔ واثرؔ رواںؔ وجگرؔ کیفیؔ ونشاطؔ
یہ کل ہیں میرے گلشن بے خار کے لئے

سروش نے جس شعر انگیز فضا میں آنکھ کھولی وہ شعر وسخن کی دنیا تھی۔ خاندانی علم وفضل، رواں کی شہرت وعظمت کے تذکرے اور فطری ذوق وذہانت نے جودت طبع کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور وہ دنیائے شعر وادب میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے۔ ان کے کنبہ کی مادری زبان اردو تھی مرد وخواتین اسی میں گفتگو کرتے تھے۔ صحت زبان تلفظ اور محاورات کے برمحل استعمال کا بطور خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اساتذہ کے لاتعداد اشعار ان کی زبانوں پر رہتے تھے۔ بچے اردو تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر پرورش وتربیت حاصل کرتے تھے۔ سروش کو بھی ایسا ہی خوشگوار علمی وادبی ماحول نصیب ہوا تتلاہٹ جاتے ہی اہل خاندان کی طرح شعری زبان میں موثر گفتگو کرنے لگے شاعری کا آغاز تو غزل گوئی سے ہوا تھا لیکن مختلف اصناف سخن پر کامیاب طبع آزمائی کرتے تھے۔ غزل۔ نظم۔ قطعہ کے علاوہ ان کی نعتیں اور سلام وغیرہ بھی پاکیزہ اظہار عقیدت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر رباعیات بھی لکھی ہیں جو سہل ممتنع۔ تراکیب کی خوش نمائی اور بندش کی چستی کی خوبیوں سے مرصع ہیں۔ وہ نعتیہ محفلوں میں بطور خاص مدعو کئے جاتے تھے اور حسن کلام اور مخصوص طرز ادا پر داد وتحسین وصول کرتے تھے۔ اکثر ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ کلام تحت میں سناتے تھے۔ پڑھنے کا انداز منفرد۔ دلنشیں اور بے حد موثر تھا۔ ان کی شخصیت میں رچی بسی متانت وسنجیدگی اور معصوم سی مسکراہٹ شعر کا لطف دوبالا کر دیتی تھی۔

سروشؔ تہذیب، تمدن، شرافت ونفاست کے اس سانچے میں ڈھلی شخصیت

کے مالک تھے جواب ٹوٹ کر قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ ان کی دوست نوازی، وضع داری اور شرافت نفس کا اندازہ ایک معمولی واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ تین چار سال قبل کی بات ہے سرورش اردو اکادمی کے جلسے میں بحیثیت رکن شرکت کرنے تشریف لائے تھے اور رام لعل صاحب کے ساتھ آکر مجھے بھی نوازا تھا۔ دوران گفتگو رام لعل صاحب نے شکایت کی کہ آپ میرے گھر نہیں آتے یہ ایسی حقیقت تھی جس کا معقول جواب میرے پاس نہ تھا میں نے مزاحاً عرض کیا۔ "آپ کے دولتکدہ (اندرا نگر) تک پہنچنا مہنگا پڑتا ہے اور آپ سے ملاقات نہ ہو سکے تو دس روپیہ کرایہ بے مد کھلتا ہے" انھوں نے اصرار کیا کہ آج سرورش صاحب کی کار سے چلئے کھانا وہیں کھایا جائے اور ہم سب بشمول بیگم سرورش ان کے یہاں پہنچے۔ اس کے بعد جب تک سرورش کی صحت نے ساتھ دیا اور وہ لکھنؤ تشریف لائے مجھے رام لعل صاحب کے گھر لے جانے کے لئے تشریف لاتے رہے۔ میں نے عرض بھی کیا کہ دس روپیہ کرایہ والی بات مزاحاً کہی گئی تھی ایسی تنگدستی نہیں ہے کہ کرایہ کی مد میں دس روپیہ خرچ کرنا بار ہو لیکن ان کے معمول میں فرق نہیں آیا

سرورش غزل گو۔ نظم گو۔ نعت گو و رباعی گو شاعر کی حیثیت سے خاصے مقبول تھے۔ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود شعر و شاعری کے شغل میں کافی وقت صرف کرتے تھے اور ملک کے مختلف گوشوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ انھوں نے چند سال قبل اپنا شعری مجموعہ ترتیب دیا تھا اور احباب کے اصرار پر اس کی طباعت پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ رام لعل صاحب ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت میں بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ متعدد بار گفتگو ہوئی۔ اچھے کاتب کی تلاش ہوئی لیکن اسی زمانہ میں سرورش اناوی صاحب فراش ہو گئے اور پھر چار کے کاندھوں پر ہی اٹھے اور مجموعہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ افسوس کہ ایک قادر الکلام شاعر کا شعری اثاثہ شائع نہ ہو سکا ان کا تمام کلام ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہے!

سرورش اناوی زود گو اور قادر الکلام شاعر تھے ان کے کلام میں الفاظ و محاورات کی صحت۔ زبان و بیان پر قدرت۔ روانی و برجستگی اور شستگی و صفائی کی خوبیوں کے ساتھ تغزل کی پاکیزگی بھی موجود ہے۔ وہ قدیم روایات کی پابندی کے ساتھ عصر تقاضوں کو بڑی مہارت کے ساتھ شعریت و نغمگی عطا کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں تنوع و ہمہ گیری بھی ہے اور قدامت و جدت کے درمیان ایک حسین توازن بھی۔

زبان وادب کے اس خاموش خادم نے عرصہ تک صاحب فراش رہ کر تقریباً ستر سال کی عمر میں جس کا بیشتر حصہ چمن سخن کی آبیاری میں گزارا تھا ۱ ستمبر ۱۹۸۸ء کو موت کی وادی میں قدم رکھا۔ سرورش نہیں رہے لیکن ان کی ادبی کارناموں کی خوشبو چمنستان ادب میں باقی ہے۔

نمونۂ کلام

غزل:

دل پہ چوٹ کھانے سے اشک خوں بہانے سے
زندگی سنورتی ہے ناز غم اٹھانے سے

دل کچھ اس طرح تڑپا عہد گل کے آنے سے
آئے تا قفس تنکے اڑ کے آشیانے سے

خود پہ ناز فرماتے آئے ہیں ترے در تک
کچھ حرم کی جانب سے کچھ شراب خانے سے

چارہ سازیٔ غم بھی غم کو تازیانہ ہے
آرزو بڑھی کتنی آرزو بر آنے سے

نام عشق لے لے کر غم کا واسطہ دے کر
اپنی جستجو کی ہے آپ کے بہانے سے

ہر طرف سے آتی ہیں گو صدائیں ماتم کی
بج رہے ہیں کانوں میں پھر بھی شادیانے سے

روئے یار کی زینت ہے نقاب سر مستی
لاج رہ گئی غم کی میرے مسکرانے سے

آرزو پرست اس کو اے سرورش کیا جانے
دل میں کیا جلا آئی دل کے ٹوٹ جانے سے

رباعیات:

کہنے پہ راز کون آمادہ ہو　　سمجھے گا وہی جو اس کا جاندادہ ہو
اک شام مفارقت کی عمر نہ پوچھ　　صدیاں گزریں تو کوئی اندازہ ہو

گر میں دل کی ٹٹولنے آئی ہے　　میزان نظر پہ تولنے آئی ہے
ہشیار کہ پھر کلید تنویر سحر　　آنکھوں کا قفل کھولنے آئی ہے

سب عشق کی آن بان رکھ لیتے ہیں　　اظہار وفا کی شان رکھ لیتے ہیں

سب کچھ کہتے ہیں اور کھلتے نہیں لب　　آنکھوں میں ہم زبان رکھ لیتے

قطعہ

نفس نفس ترے سینے کا تول لیتا ہے
شکن شکن ترے ماتھے کی کھول لیتا ہے
نظر نظر سے ملا کر نظر کی جنبش سے
ترے خیال کی نبضیں ٹٹول لیتا ہے

نظم "حسن تضاد"

اگر نہ دوزخ نما یہ ہستی سرِ وش جنت مقام ہوتی
نہ حوصلوں کا یہ رنگ ہوتا نہ زندگی بے جام ہوتی
اگر نہ زلف دراز شب پر ستارۂ صبح مسکراتا
مژہ کا آنسو اگر نہ ہونٹوں کی مسکراہٹ پہ جھلملاتا
شکست دل کی صدا کو سن کر غزل جو شاعر نہ گنگناتا
کہاں بنارس کی صبح ہوتی کہاں اودھ کی یہ شام ہوتی

خزاں کی ویرانیوں میں پنہاں اگر نہ رنگ بہار ہوتا
سکون دل کا اگر نہ باعث یہ ہر نفس انتشار ہوتا
غم جہاں گر علاج تیرا نہ یہ غم انتظار ہوتا
نگاہ و دل کی ہر اک حکایت تمام تر نا تمام ہوتی
اگر نہ بیتابیوں پہ دل کی ہو سایہ خم دار کاکلوں کا
گلوں میں یہ رنگ و روپ بھرنے کو خون ٹپکے جو بلبلوں کا
اگر یہ گمراہیوں کا عالم پتہ نہ دے دل کی منزلوں کا
نظر سے مل کر نظر کسی کی نہ اس طرح ہم کلام ہوتی
اگر نہ بے دینیوں کے فتوے یقین و ایماں کی سرخیاں ہوں
اگر نہ ماضی کے تیکدے میں حیات نو کی تجلیاں ہوں
اگر نہ واعظ ترے سخن میں حیات نو کی مراحیاں ہوں
تو کفر ساماں یہ بزم عصیاں کہاں یہ بیت الحرام ہوتی
ثواب کی شان کھلا ہی وجود ذوق گناہ سے ہے
خرد کے دامن کی زرنگاری جنوں کے حال تباہ سے ہے

تجلی عارض گل افشاں مرے شعور نگاہ سے ہے
یہ سب نہ ہوتا تو آج دنیا بس ایک اللہ کا نام ہوتی
اگر نہ خار الم سے پیدا گل تمنا سے سرخوشی ہو
اگر نہ شب رنگ شیشۂ غم پہ عکس پیماں روشنی ہو
اگر نہ آغشتہ خاک و خوں میں سرود احساس آدمی ہو
سرِ وش کیونکر یہ چشم گریاں سکون دل کا پیام ہوتی

ملک زادہ جاوید
۹۰ پروفیسرس فلیٹ، بابو گنج لکھنو

غزل

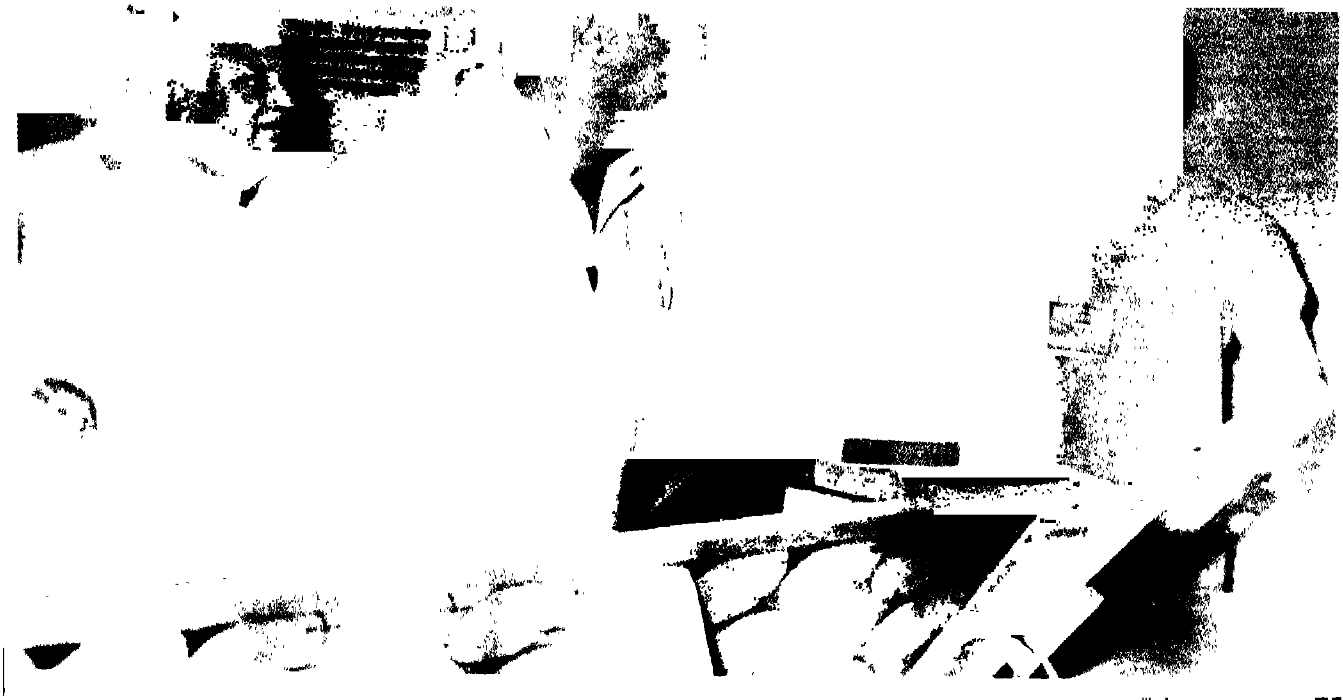
ننھے پودوں کو اب شجر کر دے
میرے اشعار معتبر کر دے

بجھ گیا آخری چراغ اب تو
اس حویلی کو بھی کھنڈر کر دے

میرے لہجے پہ تبصرہ کیوں ہو
میری باتوں کو درگزر کر دے

بھول جاؤں بچھڑنے والے کو
غم کی مدت کو مختصر کر دے

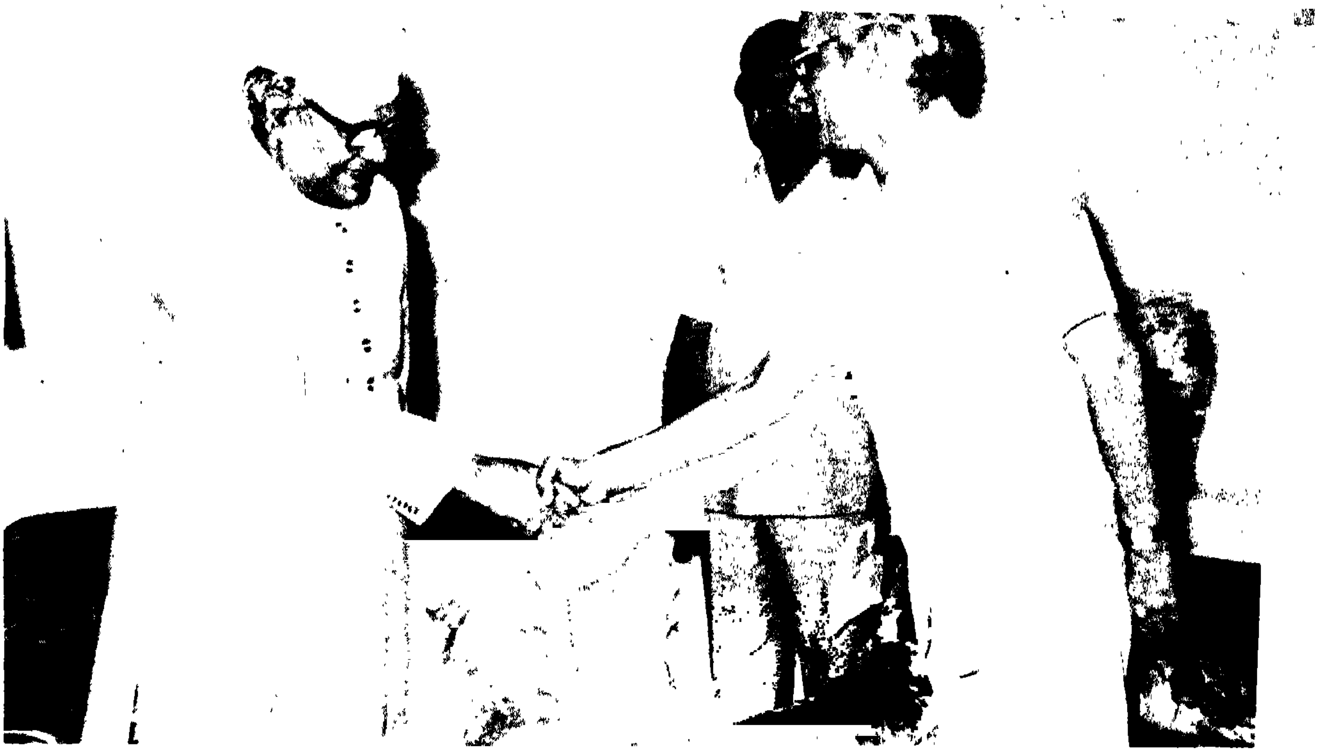
اس کا غصہ مزید بچوں سا
گھر کی چیزیں اِدھر اُدھر کر دے



وزیراعظم شری راجیو گاندھی ۱۱ر مارچ ۱۹۸۹ء کو گوری گنج ضلع سلطان پور میں "سائنس دیہاتوں کی جانب" نامی نمائش کا جائزہ لیتے ہوئے۔ وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری بھی اس موقع پر نظر آرہے ہیں۔



وزیراعظم شری راجیو گاندھی ۲۰ مارچ کو الٰہ آباد میں سابق وزیر [illegible] شری ہیم وتی نندن [illegible] کی آخری رسوم [illegible]
[illegible]



گورنر اترپردیش شری محمد عثمان عارف سے اترپردیش کے نئے چیف سکریٹری شری شردمنی ترپاٹھی راج بھون لکھنؤ میں
ملاقات کرتے ہوئے



[illegible] مارچ ۱۹۸۹ء کو گنا سنستھان لکھنؤ [illegible]
[illegible] کرتے [illegible]



شری نرائن دت تیواری ۳ مارچ ۱۹۸۹ء اترپردیش کے ایک نئے ضلع سون بھدر کی تشکیل کے موقع پر
ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے



وزیر اعلا اترپردیش شری نرائن دت تیواری ۱۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو رویندرالیہ (لکھنؤ) میں
آنجہانی بابو ترلوکی سنگھ کے یوم پیدائش کے موقع پر ان کے مجسمے کی گل پوشی کرتے ہوئے



سابق وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری ۱۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو ریشم کی صنعت سے متعلق تحقیقاتی ترقیاتی و ...
مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے۔



وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری ۹ مارچ ۱۹۸۸ء کو سکریٹریٹ (انیکسی لکھنؤ) میں شری سعید محمد خاں کی خطاطی کے نمونے دیکھتے ہوئے۔ اس موقع پر وزیر ریاست برائے داخلہ شری سعیدالزماں بھی نظر آ رہے ہیں۔



وزیر ریاست برائے اطلاعات، شہری ترقی و پارلیمانی امور شری نریش چندر، نوجوانوں کی ثقافتی تنظیم کی جانب سے راجاجی پورم (لکھنؤ) میں منعقدہ مشاعرے (کوی سمیلن) کے موقع پر کویوں اور شاعروں کو ایوارڈ دیتے ہوئے۔ اس تقریب کی صدارت شری دلدار حسین انصاری نے کی۔

رباعیات

محشر بریلوی
بی - ۲۶۶/۳ ریلوے اسٹیڈیم کالونی
گورکھپور

توقیر زمانے کی گھٹانے والو!
معیار زمانے کا گرانے والو!
سمجھے گا کسی روز زمانہ تم سے
یہ خوب سمجھ لینا زمانے والو!

نفرت کے اندھیروں کو مٹاکر دیکھو
الفت کے چراغوں کو جلاکر دیکھو
خود راہ پہ آجائے گی دُنیا اے دوست
راہوں کو تو ہموار بناکر دیکھو

دیوار تعصب کی گرا دے کوئی
یہ نقش کدورت کا مٹا دے کوئی
جو گرم ہواؤں نے لگا رکھی ہے
اس آگ کو اے کاش بُجھا دے کوئی

شبنم کی ہر اک بُوند کو شعلا سمجھا
گلشن کے ہر اک پھول کو کانٹا سمجھا
اس سے بھی بڑی اپنی نبھائی ہم نے
جس نے نہ کبھی اچھوں کو اچھا سمجھا

ترکیب کوئی ایسی نکالی جائے
خوش ہو کے ترے در سے سوالی جائے
کچھ سوچ کے کر بیٹھا ہوں میں تجھ سے سوال
اے دوست مری بات نہ خالی جائے

اسلم حنیف
گنور - بدایوں

غم کی تجسیم زرّیں ہونا ہے
اُجڑے ہوئے لمحوں کا امیں ہونا ہے
آتش کدۂ خواب نہ ہوجائے سرد
کندن مجھے اے عمر یہیں ہونا ہے

نظریں نہ رہیں گی تری کنگال اے دوست
ہوجائیں گے مرتسم خط و خال اے دوست
کائی کو ہٹاکر تو کبھی خود سے مل
جھیلیں بھی ہیں آئینہ سیّال اے دوست

اے دیوانے کرخت گفتار پسند!
کیوں ہوتا ہے اَنا کے تو خول میں بند
افکار میں ہے تیرے سماعت کا کھوٹ
پستہ قد لفظ ہیں مگر لہجہ بلند

حیات اللہ انصاری
۳۴۔۵۔د ویسٹرن کورٹ، جن پتھ
نئی دہلی

افسانہ

ادھوری

"باہر ایک عورت کھڑی ہے"

ایک لڑکے نے اندر آکر بھرو سے کہا۔

بھرو ایک ٹانگ پھیلائے اور دوسری سمیٹے اپنی کھٹیا پر کراہ رہا تھا اس کی بوڑھی اور کام چور مہری جس پر دن بھر ڈانٹ پڑا کرتی تھی تو ندی کا شکار ہونے کی وجہ سے سرِ شام ہی چلی گئی تھی۔ اب بھرو اکیلا تھا اس نے لڑکے سے کہا

"اس کا نام تو پوچھو"

لڑکے نے باہر سے کوئی آواز سن کر جواب دیا۔

"نام ہے میکی"

یہ سنتے ہی بھرو آگ ہو گیا۔ اس کی پھیلی ہوئی ٹانگ سکڑ گئی اور کراہنا بھول گیا۔

"میکی میکی۔ وہ کیوں آئی ہے میرے گھر؟ کہو چلی جائے۔ ابھی فوراً"

لڑکا یہ جواب سن کر ایک چھلانگ لگا کر گھر کے باہر ہو گیا۔

روشن اپنے بالاخانے کی کھڑکی کے پاس اپنی فکر میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ میکی کا نام سن کر وہ بڑے زور سے چونکا اور باہر جھانکنے لگا۔ یہاں سے بھرو کا چھوٹا سا گھر سوائے دالان اور رسوئی کے پچھلے حصے کے سب نظر آتا تھا۔ روشن نے لڑکے کو دیکھا اس کی بات سنی بھرو کی پھیلی ہوئی ٹانگ کو دیکھا اور اس کا جواب سنا۔ بس بھرو کے چہرے کو نہ دیکھ سکا کیوں کہ کھٹیا کا سرہانا آڑ میں تھا

بھرو چلاتا بڑبڑاتا ہوا لاٹھی ٹیک کر اٹھا۔ کراہتا اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک گیا۔ اور اس کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔

(۲)

روشن کیوں کر بھول سکتا تھا میکی کو اسی نے تو روشن کی جوانی کو جگایا تھا

یہ اس زمانے کی بات ہے جب روشن کا سن چودہ سال کا ہوگا اور اس کی ساری دلچسپیاں ہاکی تک محدود تھیں لے دے کے اس کی بے تکلفی اگر تھی تو صرف مقصود سے تھی۔ وہ تھا تو روشن سے سن میں چھوٹا لیکن جنسی رازوں سے زیادہ واقف تھا اور ان سے روشن کو تھوڑا بہت روشناس بھی کرا چکا تھا۔

ایک دن روشن کا میچ پڑ گیا اور اس کے کسی کام سے وہ خلافِ معمول گھر آکر سیدھا بالاخانے میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پہلی بات تو یہ عجیب نظر آئی کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ ضرور کہ یہ کس نے کھولا لیکن جیسے ہی وہ اندر گیا اس کا جواب مل گیا۔ گھر کی گیارہ سالہ سوکھی ساکھی کالی کلوٹی چھوکری گلابو میلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی کھڑکی سے بھرو کے گھر میں جھانک رہی تھی۔ اور ایسی منہمک تھی کہ وہ روشن کی چاپ سے بھی نہیں چونکی۔ گندی جھاڑن جو غالباً اس کے ہاتھ میں ہوگی میز پر پڑی ہوئی تھی۔

یہ کیا دیکھ رہی ہے اس طرح روشن دبے پاؤں کھڑکی تک گیا اور گلابو کے پاس کھڑکی میں جو جگہ خالی رہ گئی تھی اس سے وہ بھی جھانکنے لگا۔ جو منظر سامنے آیا اس کے سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ اس کو صرف چار ٹانگیں ننگی ننگی نظر آئیں جو عجیب طرح سے باقاعدگی سے حرکت کر رہی تھیں۔ جب وہ سمجھا کہ کیا معاملہ ہے تو اس طرح چونکا کہ اس کا بدن گلابو کے بدن سے ٹکرا گیا جس سے وہ چیخ کر اچھل پڑی ایسی اچھلی کہ اگر روشن سنبھال نہ لیتا تو وہ کھڑکی کے اس پار بھرو کے گھر میں جا گرتی۔ اس کے بعد دونوں کے ہاتھوں نے کیا کیا اور پھر کیا کیا حرکتیں سرزد ہوئیں یہ سب کچھ روشن کو بگڑا بگڑا سا یاد رہ گیا۔

ایک سال بعد جب گلابو کا پیٹ بھولنے لگا تو گھر والوں پر روشن کی حرکت کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ گلابو نے روشن کی ماں سے کہا:

"انھوں نے شادی کا وعدہ کیا تھا "

اس پر وہ بہت ماری چیخی گئی۔ روشن کا باپ جو عرصے سے بیمار پڑا ہوا بستر پر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ اس کے کان میں جو بھنک پڑی تو اس نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ روشن کی طلبی ہوئی اور پوچھا گیا کہ گلابو سچ کہتی ہے ؟

روشن نے جواب دیا شادی والی بات تو جھوٹ ہے اور یہ کہہ کر اس نے گردن جھکالی۔ بیماری میں غصہ بڑھ ہی جاتا ہے۔ باپ غصے سے ایسا بپھرا کہ اس کی تھرتھراتی ہوئی آواز کراری ہوگئی۔ اس نے بہت سخت اور سست کہا اور پھر بولا

" دور ہو جا میری نظروں سے "

روشن کو گلابو پر بے حد غصہ تھا کہ ٹکے کی لونڈیا اور کہتی ہے کہ میں نے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ اس دن سے گلابو غائب ہوگئی۔ لیکن روشن کو اس کے جانے کا افسوس ذرا بھی نہیں ہوا۔ گلابو کا سوکھا ساکھا بدن، گھٹیا حرکتیں اور احمقانہ باتیں اب بہت بری لگنے لگی تھیں ۔

میں کیوں کر گر گیا پستی میں۔ آخر کیا ہوگیا تھا مجھے۔ ان سوالوں کا جواب اندر سے یہ ملتا کہ جو کچھ بھی ہوا میکی کی وجہ سے ہوا ایسی عورتوں کو ہرگز نوجوان کے آس پاس نہ رہنا چاہیئے ۔

روشن کا گلابو پر غصہ چل رہا تھا کہ اس کا باپ دنیا سے اٹھ گیا۔ روشن کو باپ کے مرنے کا دکھ تو ہوا ہی۔ لیکن زائد شرمندگی اس بات پر تھی کہ آخری وقت ان کو میری وجہ سے دکھ پہنچا دوسری طرف باپ کے مرنے سے جائیداد کے مقدموں کا بوجھ آن پڑا وکیلوں کے گھروں پر جانا۔ کچہری کی دوڑ دھوپ ان باتوں میں روشن سب کچھ بھول گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی خشک زندگی میں تری آگئی۔ وہ یوں کہ وہ اپنی ٹیم کا کپتان بن گیا۔ میچ ہوتے تھے ہار اور جیت دونوں میں لطف آتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ساری زندگی اسی طرح کٹ جائے تو بھی کچھ برا نہیں رہے گا

(۳)

روشن کا کمرہ اب بھی وہی تھا اور وہ اسی طرح اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام مرد میکی سے بیہودہ مذاق کر رہا ہے۔ روشن کو دو سال پہلے کی دیکھی ہوئی ٹانگیں یاد آگئیں اور وہ غور سے مرد کی ٹانگوں کی ساخت کا جائزہ لینے لگا۔ ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکال پایا تھا کہ گھر کے دروازے پر کوئی بھڑبھڑ کرنے لگا ۔ اور ساتھ ساتھ بھرو سے کی گالیوں کی آواز آنے لگی۔ مرد نے چیخ کر دیوار پار کرنے کی کوشش کی تو کسی نے دوسری طرف سے اسے اندر ڈھکیل دیا۔ پھر دو مرد کود کر اندر آگئے۔ ایک نے کالے مرد کو پکڑ لیا۔ اور دوسرے نے دروازہ کھول دیا اور بھرو سے اندر آگیا۔ یہ تینوں مل کر کالے کو مارنے لگے پہلے تو اس نے خاموشی سے مار کھائی۔ پھر چلانے لگا۔ بچاؤ بچاؤ۔ آوازیں سن کر کچھ لوگ اندر آگئے انھوں نے مارپیٹ کو روکا۔ اور بات سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر تو سب ایک ساتھ بولنے اور چلانے لگے۔ ایسے میں اس مرد کو موقع مل گیا اور وہ بھاگ گیا پھر بھرو سے نے غصے سے سب آنے والوں کو بھگا دیا۔ جب اکیلا رہ گیا تو اندر سے دروازہ بند کر لیا اور لکڑی کا ایک چیلا اٹھا کر میکی کو پیٹنے لگا۔ وہ ہائے ہائے کرتی رہی۔ لیکن اپنے بچانے کی یا دفاعی حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ بے ہوش ہوگئی یا جن گئی تب بھرو سے اسے چھوڑ کر باہر سے دروازہ بند کر کے چلا گیا

بھرو سے کے جانے کے دس منٹ کے بعد روشن نے نیچی آواز سے میکی کو پکارا آخر میکی نے جو صحن میں پاؤں سمیٹے ہوئے اوندھی پڑی تھی۔ کروٹ بدلی اور اوپر کی طرف دیکھا۔ روشن نے جو کھلاڑی ہونے کی وجہ سے ٹنکچر آیوڈین اپنے پاس رکھتا تھا اس کو ایک ڈوری سے باندھ کر لٹکا دیا اور کہا۔

اس کو اپنی چوٹوں پر لگا لو

میکی کراہتی ہوئی اٹھی شیشی لے لی اور روشن کو بھرپور نظروں سے دیکھ کر رسوئی کی طرف دوا لگانے چلی گئی۔ روشن بھی بالاخانے سے چلا آیا۔

اس واقعہ کے بعد کالا مرد پھر نظر نہیں آیا۔ اور بھرو سے روزانہ دوکان سے دن میں دو مرتبہ اچانک ضرور گھر آجاتا تھا۔

پندرہ بیس دن کے بعد ایک روز پچھواڑے کی گلی میں میکی اور روشن کا سامنا ہوگیا۔ روشن نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی راہگیر نہ تھا اس نے کہا۔

"میکی "

میکی ٹھٹھک کر روشن کو دیکھنے لگی۔ روشن نے کبھی تنہائی میں اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس نے پہلی بار اس عورت کا جائزہ لیا۔ گدرائے ہوئے بالدار لچکتا ہوا بدن۔ روشن نے مسکرا کر پوچھا۔

"کہاں گیا وہ تیرا کالا"

میکی نے روشن کی نظروں کی چوری پکڑ لی تھی۔ اس سوال سے اس کے چہرے پر چمک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جگمگاہٹ آگئی۔ باچھیں اس طرح کھل

اٹھیں کر بڑے بڑے بے ترتیب لال لال دانت دکھائی دینے لگے ۔

"پوچھتے ہو کہ وہ کہاں گیا "

یہ کہہ کر اس نے اپنی کمر لچکائی ۔ اس سے اس کے سینے اور بازو میں لہر آگئی

" وہ موا وہیں گیا جہاں گئی گلابو "

پھر ایک چھنا کے دار ہنسی میکی کے حلق سے نکلی ۔ جس نے اس کے چہرے کو چمکا دیا ۔ مگر ہنسی ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا میکی نے اپنے سب کپڑے اتار دیئے ہیں

جواب سن کر روشن سٹپٹا گیا ۔ اس کی سٹپٹاہٹ دیکھ کر میکی نے ایک اور قہقہہ مارا مگر وہ پہلے قہقہے سے ذرا کم ننگا تھا ۔ کیوں کہ روشن کی ناتجربہ کاری کا احساس کر کے میکی کے دل میں ماتا بھری ہمدردی چونک پڑی تھی ۔ میکی نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کہا ۔

"تم نے اس دن شنیچر دیکھ بڑا کام کیا "

یہ کہہ کر میکی نے اپنی کمر گردن اور بالوں کے جوڑے کو بہت ادا سے لہرا کر آنکھ ماردی اور پھر اس طرح مڑ کر چلی گویا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی ۔

میکی کے جانے کے بعد روشن کو ایسا لگا جیسے میکی اس کے دل پر منوں بوجھ لاد گئی ہو ۔ اس کی کھلی ہوئی باچھیں اگال دان نما منہ اور ننگے قہقہے سے کراہیت آنے لگی اور جس طرح لوگ کھانا کھاتے وقت اس مکھی کو بھلانے کی کوشش کرتے ہیں جو کھانے میں ابھی گر چکی ہے ۔ اس طرح روشن نے میکی کو مع اس کے آنے والے بھدی رنگینیوں کے دل سے نکال پھینکا ۔

(۴)

جب رات کو روشن لیٹا تو اچانک نیند سے ذرا ہی دیر پہلے میکی مع اپنے کھلی ہوئی باچھوں ننگی ہنسی اور بھاری سینے اور گدرائے بازو کے آدھمکی ۔ یہ بن بلائے مہمان کچھ دیر تک اپنے کرتب اس طرح دکھاتے رہے کہ اگر ایک آگے آ جاتا تو دوسرا اس کو پیچھے ڈھکیل کر اپنے آگے کر لیتا ۔ رفتہ رفتہ اس اکھاڑ پچھاڑ میں ایک ایسی چیز سامنے آگئی جو ابھی تک روشن کی نظروں سے اوجھل تھی ۔ وہ تھی میکی کی نظر جو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے نکل کر کچھ کہہ رہی تھی ۔ جس طرح گانے والی آواز کے ساتھ طبلہ کی جوڑی کی دھنک اور سارنگی کی لہریں گھل مل ہوتی ہیں ۔ اس طرح اس نظر کے پس منظر میں ابھرا ابھرا سینہ اور گدرائے بازو تو تھے ہی ساتھ ساتھ ایک نامحسوس سی لہر بھی تھی ان مناظر میں ڈوبتے ابھرتے روشن کی رات گزر گئی ۔

جب آنکھ کھلی ہے تو اس احساس کے ساتھ کھلی ہے کہ میکی رات بھر سوتے جاگتے مرے ساتھ لگی رہی ہے ۔

روشن نے صبح ہوتے ہی بھردے کے گھر میں جھانکا کہ ذرا دیکھوں تو کہ کیا میکی واقعی ایسی ہی ہے جیسی مجھے رات کو لگ رہی تھی ۔ آخر اس میں ایسی کون سی بات ہے جو اس طرح رات میری جان کو آرہی تھی ۔ لیکن دن کی روشنی میں کوئی بھی خاص بات میکی میں نظر نہیں آئی ۔ بلکہ اس کی ذات ایسی محسوس ہوئی جیسے کوئی بھاری پتھر ہو ۔

اسی وقت روشن کے ذہن میں گلابو آگئی مع اپنی آنکھوں کے رومان اور چہرے کے انداز سپردگی کے کیا ملائمت تھی ان چیزوں میں ۔ اس وقت کی یاد میں نہ گلابو کا مرجھایا بدن تھا ۔ نہ اس کی کالی رنگت اور نہ گھٹیا حرکتیں اور نہ احمقانہ باتیں ان دنوں عجیب زندگی ہو گئی تھی روشن کی ادھر رات ہوئی اور ادھر میکی آموجود مع اپنے بھرے بھرے سینے گدرائے بازو اور بدن کی اس لہر کے جو روشن کے بدن میں گھسی چلی جاتی تھی مگر جیسے ہی صبح ہوتی اور وہ سخت ناپسندیدہ ہو جاتی ۔ روشن جانے کتنے دنوں میکی کے چکر میں گرفتار رہا ۔

ایک دن بھردے کے چلانے چیخنے اور رونے سے پتہ چلا کہ میکی اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی ۔ یہ خبر سن کر محلے والے بھردے سے ہمدردی بھی کرنے لگے ۔ اور اس کا مذاق بھی اڑانے لگے ۔

" اندھیر ہے کہ تمہارے ایسے ہٹے کٹے مرد کو چھوڑ کر چلی گئی ۔ یار ابھی تو تو قریب قریب جوان ہے ۔ گھر ڈال لے ایک اور جو نیا کو "

روشن کو میکی کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ڈھونڈھ کر اسے خوب پیٹے ۔ کم بخت دھوکا دے گئی ۔

بھردے کی میکی تو چلی گئی لیکن روشن کی میکی نہیں گئی ۔ وہ بدستور راتوں کو روشن کے پاس آتی اور اس کو ستاتی رہی ۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے ایک نئی شرارت سیکھ لی ۔ جہاں روشن کسی جوان عورت کو دیکھتا میکی اس عورت کا بدن بن جاتی ۔ اور پھر کہتی دیکھو میں ہوں اس عورت کا بدن پھر وہ عورتوں کے بارے میں فیصلے بھی صادر کرتی ۔ فلاں کا بدن بے لوچ ہے ۔ فلاں تو لٹھا ہے ۔ وہ لڑکی ہے یا لُو کی ماری ہوئی املیا ۔ یہ عورت ہے یا تھیلا ۔ ہاں یہ غنیمت ہے ۔ مگر بس ایک حد تک ۔ زیادہ نہیں ۔

(۵)

ایک دن جب شہاب ریل پر سفر کر رہا تھا تو ایسا ہوا کہ میکی کے تصور نے جس میں گلابو بھی شامل تھی ہار مان لی۔ کیونکہ ایک عورت ایسی نظر آگئی جس کے بارے میں میکی کا کوئی فیصلہ چل نہ سکا۔

یہ خاتون کون ہے؟ کہاں جا رہی ہے؟ روشن اپنے دل میں سوچنے لگا اور اس کی نظریں چھپ چھپ کر سامنے والے چہرے اور بدن کا جائزہ لینے لگیں اس عورت کے ساتھ ایک ادھیڑ مرد بھی تھا۔ ذرا دیر کے بعد وہ مرد روشن کے پاس آکر وہ باتیں پوچھنے لگا جن کا ریل کے مسافروں میں رواج ہے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ لکھنؤ۔ خوب ہم لوگ بھی وہیں جا رہے ہیں۔ کیا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے؟ ہاں ہاں۔ آپ کے والد صاحب کو کون نہیں جانتا ہے۔ بہت خوشی ہوئی جناب کا تعارف حاصل کر کے۔ اتنی گفتگو ہوئی تھی کہ خاتون نے پاندان کھولا۔ اور گلوریاں بنا کر روشن کے سامنے بڑھا دیں۔ اب ادھیڑ مرد کہنے لگا۔

"پان ملاحظہ کیجئے۔ یہ بائی جی رام پیاری کہلاتی ہیں۔ ہم لوگ چوک میں رہتے ہیں۔ کبھی قدم رنجہ فرمائیے۔"

روشن کا دوست مقصود ابتدائے جوانی سے بازاری عشق و عاشقی کے کوچے کا رسیا تھا۔ اس نے جو روشن کا درد دل سنا تو کہنے لگا کہ جب جی چاہے چلے چلو پھر اس نے کہا کہ میں نے اس کوچے کے تجربے کر کے دو اصول اپنے سامنے رکھ لئے ہیں ایک تو یہ کہ ان لوگوں کو جنگلی ہرن سمجھو جو کبھی پالتو نہیں ہو سکتے۔ دوسرے عشق اتنا ہی کرو جتنی جیب میں گنجائش ہو۔

روشن کی چوک میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ بہت دنوں تک رام پیاری کا نشہ رہا۔ لیکن جب دوسری طوائفوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو رفتہ رفتہ رام پیاری خوبصورت ہونے کے باوجود نظروں سے گرنے لگی۔ کیوں کہ وہ بھی گلابو کی ایسی احمقانہ اور گھٹیا باتیں کرتی تھی۔ اس وجہ سے جوش کے اتار کے بعد اس سے بھی جی متلانے لگتا تھا

روشن کے دل کو اب چھاپ لیا تھا رادھا نے اس کی شکل اور چلت پھرت باتوں ہنسی اور فقروں میں عجیب جان تھی۔ اور جوش کے اتار کے بعد وہ جو جوابی محبت دیتی تھی وہ تو ایسی ہوتی تھی جو مردے کو زندہ کر دے۔

روشن پیاری کو بھول کر رادھا کا دیوانہ بن گیا۔ رادھا میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ روشن جتنا قریب جاتا اتنی ہی اس کی پیاس بڑھتی۔ رادھا بھی اس پیاس کو سمجھتی تھی اور اسے بڑھاتی جاتی تھی۔

ایک دن روشن گھر آیا تو ماں نے یہ مسئلہ پیش کیا کہ بھروسے جو اس کے مکانوں میں سے ایک کا کرایہ دار ہے سخت بیمار ہے اور چھ مہینے سے اس کی دوکان بند پڑی ہے۔ اس نے نہ مکان کا کرایہ ادا کیا ہے اور نہ دوکان کا۔ ایسا بیمار ہے کہ اپنا کھانا نہیں پکا سکتا ہے۔ محلے والے اسے کھانا دے رہے ہیں۔ اس نے کل کہا کہ مری دوکان میں جو مال ہے وہ جتنے کا ہے بیچ ڈالو اور اس سے دوکان اور مکان کا کرایہ ادا کر دو۔ مال جو دیکھا گیا تو اتنا ہے کہ یا تو دوکان کا کرایہ ادا ہو سکتا ہے یا مکان کا۔ اور اس کو ادا کرنے کے بعد اس کے کھانے کو کچھ نہیں بچے گا۔ ماں نے کہا کہ میں تو چاہتی ہوں کہ مکان کا کرایہ معاف کر دیا جائے اور اس کو کچھ رقم بھی دے دی جائے اپنا خرچ چلانے کے لئے۔ روشن نے دونوں باتیں منظور کر لیں۔

(۶)

جب لڑکے نے کہا کہ دروازے پر میکی کھڑی ہے تو روشن چونک پڑا۔ کیا ہوا کیا شوہر کو چھوڑ کر یار کے ساتھ بھاگ جانے والی میکی واپس آگئی ہے۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ وہ ضرور کوئی چال چلنے آئی ہے۔ جب رات گئے روشن رادھا کے گھر سے واپس آیا تو سوچنے لگا کہ اب میکی کیا پھر اپنے یار کے پاس چلی گئی ہوگی؟ لیکن روشن کو ایسا لگا جیسے بھروسے سے کوئی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے غور کیا تو باتوں میں ایک آواز زنانی بھی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھروسے نے میکی کو قبول کر لیا ہے۔

روشن کی جیسے ہی آنکھ کھلی۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ میکی بھروسے کے لئے حقہ بھر رہی ہے۔ لیکن اب میکی وہ میکی نہیں تھی جو چھ سات سال پہلے تھی۔ اس کے گال پچک گئے تھے۔ سینہ لٹک گیا تھا، بدن تھل تھل ہو رہا تھا۔ روشن کو افسوس ہوا میکی کا یہ حشر دیکھ کر روشن نے دل میں کہا کہ میکی اب اس سن کو پہنچ گئی ہے جبکہ وہ شوہر کے کام کی تو ہے، لیکن عیاش عاشق کے کام کی نہیں۔ اس لئے آگئی۔

ایک دن گلی میں میکی کا سامنا ہوا تو روشن نے پوچھا۔

"میکی تو چل کیسے آئی؟"

اب میکی میں نہ شوخی تھی نہ طراری۔ اس نے سر جھکا کر بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"جس اسپتال میں میں پہلے کام کرتی تھی وہاں یہ بھی دوا لینے جاتا تھا جب پتہ چلا کہ وہ ایسا بیمار ہے تو پھر میں ٹھہر نہ سکی"

"بھروسے تیرے آنے سے خوش ہے؟"

"ہاں خوش ہے پہلے سمجھتا تھا کہ میں اس لئے آئی ہوں تاکہ اس کی حالت

سے فائدہ اٹھاکر پیسہ سمیٹ لوں ۔ یا وہ مرجائے تو گھر اور دوکان ہتھیالوں لیکن اب ایسا نہیں سمجھتا ہے ۔ میں نے اسے دکھا دیا کہ میں کچھ لے کر آئی ہوں اور وہ سب اس پر خرچ کر رہی ہوں ۔"

"لیکن وہ تو برابر برا بھلا کہا کرتا ہے "

"یہ تو مَردوں کی عادت ہے ۔ مجھے پکارا بھی تو کرتا ہے ۔ پانی پلا دے کروٹ دلادے ۔ یہ کر دے ۔ وہ کر دے "

چند روز کے بعد روشن نے سنا کہ میکی اپنی ایک پڑوسن سے جو گھر آگئی تھی کہہ رہی تھی "

"بیماری کا حال تو میں نے سن رکھا تھا ۔ مگر ایسا نہیں سمجھی تھی ۔ یہاں آکر جو دیکھا اس سے تو کلیجہ پھٹ گیا "

"تم اتنے دنوں کہاں رہیں"؟

اس کے ساتھ رہی ۔ پہلے تو اسپتال میں جہاں وہ نوکر تھا نوکری کر لی تھی ۔ پھر کچھ عورتوں اور لڑکوں لڑکیوں کو ساتھ لگاکر بیڑیاں بنانے کا کام کرنے لگی اس میں پیسہ کچھ بچ رہتا تھا ۔ وہ اب کام آرہا ہے "

"جب تو آرہی تھی تو اس نے روکا نہیں "

"نہیں اس نے کہا کہ تو جاتی ہے تو چلی جا "

بھروسے کو سل تھی کچھ دنوں سے حالت بہت بگڑ گئی تھی اور کھکھار میں خون بہت آنے لگا تھا ۔ میکی روشن کی ماں کے پاس آکر چھتر لے جاتی ۔ اس سے بھروسے کا منھ صاف کیا کرتی ۔ روشن کی ماں کو میکی بھاگ جانے کے بعد اتنی ناپسند ہوگئی تھی کہ اس سے سیدھے منھ بات نہیں کرتی تھی ۔ لیکن جب پتہ چلا کہ میکی بھروسے کی کتنی خدمت کر رہی ہے ۔ پیشاب پاخانہ کراتی ہے ، اس کا اگالدان صاف کرتی ہے ، اس کے گندے کپڑے دھوتی ہے ۔ اور یہ کام ایک دو دن سے نہیں پانچ مہینے سے جب سے کہ وہ آئی ہے ، کر رہی ہے ۔ تو روشن کی ماں پر کیا منحصر محلے کے سبھی لوگ اس کو ستی ساوتری سمجھنے لگے تھے ۔

روشن جب رات کو واپس آتا تو سنتا کہ بھروسے اس کو کوئی حکم دے رہا ہے کہ یہ کر ۔ وہ کر ۔ کبھی بگڑ رہا ہے ۔ روشن کو ایسا لگتا جیسے بھروسے نہ خود رات کو سوتا ہے اور نہ میکی کو سونے دیتا ہے ۔

روشن سوچا کرتا تھا کہ میکی کتنی خدمت کرتی ہے بھروسے کی ! اتنی خدمت کیا بلا محبت کے ہو سکتی ہے ؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کو کہتے ہیں محبت ۔ ان خیالوں نے روشن کے دماغ میں رفتہ رفتہ عجیب عجیب ڈراموں کی شکلیں اختیار کر لیں ۔ رات کو روشن سو رہا ہے ۔ اس کو سردی لگی اس وقت ایسا لگا جیسے میکی نہیں ۔ نہیں رادھا اسے چادر اوڑھا رہی ہے ۔ جب زیادہ سردی لگتی اور آنکھ کھل جاتی اور اس کو خود چادر اوڑھنا پڑتی تو دل میں یہ حسرت مچلنے لگتی کہ کاش میرے پاس میکی ، نہیں رادھا ہوتی اور مجھے چادر اوڑھا دیتی ۔

صبح جب آنکھ کھلتی تو جی چاہتا کہ میکی ، نہیں نہیں رادھا میرے لئے چائے کی کشتی لے کر آئے ۔ پیالی بنائے ۔ میں میٹھا ہی رہوں اور وہ پلا دے ۔ جب وہ دسترخوان پر بیٹھتا تو جی چاہتا کہ میکی ، نہیں نہیں رادھا بلا مجھ سے پوچھے مری مرضی کے کھانے پکائے اور ان کو مرے سامنے رکھ دے ۔ اس پر جب میں حیرت کروں اور خوش ہوں ، تو وہ بہت خوش ہو ۔

جب روشن لیٹتا تو جی چاہتا کہ میکی ۔ نہیں نہیں رادھا آئے اور بلا کہے وہ مرے بدن کو اس اس جگہ دبا دے جہاں تھکن محسوس ہو رہی ہے ۔ دبائے ۔ خوب دبائے دل بہلانے والی باتیں بھی کہے ۔ مری کتابوں اور سامان کو قرینے سے رکھ بھی دے ۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ روشن کے ذہن میں جانے کس طرح میکی اور رادھا آگ اور پانی ہونے کے باوجود اس طرح گڈمڈ ہو جاتے تھے کہ اس کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون کہاں پر ختم ہوتا ہے اور کون کہاں سے شروع ہوتا ہے ۔

جب رادھا کہتی " آج میرے سر میں درد ہے یا آج میرا جی گھبرا رہا ہے یا آج مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلادو ' یا آج میرے لئے قلاقند منگوادو ۔ یا دیکھو مجھے بالکل نہ چھیڑو ۔ میرا جی نہیں اچھا ہے ۔ یہ باتیں پہلے روشن کو پرکشش لگتی تھیں ۔ اب میکی کا تصور ایسی باتیں سن کر روشن کے کان میں کہتا تھا ۔ دیئے جاؤ اپنی محبت جا ہے بھی جتنا دو ۔ ادھر سے جواب میں سوائے ادھورے شرف قبولیت کے اور کچھ نہیں ملے گا ۔ یہ دنیا وہ ہے جہاں تالیاں دونوں ہاتھوں سے نہیں ایک ہاتھ سے بجتی ہیں رادھا پر روشن جتنا خرچ کرتا جاتا اتنا ہی وہ پھیلتی جاتی ۔ روشن محسوس کرتا تھا کہ میں اس کے جال میں پھنستا چلا جا رہا ہوں ۔ لیکن جب بھی اس سے نکلنے کی کوشش کرتا تو محسوس کرتا کہ اس کی مجھ میں سکت نہیں ہے ۔

رادھا کی مزدوریں اچانک آتی تھیں اور کسی نہ کسی ڈرامے کے ساتھ آتی تھیں ۔ ایک دن روشن رادھا کے گھر گیا تو دیکھا کہ ایک توندوالا آدمی بیٹھا ہے

اور رادھا اس سے گھل مل کر باتیں چکنا رہی ہے ۔ روشن کے آنے کے بعد بھی وہ اسی طرح بیٹھا رہا اور رادھا اسی طرح باتیں کرتی رہی ۔ صرف اتنا ہی نہیں رادھا نے روشن کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ۔ صرف سرسری مزاج پرسی کرلی ۔ رادھا باقاعدہ روشن کی ملازم تھی ۔ اس کے شرائط کے بموجب صرف خاص خاص لوگ رادھا سے ملنے آسکتے تھے ۔ لیکن رادھا کو ان میں سے کسی سے بھی گھلنے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور جب روشن آجائے تو کوئی بھی شخص اس کی مرضی کے بغیر رادھا کے پاس نہیں ٹھہر سکتا تھا ۔ اگر ہو تو رادھا کا فرض تھا کہ وہ اس کو رخصت کردے ۔ لیکن رادھا نے توندوالے کو رخصت کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی روشن کو رادھا کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی ۔

روشن کئی دن سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ رادھا اپنا جسم تو مجھے دیدیتی ہے لیکن اپنی خوشی نہیں دیتی ہے ۔ اس وقت اس کو رادھا کی یہ حرکت بری لگی اور ایک بار یہاں تک ارادہ کیا کہ اٹھ کر چل دوں مگر پھر رک گیا کہ معلوم تو کرلوں کہ معاملہ کیا ہے ۔

جب توندوالا چلا گیا تو روشن نے تیور بدلے اور بگڑنے کے لئے پر تولے لیکن اس کے متحرک ہونے سے پہلے ہی رادھا کے لبوں پر آہ اور آنکھوں میں آنسو آگئے وہ سر جھکا کر دوپٹہ سے آنسو پونچھنے لگی اور منھ سے کچھ نہ بولی ۔ آخر روشن کو پوچھنا ہی پڑا کہ کیا معاملہ ہے ۔

"کچھ نہیں"

یہ کہتے ہی اس کے آنسوؤں میں زور آگیا ۔

"آخر کچھ تو بتاؤ"

"بتاؤں تو آپ کیا کریں گے ؟"

بہت اصرار کرنے پر رادھا نے کہا

"ماں نے اپنا مکان گروی رکھ کر کئی سال ہوئے ایک مہاجن سے قرضہ لیا تھا ۔ اب قرضے کی میعاد گزر چکی ہے اور سود بہت چڑھ گیا ہے ۔ اگر اس مہینہ میں قرضہ نہیں ادا کیا گیا تو مکان ہاتھ سے نکل جائے گا میں اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں

"پھر کیا ہوگا ؟"

"یہ بھی میں ہی بتاؤں ؟ ہاں اور کون بتائے گا ۔ کیوں کہ محبت تو مجھ ہی کو ہے آپ سے ۔ اس لئے بھگتنا بھی مجھ ہی کو پڑے گا ۔

روشن پچھلے تجربوں کی بنا پر سمجھ گیا کہ کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے ۔ اس کے لئے آمادہ ہو کر اس نے رادھا کے آنسو پونچھے اور اس کو سینے سے لگایا اور پھر اصرار سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے ۔

یہ سیٹھ جو آیا تھا ۔ یہ ہمارا سارا قرضہ ادا کرنے کو تیار ہے ۔ ماں کے نزدیک تم تو جانتے ہی ہو کہ پیسہ ہی سب کچھ ہے ۔ وہ محبت کی قدر کیا جانیں ۔"

روشن سمجھ گیا کہ اگر مجھے رادھا کو اپنے پاس رکھنا ہے تو قرضہ جتنا بھی ہے ادا کرنا ہوگا ۔ جب رقم کی تعداد سنی تو وہ اتنی تھی کہ روشن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا بندوبست کیوں کر کروں ۔ جائداد پر قرض لینا ممکن نہیں تھا ۔ کیوں کہ باپ نے وصیت کچھ ایسی لکھی تھی کہ روشن بلا ماں کی مرضی کے جائداد کو نہ تو رہن رکھ سکتا تھا اور نہ فروخت کر سکتا تھا اور ماں کے لئے تحریر تھا کہ کسی حال میں دونوں میں سے کسی بات پر راضی نہیں ہوں گی ۔ دوسری رات وہ رادھا کے یہاں یہ سوچ کر نہیں گیا کہ اسے کیا جواب دوں گا ۔

جب مقصود نے اسے اتنا فکرمند دیکھا اور سارا حال سنا تو کہنے لگا

ہوسکتا ہے کہ میں ایک جگہ سے پرولوٹ پر قرضہ دلادوں ۔ روشن کے دل کی حالت اس وقت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ یہ سن کر اس کی باچھیں کھل گئیں ۔

"بھئی جو بھی کر سکو کردو"

(۷)

مقصود یہ کہہ چلا گیا اور روشن بے چینی سے ٹہلنے لگا ۔ اس وقت میکی کے چلانے کی آواز آئی ۔ روشن نے جھانک کر دیکھا تو بھروسے کا آدھا پلنگ نظر آ رہا تھا اور میکی اسکی پٹی سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ۔

اسکی چیخ سن کر پڑوسی اندر آگئے ۔ روشن سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے ۔ اور وہ بھی پہنچ گیا ۔ بھروسے میکی کی واپسی کے پہلے ہی صرف ہڈی چمڑا رہ گیا تھا ۔ اس حالت میں جانے کس طرح اتنے دنوں زندہ رہا ۔ اس کے پھونکنے کے چوتھے دن لوگوں نے میکی سے کہا ۔

"کیا تو گھر میں اکیلی رہے گی"

بولی "اور کیا کروں گی"

"کسی کو ساتھ رکھ لے"

پھر کسی نے اشارہ کیا "کوئی پرانا جاننے والا ہو تو اچھا ہے"

(باقی صـ ۴۶ پر)

مظہر رائے بریلوی
۰،۰ سپر مارکیٹ، رائے بریلی

وصیّت نامہ

آئندہ نسل کے لئے

تم حرص و ہوس کے کبھی بیمار نہ ہونا — خود اپنے لیے باعثِ آزار نہ ہونا
گمراہوں کی صحبت سے سدا دُور ہی رہنا — ایمان فروشوں کے پرستار نہ ہونا
جو غیبت و تہمت کے ہیں شیدائی، پجاری — اُن فتنہ گروں کے کبھی غمخوار نہ ہونا
جھگڑوں میں خموشی بڑی دانائی ہے پیارو — غم سہنا مگر مائلِ تکرار نہ ہونا
اپنوں سے کسی بات کی اُمید نہ رکھنا — ہاں، یہ بھی کہ شرمندۂ اغیار نہ ہونا
خاصانِ خرابات سے نفرت نہیں کرنا — دنیائے خرابات کے میخوار نہ ہونا
محنت سے، مشقت سے کبھی جی نہ چرانا — بیکار نہ رہنا، کبھی بے کار نہ ہونا
باتوں میں زمانے کی نہ آنا مرے پیارو — چالوں میں زمانے کی گرفتار نہ ہونا
جب بھی غمِ دُنیا کا پڑے بوجھ دلوں پر — ہمت نہ کبھی ہارنا، لاچار نہ ہونا
ہونا بھی کبھی صاحبِ دولت کبھی تم تو — مدہوش نہ ہونا، کبھی سرشار نہ ہونا
یارانِ عداوت کو عطا کرنا رفاقت — اربابِ تعصّب کے طرف دار نہ ہونا

جوہر نہ ہو ہیرے میں تو پتھّر ہے وہ ہیرا
سَو عیب کا اک عیب ہے خوددار نہ ہونا

سُلطان احمد نادم
منگا گلیتی گیٹ، بانسی کی مسجد
لکھنؤ

غزل

جس نے کیا تھا عشق کا اظہار میں ہی تھا
دار و رسن کا تھا جو سزاوار میں ہی تھا

غافل تھے لوگ دیدۂ بینا لیے ہوئے
ہر لمحۂ حیات میں بیدار میں ہی تھا

سرمایۂ خلوص کہاں تھا کسی کے پاس
اپنی متاعِ غم کا خریدار میں ہی تھا

چلنا پڑا تھا خود بھی زمانے کو میرے ساتھ
اک وقت تھا کہ وقت کی رفتار میں ہی تھا

اتنا نہیں کہ مجھ کو فقط فکرِ زیست تھی
ہر انقلاب کا بھی علمدار میں ہی تھا

خود کو بچا رہا تھا میں اپنے ہی خوف سے
سر پر خود اپنے صورتِ تلوار میں ہی تھا

سمجھا رہا تھا کوئی مجھے نکتۂ فریب
نادم پتہ چلا کہ وہ عیّار میں ہی تھا

افسانہ

حکایت ایک نیزے کی

اقبال مجید
اردو پروڈیوسر۔ آل انڈیا ریڈیو
لکھنؤ

یہ اس زمانے کی بات ہے جب قدیم لوک کتھا کے مطابق نادر شاہ نے بہلی
سی پر رحم کھایا تھا ــــ

دروغ برگردن راوی ــــ

وہ حکایت یوں کہتی ہے کہ ایک بار نادر شاہ اپنے لشکر کے ساتھ ایک شاہراہ
گذر رہا تھا کہ اس کی نظر بیچ سڑک پر پڑے ایک شیرخوار بچے پر پڑی۔ نادر شاہ
اپنا گھوڑا روکا اور سوچا کہ کہیں یہ بچہ اس کے لشکر کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل
لئے اس لئے اس بچے پر نادر شاہ کو بڑا ترس آیا اور اس نے اپنا تارکی نیزہ سنبھالا
ے کی انی میں بچے کو چھیدا اور پھر نیزے سمیت سڑک کے کنارے پھینک دیا۔
کہتے ہیں کہ وقت نادر شاہ کی طرح رحم دل نہیں ہوتا، وہ تو ہر پل اور ہر گھڑی
ہی بنی ہوئی حکایتوں کی تکمیل میں لگا رہتا ہے ـــ مگر جب وہ ان حکایتوں کی تکمیل
کے پلٹ کر دیکھتا ہے تو یہ دیکھ کر غمگین ہو جاتا ہے کہ جن حکایتوں کی اس نے اپنی
ب سے تکمیل کر دی تھی وہ ہنوز اسی طرح ادھوری ہیں۔ کیونکہ ہوا یہ کہ نادر شاہ تو چلا گیا
۔ بچے کو آسمان پر اڑتے گدھوں نے اپنا لقمہ بھی بنا لیا لیکن نیزہ وہیں پڑا رہ گیا اور
یقت یہ ہے کہ جب تک دنیا میں نیزے موجود ہیں حکایتیں ختم نہ ہوں گی بس ثبوت
طور پر اسی حکایت کو پڑھ کر دیکھ لیجئے کہ کس طرح سڑک کے کنارے پڑا ہوا وہ نادر شاہی
و ایک غریب درزی کو ملا اور وہ اس کو اپنے گھر لے آیا اور اسے اپنے بینتیانے دیوار
کونے میں رکھ کر سونے کے لئے بستر پر لیٹا اور نیند نہ آنے پر جب نیزے پر نگاہ کی تو ایک
ب کرشمہ دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ لکڑی کے اس حصہ پر جہاں نیزے کی فولادی انی مڑھی گئی
کوئی سرخ دھبا چمک رہا ہے۔ پہلے تو درزی کو لگا کہ شاید وہ خون کا دھبہ ہو لیکن
ں دھبے سے پھوٹتی روشنی نے درزی کو بے چین کر دیا۔ بھلا خون میں اتنی چمک دمک
ں؟ وہ اٹھ کر نیزے کے قریب پہونچا اور دھبے کو غور سے دیکھا۔ تب تو اس کی

جان ہی نکل گئی۔ دراصل وہ تو بڑا سا ایک سرخ لعل تھا جس پر نادر شاہی مہر نقش تھی اور جس سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ تب درزی کو احساس ہوا کہ جس نیزے کو معمولی چیز سمجھ کر وہ اٹھا لایا تھا دراصل وہ نادر شاہ کا نیزہ تھا۔ درزی بیچارہ خوف کے مارے بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔ درزی کی بیوی پاس ہی سو رہی تھی شوہر کے گرنے پر جاگ پڑی اور اپنے درزی کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ ہمت کر کے وہ درزی کو ہوش میں لائی اور بے ہوش ہونے کا سبب دریافت کیا درزی نے پوری روداد اپنی درزن سے بیان کی اور خوف سے کانپنے لگا۔ درزن بڑی ہوشیار تھی اس نے جھٹ نیزہ اٹھایا اور اپنے چھپر میں چھپاتے ہوئے ایک بانس کے ساتھ اچھی طرح باندھ دیا اور باقی باتیں صبح کے لئے ملتوی کر کے شوہر کو دلاسہ دیکر سُلا دیا۔ کیونکہ ہر رات کی صبح ہوتی آئی ہے اس لئے اس رات کی بھی صبح ہوئی۔ اور وقت بیچارہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ نہیں جانتا کہ آتی جاتی راتوں کی کون سی صبح کیسی ہوگی؟

صبح ہوئی تو رات کی رکھی دال روٹی کھا کر درزی بیچارہ تو اپنے کام پر نکل گیا لیکن درزن برابر سوچتی رہی کہ نیزے میں جڑے لعل کی قیمت یقیناً اس کے دن پھیر دے گی۔ ایسا لعل تو اس نے اپنے عاشق شہزاد جوہری کے گھر پر بھی نہ دیکھا تھا۔ شہزاد بڑا مالدار جوہری تھا اور گبرو جوان بھی ـــ درزی کی بیوی کے حسن کے چرچے بھی گھر گھر تھے اور ساری بستی گنڈی میں یہ لعل دیکھ کر خدا کی قدرت پر ایمان لا چکی تھی ـــ کٹار جیسی آنکھیں، تلوار جیسی بھویں سینہ، کمر، کولہے ایسے ترشے ہوئے جیسے آذر کا شاہکار۔ جوانی تھی کہ پھٹی پڑ رہی تھی مسکراتی تو سو سو بجلیاں گرتیں اور اندھیری راتیں جگمگا اٹھتیں۔ پہلی ہی نظر میں شہزاد اس پر جی جان سے فریفتہ ہو گیا مگر جوہری تھا بلا کا کنجوس۔ اپنے دام میں درزن کو بے دام گرفتار کر لیا ــ

درزن نے شوہر کے جانے کے بعد چادر سر سے اوڑھی اور کھوارڑے نانگھتی ہوئی جوہری کے ٹھکانے پر پہونچ گئی اور نیزے میں بچے اس لعل کا سارا احوال کہہ سنایا ــ بولی "تو نے ایک رتی بھی ہاتھ اٹھا کر اپنے معشوق کو کبھی نہ دی، اب مجھ سے

سوداگر خود بھی مالا مال ہو اور مجھے بھی آرام کی زندگی بسر کرنے دے ،،

لعل کا ذکر سن کر جوہری کے منھ میں پانی آگیا اور بولا

"اری نیک بخت پھر دیر کیا کرتی ہے ابھی چل میرے ساتھ اور اس لعل کو مجھے دکھا ،،

جوہری کی آتش شوق کو بھڑکتا دیکھ کر درزن بہت خوش ہوئی اور اسے فوراً گھر لے گئی چھپر کے بانس سے نیزے کو کھولا اور جوہری کو نیزے میں پیوست وہ دمکتا ہوا سرخ لعل دکھایا کہ جس کی چکاچوند پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی اور جس سے سرخ شعائیں نکل کر اندر کی مدھم روشنی کو لہولہان کر رہی تھیں - جوہری اس جلالی نیزے کو ہیبت کے ساتھ پکڑے تھا اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں اس درخشاں لعل پر جمی ہوئی تھیں ، حیرت کے سمندر میں غرق کچھ لمحے کے لئے جوہری جیسے گونگا ہوگیا - پھر دفور جذبات سے اسکی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں ـ

آخر کو وہ اپنے اوپر مشکل سے قابو پاتے ہوئے بولا ،

" خدا کی قسم یہ دنیا کا نادر جواہر پارہ ہے - جسکے پاس بھی ہوگا وہ کروڑوں میں کھیلے گا - دنیا کا کوئی جوہری اسکی قیمت ادا نہیں کر سکتا ـ ،،

یہ سننا تھا کہ درزن کے دل میں شہنائیاں بجنے لگیں ـ اسے لگا کہ اس کے گیسو عطر و عنبر میں بس گئے ہیں اس کے جوان جسم پر سونے اور چاندی کے تاروں سے بنی پوشاک جھلملا رہی ہے - وہ زیوروں سے آراستہ فرش پر بچھے تازہ گلابوں پر رانیوں کی طرح چل رہی ہے تب ہی جوہری کی آواز نے اسکو چونکا دیا ـ

" اری نیک بخت یہ لعل مجھے دے دے اور جتنی دولت چاہے اس کے بدلے میں لے لے ،،

درزن بہت ہوشیار تھی جوہری کی بیتابی کو دیکھ کر اس نے لعل کی قیمت دل ہی دل میں آنک لی ـ بولی

" آٹھ خچروں کی جھولی میں اشرفیاں بھر کر میرے گھر ہانک دے لعل تیرا ہو جائے گا ،،

سودا طے ہوگیا لیکن جوہری بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا بولا ـ

" عورت واقعی کم عقل ہوتی ہے ـ میں تیرا عاشق ، تجھ پر جان و دل سے واری ذرا سوچ اتنی دولت پاکر تو اس غریب درزی سے چھٹکارا کیسے پائے گی اری بیوقوف یہی موقعہ ہے شوہر کو جان سے مار دے اور نیزے سے اس لعل کو نکال کر میرے گھر بیٹھ جا اور میری دولت کی مالکن بن کر ساری زندگی رانیوں کی طرح رہ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ سو خچروں کی پیٹھ پر بھی نہ سما سکے ـ

درزی کی جوان بیوی اپنے عاشق کے کلمات سن کر اور وصل کے بے روک ٹوک لمحوں کی مسرتوں کا خیال دل میں لاکر بے سدھ ہوگئی ، اس لئے طے پایا کہ رات کے تیسرے پہر جب اس کا شوہر گہری نیند سو رہا ہوگا وہ نیزے سے لعل کو الگ کرکے اور نیزے کی دھار دار انی کو سوتے ہوئے شوہر کے نرخرے میں اتار کر پو پھٹنے سے پہلے جوہری کے مکان کی عقبی دیوار سے آنگن میں پھاندے گی ـــ دیوار پر چڑھنے اور پھاندنے کے پوشیدہ انتظام سے وہ پہلے ہی واقف تھی ـ

جب رات آئی تو درزی کی بیوی کو ایک ایک پل ایک ایک برس کا ہوگیا ہو ـــ وقت اس سے کاٹے نہیں کٹ رہا تھا - اس رات اس کا شوہر کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا - حسب معمول اپنی بیوی کی ہتھیلی پر اپنی کمائی کے چند سکے رکھ روکھی سوکھی کھا اور بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال وہ چراغ جلے ہی سو گیا تھا ـ

ابھی رات کا ایک پہر بھی نہ گذرا تھا کہ درزن کی بیوی سے صبر کا دامن چھوٹ گیا - سوچا جو کام رات کے دو پہر گذرنے کے بعد کرنا ہے ابھی ہی کیوں نہ کر دیا جائے اس نے نیزہ اٹھایا لعل تو بعد میں بھی نکل سکتا تھا اس لئے نیزے کو مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس کی انی اپنے شوہر کے نرخرے میں اتار دی اور خون کے فوارے میں نہائے شوہر کے بدن کو تڑپتا چھوڑ ، چادر اوڑھ ، نیزہ ہاتھ میں لئے جوہری کے گھر کی طرف چل پڑی ـ

کچھ ہی دیر میں وہ جوہری کے آنگن میں پھاند چکی تھی - آنگن سے گذر کر ابھی وہ برآمدے تک ہی پہونچی تھی کہ اسے یوں لگا جیسے سامنے اندھیرے میں کوئی سایہ سا لہرا کر یکبارگی غروب ہوگیا ہو - چند قدم آگے بڑھنے کے بعد قندیل کی ہلکی روشنی میں اس نے ایک کونے میں اناج رکھنے کا ایک اونچا سا مٹکا دھرا دیکھا لیکن اس کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس مٹکے کے منھ سے تھوڑا باہر نکلا ہوا کامدانی کے دوپٹے کا ایک سرا ابھی جھانک رہا تھا - دوپٹے پر سلمہ ستارے جڑے تھے اور وہ خوشبو میں بسا تھا درزن چاہتی تھی کہ دوپٹے کے اس سرے کو چھو کر تصدیق کرے کہ جو کچھ اس کو دکھائی دے رہا ہے کہیں وہ اس کا وہم تو نہیں کہ دوپٹے کے سرے میں حرکت ہوئی جیسے مٹکے میں چھپ کر بیٹھنے والے کو دوپٹے کے سرے کے باہر رہ جانے کا یکبارگی احساس ہوگیا تھا اور جس کو اس نے جلدی سے گھسیٹ کر اندر کر

لیا تھا۔ درزن کا ماتھا ٹھنکا کچھ دیر کو ایک خیال اس کے دل و دماغ میں بجلی کی طرح کوندگیا۔ وہ دبے قدموں سے آگے بڑھی پہلو میں جوہری کی خوابگاہ تھی جسکے اندر شمع دانوں میں شمعیں روشن تھیں۔ درزن نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ چوکی پر شراب کی صراحی اور پیالے دھرے تھے سنگار چوکی پر بالوں سے اتارے ہوئے دو گجرے پڑے تھے اور بستر پر پڑی ہوئی شکنیں پکار پکار کر بستر کو روندنے والوں کو ان کے عیش کی داد دے رہی تھیں۔ جوہری نشے کی لہر میں تھا۔ درزن کے کلیجے پر چھریاں چل گئیں اور ہر بات روز روشن کی طرح اس پر عیاں ہوگئی۔ اگر منصوبے کے مطابق وہ رات کے تیسرے پہر بعد جوہری کے گھر آتی تو یہ منظر کیسے دیکھنے کو ملتا۔ ہرجائی عاشق کی ایسی بے وفائی اس کا کلیجہ کاٹ گئی۔ دل میں سوچا جس نے بھری جوانی میں وفا نہ کی وہ مرد آگے کیا وفا کرے گا دوسرے ہی دن دھکے مار کر نکال دے گا ـــ درزن کے ہاتھ میں نیزہ تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے ایک مرد کا خون چاٹ چکا تھا۔ درزن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ نیزہ سنبھال کر خوابگاہ میں جھپٹی اور پوری انی جوہری کی گردن کے آر پار کر کے کھینچ لی۔ جوہری منہ کے بل گرا اور ایک دلخراش چیخ فضا میں بکھر گئی۔ درزن وہاں سے سراسیمہ بھاگی، بھاگتے بھاگتے اس نے ساری رات گذار دی۔ صبح کا تڑکا ہوتے زخمی تلوؤں کے ساتھ وہ ایک نئے شہر کی سرحد میں داخل ہوئی اس کے اعضا شل ہو چکے تھے۔ نڈھال ہو کر آخر کار وہ ایک پیڑ کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ جھاڑیوں کے کانٹوں میں الجھ کر اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا جسکے اندر سے اس کا خوبصورت جوان اور سرخ و سپید جسم جھانک رہا تھا۔ تکان اور شب بیداری سے اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں نیند کا غلبہ اسے سلانے کو ہی تھا کہ اس کے کانوں میں کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی، اس نے چونک کر دیکھا اس کے پاس ہی گھوڑے کی پیٹھ پر ایک قزاق بیٹھا اس کو ندیدی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا وہ سنبھلا ہی چاہتی تھی کہ قزاق کے فولادی بازو کی گرفت نے درزن کی کمر اپنے گھیرے میں لے کر زمین سے اٹھالیا اور گھوڑے کو ایڑ دے دی۔ درزن کے ہاتھ میں نیزہ ابھی بھی موجود تھا۔ گھوڑے پر بھاگتے ہوئے قزاق اسے اس طرح دبائے تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ بار بار نیزے کو سنبھالنے کی کوشش کرتی کہ کہیں وہ ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے اس ہاتھا پائی میں نیزے کا دوسرا سرا زمین پر اٹک کر بھاگتے گھوڑے کی لاتوں میں کچھ اس طرح الجھا کہ گھوڑا اپنا توازن کھو بیٹھا، لڑکھڑاتے ہوئے گھوڑے کا سوار بھی اپنے کو سنبھال نہ سکا اور ایک لمحے میں اس کے پاؤں رکاب چھوڑ بیٹھے، جب وہ زمین پر آ رہا تھا تو نیزے کی انی اسی کی جانب تھی، قزاق کے جسم کا سارا بوجھ جب انی نے اپنے اوپر لیا تو قزاق کے پیٹ کو پھاڑتی ہوئی اس کی پیٹھ کے پار نکل گئی۔

گھوڑا پانچ قدم دور زمین پر لوٹ کر اٹھ کھڑا ہوا درزن لڑھکتی ہوئی ایک درخت سے ٹکرائی۔ جب وہ قزاق کے مردہ جسم سے نیزہ نکال رہی تھی تو آسمان پر سورج کی پہلی کرن دستک دے رہی تھی اور نیزے میں جڑا ہوا وہ سرخ لعل دمک رہا تھا۔

درزن اپنے کو گھسیٹتی ہوئی آخر کو ایک سمت چل پڑی اور آخر کار ایک حجرے کے دروازے پر پہونچ کر بے ہوش ہوگئی ـــ پتہ نہیں کب تک وہ بے سدھ پڑی رہی جب اس کو ہوش آیا تو وہ اسی حجرے کے اندر فرش پر پڑی تھی اور اس کے سامنے ایک نورانی صورت بزرگ چوکی پر بیٹھے تھے۔

"اٹھ اور اپنی دین دنیا کی نگہبانی کر" بزرگ بڑے جلالی لہجے میں مخاطب ہوا اور اٹھ کر چلا گیا ـــ درزن کو لگا کہ جیسے بزرگ کی آواز نے اس کے شل اعضا میں قوت اور گرمی کی ایک لہر پھونک دی ہو۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا سامنے دیوار کے کونے میں وہ نیزہ رکھا تھا جس کو اس کی بے قرار نظریں تلاش کر رہی تھیں۔ درزن کو قدرے اطمینان ہوا۔ تھوڑی دیر میں پھلوں کی ٹوکری کے ساتھ ایک بچہ اندر آیا اور بولا

"آقا کا حکم ہے کہ پیچھے تالاب میں نہائیں اور یہ تازے پھل کھائیں"

درزن نے استفسار کیا

"میں کہاں ہوں؟ یہ بزرگ کون ہیں ـــ؟ اور تیرا ان سے کیا تعلق ہے۔؟

بچے نے جواب دیا:

"یہ دانش کدۂ سلمان کا ایک کمرہ ہے، وہ دانش مند بزرگ ہمارے معلم اور ہم ان کے شاگرد ہیں ـــ"

درزن نے پھر پوچھا۔ "وہ بزرگ کہاں گئے اور کب ملیں گے؟" جواب ملا

"آٹھ دن بعد آج ہی کے دن وہ پھر آئیں گے، آپ کے لئے حکم ہے کہ درگاہ کے لئے پانی بھریں، چٹائیاں لگائیں اور چراغوں میں تیل دیں۔ اور اسی کمرے میں قیام کریں" درزن کو عافیت کی اس خبر نے ترو تازہ کر دیا۔ ایک دو روز جب پلک جھپکتے گذر گئے تو اس نے مستقبل کی فکر کی، چادر اوڑھ اپنے ہم جنسوں کی تلاش کی، شہر کا رقبہ ناپا، مکینوں کے حسب نسب اور پیشوں کی معلومات حاصل کی، شہر کے تونگروں اور امرا کا شمار کیا تب ہی اس کو پتہ چلا کہ اس شہر میں ایک مالدار جوہری بھی رہتا ہے کہ نام جس کا طغرل خان ہے اور ایسے ایسے ہیرے جواہرات کا مالک ہے کہ بڑے بڑے سلاطین

اس کو دربار میں عزت بخشتے ہیں۔ یہ سنتے ہی جوان ورزن کو ایسا لگا جیسے گو ہر مراد پا گئی ہو۔ جھٹ نیزے پر لال اوڑھنی کے بل ڈال کر اور اسے ایک معمولی عصا کا روپ دے کر منیہارن کا بھیس بنا کر ایک دن طغرل خاں کے حرم میں بڑے ٹھسے سے داخل ہو گئی۔ بیگمات اور باندیوں کو ایسی ایسی چوڑیاں پہنائیں اور ایسی ایسی چہلیں کیں کہ سارا حرم لٹو ہو گیا۔ طغرل خاں کو ایسی ادا سے سلام کر کے آنکھوں میں اتری اور کچھ ایسی دلبری سے کلائیاں کھنکائیں کہ خان کو ان کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔

وہ بولا ـــــ یہ گدڑی میں لعل کہاں چھپا تھا اب تک۔" ورزن کی بن آئی، گھونگھٹ کے پلو کی آڑ لے کر تیر نظر کا ایسا نشانہ مارا کہ خان بیچارہ دل پکڑ کر رہ گیا۔ آواز میں دودھ اور شہد کی نہریں لہراتے ہوئے بولی۔

"حضور لونڈی قربان ـــ ابھی لعل دیکھا کہاں ہے۔ دکھا دوں تو ہوش باقی نہ رہیں گے"۔ خان کی تیوریوں پر ایک بل آیا۔ وقار سے بولا:

"ذرا ہم بھی دیکھیں تیرا لعل ۔۔۔۔" اور پھر مضبوط ہاتھوں نے اس کو چوٹی سے پکڑ لیا۔

"چل ہٹ مردوئے"۔ ورزن مچھلی کی طرح تڑپی۔ جوہری ہے تو جوہری کی طرح دیکھ بن مانس کیوں بنتا ہے"۔ جوہری کو اچھا لگا۔ چوٹی چھوڑ دی، اپنے کمرے میں لے کر آیا۔ ورزن نے موقع غنیمت جانا جھٹ چاقو کی نوک سے دمکتے ہوئے لعل کو نیزے سے اکھاڑا اور جوہری کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔

"ذرا سنبھل کر دیکھ۔ تیرا مقدر جگمگا اٹھے گا ـــ"

جوہری نے لعل کو غور سے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک شیشے کو آنکھ پر لگایا۔ تمام پہلوؤں سے غور سے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر کونے میں صندوقچہ کھولا لعل کا وزن کیا اس کو گھما کر ٹھوک کر دیکھا پھر کسی اور موتی سے اس کا ملان کیا پھر کچھ اور پتھر نکالے غرضیکہ جیسے جیسے وہ اسکو پرکھتا جاتا اس کی الجھن بڑھتی جاتی آخر کو وہ بولا ـــ

"اے عورت۔ کیا تو میرا امتحان لینا چاہتی ہے ـــ؟

"کیسا امتحان ـــ؟" ورزن نے سوال کیا۔

"یہ تو ایک معمولی پتھر ہے۔ لگتا ہے تجھ کو کسی نے مجھے ٹھگنے کے لئے بھیجا ہے"

"کیا ـــ؟" ورزن پر جیسے بجلی سی گری

"تو خود دیکھ لے یہ تو دو کوڑی کا بھی نہیں ہے ـــ" یہ کہہ کر اس نے وہ پتھر ورزن کی طرف اچھال دیا۔ ورزن نے دیکھا واقعی وہ سڑک کا ایک بے حد معمولی پتھر تھا۔ ٹھیک اس لعل کے برابر اسی طرح ترشا ہوا اتنا ہی موٹا اسی نقش کے ساتھ۔ طغرل خاں نے ایک قہقہہ لگایا بولا ـــ "تو تو بڑی دیدہ دلیر ٹھگ ہے اتنے بڑے جواہر شناس کو کیا سمجھ کر اتنے معمولی پتھر سے ٹھگ رہی تھی ـــ بول بادشاہ کے قید خانے میں سڑے گی یا طغرل کی قید میں مہکے گی۔" ورزن کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا سمجھ گئی کہ جوہری کے دل میں بے ایمانی آگئی ہے اور بڑی چالاکی سے اس نے پتھر بدل دیا۔ اس نے سن رکھا تھا نایاب پتھروں کی نقل جوہری اپنے پاس ضرور رکھتے ہیں اس نے صندوقچہ کھول کر دوسرے پتھر شاید اسی لئے نکالے تھے، کمبخت آنکھوں سے کاجل نکال لے گیا۔

ورزن نے مارے غصے کے کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح نیزے کی انی پر سرخ اوڑھنی کے بل کھولنا شروع کر دیئے۔ طغرل خاں موت سے بے خبر قہقہے لگا رہا تھا تب ہی بجلی کی سرعت سے ورزن طغرل خاں پر جھپٹی اور پل بھر میں اس نے جوہری پر لگاتار وار کر کے اسکے جسم کو چھید ڈالا۔ خون کے فوارے بہہ نکلے۔ ورزن مٹھی میں وہ پتھر دبائے دیوانوں کی طرح وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی، وہ بھاگتی گئی بھاگتی گئی تاوقتیکہ حجرے کے دروازے کی دہلیز سے ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑی۔ اسکی دونوں کہنیاں زخمی ہو گئیں، ماتھے پر ایسی ٹکر لگی کہ خون بہہ نکلا ـــ وہ کچھ پل ویسے ہی فرش پر پڑی ہانپتی رہی کہ اس کے کانوں میں آواز آئی ـــ

"اٹھ ـــ" اس نے گردن اوپر اٹھا کر دیکھا سامنے وہی بزرگ کھڑے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی ـــ "کہاں گئی تھی ـــ؟" استفسار پر ورزن نے بزرگ کی طرف دیکھا۔ بزرگ کی آنکھوں میں بلا کا جلال تھا جسکی وہ تاب نہ لا سکی اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور روتے ہوئے بولی۔

"اس کمینے نے مجھے کنگال کر دیا ـــ دھوکہ دیکر مجھے لوٹ لیا ـــ"

یہ کہہ کر ورزن نے اپنی مٹھی میں دبا وہ پتھر بزرگ کی طرف بڑھا دیا۔ بزرگ نے پتھر کو غور سے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا ـــ

"اس پتھر کو دوبارہ نیزے میں جڑ دے" ورزن نے حکم کی تعمیل کی بزرگ بولا ـــ

"اب پتھر کو غور سے دیکھتی رہ ـــ"

ورزن نے پتھر پر نظر جمائی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ پتھر میں دھیرے دھیرے ایک سرخی دوڑنا شروع ہو چلی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے

اس میں وہی آب و تاب اور دمک پیدا ہو چکی تھی اور اسی طرح سرخ شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ درزن بیچارگی اس بزرگ کے قدموں پر گر کر بولی۔

"اے بزرگ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں ——"

"یہی کہ تو نے طغرل خاں کو بے قصور مارا ہے —— اور اس سرخ پتھر کی طرح یہ نیزہ ہے اس نیزے سے جدا ہو کر یہ ایک معمولی پتھر بن جاتا ہے۔"

"لیکن اے بزرگ مجھے تو یہ لعل درکار ہے جس کی قیمت لبریز خزانوں سے بھی زیادہ ہے"

"اب تک کتنے خون کر چکی ہے اس نیزے سے۔" سوال ہوا

"چار ——"

"اور مار —— بزرگ کڑک کر بولا۔

"نہیں —— میں نے اس کے پیچھے اپنا گھر برباد کیا۔ شوہر کو مارا، دغاباز عاشق کی جان لی، قزاق کی موت آئی، طغرل خاں کا خون کیا، کتنی جانیں جا چکی ہیں ان چند دنوں میں ——"

"اور جانیں لے —— جو نیزہ ایک دن میں چار ہو جانیں چاٹ لے وہ تیرے ہاتھوں بھوکا مر رہا ہے۔"

"لیکن میں سلطان نہیں ہوں جو ایسا کر سکوں ——"

"تو پھر بادشاہوں کے کھلونوں سے کیوں کھیل رہی ہے۔"

"مجھے یہ لعل درکار ہے ——"

"تو پھر اس نیزے کو چالیس ہزار جانوں کا خون چٹا یہ لعل تجھے مل جائے گا"

درزن تڑپ کر بولی۔

"اے پیر و مرشد میں ایک سیدھی سادی عورت ہوں۔ یہ مجھ سے ممکن نہیں ہے"

"اے کم عقل عورت" بزرگ خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولا۔

"تاریخ میں سب کچھ ہر ایک سے ممکن نہیں ہوتا۔ تاریخ جب چالیس ہزار نیزہ کھانے والے پیدا کر چکی ہے تب ایک نیزہ مارنے والا پیدا کرتی ہے۔ تاریخ ہر ایک کو ایک جیسا نہیں بناتی"

"اے قبلۂ عقل و دانش کیا نیزہ مارنے والا نیزہ کھانے والے سے مختلف ہوتا ہے"

"بے شک ہوتا ہے" جواب ملا۔

"اے مرد دانا اب یہ بھی بتا دے کہ میرا شمار ان دونوں میں سے کن میں ہے۔"

"علم ہر بات ہر شخص کو نہیں بتاتا۔ ممکن ہے یہ نیزہ ہی یہ فیصلہ کر دے اور ایک دن تیرا مقام تجھے بتا دے" یہ کہہ کر وہ بزرگ دوسرے دروازے سے غائب ہو گیا۔

اس رات درزن نے خواب میں اپنے قصبے مانسے شوہر کو دیکھا۔ وہ مزدوری کر کے جو چند سکے لایا ہے انکو بڑے پیار سے اس نے درزن کی ہتھیلی پر رکھ دیئے ہیں اور خود منہ ہاتھ دھو کر ٹوٹی پھوٹی چوکی پر کھانے کے انتظار میں بیٹھ گیا ہے۔ درزن اسے مکئی کی گرم گرم روٹی اور ساگ کھلا رہی ہے اور پاس بیٹھ کر پنکھا جھل رہی ہے۔ شوہر کھانا کھا کر بستر پر لیٹ جاتا ہے اور درزن اس کے پیر دبانے لگتی ہے کچھ دیر بعد درزی اس کو بڑے پیار سے اپنی سمت کھینچ کر سینے سے لگا لیتا ہے اور دھیرے سے اس کے کان میں کہتا ہے

"کتنی اچھی ہے تو —— تیرے حسن اور تیری خدمت کے بیش بہا لعل
نے مجھے غریبی میں بھی امیر کر رکھا ہے۔ تجھ کو تو میں اپنے خدا سے
بھی چھین لاؤں گا —— کہوں گا مجھ سے میری جان تک لے لے مگر
تجھ کو مجھ سے نہ چھین ——"

تب ہی درزن کا دل کچھ اتنی زور سے دھڑکا کہ اسکی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی —— اندھیرے میں اس نے دیکھا کہ دیوار کے کونے میں رکھے ہوئے نیزے میں جڑا لعل کسی سرخ قندیل کی روشنی کی طرح دمک رہا تھا اس بار نہ جانے کیوں اس روشنی سے اس پر ایک خوف سا طاری ہونے لگا، خوف بڑھتا ہی گیا۔ اس کو لگا جیسے لعل سے پھوٹتی شعاعیں چمکیلے نیزوں کی مانند اس کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہونا چاہتی تھی کہ فرش پر گر پڑی۔ اس کے پیروں کی طاقت جواب دے چکی تھی اور نیزے تھے کہ بڑھتے ہی آ رہے تھے۔ وہ گھسٹتی ہوئی اس کونے تک گئی جہاں اس کا نیزہ دھرا تھا، اس نے نیزے کو پکڑنے کی کوشش کی مگر سنبھال نہ سکی نیزہ انی کی جانب سے اس پر گرا۔ درزن نے انی کو ہی دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ سرخ لعل اب درزن کی آنکھوں سے قریب تر ہو کر کسی ڈراؤنی اور شعلہ اگلتی آنکھ کی طرح اسے گھور رہا تھا۔ اس کو لگا جیسے ہر طرف ان شعاؤں سے آگ لگ گئی ہے اور اس آگ میں گھرا اس کا غریب شوہر مدد کے لئے اسے پکار رہا ہے۔ درزن اپنی دونوں مٹھیوں کی گرفت میں نیزے کی انی کو لئے نیزے کو پاگلوں کی طرح اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ پھر اس کو محسوس ہوا جیسے کمرے کی چھت اور دیواروں سے خون کے فوارے پھوٹ رہے ہوں۔ وہ خون جو اس نے اپنے بے گناہ اور مظلوم شوہر کی شہ رگ سے اچھلتے دیکھا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے نیزے کی انی کو اپنے گلے پر رکھا اور سلگتی ہوئی بڑبڑائی

(باقی صـ۶۴ـ پر)

غزلیں

ڈاکٹر سعید عارف

قصرِ ہستی متزلزل سا ہوا آخرِ شب
کس نے دی ہر درِ دل پہ صدا آخرِ شب

چھیڑ کرتا رہا آنکھوں کے دریچوں سے کوئی
میں نے بھی اوڑھ لی خوابوں کی ردا آخرِ شب

دل کی دہلیز پہ آکر کوئی آہستہ خرام
چپکے چپکے مجھے دیتا ہے صدا آخرِ شب

ناامیدی وہ لگاتی رہی نشتر دل پر
زندگی بن گئی زخموں کی قبا آخرِ شب

زندگی بخش دے شاید ترے دامن کی ہوا
ڈھونڈتا ہے تجھے بیمار ترا آخرِ شب

کوئی آہٹ ہے نہ دستک نہ تصور نہ خیال
کون دیتا ہے یہ رہ رہ کے صدا آخرِ شب

اڑ گئے خواب کے پنچھی مری آنکھوں سے سعیدؔ
شب بخیر اس نے کچھ اس طرح کہا آخرِ شب

[illegible]

اپنے ہی جلتے ہوئے گھر کا تماشہ دیکھوں
جاگتی آنکھوں سے اب اور میں کیا کیا دیکھوں

کون آئیگا جلانے کسی معبد میں چراغ
گاؤں کے سارے گھروں میں تو اندھیرا دیکھوں

لوگ کہتے ہیں یہ ہے میری بصارت کا قصور
وقت کے ہونٹوں پہ دم توڑتا نغمہ دیکھوں

دل کو سمجھاؤں کہ اس میں ہے کوئی جذبۂ خیر
اپنے دامن کی طرف ہاتھ جو بڑھتا دیکھوں

ایک دنیا کو تری ذات کا منکر پاؤں!
خود ہر اک ذرّے میں تیرا ہی سراپا دیکھوں

میں جو حق مانگوں تو کہتی ہے بغاوت دنیا
کیسے ٹوٹے ہوئے آئینے میں چہرا دیکھوں

سخت جاں وہ بھی تمہاری ہی طرح ہے ہمدم
اسکے چہرے پہ مشقت کا اجالا دیکھوں

شفیع اللہ خاں راز آزادی
اٹاوہ

محوِ حیرت تھے آئینے کتنے
سنگ ریزے حسین تھے کتنے

اپنی پہچان کو ترستے ہیں
اہلِ دنیا بدل گئے کتنے

آئینے پتھروں پہ سوئے تھے
جاگ اٹھے ہیں زلزلے کتنے

دونوں عالم قریب لگتے ہیں
خوبصورت ہیں فاصلے کتنے

کون ان آندھیوں سے پوچھے گا
جلتے دیپک بجھا دیئے کتنے

زندگی کا سفر انوکھا ہے
ایک منزل ہے، راستے کتنے

روشنی لکھ رہی تھی دھرتی پر
آسماں پر چراغ تھے کتنے

ایک کنکر ندی میں پھینکا تھا
راز ابھرے ہیں دائرے کتنے

ڈاکٹر اشفاق حسین
شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی
الہ آباد

ترقی پسند اردو غزل

ولی دکنی سے لے کر فراق گورکھپوری تک

ی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف نے حسن و عشق سے متعلق خیالات کے علاوہ بعض دوسرے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ناصر کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہے، مگر بعض ناقدین اس حقیقت فراموش کر جاتے ہیں اور اس صنف پر یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ س میں گل و بلبل اور حسن و عشق کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے ظاہری پیکر کو دیکھا اور یہ خیال قائم کر لیا ہ اس کے دامن میں ان عناصر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے سمجھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ حسن و عشق کے بیان کے پس پردہ غزل شعراء نے اخلاق و نفسیات اور سیاسی، سماجی و اقتصادی عناصر اپنے تجربات کی روشنی میں اشعار کے کیسے کیسے نادر نمونے پیش ر دیے ہیں۔ اگر ان عناصر کو پیش کرنا ہوتا ہے تو بقول غالب:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے، دشنہ و خنجر کہے بغیر

یا غالب نے معترضین اور ناقدین کو جواب دینا چاہا ہے کہ شعر کے ظاہری پیکر پر نہ جائیے۔ اس کے پردے میں شعرا کبھی مشاہدۂ حق کے اسرار و عارف کی باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں، کبھی تشبیہ، استعارہ اور رمز و نایہ اور علامتوں کے لباس میں بڑی گہری باتیں بیان کر جاتے ہیں۔ یر و غالب اور دوسرے شعراء نے ان عناصر کو پیش کر کے غزل میں ایک رف اپنے تجربات و مشاہدات کی مدد سے گہرائی و گیرائی پیدا کی ہے تو دوسری طرف اس کو وقار بخشا ہے۔ بیسویں صدی میں اور خصوصاً ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے اس صنف میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تحریک نے آزادی و خوشحالی اور ایک نئے و بہتر نظام کا منظم نظریہ پیش کیا۔ اس تحریک نے مارکس و لینن کے خیالات و نظریات کو اپنا نصب العین بنایا۔ اردو شعراء کی ایک بڑی تعداد اس تحریک سے متاثر ہوئی۔ ان شعراء نے سوشلزم کے عناصر کو اپنی شاعری میں سمویا۔ ان شعراء نے نظم کو خصوصی طور پر ذریعۂ اظہار بنایا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ نظم میں ہی ان خیالات و احساسات کی ترجمانی صاف طور پر اور مسلسل طریقے سے کی جا سکتی ہے۔ ان مقاصد کی ترجمانی کے لیے غزل کو موزوں نہ سمجھا گیا اور اس صنف کو مفید نہ سمجھ کر اس پر طرح طرح سے حملے کیے گئے۔ کسی نے اس کو ایک نیم وحشی صنف سخن کہا تو کسی نے قابلِ گردن زدنی قرار دیا۔ مگر غزل کا اپنا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ بعض ترقی پسند شعراء نے اس صنف میں بھی ترقی پسندی کے جوہر دکھائے۔ انھوں نے غزل کے لوازمات کو برقرار رکھا اور نئی نئی علامتیں، تشبیہات و استعارے ایجاد کیے۔ اس کے علاوہ قدیم علامتوں، تشبیہات اور استعاروں کو نئے معنی و مفہوم دیے۔ اس سے غزل کی سحر انگیزی میں اضافہ ہوا اور اس نے دل و دماغ کو پہلے سے زیادہ متاثر کیا۔ ذیل میں چند نمائندہ ترقی پسند شعراء کی غزل گوئی کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس صنف کی خصوصیات کو واضح طور پر سمجھا جا سکے اور اس ضمن میں شعراء کے کلام کی قدر و قیمت متعین کی جا سکے۔

مجاز نے اس تحریک سے متاثر ہو کر رومانیت سے حقیقت کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے مواد اور ہیئت دونوں کا توازن برقرار رکھا،

سیاسی و معاشی مسائل کو منظم طریقے سے سمجھا اور ان کو غزل کے اشعار میں دل نشین انداز سے سمو دیا۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اختصار کے ساتھ اشارے میں ایک کیفیت بیان کر دیتے ہیں۔ جس وقت متعدد شعراء نے غزل کو ایک ناپسندیدہ صنف قرار دے دیا تھا اس وقت مجاز نے اس میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کی غزلیں روایتی اور رسمی انداز سے ہٹ کر ہیں۔ ان میں صداقت اور خلوص کے عناصر ملتے ہیں۔ انکی غزلوں میں تندی اور تیزی کے ساتھ ساتھ رنگینی اور پرکاری کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھرپور جذباتیت اور رومانیت ہے جو اس دور کے نوجوان شعراء کی ذہنی کیفیت کی ترجمان ہے۔ نمونۂ کلام۔

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم
بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جراتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاست اہلِ جہاں سے ہم

محوِ سفر ہوں، گرمِ سفر ہوں
میری نظر میں رفعت نہ پستی

فیض ان کی غزلوں میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی احساسات زیادہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے غزل کے بنیادی تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے ماحول اور مطالبوں کی ترجمانی کی ہے اور اسطرح غمِ دوراں کو نہایت حسین اور دلکش انداز سے غزل میں سمو دیا ہے واقعات اور محسوسات کو فکر و فہم میں جذب کرلیا ہے۔ اور اس طرح ان کے ہاں شعریت پیدا ہوگئی ہے۔ ان کا مشاہدہ ہمہ گیر ہے اور انھوں نے تعبیرِ حسن کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی بھی ترجمانی کی ہے۔ ان کی امتیازی خصوصیت طرزِ بیان کی جدت ہے اور ان کے شاداب اندازِ بیان کی خاص وجہ تشبیہات کی رنگینی ہے۔ اس طرح۔ ان کے لب و لہجہ کی جدت نے غزل کو کافی متاثر کیا ہے۔
نمونۂ کلام:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غمِ روزگار کے

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں

یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی

یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رخسار، ہے کون؟

مخدوم: یہ ترقی پسند شاعری کے اس دور کے نمائندے ہیں جب جدید اردو شاعری کے سماجی اور عمرانی رجحانات ایک نئی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ انقلاب کے جذباتی اور رومانوی تصورات 'فکر' کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ مخدوم کی غزلوں میں تزئین و آرائش اپنے ہم عصر شعراء سے کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ الفاظ کی موسیقی 'آوازوں کی مناسب ترتیب' مختلف رنگوں اور تصویر پاروں کی ہم آہنگی اور لہجے کی نرمی پر متوجہ نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر کی گہرائی اور سیاسی سماجی و تہذیبی مسائل کی ترجمانی کا میلان نظر آتا ہے۔ انھوں نے انقلابی خیالات کی ترجمانی نرم و نازک لہجے میں کی ہے۔ نمونہ کلام:

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مے تلخیٔ ایام بھی پی ہے

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے
دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے

مجروح سلطانپوری: انھوں نے دوسری اصناف کے مقابلہ میں صنفِ غزل ہی کو ترجیح دی۔ ان کی شاعری کا آغاز ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں ہوا۔ انھوں نے جگر مرادآبادی جیسے کہنہ مشق استاد شاعر کی شاگردی اختیار کی تھی اور ان کی معیت میں شاعری کی نوک پلک درست کی تھی۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ بھرپور طریقے سے کیا اور آگے چل کر غزل میں اپنا ایک منفرد رنگ و آہنگ اختیار کیا۔ ان کے حساس دل اور فکر و شعور نے خارجی دنیا سے اثر

قبول کرنے پر انھیں مجبور کیا۔ اس لیے اپنے دور کے دوسرے اہم شعرا کی طرح وہ بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے اور سیاسی و سماجی کشمکش کی ترجمانی غزلوں میں کی۔ انھوں نے غزل کے روائتی انداز اور لب و لہجے انحراف نہیں کیا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ انھوں نے غزل جیسی محدود صنف میں وسعت پیدا کی۔ انھوں نے سیاسی اور سماجی مسائل کو حسن و عشق کے پیمانوں میں پیش کیا ہے

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا۔ تو چراغ راہ میں جل گئے

ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ذاتی خوشیوں اور غموں کو دنیا کے غموں اور خوشیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس طرح ان کی آپ بیتی جگ بیتی ہوگئی ہے اور ان کے دل کی آواز زمانہ کی آواز بن گئی ہے۔

آخر غم جاناں کو بڑھ کر اک دن غم دوراں ہونا تھا
اس قطرے کو بننا تھا دریا اس موج کو طوفاں ہونا تھا
آیا ہے ہمارے ملک میں بھی اک دور زلیخائی یعنی
اب وہ غم زنداں دیتے ہیں جن کو غم زنداں ہونا تھا
سنتے ہیں کہ کانٹوں سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزم جنوں کانٹوں سے گلستاں دور نہیں
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مندرجہ بالا اشعار میں ان کی امنگوں اور حوصلوں کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کی اس بے باکی اور عزم مستقل کی بنا پر انھیں ایک سال کی سزا بھی کاٹنی پڑی، مگر قید خانہ کی چہار دیواری ان کے خیالات اور جذبات کو اسیر نہ کر سکی بلکہ ان کے خیالات اور ارادوں میں اور زیادہ پختگی پیدا ہوگئی۔

ستم کو سرنگوں ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھیں گے
چل اے عزم بغاوت چل تماشا ہم بھی دیکھیں گے
جلا کے خون دل گیتی کو اے شوق چمن بندی
کف ہر غنچہ میں تقدیر صحرا ہم بھی دیکھیں گے

دست منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور بھی رسوا سر بازار سہی

سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

دوسری عالمی جنگ نے پوری دنیا کو متاثر کیا تھا اور بعض ممالک میں اسکی لائی ہوئی تباہی اور بربادی کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ ایشیا کے ممالک بطور خاص اس کی زد میں تھے۔ ترقی پسند شعرا نے اس کی مذمت کی اور فسطائی ذہنیتوں و سامراجی قوتوں کا پردہ فاش کیا۔ انھوں نے امن اور صلح و آشتی کا پیغام دیا چنانچہ مجروح نے بھی ان خیالات و جذبات کی ترجمانی کی اور ان کو یقین ہے کہ ایک دن امن کا دور دورہ ہوگا اور جنگجو قوتوں کو ندامت کا سامنا کرنا ہوگا۔ انھوں نے غزل کے اشعار میں ان مسائل کو جس کمال اور خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے اس کی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی

فضائے ایشیا پر یہ گھٹا ہے جنگ کی ساقی
بہار آئی تو بوئے جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے
ابھی تو لکھ کر ان دل سے نازک آبگینوں کی
بہ فیض امن پھر ساغر میں دریا ہم بھی دیکھیں گے

وہ سوشلزم کے دلدادہ ہیں۔ اشتراکیت کا سرخ نشان سورج کی روشنی سے کم تابناک نہیں ہے۔ سماج میں تغیرات رونما ہو رہے ہیں اور عوام بیدار ہو رہے ہیں۔ اس لیے اب زندہ رہنے کی خواہش بھی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اور کچھ کر گزرنے کی جستجو پروان چڑھ رہی ہے حالانکہ ابھی اس کی اجازت نہیں ہے ؎

گو رات مری صبح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگ حنا کم تو نہیں ہے
اب کارگہ دہر میں لگتا ہے بہت دل
اے یار کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں ہے
کچھ زخم ہی کھائیں چلو کچھ گل ہی کھلائیں
مانا کہ بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے

انھوں نے غزلوں میں معنویت پیدا کی۔ آراستگی بیان کے سہارے ہر قسم کے مضامین کو غزل کے اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ان کی غزلیں اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہیں کہ غزل عصرِ حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔ انھوں نے نئے نئے تجربے کئے اور یہ تجربے حسنِ بیان کی وجہ سے کامیاب بھی ہوئے

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے سرمائے میں قابلِ فخر اضافہ کیا ہے۔ ان کے تشبیہات اور استعارات میں حسیاتی پہلو نمایاں ہے۔ انھوں نے حسی پیکر تراشی کے ذریعہ غزل کو ایک نئی آب و تاب بخشی ہے۔ اس میدان میں ان کے مقابلہ میں کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا ہے۔

•••

حکایت ایک نیزے کی : (صفحہ ۱۴ کا بقیہ)

"تجھے قسم ہے اپنے جلال کی، مجھے میری جگہ بتا دے۔ مجھے میرا مقام دے دے"

درندں کے ہاتھ نیزے کی انی کو عالمِ دیوانگی میں گلے کے نرم نرم گوشت میں اتارتے ہی بے چارے بے بس تھے اور اس کے اچھلتے پھلتے گرم اور جوان خون کی ننھی سی ایک ننھی فرش پر قلقاریاں بھر رہی تھی ——••

ادھوری : (صفحہ ۲۵ کا بقیہ)

"ایسی باتیں نہ کرو۔ اس موئے کو جب دیکھ لیتی ہوں تو اپنی غلطی یاد آجاتی ہے اور سینے پر گھونسا سا لگتا ہے۔ فکر نہ کرو میں بیڑیاں بناتی ہوں اس سے خرچ چل جائے گا۔"

"مگر ایسے زندگی کیوں کر بتائے گی تو"

"تم لوگوں کے لئے وہ نہیں رہے ہیں۔ لیکن میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ میرے ساتھ ہیں"

دوسرے موقع پر روشن نے اس سے کہا "مر دے تو تجھے گالیاں دیتا" "آخر وقت میں نے جب کہا کہ اب تو مجھے معاف کرو" تو کہنے لگے۔ "تجھے کس بات کی معافی دوں۔ وہ تو کوئی اور ہی تھی جو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور وہ کبھی نہیں آئے گی۔

اس واقعہ کے کئی دن کے بعد مقصود نے آکر روشن سے کہا۔ روپے تمھارے پاس آچکے ہیں لیکن تم ابھی تک رادھا کے پاس نہیں گئے۔ کل وہ کہہ رہی تھی کہ اگر دو ایک دن میں روشن نہیں آئے تو مجھے موٹے سیٹھ کا بن جانا پڑے گا"

"جاتی ہے وہ موٹے کے پاس تو جانے دو"

مقصود سراپا حیرت بن کر روشن کو تاکنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے"

تھوڑی دیر کے بعد روشن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"رادھا کو میں دیر میں سمجھا لیکن سمجھ گیا کہ اس کے پاس عورت کا جسم تو ہے لیکن عورت کا دل نہیں —— وہ ادھوری ہے۔"

مقصود روشن کا منہ تکنے لگا کہ کیا مطلب ہے اس کا۔ لیکن روشن نے پھر اس کے ہر سوال کا جواب خاموشی سے دیا۔

★

مولانا امداد صابری —— صفحہ ۵۰ کا بقیہ

انھوں نے کبھی کہیں جانے کی ہامی نہیں بھری۔ لیکن افسوس کہ اردو صحافت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے والا اور اخبارات و رسائل کی اہمیت کو عوام پر عیاں کرنے کی غرض سے اپنے اصولوں کو قربان کر دینے والا یہ مردِ مجاہد اپنی زندگی میں اپنے مقصد کی تکمیل نہ کر سکا اور اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں تاریخ صحافت اردو کی چھٹی جلد بھی مکمل نہ ہو سکی جس میں ۱۹۴۷ء تک کے اخبارات و رسائل کے بارے میں انھوں نے عرق ریزی کی تھی۔ ▪ ▪

غزلیں

عبدالصمد تپش

آنکھ تھی سوجی ہوئی اور رات بھر سویا نہ تھا
اس طرح وہ ٹوٹ کر شاید کبھی رویا نہ تھا

ان کے شوقِ دید میں تھا اس قدر کھویا ہوا
میں بھری محفل میں تھا ایسا کہ میں گویا نہ تھا

امتحاں ذوقِ سفر کا تھا تو سورج سر پہ تھا
دھوپ تھی، دیوار تھی لیکن کہیں سایا نہ تھا

وہ بڑا تھا پھر بھی وہ کچھ اس قدر بے فیض تھا
اک گھنیرے پیڑ میں جیسے کوئی سایا نہ تھا

شاہرہ پر خون میں اک لاش تھی لتھڑی ہوئی
آئے دن کا حادثہ تھا اس لیے چرچا نہ تھا

ہر نگہ پیاسی تھی لیکن وقت کی تحویل میں
اک سراب آسا زمیں تھی دور تک دریا نہ تھا

سریندر سنگھ دیوانہ

سانسوں کے آس پاس کا ہر رنگ جل گیا
وہ شخص خوش نصیب تھا، بچ کر نکل گیا

یا لوگ سنگ دل ہیں کہ پھر جانتے نہیں
یا رنگ پھر ہمارے لہو کا بدل گیا

دیکھو تمھارے چھاؤں میں رہنے کے باوجود
ایسی جلی زمین کہ نقشہ بدل گیا

میرے قدم تو ریت پہ پڑتے رہے مگر
میں کیا کروں کہ وقت کا صحرا نکل گیا

اب صبحِ نو کی فکر میں چُپ چُپ ہیں یار لوگ
وہ سانحہ جو ہونا تھا، اس بار ٹل گیا

دیوانہ دیکھتا رہا حیرت سے بھیڑ میں
اس کا ہی سایہ آج اسی کو نگل گیا

سنّاٹا آواز بنا ہے
درد کا یوں اظہار ہوا ہے

یادوں نے جب لی ہے کروٹ
زخموں کا ہر بند کھلا ہے

اس نگری کا رہنے والا
قتلِ وفا پر خوش لگتا ہے

خط پڑھنے میں کانپ رہے ہو
ایسا اس میں کیا لکھا ہے

گھر آنگن ہے ساری دنیا
اس سے مل کر یوں لگتا ہے

برسوں کی اُلفت کا رشتہ!
اک لمحے میں ٹوٹ گیا ہے

سہیل وحید
دھے آپٹیکل ہاؤس، گریک گنج۔
سیتاپور

مولانا امداد صابری

اردو صحافت ابتدا سے ہی اردو کے محققین اور ادبا کی بے توجہی کی شکار رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو صحافت پر نہ تو معیاری کتابیں دستیاب ہیں اور نہ ہی اس موضوع پر لکھنے والوں کو کوئی اہم مقام حاصل ہوا۔ اس موضوع پر جن چند قلم کاروں نے قلم اٹھایا ہے ان میں مولانا امداد صابری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مولانا امداد صابری نے نہ صرف یہ کہ "تاریخ صحافت اردو" مرتب کی بلکہ صحافت کے موضوع پر کئی دوسری کتابیں بھی لکھیں۔ ان میں "روح صحافت" اور "اردو کے اخبار نویس" (حصہ اول) خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

"اردو کے اخبار نویس" (حصہ اول) میں انھوں نے ۱۸۲۵ء سے ۱۸۵۷ء تک کے اردو اخبار و رسائل کے اڈیٹروں کے حالات زندگی قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب میں جن صحافیوں کے حالات زندگی درج ہیں ان میں اردو کے اولین اخبار "جام جہاں نما" کے اڈیٹر جناب ہری ہر دت، "دہلی اردو اخبار" کے اڈیٹر مولوی محمد باقر، "صادق الاخبار" کے اڈیٹر سید جمیل الدین، "اودھ اخبار" لکھنؤ کے اڈیٹروں میں حاجی ہادی علی شاہ "اشک"، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا غلام محمد خاں تپش دہلوی، مولانا سید امجد علی اشہری، راجہ شیو پرشاد، مولوی رونق علی افسوس، منشی طوطا رام شایاں لکھنوی، مرزا یگانہ چنگیزی، مولوی فخر الدین فخر لکھنوی اور اودھ اخبار کے مالک منشی نولکشور جیسے مایۂ ناز صحافیوں کے حالات زندگی اور ان کے صحافتی کارناموں کے علاوہ تقریباً پچاس صحافیوں کے حالات زندگی بھی درج ہیں۔ یہ کتاب صرف اس لیے ہی اہم نہیں ہے کہ اس میں اُس دور کے صحافیوں کے حالات زندگی درج ہیں اور اس دور کی اخبار نویسی کی داستان لکھی ہوئی ہے بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں اُس دور کے تاریخی، سیاسی، تمدنی، معاشی، تعلیمی، سماجی اور ادبی واقعات بھی درج ہیں۔ اپنی انھیں خوبیوں کی بنا پر ہی یہ کتاب تاریخی اہمیت کی حامل بن سکی ہے۔

مولانا کے مطابق ۱۹۳۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کی سیاسی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر اور ان کی لکھنے پڑھنے کی دلچسپی دیکھ کر اُن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ تاریخ صحافت اردو تالیف کریں۔ ان کی رہنمائی کے زیر اثر مولانا نے یہ کام شروع کیا تھا جس کا اختتام وہ اپنی آخری سانس تک نہ کر سکے اور یہ افسوس اور مایوسی لے کر ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے کہ ان کی زندگی میں یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ تاریخ صحافت اردو کی پانچ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ جس کی پہلی جلد ۱۹۵۳ء میں طبع ہوئی جس میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے اخبارات و رسائل کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس کے بعد دوسری جلد ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آئی جس میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک کے اخبارات و رسائل کے بارے میں، تیسری جلد ۱۹۶۳ء میں طبع ہوئی جس میں ۱۸۶۶ء سے ۱۹۰۰ء تک کے اخبارات و رسائل کے بارے میں، چوتھی جلد ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی جس میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک کے اخبارات و رسائل کے بارے میں اور پانچویں جلد ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آئی جس میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کے اخبارات و رسائل کے بارے میں مکمل تفصیلات درج ہیں۔ چھٹی اور آخری جلد جو کتابت کے مراحل میں ہے اس میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کے اخبارات و رسائل کا مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

مولانا کو اخبارات و رسائل سے کتنا شدید لگاؤ تھا اور وہ ان کی اہمیت کو نظر انداز کیے جانے سے کتنے نالاں تھے اس کے متعلق وہ "روح صحافت" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"مورخین و محققین نے قدیم و جدید اخبارات و رسائل کی اہمیت کو اب تک نہیں سمجھا اور یہ نہیں جانا کہ ان میں کس قدر بیش قیمت اور نادر معلومات درج ہیں۔"

اسی طرح "اردو کے اخبار نویس (حصہ اول) کے دیباچہ میں ادب کو صحافت پر فوقیت دیے جانے اور اخبارات و رسائل کی اہمیت کو نظر انداز کیے جانے نیز صحافیوں کی خدمات و قربانیوں کو یکسر فراموش کیے جانے کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"اردو کا شاعر ہو یا ادیب یا صحافی ان میں سے ہر ایک نے ملک و قوم کی خدمت کی ہے اور اردو زبان کو ترقی دینے کی سعی اور جدوجہد میں اہم پارٹ ادا کیا ہے بلکہ اردو کی ترقی کا باعث ہی یہ تینوں طبقے بنے ہیں۔"

لیکن تاریخ ادب اردو میں شعرا اور ادیبوں کا ذکر تو ہے لیکن نہیں ہے تو اردو اخبارات و رسائل کا اور صحافیوں کا نہیں ہے بھولے بھٹکے کسی اخبار یا رسالے کا ذکر آگیا لیکن صحافیوں کو بالکل بھلا دیا گیا ہے۔ ان کے حالات زندگی کسی تاریخ میں نظر نہیں آتے۔

شعرا اور ادیبوں کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اخبار و رسائل اور صحافیوں کے کارنامے بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ بغور دیکھا جائے تو زیادہ ہی نظر آئیں گے۔ قوم و ملک میں بیداری، انقلاب و تغیر و تبدیلی لانے میں بڑا ہاتھ اخبارات و رسائل اور صحافیوں کا ہی ہے۔ قربانی دینے میں ان کا درجہ سب سے اونچا ہے اردو زبان کو ملک کے کونے کونے میں پہونچانے اور مقبول عام بنانے میں ان کو فوقیت حاصل ہے ان اخبارات و رسائل کے اوراق میں وہ معلوماتی خزانے پوشیدہ ہیں جو کسی شاعر کے کلام اور ادیبوں کی تصنیفات میں نہیں ملیں گے۔

مولانا کو اخبارات کی اہمیت کا شدید احساس تھا اور وہ ہمیشہ یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی اخبارات کی اہمیت کو سمجھیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ ادبی محفلوں میں جلسوں میں نمائشوں میں یونیورسٹیوں میں اسکولوں میں اور دوسری جگہوں پر اس بات کا پرچار کیا جائے اپنی انھیں کوششوں اور کاوشوں کا ذکر انھوں نے کیا بھی ہے: "میری کوشش رہی ہے کہ علمی ادبی و تحقیقی طبقہ میں اخبارات و رسائل کی اہمیت بتائی جائے اور صحافیوں نے ملک و قوم کے لیے جو خاموش قربانیاں دی ہیں ان سے واقفیت کرائی جائے تاکہ یہ طبقے اخبارات و رسائل کی طرف توجہ دیں اور ان سے استفادہ کریں۔"

صحافت سے مولانا کی اس قدر دلچسپی کی وجہ محض اس لیے نہیں تھی کہ انھوں نے صحافت پر کام کیا تھا بلکہ خاص وجہ یہ تھی کہ وہ خود بھی تقریباً ڈیڑھ درجن سے زائد اخبارات سے وابستہ رہے تھے انھوں نے جنگ آزادی کے دوران اخبار نویسی کی تھی اس لیے وہ بخوبی جانتے تھے کہ اردو اخبارات کن مشکلات سے دوچار ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اردو کا صحافی کیسے کیسے دشوار گذار مراحل سے گذرتا ہے اس کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے تب ایک اخبار منظر عام پر آتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ مشکل ترین کام ہے اور جو لوگ اس کام میں اپنے آپ کو لگاتے ہیں ان کے دلوں میں ملک و قوم نیز زبان کے لیے سچا جذبہ ہوتا ہے اپنے اسی تلخ تجربہ کی بنا پر انھوں نے لکھا ہے کہ "ہندستانی صحافت کی ابتدا قربانیوں سے ہوئی اور امتحان کا دروازہ ایسا کھلا کہ امتحانات کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔"

مولانا نے ۱۹۲۳ء کے بعد سے باقاعدہ انگریزوں کے خلاف تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور ۱۹۴۰ء میں دہلی سے ہفت روزہ "اتحاد" شروع کیا۔ یہ اخبار ۱۹۴۲ء میں بند ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے ہفت روزہ "تیغ" میں بحیثیت اڈیٹر کام کیا اور انگریزوں کے خلاف اپنی شعلہ بیانیاں جاری رکھیں۔

اگست ۱۹۴۲ء میں جب تحریک آزادی نے زور پکڑا اور انھیں ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد ۱۹۴۵ء میں ہفت روزہ اخبار "چنگاری" کی اڈیٹری کی۔ اس اخبار میں بھی انھوں نے انگریزوں کے خلاف تحریریں چھاپیں نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے انھیں پھر جیل پہونچا دیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں انھوں نے اپنا اخبار "قومی حکومت" جاری کیا۔ اس اخبار کے شروع ہونے کے تین مہینے بعد ہی ملک تقسیم ہوگیا اور تقسیم کے بے سرو سامانی کے ماحول میں جب ہر طرف نفسی نفسی کا عالم تھا اخبار پھر بند ہوگیا۔ اس کے بعد "قومی حکومت" ۱۷ راکتوبر ۱۹۴۸ء کو دوبارہ شروع ہوگیا۔ ۱۹۴۹ء میں جب اخبار "آزاد ہند" شروع ہوا تو اس کے اڈیٹر مولانا ہی تھے۔ اس کے بعد بھی مولانا کا صحافتی سفر ختم نہیں ہوا اور انھوں نے "انگارہ" "جماعت"، "عوامی رائے"، "صدیقی گزٹ" اور "متحدہ محاذ" میں کام کیا۔

جیمس آگسٹس ہکی نے ہندستان سے پہلا اخبار "ہکیز بنگال گزٹ" نکالنے کا مقصد یوں بیان کیا تھا: "اخبار چھاپنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے اور نہ میری طبیعت کو اس کام سے لگاؤ ہے میری پرورش بھی اس طرح نہیں ہوئی ہے کہ میں محنت ومشقت کی غلامانہ زندگی کا عادی بن سکوں لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں روح اور دماغ کی آزادی خریدنے کے لیے اپنے جسم کو بخوشی غلام بنا رہا ہوں۔ بالکل اسی طرح مولانا نے اپنے آپ کو اردو صحافت کا غلام بنالیا تھا وہ اُن محققین میں سے تھے جنھوں نے تحقیق کے سارے حقوق ادا کیے، وہ ایسے اخبار نویس تھے جو کبھی بھی مصلحتوں کے آگے سرنگوں نہ ہوئے وہ ایسے سیاست داں تھے جنھوں نے سیاست کی نئی جہتیں متعین کیں۔ ایک مرد مجاہد کی طرح انھوں نے اخبار نکالے صحافت کی تاریخ مرتب کی اور اپنا بہترین اندوختہ اردو والوں کی نذر کر گئے۔ بے شک وہ بیسویں صدی کے ایک عظیم اردو قلم کار تھے۔

ایسے ماحول میں جبکہ اردو زبان چند ادبی اصناف کی گرداب میں ہو یہ کام آسان نہیں تھا اس کے لیے انھوں نے ہر محاذ پر جنگ کی ہر محفل میں ہر موقع پر کہا کہ میر، غالب اور اقبال نصاب میں شامل ہیں کرشن چندر، بیدی اور منٹو پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دی جارہی ہیں صحیح ہے۔ لیکن اگر طالب علموں کو "اودھ اخبار" کی خدمات سے بھی متعارف کرایا جائے "دہلی اردو اخبار" کی تاریخ پڑھائی جائے اس کے اڈیٹر کی قربانی کے بارے میں بتایا جائے "پیسہ اخبار" کی اہمیت بتائی جائے اور بتایا جائے کہ ان اخبارات نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں تو کیا حرج ہے۔

مولانا نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلسل غیر ادبی یا نیم ادبی موضوعات پر کام کیا۔ ان کے لیے ایسے موضوعات پر کام کرنا بہت عزیز ہوتا تھا جس پر کسی نے توجہ نہ کی ہو یا جس کو سب نے نظر انداز کر دیا ہو۔ انھوں نے صحافت کے علاوہ متعدد ایسے موضوعات پر لکھا جو اردو والوں کو پسندیدہ نہیں ہوتے انھوں نے ہمیشہ علمی موضوعات پر کام کرنے پر زور دیا۔ کسی بات کی تہہ تک پہونچے بغیر کسی چیز کا حوالہ دینا وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے اور یہی تحقیق کا حق بھی ہوتا ہے۔ تاریخ صحافت اردو کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد انھوں نے خود اپنی کتاب میں تقریباً پانچ سو غلطیاں نکالیں اور معافی کے ساتھ اس کے دوسرے اڈیشن میں تصحیح کی۔

دنیا میں ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم ہے جو بیک وقت سیاست کے میدان میں بھی سرگرم رہے ہوں قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہوں اور قلم ہاتھ میں رہا ہو۔ مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج میں شمولیت سے کیا تھا۔ ہندستان کے آزاد ہونے کے بعد وہ کافی عرصہ تک خاموش رہے اور پھر مایوس ہونے کے باعث کانگریس چھوڑ دی اور کانگریس کی مخالف پارٹی میں شامل ہو گئے۔ کافی عرصہ تک وہ دہلی کے ڈپٹی میئر بھی رہے اور ابھی چند سال قبل مسلم مطلقہ قانون بننے سے قبل اس مسئلہ پر اس پارٹی سے نظریاتی اختلاف کی بنا پر وہ پارٹی بھی چھوڑ دی۔

اپنی سیاسی اور دوسری مصروفیات کی بنا پر ان کو اکثر دورے پر بھی جانا پڑتا تھا جلسوں اور اجتماعات میں شرکت کے سلسلہ میں وہ خاصا محتاط رہتے تھے لیکن اردو سے متعلق جلسے جلوسوں میں شرکت سے انھوں نے کبھی گریز نہیں کیا ۱۹۷۳ء میں جب وزیر اطلاعات ونشریات مسٹر اندر کمار گجرال تھے تب لکھنؤ میں کل ہند اڈیٹرس کانفرنس ہوئی تھی اس میں قدیم اردو اخبارات کی ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں آنجہانی اندرا گاندھی جو کہ اس وقت وزیر اعظم تھیں شریک ہوئی تھیں اس بات کا اعتراف کم وبیش سبھی نے کیا تھا کہ قدیم اردو اخبارات کی نمائش صرف مولانا امداد صابری کی بدولت ہی ممکن ہو سکی ہے۔ اس کانفرنس میں مولانا نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:

> "میں ایسے اجتماعات میں جہاں سرکاری لوگوں کی شرکت ہوتی ہے اس میں اپنی شمولیت کو اچھا نہیں سمجھتا ہوں اس لیے ان میں شریک نہیں ہوتا ہوں اور اپنے اس فیصلے پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔"

لیکن پھر آگے چل کر اس کانفرنس میں اپنی شرکت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

> "لیکن میں اپنے فیصلے کے مقابلے میں اردو کی بقا اور تحفظ کو مقدم سمجھتا ہوں۔"

مولانا کی زندگی میں ایسے کئی موقعے آئے جب ان کو اپنے فیصلے بدلنا پڑے اور انھوں نے کسی مصلحت کے بغیر اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کر کے اجتماعات میں شرکت کی لیکن ایسے جلسوں میں ہی جہاں اخبارات سے متعلق کوئی معاملہ ہو ورنہ
(باقی صفحہ ۶۴ پر)

شائستہ عنبر
بی۔ ۵ آفیسرز کالونی
اناؤ۔ یوپی

افسانہ

کانچ کا وجود

یہ کہانی جو میری آپ بیتی ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ میرے لہو سے روشن و تابناک ہے اور جس میں تمھیں اپنے باپ کا مکروہ چہرا نظر آئے ...... لو سنو! میرے بیٹو! مجھے حیرت سے نہ دیکھو اور نہ اپنے چہرے پر استعجاب کی لکیریں پیدا کرو۔

مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ یہ سب میری قسمت کا کھیل ہے۔ ورنہ عارف جیسے باوقار شوہر کی جدائی کا صدمہ کیوں اٹھانا پڑتا۔

کشمیر میں میرے والد محکمۂ جنگلات میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جس کی خوبصورت، خوش رنگ وادیوں، دل کش آبشار ہوا سرسبز و شاداب منظر اور پُر فضا ماحول میں میرے شعور کی آنکھ کھلی اور وہیں میرے بچپن نے جوانی کی حسین شاہراہوں پر چلنا سیکھا۔

حصول تعلیم کے بعد میرے والدین نے میری شادی عارف جیسے ہونہار، تعلیم یافتہ اور پُرکشش شخصیت کے مالک سے کر دی۔ جو لکھنؤ کے ایک انگریزی اخبار کے اڈیٹر تھے۔ شادی کے بعد ہماری ازدواجی زندگی انتہائی خوشگوار گذرنے لگی۔ ایسا لگتا کشمیر کا سارا حسن ہماری زندگی میں سمٹ آیا ہو۔ ہر وقت بہار و کیف کے نغمے، رنگ و نور کی بارش ہوتی رہتی۔

وقت پرندے کی طرح اڑتا رہا اور ہمیں پتہ نہ چلا کہ ہم محبت کی فضا میں کتنی دور پرواز کر چکے ہیں۔ ہمیں احساس اس وقت ہوا جب ہماری زندگی میں ننھے جاوید کی قلقاریاں سنائی دیں۔ جو ہوبہو عارف کی تصویر تھا۔ ہم لوگوں کی محبت اور پائیدار ہوتی گئی۔ کہ اچانک میرے اوپر غم کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اور میرے حسین خواب بکھر کر رہ گئے اور مجھے اپنا وجود کانچ کی طرح ریزہ ریزہ محسوس ہونے لگا۔

زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کرنے اور میرے خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے والے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئے تھے۔ اور میں یک و تنہا بے آب و گیاہ ریگستان میں کھڑی تھی اور میری گود میں ایک ننھی سی جان بلک رہی تھی۔ جس کا مستقبل میرے ناتواں کاندھے پر تھا۔

میں نے عارف کی امانت جاوید کو کسی لائق بنانے کا عزم کر لیا کیوں کہ اب وہی میری زندگی کا واحد سہارا تھا۔ یوں تو میں اُسی دن مر گئی تھی۔ جس دن عارف کو سفید کفن میں لپیٹا گیا تھا۔

میں ٹھوکریں کھاتی رہی کوئی سہارا، کوئی ذریعہ کوئی وسیلہ نہ تھا۔ سوائے خدا کی ذات کے ــــ میں نے کپڑے سینا شروع کر دیے اور جب کچھ پیسے پس انداز ہو گئے۔ تو میں الگ کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگی۔ پھر ایک دن مجھے اسکول کے بچوں کی ڈریس سینے کا کام مل گیا۔ جس میں خاطر خواہ آمدنی ہونے لگی۔ میرے اندر جاوید کو اچھی تعلیم و تربیت دینے کی جو لگن تھی وہ اور تیز ہو گئی۔ میں اور زیادہ محنت کرنے لگی۔

یہ کام مجھے اسکول کے پرنسپل جمیل صاحب کی مہربانیوں سے ملا تھا۔ اس طرح وہ اکثر میرے یہاں آنے لگے۔ میں ان سے ملنے میں گریز کرتی۔ لیکن مجبوراً ملنا پڑتا۔ مجھے ان کی حریص نگاہوں سے ڈر محسوس ہوتا۔ اور مجھے یہ سمجھنے میں قطعی دیر نہ لگی۔ کہ ان کا آنے کا مقصد کیا ہے۔

اور پھر ایک دن انھوں نے غضب ہی کر دیا میرے ساتھ شادی کا

پیغام بھجوایا جس پر مجھے بڑا غصّہ آیا اور یہ بات جب میری سسرال والوں کو معلوم ہوئی۔ تو انھوں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ اور عارف کے ترکے سے جاوید کو محروم کرنے کا اعلان کر کے میرے ساتھ اپنے خون کے رشتے جاوید کو بھی ٹھکرا دیا۔

میری رُوح دنیا والوں کے گندے اور فحش طنز و نشتر سہتے سہتے چھلنی ہوگئی تھی۔ میں ہر وقت اپنی بدنصیبی پر روتی رہتی کہ ایک دن کچھ خواتین اور اُن کے ہمراہ جمیل صاحب آگئے اور کہنے لگے کہ میں کوئی گناہ تو کر نہیں رہا تھا۔ سنت نبویؐ پر عمل کر رہا تھا، بیوہ عورت سے نکاح کرنا خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق افضل ترین عمل ہے۔ میں اُسے حقیقت کا لبادہ پہنانا چاہتا تھا۔ لیکن تم نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں تمھیں ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ سماجی بندھن کی ضرورت ہے اور مجھے گھر کو چلانے کے لیے ایک نیک بیوی کی۔ اور مجھے تمھارے اندر یہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو ایک اچھی بیوی میں ہونی چاہیئے۔ ان کے ہمراہ آئی ہوئی عورتوں نے بھی مجھے زمانے کی اونچ، نیچ سے آگاہ کرتے ہوئے جمیل صاحب سے عقد ثانی کے لیے زور دیا۔

میں نے اپنے حالات اور اپنی زندگی کے بارے میں سوچ کر اپنی شکستہ زندگی کو جمیل صاحب کے حوالے کر دیا۔ لیکن واہ ری قسمت کہ میں اُن کی اس ازلی خواہش جو ہر انسان میں ہوتی ہے کہ ایک ننھا سا بچہ گھر کے آنگن میں مسکراہٹ کے پھول بکھیرے (جاوید کی پیدائش کے وقت میں ہمیشہ کے لیے بانجھ ہوگئی تھی) نہ پوری کر سکی تھی۔

اور جب کئی سال بیت گئے اور میری گود ہری نہ ہو سکی۔ تو انھوں نے دوست اور اعزا کے کہنے پر دوسری شادی کر لی تاکہ ان کی زندگی میں معصوم قلقاریاں سنائی دے سکیں۔

یہیں سے میری بدنصیبی کی داستان اور طویل ہوگئی۔ ان کی زندگی میں ثریّا کے داخل ہوتے ہی میری حیثیت ایک ماما کی ہو کر رہ گئی تھی مجھے ایک شکستہ اور بوسیدہ سا کمرہ رہنے کو ملا میں اُسی پر صبر و شکر کر کے زندگی گذارنے لگی۔

ثریّا نئی عمر کی شوخ طرحدار لڑکی تھی اس کی فطرت ایک آزاد پنچھی کی طرح تھی۔ وہ گھر کی چہار دیواری میں کیسے قید رہ سکتی تھی ایک تتلی کی طرح ہر پھول پر منڈلاتی رہتی۔ اُن کی اولاد کی خواہش کو ضرور اس نے پورا کر دیا تھا لیکن گھر کی ذمہ داری سے بے پرواہ آزادی کی راہ پر گامزن رہی وہ بچے پیدا کرتی رہی اور ان کی پرورش و پرداخت میرے حصے میں آتی رہی۔

دن گذرتے رہے اور وہ آزاد فضا میں اڑتی رہی۔ جمیل صاحب اس کی حرکت سے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے رہے لیکن اس سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتے اگر کبھی انھوں نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو محسوس ہوتا کہ سامنے آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا ہے اور وہ اُس میں جھلستے جا رہے ہیں۔

غرض کہ تمھارے باپ کی زندگی میں زہر گھلتا گیا۔ غم غلط کرنے کے لیے وہ شراب پینے لگے۔ ثریّا پر تو اُن کا بس نہ چلتا اس لیے سارا غصّہ وہ مجھ پر اتارتے۔ مار پیٹ گالی گلوچ۔ میری زندگی کا ایک حصّہ بن گیا۔

داستانِ غم سناتے سناتے اس پر اچانک کھانسی کا دورہ شروع ہوگیا۔ اور کھانستے کھانستے وہ بے دم ہو کر بستر پہ گر کر ہانپنے لگی۔ پاس بیٹھی ہوئی سیما ماں کا سر سہلانے لگی۔ لیکن اس کی حالت غیر ہوتی گئی اور پھر خون کی ایک قے ہوئی جس سے بستر کی سفید چادر داغدار ہوگئی اور سانس اکھڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ شکیل گھبرا گیا اور دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کو خبر کرتا ہوا اپنے پاپا کو بلانے چلا گیا

جمیل صاحب شب خوابی کے لبادے میں صوفہ پر بیٹھے ہوئے اخبار دیکھ رہے تھے۔ شکیل کو تیزی سے آتا دیکھ کر گھبرا گئے اور سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگے۔ "پاپا! ممّی کی حالت بہت خراب ہے (وہ اور سیما نزہت کو ممّی ہی کہتے تھے) جلدی چلئے ممّی کی بے چین آنکھیں آپ کو تلاش کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ پے در پے صدمات اور سینے پر چوٹ لگنے کے باعث کوئی نس پھٹ گئی ہے بچنا مشکل ہے" وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے واپس لوٹ گیا۔

جمیل صاحب بے چینی کے عالم میں کمرے کے اس کونے سے اُس کونے تک جاتے اور پھر پلٹ پڑتے۔ اُن کی آنکھوں میں نزہت کا وہ چہرہ گھوم رہا تھا جب وہ اُن کی زندگی میں دلہن بن کر آئی تھی اور آج ہڈی کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو لرز اُٹھے۔ اور وہ سوچنے لگے۔ نزہت کو یہ روپ دینے والے وہ خود ہیں۔ انھوں نے جو ظلم اس پر کیا ہے اسے

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

مشاہیر کے خطوط

یگانہ بنام مسعود حسن رضوی ادیب

Latun (DEC.
21-12-36

مکرمی تسلیم!

نوازش نامہ اور نگار کا مطلوبہ پرچہ پہنچا۔ بہت بہت شکریہ۔ مگر میرے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ پرچے کے لیے خود آپ کو دفتر نگار میں نا پڑے گا ورنہ آپ کو اتنی تکلیف نہ دیتا۔ خیر اس بے چارے موہانی کی Common sen. میں فتور پہلے ہی تھا مگر اب اور زیادہ ہو گیا ہے یدھی سی بات کو وہ سیدھی طرح سمجھنا نہیں جانتا۔ مجھ کو تو اس کی عقل علم میں اسی وقت شبہ ہوا تھا جب اس نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں مرزا دبیر مرحوم کو میر انیس مرحوم پر ترجیح دی۔ میرزا دبیر کو وہ ایک ایسا ہری ٹھہراتا ہے جس کی بھاری دکان میں جواہرات کے انبار لگے ہوئے یں چاروں طرف بے ترتیبی ہے۔ اور میر انیس کو وہ ایک ایسا بساطی ٹھہراتا ہے جس نے اپنی چھوٹی سی دکان سلیقے کے ساتھ سجا رکھی ہے۔ گویا میر انیس کی ایک ادھوری سی پونجی ہے۔ بھلا ایسی ذہنیت میر انیس کی عظمت کا ندازہ کیونکر کر سکتی ہے۔ میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی کے قطعات کی سٹ میں بھی اسی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے جو سلامت روی سے محروم ہے۔ اختصار کلام کی حدود اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اگر اردو فارسی کے ادیب کو نہ ہو تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ ایشیائی شاعری میں غزل یاتی اور قطعات نے اختصار کلام کے حسن کو جس مرتبہ کمال پر پہنچا دیا ہے وہ اتنا بدیہی ہے کہ اس پر بحث و مباحثہ کی ضرورت ہی نہیں مذکورہ بالا اصناف پر اردو، فارسی لٹریچر کا مطالعہ کرنے والوں کو اختصار کلام کی خوبیوں کا اندازہ خود بخود ہو جانا ایک لازمی چیز ہے مگر اس پر بھی اختصار و جامعیت کے مفہوم کو جو صحیح طور پر نہ سمجھے تو اس کا کیا علاج۔؟

اچھا یہ تو فرمایئے کہ آیات وجدانی کی شرح و تنقید و محاکمہ آپ کب کریں گے؟ موجودہ شرح جو چھپی ہوئی ہے وہ اک ادھوری چیز ہے۔ میں تو اپنے اصول اپنے کیرکٹر (خصوصاً جنگجوئی) کے سبب اپنے سرمایۂ ادب کو ضائع کر چکا۔ میں ضائع کرنے پر مجبور تھا کیا آپ بھی آیاتِ وجدانی اور ترانہ کو ضائع کرنا گوارا کریں گے یا اس آرٹ (اگر یہ آرٹ واقعی آرٹ ہے) سے ملک کو روشناس کرائیں گے؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کوئی Fitzgerald ملے گا تو کب ملے گا۔ مجھے ڈاکٹر بجنوری جیسے دیوانے بدحواس شرح نگار کی ضرورت نہیں۔ ہاں رضوی جیسا سمجھا بوجھا ہوا معتدل مزاج شرح و تنقید کا حق ادا کر سکتا ہے۔

میرزا یگانہ

Latun (Dec)
7th Feb. 1936

مکرمی زاد لطفکم۔ سلام شوق

بہت دنوں سے آپ کا حال کچھ معلوم نہیں۔ کبھی کبھی دور افتادگان بزم کو بھی یاد کر لیا کیجیے تو کیا برا ہے۔ میں نے آغا جان سلمہ کے ہاتھ غالب شکن (دو آتشہ) کی دس کاپیاں بھیج دی تھیں، غالباً پہنچ گئی ہوں گی۔ کشتگان و زخم خوردگان "میرزا غالب شکن" کا کیا حال ہے۔ آپ تو بہت کچھ تماشے دیکھا کرتے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ الناظر میں آیات وجدانی پر مسلسل تنقید ہو رہی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ میری رفتار زندگی اور افتاد مزاج وغیرہ پر دل کی بھڑاس نکال لینے کے سوا کلام پر کوئی صحیح اعتراض میرے مسلک کے تحت نہ کر سکے گا۔ خیر دیکھا جائے گا۔

میرزا یگانہ چنگیزی سب رجسٹرار

نقد و تبصرہ

ہر کتاب کی دو کاپیاں آنا ضروری ہیں

نام کتاب : **علوم وفنون عہد عباسی میں**
مصنف : ڈاکٹر محمد رضوان علوی ۔ قیمت : پچاس روپے
ملنے کا پتہ : انوار بک ڈپو، امین آباد لکھنؤ

عہد عباسی کو اسلامی علوم وفنون، ادب و ثقافت اور تہذیب و تمدن کے عروج کی وجہ سے تاریخ اسلام کا عہد زریں کہا جاتا ہے جس میں اسلامی علوم وفنون میں توسیع اور تنوع پیدا ہوا اور علم وفن نے ایک مستقل حیثیت حاصل کرلی اور تدوین کے مراحل سے گزر کر تکمیل و ارتقاء کی منزل میں پہنچ گیا۔

تاریخ کی کتابوں میں عام طور پر تہذیب و تمدن اور علوم وفنون سے متعلق بحث بہت کم ملتی ہے جس کی وجہ سے ان کے ذریعہ اسلامی ثقافت کی وسعت و عظمت کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ البتہ عالم عربی میں ڈاکٹر احمد امین، عمر فروخ، استاذ عقاد اور احمد حسن زیات کی کتابوں سے اسلامی ثقافت کے تفصیلی جائزے سامنے آئے ہیں اردو میں انہی کتابوں کے کچھ ترجمے ملتے ہیں، لیکن اس موضوع پر کوئی مستقل اور مفصل کتاب میرے علم میں موجود نہیں۔ اللہ جزائے خیر دے پروفیسر رضوان علوی صاحب کو جنھوں نے پہلے "دمشق: اسلامی ثقافت کا گہوارہ" لکھ کر عہد اموی میں اسلامی ثقافت کے ارتقاء کی تاریخ مرتب کی تھی اور اب انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ عہد عباسی میں اسلامی علوم وفنون کے تدریجی نشو ونما اور ارتقاء کا تفصیلی جائزہ اور تبصرہ پیش کیا ہے اور ساڑھے پانچ سو سال کے عرصے پر پھیلی ہوئی تاریخ کے قصے و داستان کا دلچسپ اور دلکش انداز میں بڑی جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔

پہلے دو تمہیدی ابواب کے بعد تیسرے، چوتھے اور پانچویں باب میں بالترتیب یونانی، ہندستانی اور ایرانی علماء و ادباء کی خدمات اور ان کی حیات و تصنیفات کا ضروری تعارف کرایا گیا ہے جس سے تاریخ اسلام میں دوسری زبانوں سے ترجمہ و استفادہ کی سمت و رفتار سامنے آگئی ہے اور مسلمانوں کے ہمہ گیر علمی و تحقیقی ذوق و جستجو کی جھلکیاں محفوظ ہو گئی ہیں۔

چھٹے باب میں علم طب میں عربوں کی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے اور ساتویں باب میں عربوں کے نجوم و ہیئت اور ریاضی اور آٹھویں میں علم طبیعیات و کیمیا، جیسے ضروری موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

نویں باب میں علم تفسیر، دسویں میں علم حدیث، گیارھویں میں علم فقہ اور بارھویں میں علم کلام کی ارتقائی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جس سے ان علوم دینیہ کا پس منظر اور ان سے متعلق اہم شخصیات و کتب سامنے آجاتی ہیں۔

تیرھویں باب میں علم نحو، چودھویں باب میں لغت، پندرھویں باب میں تاریخ، سولھویں میں جغرافیہ اور اس سے متعلق شخصیات و کتب کے تعارف کے بعد سترھویں اور اٹھارھویں باب میں نثری اور شعری ادب اور ادبا سے بحث کی گئی ہے اور انیسویں اور آخری باب میں علم فلسفہ اور تاریخ پر اس جامع اور معلوماتی کتاب کو ختم کیا گیا ہے۔

معلوماتی لحاظ سے ڈاکٹر علوی کی یہ کتاب عربی ادب و کلچر کے طلبا و اساتذہ کے علاوہ عام اردو داں طبقے کے لیے بھی بہت اہمیت و افادیت رکھتی ہے اور بیک نظر عہد عباسی میں علوم وفنون کی ارتقائی جھلکیاں پیش کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر علوی کی اس کتاب سے اردو کے علمی و ادبی ذخیرے میں ایک خوش گوار اضافہ ہوا ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

——— شمس تبریز خاں

نام کتاب : **ترجمہ القول الجلی** : سوانح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی
مترجم : حضرت شاہ تقی انور ۔ قیمت : ڈیڑھ سو روپے
ملنے کا پتہ : کتب خانہ انوریہ ۔ خانقاہ کاظمیہ۔ تکیہ شریف کاکوری ضلع لکھنؤ

قول جلی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ملفوظ ہے۔ یہ کتاب

ـ عرصہ سے نادرالوجود تھی ۔ رحمان علی صاحب نے تذکرۂ علماء اور
اب صدیق حسن خاں صاحب نے اس کے حوالے اپنی تصانیف
یں دیئے ہیں ۔ اور یہ نواب علی حسن خلف صدیق حسن کے کتب خانہ
ں تھی لیکن جب یہ کتب خانہ تقسیم ہند کے بعد ندوہ منتقل ہوا تو یہ
مفقود ہوگئی۔ خوش قسمتی سے اس کا ایک مکمل نسخہ کاکوری کے کتب
خانۂ انوریہ میں محفوظ رہا۔ اس کا ایک ناقص نسخہ جس میں شاہ صاحب کے
شاہدات و ارادات اور اعتقادات کے متعلق تفصیل تھی وہ غائب ہوگیا۔
غائب کر دیا گیا۔

مسلک حضرت ولی اللہ محدث دہلوی کو بغیر اس کتاب کے مطالعہ
کے سمجھا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ شاہ صاحب موصوف کی تصانیف میں
تحریف ہوئی ہے بلکہ بعض بعض تصانیف ان سے منسوب کر دی گئی ہیں جو
ان کے مسلک کے بالکل خلاف ہیں ۔ اس کتاب کے مفامین اتنے
انقلاب آفریں ہیں کہ ان تمام اداروں کو جو شاہ ولی اللہ رح کے مسلک
کی ترویج اور تائید کے لیے قائم ہیں ان کو حضرت شاہ صاحب کی سوانح
حیات کی روشنی میں از سر نو اس مسلک کے اصل نقش و نگار پیش کرنا ہوں
گے ۔ اس کے لیے علماء کا ایک اجتماع ناگزیر ہے جو ان کی تحریف
شدہ تصانیف کو رد کر کے ان کی ان کتابوں کی توثیق کر سکے اور حق و باطل
میں امتیاز کی لکیر کھینچ کر شاہ صاحب کے اصل روپ کو اجاگر کر کے ان
کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں اُن کا ازالہ کر سکے۔

شاہ تقی انور صاحب نے نہایت رواں ، اور عام فہم اردو میں فارسی
سے ترجمہ کیا ہے اور جگہ جگہ پر تشریحات بھی کی ہیں ۔

اس کتاب کی طباعت اور کتابت نہایت عمدہ ہے اور کاغذ بھی
اعلا قسم کا استعمال ہوا ہے۔

———— معین الدین حسن علوی کاکوروی

نام کتاب: " انمول " (مجموعۂ کلام)
شاعر: دیپک قمر قیمت: چالیس روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ اُردو بازار ۔ جامع مسجد دہلی۔

انمول کے نام سے دیپک قمر کا دوسرا مجموعہ کلام
پیش نظر ہے۔ ایک سو اٹھائیس صفحات کا یہ مجموعہ تمام تر غزلیات پر
مشتمل ہے۔ ٹائٹل کور پر چند حضرات کی مختصر آراء کے علاوہ " پیش لفظ "
اور " تعریظ " کے بے جا تکلفات سے یہ مجموعہ یکسر بے نیاز ہے جو ایک
اچھی علامت ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر کو اپنی صلاحیتوں پر
اعتماد ہے۔

" انمول " میں شامل غزلوں کے مطالعہ سے دیپک قمر کے کلام
کی جو خوبی نمایاں طور پر سامنے آتی ہے وہ ان کے لہجہ کی پروقار کیفیت
اور انداز بیان کی سلاست ہے ۔ عام طور پر ان کے اشعار بے جا تکلف
غیر ضروری رمز و اشاریت اور ابہام و تصنع کی بازی گری سے پاک ہیں
وہ اپنے جذبات کا اظہار سادگی کے ساتھ اور مؤثر انداز میں کرتے ہیں
گویا سادگی و پرکاری ان کے کلام کی قابل ذکر خوبی ہے ۔ ان کے یہاں الجھاؤ
نظر نہیں آتا بلکہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات نے ان کے کلام میں نیا پن
پیدا کر دیا ہے ۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہے سوچ کر محسوس کر کے کہا ہے
احساس کی ضرورت ، تجربہ کی صداقت اور انداز بیان کی لطافت نے کلام
کو دلکش بنا دیا ہے ۔

ان کے کلام میں بعض جگہ کچھ فنی کمزوریاں بھی راہ پا گئی ہیں جو
نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے چند اشعار پیش
خدمت ہیں ۔

چڑھتے سورج کو سلاموں سے نوازیں بے شک
صبح کے ڈوبتے تارے کی بھی عزت کیجے

جبر و کے شہر والوں کے بہت ہی خوبصورت ہیں
مگر پہچاننا مشکل ہے سب کو ان کے چہروں سے

دیے کے ساتھ کیا سلسلہ شب بھر چلایا تھا
جلایا تھا بجھایا تھا ، بجھایا تھا جلایا تھا
اُسے لگتا ہے سر پر اب پہاڑوں بوجھ رکھا ہے
ذرا سا ایک تنکا دل نے غلطی سے اٹھایا تھا

آتے جاتے دم کا میلہ ، ایک دم دو چار دم بھاگ کر دنیا کے پیچھے خود کو کیوں بے دم کریں

مجموعی طور پر دیپک قمر کا یہ مجموعہ کلام اس بات کا بجا طور پر مستحق ہے کہ اربابِ ذوق اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں۔

—— ڈاکٹر تفسیر فہمی

نام کتاب: "افکار گریزاں" (شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر کیشو چندر سین حقیر آستانی
ملنے کا پتہ: شان ہند، ۸۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی۔
قیمت: پچاس روپے

شعری مجموعوں کی بھیڑ میں 'افکار گریزاں' بڑے اہتمام کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ ودیا پرکاش سرور تونسوی نے حقیر آستانی اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ دو سو سولہ صفحات کا یہ شعری مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ۳۶ نظمیں، دوسرے میں ۵ غزلیں اور آخری حصے میں پانچ گیت ہیں۔

'قلم سے خطاب'، 'عصر حاضر'، 'وہ کون جا رہا ہے'، اور 'مالن کے پھول' قابلِ ذکر نظمیں ہیں اور بھرپور تاثر چھوڑتی ہیں۔ گیتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو جو کمال نظم اور غزل کے میدان میں حاصل ہے وہی گیت کے میدان میں بھی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ 'کلاسیکیت' اور جدیدیت کے نام پر غزلوں کے قضیے سے دامن بچا کر وجود میں آیا ہے اور عصری حسیت کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ ندرتِ بیان، الفاظ کی بندش اور تخلیقی بصیرت کی میٹھی میٹھی آنچ میں برتے ہوئے مشاہدات حقیر آستانی کی شناخت ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی ہوتا ہے۔

نہ جانے کب سے یہ ایوان بند رہتے ہیں
ذرا سنبھل کے بہت دھول جم رہی ہوگی

ہم آسمان کے نیچے کہیں نہ رہ پائے
زمین ماما۔ وراثت میں آپ کی ہوگی

ایک ہی مشرب ہے سب کا، ایک ہی اطوار ہیں
کون اب بیہرہ شکن ہے کون پہریدار ہیں

—— پیرزادہ سید آباد جعفری

کانچ کا وجود: —— صفحہ ۵۲ کا بقیہ

خدا بھی نہ معاف کرے گا۔ میں نے اُسے کتنا دکھ دیا ہے۔ لیکن اس نے ذرا بھی اُف نہ کی۔ خاموشی سے سب برداشت کرتی رہی۔ میں اپنے جذبات اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر کس قدر اندھا اور خود غرض ہو گیا تھا۔ میری ہی وجہ سے عارف کے خاندان سے اس کا رشتہ ٹوٹا۔ اور جب اس کا بیٹا بڑا ہوا تو اس نے ماں سے یہ کہہ کر رشتہ منقطع کر لیا کہ تم نے اپنی ہوس کی خاطر دوسرا نکاح کیا اور مجھے ہوسٹل میں پھنکوا دیا۔ تاکہ میں تمھاری عیش و عشرت کی زندگی میں کانٹا نہ بن سکوں۔۔ حالانکہ ایسا نہ تھا اس نے میرے سائے (سوتیلے باپ) سے محفوظ رکھنے کی خاطر اُسے ہوسٹل میں داخل کرایا تھا۔ اور آج وہی ماں، وہی شوہر پرست بیوی۔۔ جس کا حقیقی لڑکا اور شوہر دونوں موجود ہیں۔ کسمپرسی کے عالم میں بسترِ مرگ پر پڑی ہے۔

اُن کی سوچ کے بہاؤ نے اُنھیں بے چین کر دیا اور وہ تیزی سے نزہت کے کمرے کی طرف لپکے کہ اچانک ثریا کے بیڈ روم کی طرف اُن کی نظر اُٹھ گئی۔ نائٹی پہنے ہوئے وہ اپنے بیڈ پر پڑی تھی۔ اور قریب ہی ایک نوجوان صوفے پر لڑھکا ہوا تھا۔ انھوں نے شدت سے اپنے ہونٹ کاٹ لیے اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

نزہت کے کمرہ سے جاوید کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بھی ماں کی اکھڑتی ہوئی سانسوں کی خبر سن کر آ گیا تھا اور اب اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا ماں! مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے میں انتہائی بدنصیب اور گنہگار انسان ہوں کہ میں نے آپ جیسی شفیق ماں کی قدر نہ کی۔۔ مجھے معاف کر دو ماں!۔۔ معاف کر دو ماں۔۔ اس کی سسکیوں سے کمرہ گونجنے لگا۔

پورے کمرے پر المناک سکوت طاری تھا۔ نزہت سفید کپڑے میں ملبوس ایک ملکہ کی طرح اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے اس طرح لیٹی تھی۔ جیسے مرنے سے قبل اپنے شوہر اور بیٹے جاوید سے معافی مانگ رہی ہو۔

نزہت! جمیل صاحب کی آواز کمرے کی سوگوار فضا میں گونجی۔۔ موت سے ہمکنار ہوتی ہوئی دو آنکھیں وا ہوئیں اُن میں حسرت کی چمک لہرائی اور ماند پڑ گئی۔

فضا پر جو سناٹا محیط تھا وہ اور بوجھل ہو گیا تھا۔ ••

نیا دور

جلد ۴۴ | نمبر ۳

جون سنہ ۱۹۸۹ء

اِیڈیٹر : —— امیر احمد صدیقی

جوائنٹ ایڈیٹر : —— شاہنواز قریشی

فون } ایڈیٹر : —— ۴۳۰۵۹
رہائش : ۷۴۳۴۸
جوائنٹ ایڈیٹر : —— ۴۷۱۰۸

پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش)

مطبوعہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
سالانہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ : سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری : ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ہمارا ملک بنیادی طور سے ایک سیکولر ملک ہے۔ چنانچہ یہاں ہر مذہب کے ماننے والوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں اور ان کے حقوق اس بنیاد پر کم نہیں کیے جا سکتے کہ وہ کسی مخصوص مذہب کو مانتے ہیں۔ یہی سیکولرازم ہے اور یہی ہمارے سیاسی و سماجی نظام کی بنیاد ہے۔ چنانچہ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے گزشتہ دنوں بجا طور پر کہا کہ سیکولرازم کا تحفظ حکومت کا اولین فریضہ ہے۔ انھوں نے سیکولر ذہن رکھنے والے تمام لوگوں سے فرقہ پرستی کی روک تھام کے سلسلے میں حکومت کو تعاون دینے کی اپیل کی۔ وزیر اعظم نے ان طاقتوں پر بھی کڑی نکتہ چینی کی جو سیاست کو مذہب سے اور مذہب کو جرائم سے ملا رہی ہیں۔ وزیر اعظم نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ملک کی سیاست سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس غیر مذہبی اور سیکولر سیاست کے تعلق سے اگر اترپردیش کا تجزیہ کیا جائے تو جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ اطمینان بخش ہے بلکہ حوصلہ افزا بھی ہے۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کی فعال قیادت میں اترپردیش نہ صرف یہ کہ ہمہ جہت ترقی کی راہ پر تیز رفتاری سے گامزن ہے بلکہ اقلیتوں کے تحفظ اور ان کی فلاح کے سلسلے میں بھی یہاں خصوصی اقدامات کیے گئے ہیں جو منفرد اہمیت اور دور رس نتائج کے حامل ہیں۔

گزشتہ دنوں عیدگاہ لکھنؤ میں عید ملن کی خصوصی تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے کہا کہ اقلیتوں کی زندگی کو سنوارنے کا پروگرام سارے سماج کو سنوارنے کا پروگرام ہے کیونکہ اقلیتیں سماج ہی کا حصہ ہیں۔ اقلیتوں کے لیے ہم نے کچھ بنیادی قدم اٹھائے ہیں۔ انھوں نے عربی مدرسوں کے استادوں کی شرح تنخواہ کا ذکر کیا اور کہا کہ عربی اساتذہ کی تنخواہ اب مرکز کے مساوی ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ٹیچروں کی تقرری کی بھی ذمہ داری ہم نے لے لی ہے۔ اس جلسہ میں وزیر اعلا نے لکھنؤ کی عیدگاہ کے مجوزہ ہال کی تعمیر کے لیے دس لاکھ روپئے کے عطیہ کا اعلان کیا اور یہ بھی کہا کہ پانچ لاکھ روپے کی رقم سے عیدگاہ میں ٹیوب ویل لگانے کا جو منصوبہ ہے اس کے لیے بھی وہ مطلوبہ رقم کا انتظام کرائیں گے۔

وزیر اعلا شری تیواری نے اپنی تقریر میں امن کو درہم برہم کرنے اور فسادات کرانے والی طاقتوں کو انتباہ دیا اور کہا کہ فرقہ وارانہ فسادات کو دبانے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی جائے گی۔

لکھنؤ میں ۷ مئی کو جمعیۃ العلما کی جانب سے منعقدہ مدارس دینیہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں ایک اہم اعلان اور کیا۔ انھوں نے واضح لفظوں میں زور دے کر کہا کہ دینی مدرسوں میں کسی بھی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی اور اس سلسلے میں کوئی بھی نوٹیفکیشن اگر ہے تو اس کو منسوخ اور کالعدم سمجھا جائے، جن دو قوانین کی زد میں مدرسے تھے، وہ ہیں کم سے کم اجرت قانون اور بچوں دعورتوں کے اداروں کا کنٹرول ایکٹ۔ وزیر اعلا نے مدرسوں پر سے دونوں کا نفاذ ختم کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ ایسا ارادہ نہ تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا۔

اسی طرح گزشتہ دنوں وزیر اعلا شری تیواری نے اترپردیش میں اردو کی تعلیم سے متعلق مسائل کے حل کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ بھی قائم کردیا ہے اور شری ایس۔پی۔ متل کی بحیثیت ڈائرکٹر اردو تقرری بھی عمل میں آگئی ہے۔ یہ اردو حلقوں کا ایک دیرینہ مطالبہ تھا جسے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے تسلیم کرلیا اور اس سلسلہ میں عملی اقدام بھی کردیا۔

اس کے علاوہ شری تیواری کی سربراہی میں حکومت اترپردیش نے اردو کو فروغ دینے کی غرض سے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ اگر پرائمری اسکولوں میں کم از کم دس اور پورے اسکول میں چالیس طلبا بھی اردو پڑھنے کے خواہش مند ہوں تو اس اسکول میں اردو ٹیچر کا بندوبست کیا جائے۔ اسی طرح جونیر ہائی اسکول کی سطح پر اگر کم سے کم پانچ طلبا بھی اردو سیکھنا چاہتے ہیں تو وہاں بھی اردو ٹیچر کا انتظام کیا جائے۔ اس ضمن میں محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹوریٹ کو خصوصی ہدایات جاری کردی گئی ہیں۔

ایڈیٹر

رات سو آزار پر
تو کیا کریں۔

اقبال صفی پوری

صفی پور ہاؤس۔ ناظم آباد
کراچی نمبر ۱۸

کیسی ضد ہے وہ بدلتا بھی نہیں
اتنا ظالم تو زمانا بھی نہیں

سایۂ زلف تو کیا، اب ہم پر
تیری دیوار کا سایا بھی نہیں

کیا تڑپ تھی وہ اِدھر سے گزریں
جب وہ گزرے تو پکارا بھی نہیں

جان دیتے ہیں اسی پر کیا کیا
جس کو ہم نے کبھی دیکھا بھی نہیں

جس قدر وقت کی رفتار ہے تیز
اس قدر تیز تو دریا بھی نہیں

وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے
طنز کا زخم کہ بھرتا بھی نہیں

ان کی خاطر بھی جلاتا ہوں چراغ
جن اندھیروں سے میں گزرا بھی نہیں

ہم اگر ہیں تو یہ دُنیا بھی ہے
ہم نہیں ہیں تو یہ دُنیا بھی نہیں

لغزشیں ہوتی ہیں اقبالؔ سے بھی
آخر انساں ہے فرشتا بھی نہیں

کثرتِ جلوہ سے چشمِ شوق کس مشکل میں ہے
اتنی شمعیں کب ہیں جتنی روشنی محفل میں ہے

عشق کی دیوانگی طے کر گئی کتنے مقام
عقل جس منزل میں تھی ابتک اسی منزل میں ہے

ایک اندازِ تبسّم میں ہے گم سارا چمن
یہ خبر کس کو کلی کی جان کس مشکل میں ہے

دل نہ ہو شامل تو پھر تنہا خروشِ ساز کیا
وہ تڑپ نغمے میں کب ہے جو شکستِ دل میں ہے

چشمِ حیراں کو کوئی جلوہ نظر آتا نہیں
دل کی بے تابی یہ کہتی ہے کہ تو محفل میں ہے

دل نہ ٹھہرے گا تو پھر طوفاں میں لوٹ آئیں گے ہم
دیکھتے ہیں کتنی وسعت دامنِ ساحل میں ہے

ہم بھی اے اقبالؔ ہیں گرمِ سفر کس شان سے
ایک کانٹا پاؤں میں ہے ایک کانٹا دل میں ہے

نیر مسعود
"ادبستان"
دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

شفاء الدولہ کی سرگذشت

کتاب خانۂ سید مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنؤ) میں ۱۷×۱۱ سنٹی میٹر تقطیع کے ۱۳۵ صفحوں اور ۱۱۶۶ شعروں پر مشتمل ایک اردو مخطوطہ ہے جس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

شب کو فرقت میں فغاں دن کو غم و زاری ہے رات دن خواب وہ ہے اپنا یہ بیداری ہے
"مثنوی موسوم بہ قصۂ عبرت مزیلِ وحشت ۶ جز"

اور ترقیمہ حسب ذیل ہے:

"بفضلہ تعالیٰ بہ خطِ احقر بہ تاریخ نہم شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۷۴ھ [۲۸، ۲۹ ستمبر ۱۸۵۷ء] در کلکتہ ترقیم یافت۔ محمد حسن غفرلہ"

یہ مثنوی شفاء الدولہ حکیم سید افضل علی رضوی فیض آبادی کی آپ بیتی ہے جو واجد علی شاہ کے درباری طبیب اور ندیم خاص تھے اور اپنے عہد کے ممتاز عالموں اور رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ انتزاعِ سلطنت تک بادشاہ سے وابستہ رہے اور ان کے ساتھ کلکتے گئے لیکن کچھ عرصہ بعد واپس آگئے۔ مختلف علوم اور طبِ یونانی کے علاوہ انھوں نے ایلوپیتھک طریق علاج میں بھی مہارت حاصل کی اور اس موضوع پر فارسی میں ایک ضخیم کتاب "جامع شفائیہ" لکھی۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے اردو، فارسی اور عربی میں مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ وہ حج و زیارات سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ نواب جعفر شمس آبادی اور ہاشم جون پوری کے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۳۱۹ھ (مطابق ۲-۱۹۰۱ء) میں حبس البول کے مرض میں وفات پائی اور انتقال کے وقت اُن کی عمر بہتر (۷۲) سال کی تھی۔ اس حساب سے ان کا سالِ ولادت ۱۲۴۷ھ (مطابق ۳۲-۱۸۳۱ء) قرار پاتا ہے۔ لیکن زیر نظر آپ بیتی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے چند سال قبل پیدا ہوئے ہوں گے۔ شفاء الدولہ کے نواسے مرزا جعفر حسین نے اپنی خود نوشت "کشمکشِ حیات" میں اُن کی عمر سو سال بتائی ہے۔ یہ تخمینہ بھی آپ بیتی کی روشنی میں درست نہیں معلوم ہوتا۔

مثنوی "قصۂ عبرت مزیلِ وحشت" میں شفاء الدولہ نے اپنے بچپن سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے حالات لکھے ہیں ——— ان حالات کے بیان میں انھوں نے اختصار ملحوظ رکھا ہے اور بعض اہم باتوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مثلاً وہ یہ تک نہیں بتاتے کہ اُن کا خطاب شفاء الدولہ تھا۔ اسی طرح وہ مجملاً محض اتنا بتاتے ہیں کہ واجد علی شاہ نے اُن کی بڑی قدر دانی اور ان پر بہت عنایت کی جس کی وجہ سے انھیں قابلِ رشک عزت اور آسودگی حاصل ہوئی۔ ان عنایتوں کی جو تفصیل خود واجد علی شاہ نے اپنی کتاب "عشق نامہ" میں لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے ان کو "خلاصۃ الحکما، ذکاء الملک، شفاء الدولہ، مدبر جنگ، سید افضل علی خان بہادر" کا خطاب دیا تھا۔ انھیں مہر کی انگوٹھی دی گئی تھی جس پر بادشاہ کا کہا ہوا سجع [توت] "دستِ ید اللہ شفاء الدولہ" کندہ تھا۔ اُن

کہ دو گاؤں کی معافی کے علاوہ واجد گنج کا علاقہ، داراب کی حویلی اور موتی باغ بھی عطا ہوئے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے انھیں پچیس[25] ہزار روپے کے نوٹ، گلوبند، تلوار، کلاہِ عالم پسند، سواری کے لیے تامجان اور دو گھوڑوں والی گاڑی بھی ملی تھی اور کچہری بھی ان کے سپرد تھی۔

شفاء الدولہ کی حیات اور تصنیفات پر ایک علیٰحدہ مضمون میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ ان کی خود نوشت عہدِ شاہی کے لکھنؤ کی ایک نادر یادگار ہے۔ یہاں اس کا نثری خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (نیّر مسعود)

[آغازِ داستانِ عبرت نشان]

میرا اصل نام افضل علی اور مولد فیض آباد ہے۔ میرے والد میر اکبر علی رضوی متمول اور معروف آدمی تھے۔ ہم سات بھائی تھے۔ والد صاحب مجھ کو سب سے زیادہ چاہتے تھے جس کی وجہ سے دوسرے سب بھائی مجھ سے جلنے لگے تھے۔ میرا بچپن عیش میں گزرا۔ سنِ شعور کو پہنچا تو میری تعلیم شروع ہوئی اور مجھے علم کا شوق پیدا ہو گیا۔ سنِ بلوغ کو پہنچ کر جب عربیہ سے فارغ ہوا تو خیال آیا کہ علمِ طب بھی حاصل کرنا چاہیے۔ چنانچہ معقولات کے ساتھ منقولات بھی پڑھنے لگا۔ جب میرا علم اپنے معلّم کی مثل ہو گیا تو انھوں نے آگے پڑھانے سے عذر کیا۔ ناچار میں مولوی سید محمد صاحب مجتہد کی خدمت میں حاضر ہوا جو میرے والد کے آشنا اور ایک مقدّس بزرگ تھے۔ میں نے ان سے استفادے کی درخواست کی تو وہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ میں رات کو ضرور مطالعہ کیا کروں۔ میں نے یہ شرط منظور کی۔ درس شروع ہو گیا۔ میں نے رات کا کھانا پینا ترک کر دیا اور شب بیداری اختیار کی۔ دو برس تک رات رات بھر کتب بینی کرتا رہا۔ شرح اسباب اور حلِّ موجز ختم کرنے کے بعد میں نے مطب کا ارادہ کیا۔ فیض آباد میں حکیم علی افضل خاں بے مثل طبیب ہیں۔ وہ بھی میرے والد کے پرانے شفیق ہیں۔ میں ان کی خدمت میں نسخے لکھنے اور طب پڑھنے لگا۔ انھوں نے مجھ پر بڑی شفقت فرمائی اور اپنے طریقِ علاج سکھائے۔ یہاں تک کہ کتاب قانون پڑھنے کی نوبت آ گئی۔ لیکن اس کی شرحیں [فیض آباد میں] میسر نہ آ سکیں۔ حلِّ مطالب میں دقتیں پیش آنے سے میں بہت مضطرب ہوا۔

[بیانِ سفرِ اول اور رخصت ہونا والدین سے اور گرفتارِ مصائب ہونا]

دل میں آیا کہ لکھنؤ چل کر وہاں کے کاملوں سے پڑھنا چاہیے۔ میں نے والد صاحب سے رخصت طلب کی۔ میری روانگی کے وقت سب اپنے پرائے جمع ہو گئے تھے اور والدین کا جو حال تھا میں لکھ نہیں سکتا۔ سفر میں جو رنج و ملال اٹھائے اُن کا کیا بیان کروں۔ بارے خدا نے لکھنؤ پہنچا دیا۔ یہ شہر واقعی سارے جہان کی جان تھا۔ عیش و عشرت، علم و فضل و ہنر کا مجمع، باشندے نہایت متواضع اور خلیق تھے۔ ان دنوں محمد علی شاہ [اودھ کے] بادشاہ تھے۔

سفر کی تکان دور ہونے کے بعد میں [سید العلماء] مولانا سید حسین صاحب مجتہد کے پاس گیا جو علم میں بے نظیر اور خُلقِ مجسّم تھے۔ میں نے ان سے عرضِ مدعا کیا جسے انھوں نے قبول فرمایا۔ میں صبح شام ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ اُن سے فقہ، حدیث اور ہیئت کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں ایک حکیم غازی الدین تھے جو سید العلماء سے فقہ پڑھتے تھے۔ وہ خاندانی حکیم تھے اور درسِ حکمت کی بھی مشق رکھتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اُن سے قانون پڑھ لوں اور اسی کے ساتھ مطب بھی کروں۔ غرض ان سے استفادہ شروع ہوا۔ سب کچھ حسبِ منشا ہو گیا اور مجھے عزیزوں سے دوری کے سوا کوئی غم نہ رہا۔ سوچتا تھا کامل ہو کر وطن جاؤں گا تو سب کس قدر خوش ہوں گے اور میرے والد کو، جو میرے عاشق ہیں، سب سے بڑھ کر مسرت ہوگی۔

لیکن مجھے انقلابِ آسمان کی خبر نہ تھی۔ چھ مہینے گزرے تھے کہ ایک دن وطن سے قاصد یہ پیغام لایا کہ فوراً چلو، تمھارے والد سخت علیل ہیں۔ صبح کو میں لکھنؤ سے روانہ ہوا۔ اگرچہ چار دن کی مسافت تھی لیکن میں نے تین دن میں طے کر لی۔ گھر پہنچا تو دیکھا ماتم بپا ہے۔ مسجد کے صحن میں والد کی قبر نظر آئی۔ میں قبر سے لپٹ کر بے ہوش ہو گیا۔ نو مہینے تک باپ کو روتا رہا۔ رات کو ان کی قبر کے پاس

نا تھا۔ اُن کی وفات سے طرح طرح کی پریشانیاں اٹھ کھڑی ہیں اور بھائیوں میں بڑا فتنہ و فساد پیدا ہوا۔ سارے گھر کا بار رے سر پر آپڑا اور روزمرہ کے خرچ کی فکر لاحق ہوئی۔ میں نے سوچا ن کے دم سے چین تھا جب وہی نہ رہے تو پھر یہاں اپنا کیا کام بہتر ہے لکھنؤ چلا جائے، وہیں سب حاجتیں روا ہوں گی۔ والد کی قبر سے رخصت ہو کر بہ صد حسرت لکھنؤ روانہ ہوا۔

[بیانِ سوانحات سفرِ دوم]

لکھنؤ پہنچ کر میں نے سب کا احوال دریافت کیا۔ معلوم ہوا حکیم مرزا غازی الدین انتقال کر گئے۔ محمد علی شاہ نے بھی وفات پائی اور اب ان کے بیٹے امجد علی شاہ تخت نشین ہیں۔ یہ بڑے باوقار اور دیندار بادشاہ تھے۔ احکام شرع کے مطابق حکومت کرتے تھے۔ سلطنت میں زکوٰۃ کا ادا کرنا انھیں سے مخصوص تھا۔ انھوں نے ایک عمدہ مدرسہ بنوایا تھا۔ جناب سید العلما کی تجویز سے میں اس مدرسے کے معلموں میں ملازم ہو گیا۔ چونکہ طب کی تکمیل کا خیال دل کو لگا ہوا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ قانون کا جتنا درس باقی رہ گیا ہے وہ بھی پورا کر لوں۔ فرنگی محل کے پاس حکیم نبّا صاحب یکتا طبیب ہیں، اُن سے قانون کی تکمیل کی۔

[بیانِ حصولِ اطمینان اور سب عزیزوں کا آنا اور والدہ کا شادی کو سمجھانا اور میرا راضی ہونا اور قرار پانا نسبت کا اور نکاح ہونا]

غرض پھر اطمینان میسّر آیا اور عیش و راحت کے سامان مہیّا ہو گئے۔ وطن سے سب اقربا بھی آ گئے۔ اب والدہ نے مجھ سے شادی کے لیے اصرار کیا۔ میں رضامند ہو گیا اور رشتے کی تلاش ہونے لگی۔ ایک مُجّن نے میری والدہ سے آکر کہا کہ لکھنؤ میں مرزا جانی ایک معزز رئیس تھے۔ اشرف آباد میں ان کا مکان ہے۔ ان کی ایک نواسی ہے۔ کہیے تو وہاں بات کی جائے۔ لڑکی کے باپ کا نام محمد تقی ہے، دادا منشی باقر تھے۔ خاندانی لوگ ہیں۔ والدہ نے رات کو استخارہ کیا جو بہتر آیا۔ مُجّن کے ذریعے والدہ نے پیغام بھجوایا۔ دوسرے دن اس نے آکر بتایا کہ اُن لوگوں کو رشتہ منظور ہے۔ اب [بر دکھاوے کے لیے] سمدھیانے کے لوگ یہاں آئیں گے یا لڑکے کو اپنے گھر بلائیں گے۔ والدہ نے کہا کہ بے شادی کے لڑکا وہاں نہیں جائے گا جس کو منظور ہو وہ ہمارے یہاں آئے تاکہ گھر کا حال بھی دیکھ لے۔ مُجّن اُسی وقت اشرف آباد گئی اور یہ پیغام لائی کہ وہ لوگ یہیں آ رہے ہیں۔ غرض آگے آگے کہاریاں، پیچھے سواریاں آئیں۔ سب نے مجھے دیکھا اور پسند کیا۔ اب باقاعدہ گفتگوؤں کا سلسلہ شروع ہوا۔ والدہ نے کہلوایا کہ ماہِ رمضان میں کوئی رسم ادا ہو جائے تو بہتر ہے۔ میری خوش دامن نے جواب میں کہلایا کہ اگر تم کو رسم کا خیال ہے تو پہلے عقد ہو جائے تاکہ ہم داماد کو گھر بلا سکیں۔ مجھے اصرار اس لیے ہے کہ میں دو برس سے بیمار ہوں، زندگی کا بھروسا نہیں۔ میرے دو ہی اولادیں ہیں۔ ایک بیٹی، ایک بیٹا۔ ان میں بھی بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے۔ والدہ نے کہا کہ اس طرح خالی عقد ہمارے گھر کی رسم نہیں تھی لیکن اب میں مجبور ہوں۔ چنانچہ ۲۳ رمضان المبارک کی شب کو میرا عقد ہو گیا۔ خوش دامن صاحبہ نے مجھے اپنے پاس بلا کر بلائیں لیں اور رجب تک میں وہاں رہا وہ مجھی کو دیکھتی رہیں۔ اُن کی الفت کا مزہ الفتِ مادری سے زیادہ تھا۔

[دوبارہ حسب الطلب خوش دامن پاس جانا اور اُن کی صحت سے مایوس ہو کر آنا اور پھر اُن کا بعد چند روز انتقال فرمانا]

دو چار دن گذر گئے۔ میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اسی طرح محبّت سے مجھ کو دیکھ رہی تھیں۔ لیکن جب میں نے ان کو غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ انھیں تپ دق کا تیسرا درجہ ہے۔ میں ان کے جینے سے مایوس ہو کر ہراس میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے بعد میں روز وہاں جانے لگا تاکہ وہ، جو چند روز کی مہمان ہیں، مجھے اچھی طرح دیکھ لیں۔ ایک مہینے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔

اُن کے بعد کوئی دلھن کی رخصت کا سامان کرنے والا نہ تھا۔ دلھن کے باپ کی سیرت کیا کہوں۔ انھیں اولاد سے ذرا بھی رغبت نہ تھی۔ چھوٹے بھائی کی عمر بہت کم تھی اور مجھ سے کوئی تدبیر بن نہ آتی تھی۔

[بیان خسر کے آنے کا اور شادی ہونا اور مذمت عشق اور پھر مجھے عشق کا پیدا ہونا اُن کے ساتھ اور آپس کے لطف]

اسی طرح دس مہینے گذر گئے۔ تب نانا پارے سے خسر صاحب

تشریف لائے۔ سب عزیزوں کے سمجھانے بجھانے سے کسی طرح شعبان میں وداع و رخصت کی نوبت آئی۔ خوش دامن جتنا لطف فرماتی تھیں خسر صاحب سے اُتنے ہی رنج حاصل ہوئے لیکن میری اہلیہ بڑی اطاعت گزار، نیک چلن اور خوش مزاج تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرنے لگے۔ مجھ کو اُن کی اور اُن کو میری جدائی گوارا نہ تھی۔ خوشیوں میں رات دن گزرنے لگے۔

[بیان شروع علالت عیال کا اور مایوس ہونا صحت سے اور میرا مبتلائے غم ہونا]

چار مہینے گزرے تھے کہ ایک دن اہلیہ کے سر میں درد اٹھا۔ میں نے دوا دی۔ دوسرے دن زکام اور کھانسی کی شدت ہوئی۔ تیز بخار چڑھا اور تیسرے دن منھ سے خون آنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ یہ سِل کے آثار ہیں اور اب ان کا بچنا مشکل ہے۔ جو بڑے بڑے طبیب میرے آشنا تھے ان کو بلوایا۔ سب نے متفق ہوکر علاج شروع کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میرے سب مشاغل چھوٹ گئے۔ غم سے لاغر اور زرد ہوگیا۔ گھر کے دوسرے لوگوں کو ہماری خبر گیری کی فرصت نہ تھی۔ میں رات دن اہلیہ کے پاس رہتا اور رویا کرتا تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے سمجھانا شروع کیا لیکن سمجھاتے سمجھاتے خود ہی رونے لگیں۔

[بیان شدت مرض اور بلانا وقت احتضار میں اور وصیت اور انتقال کرنا اُن مرحومہ کا اور میرا اُن وصایا کو بجا لانا اسی طرح]

چھ مہینے تک وہ تپ میں گھلتی رہیں۔ ساتویں مہینے سے حالت نازک ہوگئی۔ آخر ایک دن انھوں نے مجھے بلاکر کہا کہ میں نے اپنا مہر معاف کیا۔ تم بھی مجھ سے جو خطا ہوئی ہو بخش دو۔ میں بے اولاد گئی اور دنیا سے بے نشان جارہی ہوں اس لیے میری قبر پر عمارت بنواکر وہاں مجالس کرنا تاکہ میرا کچھ نشان رہے۔ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا کرنا۔ میرا بھائی سفر میں ہے، خدا اس کو سلامت واپس لائے تو میری جانب سے اُس کو پیار کرنا اور لاکر میری قبر سے لپٹانا۔ پنج وقتہ نمازوں کے بعد میرے لیے دعائے خیر کرنا اور جب جاں کنی کا وقت آئے تو تم خود میرے سرہانے سورۂ یٰسین پڑھنا تاکہ میں تم کو دیکھتی

اور تمھاری آواز سنتی ہوئی مروں۔ یہ کہتے کہتے اُن پر غشی طاری ہونے لگی اور اسی میں وہ ختم ہوگئیں۔ میرا جو کچھ حال ہوا وہ ہوا۔ میت سے رخصت ہوکر انتظام کو اٹھا۔ مقبرے کے لائق جگہ منھ مانگے داموں پر مول لی، قبر تیار کرائی۔ دو پہر رات گئے دفن سے فراغت ہوئی۔ صبح کو نماز سے فارغ ہوکر اُن کے صوم وصلوٰۃ کا حصہ مجتہد العصر کے پاس بھجوایا۔ پھر اُن کے مقبرے کی تعمیر میں لگ گیا۔ ایک مہینے میں مقبرہ تیار ہوگیا اور ان کے چہلم کی مجلس اُسی میں ہوئی۔

[بیان گھر برباد کرنے کا شدت غم میں اور فقیر اور تنہا ہوکر بیٹھنا قبر پر واسطے گریہ وزاری کے]

چہلم سے فرصت کے بعد جب سب مہمان اپنے اپنے گھر کو لوٹ گئے تو میں نے اپنے دل کو آزاد چھوڑا۔ نوکر کے ذریعہ اہل محلہ سے کہلا دیا کہ آکر میرے گھر کا سامان اٹھالے جائیں۔ عیال کی فکر پہلے ہی قطع ہوچکی تھی، اب حفظ مال کا خیال بھی گیا۔ مقبرے پر پہنچا۔ وہیں نوکروں کو بلایا اور تنخواہ دے کر رخصت کر دیا۔ مقبرے کا دروازہ بند کرلیا اور پاگلوں کی طرح قبر سے باتیں کرنے لگا۔ تین دن تک نہ سویا نہ کچھ کھایا۔ قبر سے لپٹا باتیں کرتا اور روتا رہا۔

[بیان والدہ کے آنے کا یہ حال سُن کر اور اکثر عزیزوں کا جمع ہوکر سمجھانا اور میرا پھر نہ ماننا اور تنہا قبر پر رہنے کو اختیار کرنا]

والدہ کو اطلاع ہوئی کہ میں گھر بار لٹاکر فقیر ہوگیا ہوں۔ اُس زمانے میں میری بہن تپ میں مبتلا تھیں اور ان کی حالت مایوس کُن تھی۔ والدہ انھیں کے ساتھ تھیں۔ یہ خبر سُن کر وہ میرے بھائیوں کے ساتھ مقبرے پر آئیں۔ مجھے دروازہ کھولنے کا ہوش نہ تھا ناچار وہ لوگ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ والدہ کے بین سے ایک قیامت برپا تھی۔ کہنے والے بھی سب وہاں آکر جمع ہوگئے۔

[بیان بہن کے آنے کا اسی حالِ مرض میں اور قبر سے کلام کرنا]

سب تو سب، میری بیمار بہن بھی وہاں آگئیں۔ انھوں نے اپنی مرحومہ بھاوج کو خطاب کرکے ایسی مایوسی کی باتیں کیں کہ والدہ کو تو غش سا آنے لگا۔ میں نے انھیں سنبھالا۔ جب ذرا سکون ہوا تو سب نے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ والدہ نے کہا کہ بڑے بھائی کا گھر پاس ہی ہے وہاں چل کر رہو۔ یہاں روز آکر فاتحہ پڑھ جایا کرنا۔

میں مقبرے سے ہٹنے پر تیار نہیں تھا، بہ دقّت اس پر راضی
ا کہ میرے لیے آدمی وہیں کھانا پہنچا دیا کرے، اس کے سوا میرے پاس
ئی نہ رہے۔ سب نے میری یہ ضد دیکھی تو مجبور چپ ہو رہے۔ دسترخوان
بچھا کر مجھے کھانا کھلایا اور رخصت ہو گئے۔ میری بے قراری اور آہ و زاری
کا پھر وہی عالم ہوا۔ اسی طرح چھ مہینے گزرے تھے کہ بہن نے بھی وفات
پائی اور ان کی قبر بھی اسی مقبرے میں بنی۔

[بیان سبب تبدیلِ لباس فقر اور ترک مجاورت قبر اور پھر آلودہ ہونا دنیا میں بہ دستور سابق حسبِ ہدایتِ عیالِ مرحومہ]

اسی طور پر ایک سال گزر گیا اور میری مرنے کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ اب میں نے قبولِ دعا کے لیے عملِ اُمّ داؤد پڑھنا شروع کیا۔ تین دن تک کچھ نہیں کھایا۔ تیسرے دن عمل پورا کر کے قریب شام اٹھا تھا کہ دفعتہً طبیعت بگڑی۔ میں خوش ہوا کہ وقت آ پہنچا۔ مرنے پر تیار ہو کر لیٹا تو غشی طاری ہو گئی۔ اسی عالم میں دیکھا کہ جن کے لیے میرا یہ حال ہوا تھا وہ خوش دامن کے ہمراہ آئیں اور میرے سرہانے اداس بیٹھ گئیں۔ انھوں نے ماں سے میری شکایت کی اور مجھ سے عقدِ ثانی کے لیے اصرار کیا۔ دیر تک مجھ کو سمجھانے بجھانے کے بعد وہ غائب ہو گئیں۔ دو گھڑی رات رہے میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں نے رو رو کر صبح کی، دل کو سمجھایا، غسل کیا، لباس بدلا اور شام تک اگلی شکل پر آ گیا۔ رات کو مجتہد العصر کے پاس جا کر اپنی داستان سُنائی اور ان سے درخواست کی کہ میرے لیے کچھ شغل تجویز کریں۔ انھوں نے کتبِ اربعہ میں سے کافی پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اُس کے مطالعے سے کچھ میرا جی بہلا۔ میرے پاس طالب علموں اور مریضوں نے بھی آنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ میری شہرت ہو گئی اور میرے یہاں مریضوں کا ہجوم رہنے لگا۔

[بیان حکیم مرزا محمد علی صاحب مرحوم کی خدمت میں جا کر شاگرد ہونے کا]

اب مجھے تحقیق و تشخیص کا شوق بڑھا۔ اس زمانے میں حکیم مرزا محمد علی صاحب کہن سال اور مشاق طبیب تھے۔ وہ بڑے نازک دماغ اور تند مزاج تھے لیکن طبابت میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا اور اُن کے طریق علاج کا بھی ماہر ہو گیا۔

[بیان دوسری شادی کا اور لڑکی کا پیدا ہونا اور مرنا]

رفتہ رفتہ میں نے پھر تاہل کی زندگی اختیار کر لی۔ اللہ نے ایک نیک زوجہ عطا کی۔ اُن کی اطاعت کیا کہوں۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ میں ان سے بالکل راضی ہوں۔ خدا کے فضل سے ایک بیٹی بھی ہوئی۔ لیکن چودھویں مہینے میں وہ جاتی رہی۔ اُس کی بھولی بھولی باتیں یاد آتیں تو غم سے میرا عجب حال ہو جاتا تھا، لیکن آخر صبر اختیار کیا اور اپنے کاموں میں لگ گیا۔ سہ پہر کو حکیم محمد علی کے مطب جاتا اور مستفیض ہو کر آتا تھا۔ چند سال بعد ان کی وفات ہو گئی جس کا مجھے بڑا قلق ہوا۔

[بیان مسیح الدولہ بہادر سے شاگردی کا اور اس میں حالِ انتقال [امجد علی شاہ] جنت مکان طاب ثراہ]

میں نے سوچا کہ درس و علاج کا شغل استفادے کا بہت محتاج ہے لہٰذا کسی کامل کی صحبت اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ مسیح الدولہ حکیم مرزا علی حسن صاحب جو اپنے فن اور علم میں بے مثل ہیں، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کی صحبت میں نسخے لکھنے لگا۔ ان کے حسنِ تعلیم سے میرے دل پر علم کے دروازے کھُل گئے۔ اُن کی قدر دانیوں اور مہربانیوں کا بیان مجھ سے ممکن نہیں۔ خدا اُن کا مرتبہ روز افزوں کرے۔

اس عرصے میں امجد علی شاہ بادشاہ جنّت مکان نے بیمار ہو کر رحلت کی۔ اہلِ دیں جانتے ہیں کہ اُن کے مرنے سے کیا گزری۔

[سلطانِ عالم کا بادشاہ ہونا اور مسیح الدولہ بہادر کا بہ تقریب علاج مقرب ہونا اور میرا بھی دربار میں حاضر ہونا اور بادشاہ کا میری تدبیر سے مُنتفع ہو کر قدردانی فرمانا]

اب واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ خدا انھیں زندہ رکھے اور ان کے رنج و ملال جلد رفع ہوں۔ یہ بادشاہ فلکِ حُسن کا ستارہ، نکتہ سنج، فصیح اللّسان، ہر صناعت میں کامل ہے۔ جانِ عالم کا خطاب ہے۔ نوجوانی میں بادشاہ ہوئے۔ جب حُسن کے ساتھ حکومت ہو تو پھر عیش و عشرت کی خواہش کیونکر نہ ہو۔ حُسن و شباب کے تقاضے سے عشق و عیش کے اسباب جمع تھے۔ جلوس کا پہلا ہی سال ہو گا کہ اُن

پر آتشک کا اثر ہوا۔ جب اوروں کے علاج سے فائدے کی جگہ نقصان ہوا تو میرے استاد مسیح الدولہ بہادر نے ان کا علاج شروع کیا۔ علاج نہ تھا، کرامت تھی، بادشاہ نے بھی بڑے استقلال سے کام لیا اور مرض میں سکون ہوا۔ استاد پر بادشاہ کی عنایتیں روز افزوں ہوئیں۔ میں بھی تقرب کا متمنی تھا، آخر استاد کی رہنمائی سے خدمت شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے پہلے اچھی طرح میرا امتحان لیا پھر حضوری کا حکم دیا۔ وہ کمال کے نقاد اور نکتہ سنج تھے اور ان کی صحبت میں علم و حکمت کے چرچے رہتے تھے۔ خدا نے اپنے فضل سے مجھ کو دست شفا عطا کیا۔ جس نے بھی مجھ سے علاج کرایا اس کو فائدہ ہوا۔ بادشاہ کو بھی میری تدبیروں سے شفا حاصل ہوئی۔ پھر تو انھوں نے کیا کچھ قدردانی نہیں کی۔ میرے لیے عشرت و حشمت کے سامان بہم ہوگئے۔ عنایاتِ شاہی سے سب مرادیں برآئیں۔ میں اپنے اہل و عیال کے درمیان آسودہ تھا اور دوسرے امیروں کو مجھ پر رشک آتا تھا۔

[بیان انتزاعِ سلطنتِ لکھنؤ]

چند سال اسی طور بسر ہوئے تھے کہ لکھنؤ کو فلک کی نظر لگ گئی۔ دفعتہً ملک بادشاہ سے چھن گیا۔ انتزاع سلطنت کا سبب مشہور ہے، میں کیا لکھوں۔ قصہ کوتاہ غم و نکبت میں اسیر ہو کر ہم فقیر ہوگئے۔ فلک کے ظلم کیا کہوں جس نے ملک چھن جانے پر بس نہ کی۔

[بیان سفر شوم بہ سوئے کلکتہ ہمراہ بادشاہ]

ملک قبضے سے نکل جانے کے بعد یہ صلاح ٹھہری کہ بادشاہ لندن جا کر پارلیمنٹ میں استغاثہ کریں۔ اس طرح بادشاہ کے ساتھ ہم بھی گھروں سے چھوٹے اور سب کلکتے روانہ ہوئے۔ راستے میں کیا کیا اذیتیں نہیں گزریں۔ دو مہینے سفر میں گذرے، تیسرے مہینے کلکتے پہنچے۔ وہاں موچی کھولے میں راجہ بردوان کی کوٹھی جو منحوس مشہور تھی اس میں بادشاہ ٹھہرے۔ اس تنگ کوٹھی کے ایک طرف دریا ملا ہوا بہتا تھا، دوسری طرف مزبلہ تھا، وہاں نہ لیٹنے کا ٹھکانا تھا نہ بیٹھنے کا۔ مد و جزر کی شدت سے ناک میں دم رہتا تھا۔ کھانا تیار کرنا سب سے مشکل کام تھا جس کی وجہ سے کھانا کبھی ملتا کبھی نہ ملتا تھا۔ اس پر مستزاد میری علالت اور ہوا کی خرابی تھی۔ جب سے کلکتے پہنچا ایک دن بھی اچھا نہیں رہا۔ طرح طرح کے عارضے لاحق ہوگئے اور عقل تک میں فتور آگیا۔ پہلے تو ضعف معدہ، درد سر، اندرونی حرارت کی شکایتیں پیدا ہوئیں پھر کھل کر بخار ہوگیا۔ بدن کی طاقت جاتی رہی اور میں شدید خفقان میں مبتلا ہوگیا۔

[بیان مراجعت کا لکھنؤ کی طرف بہ سبب علالت کے کلکتے سے]

اسی طرح گیارہ مہینے گزر گئے تو دیکھنے والوں کو فکر پیدا ہوئی۔ بادشاہ تک خبر پہنچی تو انھوں نے مجھے بلا کر گھر جانے کو کہا۔ میں لکھنؤ روانہ ہوا۔ بنگال کی سرحد سے نکلتے ہی طبیعت اعتدال پر آنے لگی۔ گھر پہنچ کر سب سے ملاقات ہوئی اور حسبِ منشا دوا اور غذا ملی تو میں پندرہ دن میں تن درست ہوگیا۔

[بیان پھر لکھنؤ سے کلکتے کی طرف سفر کرنے کا اور مبتلائے مصائب ہونے کا]

مقدر کی بدی پر کسی کا اختیار نہیں۔ ابھی میرا مرض پوری طرح دور نہ ہوا تھا کہ کلکتے سے ایک دوست کا خط پہنچا جس میں لکھا تھا کہ بادشاہ تم سے ناراض ہوگئے ہیں۔ کسی مفسد کے بہکانے سے ان کو یقین ہوگیا ہے کہ تم نے بیماری کا فقط بہانہ کیا تھا۔ انھوں نے بہ تکرار مجھ سے مجھ سے یہ لکھنے کو کہا ہے کہ جب تک میرا وہاں آنا نہ ہو تم در دولت پر مت جانا۔ میں کیا بتاؤں کہ یہ خط پڑھ کر مجھے کیسی تکلیف ہوئی۔ دنیا سے نفرت ہوگئی۔ جی چاہتا تھا جلائے وطن اختیار کر کے کربلائے معلیٰ چلا جاؤں۔ جن کے لیے میرا یہ حال ہوا وہی بے سبب آزردہ ہیں۔ محنت کی اچھی قدردانی ہوئی۔ پھر خیال آیا کہ اس معاملے میں چپ رہنا گویا الزام کو تسلیم کر لینا ہوگا لہٰذا بادشاہ سے روبرو گفتگو کرنا بہتر ہے۔ غرض حمیت کا ایسا جوش ہوا کہ صحت کا خیال نہ کیا اور پھر کلکتے روانہ ہوگیا۔ یہاں پہنچا تو بادشاہ کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ پایا۔ اسی عنایت سے پیش آئے۔ اور مجھ کو شکایت بھی نہ کرنے دی۔ میں نے پوچھا بھی کہ بات کیا تھی تو انھوں نے کہا محض بہتان تھا۔ مجھے خود یقین نہیں آیا تھا، احتیاطاً تم کو لکھوا دیا تھا۔ میں نے کہا اس

معاملے کی تحقیق کی جائے تو فرمایا اس کی ضرورت نہیں۔ تم کو مجھ سے مطلب ہے۔ میرا دل صاف ہے۔ اب اس معاملے میں کچھ نہ کہو۔ یہ میرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ یہ سُن کر میں چُپ ہو رہا مگر میرے دل سے یہ بات نہ نکلی۔ تحقیقات سے بادشاہ کے انکار کا سبب بعد میں کھلا کہ یہ بعض بیگموں کی حرکت تھی۔ ہر چند بے حقیقت بات تھی لیکن میرا دل بجھ گیا اور اس بار میں نے خدام شاہی سے الگ قیام اختیار کیا۔

[بیان اسبابِ مانعۂ مراجعت لکھنؤ کا کلکتے سے]

میں نے دل میں طے کر لیا تھا کہ بہت جلد واپس چلا جاؤں گا تاکہ یہاں کی مخالف ہوا سے پھر بیمار نہ پڑ جاؤں۔ لیکن قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ تھوڑے ہی دن میں پھر بیمار پڑا۔ ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا کہ خود بادشاہ سخت بخار میں مبتلا ہوئے۔ میرے استاد میح الدولہ بہادر بھی بیمار ہو گئے۔ علاج کی ذمہ داری میرے سر آ پڑی۔ خدا کے فضل سے دونوں کو شفا اور مجھے سُرخ روئی حاصل ہوئی۔

بادشاہ نے مجھ کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ میں آمادۂ سفر اور بادشاہ کے غسلِ صحت کا منتظر تھا کہ پھر بیمار پڑا۔ تپ کی شدت سے اخلاط جل کر سیاہ ہو گئے۔ بیس دن تک غذا نہیں ہوئی۔ پھر کچھ سکون ہوا۔ اٹھ کے بیٹھا۔ تھوڑی غذا بھی ہوئی۔ اُدھر بعض احباب نے یہ خوش خبری سُنائی کہ آج بادشاہ نے غسل صحت کیا، اب تمھارے گھر جانے کا وقت آ گیا۔ یہ سن کر میں سجدۂ شکر بجا لایا۔ اب کوئی مانع سفر نہ رہا اور میں صرف تھوڑی اور طاقت آنے کا منتظر تھا۔

[بیان بادشاہ کے قلعے میں جانے کا]

بادشاہ کے جشن صحت کی چہل پہل تھی کہ ۲۲ شوال [۱۲۷۳ھ مطابق ۱۵، ۱۶ جون ۱۸۵۷ء] کو میں نماز صبح کے لیے جو اٹھا تو آواز آئی کہ انگریزی فوج نے بادشاہ کے لشکر پر چڑھائی کر دی ہے۔ پیادے، سوار، توپیں تیار ہیں اور راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص نے آکر بتایا کہ بادشاہ کو تنہا قلعے میں لے گئے ہیں۔ یہ سُن کر درد و غم سے میرا مرض دونا ہو گیا۔ افسوس کہ بادشاہ آ نہیں سکتے اور میں بیماری کے سبب وہاں جا نہیں سکتا۔

[بیان اپنے حالِ زار کا]

اب میرا جو حال ہے، کیا بتاؤں۔ مرض کبھی کم ہے، کبھی زیادہ۔ کوئی علاج فائدہ نہیں دیتا۔ خفقان نے کام تمام کر دیا ہے۔ زندگی کے دن بھر رہا ہوں۔ نہ جیتا ہوں، نہ مرتا ہوں۔ یہاں کی آب و ہوا ایسی ناموافق ہے کہ صحت کی امید نہیں۔ یہاں کے زیادہ تر لوگ سنگ دل ہیں۔ مروت محبت سے کام نہیں، لوٹ کھانے کی فکر ہے۔ اور ابھی تو کچھ اور تجویزیں ہیں۔ کبھی رنگون، کبھی کالے پانی بھیجنے کا ذکر ہے۔ کوئی مدراس بھیجنے کو کہتا ہے، کوئی قتل کرنے، پھانسی دینے کو کہتا ہے، کہیں توپ سے اڑا دینے اور کہیں حبسِ دوام کی تجویز ہے۔

ہمراہیوں کی حالت کیا بتاؤں۔ مختصر یہ کہ جس کے آس پاس ایسے دوست ہوں اس کو دشمن کی احتیاج نہیں۔ ایسے لوگوں میں تنہا ہوں۔ دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے۔ گھر یہاں سے سیکڑوں کوس دور ہے۔ پہلے تو دل کو یہ اطمینان تھا کہ اپنے پاس کا جب خرچ ہو جائے گا تو اور منگا لیں گے۔ گھر میں ایسا مال نہ تھا جو ساتھ لے آتا۔ زمین کی آمدنی پر معاش تھی۔ اس فسادِ عظیم [۱۸۵۷ء] کی خبر تھی جس نے سب کو تباہ کر دیا۔ سب سے بڑھ کر ملال یہ ہے کہ اہل و عیال کا حال کچھ معلوم نہیں کہ خوش ہیں یا پریشان، جیتے ہیں یا مر گئے۔ راستے بند ہیں، لوٹ مچی ہوئی ہے، ہر طرف فساد برپا ہے۔ یقین ہے وہ سب بھی لُٹ گئے ہوں گے۔ لکھنؤ میں امن امان کہاں، بلکہ سنتا ہوں وہاں سب سے زیادہ فساد برپا ہے۔ صبح سے انتظار شروع کرتا ہوں کہ شاید گھر سے کوئی خبر آئی ہو، شام کو پھر بسترِ غم پر جا لیٹتا ہوں۔

اپنے حال پر نظر کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ابتدا کیا تھی اور یہ کیا ہو گیا۔ بے وفا دنیا کی ہر بات میں دغا ہے یہ حالت خوب اچھی طرح دیکھ کر میں نے اپنا یہ قصۂ عبرت لکھ دیا۔

★

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور

غزلیں

ساغر کو سدا جن کے صہبا سے تہی دیکھو
ان علم کے پیاسوں کی شاداب لبی دیکھو

دیتی ہیں دھواں شمعیں تہذیب و تمدّن کی
قندیلِ دلِ انساں کجلائی ہوئی دیکھو

ممکن ہے کہ جھوٹا ہو تاریخ کا آئینہ
چہروں پہ زمانے کی تصویر کھنچی دیکھو

شہروں میں بھی ہوتی ہے کیا انجمن آرائی
جس سمت نظر پھیرو تنہائی کھڑی دیکھو

خوابوں کا محل گویا شدّاد کی جنّت ہے
پہلا ہی قدم رکھا اور جاں پہ بنی، دیکھو!

تفہیم کے ساحل پر کھڑا ہے تو ہمّت کا
دریائے حقائق کو اختر نہ ابھی دیکھو

کیونکر میں کہوں دہر میں کیا بن کے رہا ہوں
خاموش فضاؤں کی صدا بن کے رہا ہوں

بونوں کے نگر میں تھی کہاں قدر شناسی
خود اپنی نگاہوں میں بڑا بن کے رہا ہوں

ہر صبح نے آندھی کا مجھے روپ دیا ہے
ہر شام کو بوجھل سی ہوا بن کے رہا ہوں

بڑھتے ہیں مرے عیب تو گھٹتی نہیں قیمت
کھوٹا ہوں مگر پھر بھی کھرا بن کے رہا ہوں

آکاش پہ چھا کر بھی جو دھرتی پہ نہ برسے
اختر میں وہ بے فیض گھٹا بن کے رہا ہوں

عشرت ظفر
روزنامہ "انوارِ قوم"
۶۵/۱۰۵ فہیم آباد ۴
کانپور۔ ۲۰۸۰۰۱

ایک معتبر آواز

باقی جدید اردو غزل کی اس اہم آواز کا نام ہے جو ناصر کاظمی شکیب جلالی کے بعد ابھری ہر چند کہ باقی کا عرصۂ حیات بہت مختصر تھا مگر اس کے لہجے کی گونج ہمیشہ ایوانِ غزل میں سنی جاتی رہے گی۔

باقی کی غزل کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی ساخت میں جو تار و پود کار فرما ہیں وہ غیر فانی رنگوں سے مملو ہیں یہی وہ رنگ ہیں جنھوں نے اس آواز کو حیاتِ دوام عطا کی ہے۔

یوں تو اس نگارخانے میں قدم رکھتے ہی ایسے عکسوں اور پرچھائیوں سے سامنا ہوتا ہے کہ نگاہ خیرہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ تحیّرات کا طلسم اپنا جلوہ دکھاتا ہے، مگر بالخصوص باقی کی غزل میں دو ایسی چیزیں ہیں جو اس نگارخانے میں سیر کرنے والے کو قدم قدم پر جھنجھوڑتی ہیں اور متحیر بھی کرتی ہیں۔

پہلی نظر میں تو ایسا لگتا ہے کہ ہر شعر ایک منظر نامہ ہے، جو غزل کی خلائے بسیط میں متحرک ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ جامد منظر بھی ابھرتے ہیں جو ناظر کا لمس نگاہ پاکر متحرک ہو جاتے ہیں پھر دلچسپ صورتحال یہ ہوتی ہے کہ سارے مناظر پیکروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ہزاروں متحرک منظروں کا خلائے بسیط میں پھیلاؤ اور ہر منظر ایک پیکر کی شکل میں اس کے ساتھ ہر لمحہ تغیر تمام مناظر کو نئے جلوؤں اور نئے آہنگ سے ہمکنار کرتا ہے۔

شاعر نے ان پیکروں کی تخلیق میں اسما اور افعال سے کام لیا ہے مثلاً پرندہ، ابرِ رواں، ہوا، ندی، بھنور، موج، زمین، دریا، صدا، پر پھیلانا، اوراق منظر کا بکھرنا، دریا کا اچھلنا، بہتے رہنا، لپکتی ہوا پر سوار ہونا، چن رہا ہوں، امکاں ہزار امکان سفر، موج کا مصروف ہونا، موج اچھلنا، یہ وہ متحرک اشیا ہیں جو باقی کی غزل میں داخلی و ظاہری کیفیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لیکن ان پیکروں اور منظروں کے پس منظر میں کچھ اور بھی اشیا، اپنا جلوہ دکھاتی ہیں جن تک رسائی ہوتے ہی وہ طلسمی حصار تعمیر ہوتا ہے کہ جس سے نجات مشکل ہوتی ہے اس سلسلے میں چند سطور میں اپنے مطالعہ سے حاصل ہونے والے تجربے کی روشنی میں پیش کرنا چاہتا ہوں اب دیکھئے کہ ان اشیا کی تشریح و توضیح اس طرح ممکن ہے۔

مناظر کا سیلِ رواں ہو یا پیکروں کا ایک ہجوم، یہ دونوں اشیا بصری ہیں چنانچہ آنکھ جب ان سے ہم آغوش ہوتی ہے تو لمسی کیفیت کا احساس ہوتا ہے نیز آنکھ کے چھونے کا عمل ختم ہوتے ہی خوشگوار یا ناخوشگوار تاثر کی دھند ذہن کی سطح پر نمودار ہوتی ہے جو ہمیں ایک قسم کے ذائقہ کا سراغ دیتی ہے، چنانچہ یہ ظاہر ہوا کہ لمس اور ذائقہ بصارت سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور فوراً ہی اپنا عمل شروع کر دیتے ہیں حواسی کیفیات سامعہ اور شامہ کا بھی اہم کردار ہے اور یہ بھی دوسری حواسی کیفیات سے وابستہ ہیں مثلاً پیکر یا منظر متحرک ہے تو ایک آہٹ یا آواز ابھرتی ہے جو استماعی فضا تخلیق کرتی ہے۔ یا پھر غیر متحرک پیکروں میں یا کسی حد تک متحرک منظروں میں کچھ ایسی اشیا کی نمو بھی ہے جن

کے وجود کو بصارت کے بعد شامہ محسوس کرتا ہے، مثلاً پھول جس کے ساتھ خوشبو کا وجود لازم ہے براہ راست مشامی حسوں کو چھیڑتا ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بانی کی غزل کا ہر شعر ایک بے سمت و بے حد و دخلا ہے جس میں متحرک و غیر متحرک اشیاء کی عظیم الشان دنیا آباد ہے۔

اگر عمیق نگاہ سے دیکھا جائے تو بانی کا سارا کلام انھیں لذتوں سے سرشار ہے مگر میں اس مضمون میں چند اہم اشعار پر گفتگو کروں گا تاکہ سطور بالا میں میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی کسی حد تک تصدیق ہو سکے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ اشعار لیتا ہوں جن میں لفظ "پرندہ" یا "طائر" استعمال ہوا ہے یہ بانی کی غزل کا سب سے متحرک پیکر ہے جو بذاتِ خود کئی متحرک منظروں کو تخلیق کرتا ہے۔ "پرندہ" بانی کی غزل میں جس علامت کے طور پر آیا ہے اس سلسلے میں اردو کے مشہور ناقد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی یہ رائے دیکھیے۔

> "بانی کی غزل میں آشوب زدہ آگہی کے منظر نامے سے گریز و انحراف کی سب سے متحرک علامت طائر یا پرندے کی صورت میں ابھرتی ہے۔"

اب یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

اڑ چلا وہ اک جدا خاکہ لیے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا

ڈھانپ لیا سارا آکاش پرندے نے
کیا دلکش منظر تھا پر پھیلانے کا

نہ جانے کل ہوں کہاں ساتھ اب ہوا کے ہیں
کہ ہم پرندے مقاماتِ گم شدہ کے ہیں

طائر کو دے آزاد فضاؤں کی اڑانیں
کہسار کو دریا کے اچھلنے کی خبر دے

شعر کے مصرعہ اولیٰ میں "اڑ چلا" ایک متحرک کیفیت کی نشاندہی کرتا ہے، پھر "جدا خاکہ لیے سر میں اکیلا" یہ ٹکڑا تلاشِ رزق کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فرد کے اندرون کی کشمکش کی سمت ذہن کو موڑتا ہے جو اس عہد میں انسانی نسل کا مقدر ہے مصرعہ ثانی میں لمبے آسمان میں پرندے کا اکیلا ہونا ایک بے مثال منظر تخلیق کرتا ہے۔

دوسرے شعر میں پرندے کا سارے آکاش کو ڈھانپ لینا اور پر پھیلانے کا منظر ایک شاندار بصری تجربہ ہی نہیں بلکہ ایک عظیم متحرک پیکر بھی ہے، علاوہ ازیں پر پھیلانے میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ جو استماعی فضا کی طرف اشارہ کرتا ہے اس شعر میں پرندہ روح کے ارتفاع اور بلندی کی علامت ہے اس شعر کا مطالعہ ذہن کو ہندو صنمیات کی طرف بھی لے جاتا ہے جہاں پرندے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے پرندے کے پروں میں آسمان کا چھپ جانا خلائے بسیط کے انتہائی تنگ ہونے اور روح کے عظیم و بسیط ہونے پر دال ہے، نیز روح کے اظہار کی وہ فضا تخلیق ہوتی ہے جس میں صرف اسی کا جلوہ ہوتا ہے باقی اشیا نقش طاق نسیاں بن کر رہ جاتی ہیں، قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ اس شعر کے متحرک پیکروں میں اسم و فعل دونوں ہی سے کام لیا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں ہوا اور پرندہ دو متحرک پیکر ہیں مگر "نہ جانے کل ہوں کہاں" کا ٹکڑا اس گمشدگی کا غماز ہے جس کا شکار آج ہر فرد ہے، یعنی اپنی ہی ذات میں کھو جانا پھر خود کو دریافت کرتے رہنے کے عمل میں مصروف رہنا بار بار ملنے اور بچھڑنے کی کیفیت بھی اس شعر میں بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ بالخصوص پہلے مصرعہ میں نہ جانے کل ہوں کہاں اور دوسرے مصرعے میں مقامات گمشدہ کے ہیں کا ٹکڑا، زمانی اور مکانی فصل کو پوری طرح سامنے لاتا ہے۔

چوتھے شعر میں ایک ساتھ کئی پیکر ابھرے ہیں طائر آزاد فضاؤں کی اڑانیں، کہسار دریا کا اچھلنا، ان میں سے تین پیکر بے انتہا متحرک ہیں، اور ایک جامد، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جب دریا قلبِ کہسار سے اچھلے گا یا جست بھرے گا تو دریا کی دیو پیکر امواج کا تحرک کہسار کو بھی متحرک کر دے گا اسی لیے شاعر یہ کہہ رہا ہے

کہ دریا کے اچھلنے کی خبر کمہار کو دے تاکہ کمہار کا جمود ٹوٹ سکے۔

مزید برآں اس شعر کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہے کہ طائر آزاد فضاؤں کی اڑانیں، دریا کا اچھلنا، نیز اچھلنے کے بعد ادلوں، ریگستانوں میں اس کا ورود اور پھیلاؤ ایک دوسرے سے اس قدر مربوط ہیں کہ اگر یہ الفاظ شعر سے کم کر دئے جائیں تو شعر میں کچھ نہ رہ جائے گا۔ طائر، پرندہ نیز اس کے ساتھ متحرک پیکروں کا تسلسل رکھنے والے یہ اشعار بھی دامن دل کھینچتے ہیں۔

اے ہیم پرواز پرندے دم لے لے
نہیں اترنا آنگن میں تو چھت پر آ

پرندے پہلی اڑانوں کے بعد لوٹ آئے
چمک اٹھا کوئی احساس رائیگانی کا

بعض طائر بھی منڈیروں پہ نہ تھے
رزق کا بھمہ اکثر میں نہ تھا

مست اڑتے پرندوں کو آواز مت دو کہ ڈر جائیں گے
آن کی آن میں سارے اوراق منظر بکھر جائیں گے

میں دیکھتا تھا شفق کی طرف مگر تتلی
پروں پہ لیکے عجب رنگ زار لے آئی

مندرجہ بالا اشعار میں آخری دو شعر انتہائی توجہ کے قابل ہیں۔ پہلے شعر میں مست پرندوں کا قطار باندھ کر پرواز کرنا ایک خوبصورت متحرک منظر ہی نہیں بلکہ ایک حسین بصری پیکر بھی ہے پھر کسی آواز کا لمس انھیں خوف زدہ بھی کرسکتا ہے اور وہ منتشر بھی ہو سکتے ہیں اسی لیے بانی نے اوراق منظر بکھرنے کی خوبصورت فضا تخلیق کی ہے پرندے قطار باندھے ہوئے پرواز میں مست ہیں کہ اچانک کوئی آواز انھیں ہراساں کر دیتی ہے اور مستیٔ پرواز کا سحر یک لخت زائل ہو جاتا ہے، پرندے مختلف سمتوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، اور پھر کیا رہ جاتا ہے اداس نیلگوں، بے کراں تنہا، خاموش آسمان، ویرانی، اداسی، سکوت، بے کرانیت نیلا پن جو آسمان کا مقدر ہے، گویا پرندے آسمان کے باشندے ہیں جو دم بھر کو آسمان کی فضا اور اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں، چنانچہ اس شعر میں التجائیہ لہجہ ابھرتا ہے کہ ہزاروں سال کی اس جامد فضا کو پل بھر کے لیے متحرک رہنے دو، یہ منظر باقی رہنے دو کیوں کہ جمود تو اس فضا کی تقدیر ہے یعنی اوّل و آخر جمود۔

دوسرے شعر میں شاعر کا شفق کی طرف دیکھنا ایک آرزو ایک شوق کا سراغ دیتا ہے یعنی وہ رنگ شفق کو پسند کرتا ہے اسے پانا چاہتا ہے لیکن شفق کا رنگ اس کی آنکھوں میں تو اتر سکتا ہے مگر اس کے ہاتھ نہیں آسکتا، یکایک تتلی رنگِ شفق کو آسمان سے اتار لاتی ہے رنگ زار صرف رنگ شفق ہی نہیں بلکہ آسمان کی بے کراں فضا میں نمود کرنے والے مختلف رنگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے مثلاً قوس قزح، رنگ سحاب، رنگ شفق وغیرہ۔

چنانچہ یہ ظاہر ہوا کہ تتلی آسمان کے تمام سرمائے کو اپنے پروں میں سمیٹ لائی، شاعر نے تتلی کو قریب سے دیکھا اسے چھوا رنگوں کی حرارت اور توانائی کا احساس کیا دیکھنے اور چھونے میں لمسی اور بصری تجربات بھی موجود ہیں حرکت و توانائی کے احساس سے مملو بانی کے یہ اشعار بھی دیکھیے، جن میں مختلف اشیاء کو متحرک پیکر دیے گئے ہیں۔

اے صفِ ابرِ رواں تیرے بعد
اک گھنا سایہ شجر سے نکلا

صفِ ابرِ رواں، ایک خوبصورت پیکر ہی نہیں بلکہ حرکت اور توانائی سے بھرپور دل فریب منظر بھی ہے بالخصوص ابر کیساتھ سیاہ رنگ کی وابستگی آنکھوں پر ٹھنڈک برساتی ہے پھر صفِ ابرِ رواں کے گذر جانے کے بعد شجر سے گھنے سائے کا برآمد ہونا میں روئیدگی اور نمو کا احساس دلاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ صف ابر رواں ایک سیاہ رنگ لشکر کی مانند ساری فضا پر محیط ہے جس نے سورج کی چمک کو اپنے لبادے میں چھپا لیا ہے اور تمام فضا پر ایک گھنی تاریکی مسلط ہے ایسی صورت

میں سایۂ شجر کا معدوم ہونا یقینی ہے۔ معًا یہ لشکر گذر جاتا ہے، اور فضا پھر آفتاب کی شعاعوں میں غسل کرنے لگتی ہے۔ اس وقت معدوم سایہ جو دراصل معدوم نہیں ہے بلکہ صف ابرِ رواں کے خوف سے بطنِ شجر میں پناہ گزیں ہے باہر آتا ہے اور پھر سے اپنی شادابیاں، تازگی اور ٹھنڈکیں بکھیرنے لگتا ہے، دوسرا مفہوم اس شعر میں یہ بھی ہے کہ درخت بے برگ و بار ہو نیز بارش کے لمس سے سرشار ہونے کی تمنا رکھتا ہے مگر بادلوں کا دور دور تک پتہ نہیں ہے معًا ابرِ رواں صفوں کی شکل میں ہاتھی کیطرح جھومتا ہوا نمودار ہوتا ہے اور بے برگ و بار شجر پر ٹوٹ پڑتا ہے پھر اسے اپنے خنک آلود اور نم آمیز لمس سے سرشار کر کے گذر جاتا ہے۔ یکا یک شجر میں برگ و بار کی نمود ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک گھنا سایہ طلوع ہوتا ہے، اس طرح یہ بات ظاہر ہوگئی کہ گھنے سایہ کی تخلیق ابرِ رواں نے کی۔

باقی کے اس شعر میں اتنے ابعاد پائے جاتے ہیں جنکی باقاعدہ تشریح ممکن نہیں مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ شعر اوراک تصور کی بیشتر گرہیں کھولتا ہے اور اس میں تفہیم کی ان گنت جہتیں اور سطحیں موجود ہیں اس سلسلے میں یہ اشعار بھی پڑھے جا سکتے ہیں ؎

میں لپکتی ہوا پر سوار سے آئی
کوئی تو موج تھی دریا کے پار لے آئی
قدم زمیں پہ نہ تھے راہ ہم بدلتے کیا
ہوا بندھی تھی یہاں بیٹھ کر سنبھلتے کیا

لپکتی ہوا، موج، دریا، زمیں یہ سارے پیکر متحرک اور تسلسل سے عبارت ہیں اور ان میں ان ابعاد کا جلوہ دکھائی دیتا ہے جو جدید غزل کا طرۂ امتیاز ہیں اب یہ شعر بھی دیکھیے ؎

میں ندی پار کروں سوچ رہا تھا باقی
موج مصروف تھی پانی کو بھنور دینے میں

دوسرے مصرعے میں موج کا پانی کو بھنور دینے میں مصروف ہونا ایک زبردست متحرک منظر ہے مسلسل اس عمل کی انجام دہی ذہن کو ایسی فضا میں لے جاتی ہے جہاں ہر طرف گردابوں کا ایک لشکر ہے اور ساحلوں پر ندی پار کرنے والوں کی ایک بھیڑ مستقل تفکر اور تحیر میں گم، یہ شعر بھی دیکھیے جس میں زندگی کی لاانتہائیت اور کائنات کی لامحدودیت کو ہم آہنگ کیا گیا ہے ؎

کہاں تلاش کروں اب افق کہانی کا
نظر کے سامنے منظر ہے بے کرانی کا

اس شعر کو پڑھ کر فارسی کے مشہور شاعر مرزا بیدل کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ہر طرف نظر کردیم ہم بہ خود سفر کردیم
اے محیط حیرانی ایں چہ بے کرانی ہاست

باقی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بے کرانی کے منظر کو اس قدر وسیع اور لامحدود بنایا ہے کہ کسی افق کا سراغ ملنا ناممکن ہے بیدل نے تو اپنے آپ کو اس بے کرانی کا اٹوٹ حصہ بتاتے ہوئے پورا ایک مصرع اس کی نذر کیا ہے مگر باقی نے صرف "کہاں تلاش کروں" کہہ کر اپنے وجود کو اس منظر نامے میں شامل کیا ہے، علاوہ ازیں "کہاں تلاش کروں" کا ٹکڑا ایک تجسس اور مستقل شوق کا پتہ دیتا ہے۔ حالانکہ مصروفیت بیدل کے یہاں بھی پائی جاتی ہے مگر باقی اور بیدل میں سفر مشترک ہے بیدل کے یہاں سفر کا عمل ہے تجسس کچھ بھی نہیں اس کے برعکس باقی کے یہاں تجسس اور سفر دونوں موجود ہیں۔ ان فضاؤں میں سیر کرنے کیلئے یہ اشعار بھی ساتھ رکھئے ؎

کوئی بھولی ہوئی شے طاقِ ہر منظر پہ رکھی تھی
ستارے چھت پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی
کب سے ہے گرتے ہوئے پتوں کا منظر آنکھ میں
کیسا موسم ہے کہ خوابوں کا زیاں ایسا نہ تھا
بیٹھے تھے سائے تھے نگڈ ندی تھی اک جاتی ہوئی
کیا یہ سچ مچ خواب ہے کچھ بھی یہاں ایسا نہ تھا
اے گلِ آوارگی تیری مہک تاروں سے کھیلے
اے ندی بہتا رہے دائم ترا بیدار پانی
اے کہ آوارہ ہوا تو بھی کسی دیس کی ہے
ہم بھی رکھتے ہیں وطن ہم بھی کسی گھر کے ہیں

(باقی ص ۳۱ پر)

غزلیں

انیس انصاری
۳ گلستاں کالونی، لکھنؤ

میں ترے شہر میں تھا اور تجھے معلوم نہ تھا
اتنا خاموش طبیعت دلِ محروم نہ تھا

میری منزل تری سرحد کے بہت آگے تھی
تو عبارت تھا مری لوح پہ مفہوم نہ تھا

ٹکڑے کر کے مجھے روتا تھا کوئی آخرِ شب
میں صحیفہ تھا، شہِ وقت کا محکوم نہ تھا

خوب ملتا تھا بدن پر مجھے صابن کی طرح
اور میں کیسے گھلا یہ اسے معلوم نہ تھا

اس کی مٹھی میں چھپے ہیں جو طلسمی الفاظ
مجھ کو دیتا تو کھلا در تمہیں معدوم نہ تھا

پیڑ بارش میں گرا اور سڑک بند ہوئی
دوسرا راستہ کوئی ہمیں معلوم نہ تھا

شہر سیلاب میں ڈوبا ہے جزیرے کی طرح
کچھ نشیبی ہے زمیں پانی بھی معصوم نہ تھا

لوٹ کر آؤ میرے دل کے خرابے کی طرف
شہر خاموش ہے لیکن کبھی مرحوم نہ تھا

کلیم حیدر شرر
۲/۱۷ - اسحٰق سیٹھ چالس
جری مری بمبئی ۴۰۰۰۷۲

زمینیں کیا، ہمارے واسطے سارا زمانہ گیا
امیرِ شہر ہم ایسے فقیروں کا ٹھکانہ کیا

یہ اس بستی کے باشندوں میں کیا خوف پھیلا ہے
گزرنے کو ہوائیں ہیں یہاں سے جارحانہ کیا

ضروری تو نہیں ہر پیڑ پر کچھ پھل نظر آئیں
ہری شاخیں نہیں ہیں زندگی کا شاخسانہ کیا

نہ راس آیا جسے گھر، اس مسافر سے کوئی پوچھے
نہ آگے آئے گا راہوں میں کوئی شامیانہ کیا

نہ کرتی ہوں اثر سورج کی کرنیں پشت پر جن کی
لگائے پھر انھیں عبرت کا کوئی تازیانہ کیا

اگر یوں ہے تو میری پتلیاں اشکوں میں بہہ جائیں
کھٹکتا ہے تری آنکھوں میں میرا آب و دانہ کیا

شررؔ فن کار کی دولت تو اس کی فکر ہوتی ہے
غزل کا فن دیا اس نے مجھے، دیتا خزانہ کیا

خورشید افسر بسوانی

بسواں۔ ضلع سیتاپور

غزل

(نذرِ فراق)

مرے وجود سے ہنگامہ ہائے لیل و نہار
مرے نفس کی حرارت سے گرمیِ بازار

شکست کھا گئے جب آئے سامنے اغیار
مرے خلوص کی لو سے لچک گئی تلوار

کل آ کے کہہ گیا مجھ سے یہ لمحۂ بیدار
جمودِ مرگِ سراسر، سکوت اک آزار

غزلِ بادۂ احساس ہیں مرے اشعار
مری غزل سے ہے انیلی جوانیوں کا نکھار

کسے دکھاؤں خدوخالِ زندگی آخر
نہ آئینہ ہے مرے سامنے نہ آئینہ دار

مجھے تو سایۂ اُمید بھی نصیب نہیں
خدا کرے نہ ہو مجھ سا کوئی غریبِ دیار

اسی کا نام ہے لمحات و وقت کی سازش
گناہ جاگ اُٹھے جب تو سو گیا سنسار

میں جب بھی چاہوں، جہاں چاہوں دیکھ لوں تجھ کو
مجھے نہ وقت سے مطلب نہ سمت سے سروکار

ترے بغیر اُداسی کا اب یہ عالم ہے
وہی شراب ہے لیکن نہ کیف ہے نہ خمار

طلوعِ فکر کا عالم جو دیکھنا ہو تجھے
مرے خیال کی دُنیا میں ایک رات گزار

یہ کائنات مرا گوشۂ تصوّر ہے
یہ آسماں ہے مری وسعتِ نظر کا حصار

کسی کی مست خرامی کا حال کیا کہئے
کلی کلی متحرک، چمن چمن بیدار

یہ غم کی دُھوپ، یہ طولِ سفر معاذاللہ
نہ سایۂ خمِ ابرو، نہ سایۂ دیوار

میں آج خود ہی ہلاکِ غمِ زمانہ ہوں
لبوں کی برق نہ چمکا نگہ کے تیر نہ مار

اُن آنسوؤں کو جو چمکے تھے ہجر میں تیرے
نجومیوں نے ستاروں میں کر لیا ہے شمار

چمک رہے ہیں لبوں پر تبسموں کے چراغ
برس رہے ہیں زمیں پر ثوابت و سیار

گزر رہا ہوں میں اس راہ سے جدھر افسر
نہ کوئی دشتِ جنوں ہے نہ کوئی شہرِ نگار

افسانہ

رکا ہوا طوفان

طاہر نقوی
گلشن اقبال 3/11 A 8
کراچی۔ پاکستان

جاتے ہوئے ہر موسم کا اثر اپنا لباس پہنے میں اپنی زندگی کے آنگن میں بیٹھا ہوں اور دھوپ آہستہ آہستہ ڈھل رہی ہے۔ البتہ اُس موسم سے اس موسم تک محض یادوں نے چادر تان رکھی ہے جس کے ٹھنڈے سائے تلے بیٹھا میں یہی سوچ رہا ہوں کہ نہ صرف خود میں نے اب تک شرافت اور نیکی کی زندگی گزاری بلکہ اپنے بچوں کو بھی یہی تعلیم دیتا رہا ہوں۔ کیونکہ یہی ایک ایسا تجربہ ہے جو صدیوں کی تہذیبی تاریخ کے سفر میں اپنی مسلسل تکرار کے باوجود اب تک باسی نہیں ہوا اور شاید اسی سبب بچوں کے آئینے میں ہمیشہ خود ماں باپ کی سیرت صاف نظر آتی ہے۔

چنانچہ میری ایسی باتوں کا اثر میرے بڑے بیٹے علی پر ضرور ہوا مگر اس کے برعکس میرا چھوٹا بیٹا حسن میری باتیں خاموشی سے سنتا ضرور مگر میرے اوپر مسکراہٹ پھینک کر وہاں سے اٹھ جاتا گویا وہ ان باتوں کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہ ہو۔ تاہم اپنی فرمانبرداری کی وجہ سے علی سر جھکائے میرے پاس احترام سے اسی پہلو بیٹھا رہتا کم گوئی اس کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہے اس لیے میں اکثر اس سے کہتا کہ یہ دنیا بولنے والوں کی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات سے باہر کے راستے بند کر رکھے ہیں اور اندر کے راستوں پر سفر کر رہا ہے۔ چنانچہ کالج سے آکر زیادہ وقت وہ کتابوں کے شکم میں قید رہتا کبھی کبھار شام کو کسی دوست سے ملنے چلا جاتا یا کوئی اُس کے پاس آجاتا۔ البتہ حسن کا زیادہ وقت تعلیم کی بجائے گھر سے باہر دوستوں میں گزرتا۔ رات گئے آنا اور پھر صبح اس کے بیدار ہونے سے قبل اس کے دوست آنا شروع ہو جاتے۔ اس طرح نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ایسے گروہ کے ساتھ نظر آنے لگا جس کا لیڈر وہ خود ہی ہوتا اور اس کا ہر ساتھی اس کے اشارے کا منتظر رہتا کبھی اپنے کالج جاتا تو کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور برپا ہوتا جس کی شکایت علی کے ذریعے ملتی اور اکثر اپنے ساتھیوں کی مدد سے کالج میں ہڑتال کے حالات پیدا کر دیتا۔ اس کے علاوہ آئے دن محلے میں اس کے جھگڑے ہوتے رہتے جس کی وجہ سے میرے علاوہ محلے والے بھی اب تنگ آنے لگے تھے اگر میں اسے سمجھاتا تو خاموشی سے سن ضرور لیتا لیکن کوئی اثر نہ لیتا لہٰذا روز بروز یہ صورت حال بگڑتی رہی جس کے نتیجے میں پڑوسیوں کی مختلف شکائتوں کے ساتھ محلے کی جوان لڑکیوں کو سرِ راہ تنگ کرنے کی اطلاعات بھی ملتیں جنھیں سن کر میں شرم سے اپنی گردن جھکا لیتا ان سے معافی مانگ کر اور حسن کی سرزنش کا وعدہ کرکے گھر آتے ہی اسے سختی سے ڈانٹتا۔ میرے ساتھ ماں بھی اسے سمجھاتی مگر اس کے برعکس یہ شکائتیں کم ہونے کی بجائے بڑھتی رہیں۔ اس صورتحال سے میں اب پریشان ہو گیا مگر سختی کرنے کو بیوی ہمیشہ منع کرتی کہ کہیں اس پر الٹا اثر نہ پڑے اور بغاوت پر نہ اتر آئے کیوں کہ اب بچہ نہیں رہا۔ ایسے لمحے میں اپنے آپ کو ایسا درخت سمجھتا جس کی چھاؤں تلے حسن بے فکری سے اپنے فاصلے طے کر رہا ہو چنانچہ میں وقت کے بھاری قدموں تلے آنے والے دنوں پر اپنی نرم چاہت گرانے

سے شعوری طور پر ہاتھ کھینچنے لگا۔ جب اس سے اس کے موجودہ طرزِ عمل کے بارے میں کریدا تو وہ کہنے لگا کہ ’ابا یوں لوگ کمزور سمجھتے ہیں اور سر پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے میں ان سب کو رعب میں رکھتا ہوں۔ فی زمانہ اس کے اس نقطۂ نظر کو میں دل میں تو تسلیم کر لیتا مگر اس پر اپنا تاثر ظاہر نہ ہونے دیتا اور اسے مزید سمجھاتا تاہم وہ میری اس سوچ سے کسی طرح مطمئن نہ ہوتا۔

ایک روز میری بیوی نے علی کو بازار بھیج کر کوئی چیز منگوائی وہ چیز معیاری نہ تھی تو ماں نے اسے واپس بھیجا مگر علی روہانسا ہو کر واپس آیا۔ اور کہنے لگا کہ دکاندار واپس نہیں کر رہا ہے بلکہ الٹا اس نے بے عزتی کی ہے۔ بیوی نے الجھتے ہوئے علی کو سخت سست کہہ کر مجبوراً چیز رکھ لی۔ اس پر میری بیٹی ہنستے ہوئے بولی کہ اماں حسن آئے تو اس سے واپس کرانا۔ علی نظریں جھکائے وہاں سے واپس اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں یہ سب چپ چاپ دیکھ رہا تھا مگر علی کی اس کیفیت پر میں نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کئے رکھی اتنے میں اپنے مخصوص انداز میں لاابالی پن سے سیٹی بجاتا ہوا حسن داخل ہوا تو ماں نے دکاندار کی شکایت کی اور وہ چیز واپس کرنے کو کہا، ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ دیکھو جھگڑنا مت، واپس نہ کرے تو خاموشی سے آجانا۔ وہ بغیر کوئی بات کئے اسی لاپروائی کے انداز میں فوراً باہر نکل گیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ خوف تھا کہ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے۔ اس لیے میں نے بیوی کو ڈانٹا کہ معمولی بات کے لیے تم کوئی ہنگامہ کرواؤ گی اسی لمحے حسن واپس آگیا اور ماں کو پیسے واپس کر دیئے۔ اس پر بیٹی بولی کہ امی دیکھا میں نہ کہتی تھی آپ نے خواہ مخواہ علی کو بھیجا۔ اس وقت حسن کی گردن مزید اکڑ گئی تھی۔

یوں ہی ایک روز شام کو میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا، ماں بیٹی دونوں بیٹھی آپس میں نہ جانے کیا باتیں کر رہی تھیں اور حسبِ معمول علی اپنے کمرے میں اپنی تنہائیاں سمیٹے بند تھا۔ کہ ایسے میں اطلاعی گھنٹی بجی، بیٹی نے جا کر دیکھا اور گھبرائی ہوئی آ کر مجھے بتانے لگی کہ باہر چند خطرناک قسم کے لوگ کھڑے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ اپنی توقع کے کانچ ایسے انداز سے بیوی مجھ سے کہنے لگی کہ آپ نہ جائیں کہیں کوئی بدتمیزی نہ کریں میں علی کو بھیجتی ہوں لیکن چند لمحے بعد واپس آ کر مایوسی سے بولی کہ وہ جانے سے انکار کر رہا ہے، اس پر بیٹی نخریہ لہجے میں بولی، میں نے خود بھی یہی سوچا کہ ان کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہا ہے لہٰذا مجبوراً میں اٹھ کر باہر گیا تو دیکھا واقعی غنڈے قسم کے تین جوان بپھرے ہوئے کھڑے ہیں بغیر علیک سلیک کے بولے کہ اپنے بیٹے کو سمجھا لو ورنہ۔ اس وقت میری زندگی کے ماحول میں ان کی آواز کا بوجھ دروں کر گرنے لگا اور میں نے گھبرا کر دریافت کیا کہ آخر ہوا کیا ہے اس کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ بدتمیزی سے یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ اس سے کہہ دینا کہ زندگی پیاری ہے تو باز آجائے۔ لیکن میں کچھ نہ سمجھا اور چند ثانیے انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اپنے جذبوں کے طوفان دبائے گھر کے اندر داخل ہوا تو بیٹی اور بیوی دروازے سے لگی یہ ساری باتیں پہلے ہی سن چکی تھیں جس کی وجہ سے وہ دونوں ہی خوف زدہ تھیں اس پریشانی کے ساتھ مجھے غصہ بھی آ رہا تھا مگر حسبِ عادت بیوی نے مجھے ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا کہ اسے نرمی سے سمجھانا۔ اسی اثنا ہماری اس کیفیت کے دوران حسن گنگناتا ہوا نپے تلے قدم رکھتا ہوا گھر میں داخل ہوا اس کے قدموں کی مخصوص آہٹ آہستہ آہستہ میرے اندر چھاتی چلی گئی تھی اس لیے میں اسے دیکھے بغیر محض اس کے قدموں کی آہٹ سے اس کی آمد کا اندازہ کر لیتا تھا۔ اس لمحے اس کی آہٹ سن کر میں بھڑک اٹھا اور اس کے نزدیک آتے ہی اس کے ایک طمانچہ رسید کر دیا تو وہ ٹھٹھک کر رہ گیا ماں معاملہ رفع دفع کرنے کی غرض سے بیچ میں آگئی اور اسے ساری بات بتائی۔ بیٹی سہمی ہوئی کھڑی تھی اس لیے میری بجائے وہ بولی کہ انھوں نے ابا کے ساتھ بہت بدتمیزی کی اس دوران وہ خاموش رہا اور حالات معمول پر آجانے پر سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تو وہ چپکے سے نہ جانے کس وقت پھر باہر کھسک گیا۔ اس بات کی اطلاع مجھے بیوی نے آکر دی۔ دراصل وہ اس لیے پریشان تھی کہ کہیں حسن ان غنڈوں سے جا کر نہ الجھ پڑے۔ حالاں کہ میں خود پریشان اور فکر مند تھا لیکن اسے جھوٹی تسلی دیتا رہا۔ اگرچہ حسن کے گھر میں آنے کا کوئی وقت نہ تھا مگر اس وقت واہموں کے اندھیروں میں کوئی

[illegible] سے ہمکنار رہی' اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں تو گویا لاشعوری طور پر اس بات کا منتظر ہی تھا اس لیے لپک کر گیا تو دیکھا کہ وہی غنڈے سامنے کھڑے ہیں۔ اب مجھے دیکھتے ہی وہ گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نے آپ سے حسن کی جو شکایت کی تھی تو اس جرم میں اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں بری طرح مارا پیٹا۔ پھر اپنے اپنے بدن پر نیل دکھانے لگے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ حسن نے پھر دھمکی دی ہے اس لیے آپ اسے سمجھا دیں۔ ان کا لہجہ اس وقت بڑا خوشامدانہ تھا گویا حسن سے بے حد خوف زدہ ہوں۔ اس اچانک تبدیلی پر میں حیران تھا اور مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ تاہم اس بار وہ مجھے نہایت ادب سے سلام کرکے چلے گئے۔ بیوی اور بیٹی اسی طرح دروازے کے پیچھے سے ساری باتیں سن چکی تھیں۔ بیوی بھی میری طرح حیران اور خاموش تھی مگر بیٹی کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ رات کے کھانے کے وقت حسن اسی طرح بے فکری اور لاابالی پن سے سیٹی بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور بغیر کوئی بات کئے ہاتھ دھو کر کھانے میں شریک ہوگیا۔ کافی دیر تک کوشش کے باوجود مجھ سے کچھ نہ بولا گیا اور میں محض اسے کھوج والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ بیوی مجھے ایسے انداز میں دیکھ رہی تھی گویا کہہ رہی ہو کہ پہلے اسے کھانا کھا لینے دو پھر بات کرنا۔ ادھر بیٹی اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے چلی جا رہی تھی جیسے اس کا دل بڑھ رہا ہو اور کبھی اچٹتی نظر سے علی کو دیکھتی جو نظریں جھکائے غیر محسوس طریقے سے کھانے میں مصروف تھا مگر حسن ہم سب کی طرف سے یوں بے خبر تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور اپنے کو مجتمع کرکے اسے سمجھانے کے لیے آہستگی سے کہا کہ تم نے خواہ مخواہ ان بے چاروں کو اتنا مارا پیٹا' پھر میں نے اسے آئندہ حالات کی سنگینی سے بھی باخبر کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس دوران لاپرواہی سے محض مسکراتا رہا۔

اس واقعے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس اس کی شکائتیں رفتہ رفتہ آنا بند ہوگئیں۔ اور محلے کے بدمعاش اور غنڈے مجھے دیکھ کر سلام کرنے لگے کیوں کہ ان سے میری پہچان کا وسیلہ اب حسن بن گیا تھا۔ ادھر میری بیٹی بھی اس بات سے مطمئن رہنے لگی کہ اسے اب آتے جاتے نہ کوئی گھورتا نہ آوازے کستا۔ خود میں حسن کو اس کے گروہ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھتا تو خاموشی سے وہاں سے گزر جاتا حالانکہ اس سے پہلے میں ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر اسے تنبیہہ کیا کرتا تھا شاید میں نے لاشعوری طور پر اس صورتحال سے اب اسلئے سمجھوتہ کرلیا تھا کہ کہیں ایسے لمحوں کی آنچ سے کبھی پگھل کر نہ رہ جاؤں۔ چنانچہ اب مجھے ملال آمیز خوشی ہوئی کیونکہ افسردگی اور خوشی کے موسم مختلف ہوتے ہیں جن سے ہمارے احساسات گزرتے ہیں تاہم یہ تبدیلی اندر سے مجھے ہمیشہ پریشان رکھتی کہیں دور کسی خطرے کی گھنٹی متواتر بجتی رہتی اور انجانے خدشے دل کو ہر وقت دھڑکاتے رہتے۔ میری بیوی بھی اس تبدیلی کے پرسکون سمندر کے نیچے چھپے ہوئے طوفان سے مضطرب رہتی اور دروازے کی ہر دستک پر چونک اٹھتی۔ میں کسی وقت گھر سے باہر نکل کر محلے میں جا کھڑا ہوتا تو کوئی نہ کوئی پڑوسی بات چیت کے دوران دبی دبی زبان میں حسن کی کسی نہ کسی غلط حرکت یا غنڈہ گردی کی اطلاع دیتے ہوئے کمزور لہجے میں یوں شکایت کرتا کہ کہیں مجھے برا نہ لگ جائے اور میں اس کا ذکر حسن سے نہ کردوں جس کا نتیجہ ظاہر تھا مگر میں محسوس کرتا کہ وہ لوگ جو ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے میرے مخالف رہے تھے وہ بھی اب مجھ سے آہستہ آہستہ نہ صرف راہ و رسم بڑھانے لگے تھے بلکہ میری خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ میں کوئی معمولی بات بھی کرتا تو زور شور سے ہاں میں ہاں ملاتے اور میری ہر بات پر خواہ مخواہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے۔ اتنی اہمیت تو مجھے اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں ملی تھی تاہم ان کے رویے کے اس کھوکھلے پن کی وجہ سے میں بے چین رہتا۔ لہٰذا ان کے رویے کے ردعمل کے طور پر کبھی میں نرم لہجے میں اور کبھی سختی سے حسن کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کرتا۔ وہ شکایت کرنے والے کا نام دریافت کرنا چاہتا تو میں اس نازک صورتحال کو بھانپتے ہوئے کسی کا نام نہ بتاتا اور مزید نرم لہجے میں اسے اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کرتا کہ اس قسم کا رعب داب مناسب نہیں ہوتا' یہ محض وقتی ہوتا ہے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کے لیے یہ راستہ مناسب نہیں۔ وہ حسب عادت اس طرح ہنستا گویا میرا مضحکہ اڑا رہا ہو۔ البتہ دوسری جانب کبھی محلے میں راہ چلتی کسی لڑکی کو

کوئی غنڈہ چھیڑتا یا آوازے کستا یا کسی کے بچوں کو مارتا تو متاثرہ پڑوسی اس بات کی اطلاع حسن کو دیتا تاکہ وہ اس کا تدارک کرے محلے والوں اور پڑوسیوں سے اس کی اتنی سی شناسائی بھی میرے نزدیک غنیمت تھی اس لیے اس لمحے فطری طور سے مجھے خوشی بھی ہوتی۔

انہی دنوں شہر میں فسادات پھوٹ پڑے۔ فرقہ وارانہ، لسانی اور سیاسی بے چینی کی بنا پر آئے دن لوٹ مار اور مار دھاڑ کی خبریں ملتی رہتیں۔ چنانچہ خوف کے بازوؤں میں دبکے ہوئے انسان اپنے اپنے گھروں میں سہمے ہوئے بیٹھے رہتے جس کی وجہ سے پرندے پناہ گاہوں کی جستجو میں بھٹکتے رہتے اور فضا میں چاروں سمت سراسیمگی کا ہراس پھیلا رہتا۔ تاہم ہمارے محلے میں نسبتاً امن رہا کیوں کہ حسن اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہر وقت گشت کرتا رہتا جس کی وجہ سے نہ باہر سے آنے والوں کی ہمت ہوتی اور نہ ہی محلے کے کسی اور غنڈے کو کوئی موقع مل پاتا اور پھر جب یہ حالات شاید اپنے عروج پر تھے اور حسن رات کو گھر آکر کھانے میں مصروف تھا کہ اس لمحے دروازے پر اچانک زور زور سے متواتر دستک کی آوازیں آئیں۔ میں اور میری بیوی دونوں اپنے گمان کی گھاس پھوس میں سے خطرناک کیڑوں سے بچتے بچاتے ہوئے دروازے کی طرف لپکے، دیکھا تو پڑوس کی ایک بیوہ عورت کھڑی زار و قطار رو رہی تھی، میرے دریافت کرنے سے پہلے ہی بیان کرنے لگی کہ میں اور میرا بیٹا واپس گھر آرہے تھے کہ ہم فساد میں پھنس گئے اور غنڈوں نے میرے بیٹے کو پکڑ لیا۔ میں بھاگی بھاگی یہاں آرہی ہوں، خدا کے لیے حسن سے کہہ کر اس کی جان بچاؤ، اتنے میں حسن خود بھی دروازے پر آگیا اور اس کو تسلی دے کر باہر نکل گیا میری بیوی نے اس عورت کو اندر بلا کر بٹھایا اور تسلی دینے لگی ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ حسن اس عورت کے بیٹے کو ساتھ لیے واپس آگیا۔ وہ معمولی زخمی ہوا تھا مگر خوف کی وجہ سے ابھی تک حواس باختہ تھا۔ عورت اسے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ چنانچہ حسن اور اس کے ساتھیوں کے کردار کے اس مثبت پہلو کی بنا پر ان دنوں محلے میں سب کی پرامید نظریں اس پر رہتیں، وہ خود یا اس کا کوئی ساتھی کوئی نازیبا حرکت کرتا تو لوگ احتجاج کرنے کی بجائے خاموش ہی رہتے۔ اس دوران علاقے کے تھانے سے پولیس والے حسن کے سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے آئے تو کسی نے اس کے خلاف کچھ تو موجودہ صورتحال اور کچھ اس کے خوف کی وجہ سے کوئی شکایت نہ کی۔ کیوں کہ میرے خیال میں ان دنوں شہر کے دوسرے علاقوں کے سنگین واقعات کے پیش نظر یہ لوگ حسن اور اس کے ساتھیوں کو بخوشی برداشت کر رہے تھے۔ البتہ یہ دیکھتے ہوئے میں اپنی پوری زندگی پر نظر ڈالتا تو خود ہی خود ہنستا اور ساتھ ہی اپنے بڑے بیٹے کے ہر وقت گھر میں گھس پیٹھیوں کی مانند پڑے رہنے پر بھی کڑھتا اور یہی سمجھتا کہ یہ زندگی میں پیچھے رہے گا اور اس معاشرے کا کسی طرح مقابلہ نہ کر پائے گا۔ چنانچہ میں اس کی جانب سے تقریباً مایوس ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس بات پر بیوی میری ہاں میں ہاں ملاتی ایسے موقع پر بہن اس کی طرف دیکھ دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکراتی اور خود حسن اسے کوئی اہمیت نہ دیتا اور گھر کے کاموں میں اس پر رعب جماتا رہتا جبکہ اس کے برخلاف حسن کی وجہ سے ہم سب کے اندر حوصلہ بڑھتا بہن اس کا بہت خیال رکھتی اور سہیلیوں سے اس کا ذکر فخریہ کرتی رہتی میں ایسے نازک مرحلے پر یہ سوچتا کہ شرافت کے ڈھیر پر بیٹھ کر زندگی گزارنا کتنا دشوار ہے۔

پھر شہر کے یہ سارے ناموافق حالات وقت کی راکھ تلے چنگاریوں کی طرح بجھتے چلے گئے اور شہر پرسکون ہو گیا۔ تو میں نے حالات کے اس موڑ پر محسوس کیا کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ محلے کے افراد کا رویہ بھی بدل گیا اور اب ان کے دل میں حسن کے لیے اس عارضی قدر کی جگہ ایک بار پھر اسی خوف زدہ کیفیت نے لے لی۔ اب وہ دوبارہ اس سے دل ہی دل میں نفرت کرنے لگے تھے مگر ظاہر نہیں کرتے تھے، ماں باپ اپنی اولاد کے لیے دوسروں کے جذبات ان کے چہروں اور آنکھوں سے باآسانی پڑھ لیتے ہیں اس لیے حسن کے بارے میں ان کے جذبات میرے دل میں ترازو ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ میں نے اس تبدیلی کو محسوس کیا مگر میں حسن کو سمجھانے بجھانے کے سوا کچھ نہ کر پاتا لیکن اس کا نقطۂ نظر ہمیشہ کی طرح اب بھی یہی تھا کہ اگر اس نے اپنا موجودہ رویہ ترک کر دیا تو یہی لوگ اس کا اور پورے گھر کا زندہ رہنا دشوار کر دیں گے۔ اس بات پر

، بات پر حسب دستور میں چپ ہو جاتا اور اس کی تعلیم و تربیت کی طرف
ے محض فکرمند رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا کیونکہ میں ان بچوں کے مستقبل
ی تعمیر کے ارمان میں برسوں سے بوجھ ڈھو رہا ہوں جس کے نیچے میں
ب ایک سرے پر میرا جسم اور دوسرے پر روح ہے۔

موسموں کی چادریں بدلتی رہیں اور زندگی اسی ناہموار راستے پر یونہی چلتی رہی۔ اب میں نے حسن کے رویے اور اس کی بہتری کے لیے سوچنا بھی ترک کر دیا تھا۔ میں محض معمولی معمولی سی باتوں کو غنیمت جانتے ہوئے مطمئن ہونے کی کوشش کرتا کیونکہ انسان تو مطمئن اور خوش ہونے کے بہانے تراشتا رہتا ہے۔ انہی دنوں ایک قریبی عزیز کی شادی کا دعوت نامہ ملا جس میں شریک ہونا لازمی ہو گیا۔ چنانچہ اس روز بیوی بیٹی اور علی سب اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میرے خیال میں اس قسم کی تیاری جسمانی سے زیادہ ذہنی عمل ہوتا ہے حسن حسب عادت گھر سے غائب تھا ویسے بھی وہ ایسے فنکشن میں نہیں جاتا تھا لیکن ماں بے حد چاہتی تھی کہ اس شادی میں وہ ضرور ساتھ چلے حالاں کہ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ کبھی راضی نہ ہوگا۔ اور اگر گیا بھی تو وہاں کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے گا مگر وہ اپنی بات پر مصر رہی پھر یہ مسئلہ بھی تھا کہ اس وقت وہ جانے کہاں ہوگا۔ اسے کس طرح اور کہاں تلاش کیا جائے اور محض اتفاقاً یا ممتا کی کشش کی بنا پر عین اسی لمحے اپنے مخصوص انداز میں وہ گھر میں داخل ہوا۔ ماں نے اسے تیار ہونے کو کہا تو اس نے حسب توقع انکار کر دیا۔ میں نے بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی، پھر ماں اور بہن کی ضد کی وجہ سے وہ بادل نخواستہ تیار ہو کر چند ہی لمحوں میں ہمارے ساتھ ہو لیا۔ بڑا شہر ہونے کے ناتے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے نہ صرف وقت بہت صرف کرنا پڑتا ہے بلکہ طویل فاصلے بھی طے کرنے پڑتے ہیں اور سواری ملنا علیحدہ کاردارد ہوتا ہے اس لیے گھر سے نکلنے کے بعد مجھے ہمیشہ ہی پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی بڑی کوشش کے باوجود کوئی ٹیکسی والا ہماری منزل مقصود تک جانے کو راضی نہ ہوا تو حسن نے جھنجھلا کر کھڑی ہوئی ایک خالی ٹیکسی میں جس کا ڈرائیور پہلے ہمیں انکار کر چکا تھا ہم سب کو بیٹھنے کے لیے کہا، ہماری اس حرکت پر اس لمحے ٹیکسی والا بھڑک اٹھا اور غصے کی حالت میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے معاملے کو رفع دفع کرنے کی غرض سے کہا کہ اچھا بھئی تمہاری مرضی مگر حسن نے بھی غصے کے عالم میں کہا کہ دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں جاتا۔ یہ سن کر ٹیکسی والا آپے سے باہر ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ حسن پر حملہ کر دیتا یا کوئی گالی دیتا، حسن نے چلا کر کہا کہ تیرے تو اچھے بھی جائیں گے۔ یہ سننا تھا کہ آس پاس سے حسن کے ساتھی جو دور کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے، قریب آ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور یہ صورتحال دیکھ کر خاموش ہو گیا اور ٹیکسی فوراً اسٹارٹ کر دی بلکہ پانچ افراد کے بیٹھنے پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ مجھے اور میری بیوی کو یہ اطمینان تھا کہ بات ہاتھا پائی تک نہیں پہنچی اور بیٹی حسب معمول دھیرے دھیرے مسکراتی رہی۔

شادی کے فنکشن سے فراغت کے بعد جب ہم باہر نکلے تو کافی وقت ہو چکا تھا۔ آخری تاریخوں کی رات تھی اور آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اجالا بہت کم تھا اور شہر کے راستوں کے چہروں کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ سواری کی جستجو میں ایک سنسان سڑک سے گزرتے ہوئے ہمیں اچانک ادھر ادھر سے پانچ چھ غنڈوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا اور میری بیٹی کی طرف بری طرح گھورتے ہوئے بڑھنے لگے یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا، بیٹی سہم گئی اور ماں نے بیٹی کو اپنے قریب کر لیا وہ نزدیک آئے تو میں نے ہمت کر کے انھیں دور رہنے کو کہا اس پر انھوں نے ملا جلا بھیانک قہقہہ لگایا۔ اس مرحلے پر لامحالہ بیٹی، بیوی اور میں نے مل کر اعتماد اور امید کے ساتھ حسن کو دیکھا۔ چنانچہ وہ سینہ تان کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا تو وہ غنڈے سب مل کر اس پر حملہ آور ہو گئے مگر وہ ایک آدھ ہاتھ چلانے کے سوا کچھ نہ کر پایا اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے تعجب سے کہا کہ ارے تمہیں اس وقت یہ کیا ہو گیا ہے۔ آگے بڑھو مگر وہ سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اس وقت میرے آدمی ساتھ نہیں ہیں میں اکیلا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ غیر متوقع طور پر مجھے اس وقت اس کی آواز میں خوف جھلکتا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میری کیفیت دھوپ کی کرچیوں سے زخمی مسافر کی سی ہو گئی اور اس وقت بجلی کے بلبوں کی

(باقی ص ۳۴ پر)

اندر سروپ دت ناداں
۲۶۹/۳۔ بی، پچھم وہار
نئی دہلی

خار پُشت

اس امن کیش، محبت پرست بستی میں !
یہ سُرخ شعلے، یہ خنجر کہاں سے آئے ہیں
یہ خار پشت، یہ اجگر کہاں سے آئے ہیں
جنم جنم کی شرافت پرست بستی میں !

ہے کس کے ہاتھ کا جادُو یہ جشنِ خوں ریزی
یہ آگ کس کی محبّت کا شاخسانہ ہے
یہ زہر کس کی شرافت کا شاخسانہ ہے
ہے کس کی ذات کا زیور نشانِ چنگیزی

لہُو کے دیپ جلاتا ہے کون شام ڈھلے
اور اپنے گھر میں ستاروں کو دفن کرتا ہے
حیات بخش بہاروں کو دفن کرتا ہے
خراج لیتا ہے زخموں سے کون رات گئے

جواب مانگتے ہیں لوگ ان سوالوں کا
ہے کوئی مدعی ان قتل ہونے والوں کا

شاکر جرولی
اونچا مکان۔ پوسٹ جرول
بہرائچ

غزل

چاند مقابل چاند کے ہو تنویر رہے تنویر کے پاس
تیرا جیسا کوئی بٹھا دوں آج تری تصویر کے پاس

ڈوب چلے حرفوں کے پیکر، غرق ہوئے لفظوں کے بدن
خاموشی کا اتنا گہرا دریا تھا تقریر کے پاس

سکّوں کی جھنکار کا موسم سر سے گزر جانے تو دو
ناداری کا گاؤں بسے گا لاکھوں کی جاگیر کے پاس

فصلِ جنوں، اک مہوش چہرہ، درد میں ڈوبے کچھ لمحے
یادوں کے اتنے نشتر ہیں ایک اکیلے میر کے پاس

کوس کڑے اور جلتا صحرا، یوں بے چین سے پھرتے ہیں
جیسے جانے کیلئے تڑپے رانجھا اپنی ہیر کے پاس

لاکھ اچھوتا اپنا فن ہو اب ایسا اندھیر بھی کیا
غالب کا لکھّا رکھتے ہیں لوگ مری تحریر کے پاس

غزلیں

حکیم مسعود احمد عباسی مُبتصر امروہوی

شاہ پیر گیٹ۔ میرٹھ

جب کبھی پیشِ جنوں بات بڑھانے آئے
ایک ٹھوکر ہی میں رستے پہ زمانے آئے

راستہ بھُول کے نکلے تھے غلط رستے پر
اب جو اندازہ ہوا ہوش ٹھکانے آئے

بُجھ گئیں شمعیں تو دل ہم نے جلایا اپنا
جس میں ہمّت ہو وہ یہ شمع بجھانے آئے

کھیل ہے عزم و عمل کا سر بازی گہِ عشق
پاس کچھ ہے کہ یونہی شرط لگانے آئے

اس گلستاں سے چلیں ہم جو باندازِ نسیم
دُور تک نکہتِ گُل ساتھ نبھانے آئے

خود کو دہراتی ہے تاریخ ذرا دیکھو تو!
لوٹ کر پھر وہی نا دیدہ زمانے آئے

جب بھی آیا ہے تجھے دل سے بھُلانے کا خیال
یادِ ماضی کے بہت ہم کو فسانے آئے

اپنی محفل میں مُبتصر کوئی تفریق نہیں!
کون بیگانہ ہے سب یار یگانے آئے

شمس فرخ آبادی

سحر و منزل۔ گولا گنج لکھنؤ

خیر ہو زنداں میں گونجے جائے ہے زنجیرِ پا
دیکھیے کیا رنگ اب دکھلائے ہے زنجیرِ پا

اللہ جانے اب کہاں پہنچائے ہے زنجیرِ پا
کچھ دنوں سے تنگ ہوتی جائے ہے زنجیرِ پا

طفلکِ ناداں کی طرح رونے ہنسنے پر مرے
عرصۂ تنہائی میں بہلائے ہے زنجیرِ پا

گھوم پھر کر دائرے سے گر نکالوں بھی قدم
کھینچ کر محور پہ پھر لے آئے ہے زنجیرِ پا

جتنا جتنا تیز ہوتا جائے ہے رقصِ جنوں
اُتنا اُتنا اور بھی بل کھائے ہے زنجیرِ پا

تھک کے بیٹھوں تو عجب منظر ہو میرے اِردگرد
حلقۂ احباب سی بن جائے ہے زنجیرِ پا

ہر کڑی کو غور سے دیکھوں تو بس دیکھا کروں
کچھ شناسا صورتیں دکھلائے ہے زنجیرِ پا

ہو شکستہ سازِ دل تو رقصِ بسمل کے لیے
شمس تب گھنگھرو سے کچھ چھنکائے ہے زنجیرِ پا



راج بھون (لکھنؤ) میں گورنر اترپردیش شری محمد عثمان عارف کی صدارت میں ۲۴ را پریل ۱۹۸۹ء کو ماہنامہ "استقامت" ڈائجسٹ (انگریزی) کی رسم اجراء کی تقریب منعقد ہوئی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں "استقامت" (اُردو) کے مدیر شری ظہیر الدین قادری وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کو "استقامت" (انگریزی) کا پہلا شمارہ پیش کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

گورنر شری محمد عثمان عارف ۱۳ مئی ۱۹۸۹ء کو بیلی گارد (لکھنؤ) میں وزیر ریاست برائے اطلاعات، شہری ترقی و پارلیمانی امور شری نریش چندر کی جانب سے منعقدہ عید ملن کی تقریب میں شہریوں سے عید کی مبارک باد قبول کرتے ہوئے۔ تصویر میں شری نریش چندر بھی نظر آرہے ہیں۔





وزیراعلا شری نرائن دت تیواری، ۲۰؍اپریل ۱۹۸۹ء کو لکھنؤ میں مرکزی وزیر مملکت برائے غذا و رسد شری سکھ رام سے ریاست میں غذا و رسد سے متعلق صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے۔ تصویر میں اترپردیش کے وزیر شری حکم سنگھ بھی نظر آ رہے ہیں۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری انیکسی (لکھنؤ) میں ۸؍مئی ۱۹۸۹ء کو ایک خصوصی جلسے میں دیہی انجینئرنگ خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے

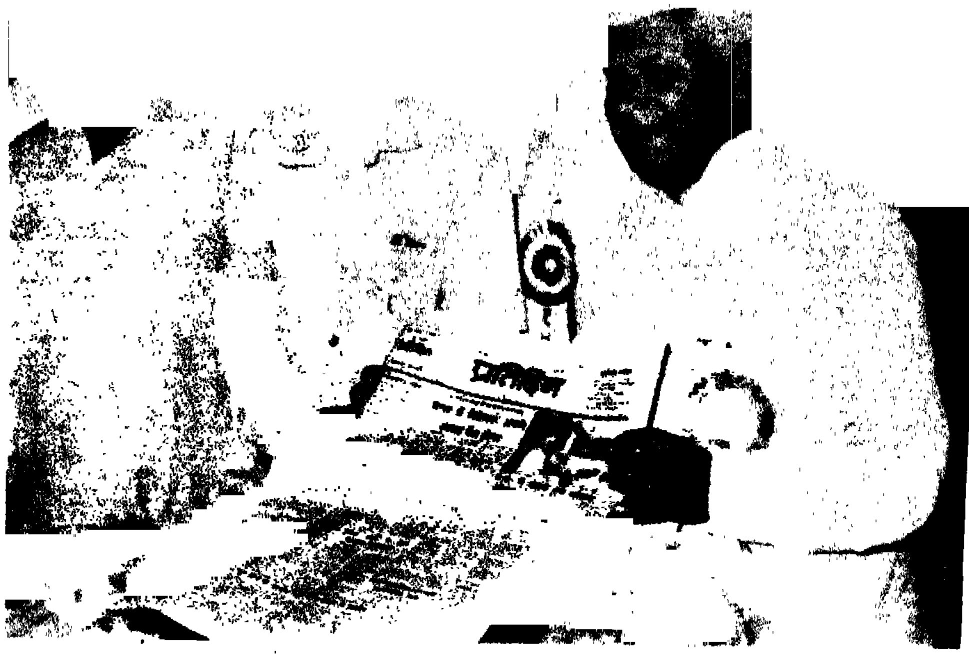




وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری ۲۵ر اپریل ۱۹۸۹ء کو انیکسی میں "اقبال : ہندی کے آئینے میں" نامی تصنیف کی رسم اجرار انجام دیتے ہوئے۔ تصویر میں اتر پردیش کی وزیر تعلیم شریمتی سروپ کماری بخشی بھی نظر آرہی ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری ۲ر مئی ۱۹۸۹ء کو سنچائی بھون (لکھنؤ) میں محکمہ آب پاشی کے ایک اعلیٰ سطحی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے





وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری یکم مئی ۱۹۸۹ء کو سیتاپور میں ہندی روزنامہ "پرتی دن" کے سیتاپور ایڈیشن کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے

وزیر ریاست برائے اطلاعات، شہری ترقی و پارلیمانی امور شری نریش چندر نے ۴ مئی ۱۹۸۹ء کو عیدگاہ (عیش باغ لکھنؤ) میں صفائی بندوبست کا معائنہ کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں شری نریش چندر کے ساتھ امام عیدگاہ مولانا احمد میاں فرنگی محلی بھی نظر آ رہے ہیں۔



احقر کاشی پوری
رام نگر روڈ، کاشی پور ۔ نینی تال

قطعات

روز و شب سے جہاد کرلوں گا
یاس کا انسداد کرلوں گا
زندگی جیس تو بدل کوئی
تجھ پہ پھر اعتماد کرلوں گا

ایک ساعت کلی کے کھلنے کی
اک مہورت خلش نکلنے کی
لگ رہی ہے حیات آج مجھے
شام جیسے کسی سے ملنے کی

رشتۂ یاس جاگتے سوتے
نوبہ نو پیرہن بدلتا ہے
زندگی بھر نزول یادوں کا
دیپ سے جیسے دیپ جلتا ہے

راگنی ساز اب نہیں آتی
موجِ شہناز اب نہیں آتی
رات پتھرا چکی تعلق کی
کوئی آواز اب نہیں آتی

پھر پلٹ آئیں دیدہ و دل کو
بس یہی انتظار رہتا ہے
چند باغ و بہار لمحوں کا
زندگی بھر خمار رہتا ہے

کاوش پرتاپگڑھی
ڈی ۔ ۱۹۰ ۔ بلجیت نگر ۔ ویسٹ پٹیل نگر
نئی دہلی

ھائیکو

جاپانی صنفِ سخن 'ھائیکو' سے انداز میں نظمیں

آج پھر فاقہ کریں گے میرے بچے
دیکھ کر مجھ کو پرندے
پھڑپھڑا کر اڑ گئے سارے شجر سے

چاند پیروں کے تلے ہے
اور خلا میں ہیں ٹہلتے
ہم مہذب کیا نہیں ہیں ؟

ایک ہاتھ میں انگارہ ہے
دوسرے میں ہے برف کی گیند
ہم کیا سچ مچ بے حس ہیں ؟

جسم میں قید جو پرندہ ہے
مضطرب ہے نہ جانے کب سے وہ
اپنے یاروں کے پاس جانے کو

اڑ رہی ہیں تتلیاں چاروں طرف
میری قسمت میں بھی شاید کوئی ہو
مدتوں سے گلستاں میں پھر رہا ہوں

جب کوئی کارِ خیر کرتا ہوں
ایک ذہنی سکون ملتا ہے
اور اسی میں مرا خدا خوش ہے

ساغر وارثی

ایمپوریم. جلال نگر
شاہ جہاں پور

عین ممکن تھا مرے غم کا ازالہ ہوتا
تم نے مفہومِ خموشی تو نکالا ہوتا

کوئی خط اس نے مجھے ایسا تو ڈالا ہوتا
جس میں ایامِ گزشتہ کا حوالہ ہوتا

مجھ کو محفل میں بھی تنہائی کا احساس ہے کیوں
کاش یہ بات کوئی سوچنے والا ہوتا

اسکے بازو جو ہوئے شل تو کناروں کی طرف
ڈوبنے والے کو موجوں نے اچھالا ہوتا

روح کا دل سے تعلق جو سمجھنا تھا تمھیں
عکس آئینے کا آئینے پہ ڈالا ہوتا

لوگ بیگانہ سہی تم تو شناسا تھے مرے
تم نے تو سنگِ ملامت نہ اچھالا ہوتا

حادثے ذہن کو بے نور نہ کرتے ساغر
خود کو حالات کے سانچے میں جو ڈھالا ہوتا

ہما پروین

۱/۱۱۱ اے بلاک۔ اندرا نگر
لکھنؤ

خوشبوؤں کی آہٹ کو تتلیاں سمجھتی ہیں
کون آنے والا ہے لڑکیاں سمجھتی ہیں

نام اس کا لینے سے فائدہ نہیں کوئی
کس نے مجھ کو لوٹا ہے بستیاں سمجھتی ہیں

ساحلوں پہ رہ کر بھی مطمئن نہیں رہتیں
برہمی سمندر کی کشتیاں سمجھتی ہیں

رات میرے آنگن میں چاند گفتگو کرنے
کس طرح سے اترا تھا سیڑھیاں سمجھتی ہیں

وہ ہوا کا جھونکا تھا یا تری شرارت تھی
کون ادھر سے گزرا ہے کھڑکیاں سمجھتی ہیں

زندگی سے گھبرا کر خودکشی نہ کر بیٹھیں
ماں تری اداسی کو بیٹیاں سمجھتی ہیں

ضد کسی کھلونے کی اب ہما نہیں کرتیں
اپنے گھر کی غربت کو بچیاں سمجھتی ہیں

جالب نعمانی

معرفت "اشتراک ویکلی"
قاضی پور خورد۔ گورکھ پور

صفحۂ صفحۂ خواب کے منظر بنتے ہیں
رنگوں سے اظہار کے پیکر بنتے ہیں

قطرہ قطرہ بٹنے میں رسوائی ہے
قطرہ قطرہ مل کے سمندر بنتے ہیں

لفظوں کو جذبوں میں تپا کر تو دیکھو
ان سے کیسے کیسے خنجر بنتے ہیں

اک جھونکے میں ریگ کی صورت بکھریں گے
ظاہر میں وہ لوگ جو پتھر بنتے ہیں

طوفانوں کے بیچ رہو تو سمجھو گے
بھٹکے پرندے کیسے رہبر بنتے ہیں

ہاتھوں کی بے جان لکیریں مت دیکھو
ان سے کبھی دنیا کے مقدر بنتے ہیں

وجدان و احساس کے صدقے میں جالب
گاہے گاہے شعر پیمبر بنتے ہیں

غزلیں

مشاہیر کے خطوط

پٹنہ - ۴

۲۳ مئی ۱۹۷۹ء

مشفق مکرم!

کاظم علی خاں صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ موعودہ مضمون کے منتظر ہیں "فرہنگ آصفیہ کی جھلکیاں" چند دنوں میں مکمل ہو جائے گا۔ آپ چاہیں تو بھیج دوں۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص

قاضی عبدالودود

"بڑی سرکار"

مارہرہ (ایٹہ) یو، پی

محبی! السلام علیکم

آج ستمبر کا نیا دور ملا، ممنون کرم ہوں۔ عرصہ ہو گیا کہ اپنے محبوب پرچے رسالے کی خدمت سے محروم رہا، شرمندہ ہوں۔ دونوں ٹانگیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ اپاہج ہوں، پلنگ کا قیدی ہوں۔ زندگی کی ساری ضرورتیں بستر ہی پر پوری ہوتی ہیں۔ عمر کا چھیانواں برس اگلے مہینے کی ۱۹ ویں کا منتظر ہے۔

دعا فرمائیے کہ اب جو شروع کیا ہے ختم کر لوں اور نیا دور سلمہ اللہ تعالیٰ کی نذر کروں۔ بلگرامی سادات کا ایک گھرانہ مارہرہ میں آن بسا۔ اسی گھر کے ایک جید بزرگ حضرت صاحب عالم کا ایک قلمی روزنامچہ ہاتھ آیا۔ فارسی زبان میں ہے۔ شانِ تحریر یہ کہ دو برس کی کاوش اور دیدہ ریزی کے بعد اس بے بضاعت کو پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ بزرگ میرے قریبی رشتے سے پردادا ہوتے تھے۔ سنتا ہوں کہ روزنامچے کی اٹھارہ جلدیں تھیں، جو نہ جانے کہاں کہاں پہنچیں۔ حسنِ اتفاق کہ دو ضخیم جلدیں حضرت کے گھر کے ایک باندی بچے نے قصبہ کے کسی بنیئے کو ردّی میں بیچنے کے لیے سرقہ کیں اور ہمارے ہاتھ لگیں۔ حضرت صاحب مرزا غالب کے ہم عصر اور گہرے دوست تھے۔ بہرکیف دو ڈھائی برس کی مسلسل کاوش کے بعد اب میں نے بعض مفید حصے اپنائے اور تحریر کا عکس بھی لیا۔ اگر جی گیا تو نیا دور کی نذر کروں گا اور تحریر کا عکس بھی ہم رشتہ ہوگا۔

کیا عرض کروں کہ لکھنؤ آنے کی تمنا میرے لیے کتنی روح فرسا ہے۔ عمر کا بڑا حصہ، جس میں طفلی اور جوانی کا طویل زمانہ گزرا ہے، کس طرح مجھے اذیت دے رہا ہے۔ عرفان احمد صدیقی میرے داماد اور میرا اپنا برادرزادہ عقیل حیدر دونوں اطلاعات کے محکمہ میں ہیں۔ ان کے بال بچے وہیں ہیں۔ ان لوگوں سے ملنے کی کتنی تڑپ ہے۔ مگر چلنا پھرنا کیسا، پلنگ چھوڑے بھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مارہرہ اب کیسا ہے۔ حویلی کا دروازہ کہاں ہے۔

صبح سے پڑے پڑے یہ نیاز نامہ اب دو بجے ختم کرتا ہوں اور لاحظہ کی تکلیف گوارا کرنے کی معافی کا خواستگار ہوں۔

خادم

آوارہ

دسمبر ۱۹۸۲ء

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نامِ کتاب : چراغِ نیم شب (شعری مجموعہ)
شاعر : حنیف کیفی
قیمت : چالیس روپے
ملنے کا پتہ : نصرت پبلشرز ۔ امین آباد ۔ لکھنؤ

"چراغِ نیم شب" ڈاکٹر حنیف کیفی کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے ۔ انھوں نے شاعری کے رموز و نکات جناب عشرت بریلوی سے سیکھے ۔ کتاب کا انتساب انھیں کے نام ہے ۔ حنیف کیفی شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں پروفیسر ہیں ۔ کیفی صاحب نے زندگی کو بڑا جھیلا ہے ۔ مشاہدات و تجربات کی ان کے یہاں کوئی کمی نہیں ہے ۔ ان کی ساری زندگی جد و جہد سے عبارت ہے ۔ یہاں تک پہنچنے میں انھیں طویل سفر طے کرنا پڑا ۔ اور وہ سرخرو بھی ہوئے ۔

ان کی غزلیں انھیں کی طرح سادہ و دل نشین ہیں، جن پر ان کی ریاضتِ فن کی گہری چھاپ نظر آتی ہے ۔ انھیں اچھی طرح سمجھنے کے لیے میں ایک اقتباس کا سہارا لے رہا ہوں جو موصوف نے "متاعِ خونِ جگر" کے عنوان سے تحریر کیا ہے :۔

"میں شاعری کو ایک فنِ شریف سمجھتا ہوں اور اسے کسی بھی طرح کی آلودگی سے ملوث کرنا گناہ تصوّر کرتا ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہ تو کبھی کسی مخصوص سماجی، سیاسی یا اسی قسم کے کسی بھی غیر ادبی نظریے یا ازم کا پابند رہا ہوں اور نہ کبھی ادبی گروہ بازی، جگروہ بندی یا فیشن پرستی کا شکار ہوا ہوں، نہ کھوکھلی روایت پرستی کا قائل ہوں، نہ بے تکی جدّت پسندی کا ۔ زمانے کا ہم قدم ہونا تقاضائے حیات سمجھتا ہوں لیکن اسی حد تک کہ چال نہ بگڑنے پائے ۔ میرے نزدیک شاعری اپنی تلاش کا نام ہے ۔ میرے لیے یہ عرفانِ ذات کا راستہ بھی ہے اور انکشافِ ذات کا وسیلہ بھی ۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

"میرا تخلیقی سفر آہستہ روی کے ساتھ جاری ہے کیونکہ میں آہستہ روی کو سلامت روی سے تعبیر کرتا ہوں تخلیقی سفر ایسا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا ۔"

آیئے ان کے کچھ اشعار دیکھیں ؎

اب آکر چھاؤں تھوڑی سی ملی بھی ہے تو کیا حاصل
برستی آگ میں سارا سفر تو ختم کر آئے

وہ خواب ناک فضا، وہ ترے وصال کی رات
مری نظر میں ہے اب تک وہ جاگتا منظر

پریشاں کیوں ہے دل کیا ہونے والا ہے خدا جانے
بہ ہر عالم کوئی بے نام سا ڈر ساتھ رہتا ہے

ترے جمال سے راہِ حیات روشن ہے
چراغ لے کے تجھے ڈھونڈنے نکلتے کیا

ہاتھوں کی لکیروں پہ بڑا ناز تھا ہم کو
یہ جانتے اے کاش کہ مٹھی میں ہوا ہے

مرے خلوص کا یاروں نے آسرا لے کر
کیا ہے خوب مری دوستی کا استعمال

خبر کرو کوئی ٹھہری ہوئی ہوا اُس کو
بھڑک رہا تھا جو شعلہ وہ آج سرد ہوا

بھرم بنائے ہوئے ہوں سفید پوشی کا
ضروریات کا محرومیوں سے رشتہ ہے

"چراغ نیم شب" میں اچھے اشعار بکثرت ہیں۔ کتاب فوٹو آفسیٹ پر انتہائی دیدہ زیب انداز میں چھپی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حنیف کیفی کا یہ فکری سرمایہ اربابِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کرے گا۔

—— رباب رشیدی

نام کتاب: نئے نئے آسمان (شعری مجموعہ)
شاعر: مہدی پرتاپ گڑھی قیمت: ۱۵ روپے
ملنے کا پتہ: رومی پبلشرز۔ ۹۲ھ/۲۶۶ بھدیواں لکھنؤ

مہدی پرتاپ گڑھی کی غزلوں میں انسانی پیکر عصر حاضر کی سنگینیوں سے نبرد آزما نظر آتا ہے۔ اس کا تہذیبی ورثہ دن بہ دن روبہ انحطاط ہو کر ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ شاعر کی وابستگی جن اعلیٰ قدروں سے ہے وہ ٹوٹ چکی ہیں اور اس کی کرچیں اسے لہولہان کرتی رہتی ہیں ؎

کل تو یورش میرے مکاں پر تھی
لُٹ گیا آج کس کا گھر بولو
کیوں انگوٹھے کٹے ہیں محنت کے
آج رُسوا ہے کیوں ہُنر بولو

مہدی صاحب کا تخلیقی لگاؤ ایک فعال اور متجسس ذہن کی نشان دہی کرتا ہے چنانچہ انسانی اقدار کے کھنڈر پر یوں رقمطراز ہوتا ہے ؎

پھر کسی دستک پہ کیسے چونکتے اُس کے مکیں
چند لاشوں کے سوا کوئی نہ خالی گھر میں تھا

شاعر کے عمیق مشاہدے کی خود ایک دلیل ہے۔ نازش پرتاپ گڑھی مرحوم نے بجا طور پر فرمایا تھا کہ "مہدی صاحب کی غزلیہ شاعری انسانی رشتوں کی استواری اور محبت کی پائیداری کا سراغ دیتی ہے"۔ یقیناً ان کی شاعری نئی جہتوں کی نشان دہی کرتی ہے اور ان کا مخصوص لہجہ انفرادیت کا حامل ہے ؎

ہیں خونچکاں میرے الفاظ میرا فن زخمی
لہولہان صداقت کی رہ گزر ہوں میں

—— اسلم ولیدی

نام کتاب: ادبی مضامین
مصنف: نثار اعظمی قیمت تیس روپے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

اپنی اس تصنیف سے نثار اعظمی نے اپنے آپ کو اہلِ ادب سے اس طرح روشناس کرایا ہے کہ صاحبِ نظران سے اور بہتر کی توقع کرنے لگے ہیں۔

بارہ مضامین کی اس کتاب کو نثار اعظمی نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول عصری مسائل۔ دوم کلاسیکی ادب اور تیسرا حصہ شخصیات سے متعلق ہے۔ پہلے حصے میں نئی غزل، جدید ادب اور ادب اطفال پر مضامین ہیں۔ دوسرا حصہ کلاسیکی ادب کے چند موضوعات پر مبنی ہے۔ تیسرا حصہ شخصیات کے تحت سرسیّد، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر نورالحسن ہاشمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔

ادبی مضامین میں کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جس کے متعلق قارئین نہ جانتے ہوں۔ ہر موضوع پر نہ جانے کتنی کتابیں اُردو میں موجود ہیں لیکن جب یہ موضوعات مختصراً ایک مضمون میں سمیٹنا پڑتے ہیں تو اس میں کتنی دقتیں ہوتی ہیں، یہ صرف لکھنے والا ہی جان سکتا ہے۔ نثار اعظمی نے ہر موضوع کے ساتھ محنت کی ہے اور ہر اس گوشے کو اپنے احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے جو ایک چھوٹے سے مضمون میں بہ مشکل آسکتا ہے۔

—— وقار ناصری

نام کتاب: "شیشۂ دل" (شعری مجموعہ)
شاعر: سلیمان صدیقی — قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ امین آباد لکھنؤ

"شیشۂ دل" جناب سلیمان صدیقی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے "برگِ گل" ان کی اولین شعری پیشکش تھی۔ برگِ گل کی اشاعت کے زمانے سے ہی یہ حقیقت آشکار ہونے لگی تھی کہ سلیمان صدیقی صرف اور صرف اپنے دماغ سے سوچتے اور اپنے قلم سے لکھتے ہیں بعض معاصرین سے وہ متاثر ضرور ہیں لیکن اپنی شاعرانہ شناخت کو وہ بہرصورت قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

شیشۂ دل بھی ان کے دل کش اسلوب اور انفرادی طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ دیانت داری اور بے باکی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرنا سلیمان صدیقی کا طرۂ امتیاز ہے۔ سادہ، عام فہم اور فطری انداز میں زندگی کے انفرادی و اجتماعی مسائل کو اشعار کا پیکر عطا کرنے میں انھیں خاص مہارت حاصل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سلیمان صدیقی کے شعری مجموعے میں نئے شعری تجربوں اور جدید رنگِ سخن کی جستجو کرنے والے قارئین کو مایوسی ہوگی، کیوں کہ ان کے یہاں عصری حسیت تو موجود ہے لیکن اسلوبِ سخن کسی حد تک روایتی ہے۔

مختصر یہ کہ زیرِ تبصرہ مجموعۂ کلام ایک ایسے شاعر کا سرمایۂ سخن ہے، جس کا دل شیشے سے بھی زیادہ نازک اور دماغ بیدار، تروتازہ، جذبات سے پُر اور حالاتِ حاضرہ سے باخبر ہے۔

شیشۂ دل صرف غزلوں ہی کا نہیں بلکہ زندگی، احساسِ شکست، ارادے، آمدِ بہار، رقصِ بہار، اعتراف اور میرا گاؤں جیسی خوبصورت نظموں کا گلدستہ بھی ہے۔ ویسے بنیادی طور پر سلیمان صدیقی غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یوں دوستوں کا ساتھ نبھاتا رہا ہوں میں
ہر زخمِ دل کا ان سے چھپاتا رہا ہوں میں

زندگی کی بے ثباتی کا جنھیں احساس ہے
وہ زمانے کے فریبوں میں بھی آ سکتے نہیں

اپنے ہی جب ہیں بیگانے
کون کسی کو اب پہچانے
صحراؤں میں پھول کھلے ہیں
شہر ہوئے ہیں اب ویرانے

—— جعفر عسکری

نام کتاب: "دامِ تحریر"
مصنف: ڈاکٹر جلیس سہوانی — قیمت: دس روپے
ناشر: جلیس سہوانی۔ رستم ٹولہ۔ سہسوان (بدایوں) یو۔پی

جلیس سہوانی محض "گل کدہ" کے ایڈیٹر ہی نہیں ہیں، ناول نگار بھی ہیں۔ ان کے معیاری ناول "پھیلتے اندھیرے" اور "موم کا پتھر" منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ "دامِ تحریر" ان کا ایک ایسا ناولٹ ہے جو رومانی خطوط پر مبنی ہے۔ یہ خطوط تخیل کی فراوانی سے زیادہ آپ بیتی پر منحصر ہیں۔ ان خطوط کے سہارے عظیم شعراء میر، غالب وغیرہ کے کلام پر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہیروئن کے خطوط کو بنیاد بنا کر انھوں نے اپنی کتابوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ یہ ناول شادی شدہ مرد کی دماغی عیاشی اور تعلیم یافتہ عورت کی عیاری کی بہترین تصویر ہے۔

دامِ تحریر عشق کی آگ کو بھڑکاتا ہے لیکن خوش نما فریب کا بھانڈا حالات پھوڑ دیتے ہیں۔

جلیس سہوانی کے طرزِ تحریر میں روانی اور شگفتگی ہے۔ اندازِ بیان اچھوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک معیاری ناول ہے جس کا ظاہری روپ (یعنی گٹ اپ وغیرہ) بھی خوبصورت ہے۔

—— خلیل اللہ خاں

نام کتاب: "نمودِ سحر"
شاعر: نیر قریشی گنگوہی — قیمت: ۳۵/- روپیہ

ملنے کا پتہ: نیر ولا۔ گنگوہ ضلع سہارن پور

"نمودِ سحر" ملک کے مقبول شاعر، نیر قریشی کا مجموعۂ کلام ہے۔ جو خوبصورت غزلوں اور قطعات و رباعیات سے آراستہ ایک ایسا گلشن ہے جس کی خوشبو اذہان و افکار کو ہمیشہ مہکاتی رہے گی۔

نیر قریشی کی شاعری میں حسن و عشق کی رنگینی کے ساتھ ساتھ حادثاتِ زمانہ سے نبرد آزمائی کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔ جمالیاتی حسن اور محبت کے لطیف جذبوں کا عنصر ان کے کلام کا جوہر ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی نے ان کے بارے میں بڑے کمال کی بات کہی ہے کہ:

"نیر قریشی کی شاعری کو پڑھ کر مجھے ان کے شعری اور تخلیقی تجربوں میں شرکت کا موقع ملا اور میں نے محسوس کیا کہ جو سادگی اور خلوص، درد مندی اور دلنوازی ان کی زندگی میں ہے وہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔"

بلاشبہ نیر قریشی اپنے احساس کے رچاؤ اور شعور و فکر کی بلندی کے ساتھ تخیل کی وادی میں سفر نہیں کرتے بلکہ حقیقتِ حیات و کائنات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

نمودِ سحر ۷۶ صفحات پر بکھری ہوئی لہولہان احساس کی ایک ایسی کہکشاں ہے جو زبان و ادب کے لیے نئے زاویے اور نئے دائرے تراشتی ہے۔"

ان کے ایسے اشعار زندہ ہیں اور ہمیشہ ان کی قادر الکلامی اور علمی و فکری برتری کا احساس اجاگر کرتے رہیں گے ملاحظہ ہو۔

تاریک راستوں میں جلا کر چراغِ دل
ہر سمت اک نمودِ سحر چھوڑ جاؤں گا

نئی سحر کی تمنا میں ڈھل رہا ہوں میں — حسین وقت کے تیور بدل رہا ہوں میں

شعری مجموعہ "نمودِ سحر" کتابت اور اشاعت کا اعلیٰ معیاری نمونہ ہے سرورق خوبصورت اور جاذبِ نظر ہے۔

واصف عابدی

"بانی: ایک معتبر آواز" صفحہ ۱۵ کا بقیہ

ان اشعار میں غواصی کرنے کے بعد یہ منظر کھلتا ہے کہ یہاں صرف متحرک و غیر متحرک مناظر اور پیکر ہی نہیں بلکہ آج کے انسان کی تنہائی اس کا کرب اس کی اندرونی کشمکش و اضطراب اقدارِ حیات کی شکست و ریخت جو نئی غزل کی اساس ہیں ان اشعار میں موجود ہیں۔

اب بانی کی یہ غزل دیکھئے جن میں مناظر کا ایک ہجوم، شعر کی بے حد و جہت فضا میں متحرک منظروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ سب سے زیادہ لائقِ توجہ اس غزل کی ردیف ہے جو بذاتِ خود ایک متحرک پیکر ہے، اور جس سے بار بار زندگی کی توانائی اور حرارت کا احساس ہوتا ہے پھر ایک گہرا لمسی تجربہ بھی اس سے وابستہ ہے جو پوری غزل کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے ؎

اک ڈھیر راکھ میں سے شرر چن رہا ہوں میں
خوابوں کے درمیان خبر چن رہا ہوں میں
کیا جانے اس کے خط میں دھواں کیا ہو حرف حرف
مفہوم چن رہا ہوں اثر چن رہا ہوں میں
اک خواب تھا کہ ٹوٹ گیا خوں کے حبس میں
اب تند دھڑکنوں کے بھنور چن رہا ہوں میں
کیا دلخراش کام ہوا ہے مرے سپرد
اک زرد رت کے برگ و ثمر چن رہا ہوں میں
اے رمز آشنائے تجسس ادھر بھی دیکھ
اندھے سمندروں سے گہر چن رہا ہوں میں
وہ مستقل غبار ہے چاروں طرف کہ اب
گھر کے تمام روزن و در چن رہا ہوں میں
بانی نظر کا زاویہ بدلا ہے اس طرح
اب ہر فضا سے چیزِ دگر چن رہا ہوں میں

••★••

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۳۵ - قطب پور ڈالی گنج لکھنؤ

ثابت قدم

(۱۴۰۹ھ)

دن رات کے اوراق الٹے رہتے ہیں اور تاریخ تغیر ہوتی رہتی ہے۔ تصور کیجیے ۲۸ء کا زمانہ ہے کہ مجھے اپنے دوست اور کلاس فیلو شمشیر بہادر صمدی صاحب سے یہ بات معلوم ہوتی کہ نسیم انہونوی صاحب رسالہ انکشاف کے اڈیٹر ہوگئے ہیں اور اب ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کا یہ رسالہ انھیں کی ادارت میں نکلے گا۔ صمدی صاحب ایک آنہ فنڈ کے قریب رہتے تھے اور وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کو شہر کی خبریں بہت جلد معلوم ہوجاتی تھیں۔ میں جوبلی کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں نسبتاً دور رہتا تھا اور شہر والوں سے کٹا ہوا۔ خیر صاحب، ہم دونوں رسالہ 'انکشاف' کے دفتر (واقع ماڈل ہاؤس) پہنچے۔ فنڈ مذکور کے جنرل سکریٹری سید خلیل احمد صاحب بڑے اخلاق اور شفقت سے ملے۔ رسالہ دیا۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے یہ ایک آنہ فنڈ کے معمولی خبرنامہ کے طور پر شائع ہوتا تھا اور اب اسے نسیم صاحب نے ادبی بنا دیا ہے۔ ہم دونوں خوش خوش رسالہ لے کر واپس ہوئے۔ اب مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ صمدی صاحب نے میری ملاقات نسیم صاحب سے کب کرائی تھی اور کہاں۔ شاید نسیم صاحب نے جب 'انکشاف' کا سالنامہ نکالا یا اس کا ظریف نمبر تب میں ان سے ملا تھا یا نیاز فتح پوری صاحب کے دفتر واقع نظیر آباد میں۔

جولائی ۳۱ء سے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک ہوسٹل میں رہنے لگا۔ صمدی صاحب بھی اسی ہوسٹل میں آگئے تھے اور وہیں ان سے معلوم ہوا تھا کہ اب نسیم صاحب رسالہ حریم نکالنے لگے ہیں اور اس کا دفتر اب لاٹوش روڈ پر قائم ہوگیا ہے' اتفاق سے یہ دفتر میرے ماموں کے مکان کے بالکل قریب تھا اور رسالہ حریم ان کے ہاں آتا تھا اس لیے جب میں اپنے ماموں کے وہاں ہفتہ عشرہ میں جاتا تو اس رسالہ کی زیارت ہوجاتی تھی۔ مضامین لکھنے کا مجھے بھی اس وقت شوق ضرور تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس عورتوں کے پرچے کے لیے کیا لکھوں۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ ۳۸ء یا ۳۹ء میں جب میں علی گڑھ میں تھا وہاں سے دو ایک مضامین نسیم صاحب کو بھیجے تھے اور اسی سال 'حریم' میں شائع ہوگئے تھے۔

وقت نے پھر کروٹ لی اور فروری ۴۵ء میں میں پھر لکھنؤ آگیا۔ یونیورسٹی میں لیکچرر ہوکر۔ اور اب کے میرا قیام میرے ماموں (مولوی رفیع الدین) صاحب مرحوم کے مکان ہی میں ہوا۔ جو حریم کے دفتر کے پڑوس ہی میں تھا۔ اس وقت میری شادی سرور فاطمہ عثمانی سے ہوچکی تھی جو میرے ماموں صاحب کی نواسی تھیں اور چونکہ وہ حریم کے ابتدائی دور میں حریم کے لیے مضامین لکھا کرتی تھیں انھیں حریم کی بزم ادارت میں بھی شامل کر لیا گیا تھا اور نسیم صاحب نے انھیں منہ بولی بہن بنا لیا تھا۔ اس رشتہ کو اپنی ساری عمر بڑی خوش اسلوبی سے نبایا اور میری مرحومہ بیگم بھی بحیثیت ایک بڑے بھائی کے ان کی بڑی عزت اور تکریم کرتی تھیں۔ ان تعلقات میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب ان کے بڑے بیٹے شمیم سلمہ کے ساتھ میری بیٹی کا عقد ۱۹۶۱ء میں ہوگیا۔

جنوری ۷۰ء سے میں یونیورسٹی کے ایک مکان میں منتقل

ہو گیا تھا جو دفتر حریم سے کافی دور تھا لیکن نسیم صاحب کبھی تنہا اور کبھی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ از راہِ عنایت و مہربانی وہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ یہی صورت اس وقت بھی رہی جب ۸۲ء میں میں ڈالی گنج میں مقیم ہو گیا۔ اگرچہ ۶۹ء سے نسیم صاحب کو دمہ کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا لیکن وضعداری ان سے چھوٹ نہیں سکتی تھی۔ وفات سے چند دن قبل بھی انہوں نے مجھ سے فون پر وعدہ کیا تھا کہ اس اتوار کو بوجہ حرارت نہ آ سکا اگلی اتوار کو ضرور آؤں گا اور وہ ضرور حسب وعدہ آتے مگر افسوس کہ وہ اگلی اتوار سے ایک دن پہلے یعنی سنیچر ہی کو ایسی جگہ چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

نسیم انہونوی صاحب نے اپنی زندگی بڑی محنت اور مشقت سے بنائی۔ ایک وقت ان پر ایسا بھی گذرا کہ جب وہ اپنے دفتر کے کلرک، اڈیٹر اور منیجر سب خود ہی تھے۔ پھر ایسا بھی زمانہ آیا جب مالی حالت ایسی سقیم ہو گئی کہ انھیں اپنی والدہ اور پہلی بیوی کے زیور فروخت کر کے اپنے بکڈپو میں ساری رقم لگا دینا پڑی۔ اور کبھی کبھی قرض بھی لینا پڑا۔ لیکن وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ سرد و گرم زمانہ کو جھیلتے رہے مگر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کبھی نہ بیٹھے۔ اور برابر محنت شاقہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بالآخر کامیاب ہوئے۔

یہ نسیم صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں نیاز فتح پوری جیسا تجربہ کار صحافی بطور ایک راہبر مل گیا۔ اور جس نے ان سے حریم جیسا رسالہ نکلوا کر ان کے ادبی سفر کی راہ متعین کر دی۔ عورتوں کے لیے سارے یو پی میں غالباً اس وقت کوئی ایسا رسالہ نہیں نکل رہا تھا جو ان کی مخصوص معاشرت کی ترجمانی کرے اور ان مخصوص اخلاقی اقدار کا حامل ہو جو اوسط درجہ کے اسلامی معاشرہ کو عزیز تھیں۔ وہ خود بھی ایسے مذہبی ماحول کے پروردہ تھے جو بڑھتی ہوئی مغربیت اور لادینی سے دامن کش اسلامیت کے حصار میں رہ کر ہی اپنے لیے عافیت سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رسالہ حریم کے اداریے جو وہ 'لمعات' کے عنوان سے لکھتے تھے عموماً پسند کیے جاتے تھے۔ اور یہی اصلاحی جذبہ ان کے ناولوں میں بھی جاری و ساری ہے اگرچہ ناول نگاری کی رنگینیاں اور رنگ آمیزیاں اپنی جگہ موجود ہیں لیکن وہ ان کے مقصدی جذبہ پر حاوی نہیں ہوتیں۔ رسالہ حریم کے اجرا کے ساتھ انھوں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ اگر اشاعتی سلسلہ قائم کیا جائے تو وہ بیشتر ناول اور افسانہ کی اشاعت پر مرکوز رہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اردو میں جو کتابیں نصابی کتابوں کے بعد زیادہ فروخت ہوتی ہیں وہ صرف ناولیں ہیں اور طبقۂ نسواں عموماً ناولوں پر زیادہ فریفتہ ہوتا ہے۔ ان کی دور اندیشی واقعی ان کے لیے بہت منفعت بخش ثابت ہوئی۔ انھوں نے تقریباً ایک ہزار کتابیں اپنے ادارہ سے شایع کیں (اور یہ خود اپنی جگہ ایک قابل قدر کارنامہ ہے ایک فرد واحد کے لیے ہے) ان میں سے بیشتر تعداد ناولوں کی ہے۔

بحیثیت ایک انسان کے نسیم صاحب کی میرے دل میں بہت زیادہ قدر و قیمت ہے۔ غالباً ان کے ادبی کارناموں سے بھی زیادہ۔ ان سے مل کر ایک انشراح صدر کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ میں جب ان کے دولت خانہ پر پہنچ جاتا تو وہ اور ان کی بیگم صاحبہ اس پُرتپاک اور خلوص اور اس قدر خوش اخلاقی سے پیش آتے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جب وہ میرے غریب خانے پر تشریف لاتے تو میری بیگم (جو ان کی منھ بولی بہن بھی تھیں) کو اور مجھے اس قدر خوشی ہوتی گویا ایک ایسا ہمدرد اور رفیق دیرینہ آ گیا جس کے ہم عرصہ سے منتظر تھے۔ میری بیوی کو دوپہر میں ناولیں پڑھنے کی عادت تھی۔ نسیم صاحب نے ان کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ دفتر سے جو ناول یا جتنے ناول پسند کریں آ کر لے جائیں۔ چنانچہ جب تک وہ صحت مند رہیں ہر دسویں پندرھویں نسیم صاحب کے دفتر سے ایک ٹوکری میں بھر کر ناولیں لے آتی تھیں۔ انھیں بہت احتیاط سے رکھتیں تاکہ میلی نہ ہونے پائیں اور پھر انھیں واپس کر کے دوسری ناولیں لے آتیں۔ یہ سلسلہ چونکہ عرصہ تک جاری رہا بلاشبہ انھوں نے سیکڑوں ناولیں پڑھ ڈالیں تھیں۔ آج جب

نسیم صاحب نہیں رہے ہیں اور ان کو مرحوم لکھنے کو جی نہیں چاہتا ان کی ایک ایک خوبیاں اس طرح یاد آرہی ہیں کہ انتخاب کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ میرا دھیان اس حقیقت کو ماننے سے گریز کر رہا ہے کہ نسیم انہونوی صاحب جیسا ہمدرد اور پرخلوص انسان اب اس دنیائے آب و گل میں نہیں رہا۔ میرا تصور ان کو اب بھی اپنے نسیم بک ڈپو کے دفتر کی بڑی میز پر جھکے ہوئے کچھ لکھتے ہوئے یا اپنے مکان کے اندرونی ڈرائنگ روم میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے اور اپنی بیگم سے کہہ رہا ہے۔ بھئی عزالہ یہ دیکھو ہاشمی صاحب آگئے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کی بنی کافی انھیں پسند ہے۔ پلاؤ نا!

رُکا ہوا طوفان : صفحہ ۲۲ کا بقیہ

چمک مجھے مزید دھندلائی ہوئی لگی۔ دماغ کو تو راہ پر لگایا جا سکتا ہے مگر حواس اتنی سہولت سے پکڑ میں نہیں آتے۔ چنانچہ میرے اعصاب جواب دینے لگے اور یہ دیکھ کر ہم تینوں کا حوصلہ بالکل ٹوٹ گیا اور بیوی نے بیٹی کو حفاظت کی غرض سے اپنے بازوؤں میں بھر لیا جو کھڑی بُری طرح کانپ رہی تھی۔ غنڈے اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ لہٰذا میں نے اور بیوی دونوں نے ملکر گڑگڑاتے ہوئے ان کی خوشامد کی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ چنانچہ میری حالت اسوقت ایسی کشتی کے مسافر کی طرح تھی جو بیچ سمندر میں طوفانی لہروں کی زد میں ہو اور اوپر سے سیاہ بادلوں سے پانی کا طوفان مسلسل اتر رہا ہو اور ایسے میں وہ مسافر چیخنے چلانے کو بھی بے سود سمجھ رہا ہو۔ لہٰذا اب میری ناکامیوں کا چہرہ سلگنے لگا' میرا دل خزاں کے موسم میں دکھ کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا اور تنہائی اس کی ڈالیوں سے چھن چھن کر بوند بوند میرے اندر گرنے لگی اور میرے دکھ میرے بدن کی درازوں سے رینگنے لگے۔ ادھر غنڈے اب بالکل میری بیٹی کے قریب آگئے تھے۔

اچانک ایک طوفان سا اٹھا' اس لمحے مجھے آگہی کے ان دیکھے جزیرے کا سراغ ملا۔ اس جزیرے نے سطح سے اپنا چہرہ اٹھایا اور مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی۔ بولتے شور مچاتے معاشرے کا سلسلہ بھیدوں بھری ایسی ذات تک جاتا ہے جو دکھائی تو نہیں دیتی مگر ہر آن اپنے ہونے کا احساس رکھتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ علی طیش کے عالم میں آگے بڑھا۔ دو غنڈوں کا گریبان پکڑ کر جھٹکے دیئے پھر ان کے منھ میں اتنے زور سے گھونسے لگائے کہ وہ دونوں اس اچانک حملے سے لڑکھڑا کر رہ گئے۔ باقی آگے بڑھے تو اس نے ان کے لاتیں جمائیں اور غضب ناک ہو کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے غنڈے حواس باختہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلے کیوں کہ غنڈوں میں ہمیشہ جرأت کا فقدان ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم اب آرام سے آگے بڑھنے لگے۔ علی اپنے اس مدہم اور دھیمے انداز میں خاموشی سے نہایت اعتماد کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس وقت زرد لمحے گلاب لمحوں میں بدل چکے تھے اور دھوپ کا موسم گزر گیا تھا کیوں کہ دراصل موسم تو خود انسان کے اندر موجود ہوتا ہے اور ان لمحوں کی بشارت سے میرے دل پر آبشار گرنے لگے۔ چنانچہ اس وقت میری قوت ایک دم ہزار گنا بڑھ گئی اور میں نے جیسے پہلی بار علی کیطرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔
اب میری آنکھوں میں یہی ایک منظر ٹھہر کر رہ گیا ہے۔ ۔ ۔

پیکرِ اخلاق و محبّت

رباب رشیدی
۶۵۔ تارین تکلی
شاہ جہاں پور

تہذیب و شرافت کی علامت تھے نسیم
اک پیکرِ اخلاق و محبّت تھے نسیم
برتا کیے تا عُمر پُرانی قدریں
اسلاف کی تابندہ روایت تھے نسیم

پیمانِ وفا باندھ کے تحریر کے ساتھ
جو کچھ بھی لکھا جذبۂ تعمیر کے ساتھ
نام ان کا ہمیشہ ہی لیا جائے گا
دُنیائے ادب میں بڑی توقیر کے ساتھ

عابد سُہیل
نصرت پبلشرز، حیدری مارکٹ
امین آباد لکھنؤ

کرم یوگی: نسیم انہونوی

کم و بیش دو لاکھ بیس ہزار گھنٹے کام کرنے کے باوجود اگر کوئی شخص ایک موٹر کار بھی نہ خرید سکے تو اس کے کیا معنی ہوئے؟ یا تو اسے کام کرنا نہیں آتا تھا، یا یہ کہ اس کام میں مالی منفعت اتنی نہیں تھی یا یہ کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے کمایا اور دونوں ہی ہاتھوں سے لٹایا۔ اس کے علاوہ بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن اسے کیا کہیئے کہ ان میں سے کوئی بھی صورت نہ تھی۔ وہ شخص اپنے کام کے ایک ایک رگ و ریشے سے واقف تھا۔ کام بھی ایسا تھا جس میں چند ہی برسوں میں ایسے ویسے کیسے کیسے بن جاتے ہیں اور اس نے جو کمایا اسے دونوں ہاتھوں سے لٹایا بھی نہیں۔ مکروہات زمانہ سے وہ کوسوں دور تھا، عیش و عشرت کو اس نے پاس پھٹکنے نہ دیا اور شاہانہ کی زندگی اس نے کبھی نہ گذاری، پھر بھی شدید خواہش کے باوجود وہ ایک موٹر کار بھی نہ خرید سکا۔

ذکر ہے نسیم انہونوی مرحوم کا جنھوں نے ٹھیک ساٹھ سال قبل ۱۹۲۹ء میں ایک نہایت قلیل رقم سے "طرز زندگی" نامی اپنے ہی ناول سے ایک اشاعتی ادارہ کی بنیاد ڈالی جس نے ساٹھ برسوں میں بچوں کی کتابوں کے علاوہ تیرہ سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں، گم نام لوگوں کو بام شہرت تک پہنچایا، آندھی آئے یا طوفان بلا مبالغہ کم از کم دس گھنٹے روزانہ کام کیا اور تجارت میں معاملت کے وہ معیار قائم کیے جن کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

نسیم بک ڈپو میں ہر کام کے لیے وقت اور تاریخ مقرر تھی۔ ملازمین کو تنخواہ کی ادائیگی مہینہ کے آخری دن ہوتی اور اگر اس دن چھٹی ہوتی تو تنخواہ ایک دن قبل ہی ادا کر دی جاتی، کاغذ کی خریداری کے بلوں کی ادائیگی مہینہ کے ابتدائی دنوں میں ایک مخصوص تاریخ کو ہوتی اور پریس کے بلوں کی رقوم بھی ایک مخصوص تاریخ کو ادا کی جاتیں، زمین شق ہو جائے، آسمان پھٹ پڑے، لیکن اس پروگرام میں فرق نہیں پڑے گا۔ اٹھاون سال سے ماہنامہ سر پنچ اور ۴۸ سال سے ماہنامہ حریم اسی ادارہ سے شائع ہو رہے ہیں۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی اشاعت میں ایک دن کی بھی تاخیر ہوئی ہو۔ نسیم انہونوی انسان تھے یا گھڑی اور گھڑی کی رفتار بھی تو سست و تیز ہو جاتی ہے، برقی گھڑیاں بھی بجلی فیل ہو جانے سے رک جاتی ہیں اور سیل سے چلنے والی گھڑیاں بھی سیل کمزور ہو جانے پر اپنی رفتار دھیمی کر دیتی ہیں۔ یا اللہ یہ تو نے نسیم انہونوی میں کون سی مشین فٹ کر دی تھی جو رک تو سکتی تھی، اور وہ بھی صرف ایک اور آخری بار، لیکن اپنی رفتار کم نہیں کر سکتی تھی۔

بلا شبہ نسیم انہونوی نے جو کچھ بھی کمایا، اور وہ کچھ ایسا کم بھی نہ تھا، نسیم بک ڈپو اور کتابوں کی اشاعت اور ان کی فروخت ہی سے کمایا لیکن اگر وہ یہ دو لاکھ بیس ہزار گھنٹے کسی اور کام میں صرف کرتے، کوئی دوسرا کاروبار کرتے اور وہ سب کچھ کرنے سے احتراز نہ کرتے جو آج کی اقدار سے عاری ہوتی

ہوئی دنیا میں سکۂ رائج الوقت بن گیا ہے تو کروڑوں میں کھیلنے اور ان الزامات سے بھی محفوظ رہتے جو ان کی طرح کے ہر ناشر کا مقدر ہیں۔ مصنف، ناشر اور کتب فروش کتابوں کے کاروبار کے تین ایسے سرے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کا شاکی رہتا ہے۔ مصنف نالاں رہتا ہے کہ ناشر اس کا خون چوستا ہے، ناشر پریشان رہتا ہے کہ جھوا بھر روپے خرچ کر کے کتاب چھاپی جاتی ہے اور رقم کی واپسی دس دس بیس بیس روپوں کی شکل میں چھ سے دس سال میں ہوتی ہے اور کتب فروش کے خیال میں اول الذکر دونوں ہی مزے میں رہتے ہیں اور وہ نقد یا چند ماہ کے قرض پر کتابیں خرید کر لائبریریوں کے حوالے کر دیتا ہے جہاں سے بلوں کی ادائگی سال دو سال میں بھی ہو جائے تو غنیمت جانیے۔ سچ پوچھئے تو ان میں سے کسی کی بھی شکایت بے بنیاد نہیں ہے۔ رائلٹی اول تو مصنف کو ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو بقدر اشک بلبل، ناشر کتابوں کی فروخت کی سست رفتاری سے پریشان رہتا ہے اور کتب فروش ناشروں کے تقاضوں سے۔ لیکن اصل سبب پر کوئی غور نہیں کرتا۔ اردو کتابوں کی تعداد اشاعت اس قدر کم اور نکاسی کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ ننگی کیا اور ڈھے کیا پکھائے؟ آخر ملیالم یا بنگالی کے ادیب، ناشر اور کتب فروش اس صورتحال سے کیوں دوچار نہیں، یا مغربی ممالک میں جہاں رائلٹی کی شرح دو ڈھائی فی صد ہونے کے باوجود ایک کتاب کی اشاعت سے مصنف مکان بنا لیتا ہے صورتحال اردو کے بالکل مختلف کیوں ہے۔؟ کتاب جب تک تیزی سے فروخت نہ ہوگی نہ مصنف کی شکایت دور ہوگی، نہ ناشر کی نہ کتب فروش کی۔

الزام تراشیوں کے شکار نسیم صاحب بھی تھے لیکن انھوں نے کسی الزام کا کبھی جواب نہیں دیا اور نہر کی پن چکی کی طرح دُھن کے پورے اور کام کے پکے بنے ساری زندگی کرم یوگی کی طرح کام کرتے رہے۔

کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ بونس کا طریقہ عام ہونے سے قبل ہی سے نسیم بک ڈپو کے ملازمین کو سال میں تیرہ مہینے کی تنخواہ ملتی تھی، ہر سال تنخواہوں میں اضافہ ہوتا تھا، عید میں کپڑے بنوائے جاتے تھے، متعدد غریب اور نادار طلبا کی فیس ادا کی جاتی تھی، بیواؤں کے لیے مستقل مالی امداد جاری تھی۔ ادارہ کے ملازمین کی لڑکیوں کی شادی کے موقع پر تنخواہ، بونس اور دوسری مراعات کے علاوہ ان کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ ایک ہاتھ کی دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو اور نسیم صاحب رات رات بھر جاگتے، کروٹیں بدلتے اور متوقع آمدنی اور واجب الادا رقوم کے پلڑوں کو کھینچ تان کر برابر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔

نسیم انہونوی صاحب کو پہلی بار غالباً ۱۹۵۸ء میں دیکھا۔ ان دنوں کرشن چندر اکثر لکھنؤ آتے تھے۔ سورج ڈھلے وہ 'کتابی دنیا' آجاتے اور بار بار گھڑی دیکھتے۔ "اب چار منٹ رہ گئے ہیں، اب دو منٹ باقی ہیں، اب نسیم صاحب آتے ہی ہوں گے" اور نسیم صاحب اسی لمحے پہنچ جاتے اور کتابی دنیا کے مالک اظہر نگرامی صاحب کے ساتھ یہ لوگ چہل قدمی کے لیے نکل پڑتے۔

گندمی رنگ، چوڑی مہری کا پاجامہ، کرتے پر شیروانی، سر پر ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی، چہرہ پر سنجیدگی جس میں خشونت نام کو نہ ہوتی بلکہ ایک ایسی مسکراہٹ ہوتی جیسے مسکراہٹ کتنا بھی کسی قدر پریشانی ہوگا۔ یہ تھا نسیم صاحب کا حلیہ۔ اس دن کے بعد سے انتقال سے چند ماہ قبل تک جب آخری ملاقات کتابوں کے قومی میلہ میں ہوئی ان کو اسی طرح پایا۔ عمر، تفکرات، اور موت کے منڈلاتے سائے ان کے جسم اور چہرہ پر اثر انداز ضرور ہوئے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی شخصیت اور چہرہ بشرہ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

نسیم صاحب ناول نگار تھے لیکن تنقیدی کتابوں اور مضامین میں ان کی ناول نگاری کا ذکر نہیں ملتا۔ ان کے فن پر مضامین بھی نہیں لکھے گئے، نہ تعریف میں نہ تنقیص میں۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ان کے ناول ایسے ہیں کہ انھیں نظر انداز کیا جا سکے بلکہ یہ ہے کہ بطور ناشر ان کی شخصیت اس طرح چھا گئی

نہ اس پہلو پر کسی نے غور ہی نہیں کیا۔ ایک دوسرا ممکن سبب یہ ہو کہ نسیم صاحب ان اقدار کے پاسدار تھے جن کو کامیابی سے ہمکناری کو قدرِ اول کا درجہ دینے والے سماج نے از کار رفتہ بنادیا ہے۔ انھوں نے جس دنیا میں آنکھ کھولی اور ناول نگاری شروع کرتے رہے اور زندگی کی آخری سانسوں تک جس دنیا میں رہے، جن قدروں کو سینے سے لگائے رہے، ان کا ہر ناول ان ہی اقدار کی بازگشت ہے۔ اس دوران ادب کے معیار بدل گئے، ناول نگاری ارتقا کے مدارج طے کرکے کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مقصد ایک بڑے حلقہ ادب میں شجرِ ممنوعہ بن گیا اور افسانوی ادب لکھنے والوں سے کم vegetarian ہونے کی فرمائشیں کی جانے لگیں۔ ایسے میں نسیم صاحب کے ناولوں کو کون اہمیت دیتا کہ "اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں"۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہو کہ نسیم صاحب کے ہر ناول کے کئی کئی ایڈیشن چھپے، انھیں بلا مبالغہ لاکھوں لوگوں نے پڑھا جبکہ ان کے حسن و قبح کے بارے میں فیصلہ کرنے والوں کے ناموں سے بھی اس تعداد کے عشر عشیر لوگ واقف نہ ہوں گے۔ نسیم صاحب کو کسی سرٹیفیکٹ، کسی سند، کسی توصیف کی ضرورت نہ تھی کہ ان کے اور قاری کے درمیان براہِ راست اور زندہ تعلق قائم تھا اور کوئی تنقید، تنقیص یا توصیف نہ اس میں کمی کر سکتی تھی نہ اضافہ۔

زندگی اس قدر تیز رفتار اور زمانہ اس قدر بے رحم ہو کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا اٹھ جانا ندی میں بس چند دائرے بناتا ہے اور پھر وقت کا پانی اپنی سابقہ رفتار سے بہنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن نسیم صاحب ان لوگوں کو جنھوں نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ نسیم صاحب کو دعائیں دیں گے وہ طالب علم جن کی وہ مالی اعانت کیا کرتے تھے، وہ بیوائیں جن کے کڑے کوسوں میں وہ رحمت کا فرشتہ بن کر آتے تھے۔ ان کے ادارہ کے وہ کارکن جن کی ہر غلطی کو، ہر کوتاہی کو وہ درگزر کر دیا کرتے تھے۔ ان کو یاد رکھیں گے وہ ادیب جن کی رائلٹی کی رقم وہ موعودہ وقت پر ادا کرتے تھے اور وہ درجنوں، جی ہاں درجنوں ادیب، جن کو نسیم صاحب نے ادبی دنیا میں متعارف کرایا۔ نسیم صاحب کو وہ لوگ بھی یاد رکھیں گے جنھوں نے ان کے ناولوں کے کرداروں کے ساتھ قہقہے لگائے، آنسو بہائے، جن میں انھوں نے خود کو تلاش کیا اور اپنی زندگی کی کوئی لہر، کوئی لَے، کوئی ادا ان میں پاکر فخر محسوس کیا اور ایسا نہ ہونے پر افسردہ ہوئے۔ ان کی وہ ہزاروں ان دیکھی، ان جانی، منہ بولی بہنیں یاد رکھیں گی جن کے ہر غم کے موقع پر نسیم صاحب دلداری کے خطوط لکھتے تھے اور جن کی مسرتوں کے موقعوں پر ان کی شگفتہ تحریر ان کی خوشیوں کو دوبالا کر دیتی تھی۔ ان کو وہ لوگ بھی یاد رکھیں گے جو اصولوں کی زندگی گزار کر آندھیوں میں چراغ جلا رہے ہیں، ان کو وہ بھی یاد رکھیں گے جو تجارت کو عبادت اور خوش معاملگی کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔

نسیم صاحب کو یاد کرے گی، یاد رکھے گی اور ان کی یاد میں زندگی بھر آنسو بہائے گی ان کی بیٹی نجم السحر جس کو سونی برسوں سے، اس کی شادی کے بعد سے، وہ ہر روز خط لکھتے تھے، بلا مبالغہ ہر روز اور ان کے ہوش و حواس کا آخری کام بھی یہی خط تھا جو انھوں نے بسترِ مرگ سے املا کرایا تھا۔ اس معمول میں ایک دن کی بھی خطا نہیں ہوئی کہ قبل اس کے کہ اگلے دن کا سورج طلوع ہو نہ ان کے ہاتھ میں جنبش تھی نہ آنکھوں میں دم۔

نسیم صاحب ایک فرد تھے لیکن ایک انجمن بھی تھے، نسیم صاحب ناشر تھے لیکن ایک ادیب بھی تھے۔ انھوں نے اپنی دنیا خود بنائی تھی اور یہ دنیا ایسی بھرپور تھی کہ کامیاب سے کامیاب زندگی گزارنے والے اس پر رشک کریں گے۔

ایسی دل کش شخصیتیں، معاملت کے ایسے جو کھرے، بات کے دھنی، کام کے پکے، باوضع اور نام و نمود سے بے نیاز افراد خدا کرے جنم لیتے رہیں کہ اے خدا تیری دنیا میں روشنی کے چراغ کم سے کم ٹمٹماتے ہی رہیں۔

★

عبدالقوی دسنوی
صدر شعبۂ اردو پوسٹ گریجویٹ
سیفیہ کالج بھوپال

نسیم انہونوی
میرے محترم میرے مکرّم

نسیم انہونوی کا نام اس وقت سے سنتا آرہا ہوں جب مجھے پڑھنے لکھنے کا شوق ابھی پیدا ہی ہوا تھا۔ اور افسانے سے زیادہ ناول کے مطالعہ کی طرف طبیعت تیزی سے مائل ہورہی تھی۔ اس شوق کو تیز کرنے میں میرے وطن دسنہ کے کتب خانہ الاصلاح نے بھی کافی کام کیا۔ جہاں عبدالحلیم شرر، ڈپٹی نذیر احمد، منشی پریم چند، نیاض علی ایم۔اسلم، اے۔ آر۔ خاتون وغیرہ کے ناول پڑھنے کے مواقع ملے وہاں نسیم حجازی اور نسیم انہونوی کے ناول دیکھنے اور ان سے دلچسپی بھی پیدا ہوئی۔ پھر یہ سارے ناول نگار کے نام پسندیدہ اور محترم محسوس ہونے لگے۔ ان میں جو اس وقت حیات تھے انھیں دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن انھیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ یہ آرزو دل میں مچلتی رہی اور زور پکڑتی رہی۔ ان میں نسیم انہونوی سے زیادہ قربت اس لیے بھی محسوس کرنے لگا کہ ان کے ہفتہ وار سرپنچ اور ماہنامہ حریم اکثر نظر سے گذر جاتے تھے۔ جن کے دیکھنے اور مطالعہ سے نسیم انہونوی صاحب کے لیے میرے دل میں عزت بڑھتی جارہی تھی۔ عزیز و اقارب اور بعض ساتھیوں میں اکثر ان کا ذکر رہتا، ان کے ناولوں پر خیالات کا اظہار ہوتا، عورتوں میں وہ زیادہ مقبول نظر آتے اس لیے کہ وہ عورتوں کے طرفدار سمجھے جاتے تھے۔ مجھے تو ان کے ناول خاص طور سے اس وجہ سے پسند آتے تھے کہ ان میں عام طور سے اپنے ہی طبقہ کا ذکر ہوتا، وہی مزاج، وہی افکار، وہی مسائل، وہی مشاغل، وہی انداز زندگی، وہی کردار ہنستے، بولتے۔ الجھتے سلجھتے، بگڑتے، لوٹتے بنتے، سنورتے ہوئے، دیکھے بھالے محسوس ہوتے۔ اس لیے ان کے مطالعہ سے بڑی اپنائیت کی فضا ملتی ماحول سے بھی بڑے اپنے پن کا احساس ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ میں بھی اس ماحول کا ایک فرد ہوں، اور انھیں کے ساتھ ان کی زندگی میں ایک کردار کی حیثیت رکھتا ہوں۔ ان کی سانس کی گرمی نرمی محسوس ہوتی ان کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کا احساس ہوتا اور ان سے متاثر ہوتا۔ کبھی ان کی خوشیوں سے گل بداماں ہوجاتا کبھی ان کی پریشانیوں سے چشم نم نظر آتا۔ غرض ابتدائی زندگی کا اچھا خاصا حصہ ایسا گزرا کہ نسیم صاحب کے کرداروں کو اپنے سے الگ نہیں پاتا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹ گیا جب تعلیم کی خاطر مجھے بمبئی جانا پڑا۔ پھر تو ناول کا مطالعہ کم ہوتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نسیم صاحب کے کرداروں سے آہستہ آہستہ دوری ہونے لگی۔ ان کے نقوش ذہن پر دھندلے پڑنے لگے۔ ان کے ناولوں کے حسین مناظر کے جلوے کم دکھائی دینے لگے ان کے الفاظ کے جادوئی اثرات زائل ہونے لگے البتہ کبھی کبھی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں نسیم صاحب کے کرداروں سے ملاقات ہوجاتی، حریم اور سرپنچ کے پردے سے خود نسیم صاحب کی بھی جھلک دیکھ لیتا۔ ان کے وہی نقوش ابھرتے جو پہلے سے اپنا رنگ دل و دماغ پر جمائے ہوئے تھے ایک اچھے انسان، رحم دل شخص سب کے لیے اچھا چاہنے والے، قوم کے ہمدرد، طبقہ نسواں کے بہی خواہ، انسانیت سے دلچسپی رکھنے والے۔ خوشحال طبقہ کے نمائندے نسیم انہونوی صاحب۔ لیکن ابتک ان سے ذاتی تعلق پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ یہ سب کچھ شناسائی ان کی تحریروں کی مرہون منت تھی اسی

کے پردے پر نسیم صاحب کی شخصیت کے جلوے جھلملاتے نظر آتے۔

لیکن جب میں بھوپال آیا اور محب محترم ڈاکٹر ابو محمد سحر کو تعلقات پیدا ہوئے اور اس کا علم ہوا کہ ان کی کتابیں نسیم بکڈپو سے شائع ہوتی ہیں تو نسیم صاحب کیلئے دل میں جگہ دوسری حیثیت سے پیدا ہونے لگی پھر سحر صاحب ہی کی وجہ سے نسیم صاحب سے خطوط کا سلسلہ شروع ہوا اور اب ان سے پبلشر کی حیثیت سے ملاقات ہوئی۔ دراصل اس زمانے میں میں نے "مضامین لسان الصدق" ان کے پاس اشاعت کے لیے بھیجی تھی، جس کی وجہ سے ان سے مختصر سی خط وکتابت رہی تھی۔ وہ میری کتاب شائع کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور جلد ہی حسب وعدہ شائع بھی کر دی تھی۔ اس دوران میں انھوں نے نہ عام پبلشر کی طرح کوئی داؤ پیچ کی بات کی، نہ کتابت طباعت اور اشاعت کی منزلوں میں کسی قسم کی تساہلی کا احساس پیدا ہونے دیا۔ نہ خطوط کے ذریعہ کاتب کا رونا رویا، نہ پریس کے عدم تعاون کی شکایت کی، نہ کسی دوسری پریشانی کا اظہار کیا۔ کتاب وقت پر شائع ہوئی۔ خط و کتابت کے ذریعہ جو کچھ بحیثیت پبلشر انھوں نے وعدے کیے تھے اس پر پورے اترے۔ نہ کسی قسم کی جھک جھک نہ کھٹ کھٹ۔ میری اس کتاب کی پہلی اشاعت نے میرے دل میں نسیم انہونوی صاحب کا احترام اور زیادہ بڑھا دیا۔ میں نے اردو کے پبلشر کی جو عام برائی اور بدمعاملگی سن رکھی تھی اس سے ان کا دور دور سے واسطہ محسوس نہیں ہوا۔ نہایت صاف معاملات کے انسان نظر آئے۔ جو کچھ کہا اسے کیا، جو کچھ کیا وہ ان کے وعدے کے عین مطابق تھا نہ مجھے انھیں کسی وعدے کی یاد دہانی کرنی پڑی، نہ انھوں نے اس کا موقع دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یہاں میری کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بندھ گیا۔ مضامین لسان الصدق کے بعد غالبیات ایک شہر پانچ مشاہیر، تلاش و تاثر، مہدی حسن افادی، اقبال انیسویں صدی میں، بچوں کا اقبال، مطالعہ خطوط غالب اور اقبال اور دارالاقبال بھوپال شائع ہوئیں۔

میری نصف درجن سے زیادہ مطبوعات کے پبلشر سے مجھے کسی اہم معاملہ میں کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف وہ رفتہ رفتہ میرے اور زیادہ قریب آتے گئے اور اپنوں کی طرح محسوس ہونے لگے۔ عزیزوں کی شفقت میں نے ان سے پائی، دوستوں کی محبت محسوس ہوتی۔ ہمدردوں کا سلوک ان کے برتاؤ میں نظر آیا۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ بلکہ تعلقات ملاقات کے ذریعے بھی نہ صرف بڑھے بلکہ مضبوط سے مضبوط تر ہوئے۔ سچ یہ ہے کہ جوں جوں میری کتابوں کی اشاعت ان کے یہاں بڑھنے لگی ان سے ملاقات کی خواہش تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ لیکن بہت دنوں تک وہ دن نہیں آیا جو ملاقات کیلئے بارگاہ خداوندی سے مقرر کیا گیا تھا۔ میرا اشارہ آج سے چند سال پہلے اس ملاقات سے ہے جب ان کی گاڑی لکھنؤ سے بمبئی جاتے ہوئے بھوپال سے گزری تھی۔ تاریخ اور وقت کی اطلاع ایک ہفتہ پہلے مل چکی تھی۔ میں اور ابراہیم یوسف صاحب ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچے ہم دونوں کی ملاقات نسیم انہونوی صاحب سے پہلی بار ہو رہی تھی وہ بھی ہم دونوں کے صورت آشنا نہ تھے۔ ان کے ذہن نے ہماری تصویریں کیسی بنائی تھیں اس کا ہمیں علم نہیں البتہ میں ذاتی طور پر نسیم انہونوی صاحب کی جو تصویر ذہن کے دریچے سے جھانک کر دیکھ رہا تھا، جب گاڑی آئی تو وہ اس سے مختلف نکلے۔ دراز قد، چھریرا بدن، کھڑی ناک، چہرہ شگفتہ، انداز و ادا ادیبانہ، حسن اخلاق کی تصویر بنے دروازے پر کھڑے نظر آئے۔ دیکھتے ہی پہچان لیے گئے پلیٹ فارم پر کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہی ہوسکی تھیں کہ گاڑی نے سیٹی بجائی تو جلدی سے ڈبے کی طرف لپکے اور ککڑیوں کے دو پیکٹ لیے ہوئے آئے اور ہم دونوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ لکھنؤ کی مشہور ککڑیاں ہیں۔ گاڑی کھل گئی ہم لوگوں نے جس قدر باتیں ممکن تھیں کرلیں۔ باقی دل میں چھپائے آئندہ کے لیے بچا لائے لیکن یہ بات سچ ہے کہ ہم لوگ اس ملاقات کے بعد ایک دوسرے کو بہت قریب سے محسوس کرنے لگے۔

اسی طرح پلیٹ فارم پر ملاقات کا ایک موقع اور ملا، شاید اس بار بھی ابراہیم یوسف صاحب ساتھ تھے۔ وہی گاڑی کا وقت، وہی پلیٹ فارم لیکن موسم مختلف، یہ جاڑے کا موسم تھا، اس لیے اس بار

نسیم صاحب ریوڑیوں کا تحفہ ساتھ لاتے تھے۔ اس بار بھی وہی انکی سادگی چہرے پر ہلکی مسکراہٹ، آنکھوں سے خوشیاں چھلکتی ہوئیں۔ مختصر ملاقات اور اس سے زیادہ مختصر گفتگو، لیکن اس کے باوجود ہم لوگ مطمئن لوٹے جیسے طویل ملاقات کا لطف اٹھایا ہو۔ وجہ شاید ان کا بھرپور خلوص تھا جس نے ملاقات کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دو ملاقاتوں نے ہم دونوں کو بہت قریب کر دیا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر اس طرح ہماری ملاقاتیں نہ ہوتیں تب بھی ہمارے تعلقات اسی طرح استوار رہتے جیسے ملاقات کے بعد رہے اس لیے کہ ہمارے تعلقات کی بنیاد بے غرض تھی۔ لیکن اس کے باوجود تفصیلی ملاقات کو جی چاہتا تھا۔ تاکہ اطمینان سے کچھ کہا سنا جائے۔ اس کا موقع بھی مل گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء میں "نذر تخلص" کی اشاعت نسیم بک ڈپو سے ہوئی۔ سوچا اس موقع پر "یادِ تخلص" منائی جائے۔ اور نسیم صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس میں شریک ہوں جس کے لیے ۲۶ر دسمبر کی تاریخ مقرر ہوئی۔ انھیں جب اپنی اس خواہش کی اطلاع دی تو وہ نہایت خوشی کے ساتھ راضی ہوگئے ہم لوگوں کے لیے یہ بات نہایت مسرت کی تھی، اس لیے کہ اس بہانے طویل ملاقات کا موقع ملنے والا تھا۔ خط و کتابت کے ذریعہ طے ہوگیا کہ ۲۵ر دسمبر کو رات کی گاڑی سے تشریف لائیں گے۔ قیام کا انتظام محترمی اسرار مسعود صاحب کے یہاں کیا گیا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق اسرار مسعود صاحب کی گاڑی پر ہی میں عشرت قادری صاحب اور محمد نعمان، اسرار مسعود صاحب کے ساتھ نسیم صاحب کو لانے اسٹیشن گئے۔ اسرار صاحب کا شمار اس شہر کے ان لوگوں میں ہوتا ہے جو نہایت خلیق، خوش مزاج اور خوش گزار تصور کئے جاتے ہیں۔ اور یہاں کی علمی، ادبی اور سماجی تقاریب سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے وجود سے اس شہر کے ماحول کو پرکشش بھی بناتے ہیں اور توانائی بھی بخشتے ہیں۔ سردی سخت تھی لیکن وہ ہم لوگوں کے ساتھ اسٹیشن آئے ٹرین کچھ دیر سے آئی لیکن اسرار صاحب کی وجہ سے ہماری گفتگو کا سلسلہ اس قدر دلچسپ ہوگیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی ہم لوگوں نے اسٹیشن پر بے کیفی محسوس نہیں کی بلکہ یوں کہئے کہ ہم گفتگو میں اس قدر کھو گئے تھے کہ گاڑی کی آمد کی خبر سے پلیٹ فارم پر جو چہل پہل محسوس ہوئی تو اچانک بات چیت کا سلسلہ ٹوٹا اور دیکھا کہ گاڑی آرہی ہے۔ ہم لوگ گاڑی کے رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

گاڑی رکی تو نسیم صاحب کی تلاش میں کوئی دقت نہیں ہوئی نہایت گرمجوشی سے ہم لوگوں سے ہاتھ ملایا، علیک سلیک ہوئی، خیر و عافیت دریافت کی گئی، پھر ہم لوگ مسکرائے پھر نسیم صاحب ہنسے۔ نسیم صاحب کی سالی ناہید جہاں صاحبہ بھی ہماری گفتگو سے محظوظ ہو رہی تھیں قلی نے سامان اٹھایا، گاڑی میں سلیقے سے رکھا گیا۔ اور گاڑی ہم چھ نفوس کو لے کر اسرار مسعود صاحب کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئی۔ راستہ میں موسم اور سفر کا تذکرہ ہوتا رہا۔ لکھنؤ اور بھوپال کے موسموں پر تبصرہ ہوتا رہا۔ اسی دوران میں گاڑی رکی تو معلوم ہوا کہ منزل آگئی۔ سامان اتارا گیا۔ ہم لوگ مہمان خانہ کی طرف بڑھے۔ جہاں کچھ دیر مزید گفتگو رہی۔ ماحول میں بڑی اپنائیت تھی۔ ہمارے اٹھنے، بیٹھنے اور بات چیت سے ہمارے اندر کی خوشی جھلک رہی تھی۔ عشرت قادری بھی ہماری اس چھوٹی سی جماعت کی پرخلوص گفتگو میں شریک تھے نعمان ہماری گفتگو کو سنجیدگی کے ساتھ سنتے رہے لیکن کچھ بول نہیں رہے تھے۔ کہ اچانک گھڑی پر نگاہ پڑی تو احساس ہوا کہ رات کافی گزر چکی ہے۔ رخصت چاہی نعمان نے "نذر تخلص" کا پیکٹ سنبھالا اور ہم رخصت ہوئے۔

دوسرے دن ۱۰ بجے صبح، سجاد ہال (سیفیہ کالج) میں یادِ تخلص کی تقریب میں نسیم صاحب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے تقریر کی۔ مختصر لیکن پرخلوص۔ فخرالدین صاحب سکریٹری سیفیہ کالج نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے تخلص صاحب کے بعض دلچسپ واقعات سنائے جلسہ ختم ہوا سب رخصت ہوئے۔ تین دن تک محفلیں جمتی رہیں، اور نسیم صاحب

ل بنتے رہے۔ بھوپال کی سیر کرتے رہے۔ اسرار مسعود صاحب ں سارے بھوپال میں لیے پھرے۔ بہت کچھ دکھایا، بہتوں سے ۔اکثر میں اور نعمان ساتھ ہوتے۔ خوب خوب باتیں ہوئیں۔ صاحب خوب خوب کھلے۔ جتنے وہ کھلتے گئے اتنے ہی عزیز بنتے ایک شام میرے گھر پر کافی دیر بیٹھے میرے بچوں نے انھیں گھیر عائشہ، عصمی اور علی متقی ان کے اور ان کی ناول نگاری سے ت سوالات کرتے رہے۔ وہ نہایت دلچسپی سے ان کی باتیں رہے۔ اور جواب دیتے رہے۔ بچے کبھی نہایت بے تکلفی کے ہ سوالات کرتے، جوابات سنتے، میں نے اپنے آپکو اس محفل سے رکھا، تاکہ وہ اپنے طور پر سوالات کریں۔

عائشہ دسنوی نے سوال کیا۔ آپ نے اپنے ناولوں میں جو وں کا ذکر کیا ہے اور ان کو اہمیت دی ہے تو کیا آپ نے عورتوں سائل کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے"۔ نسیم ب نے جواب دیا: "جی ہاں مجھے ابتدائی زندگی سے عورتوں سے ہمدردی رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ مرد ہمیشہ ان ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ جن چیزوں کا حقدار وہ مردوں کو سمجھتے عورتوں کو ان کا حقدار نہیں سمجھتے۔ مجھے معاشرے میں مرد اور توں کا یہ فرق اچھا نہیں لگا۔ اسی لیے ان کا ہمنوا بن گیا۔ اور ناولوں میں ان کو اہمیت دیتا رہا۔"

دوران میں عصمی دسنوی نے دریافت کیا کہ کیا آپکے ناول کے ار محض خیالی ہیں۔ یا آپ اس جیتی جاگتی دنیا میں کبھی ان سے ہی ہیں۔" اور نسیم صاحب کی آواز گونجی۔

خیالی ضرور ہیں لیکن ان کے ذریعہ میں وہی پیش کرتا ہوں جو دیکھتا ہوں، محسوس کرتا ہوں، مضطرب ہو جاتا ہوں، حقیقت ہے کہ اس طرح کے کردار ہمارے ارد گرد ہزاروں ہیں ان میں اپنے کام کے کردار میں انتخاب کر لیتا ہوں"۔

علی متقی سوال کرنے کے لیے بے چین نظر آرہے تھے، جیسے نسیم صاحب کا جواب مکمل ہوا، انھوں نے اپنی آواز بلند کی:

نسیم صاحب کیا آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں ناولوں کے ذریعہ کیا آپ کہنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟"

نسیم صاحب علی متقی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے" جی ہاں زندگی میں جن چیزوں نے مجھے متاثر کیا، جن حالات نے مجھے مضطرب کیا اور جن تجربات نے مجھے کچھ دیا، انھیں میں نے مختلف موقعوں سے مختلف ناولوں میں، مختلف کرداروں اور حالات کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ تقریباً سب کہہ دیا۔"

سوال و جواب کا سلسلہ دیر تک قائم رہا، میں کبھی کبھی اس محفل میں کچھ دیر کے لیے چلا جاتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ نسیم صاحب نہایت دلچسپی کے ساتھ سوالات سنتے ہیں۔ کبھی ہنس دیتے ہیں کبھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں، کبھی نہایت شفقت سے جواب دیتے ہیں ان سب کی بات چیت سے جو فضا تیار ہو رہی تھی۔ اس میں نسیم انہونوی صاحب خاندان کے ایک بزرگ کی حیثیت سے نظر آرہے تھے۔

تین دن بعد جب نسیم صاحب بھوپال سے رخصت ہوئے تو عجیب پرخلوص تاثر چھوڑ گئے۔ ایسا تاثر جس کے اثرات خوشگوار بھی ہیں اور دیرپا بھی۔ جس سے میں آج تک لذت یاب ہوتا رہا، اور سوچتا رہا ہوں کہ کاش اس تاثر کو بار بار تازہ کرنے کے مواقع ملتے رہتے۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ اس کے بعد پھر کبھی نہیں آسکے۔ یہاں کوئی محفل نہیں جما سکے اور اس سے پہلے کہ اس کا کوئی موقع ملتا ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔

اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے

★

مسرور جہاں
عراؤن عیث جگت نرائن روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی صاحب
مشرقی قدروں کے علمبردار

اچانک نسیم انہونوی صاحب کے انتقال کی خبر سن کر جی دھک سے رہ گیا اور اس خبر پر یقین کرنے کو دل آمادہ نہیں ہوا۔ ان کی صورت نظروں میں پھر گئی۔ ابھی دو ہفتے قبل نسیم بک ڈپو کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ بڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے تھے، ہرچند پہلے سے زیادہ کمزور نظر آرہے تھے لیکن ایسا گمان بھی نہیں تھا کہ صرف چند روز بعد وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ حالانکہ پچھلے چند سال سے ان کی صحت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ لیکن ان کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ اور وہ برابر دفتر تشریف لاتے رہے۔ جب کبھی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی تو بہ مشکل چند روز آرام کرتے اور جہاں ذرا سا افاقہ محسوس ہوتا دفتر آنا شروع کر دیتے۔ یوں تو کئی برس سے نہیم سلمہٗ دفتر کی ساری ذمہ داریاں بہ حسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔ لیکن انھیں دفتر آئے بغیر قرار نہیں آتا تھا۔ جس "نسیم بک ڈپو" کو انھوں نے بے حد نامساعد حالات میں قائم کیا تھا۔ اور جس ننھے سے پودے کو پروان چڑھانے کے لیے شب و روز محنت کی تھی اور جس کی آبیاری میں انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا۔ اس سے ایک دن کی جدائی بھی انھیں شاق گزرتی تھی۔ انھیں "نسیم بک ڈپو" اپنی اولاد کی مانند عزیز تھا۔ آج موت کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں اس سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔

نسیم انہونوی صاحب سے میرے تعلقات برسوں پرانے تھے۔ انھوں نے ۶۲ء میں میرا ناول "روکمہ" شائع کیا تھا (اس سے قبل میرے کئی ناول پاکستان سے شائع ہو چکے تھے) روکمہ کے بعد میرے بارہ ناول "نسیم بک ڈپو" سے شائع ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کا سبب "مکتبۂ جامعہ" ناولستان دہلی سے میرے ناول دھوپ چھاؤں کی اشاعت تھی۔ بہرحال اس سے ہمارے ذاتی تعلقات پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس کے بعد بھی اسی شفقت اور محبت سے پیش آتے رہے۔ جب میں نے اپنی کتابیں خود شائع کرنا شروع کیں تو انھوں نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور اکثر و بیشتر اس سلسلے میں میری رہنمائی کی۔ یہی نہیں۔ کتب کی فروخت میں بھی نسیم انہونوی صاحب نے مجھے پورا تعاون دیا۔ یہ ان کے کردار کا ایسا روشن پہلو تھا جس نے میرے دل میں ان کی عزت اور محبت دوچند کر دی۔ وضع داری اور مروت کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ سب کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے اور خاطر و خدمت میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ مجھے اپنے بیٹے اسلم سلمہٗ کی ملازمت کے سلسلے میں بمبئی جانا پڑا تو میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی انھوں نے اپنی صاحبزادی نجم السحر سلمہا کو فون کر کے میری آمد کی اطلاع دے دی اور خاطر مدارات کرنے کی ہدایت کی، میرا قیام تقریباً ایک ہفتہ وہاں رہا۔ اس دوران نجم السحر سلمہا نے میری خاطر و خیال اور تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انھیں دنوں وہ خود بھی ایک شادی کے سلسلے میں بمبئی گئے اور مجھے اپنے ہمراہ متعدد مقامات کی سیر بھی کرانے لے گئے۔ جب تک میرے بیٹے اسلم سلمہ کا قیام بمبئی میں رہا۔ وہ برابر نجم السحر کو فون کر کے اسلم کی خیریت دریافت کرتے تھے۔ ایسے ضعدار متواضع اور خلیق لوگ فی زمانہ نظر نہیں آتے۔ جو بھی ان سے ایک

بار مل لیتا تھا - وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا - میرا تو ان سے برسوں پرانا تعلق تھا - اور وہ میرے لیے عزیزوں سے بڑھ کر تھے - یوں تو ان کا تعلق قصبہ انہونہ سے تھا - لیکن بود و باش لکھنؤ میں اختیار کی تو مزاجاً بالکل لکھنوی ہو گئے - ان کے لباس کی نفاست آدابِ نشست و برخاست، تہذیب گفتگو کی شیرینی، وضعداری غرض ہر بات سے لکھنویت نمایاں تھی - وہ مشرقی قدروں کے امین اور پرانی تہذیب اور روایات کے علمبردار تھے - پردے کے سخت حامی تھے اور آخر وقت تک وہ اپنے اصولوں پر قائم رہے - دیکھتے دیکھتے زمانہ بدل گیا .... ترقی کے نام پر معاشرہ میں کتنی تبدیلیاں آگئیں - لیکن نسیم انہونوی مرحوم کی مشرقیت کا مطلب کبھی نہ بدلا - اور وہ حریم کے 'لمعات' کے ذریعہ ہمیشہ بہنوں اور بھانجیوں کو پردہ اور شرم و حیا اپنانے کا درس دیتے رہے - حریمی بہنوں کا ایک وسیع حلقہ ان کا مدّاح تھا اور بہنوں سے ان کے عزیزدارانہ مراسم بھی استوار ہو گئے تھے -

نسیم انہونوی مرحوم کی ادبی حیثیت بھی محتاج تعارف نہیں ہے - وہ بیک وقت ناول نگار - صحافی اور ناشر تھے - ناول نگار کی صورت میں انھوں نے اردو ادب کو بائیس ۲۲ تیئیس ۲۳ ناول دیے - جن کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی ہر ناول کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اب بھی شائع ہو رہے ہیں - بحیثیت صحافی کے انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ماہنامہ انکشاف سے کیا جس کے آپ مدیر تھے - انجمن ایک آنہ فنڈ کے تحت یہ ماہنامہ شائع ہوتا تھا - اس کے بند ہونے کے بعد انھوں نے اپنا ذاتی رسالہ حریم نکالا - جو آج تک پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے - اور حریم کی پالیسی آج بھی وہی ہے جو اس کے اجراء کے وقت تھی - حریم کے بعد شوکت تھانوی مرحوم کی ایما پر ایک مزاحیہ ہفتہ وار 'سرپنچ' نکالا جو کافی عرصہ تک نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا رہا - اب جو سرپنچ نکلتا ہے - وہ اس معیار کا تو نہیں ہے - لیکن یہی کیا کم ہے کہ شائع ہو رہا ہے - بچوں کے لیے ایک ماہنامہ کلیاں بھی عرصۂ دراز تک شائع ہوتا رہا - بحیثیت ناشر کے انھوں نے اپنے ادارے 'نسیم بک ڈپو' سے اب تک کئی سو کتابیں شائع کیں - نسیم بک ڈپو ہندوستان کے چند معیاری اداروں میں سے ایک ہے - اس ادارے نے ناولوں کے علاوہ تحقیق، تنقید، شاعری، تاریخ اور تراجم کی معیاری کتابیں شائع کر کے ادب کی گراں بہا خدمت انجام دی ہے -

نسیم انہونوی مرحوم کو 'مسلم خواتین' کے مسائل سے بے حد دلچسپی تھی - اپنی ناولوں کے ذریعہ انھوں نے خواتین کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی - جہالت اور جہیز کے لین دین کے خلاف ان کا قلم ہمیشہ سرگرم رہا - اور مسلم معاشرہ کی بیشتر خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے انھوں نے بچپن کی منگنی اور شادی کو ناپسندیدہ رسم قرار دیا — شادیوں میں فضول خرچی اور نمود و نمائش کی کھُل کر مخالفت کی اور اپنے لمعات کے ذریعہ وہ 'پردے' کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالتے رہے - نسیم انہونوی مرحوم نے 'عورت' کو عزّت اور وقار بخشا اس کے حقوق اور فرائض پہچنوائے اور عورت کے استحصال کی پُرزور مذمت کی - مشرقی قدروں اور روایات کی پاسداری ان کا نصب العین رہا - اور اپنے عمل سے انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اُن کے اصول صرف دوسروں کے لیے نہیں ہیں بلکہ وہ خود بھی ان پر کاربند ہیں - ان کے گھر کی خواتین آج بھی پردے کی پابند ہیں -

آج نسیم انہونوی مرحوم ہمارے درمیان نہیں ہیں اور ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر ہوتا نظر نہیں آتا ہے - ہماری مشرقی تہذیب کی آخری شمع بھی گُل ہو گئی ہے - لیکن ان کی یاد عرصۂ دراز تک بھُلائی نہ جا سکے گی - اور ان کی عزّت اور احترام — محبت اور عقیدت میں کبھی کمی نہیں آئے گی - کیونکہ ایسی ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتیں - شاید انھیں کے لیے شاعر نے کہا تھا :

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

★

ڈاکٹر اخلاق اثر
صادق منزل، چوکی امامباڑہ بھوپال

اور بھوپال

نسیم انہونوی (مرحوم) کے انتقال کی مختصر سی خبر پڑھی اور دل دھک سے رہ گیا۔ دو دن قبل پروفیسر عبدالرشید صاحب کے ساتھ معروف لاٹوش روڈ سے گزر کر نسیم بک ڈپو کی سیڑھیاں چڑھ کر دفتر میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ نسیم صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے دوپہر ہوتے ہوتے گھر لوٹ جاتے ہیں۔ فہیم انہونوی صاحب نے گھر کا پتہ دیا مگر ہم ان کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے رشید صاحب سے پوچھا "وہ اتنی سیڑھیاں کیسے چڑھتے اترتے ہوں گے؟" "احساسِ ذمہ داری ان کو کھینچ لاتا ہے"، رشید صاحب کا مختصر جواب تھا۔ کیا معلوم تھا کہ نسیم صاحب سے اب کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔

نسیم انہونوی بلند پایہ ادیب اور ناول نگار تھے۔ بانو، نشاط، کشور، حسن طلعت، شبانہ، تمنّا، کہکشاں، مہتاب، خاتون، شبنم، گلرو، شگفتہ، سرابِ زندگی کا، آخری تمنّا، حسینہ ان کے اعلا پایہ کے ناول تھے جن میں مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے مسائل اور ان کی نفسیات پیش کرنے میں ان کو کمال حاصل تھا، ساتھ ہی وہ بہترین صحافی بھی تھے۔ اور ۱۹۳۱ء سے قائم سرپنچ کو کامیابی سے جاری رکھے ہوئے تھے۔ صحافت نے ان کے اسلوب بیان پر خوشگوار اثرات مرتب کیے تھے۔ وہ اردو زبان و ادب کے مسائل سے بھی واقف تھے اور ان کے نزدیک اکادمیوں کے قیام سے طباعت کے مسائل میں اضافہ ہوا تھا۔ نسیم انہونوی اردو تعلیم سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ ان کی مطبوعہ کتب برسوں سے مدھیہ پردیش میں پڑھی جا رہی تھیں اور پڑھائی جا رہی ہیں۔ ان کو اہل بھوپال سے خصوصیت سے محبت تھی۔ یہاں کے محققوں، ناقدوں، ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے نوجوان ادیبوں کی کتابیں شائع ہوئیں۔ انھوں نے مستند قلم کاروں کے ساتھ بھی تعاون کیا۔

پروفیسر ابو محمد سحر کی 'اردو میں قصیدہ نگاری' 'مطالعہ امیر' 'انتخاب قصائد اردو' 'غالبیات کے مباحث' کے کئی ایڈیشن نسیم بک ڈپو نے شائع کیے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی 'غالبیات ایک شہر پانچ مشاہیر' 'تلاش تاثر' 'مہدی حسن افادی' 'بچوں کا اقبال' 'اقبال اور دارالاقبال بھوپال' 'نذر مخلص' 'مطالعہ خطوط غالب'، ڈاکٹر سید عابد حسین کی 'نثر اور انداز نثر'، ابراہیم یوسف کے 'دھرتی کے آنچل' 'اندر سبھا اور اندر سبھائیں' 'گمشدہ خط' 'طنزیہ ڈرامے'، ڈاکٹر حنیف نقوی کی 'شعرائے اردو کے تذکرے'، ڈاکٹر مظفر حنفی کی 'جدیدیت تجزیہ و تفہیم' 'ایک تھا شاعر شاد عارفی' اور عبدالودود کی 'اردو نثر میں ادب لطیف' 'اردو سے ہندی تک'، ڈاکٹر کشور سلطان کی 'جاں نثار اختر حیات و فن'، دیبا قدوائی کے ناول 'آنسو ھی ملے' 'جگمگاتے اندھیرے' 'غبار کے پیچھے' 'نفرت کی آندھی' اور 'معصوم گناہ'، ڈاکٹر خلیل احمد کا 'دکھنی کا تنقیدی مطالعہ'، یعقوب یاور

(باقی ص۴۸ پر)

رضوان احمد
ایڈیٹر عظیم آباد اکسپرس۔ پٹنہ

کچھ یادیں کچھ باتیں

میں گزشتہ تین مہینوں سے اسپتال میں ہوں۔ میری اہلیہ کو ایک حادثہ پیش آیا اور اس کے بعد سے میں خود مسلسل حادثات کا شکار ہوں۔ روزانہ کتنی ہی لاشیں دیکھتا ہوں۔ ان کے اعزا و اقربا کا بین سنتا ہوں، آہ و زاری، نالہ و شیون میرے کانوں سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ میرے نزدیک موت کا مفہوم کچھ بدل سا گیا ہے۔ ان تین مہینوں کے دوران میں نے کتنے ہی ادب دوست احباب اور بزرگوں کی موت کی خبر سنی جن سے میری ذاتی دوستی یا شناسائی تھی مگر میں نے کسی پر کچھ نہیں لکھا اور ان پر لکھنا میرے اوپر قرض ہے جو کبھی اتاروں گا۔ جیسے لکھنے کی خواہش ہی ختم ہو گئی ہے۔ ان تین مہینوں کے دوران حسین قدوائی، ڈاکٹر آصف قدوائی، نیاز حیدر کا بھی انتقال ہوا جن سے میرے نیازمندانہ تعلقات تھے، مگر میں نے ان پر کچھ بھی نہیں لکھا، کیونکہ میرا قلم ہی زنگ آلودہ ہو گیا تھا۔ مگر گزشتہ ہفتہ جب نسیم انہونوی کے انتقال کی مختصر سی خبر مقامی انگریزی روزنامہ میں دیکھی تو جیسی بے کلی سی طاری ہو گئی۔ بے اختیار بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ ان سے میرے تعلقات کم و بیش چوتھائی صدی پر محیط تھے۔ جب میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ اور میں نے لکھنا پڑھنا شروع ہی کیا تھا، ان کی حیثیت میرے ادبی استاد کی تھی۔ مگر سلوک بڑے بھائی جیسا تھا۔ وہ بزرگ بھی تھے اور بے تکلف دوست بھی۔ ان کی موت میرے لیے ذاتی سانحہ تھی۔ اگرچہ وہ بھرپور زندگی جیئے ان کی عمر ۸۲ سال سے متجاوز تھی۔ مگر انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی کام بند نہیں کیا جب سے کام کی شروعات کی کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رُکے۔ اُن کی موت نے مجھے بے حد سوگوار کر دیا، ابھی ایک عشرہ قبل ہی تو میرے پاس ان کا خط آیا تھا۔ انھوں نے اخبار میں میری اہلیہ کے حادثے کی خبر پڑھی تھی اور جو خط سب سے پہلے عیادت کے لیے میرے پاس آیا تھا وہ نسیم انہونوی کا تھا۔ اس کے بعد تو درجنوں اصحاب کے خطوط آئے مگر سب سے پہلے جانکاری کے لیے جس نے خط لکھا وہ نسیم انہونوی تھے۔ اگرچہ اس خط میں علالت کا ذکر تھا مگر میں نے سوچا نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سب سے بچھڑ جائیں گے۔ میں نے ان کو فوری طور پر خط کا جواب بھی دے دیا تھا جو پتہ نہیں ان کو ملا بھی یا نہیں۔ حسب معمول انھوں نے لکھا تھا۔ علاج و معالجہ کے بعد اہلیہ کے ساتھ لکھنؤ آجاؤ، کچھ دنوں ہم سب کے ساتھ رہو تاکہ ماحول تبدیل ہو جائے۔

ربع صدی کے دوران میری نسیم انہونوی سے ملاقات زیادہ سے زیادہ پچیس تیس بار ہوئی ہوگی۔ تین بار مجھے ان کے ساتھ قیام کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی تھی۔ اور اس دوران قیام مجھے ان سے باتیں کرنے اور بہت کچھ معاملے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا تھا۔

باتیں بہت سی ہیں اور یادوں کا ایک سیلاب ہے جسے منتقل کرنا مشکل ہے۔ بات شاید ۶۴-۱۹۶۳ء کی ہے جب میں نے بچوں کی کچھ کہانیاں لکھ کر انھیں ارسال کیں۔ یہ میری ابتدائی کوشش تھی۔ اس لیے اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے شاید میرے اندر لکھنے پڑھنے کے جراثیم محسوس کر کے ان کی اصلاح کی اور انھیں کلیاں میں شائع کر دیا۔ جس

سے میری ہمت افزائی ہوئی اور میں نے ایک مختصر سی کتاب لکھی۔ 'یونان کی شہزادی' اسے میں نے انھیں کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے ارسال کیا۔ اس میں بھی کافی خامیاں تھیں۔ اصلاح کے بعد انھوں نے اسے خوب تصاویر سے مزین کرواکر کلیاں کے سالنامہ ۱۹۶۵ء میں شایع کر دیا۔ اس کی کاپی پاکر میں پاگل سا ہو گیا۔ بیٹھتے اٹھتے میرے اوپر لکھنے کا دورہ پڑ گیا بعد میں انھوں نے اسے کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا۔ اس کی کافی کاپیاں مجھے ارسال کر دیں جو میں اپنے دوستوں کو دکھا فخر کرتا تھا اور ان کو میرے اوپر رشک ہوتا تھا۔ اس کے بعد سے برابر کلیاں اور حریم میں میرے افسانے شائع ہونے لگے ۱۹۶۷ء میں جب میں نے نرہیور نکالنا شروع کیا تھا تو میں ادبی حلقوں میں خاصا معروف ہو چکا تھا اور میرے افسانے ہندو پاک کے سربرآوردہ ادبی رسائل میں شایع ہو چکے تھے۔ میرے ہی توسط سے ۱۹۶۸ء میں مناظر عاشق ہرگانوی سے وہ متعارف ہوئے اور ان کی بہت سی کتابیں شائع کیں اور تادم آخر یہ تعلقات قائم رہے۔

۱۹۶۹ء تک صرف خط و کتابت کا سلسلہ رہا اور ان سے ملاقات نہیں ہو سکی حالانکہ میں اپنے گھر بارہ بنکی جاتے ہوئے یا واپس پٹنہ آتے ہوئے اکثر رکتا مگر ان سے ملنے کی ہمت نہ ہوتی کہ اتنے عظیم ادیب اور صحافی پتہ نہیں ایک نوآموز سے کس طرح پیش آئیں گے۔ مگر ایک بار ایسا ہوا کہ ۱۹۶۸ء میں جب میں لکھنؤ گیا اور میرے دوست سلیم عمر نے میرے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا تو اس کی رپورٹ مرحوم احمد جمال پاشا نے بڑے اہتمام سے 'قومی آواز' میں شائع کر دی۔ نسیم صاحب 'قومی آواز' بہت پابندی سے پڑھتے تھے اس رپورٹ پر ان کی نظر پڑی تو انھوں نے مجھے خط لکھا کہ آپ لکھنؤ آئے تو ملے بغیر کیوں چلے گئے اگر خود نہیں آسکے تو مجھے خبر کر دیتے میں آکر مستقر پر مل لیتا یا پھر ریلوے اسٹیشن پر رخصت کرنے آجاتا اب آئیں تو ضرور ملیں اور قیام غریب خانہ پر فرمائیں۔ اس قدر ہمت افزائی، ان کے اس خط سے جھجک کچھ دور ہو گئی۔ اگلی بار جب میں لکھنؤ گیا تو قیام ان کے ساتھ ہوا۔ نیچے کا حصہ انھوں نے میرے لیے خالی کروا دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ خانۂ بے تکلف ہے جو چاہیں طلب کر لیں، اپنا ہی گھر سمجھیں مگر اس کے بعد لکھنوی "تکلفات کا سلسلہ شروع ہوا۔ صبح چائے آ رہی ہے، پھر ناشتہ کی میز پر میرا انتظار ہو رہا ہے۔ دوپہر کا کھانا وہ دفتر میں کھایا کرتے تھے مگر اسی اہتمام سے پھر شام کی چائے دفتر میں پیتے۔ وہ رات دیر کو گھر آتے اور کھانا کھانے کے بعد پھر مسودات کی ورق گردانی کرتے رہتے۔

شام کو اکثر ٹہلنے کے لیے حضرت گنج کی طرف نکلتے تو متعدد دکانوں پر رک کر خریداری کرتے۔ میرا سبھوں سے تعارف کرواتے جاتے۔ دفتر میں دن بھر لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا۔ ان میں بہت سے کتابوں کے تاجر ہوتے۔ کچھ حریم کے خریدار، کچھ دوست احباب، کچھ ادیب اور شاعر ان کا سلوک سبھوں سے یکساں ہوا کرتا تھا۔ سب سے وہ خلوص سے ملتے، ان کا ادارہ ایک کنبے کی طرح تھا۔ وہ سب پر غصہ بھی کرتے اور سب پر شفقت بھی فرماتے، دن بھر وہ تجارتی معاملات میں الجھے رہتے۔ مگر درمیان میں ان کے جنرل منیجر اور بے تکلف دوست جمیل ردولوی (جو چار پانچ سال قبل مرحوم ہو چکے ہیں) لطیفوں کے شگوفے چھوڑتے اور محفل کو قہقہہ زار بنا دیتے۔ وہ بھی بے حد وضعدار اور رکھ رکھاؤ والے انسان تھے، ان کی موت نے بھی نسیم صاحب کو بہت بڑا دھکا لگایا تھا۔ ایک طرح سے ان کا داہنا بازو ہی ٹوٹ گیا تھا جس کا وہ بار بار اعتراف کرتے رہتے تھے۔ جمیل صاحب ہم ضلع ہونے کی وجہ سے مجھ سے خاص شفقت فرماتے تھے۔ حریم بھی ان کے لیے ایک کنبہ جیسی تھیں۔ وہ سب کو بے حد اپنائیت سے خطوط لکھتے۔ شام تک وہ کئی درجن خطوط لکھ لیا کرتے تھے پھر ان پر 'ٹائپ رائٹر' سے پتے خود ٹائپ کرتے۔ میرا تین بار ان کے ساتھ قیام رہا اور مجھے بہت سی باتیں کرنے کا موقع ملا۔ وہ ایک 'سیلف میڈ' انسان تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی یادداشتوں

کو نقل یا 'ٹیپ' نہیں کر سکا۔ اور انھوں نے باقاعدہ اپنی یادداشتوں کو لکھا نہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے والد ایک مدرس تھے اور شروع میں انھوں نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا مگر بعد میں وہ صحافت کی جانب مڑ گئے۔ اور انھوں نے ایک فلمی رسالہ نکالنا شروع کیا۔ تقسیم کے بعد اسے بے حد خسارے سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ اس زمانے میں فلمی مرکز لاہور ہوا کرتا تھا۔ اور فلموں کے اشتہارات سے ہی فلمی رسالہ چلتا تھا۔ تقسیم کی وجہ سے پچاسوں ہزار کا خسارہ ہوگیا اس سے ان کا ادارہ ڈگمگا گیا۔ پھر انھوں نے کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ آزادی کے کافی قبل سے ہی عورتوں کے لیے ان کا رسالہ حریم اور تفریحی اخبار سرپنچ شائع ہوتا تھا۔ حریم سے ان کا بے حد لگاؤ تھا۔ اگرچہ اسے قبول عام کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ایک مخصوص تحریک کا رسالہ تھا۔ وہ پردے کی تبلیغ کرتے تھے جو ہمارے معاشرے سے دھیرے دھیرے اٹھتا جا رہا تھا۔ انھوں نے خواتین قلمکاروں کا بڑا حلقہ پیدا کیا۔ عفت موہانی، مسرور جہاں، نوشابہ سعید ناز اور متعدد خواتین افسانہ نگار و ناول نگار جو ان کے قلم کی پیروی کرتی تھیں۔ ان کا ایک خاص اسٹائل تھا جو ان کے تمام ناولوں میں جاری و ساری ہے۔

چار پانچ سال قبل میں فخرالدین علی احمد کمیٹی کا رکن ہونے کی وجہ سے تقریباً ہر ماہ دو ماہ پر لکھنؤ جایا کرتا تھا تو ان سے اکثر ملنے جاتا۔ ایک بار میرے ہمراہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی بھی گئے۔ انھوں نے ہم لوگوں کو کھانے پر بلایا اور دل بھر کر باتیں کیں۔ اسی دوران مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریک پر ان کے ایک شاگرد نے نسیم انہونوی پر پی ایچ ڈی کا کام شروع کر دیا تھا جو کہ ایک سال قبل ہی مکمل ہوا ہے اور اس پر پی ایچ ڈی دی جا چکی ہے۔ ہم لوگوں کو خوب خوب وہ اپنی یادداشتیں سناتے رہے۔ 'مرزا چرکین' ان کے شاگرد شوقین اور فحش نگار خاں کے بہت سے غیر مطبوعہ اشعار انھیں یاد تھے۔ ان لوگوں سے وابستہ بہت سے کے شاہد بھی وہی تھے۔

نسیم انہونوی بہت سے ادبی معرکوں کے شاہد تھے۔ کتنے ہی ادبی معرکے تو ان کے سرپنچ کے اوراق پر برپا ہوتے تھے۔ انھوں نے ادبی سطح پر بھی لکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ پیدا کیا تھا۔ خان محبوب طرزی، مظہر الحق علوی، سلام سندیلوی کی خدمات صرف انھیں کے ادارے کو حاصل تھیں اور ان کی تمام مطبوعات کی اشاعت انھوں نے ہی کی تھی۔

پٹنہ میں میرے غریب خانے پر بھی دو تین بار تشریف لائے۔ پہلی بار شاید ۱۹۷۴ء میں آئے تھے۔ کسی قریبی بہن کی بیٹی کی شادی تھی۔ مجھے کچھ علم نہیں، دیکھا کہ کسی کی معیت میں چلے آ رہے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھے چائے پی پھر رخصت لی، جب بھی آتے بغیر خبر کیے ہوئے بے حد رواداری سے ملنے آجاتے۔ جتنے دوست احباب یا خریدار تھے سب سے ملتے۔

میری آخری ملاقات تقریباً دو سال قبل ہوئی تھی۔ اہلیہ کا اصرار تھا کہ ہم لوگ گھومنے لکھنؤ چلیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ نسیم صاحب کے یہاں قیام بہتر رہے گا۔ تو اہلیہ نے کہہ دیا کہ وہ ان کے یہاں قیام نہیں کریں گی۔ کیونکہ وہ پردے کے مبلغ ہیں اور یہ پردہ نہیں کرتیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں نے الگ قیام کر لیا۔ مگر نسیم صاحب بیمار ہیں ان کا آپریشن ہوا ہے ان کی عیادت کو چلیں گے۔ ہم لوگ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ان سے ملنے گئے تو گھر پر نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ اس علالت میں بھی دفتر جانا جاری ہے۔ گھر پر صرف برادرم فہیم کی اہلیہ تھیں انھوں نے فون کر کے دفتر خبر کی تو وہ تشریف لے آئے۔ یہیں ٹھہرنے کے بارے میں انھیں خط لکھ چکا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ یہاں کیوں نہیں آتے تو میں نے بتایا کہ میری اہلیہ حریم کی بچپن سے قاری ہیں مگر ان پر آپ کی تحریر کا کچھ اثر نہیں، یہ پردہ نہیں کرتیں اسی خیال سے یہاں قیام نہیں کیا۔ وہ ہنسنے لگے، کہنے لگے کہ میں تو اپنی تحریک پر قائم ہوں۔ اگرچہ اس کا میرے گھر پر بھی کوئی اثر نہیں۔ میری پوتیاں پردہ نہیں کرتیں۔ میری اہلیہ کی بہن تو ساتھ ہی رہتی ہیں۔ وہ بھی پردہ نہیں کرتیں۔ انھوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ ہاری ہوئی بازی لڑ رہا ہوں مگر محاذ سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ اب آخری عمر میں راستہ کیا تبدیل کریں گے۔ وہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ میں

جانتا ہوں کہ میرے بعد حریدہ جاری نہیں رہ سکے گا۔ اگر دوسری شکل میں جاری رہے تو اس سے مجھے کیا حاصل۔ حریدہ سے انھیں کوئی منفعت نہیں تھی، نقصان تھا۔ اس کا نقصان وہ نسیم بک ڈپو سے پورا کیا کرتے تھے۔ ایک ہزار سے زائد کتابوں کے پبلشر تھے اور ہندوستان میں کسی اردو ادارے نے اتنی کتابیں شائع نہیں کیں۔

مجھے ان کی گرتی ہوئی صحت کا احوال ملتا رہتا تھا۔ اکثر خطوط کا بھی تبادلہ ہوتا۔ ہر سردی ان کے لیے تنفس کی تکلیف لیکر آیا کرتی۔ وہ وقفہ وقفہ سے آکسیجن لیا کرتے۔

اپنے آخری خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ ان کی طبیعت بالکل اچھی نہیں رہتی مگر میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ ہفتہ عشرہ میں ہی ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے۔

مجھے اچانک ہی مقامی اخبار سے یہ خبر ملی اور میں بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اہلیہ کو یہ خبر سنائی تو ان پر بھی بہت دیر تک سکتہ طاری رہا پھر جب خاموشی ٹوٹی تو ہم لوگ بہت دیر تک ان کا ذکر کرتے رہے۔ ان کی باتیں یاد آتی رہیں اور پتہ نہیں کب تک یاد آتی رہیں گی۔

ابن تیمیہ ایک زبردست عالم تھا اس کا مطالعہ بیحد عمیق تھا اور اس کو مطالعہ کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اس کی عملی زندگی میں صرف دو راتیں ہی ایسی آئی تھیں جب اس نے مطالعہ نہیں کیا۔ ایک اس کی شادی کی رات اور دوسری موت کی رات — غالباً نسیم انہونوی بھی انھیں میں سے ایک تھے ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

نسیم انہونوی اور بھوپال — صفحہ ۴۴ کا بقیہ

کے جاسوسی ناول "کمندِ ہوا"، طاقِ نسیاں، شب گزیدہ، رقصِ اجل، سدھارتھ، رشید انجم کی ٹھنڈی موت، مختار شمیم کی تنقیدی کتاب ریاست ٹونک اور اردو شاعری کے علاوہ مختلف ادیبوں کی اور بہت سی کتابیں نسیم بک ڈپو نے شائع کیں، نہ صرف یہ کہ کتابیں شائع کیں بلکہ کتابوں پر تبصرے بھی کیے اور ان کو ادب میں نمایاں مقام دلوایا۔ نسیم انہونوی کے بھوپال اور مدھیہ پردیش کے ادیبوں سے گہرے مراسم تھے، وہ انکی خوشیوں میں شریک ہوتے اور غم کو بانٹ لیتے۔"

اور ہم نے ان کو کیا دیا؟ نہ وہ ہمارے سیمیناروں میں مدعو کیے گئے اور نہ ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ ان لوگوں کی خدمات کو سراہا گیا، ان لوگوں کی خدمات کو انعامات سے نوازا جنھوں نے اردو زبان و ادب کی کوئی خدمت نہیں کی۔

سچ پوچھیے تو نسیم بک ڈپو کو نسیم انہونوی صاحب نے اکاڈمی کا درجہ دیا تھا۔ بھوپال کے قلمکاروں کو دوسرے صوبوں سے جو انعامات و اعزازات ملے، بھوپال اور صوبے کے ادب کو جو مقام ملا اس میں نسیم انہونوی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ان کی خدمات ہم چاہیں بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ نہایت شریف انسان اور اردو کے بے لوث خادم تھے۔ انھوں نے فہیم انہونوی کے ہاتھوں میں کاروبار اور ذمہ داریاں دے کر اپنی نئی نسل کو اردو کی خدمت میں لگا دیا۔ میرے نزدیک یہ بھی ایک کارنامہ ہے جس کی قدر کرنا چاہیے۔

جب کبھی لکھنؤ میں ملاقات ہوتی سارا کام روک دیتے، ایک ایک مصنف، اور ایک ایک ادیب کا نام لے کر خیریت دریافت کرتے، ایک ایک مسئلہ میں دلچسپی لیتے، ایسا لگتا تھا کہ وہ اتنے دور ہو کر بھی بہت پاس تھے۔ جب کبھی اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے سفر کرتے بھوپال کے احباب کو مطلع کرتے، ملاقات میں آنکھیں بچھا دیتے تحفے تحائف لاتے اور پابندی سے رائلٹی ادا کرتے اور وہ بھی بہت مہذب انداز سے۔

بہت بعد میں راقم الحروف، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، جناب ابراہیم یوسف کی کتب مکتبۂ جامعہ سے شائع ہوئیں ورنہ عرصۂ دراز تک نسیم بکڈپو اور صرف نسیم بک ڈپو ہی ہماری امیدوں کا مرکز تھا۔ نسیم بک ڈپو کے روحِ رواں نسیم انہونوی مرحوم نے زندگی بھر انسانیت، اردو اور اردو ادب کی خدمت کی اور وہ بھی اس دور میں جب بڑے بڑے اس میدان سے منھ موڑ گئے ؎

'ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے'

★

نیا دور

جلد ۴۴ | نمبر ۴-۵

جولائی، اگست ۱۹۸۹ء

(ایکٹنگ) ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون: —— ۴۳۰۵۹
۴۷۱۰۸

پبلشر: اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
زرِ سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو.پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو.پی. لکھنؤ

عنوانات

گوشۂ جمیل مہدی

اپنی بات

ہر سال پندرہ اگست کو ہم اپنا یوم آزادی مناتے ہیں اور ان قربانیوں کو یاد کرتے ہیں جو ہمارے رہنماؤں نے اس ملک کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے دی تھیں۔ اس طویل جدوجہد کو یاد کرتے ہیں جو اس ملک کے سبھی طبقوں اور فرقوں نے مل کر کی تھی۔ اس ملک کے عوام حصول آزادی کی راہ میں جہد مسلسل اور بے مثل قربانیوں کی ایک شاندار تاریخ کے امین ہیں۔ یہ تاریخ بہادر شاہ ظفر سے بابائے قوم مہاتما گاندھی، لوک مانیہ تلک، مدن موہن مالوی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد تک پھیلی ہوئی ہے۔ رہبران ملک وقوم اور مجاہدین آزادی کے بے شمار نام ہیں، جو لائق احترام بھی ہیں اور ان کا طرز عمل قابل تقلید بھی۔

یوم آزادی کے موقع پر ہم اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کا جائزہ بھی لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس عرصے میں ہمارے ملک نے کتنی ترقی کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ ۴۴ برسوں میں ہمارا ملک ہمہ جہت ترقی کی راہ پر بہت آگے جا چکا ہے۔ سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہمارے ملک میں بنتے ہیں۔ خلائی سائنس کے میدان میں بھی ہم نے پیش رفت کی ہے۔ علاج وصحت کے میدان میں ہم نے جو ترقی کی ہے، وہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب طاعون کے مرض میں گاؤں کے گاؤں صاف ہو جاتے تھے۔ اب اس بیماری کا نام بھی سننے کو نہیں ملتا۔ اسی طرح چیچک اور تپ دق جیسے امراض میں بھی لوگ فوت ہو جاتے تھے، مگر ان بیماریوں پر بھی ہم نے قابو پا لیا ہے۔ تعلیم اور خواندگی کے تناسب میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس داں اہم کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اشیائے ضروری کی قیمتیں وہ نہیں ہیں جو پہلے تھیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری قوت خرید میں بھی قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ تنخواہیں بھی بڑھی ہیں۔ جن گھروں میں پہلے سائیکلیں ہوا کرتی تھیں، وہاں اب اسکوٹر نظر آتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تعمیر و ترقی سے خوش حالی کی منزل تک ہم نے جو سفر شروع کیا تھا، اس میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے اور اس راہ پر ہم وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں سے خوش حالی کی منزل صاف نظر آ رہی ہے۔

■ —— گزشتہ سال جون میں اترپردیش کے موجودہ وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے اپنے عہدے کی ذمہ داری سنبھالی تھی، تب سے اب تک یعنی گزشتہ ایک سال کے دوران اترپردیش میں کارکردگی کا ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی غرض سے شری تیواری نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے حوصلہ مندانہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ مختلف زمروں میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ اس بات کی مظہر ہیں کہ اترپردیش اب زیادہ دنوں تک اقتصادی طور سے پس ماندہ نہیں رہے گا۔

شری نرائن دت تیواری نے وزیر اعلا کے عہدے پر فائز ہوتے ہی ایسی پالیسی اور ایسی حکمت عملی اختیار کی، جس کے فی الفور نتائج حاصل ہو سکیں۔ اقتصادی ترقی کے مختلف پروگراموں پر عمل درآمد کو یقینی بنانے، غریبی دور کرنے، دیہات کے عوام کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور عوام کا معیار زندگی بہتر بنانے کی غرض سے دیہی علاقوں میں کمزور طبقوں کے لیے مکانات کی تعمیر کو اولین ترجیح دی گئی۔ وزیر اعلا نے اس سلسلے میں عوامی نمائندوں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سمیت عوام کے سبھی طبقوں کا تعاون چاہا۔ اس طرح ریاست کو سبھی کے تعاون سے تیز رفتاری کے ساتھ ترقی اور خوش حالی کے راستے پر لے جانے کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

گاؤں سبھاؤں کو مضبوط کرنے کی غرض سے متعدد فیصلے کیے گئے۔ دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے وزیر اعلا نے ۲۸/۳۰ کروڑ روپے تک کی سالانہ مال گزاری گاؤں سبھاؤں کو دینے کا فیصلہ بھی کیا۔ اس فیصلے کو سراہتے ہوئے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے کہا کہ پنچایتی راج اداروں کو وسائل فراہم کرانے کے سلسلے میں اترپردیش نے ملک کی قیادت کی ہے۔ (باقی ص ۲۸ پر)

ایڈیٹر

سید احمد سحر
خلیل غربی ۔ شاہجہاں پور

یومِ آزادی

ہے آج جشنِ نو بہار یعنی پندرہ اگست
جو ہے وہ شادماں ہے آج وہ بلند ہو کہ پست
مُبارک اہلِ بزم کو یہ سرخوشی یہ زندگی
یہ زمزمے، یہ قہقہے، یہ قمقمے، یہ روشنی
نظر نظر میں مستیاں ہیں تن بدن میں گدگدی
نفس نفس میں تازگی قدم قدم پہ بیخودی
نئے ہیں سرو نسترن نئی روش نیا چلن
نئی نئی بہار ہے نیا نیا ہے بانکپن
جدھر نظر اُٹھایئے شباب ہی شباب ہے
ہر ایک جلوہ خود ہی اپنے حُسن کا جواب ہے
ہزار بار آئے دن یہ لوٹ کر خدا کرے
ہر ایک دل یونہی وطن میں شادماں رہا کرے
مگر یہ دن جب آئے گا کسی کی یاد لائے گا
گزشتہ غم کی رات کا پھر آئینہ دکھائے گا
کھُلے گی پھر کتابِ دل چھڑے گی داستانِ غم
نظر میں گھوم جائے گا پھر اک صدی کا زیر و بم
وہ غیر کے طویل ظلم و جور سے بھری صدی
جب ایک آہ بن کے رہ گئی تھی اپنی زندگی
جب اپنے خوں سے اپنے گھر میں کھیلتے تھے ہولیاں
ہماری دولتوں سے غیر کی بھری تھیں جھولیاں

ہوا جب اختتام پر یہ خاک و خوں کا امتحاں
ہمارے خوں سے لالہ رنگ ہو اٹھا جب آسماں
تو لے کے پرچمِ وفا بڑھے ہمارے نوجواں
بڑھے قدم، چلے قلم، اٹھی نظر، کھُلی زباں
ہمارے اتحاد پر زمانہ دنگ رہ گیا!
وہ آگ سرد ہو گئی پر اس کا رنگ رہ گیا
ہمارے سُورماؤں کا جہاں جہاں لہو گرا
چمن چمن کھِلی ہوئی ہے ایکتا کی داستاں
ملائے ہاں بڑھے چلو قدم سے اب یونہی قدم
بڑھے چلو کہ ساتھیو! بہت ہے کام وقت کم
ہماری راہ دیکھتی ہیں اب ملوں کی چمنیاں
پُکارتی ہیں چکیاں، بلا رہی ہیں کھیتیاں
ہمارے ہاتھ چومتی ہیں دفتروں کی فائلیں
نہیں سمے کہ ہم نکالیں بستروں کی سلوٹیں
نکل رہی ہے ایک اک مشین سے یہی صدا
میں ہوں تمہاری موہنی گلے لگا لو ساجنا
قدم قدم پہ کارخانے آسرا لگائے ہیں
یہ سب ہمارے راستے میں فرشِ گل بچھائے ہیں
چلو یہی تو وقت ہے کہ اب مزے اڑائیں ہم
سُورگ اپنے بازوؤں سے دیش کو بنائیں ہم

ڈاکٹر مجیب اشرف
شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی

ایک گمنام مجاہدِ آزادی : نذیر محمد خاں رامپوری

۱۸ ویں صدی کے آخر میں روہیلہ پٹھانوں کی ریاست رامپور کا وجود برطانوی حکومت کے دورِ عروج میں تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ دیگر ہندوستانی ریاستوں کی طرح رامپور ریاست کو بھی انگریزوں سے دوستی اور مصالحت کی پالیسی اپنانی پڑی تھی۔ یہ انگریز دوستی جو ایک طرح کی ماتحتی تھی فیض اللہ خاں کے دور سے شروع ہوئی، ۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خاں نے اس دوستی کا حق ادا کیا۔ رامپور کے حکمران اس پالیسی پر ۱۹۴۷ء تک کاربند رہے۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام اور قومی تحریک کے ارتقا کے ساتھ رامپور کے باسیوں کو ایک زبردست آزمائشی مرحلے سے گزرنا پڑا۔ ہندوستانی ریاستوں میں قومی تحریک کا فروغ آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ والیانِ ریاست انگریزوں کے ہمنوا تھے اور عوام ریاستی حکمرانوں کے وفادار اور پابند۔ خصوصاً رامپور میں رضا علی خاں نے عوام کے بہبود کے لئے اتنی اصلاحات کیں کہ انھیں کوئی خاص شکایت کا موقع نہیں تھا۔ عمارتیں تعمیر کرانے کے علاوہ اقتصادی ترقی کے لئے شکر اور ٹیکسٹائل کی متعدد فیکٹریاں قائم کیں۔ تعلیمی ترقی کے لئے اسکول، کالج اور لائبریریاں قائم کیں۔ پھر بھی قومی تحریک کے طوفان نے رامپور کے سیاسی تعطل میں لہریں پیدا کر دیں۔ خصوصاً دانش مند طبقہ جس نے عموماً علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ نئے خیالات سے بیحد متاثر تھا۔ وہ یہ جان گیا تھا کہ اصل آزادی کیا ہوتی ہے اس لئے یہاں کے لوگوں نے بھی قومی تحریک میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لینا شروع کر دیا۔

علی برادران، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے خلافت تحریک اور ترک موالات کی تحریک کو زندہ جاوید کر دیا رامپور کی سرزمین کے ہی وہ درخشندہ ستارے تھے جو اس وقت آسمانِ سیاست پر سب سے زیادہ چمک رہے تھے۔ ان ہستیوں کے سیاسی کارناموں سے کون واقف نہیں تھا لیکن ان ہستیوں کے توسط سے رامپور میں قومی تحریک کے لئے کیا ماحول پیدا ہوا؟ اور ان کے بعد قومی تحریک کن کن ہستیوں کی مرہونِ منت ہوئی؟ یہ سوالات ابھی تشنۂ جواب ہیں۔ اگر ہم نے ان ہستیوں کی قربانیوں کا جائزہ نہ لیا تو نہ صرف یہ کہ تاریخ کا یہ باب نامکمل رہے گا بلکہ ان مجاہدوں کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی۔

نذیر محمد خاں عرف پتّن خاں رامپوری ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کے ہر فرد نے قومی تحریک میں علی برادران کے شانہ بشانہ کام کیا اور اُن کے بعد اُن کی سیکولر روایتوں کو زندہ رکھا۔

نذیر محمد خاں وزیر محمد خاں ٹھیکیدار کے چھوٹے صاحبزادے ۵ جولائی ۱۹۰۶ء کو شہر چھندواڑہ (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے یہ خاندان پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ دراصل وزیر محمد خاں کو اپنے عزیزوں کی جائداد چھندواڑہ میں وراثت میں ملی تھی جس کے انتظام کے لئے انھیں اپنے وطن رامپور کو چھوڑ کر چھندواڑے میں رہائش اختیار کرنی پڑی۔ خلافت

تحریک کے دوران اشتعال انگیز تقریریں کرنے کے الزام میں علی برادران کو ۱۹۲۱ء میں گرفتار کرکے چھندواڑہ میں ڈھائی برس کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ انھیں شہر کے اندر گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ وطن کی نسبت سے علی برادران وزیر محمد خان کے مکان پر اکثر نشستیں کرتے تھے جہاں دیگر موضوعات پر گفتگو کرنے کے علاوہ اُس وقت کی سیاست پر بھی مباحثے ہوتے تھے۔ اسی وقت سے وزیر محمد خاں اور اُن کے خاندان کے تمام فرد علی برادران کے ہم خیال ہوگئے اور ریاست کے میدان میں کود پڑے۔

جس سال علی برادران چھندواڑہ گئے اتفاق سے نذیر محمد خاں اسی سال اپنے خالہ زاد بھائی عظیم الدّین خاں اور ماموں شفیع احمد خاں کے ساتھ رامپور واپس آگئے تھے۔ اور یہاں آکر حامد ہائی سکول میں تعلیم شروع کی۔ دسویں کلاس تک تعلیم جاری رکھی۔ وزیر محمد خاں کے بڑے بیٹے بشیر محمد خاں بلا کے ذہین تھے۔ وہ مدھیہ پردیش میں ہائی اسکول میں اوّل آئے۔ والد تو انھیں ٹھیکیداری شروع کرانا چاہتے تھے مگر مولانا محمد علی نے جو خاندان کے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل کرا دیا۔ ۱۹۱۶ء میں قید سے آزاد ہونے کے بعد علی برادران جب سیاست میں سرگرم ہوئے تو بشیر محمد خاں نے تعلیم کو بالائے طاق رکھ کر اُن کی سیاست میں مدد کرنے کو ترجیح دی۔ اسی وقت سے ۱۹۲۲ء تک وہ مولانا محمد علی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۱۹۲۲ء میں جب علی برادران گرفتار کرکے کراچی جیل بھیجے گئے تو مولانا محمد علی نے حکیم اجمل خاں کو ایک خط لکھ کر انھیں طبیہ کالج کے انتظام پر مامور کرا دیا۔ دو سال کے بعد وہاں سے مولانا شوکت علی انھیں بمبئی لے گئے۔ جہاں انھیں چھوٹانی مل کا انتظام سپرد کیا گیا جس کو انھوں نے بخوبی انجام دیا۔ آخر میں اُن کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔

نذیر محمد خان کے دوسرے خالہ زاد بھائی عبدالوحید خاں عرف فن خاں پاپا نے علی برادران کے ساتھ خلافت تحریک اور اور ترکِ موالات میں حصّہ لیا۔ چھندواڑہ میں قید و بند کے زمانے میں یہ خفیہ طور پر قومی رہنماؤں کے خطوط علی برادران تک پہنچاتے تھے۔ ترکِ موالات کی تحریک چونکہ مہاتما گاندھی کی سرپرستی میں چلائی گئی تھی اس لئے اصولی طور پر کھدر کے کپڑے پہننا ہر کانگریسی کے لئے ضروری تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی کہ رامپور میں علی برادران کے علاوہ نذیر محمد خاں کا واحد خاندان تھا جو کھدّر کے کپڑے پہنتا تھا۔ غالباً کانگریس کے اس قدر معتقد اور سرگرم کارکن ہونے کی وجہ سے ہی اس خاندان کے سب سے زیادہ سرگرم کانگریسی رکن عبدالوحید خاں کو لوگ رامپوری گاندھی کہنے لگے تھے۔

جب نذیر محمد خان نے شعور کی منزلوں میں قدم رکھا یعنی ۱۹۳۰ء کے قریب تو سب سے پہلے انھیں والدین کے انتقال کے بعد اپنے خاندان کی کفالت کی فکر ہوئی۔ والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے ٹھیکیداری شروع کی۔ ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں اُن کی شادی ایک خوشحال خاندان میں ہوگئی۔ اُن کی اہلیہ گوہر بیگم اجیت پور اور مرادآباد کی کثیر جائداد کی مالک تھیں اس دوران یہ ٹھیکیداری کرتے رہے اور اقتصادی اعتبار سے مطمئن ہو جانے کے سبب انھیں مقامی سیاست میں زیادہ سے زیادہ وقت دینے اور گرمجوشی سے حصّہ لینے کا موقع میسر ہوگیا۔

قومی تحریک میں شامل ہونے میں نذیر محمد خاں کو سخت آزمائش اور ذہنی کشمکش کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ایک طرف خاندانی روایات تھیں اور دوسری طرف کانگریس مخالفین کا جوشِ جنون مولانا محمد علی کا ۱۹۳۰ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ نوابِ رامپور قومی تحریک کے سخت مخالف تھے۔ رامپور ریاست میں دو مقامی جماعتیں کام کر رہی تھیں، ایک مسلم کانفرنس اور دوسری نیشنل کانفرنس، اوّل الذکر جماعت مسلم لیگ کی ہمنوا تھی اور دوسری جماعت کانگریس کی حامی تھی، اس زمانے میں مسلم کانفرنس کا بہت زور تھا۔ نذیر محمد خاں کی جرأت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان سنگین حالات میں انھوں نے نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کا

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

غزلیں

عمر انصاری

۲۰۔ امین آباد لکھنؤ

زمانہ آتا، لُٹے شہرِ دل کو گزرا تھا
کسی کو یاد نہ تھا، کس مقام پر کیا تھا

بٹھا کے ریل پہ اپنے جوان بیٹے کو
ادھیڑ باپ گھر آیا، تو کتنا بوڑھا تھا

وہ خودکشی تھی، کہ تھا قتل کیا کہا جائے
کہ نام کس کا ہوا، اور کام کس کا تھا

ترنگ میں جو لنڈھا دی، تھی زندگی کی شراب
کچل گیا جو مرے پاؤں سے، زمانا تھا

چُبھا، تو لکھتا گیا یہ بھی صفحۂ دل پر
وہ کس کا تیر تھا کس کی کماں سے نکلا تھا

وہی تھے ہم، وہی اک بھیڑ ناشناسوں کی
سماں اِدھر کا بھی دریا کے پار جیسا تھا

نہ گھر سے نکلا، نہ ہولی کے رنگ میں ڈوبا
بھرے نگر میں بھی وہ، کس قدر اکیلا تھا

بس ایک نقشِ محبّت کہ تھا جواں اَب بھی
نہ وہ شباب تھا اس کا، نہ وہ سراپا تھا

گزر رہی تھی شبِ غم اسی کے ساتھ عمرؔ
وہ اک چراغ کہ بجھتا تھا، اور نہ جلتا تھا

فضا ابن فیضی

جمال پورہ۔ مئوناتھ بھنجن

ابر میرے ہیں نہ بارش میری
شعلہ شعلہ رہی خواہش میری

سبز موسم کو ہے درسِ عبرت
زرد پتوں پہ نگارش میری

آئینہ زانوِ صحرا کا ہوں
کر نہ شہروں میں نمائش میری

میرا سایہ جو خفا ہے مجھ سے
دُھوپ کرتی ہے سفارش میری

وقت سے تم نہ یہ کہنا کہ ٹھہر!
اس کے پیروں میں ہے گردش میری

اپنے منصب سے جو معزول ہوا
تھا وہی لفظ گزارش میری

دوستو! کس کا گریباں پکڑوں
چاک دامن ہوئی دانش میری

خالقِ لوح نہیں ہوں، پھر بھی
حرف کرتے ہیں پرستش میری

اپنے نقّادوں سے خوش ہوں کہ فضاؔ
ان کے خنجر میں ہے پُرسش میری

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین
صدر شعبۂ اُردو (میرٹھ کالج)
میرٹھ یونیورسٹی۔ میرٹھ

قومی ایکتا میں زبانوں کا کردار

سخن کو سکوت، گویائی کو گونگے پن اور گفتگو کو خموشی پر ایک گونہ برتری حاصل ہے اس لیے کہ زبان اظہار خیال کا موثر ترین وسیلہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اشارے کتنے ہی واضح اور خوب صورت ہوں مبہم اور مگلم ہوتے ہیں جب کہ الفاظ ہنڈی کی جنڈی کرتے ایک ایک گرہ اور ہر گتھی کو کھو لتے ہیں وہ اندرونی تھلکوں اور تموجوں نیز بیرونی تدبیروں اور تحریکوں کو اپنے حسین پیکروں سے آراستہ کرکے یوں پیش کرتے ہیں کہ ہر تصویر منہ سے بولنے لگتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ الجھنیں بھی پیدا کرتا ہے۔ مگر وہ الجھن لفظ کی نہیں اس کے برتنے والے کی ہوتی ہے۔ ژولیدہ بیانی فکری ژولیدگی کا سبب ہوتی ہے۔ زبان جس لفظ یا لفظیات (Vocabulary) سے بنتی ہے اس کے خمیر میں دوری یا دوئی نہیں قربت، ہم آہنگی، میل ملاپ اور یک جہتی ہے یعنی مختلف الفاظ مل کر ایک تاثر دیتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں، لفظوں کی بنیاد جن اصوات پر قائم ہے وہ سب بامعنی آوازیں ایک دوسرے سے مل کر آپس کے اختلاط سے جیتے جاگتے مچلتے پھڑکتے بامعنی الفاظ کو جنم دیتی ہیں وہ ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ بغیر ملے جلے جذبوں کی تجسیم ممکن نہیں ہوتی۔ محسوسات، مشاہدات اور تجربوں کی تشبیہیں اور شکلیں وجود میں نہیں آسکتیں اسی لیے وہ بآواز بلند اعلان کرتی ہیں کہ میل ملاپ ناگزیر ہے۔

یہ اصوات جن اعضائے صوت (ORGANS of SPEECH) سے برآمد کیے جاتے ہیں یعنی حلق، گلا، سینہ اور پھیپھڑے صوتی لب، تالو، زبان، ہونٹ، منہ، ناک کی نلیاں ان کی رہ گزاریں، ہوا کی رہ نوردیاں یہ سب انسانوں میں الگ الگ ہوتے ہوئے اپنی اپنی انفرادی چھاپ اور چھوٹ کے باوصف سب انسانوں میں مشترک ہوتی ہیں سب انھیں سے آوازیں پیدا کرتے ہیں مگر لب ولہجے بدل جاتے ہیں۔ اپنی پسند کے معیار کے سبب جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی اور سماجی تبدیلیوں کے باعث یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ طبیعتوں کا یہ اختلاف ایکتا اور یک جہتی کے لیے ضروری ہے۔ اپنے مفادات کی پاسداری، اپنی بٹی ہوئی وابستگیاں فضا کو بگاڑ بھی دیتی ہیں۔ زبانیں یہ منفی رول بھی ادا کرتی اور کر سکتی ہیں۔ اسی لیے بعض لوگ زبانوں کو جھگڑے کی جڑ بھی سمجھتے ہیں۔ انھیں سے بیگانگی کی دیواریں اٹھتی اور تقسیم کے دیوزاد انھیں سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر زبان کا یہ مسخ شدہ رول اس کا اصل روپ اور صحیح کردار نہیں ہے۔ زبان تو ننگی تلوار کی مانند ہے وہ سروں کو قلم بھی کرا سکتی ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتی ہے اس کا حقیقی کردار صلح وصفائی، امن وآشتی، ایکتا اور یک جہتی ہے۔

ماضی بعید میں سنسکرت نے پورے آریہ ورت کو جس طرح ایک لڑی میں پروئے رکھا ہماری تاریخ اس کی گواہ ہے۔ وہ چاہے ویدک کال کی سنسکرت ہو کہ کلاسیکی سنسکرت ہو یا رامائن اور مہابھارت کی عظیم رزمیہ نظموں کی ترتیب کا عہد ہو۔ یہ ایک ڈور تھی جس نے راجا اور پرجا پنڈت پروہت اور جہان سب کو باندھ لیا تھا۔ آج سے لگ بھگ ۲½ ہزار برس پہلے جو سنسکرتی جو تہذیب اور ملک گیر معاشرہ تھا، مشرق سے مغرب اور شمال سے انتہائے

شمال تک ان سب کو جس زبان نے ایک بنایا تھا وہ محض سنسکرت تھی۔ یہ زبان ایک پوری سنسکرتی اور تہذیب بن گئی تھی۔ یہ ایک زبان بیرونِ ہند کی پوری آریائی نسل کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھی تو دوسری طرف اس کے ڈانڈے ملتے تھے ایران میں ہند ایرانی سے یورپ میں جرمنی، فرانسیسی، پرتگالی اور انگریزی سے یہ اٹوٹ رشتہ آج تک برقرار ہے اسی لیے ہند یورپی، ہند ایرانی اور ہند آریائی کا مثلث معنی خیز اور اثر انگیز ہے۔

اس کی دوسری مثال ماضی قریب میں فارسی زبان رہی ہے۔ مغلیہ عہد کی تین سو سالہ تاریخ میں فارسی کو جو عمل دخل حاصل رہا اس زبان نے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک لوگوں کو اظہار کے نہ صرف نئے پیرائے دیئے بلکہ ان کو ملانے اور یکجا کرنے کے نئے نئے مواقع بھی فراہم کیے۔

قومی ایکتا میں زبان کے مثبت کردار کی تیسری نمایاں مثال اُردو ہے جس نے انگریزوں کے عہد میں انگریزوں کو ہندستان اور ہندستانیوں سے واقف کرایا۔ ان کے خد و خال، خصائل و خصائص اور خو بو سے روشناس کرایا اور وقتاً فوقتاً اس امر کا اعادہ بھی کیا کہ پوری ہندستانی قوم جو ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں پر مشتمل ہے ایک ہے، وہ ایک دوسرے کے غم میں شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ٹیپو سلطان شہید ہوئے تو پوری قوم نے ان کا سوگ منایا۔ جب سراج الدولہ کا سانحہ پیش آیا تو رام نرائن موزوں نے یہ تاریخ ساز شعر کہا جو آج تک زبان زد خاص و عام ہے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ اٹھ گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اُردو نے شروع شروع میں یہ بھی کوشش کی کہ فاتح اور مفتوحین کے درمیان جو خلیج ہے اسے پاٹا جائے۔ زبان کے بطن سے اس کا ادب پیدا ہوتا ہے۔ اردو ادب نے قومی ایکتا کی روایت کو مضبوط بھی کیا اور اس میں توسیع بھی کی، اسے نئے دلائل و براہین سے مزین کرنے والوں میں ماسٹر رام چندر، سر سیدؒ اور ان کے رفیقوں کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ ان سب نے قومی یک جہتی کو تصورِ وحدت سے قریب پایا، انھیں کثرت میں وحدت کے جلوے نظر آئے جنھیں انھوں نے اپنے ادب پاروں اور شہ پاروں میں مختلف پیرایوں اور اسالیب میں ڈھالا۔ وسیع النظری، مذہبی رواداری لوگوں کا مزاج بن گئی۔ اُردو نے پورے ملک میں یک جہتی کی فضا بنا دی جس میں مذہب، رنگ و نسل، طبقے اور علاقے کا احساس [موہوم] اور وہم ہوتا گیا۔ ایسے میں سودیشی تحریک وقت کی سب سے بڑی ضرورت بن کر ابھری۔ جنگِ آزادی باقاعدہ شروع ہو گئی۔ اُردو نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لوگوں کو یہ سبق بار بار یاد دلایا گیا کہ یہ جنگ باہمی میل ملاپ سے ہی جیتی جا سکتی ہے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں اور تقریروں اور پریم چند کی تخلیقات نے ایک نئی بیداری عطا کی۔ مولانا حسرت موہانی اور رام پرشاد بسمل نے اپنے ترانے چھیڑ دیے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یا

سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں

آزادی کے جذبے سے سرشار یہ جیالے اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ جس وادیٔ سنگلاخ میں انھوں نے قدم رکھا ہے اس میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب پوری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے اور اس میں کہیں کوئی دراڑ نہ پیدا ہو۔ جب وہ اپنے معمولی سے معمولی چھوٹے بڑے اختلافات کو خود مٹا دے تب ہی آزادی کامل کا حصول ممکن ہے۔ چنانچہ اس احساس کو ابھارنے اور اسے فروغ دینے میں اُردو کامیاب ہو گئی ملک آزاد ہو گیا۔ یہ آزادی جہاں بڑے سیاست دانوں کی دین اور وطن پر مٹنے والوں کی مرہونِ منت ہے وہیں اس جذبے کی آئینہ دار بھی ہے جس نے سب کو یکجا کیا اور یہ کام اردو نے بہ تمام و کمال کیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کی دیگر زبانوں نے بھی اہم رول ادا کیا۔ اس ضمن میں بنگلہ اور ہندی کے کارنامے نمایاں لائق ستائش ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے ترانۂ ہندی کا یہ مصرعہ ؎ "کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری" یہی ہماری مشترکہ تہذیب ہے۔ یہ جذبہ مہاتما گوتم بدھ سے گو سوامی تلسی داس تک اور ان سے اقبال اور پریم چند تک مسلسل کارفرما رہا ہے۔ ٭ ٭

ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت
۳۹۔ حسن پوریہ،
کشمیری محلہ لکھنؤ

جشنِ آزادی

ہم ہیں سب ایک یہ دُنیا کو دکھانا ہے ہمیں
اختلافات کے شعلوں کو بجھانا ہے ہمیں
جذبۂ عشق ہر اک دل میں جگانا ہے ہمیں
اپنے اقدامِ عمل سے یہ بتانا ہے ہمیں
خُلق و ایثار و مروّت کے پرستار ہیں ہم
دوستو! جنسِ محبّت کے خریدار ہیں ہم

نفرت و بغض سے دامن کو بچانا سیکھو
سب کو تم راہِ محبّت پہ چلانا سیکھو
اپنی تدبیر سے تقدیر بنانا سیکھو
قوم کے کاموں میں تم ہاتھ بٹانا سیکھو
اپنے آزاد وطن کے لیے کچھ کرنا ہے
دلِ شیں کا دامنِ امید تمھیں بھرنا ہے

متحد ہو کے رہو صرف گزارش ہے یہی
ہر بہی خواہِ وطن دوست کی خواہش ہے یہی
فرضِ تہذیب یہی حسنِ نوازش ہے یہی
وصفِ انساں کی سزاوارِ ستائش ہے یہی
لازمی کام ہے تعمیرِ وطن اے فطرت
اس سے بڑھ کر نہیں دُنیا میں کوئی بھی خدمت

سیّد علی رضا حسینی
۹۶/۴۳ کرنیل گنج، بکرمنڈی چورا(ہا)
کانپور

غزل

اب وہ نگاہ و دل کو جو پیارے ہوئے تو کیا
جب ہم ہی زندگی کے کنارے ہوئے تو کیا

ٹوٹا نہ ان کے حسن کا جادو کسی طرح
غمزوں سے کچھ حسین اشارے ہوئے تو کیا

دلدادگانِ عشق کی کوئی خبر تو لے
روشن افق پہ نور کے دھارے ہوئے تو کیا

آیا نہ زندگی پہ کسی طرح آب و رنگ
غرقابِ خون چاند ستارے ہوئے تو کیا

جب دل تھا اپنے پاس تو قصے ہزار تھے
اب حسنِ گلستاں کے نظارے ہوئے تو کیا

قسمت جو ٹوٹنا ہے تو ٹوٹیں گے ایک دن
سالم ابھی تلک جو گگارے ہوئے تو کیا

آندھی چلی تو پیڑ یہاں کے وہاں گرے
تھے گو بہارِ زیست گزارے ہوئے تو کیا

بستر جب ان کے در سے حسینی اٹھا چکے
چرچے جو محفلوں میں ہمارے ہوئے تو کیا

مطرب نظامی
جوہری محلہ۔ لکھنؤ

محمد عثمان عارف نقشبندی کی شاعری
فراق گورکھپوری کی نظر میں

عزیز گرامی ایڈیٹر صاحب۔ نیا دور لکھنؤ

تسلیمات :۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

میری کتاب "فراق یادوں کے جھروکوں سے" جو شائع ہو چکی ہے جس میں ایک عنوان "کچھ شعراء کے بارے میں" ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سے شعراء پر فراق صاحب کی رائے ہے لیکن چند شعراء کا کلام اس وقت وافر مقدار میں نہیں مل سکا تھا اس لیے بعد میں وہ کلام حاصل کرکے فراق صاحب سے رائے لی گئی جس میں جناب عارف صاحب نقشبندی کا کلام بھی شامل ہے۔ فراق صاحب نے پورا کلام سننے کے بعد اپنی بھرپور رائے کا اظہار کیا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ اس مضمون کو نیا دور میں شائع ہونا چاہیے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ توجہ فرماکر اس کو شائع کرنے میں تعاون فرمائیں گے۔

——— مطرب نظامی

مطرب صاحب! آج میری طبیعت بہت اُداس ہے اس قدر خوش گوار موسم میں بھی یہ اداسی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہرچند آپ کی موجودگی نے میری زندگی میں ایسی تبدیلی کی ہے کہ ماضی کی تلخیوں کا خیال کم ہی آتا ہے۔ میرے پاس لوگ پہلے تو برابر آتے تھے۔ لیکن اب کوئی بھی نہیں آتا اور اگر کوئی بھولے بھٹکے آیا بھی تو تنہائی کا جامہ پہن کر، یعنی کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد اپنا کوئی ذاتی مقصد بیان کر دیتا ہے۔ یا نوکری کی سفارش کے لیے درخواست ہوتی ہے یا اور کوئی ذاتی کام۔ اس لیے تقریباً ادبی ماحول اور ادبی گفتگو کو ترس گیا ہوں۔ آپ کی موجودگی میں گو اس کا احساس کم ہو گیا ہے لیکن ماضی کی تلخیاں بھلا نہیں سکا

خیر کوئی لطیفہ سنائیے یا ادبی گفتگو کیجئے تاکہ دل بہلے۔

محترم۔ آپ کا حکم ہے تو لطیفے بھی سناؤں گا اور ادبی گفتگو بھی ہو جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ میں نے آپ کے مزاج کا اندازہ لگایا ہے کہ جب آپ زیادہ اداس ہوتے ہیں تو اپنا ذہنی رُخ موڑنے کے لئے یا تو شعر کہتے ہیں، یا ادبی گفتگو بڑی گہرائی سے کرتے ہیں۔ آج سے کچھ دن قبل میں کچھ شعراء کے بارے میں آپ سے رائے لے چکا ہوں، جن میں کچھ شعراء ایسے بھی ہیں کہ وقتی طور پر ان کا کلام زیادہ نہ فراہم ہو سکا اس لیے آپ کی رائے بھی ان پر مختصر رہی۔ اب میں نے کچھ دنوں کی کاوش کے بعد شعراء کا مزید کلام حاصل کر لیا ہے، جس میں خاص طور سے عارف

نقشبندی کا کلام ہے ۔ پہلے آپ کو لطیفے سناؤں گا اس کے بعد عارف صاحب کا کلام ۔

لطیفے

ایک شخص اپنی بوڑھی نوکرانی کو ملازمت سے نکالنا چاہتا تھا چونکہ نوکرانی کی تنخواہ کئی مہینوں سے باقی تھی اس لیے وہ بیماری کا بہانہ کر کے لیٹ گئی۔ اس کے آقا نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو جب اس کے علاج کے لیے بلوایا تو نوکرانی نے چپکے سے ڈاکٹر سے کہا کہ میں بیمار نہیں ہوں چونکہ آقا نے کئی ماہ سے میری تنخواہ نہیں دی اس لیے میں بھی جھوٹ موٹ بیمار بن کر لیٹ گئی ہوں اور جب تک میرے آقا میری تنخواہ نہیں دیں گے میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گی ۔

ڈاکٹر نے یہ سن کر سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔" ذرا تم اپنے پلنگ پر کھسک جاؤ میں بھی یہیں لیٹا جاتا ہوں ۔"

نوکرانی نے حیرت سے پوچھا ۔ "آخر یہ کیوں ۔ ؟"

ڈاکٹر نے کہا۔" کئی سال سے مجھے بھی میری فیس نہیں ملی ہے ۔"

ایک شخص کا نکاح ہوئے عرصہ گزر چکا تھا لیکن نیا مکان نہ ملنے کی وجہ سے ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی ۔ اس کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنی سکونت اپنی سسرال ہی میں اختیار کر لو ۔

نوشاہ نے اک آہ بھرتے ہوئے کہا۔" یہ اس لیے ممکن نہیں ہے کہ میری ساس اور سسر ابھی تک خود اپنی سسرال میں قیام پذیر ہیں ۔"

گاہک ویٹر سے : "بھئی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تین ابلے ہوئے انڈوں کی قیمت چھ روپیہ ہے اور تین آملیٹ کی قیمت صرف ۲ روپیہ ہے ۔"

ویٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔" ارے صاحب ! آملیٹ میں انڈے کون گنتا ہے ۔"

فراق : ہاں سب لطیفے خوب تھے ۔ اب ذرا ادبی گفتگو ہو جائے ۔"

مطرب : پہلے میں جناب عارف صاحب کا کلام سناتا ہوں :

فن کار قلم خون میں اپنے ہی ڈبو کر
سو نقش بنا سکتا ہے اک نقشِ کہن سے
کس پھول کا ماتم کریں کس غنچہ کو روئیں
سوغات لیے آئے ہیں زخموں کی چمن سے

ہر پھول کو دیکھوں یہ ہے آوارہ نگاہی
ہر نقش میں تو جلوۂ جاناں نہیں ہوتا

تم آزمانے کو توڑو تو یہ خیال رہے
مجھے نہ توڑ سکو گے میں دل کا شیشہ ہوں

عیش و نشاطِ زیست تو دھندلا سا خواب تھا
آنا پڑا ہمیں ترے غم کی پناہ میں !

صدیوں کی ہے تاریخ دھڑکتے ہوئے دو دل
ملنے پہ جو آئے ہیں تو طوفاں میں ملے ہیں

وقت بھی کیسا مصوّر ہے تری یاد کے ساتھ
کتنی تصویریں بناتا ہے مٹا دیتا ہے

واہ واہ ۔ مطرب صاحب اس شعر کو پھر پڑھیے یعنی پہلے مصرع کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیجیے ۔ وقت بھی کیسا مصور ہے ۔ تری یاد کے ساتھ ۔ دوسرا مصرعہ کتنی تصویریں ۔ بناتا ہے ۔ مٹا دیتا ہے ۔ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیجیے تب شعر کا جوہر ابھرے گا ۔ یہ شعر کس ماحول اور کس عالم میں کہا ہے ۔ وقت اور یاد میں یہ ایک ایسا تسلسل ہے جو آئینہ نگاہ نہیں بنتا ۔ بلکہ ایک احساس افزا تراوش ہے

کبھی انسان اس سے کیف و سرور حاصل کرتا ہے اور کبھی عقل کو فراموش کر کے جنوں کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں یہ ایک ایسا عالم ہے جس میں توازن قائم رکھنا ایک اہم مسئلہ ہے۔

کیونکہ کائنات میں انسانی زندگی کے انفاس کی موجیں ایک وسیع سمندر میں رقص کناں ہیں اور یہ موجیں لاتعداد ہونے کے ساتھ اپنے شعوری عمل کے جلووں میں کاروبارِ حیات میں مصروف ہیں یعنی یہ موجیں ضابطۂ حیات ہیں۔ لیکن سمندر میں چھوٹی موجیں بھی معرضِ وجود میں آتی ہیں اور محدود انداز میں غیر مشترک ہوتے ہوئے بھی باہم ایسا ربط رکھتی ہیں جیسے زنجیر کی کڑیاں اور اس کی ہر کڑی اپنے میں ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ بڑی موجیں ابتدا ہی سے مربوط اور لطافت در ہوتی ہیں۔ اگر وقت ساتھ دے رہا ہے تو بڑی موجیں لذتِ ساحل سے آشنا کر دیتی ہیں اور اگر وقت گردشِ وقت کا آئینہ دار رہے تو چھوٹی موجیں ہی زندگی کو سہارا دیتی ہیں۔ رفتہ کی ان دونوں کیفیتوں کو شاعر نے مصور سے استعارہ کیا ہے۔ مصور تصویر کے خاکوں میں رنگ بھرتے وقت تصویر کے خاکوں میں گم بھی ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے دل و دماغ میں کوئی حقیقی پیکر ہے ورنہ تصویر کے سادے کاغذ کی نمائش ہو کر رہ جائے گی۔ اسی ضمن میں میرا ایک شعر ہے ؎

ایک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

میرے اس شعر کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ حسرت موہانی کا مشہور شعر

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اس کے بعد اس مضمون کے لیے دوسرے شعر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن میرے شعر میں انداز کے ساتھ معنوی فرق بھی بہت ہے۔ اکثر یاد آنا، اور برسوں یاد نہ آنا، ایک دوسری کیفیت ہے لیکن میرے شعر میں یاد آنا اور نہ آنا مسائلِ حیات ہیں جو ایک عالم میں انسان کو نہیں رکھتے اور یہ سب وقت کی کاریگری ہے۔

لیکن عارف نے زاویہ بدل کر شعر کہا ہے جیسے میں نے حسرت موہانی کے زاویہ سے ہٹ کر اپنا زاویہ پیش کیا۔ عارف کے یہاں وقت مصور کی صورت میں لمحات کو اس طرح بدل رہا ہے کہ کسی بھی تصور کو قیام نہیں۔ تصویر کا بنانا اور مٹانا۔ ایک ناکام مصور کی ایسی رنگ آمیزی ہے جو وقت کے ہمراہ ہر رنگ اڑا لے جاتی ہے۔ لیکن تیری یاد جو زندگی بن گئی ہے ہمیں اپنے وجودی احساس سے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ سماجی حالات اور ماحول میں کتنا ہی رد و بدل ہو، انقلاب آئیں، حکومتیں بدلیں، کچھ بھی ہو۔ لیکن تیری یاد ایسا نقش معتبر ہے، جس میں وقت کے ساتھ مصور کے رنگوں میں حقیقی رنگ آمیزی کی بھی ضرورت ہے۔ تصویر اگر بنے تو مٹے نہیں۔ اس میں اصلاحی پہلو کی بھی وضاحت ہے۔ وقت کوئی جامد شے نہیں۔ انسان اگر چاہے تو وقت کی رفتار کو اپنے عزم میں ڈھال کر وقت کی گرفت کر کے اس پر قابو حاصل کر سکتا ہے۔ اور اسی کا نام جہدِ مسلسل ہے۔ باقی اشعار کل سنائیے گا۔

یہ سلسلہ کئی دنوں تک رہا۔ جب دوسرا دن ہوتا تھا تو یہ ضروری نہیں کہ کل جو موضوع تھا وہی برقرار رہے۔ فراق صاحب کی مزاجی کیفیت میں کوئی توازن نہیں تھا۔ کئی دنوں کے بعد ان کو پھر یاد آیا تو کہا کہ "آپ نے عارف کے اشعار سنائے تھے، میں نے اشعار سننے کے درمیان کچھ تبصرہ شروع کر دیا تھا۔ اب یاد نہیں آتا۔ مزید کچھ شعر اور سنائیے"۔

"بہتر ہے جناب۔ سنیئے" ؎

ہر روز نیا رنگ بدل لیتی ہے دنیا
فرسودہ مزاجوں کو یہ احساس نہیں ہے

آلامِ روزگار میں گم تھا تو کیا ہوا
آیا ترا خیال مجھے ڈھونڈتا ہوا

افسردہ زندگی میں چراغاں سا ہو گیا
جب جب ترے خیال کے جگنو چمک گئے

جناب اس شعر میں بھی بڑا لطیف کنایہ ہے۔ محبوب کا خیال اور توجہ مسلسل نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی ہے تو ایک خاص ماحول کی عکاسی کرتی ہے
حضرت جگر مرادآبادی کا یہ شعر اس لطافت کا آئینہ دار ہے ؎

شب فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں ان کی توجہ سی پائی جاتی ہے

اس شعر پر کم فہم حضرات نے یہ اعتراض کیا کہ شب فراق اور نیند کا آنا تو متضاد چیزیں ہیں۔ لیکن یہ نہیں غور کیا کہ شب فراق اس وقت تک بھرپور شب فراق ہے۔ جب تک کوئی تصور بھی محبوب کا نہ ہو۔ لیکن اس شعر میں محبوب کی یاد ایک توجہ بن کر جلوہ فرما ہو گئی۔ اور یہی توجہ تسلی اور سکون کی لوری بن کر نیند میں ڈھل گئی ہے۔

عارف نے اسی مضمون کو دوسرے رخ سے پیش کیا ہے۔

بعض جگہ اندازِ بیان ہی دوسروں پر فوقیت کا باعث بن جاتا ہے یہاں بھی محبوب کا خیال مسلسل نہیں ہے کیونکہ آلام روزگار اتنے عروج پر ہیں کہ روشنی اپنے حلقہ میں محدود ہے۔ یعنی 'چراغاں سا'۔ یہاں چراغاں سا' پائندہ روشنی کا عنوان نہیں ہے بلکہ بہت مختصر اور مختصر ہونے کی مثال جو پیش کی ہے وہ آپ اپنی مثال ہے جگنو کی چمک مسلسل نہیں ہوتی درمیانی وقفہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ یعنی اندھیرے اور روشنی کا تضاد بھی افسردہ زندگی کا کرشمہ ہے" جب جب ترا خیال" اور جگنو کا وقفہ کے ساتھ چمکنا۔ مشاہدے کے ساتھ محبوب کے خیال کی وابستگی ایک بالکل نیا انداز ہے۔ تشبیہ نے وسعتِ خیال میں ایسی رنگینی بھر دی ہے کہ غور کرنے سے پہلے ہی شعر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ شعر دراصل وہی ہے جس میں تاثر اور توجہ طلب کنایہ ہو۔

حالات بدلتے ہی بدل جاتی ہے تاریخ
اترا نہ تو اس بات پہ تاریخ کہن ہے

تجدید کے سانچے میں ہو تشکیل سرِ نو
ٹھکرا ہوا بوسیدہ روایت کا بدن ہوں

جناب اس شعر میں 'سرِ نو' کی ترکیب نہ مجھے پسند ہے اور نہ لطف دے رہی ہے بلکہ روانی کو محدود کیے ہے۔ خیر جانے دیجئے۔

کتنے ہی مرقعے مرے مر جائیں گے مجھ میں
فن کار ہوں اور اپنے ہی فن کا میں کفن ہوں

بہت خوب شعر کہا ہے۔ اگر میں اس کی وضاحت کروں تو ایک کتاب ہو سکتی ہے، لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں ذوقِ شعری کی آسودگی کے لیے باتیں کرتا ہوں اور آپ نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ تمام ایسے شعراء کو ایک ہی منزل پر لایا جائے تاکہ ان کے ادبی جوہر کھلیں۔ جناب میں آپ کے اس ادبی اقدام سے خوش ہوں کہ آپ میں اپنے علاوہ دوسروں کی اہمیت کا بھی خیال ہے جو فی زمانہ تعجب خیز ہے۔ خیر اور شعر سنائیے :

وقت ہر لمحہ یہ کہتا ہوا گزرا مجھ سے
ساتھ چلنا ہے تو چل میں تو گزر جاؤں گا

میرا بھی چہرہ پڑھیے سراپا ہوں داستاں
تاریخِ روزگار کا مکتوب میں بھی ہوں
نسبت نہیں تجھی کو بدلتے زمانے سے
طوفان و انقلاب سے منسوب میں بھی ہوں
میری بھی ایک مہر ہے تاریخ وقت پر
میرا بھی ایک ڈھنگ ہے اسلوب میں بھی ہوں

تم خیالوں میں بس گئے میرے — آبرو بڑھ گئی خیالوں کی
کائناتِ عظیم کو عارف — کیسے دُنیا کہوں خیالوں کی

میں نے ہر ایک تمنا تری پڑھ لی ان میں
تحفے پھولوں کے مہکتے ہوئے مکتوب ہوئے

راتیں سحر پہ راتوں پہ حاوی سحر ہوئی
صدیوں سے یہ اندھیرے اُجالے کی جنگ ہے

قیمتی لاکھ ہو پتھر تو ہے پتھر آخر
اشک میں جوہرِ غم ہے اسے پتھر نہ بنا

ہر لمحہ اپنے آپ بدلتی چلی گئی — کیسی ہماری عمر بھی موقع شناس ہے

آنسو بنی تھی آرزو پلکوں پہ روک لی
غیرت کی ایک بوند سمندر بنی رہی

عظمتِ ذات کا احساس اگر ہے کچھ بھی
شل بچوں کے کھلونوں سے بہلتا کیوں ہے

عارف مری منزل کیا سرگرم سفر رہنا
دنیا مری راہوں میں اک خیمۂ ہستی ہے

اخبار کے صفحوں پہ تو ہے دل کی سیاہی
حالات جو سچ پوچھئے چہروں پہ چھپے ہیں

چمن میں انجمن میں ہو تمھیں تم   ہمارا کوئی بھی عالم نہیں ہے

بڑھتے ہی جائیں قافلے راہِ حیات میں
بن کر چراغِ راہ گزر جا سکتے رہو

نور ہی نور ہے نقشہ کہاں تحریر کہاں
آئینہ خانے میں دیکھیں تری تصویر کہاں
بزمِ دنیا نہیں مقتل ہے یہ انسانوں کا
زندگی تجھ کو اٹھا لائی ہے تقدیر کہاں

کیا ہے اپنی حقیقت سے آشنا مجھ کو   ترے خیال نے اکثر جگا دیا مجھ کو

بھرنے والے زخم جلدی کیوں بھریں؟
زخم میں چاندی بھی ہے سونا بھی ہے

جناب آپ نے خوب خوب اشعار سنائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام کا انتخاب نہیں بلکہ پھولوں سے رس نچوڑ لیا ہے۔ میں اس کا پہلے ہی سے قائل ہوں کہ آپ کے مزاج میں اچھے اشعار کی پرکھ ایک میزان کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے خیال سے اس انتخاب کے بعد مزید انتخاب کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ نے جب میرے کلام کا انتخاب کیا تھا میں اسی سے حیرت میں ڈوب گیا تھا۔ کسی شاعر کے کلام اور اس کے انتخاب کا کام اس لیے مشکل ہے کہ اس میں عمیق مطالعہ اور گہرائی کی ضرورت ہے آپ نے اشعار کہنے سے زیادہ مطالعہ میں وقت گزارا ہے۔ میں نے بہت سے اچھے شعراء میں یہ عیب پایا ہے کہ وہ نہ تو اپنے کلام کا انتخاب بہتر کر پاتے ہیں اور نہ دوسروں کے کلام کا۔ یہ بناضی ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی۔ آپ کی یہ صلاحیت اور ایمان داری ادبی تاریخ میں ضرور نمایاں ہوگی۔ محرومی کا میں قائل نہیں۔ کوئی نہ کوئی آپ کی اس اہمیت کو سمجھ کر اور پریشانیوں کا طلسم توڑ کر اس حصار سے آزاد کرے گا۔

مجھے اس سلسلے میں حضرت جگر مرادآبادی کی وہ بات یاد آگئی جب انھوں نے دیگر شعراء کی موجودگی میں آپ سے یہ فرمائش کی تھی کہ آپ اپنے ہم عصر شعراء کا کلام سنائیں۔ یہ بات اس وقت یقیناً آپ کو ناگوار گزری ہوگی۔ تمام شعراء سے تو جگر صاحب نے ان کا کلام سنا تھا اور آپ سے دوسروں کا۔ حضرت جگر نے آپ کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ آپ کو اچھا کلام یاد ہے کہ نہیں۔ یہ مستقبل کی آزمائش تھی کیونکہ ہر عہد اپنے مستقبل میں گم ہونا چاہتا ہے۔ اور آپ کا عہد اپنے مستقبل میں بہت شاندار طریقہ سے گم ہوا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ میری تنہائی میں رس گھولنے کہاں آتے اور نہ میں اپنی زندگی کے دوسرے رُخ پر نظرثانی کرتا۔ یہ ادبی گفتگو کا سلسلہ میری زندگی کو ایک نئے عالم میں لے آیا ہے۔ آپ جو تعمیری کام مجھ سے لے رہے ہیں اس سے میری روح کو تسکین مل رہی ہے۔

اس وقت آپ نے عارف کا کلام سنا کر اپنی ادبی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ میری ملاقات تو عارف صاحب سے ہے لیکن آپ کا کوئی تعارف نہیں ہوا۔ دیکھئے اگر دہلی جانا ہوا تو ضرور ملاقات کراؤں گا نہایت سنجیدہ اور خداپرست انسان ہیں۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔ اس دور میں ایسے انسان نایاب ہیں کیونکہ یہ

دَور، دورِ فرعونی ہے۔ بلکہ اس سے کچھ سوا۔ عہدِ فرعون میں تو فرعون ہی نے خدائی کا دعوا کیا تھا، لیکن آج کل ہر انسان اپنی فرعونیت پر فخر کرتا ہے ؎

اس دورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے
عارف خدا بہت ملے انسان کم ملے

دورِ حاضر پر عارف نے تاکید و تحریص فرمائی ہے۔ آگے چل کر ممکن اور ناممکن کے پہلو کو کس حُسن و خوبی سے پیش کیا ہے۔ تنقید کا یہ پہلو فرد کی خود پرستی اور ذات کا غم اس دور کا المیہ ہے۔ اکثر یہ بھی جواز پیش کیا گیا کہ ذات کا غم تنہا نہیں بلکہ غمِ دوراں ہے۔ بلکہ اجتماعیت کا محور ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے ذات کے غم میں اجتماعیت کا احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ انسان اتنا خود پرست ہو جاتا ہے کہ عوامی سطح پر سوچنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے لیکن جو دنیائے فانی پر نظر رکھتے ہیں وہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ

گزرے جس دم دُنیا سے ہم
ہم نے جانا دنیا گزری (رند)

ہونے کو تو اس دور میں کیا چیز نہیں ہے
انسان کو ڈھونڈو یہاں انسان نہیں ہے

غالب و میر نے پہلے ہی تنقید کر کے ہمیں اس سے آشنا کر دیا ہے ؏

غالب: آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
میر: آدمی ہونا بہت مشکل ہے یاں

راتیں سحر پہ، راتوں پہ حاوی سحر ہوئی
صدیوں سے یہ اندھیرے اُجالے کی جنگ ہے

جناب مطرب صاحب آپ نے جو اشعار سنائے اس سے مزاج میں ایک کیفیت پیدا ہوئی اور رات ہی میں نے کچھ شعر کہے آپ کو اس لیے نہیں جگایا کہ نیند خراب ہوگی۔

عارف نے جس انداز سے اپنی زندگی اور ماحول کا تجزیہ اشعار میں کیا ہے اس میں کہیں کہیں نیا پن ضرور ہے اور اثر پذیری کے ساتھ حیات اور فن واضح کرنے کے لیے اگر کوئی ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے یہاں سے مثال پیش کرے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ زندگی گزارنے والا وجود اور تخلیق کرنے والا عمل ایک دوسرے سے الگ ہیں تو وہ صحیح نہیں ہے وہ اس لیے کہ وجود صرف ایک ہی ہے (ایلیٹ) نے اس پہلو کو واضح کرنے میں تخلیقی اہمیت کا ذہنی مطلب زیادہ نمایاں کرنے کے لیے شخصیت کی دوئی کا یہ خیال واضح کیا ہے جو انسانی تجزیے کے ساتھ ہر ساعت رواں ہے جس سے وجود کی پرتیں کھلتی رہتی ہیں۔ تخلیقی فن میں فن کار کسی فرد کی کش مکش کا اعلان نہیں کرتا بلکہ اپنے ہی وجود میں احساس کی تخلیق کرتا ہے۔

اس صورت سے فن کار اور فن ایک دوسرے میں سمو جاتے ہیں۔ میں شاعر کا احساس اور اس کی شاعری کو زندگی کے واجبات سے تعبیر کرتا ہوں۔ عارف کا شعورِ حیات عصرِ نو کے تقاضوں کے ساتھ زیادہ ترقی یافتہ ہے اور حقیقت پسندانہ بھی۔ انھوں نے انقلاب اور ماحول کو ایک دوسرے سے متناقص نہیں سمجھا نہ ان کے ذہن میں ایک دوسرے پر ترجیح کا سوال اٹھا۔ اسی لیے یہی وجودی حیثیت تخلیقی قوت کے ساتھ سماجی انقلاب کا منشا بنی۔ کیونکہ حیاتیاتی سطح پر انسان سکون اور توازن کا معیار تلاش کرتا ہے اور اس عالم میں ان دونوں کیفیتوں کو نہ تو متضاد گردانتا ہے نہ متوازی، اس لیے فکری احساس میں شعری زندگی کی کلیت اور تجزیۂ وجود کی ہمہ گیری ہے۔

تخلیق کا عمل فن کے خاکوں میں اپنا عکس ڈالتا ہے۔

فکری تخلیق کا عمل مجسم آئینہ بن کر آئینہ گری کی مثال پیش کرتا ہے۔

فکری تحقیق اور صرف تحقیق دونوں میں حسین ربط بھی ہے۔ اسی سے فن کار کی زندگی اور اس کے فن کا تجزیہ آسان ہو جاتا ہے اور فرض کیجیے کوئی ایسا فن کار ہے کہ ہم اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف نہیں ہیں۔ یعنی ہم تک اس کی سوانح کا کوئی حصہ نہیں پہنچ سکا، تو پھر ہم اس کے کلام ہی سے انھی کے سرد و گرم کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بات آج بھی ہے کہ ہم اگر ماضی کی تاریخ پڑھتے ہیں تو ہمیں کبھی کبھی سچائی

پر اس لیے کم یقین ہوتا ہے کہ ماضی کی تاریخ یا تو جبراً مرتب کرائی گئی ہے یا اور کوئی سیاسی مصلحت تھی۔ بہرحال تاریخ سے زیادہ معتبر اس دور کے شعرا کے کلام کا اگر ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ہر نشیب و فراز کا پتہ چل جاتا ہے۔ عارف کی شخصیت اور ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ بہت اہم ہے۔ یہ حیات و فن کے ایسے رابطے کے قائل ہیں کہ جس کے جلو میں شاعری زندگی کے اہم مسائل کو مخاطب کرنے میں ایک خاص جذبہ رکھتی ہے۔ کیونکہ

حیات روزنئے رنگ میں نمایاں ہے
جو اک چراغ بجھا سیکڑوں چراغ جلے

'روز نئے رنگ میں نمایاں ہے' شاعر نے یہ نہیں کہا کہ 'روز نئے رنگ میں نظر آتی ہے' بلکہ 'نمایاں' کہا ہے۔ نمایاں کا لفظ بہت بلند ہے۔

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

تاریخی، معاشی اور سیاسی سطح پر اپنے ماحول کے لحاظ سے زندگی طلوع ہوتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی ایک انقلابی تصور ہے۔

ز انقلابِ زمانہ عجب مدار کہ چرخ
ازیں فسانہ و افسوں ہزار داد دیاد

اور اس انقلاب کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی نے فروغ پایا ہے آرٹ اور ادب کی نئی تصویریں ابھری ہیں اور دوسری جگہ عارف فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں ؎

وقت ہر لمحہ یہ کہتا ہوا گزرا مجھ سے
ساتھ چلنا ہے تو چل میں تو گزر جاؤں گا

یہ شاعری کی اس حقیقت اور طاقت پر مستحکم یقین رکھتے ہیں کہ شاعری ان کے نظریۂ حیات کا ماحصل ہے اور اس پر براہِ راست ان کو قدرت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی رہنما بن کر ایک مستحکم اور مربوط زندگی گزاری ہے اس لیے شعر کہتے وقت بھی سیاسی اہمیت قائم رہتی ہے۔ سیاسی سنگلاخ راہوں کو تراش کر بھی ان کی شعریت ایک نئی کروٹ کے ساتھ پیغام بن کر ابھرتی ہے ؎

فن کار قلم خون میں اپنے ہی ڈبو کر سو نقش بنا سکتا ہے اک نقش کہن سے

یہی ان کا پیغام لازوال ہے جو اشعار میں ڈھل گیا ہے۔ تجزیۂ حیات کے ساتھ ساتھ فن کے تخلیقی عمل کو استوار کرتا ہے۔ شاعری اور سیاست کے یہ دو دھارے جن کا مرکز زندگی ہے، ایک ساتھ کہکشائیں تراشتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ دو دھارے کبھی ہم آغوش بھی ہو جاتے ہیں۔ چونکہ تمام احساسات کا محور زندگی ہے تو پھر جمالیاتی حس کی رنگ آمیزی بھی لازم و ملزوم ہے اس لیے ان لوازمات کے ساتھ۔ یہ کیفیت بھی بہت دل نشین ہے ؎

صدیوں کی ہے تاریخ دھڑکتے ہوئے دو دل
ملنے پہ جو آئے ہیں تو طوفاں میں ملے ہیں

صدیوں کی تاریخ۔ یہ لفظ تاریخ بجائے خود ایک وسعت کا حامل ہے یعنی دو ٹکراتی طاقتیں نفرت کی آندھیوں کے باوجود ماحول کی تبدیلی اور تاریخی کروٹ بدلنے کے بعد آپس میں شیر و شکر ہو جاتی ہیں اور دو بچھڑے ہوئے فرقت کے مارے محبت بھرے دل کبھی اچانک مل جاتے ہیں۔ یہی صدیوں کی تاریخی حقیقت ہے۔ عارف کا مزاج اور فن دو مستقل کیفیتوں میں تقسیم ہے جو بہت اہم ہے۔ اگر یہ محض سیاسی شاعری کے دلدادہ ہوتے تو زندگی میں یہ تابناکی نہ ہوتی اور نہ شاعری نئے اقدار کی حامل ہوتی کیونکہ صرف سیاسی زندگی اور سیاسی شاعری ایک ہی سرچشمہ کے دو سرے ہیں مگر ان کے وہاں تو زندگی ع حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

سیاسی رخ بھی ہے، جمالیاتی پیکر تراشی بھی نئے رنگ میں جلوہ گر ہے۔ الغرض ہر صنفِ سخن کی نبضوں میں خون ایک ہی رواں ہے لیکن روانی جدا ہے کہیں پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فن میں سیاسی گرما گرمی ہے ہی نہیں، اور ہے بھی تو سنجیدگی کے ساتھ ایک جمالیاتی دل کشی ہے جس سے ذہن فکر میں ڈوب جاتا ہے اور کہیں سیاسی رخ ایک مسئلہ حیات کا پہلو اختیار کر لیتا ہے۔ بہرحال ان کے کلام میں یہ خوبی ہے کہ زندگی کے خاکوں میں سب رنگ بھر دیے ہیں اور ہر رنگ اپنی آب و تاب میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی جداگانہ نہیں ہے پورا کلام ہفت رنگ امتزاج ہے اس کی موج در موج میں زندگی کے اہم تقاضے رقص فرما ہیں اور عمر کا ہر حصہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر بھی ایک دوسرے کا تکملہ کرتا ہے، اس لیے ان کا معتبر وجود زیادہ تر

غیر معتبر وجود کی نفی کرتا ہے۔ سیاسی زندگی نے ان کے فن اور جذبات کی حصار بندی نہیں کی بلکہ لامحدود بنا دیا ہے۔ یہ دو نظریوں کے درمیان یوں سفر کر رہے ہیں کہ ہر گام پر تجربات اور ہر لمحۂ حیات کو محبت سے ترتیب دے کر جز بندیٔ حالات کر رہے ہیں۔ زیادہ تر متنوع تجربات کو محبت ہی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، ان کی آزادیٔ فطرت اور جہد پیہم محبت کی مثالی توسیع ہے کیونکہ جہد مسلسل میں زندگی کے کرب کا روحانی تجزیہ ہے۔

ان کی شاعری پر نشیب و فراز کا نمایاں پہلو ہے۔

ماضی کی تلخی اگر مضمحل ہے تو
دورِ حاضر شادمانی کا آسودہ لمحہ
جس میں فرصت کا عمل کارفرما ہے۔

مستقبل ایک تابناک آئینہ ہے جو ماضی و حال کے غموں کا مداوا ہے اور اس کی ایک ایک کڑی حسین خوابوں کی توانائی ہے اس لیے ایک کرن سے بھی جو روشنی فراہم ہو رہی ہے اس کو زندگی کے ہر گوشہ میں امانت کی طرح محفوظ کیے ہیں۔

اک صبحِ نو کی شوخ کرن کی اُمید میں
رکھتا ہوں ذہن و دل کا دریچہ کھلا ہوا

ان کے کلام میں فرسودہ رسم و رواج کی کڑیوں کا کوئی تسلسل نہیں ہے۔ ماحول کی الجھن سے کٹ جانے والے انسانوں کے لیے ہر لمحہ صرف ایک گزرتا ہوا لمحہ ہے لیکن حقیقی فن کار کے لیے یہی گزرتا ہوا لمحہ تاریخ کا سنہرا باب اور ابدی زندگی ہے۔ اس شعر میں عارف نے اپنے دل میں آنے والی روشنی اور تاریکی کا توازن روحانی آویزش کے ساتھ (صبحِ نو کی شوخ کرن کو) علامت نگاری سے واضح کیا ہے۔ کیونکہ اسی امید و عمل سے کشمکش تحلیل ہو کر تسکین میں ڈھل جاتی ہے۔ شاعر بحیثیت ایک فردِ معاشرے کی صداقتوں سے متصادم اور متاثر ہوتا رہتا ہے اور اسی عالم میں دل کے دریچے کھول کر یعنی جلوت سے خلوتِ خاص کی نمائندگی کرتا ہے اور روحانی ترشح سے سیراب ہو کر شعر کی تخلیق کرتا ہے اور اس کے بعد داخلی امکان سے نکل کر خارجی ماحول میں آتا ہے تاکہ عوامی سطح پر انسانی فطرت سے نزدیک تر ہو کر محوِ گفتگو ہو۔ باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ محور ہے جسے ناسمجھ لوگ اَنا اور ذاتی شخصیت کہتے ہیں۔ لیکن اس کی تہ میں مجاز اور حقیقت کی راہیں ہموار ملیں گی۔ اس سے شعری اہمیت ایک نقشِ معتبر ہو جاتی ہے اور یہی نقشِ حقیقی۔ باہمہ سے بے ہمہ ہونے کا اصرار کرتا ہے۔

اگر فرد اور سماج کا یہ ٹکراؤ نرم ہو کر پگھل نہ سکے تو اَنا کا پہلو ابھرتا ہے۔ لیکن یہاں دریچہ کھلا ہوا ہے۔ اَنا کے بجائے خاکساری ہے اور صبحِ نو کا خیر مقدم کتنا پاکیزہ اقدام ہے۔

**

نذیر محمد خاں رامپوری

ص ۹ کا بقیہ

فیصلہ کیا۔ اسی کو جراُت مندانہ کہتے ہیں۔ جو اُن کی کشادہ دلی، رواداری اور سیاسی سوجھ بوجھ کی نشاندہی کرتی ہے۔

ریاستی دور میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک نذیر محمد خان نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے میونسپل بورڈ کے ممبر رہے اور اس دوران پی۔ ڈبلوڈی کمیٹی کے چیرمین بھی چنے گئے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک اپنے خالہ زاد بھائی عبدالوحید خاں کے ساتھ کوئٹ انڈیا تحریک میں بھی شامل رہے۔

حالانکہ نذیر محمد خاں کی سیاسی سرگرمیاں ملک گیر نوعیت کی حامل نہ ہو سکیں مگر مقامی پیمانے پر انھوں نے قومی تحریک میں جس طرح حصہ لیا اُسے اور مادرِ وطن کی آزادی کے لئے اُن کی اور اُن کے خاندان کی جاں نثاری کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

محمد ضیاء الدین شمسی طہرانی
استاد شعبہ فارسی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

محمد عثمان عارف نقشبندی
ایک
جامع شخصیت

بیکانیر کا تاریخی پس منظر

سرزمین راجستھان کے علاقہ مارواڑ میں بیکانیر اپنی سادگی و پُرکاری اور تاریخی و تہذیبی رنگارنگی کے لیے مشہور ہے۔ سلاطین مغلیہ سے خصوصی روابط جو یہاں کے فرماں رواؤں کے رہے ہیں اُن سے اس شہر کی عظمت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راجستھان کے آثار قدیمہ کا سب سے بڑا مرکز اسی شہر میں قائم کیا گیا ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک مشہور ناگور شریف ہے جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح کے خلیفہ حضرت سلطان التارکین صوفی حمید الدین سوالی رح کا مزار مرجع خلائق ہے۔ صوفی صاحب حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی سے پہلے اور خواجہ معین الدین رح کے بعد واحد چشتی بزرگ ہیں جنھوں نے اپنے ملفوظات بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ ملفوظات کا نام "سرور الصدور" و "نور البدور" ہے۔ اس کا قلمی نسخہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ اس کا ایک نسخہ استاد محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی، سابق صدر شعبۂ تاریخ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذاتی کتب خانہ کی بھی زینت ہے۔ اسی ناگور شریف کے ایک گاؤں بھاٹو میں شیرانیوں کی ڈھانی ہے۔ جو پروفیسر محمود خاں شیرانی اور اختر شیرانی کا آبائی وطن ہے۔ محمود خاں شیرانی کے والد منشی محمد اسماعیل خاں دوسرے فرماں روا نواب وزیرالدولہ مرحوم کے عہد میں ٹونک آ گئے تھے اور وہیں کے ہو رہے۔

بیکانیر خواجہ معین الدین چشتی رح کے سلسلۂ عالیہ کا گہوارہ ہے بابا فرید شکر گنج مسعود رح سے لے کر ان کی بارہویں پشت کے ایک بزرگ حضرت محمود اجودھنی تاج تک کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے اسی طرح خواجہ فخرالدین محدث کے خلیفہ عبدالوہاب بیکانیری کا ذکر بھی تاریخوں میں محفوظ ہے۔

بیکانیر کا علمی اور روحانی ماحول

بیکانیر کے راجپوت فرماں روا نہایت فراخ دل غیر متعصب اور رواداروا قع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء و مشائخ کے قافلے اس طرف رجوع ہو گئے۔ خانوادۂ چشتیہ کے عظیم المرتبت بزرگ حضرت شیخ الاسلام بابا فرید شکر گنج مسعود رح کی ذات بابرکات آپ کی اولاد امجاد اور خلفائے عظام نے سرزمین بیکانیر کو رونق بخشی اور ان کے قدوم میمنت لزوم سے اس شہر کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا۔

یوں تو تصوف کے تقریباً سبھی سلاسل کے مشائخ یہاں رونق افروز ہوئے۔ مثلاً حضرت سید جہاب شاہ اور ان کے صاحبزادے سید حیدر شاہ نیزان کے صاحبزادے سید اکبر شاہ

سجادہ نشینانِ درگاہ حضرت شاہ ابوالمعالی کرمانی لاہوری مختلف اوقات میں بیکانیر میں قیام پذیر رہے مشہور سرحدی عالم حضرت مولانا عبدالرحمٰن پشاوری (المتخلص بہ ریحاؔن بیکانیر میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔ پیر سید لٰسین علی صاحب قادری، مولوی گل حسن صاحب، مولوی محمد حسن سلیمانی، الحاج غلام فرید صاحب خطیب، مسجد بیوپاریان وغیرہ نے بھی اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر بیکانیر کی سکونت اختیار کرلی۔ حضرت مولانا محمد فخرالدین صاحب مکرانوی فاضل دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف بھی تیس سال تک بیکانیر میں مسندِ درس و ارشاد کی زینت بنے رہے۔ مولانا حافظ محمد یوسف علیخاں عزیزؔ آگاہی ٹونکی جیسے پوری بھی مدتوں تک بیکانیر کو اپنی علمی، ادبی، روحانی تبلیغی و اصلاحی مساعی کی جولان گاہ بنائے رہے۔

خاکسار راقم الحروف بھی برسہا برس تک بیکانیر آتا جاتا رہا اور وہاں کے علمی ادبی اور روحانی و اصلاحی معاملات میں بقدر ذوق و ظرف حصہ لیتا رہا جس کا ذکر حضرت عارؔف نقشبندی نے اپنی کتاب "ذکر محبوب" (ص ۷) میں کیا ہے۔ بیکانیر کے سلسلے میں اور حضرت عارؔف کے بارے میں میری معلومات "دیدہ" کا درجہ رکھتی ہیں "شنیدہ" کا نہیں حضرت مولانا ہاشم علی صاحب جھنجھنوی بھی اکثر اوقات اور حضرت مولانا عبدالحمید صاحب ناگوری سلیمانی بھی کم سے کم سال میں دو بار اس علاقے کو سنبھالتے رہے ہیں اور اپنے روحانی اور نورانی ارشادات سے یہاں کے باسیوں کو مستفید کرتے رہے ہیں ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

روحانی کیفیات و واردات کے اس ہماہمی کے ماحول میں ایک نادرہ روزگار شخصیت جو سلوک نقشبندی مجددی کا جیتا جاگتا نمونہ تھی بیکانیر میں رونق افروز ہوئی جس کا نام نامی سید جماعت علی شاہ تھا۔ آپ علی پور (سیدان) کے جو آجکل پاکستان میں ہے، رہنے والے تھے۔ عالم متبحر، صوفی صافی پیر کامل اور حافظ قرآن شریف تھے۔ آپ کئی بار حج بیت اللہ کے شرف سے مشرف ہوئے تھے۔ سرزمین ہند سے سرزمین حجاز اور تقریباً تمام عالم اسلامی میں آپ کا سلسلۂ رشد و ہدایت پھیلا ہوا تھا اور کیوں نہ پھیلتا یہ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کی برکت ہے جو اپنے ہر مبتدی کو دوسرے سلاسل کے منتہی کا ہمسایہ بنا دیتی ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ ملا جامی جیسا عارف، عالم اور شاعر اپنی مثنوی "تحفۃ الاحرار" میں کہہ رہا ہے۔

اوّل یا آخر ہر منتہی، منتہی از جیب تمنا تہی شہ ؛

حضرت سید جماعت علی شاہ صاحبؒ علی پوری دنیائے اسلام میں امیر ملت کے خطاب سے جانے پہچانے جاتے ہیں دینی حمیت اور اسلامی و روحانی اقدار کی حمایت میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ عشق رسولؐ آپ کی زندگی کا سرمایہ تھا۔ علامہ اقبال کے اس شعر کا حقیقی مصداق تھے۔

ہر کہ عشق مصطفٰے سامانِ اوست
بحر و بر در گوشہ دامانِ اوست

عارؔف صاحب اسی بزرگ کی نظر کیمیا اثر سے متاثر ہوئے اور ——— کندن بن گئے۔

آہن کہ بہ پارس آشنا شد
فی الفور بصورتِ طلا شد

عارؔف صاحب کے والد بزرگوار سلسلۂ چشتیہ نظامیہ سلیمانیہ سے منسلک رہے۔ تونسہ شریف کے سجادہ نشین حضرت خواجہ حامد صاحب کے مرید تھے۔ لیکن عارؔف صاحب کے حصہ میں نقشبندیہ مجددیہ کی نسبت روحانی آئی ہے۔

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

عارؔف صاحب کا خاندان

تاریخ بیکانیرؒ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیکانیر

ہاں رواؤں نے زمانۂ قدیم سے بیکانیر کی آبادی کو مختلف
میں تقسیم کیا تھا اور محلوں کی تقسیم میں صنعت و حرفت
پر نظر رکھا تھا۔ مثلاً بیکانیر میں ایک محلہ کا نام ہے محلہ
ان لفظ اوستان جمع ہے اوستا کی۔ اوستا کلاسکی فارسی میں استاد
ہتے ہیں۔ رومی کا شعر ملاحظہ ہو ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

اسی طرح ایک محلہ کا نام محلہ چون گران ہے۔ چون مارواڑی
ن میں چونے کو کہتے ہیں۔ یہ ان صناعوں اور فنکاروں کا
لہ تھا جس کے باسی چونے سے عمارت سازی اور صناعی کا
م کرتے تھے۔ چون گری سے مراد صرف عمارت سازی نہیں
ہ نقش گری اور صناعی بھی ہے۔ یہی نقش گری اور صناعی
ن گروں کی جماعت کا طرۂ امتیاز ہے۔ قدیم آثار اور دستاویزات
لتے ہیں کہ جماعت غوری و غزنوی سلاطین کے عہد میں غزنین
سے یہاں منتقل ہوئی۔ بیکانیر کے فرماں رواؤں کی ہنر نوازی
ور صنعت دوستی نے اس جماعت کو بیکانیر میں بسا دیا۔ چنانچہ
آج بھی بیکانیر کے راجاؤں کے محلوں میں (مثلاً لال گڑھ، جوناگڑھ
وغیرہ میں) اور سیٹھ ساہوکاروں کی حویلیوں میں چون گروں اور
اوستوں کی جماعت کے نقاشی و صناعی کے نمونے ان جماعتوں کے
کمالات کے شاہد عدل ہیں اور ان کے خون جگر کا بیّن ثبوت ہیں۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر

نقش گروں اور صناعوں کے اس محلہ میں عارف صاحب
نے آنکھ کھولی۔ آپ ۵ر اپریل ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ
کے والد ماجد علامہ الحاج محمد عبداللہ بیدل نے آپ کا نام
محمد عثمان رکھا۔ بیدل صاحب نے راقم سطور سے ایک ملاقات
میں بتایا کہ مولوی بادشاہ حسین رعنا نے آپ کی تاریخ ولادت
عیسوی سن میں "فضیلت تبار" = ۱۹۲۳ء کے مادہ سے نکالی مگر
وہ قطعہ تاریخ .... دستیاب نہیں۔

راقم سطور نے فارسی میں فی البدیہہ قطعہ کہا اور حضرت رعنا کا
مادہ تاریخ ضم کر دیا۔ چوں کہ بیدل صاحب خود اعلیٰ پایہ کے
شاعر تھے۔ اور اس لیے شاعر نواز بھی۔ چنانچہ خاکسار کو بہت داد
دی اور دعائیں بھی دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر کی تلاش کی داد
شاعر ہی دے سکتا ہے۔ بقول ابو طالب کلیم اصفہانی ——

کس بجز شاعر نمی فہمد تلاش ما کلیم
شعر فہمان جملہ صیاد اند صید بستہ را۔

خاکسار کا فی البدیہہ کہا ہوا قطعہ حسب ذیل ہے۔

"خوشا خانۂ بیدل نیک خو
کہ پیدا شد آں پور طاعت شعار
در اشمس محمدؐ بہ عثمانؓ بود
یکے شد وزیرؓ و دگر شہریار
چہ قطعہ شمسی خوش سخن
زہے فکر رعنائے عالی وقار
بہ سال مسیحی ز میلاد او ندا داد ہاتف "فضیلت تبار" (۱۹۲۳ء)

حال ہی میں خاکسار نے آپ کی تاریخ ولادت پر عیسوی
سن میں سجع کی صورت میں ایک مصرع بھی کہا ہے جس میں محمد
اور عثمان کا تلازمہ شاید ناظرین کو پسند آئے۔ گلِ خورشید محمدؐ
عثمانؓ ۱۹۲۳ء۔

اس سجع کی شان نزول یہ ہے کہ علامہ اقبال کے
بین الاقوامی سمینار میں افتتاح کے لیے ہماری یونیورسٹی کے
وائس چانسلر عالی جناب سید ہاشم علی صاحب نے آپ کو دعوت
دی بعض احباب نے فرمائش کی کہ میں کچھ لکھوں تاکہ اس کا
طغرا بنوا کر یونیورسٹی کی جانب سے عارف صاحب کو پیش کیا
جائے۔ آپ کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ بہر حال وہ طغرا آپ
کا آج بھی انتظار کر رہا ہے اور زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

دیدہ لبریزم سراپا انتظار کیستم

بہر حال! آپ نے جس محلہ میں آنکھ کھولی آج وہاں کا

ہر لڑکا اور ہر لڑکی دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہے ماسٹروں، ڈاکٹروں، انجینیروں، وکیلوں اور گورنمنٹ آفیسروں کی کمی نہیں ہے۔ ہر شخص علم و ادب کا دیوانہ نظر آتا ہے اور اس فیض تعلیم کی ابتدا خود آپ کے والد ماجد علامہ بیدل سے ہوئی۔ وہ ریاست کے مسلمانوں میں پہلے اور ہندو مسلمانوں میں دوسرے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ اس علاقے کے پہلے گریجوئٹ اور پہلے مسلمان ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تھے۔ مسلمانوں میں تعلیم کا سلسلہ حضرت بیدل ہی کے ذریعہ شروع ہوا۔ انھوں نے اپنے گھر میں ہندو مسلمان بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ حضرت بیدل قانون کے ماہر اور انگریزی فارسی کے بڑے عالم تھے۔ شاعری میں حضرت بیخود دہلوی، جانشین داغ کے شاگرد رشید تھے۔ بیخود کہتے تھے کہ "بیدل تم نے مارواڑی ہوکر دہلی کی زبان پر ڈاکہ ڈالا ہے۔" عارف صاحب کے بڑے بھائی استاد محمد یوسف راسخ، ادیب فاضل و منشی فاضل بلا کے ذہین و طباع آتش بیان مقرر اور چوٹی کے شاعر تھے۔ آپ کے ایک اور بڑے بھائی محمد سلیمان صاحب مضطر ہیں جو اردو انگریزی اور فارسی پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مسدس حالی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ کلاسکی موسیقی کے عملی اور نظری حیثیت سے ماہر ہیں۔ والد ماجد بیدل صاحب کو بھی موسیقی میں نظری طور پر دخل تھا۔ شہر کے بڑے بڑے کلاونت آپ کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔

آپ نے اس یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ اور ایل۔ایل۔بی۔ کی ڈگریاں امتیاز کے ساتھ حاصل کیں اور سرسید کی زندگی اور اس مادر درسگاہ سے خدمت خلق کا سبق سیکھا۔ آپ نے تعلیم سے فراغت پاکر اپنے وطن بیکانیر میں وکالت شروع کی اور ایک کامیاب وکیل کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے۔ آپ وکالت سے وزارت تک اپنی مادر درسگاہ کو نہ بھولے اور اس کی صوری و معنوی خدمت کو اپنے لیے سرمایۂ سعادت سمجھا۔

آنجہانی اندرا گاندھی کے دور وزارت عظمیٰ میں آپ برابر مسلم یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل رہے ۱۹۸۰ء میں اقلیتی کردار کی بازیابی کے لیے آپ نے خاموش خدمت کی۔ اندرا جی کے ذہن کو اقلیتی کردار دینے کے لیے ہموار کرنا آپ کی حکمت عملی اور دانائی کی روشن مثال ہے۔

علمی و ادبی خدمات

آپ ۳۵۔۴۰ برسوں میں بیکانیر اور کل راجستھان میں اردو شعر و ادب کی خدمت کے لیے سمینار، اردو کانفرنسوں اور کل ہند مشاعروں کی ترتیب و انعقاد کے لیے ایک سرگرم خدمت گزار اور فعال رکن کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔ انجمن ترقی اردو شاخ بیکانیر کے جنرل سکریٹری۔ صوبائی انجمن ترقی اردو راجستھان (جے پور) اور مرکزی کل ہند انجمن ترقی اردو (دہلی) کے ممبر رہے۔ راجستھان ساہتیہ اکاڈمی (اودے پور) کے ممبر رہے۔ اردو اکاڈمی راجستھان۔ پارلیمینٹرینس اردو کمیٹی دلی نیشنل اردو رائٹرس ایسوسی ایشن کے نائب صدر۔ راجستھان ساہتیہ اکاڈمی کے رسالے "نخلستان" کی مجلس ادارت کے رکن اور ماہنامہ "شعلہ و شبنم" (دہلی) کے معاون مدیر رہے۔

تخلیقات و تصنیفات

(۱) "نذر وطن" (قومی اور وطنی شاعری ۱۹۷۶ء) (۲) "عقیدت کے پھول" (حمد و نعت اور منقبت کا مجموعہ ۱۹۸۱ء) (۳) "قلم کی کاٹ" (شعری مجموعہ ۱۹۸۱ء۔) (۴) "ذکر محبوب" (بیکانیر کے صوفی اور ولی پیر محبوب بخش چشتی پر ایک متصوفانہ کتاب ۱۹۸۰ء) (۵) "نور زندگی" (شعری مجموعہ ۱۹۸۳ء) (۶) "لمحوں کی دھڑکن" (۱۹۸۵ء غزلوں کا دوسرا مجموعہ) (۷) "راجستھان کے موجودہ اردو شاعر" (پروفیسر پریم شنکر سریواستو کی شرکت میں اس کتاب کو مرتب کیا) (۸) "دامان باغبان" (راجستھان کے مدرس شعرا کی حیات و شاعری پر محکمۂ تعلیمات کی شائع کردہ کتاب کی تصنیف میں شریک غالب رہے)۔ نظموں کا ایک اور مجموعہ

"فکرواحساس" بھی ترتیب واشاعت کی منزلیں طے کر رہا ہے نعتوں اور منقبتوں کا ایک اور مجموعہ اور غزلوں کا تیسرا مجموعہ زیرترتیب ہے۔

سیاسی خدمات

۱۹۷۰ عیسوی میں راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ حکومت ہند کے نمائندے کی حیثیت سے یو۔این۔او۔ کے ۲۶ ویں سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔ حکومت ہند کے خیرسگالی وفود میں دوبار بہ حیثیت رکن اور تیسری مرتبہ بہ حیثیت لیڈر سعودی عرب کا دورہ کیا۔ ماسکو اور بغداد اور کنیڈا غیر ممالک کے لیے مختلف وفود میں شرکت کی آپ کے شعری مجموعہ" نور زندگی" پر راجستھان اردو اکاڈمی نے اور" ندر وطن" پر راجستھان ساہتیہ اکیڈمی نے آپکو انعامات واعزازات سے نوازا۔

آنجہانی اندراگاندھی آپ کی بڑی عزت کرتی تھیں اور آپ کی قومی وملی خدمات کو ہمیشہ سراہتی رہیں۔ قومی وملکی مسائل میں وہ آپ کی رائے گرامی کو نہایت صائب اور وقیع سمجھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مدت دراز تک ان کی حیات میں وزارت کے منصب پر فائز رہے جو آپ کو نہ صرف ایک سیاست داں بلکہ دانشور سمجھتی تھیں اور اہم امور میں آپ سے مشورہ کرتی تھیں۔ آپ کا ان کے ساتھ ہمیشہ وفادارانہ تعلق قائم رہا۔ ان کے عہد زوال میں بھی آپ نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

آج کل آپ ہندستان کے سب سے بڑے صوبے اترپردیش کے نامور گورنر ہیں سیاسی سرگرمیوں کی ہماہمی کے باوجود آپ نے شعروشاعری اور مادردرسگاہ علیگڑھ سے رشتہ نہیں توڑا۔ حال ہی میں آپ نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی ڈیوڈ سوسائٹی کو ایک گرانقدر وظیفہ سے نوازا اور مختلف طریقوں سے آپ نے ڈیوٹی سوسائٹی کی مدد کی ہے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کے اراکین نے آپ کو اپنا خصوصی رکن اور سرپرست منتخب کیا ہے۔ آپ ڈیوٹی سوسائٹی کو اس درسگاہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی تصور کرتے ہیں اور اس کی ہر خدمت کے لیے جان ودل سے تیار رہتے ہیں۔ بلا شبہ یہ ہندستان میں واحد سوسائٹی ہے جو باصلاحیت طلبہ کی معاشی مدد کرتی ہے۔ ہمارے بہت سے ذہین اور باصلاحیت طلبہ عسرت وتنگدستی کی وجہ سے پڑھ نہیں پاتے۔ یہ سوسائٹی اقتصادی طور پر ان کی مدد کرتی ہے اور بدرجہ اتم ان کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

حواشی

۱۔ ناگور کے متعلق ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا مضمون Nagaur A Forgotten Kingdom مطبوعہ۔ دکن کالج ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بلیٹن پونہ، نومبر ۱۹۴۰ء۔

۲۔ تاریخ مشائخ چشت از پروفیسر خلیق احمد نظامی صفحہ ۱۴۸ ۔ حاشیہ مطبوعہ اشوکا پریس دہلی ۱۹۵۳ء۔

۳۔ خاتم سلیمانی' حالات وملفوظات خواجہ سلیمان تونسوی از مولوی الہ بخش بلوچی خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور ۱۳۲۵ھ

۴۔ تاریخ مشائخ چشت ص ۵۲۱ از پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

۵۔ تحفۃ الاحرار از ملا عبدالرحمن حاجی مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

۶۔ ملاحظہ ہو تاریخ بیکانیر اور کرنل" ٹاڈ" کی کتاب متعلق بہ راجستھان

۷۔ مثنوی رومی مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

۸۔ کلیات اشعار کلیم مطبوعہ ایران۔

۹۔ "ذکر محبوب" عارف نقشبندی۔

اختر لکھنوی
ریڈیو پاکستان۔ کراچی

غزل

ملتے ہیں ہر قدم پہ نشاں تیرے شہر میں
جیسے سبھی ہوں تشنہ لباں تیرے شہر میں

بزمِ طرب سے اُٹھ کے کبھی دیکھ اک نظر
ہر گھر سے اُٹھ رہا ہے دھواں تیرے شہر میں

ہنگامِ گیر و دار کہ سامانِ رنگ و بو
کیا کچھ نہیں ہے جانِ جہاں تیرے شہر میں

اوروں کو گر ملی ہو تو یہ اور بات ہے
ہم کو مگر ملی نہ زباں تیرے شہر میں

دشنام ہو کہ سنگ ملا ہر قدم پہ کچھ!
ہم کو تو سود بھی ہے زیاں تیرے شہر میں

ہشیار کر رہا ہے گجر جاگتے رہو
اے صاحبانِ فکر و نظر جاگتے رہو

دشتِ شبِ سیاہ میں سُنتے ہیں شب پرست
روکیں گے کاروانِ سحر جاگتے رہو

ظلمت کہیں نہ کردے اُجالے کو داغدار
لے کر چراغِ دیدۂ تر جاگتے رہو

سوئے نہیں کہ ڈوب گئی نبضِ کائنات
بوجھل ہو لاکھ آنکھ مگر جاگتے رہو

کیا جانیے کہ کرنے لگیں شعلے رقص کب
ہر ذرّہ بن چکا ہے شرر جاگتے رہو

لو چاندنی بھی چھن گئی گہنا رہا ہے چاند
ظلمت کا بڑھ رہا ہے اثر جاگتے رہو

خوابیدہ اپنے چاہنے والوں کو دیکھ کر
ممکن ہے لوٹ جائے سحر جاگتے رہو

شب خوں کی فکر میں ہیں ثنا خوانِ تیرگی
اخترؔ عزیز جاں ہے اگر جاگتے رہو

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اُردو، گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور

نظمیں

خضر کی محرومی

مثل اقبال کے مجھ کو بھی ملیں خضر اگر
میں یہ پوچھوں کہ بتاؤ تو جہاں کے رہبر!
لطف دے سکتی ہے کیا دہر میں ایسی بھی حیات؟
جس میں ہر وقت کھٹکتا نہ رہے خارِ ممات
فلسفہ زیست کا اقبال کو سمجھا ڈالا
موت کے خوف سے کیا تم کو پڑا ہے پالا؟
زندگی کیسی ہے اے خضر! تمھیں کیا معلوم
تم تو ہو موت کے اندیشے سے یکسر محروم

حصار

پھنس گیا ہے "میں" کے گھیرے میں دماغ
مل نہیں پاتا تصوّر کو فراغ
ہو گیا ہے اس کی قدغن سے یہ حال
جا نہیں سکتا کسی جانب خیال
اس کے باعث فہم ہے مجبور سی
قوتِ افکار ہے محصور سی
ٹوٹ جائے کاش اس "میں" کا حصار
ذہن کو میرے ملے راہِ فرار

احساسِ برتری

جب بھی ہوا یہ خوف مرے دل میں جاگزیں
چھوٹا نہ میرے دوست سمجھ لیں مجھے کہیں
فوراً ہی میں نے ایسی نکالی کوئی سبیل
احباب کو ملے مری عظمت کی اک دلیل
اکثر سخنوری کو سہارا بنا لیا
شاعر کی حیثیت سے بڑا پن جتا دیا
کہتے ہیں سچ ہی فطرتِ انساں کے جوہری
احساسِ برتری بھی ہے احساسِ کمتری

عمل تک؟

سو قسم کے خدشات سما جاتے ہیں دل میں
آتا ہے مرے سامنے جس وقت کوئی کام
آگے نہیں بڑھتا میں تفکّر کی حدوں سے
افکار بچھا دیتے ہیں ہمّت کے لیے دام
خطرات کا احساس عزائم کا ہے دشمن
عقدوں کو یہ لیجا نہیں سکتا کبھی حل تک
آغاز میں انجام نظر آتا ہو جس کو
وہ فکر کو پہنچائے گا کس طرح عمل تک

ڈاکٹر وضاحت رضوی
نیو حنفی بلڈنگ۔ دیوان بازار
گورکھپور

اردو ناولٹ ایک جائزہ

اردو فکشن پر نظر ڈالنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں ضخیم ناولوں کی بہ نسبت ناولٹ (Novelette) زیادہ لکھے جا رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جہاں فسانۂ آزاد، گئودان لہو کے پھول، خدا کی بستی، اداس نسلیں، آگ کا دریا، ایک قطرہ خون وغیرہ ضخیم ناول تخلیق کیے گئے وہیں دادر پل کے بچے، ندی، مرمر خوں، بغیر عنوان کے، کہیں گاہ میگھ ملہار، ایک چادر میلی سی، مدار، نغمے کا سفر، چائے کے باغ، ہاؤسنگ سوسائٹی سیتا ہرن، آتشِ رفتہ، چہرہ بہ چہرہ رو برو، مجو بھیا، چراغ تہہِ داماں، ندی، نشیب، دو بوند پانی، رات چور اور چاند، گھوا، مٹھی بھر دھوپ، ضبط کی دیوار، فاختہ، دربدری جیسے ناولٹ وجود میں آئے۔ جنھوں نے کافی مقبولیت حاصل کی۔

'ناولٹ' (Novelette) عام قاری کے لیے جو اس صنف سے بے بہرہ ہے، لازمی طور پر کچھ تجسس ضرور پیدا کرتا ہوگا کہ ادب میں ناولٹ بطور صنف کب سے وجود میں آیا۔ اس کی ابتدا کب اور کہاں سے ہوئی۔ دراصل ناولٹ (Novelette) انگریزی لفظ ہے۔ جس کے معنی مختصر ناول یا ناولچہ ہے۔ انگریزی لفظ ناول' لاطینی کے (Novella) اطالوی لفظ (Novela) کی اساس پر انگریزی لفظ ناولٹ وضع کیا گیا ہے۔ انگریزی ادب میں ناولٹ اطالوی لفظ (Novella) سے اخذ کیا گیا ہے۔ ناول کے ساتھ ہی ساتھ جو ناول چھوٹے کینوس پر لکھے گئے ان کے لیے (Short Novel' Novelette Small Novel اور' Mini Novel کے الفاظ وضع کیے گئے بحیثیت صنفِ ادب ناولٹ کا تذکرہ نہیں ملتا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا۔ (Encyclopeadia Britanica۔ میں ناول سے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے مگر ناولٹ کا الگ سے کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ناول کی ضمن میں ناولٹ کو ضخامت کے لحاظ سے منفرد مقام دیا گیا ہے۔ انگریزی ادب میں ناولٹ کا استعمال سب سے پہلے ڈی' ایچ' لارنس نے کیا۔ البتہ امریکی ادب میں ناولٹ کا وجود بطور علٰحدہ صنفِ ادب ہے' مگر اطالوی اور جرمنی (Novela اور Novelle) سے ہی ماخوذ ہے۔ لیکن با قاعدہ اور با ضابطہ اس کی الگ سے کوئی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کولمبیا (Encyclopeadia columbia) میں ناولٹ کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے اسی مفہوم میں ناویلا کو واضح کیا گیا ہے ناولٹ اور ناویلا سے متعلق جو بھی تعریفیں کی گئی ہیں غور و فکر کرنے پر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی ادب میں ناولٹ کا وجود تو ضرور ہے مگر وہاں اسے صنفِ ادب تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ مختصر ناولوں کے لیے اصطلاحاً یہ لفظ رائج ہوا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اردو میں

ناولٹ مغربی ادب کے توسط سے آیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر ناقدین سجاد ظہیر کی تخلیق "لندن کی ایک رات" کو اردو کا پہلا ناولٹ قرار دیتے ہیں۔ دراصل 'لندن کی ایک رات' کے فن اور ٹکنیک اور ہیئت کو دیکھنے کے بعد ہی ناقدین کا ذہن ناولٹ کی طرف مبذول ہوا۔ پھر اس طرح کے مختصر ناولوں کو ناولٹ سے موسوم کیا جانے لگا۔ لیکن اگر ہم اس کی جڑوں کی طرف توجہ مرکوز کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے یہاں لندن کی ایک رات سے قبل، غیر شعوری طور پر ایسی تخلیقات وجود میں آچکی تھیں جو ناولٹ کے فن پر قدرے پوری اترتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 'مراۃ العروس' کے خالق ڈپٹی نذیر احمد کی تخلیق 'ایامیٰ' کو نئی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا ناولٹ کہا گیا ہے۔ 'لندن کی ایک رات' سے قبل جو ناولٹ غیر شعوری طور پر تخلیق کیے گئے ان میں رتن ناتھ سرشار کے 'ہشو'، 'پی کہاں'، 'کڑم دھم'، عبدالحلیم شرر کے 'بدرالنساء کی مصیبت'، راشد الخیری کے 'محبوب خداوند'، 'ستونتی'، نیاز فتح پوری کے 'ایک شاعر کا انجام'، 'شہاب کی سرگزشت'، مجنوں گورکھپوری کے 'گردش'، 'سوگوار شباب'، کشن پرساد کول کا 'شیاما' اور پریم چند کے 'روٹھی رانی' و 'بیوہ' بطور خاص ہیں جو کسی حد تک ناولٹ کے فن پر پورے اترتے ہیں۔

اب بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس نئے فارم پر ناقدین و محققین کی نگاہیں مرکوز کیوں نہیں ہوئیں؟ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہند و پاک کے بعض مدیروں نے اپنے جریدوں کے ضخیم ناولٹ نمبر شائع کرکے ناقدین و محققین کو اس صنف پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا۔ فن کاروں کی اکثریت نے اس کی تکنیک اور خصوصیات کو پورے طور سے سمجھ کر برتنے کی کوشش نہیں کی۔ بس افسانے کی طوالت اور ناول کے اختصار کو 'ناولٹ' کا نام دیدیا۔ لیکن ناولٹ کی یہ تعریف ہمہ گیر اور مکمل نہیں۔ ایک تجرباتی صنفِ ادب کو جانچنے کے لیے سماجی اور عمرانی جمالیات اور ہیئت کو بدلتے ہوئے سماجی حالات جدید نظریات و رجحانات کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ناول اور ناولٹ میں کیا فرق ہے یا کیا فرق ہونا چاہیے کیونکہ اب تک ناولٹ کی کوئی تعریف متعین نہیں کی گئی اور نہ ہی اس فرق کو واضح کیا گیا جو ناول اور ناولٹ کے درمیان ہوتا ہے مزے کی بات یہ ہے کہ اس صنفِ ادب پر کہیں تفصیل سے بحث بھی نہیں ملتی۔ پھر بھی کثرت سے ناولٹ کا لفظ بیشتر فنکار و نقاد استعمال کر رہے ہیں۔ دراصل ناولٹ اسم تصغیر ہے ناول کا جس کے معنی ہی ہیں مختصر ناول اور نقادوں میں سب سے پہلے علی عباس حسینی نے اس کے لیے "ناولچہ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

آج ادب میں ناولٹ ایک مقبول صنف کی شکل میں ترقی کر رہا ہے۔ جو ہیئت کے لحاظ سے ناول کے بہت قریب ہے، لیکن ضخامت میں بہت کم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا اختصار ہی اس کی مقبولیت کا سبب ہو۔ اب یہاں بنیادی سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا ضخامت کا فرق ہی ناولٹ کو ناول سے علیحدہ کرتا ہے اور اگر ایسا ہے تو اسے مختصر ناول نہ کہہ کر کس ضرورت کے پیش نظر ناول سے مختلف سمجھتے ہیں اور ادب کی ایک مقبول صنف قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ علیحدہ صنفِ ادب ہے تو اس کا فن کیا ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اس بحث کو آگے بڑھانے سے قبل اس متنازعہ فیہ صنفِ ادب سے متعلق ادبی حلقوں کے خیالات و نظریات کو سمجھ لینا مفید ہو سکتا ہے۔ نقادوں اور ادیبوں کے نظریات کو دیکھتے ہوئے ہم انھیں تین حلقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک حلقہ اسے الگ سے کوئی صنف ماننے سے منکر ہے تو دوسرا حلقہ ناول اور افسانے کے درمیان کی شے مانتا ہے اور تیسرا اسے ایک علیحدہ اور منفرد صنف کا درجہ دیتا ہے۔ اگر صفحات یا ضخامت کی بنا پر ناولٹ کو ناول اور افسانے سے ممیز کرتے ہیں تو ہمارے نقادوں نے وہ خطِ امتیاز

(Dividing Line) کیوں نہیں کھینچی جو ناول و ناولٹ اور طویل افسانے و ناولٹ میں ضروری ہے ناولٹ میں صرف ناول کا بچہ سمجھ لینا یا اس کی تلخیص سمجھنا سراسر غلط ہوگا۔ کیونکہ ناول کا دائرہ عمل محدود نہیں' ایسے بھی ناول وجود میں آچکے ہیں جو کافی ضخیم ہیں بعض تو کئی جلدوں پر مشتمل ہیں' اور ایسے بھی ناول مل جائیں گے جن کی ضخامت ایک سو صفحات سے بھی کم ہے اسی طرح افسانہ میں بھی ہمیں مختصر اور طویل ترین' دونوں قسم کے مل جاتے ہیں۔

ناولٹ ادب کی واحد صنف ہے جس کے متعلق آج بھی ناقدین و محققین صاف صاف کچھ کہنے سے کتراتے نظر آتے ہیں۔ کچھ مخصوص ادیبوں کے نظریات حوالے کے طور پر یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ادیبوں نے بہت اچھے اور اہم ناولٹ تصنیف کیے ہیں جو مقبولِ عام بھی ہوئے ہیں۔ اب ذرا نقادوں کی طرف ایک نظر ——

پروفیسر قمر رئیس فرماتے ہیں کہ " ناول میں زیادہ بڑے کینوس پر زیادہ کرداروں اور بڑے سماجی مسائل کو لے کر زندگی کی نقاشی ہوتی ہے جبکہ ناولٹ میں موضوع ، مواد اور فضا محدود رہتی ہے ......

افسانہ اور ناولٹ میں فرق کرنا یا دونوں کی شناخت متعین کرنا نسبتاً آسان ہے افسانہ میں سارا زور تاثر کی وحدت کے قیام کا ہوتا ہے واقعات اور کرداروں کے صرف وہی پہلو دکھائے جاتے ہیں جو کسی ایک تاثر کی وحدت اور شدت ...... میں ممد و معاون ہو سکیں ..... جبکہ ناولٹ میں فنی رویہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔" ڈاکٹر ظ۔ انصاری اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں: ——

" زیادہ وسیع منظر' پیچیدہ منظر نامہ اور کرداروں کی کثرت کے پس منظر سے ابھرنے والے ہیرو ناول کا موضوع ہوتے ہیں۔ لفظ ناولٹ اسم تصغیر ہے ناول کا اور وجود میں آیا ناول کے ساتھ نہ وہ لانگ شارٹ اسٹوری ہے نہ ناول کا بچہ دونوں کے درمیان وہ ارتکاز نظر اور منشائے مصنف کا ایک فنی ترجمان ہے۔ مصنف کی نگاہ اور نیت کا فرق ہے۔"

اس سلسلے میں وارث علوی کا خیال ملاحظہ ہو' فرماتے ہیں:

" ناولٹ کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ وہ چیز ناول سے مختصر ہوتی ہے۔ لیکن ناول' ناولٹ اور مختصر افسانہ چونکہ ابھی تک اپنا کوئی قطعی فارم پیدا نہیں کر سکے اس لیے ان کی تعریف ممکن نہیں۔"

وزیر آغا کا خیال ہے کہ:۔ "صنف ناولٹ خود ہی ایک مسئلہ ہے بطور صنفِ ادب کے تا حال کھٹائی میں ہے اور اس کی حدود کا تعین کرنے سے پہلے ایک لحظہ کے لیے رکنے اور سوچنے کی اشد ضرورت ہے۔"

خواجہ احمد عباس ناول' ناولٹ اور افسانہ سے متعلق اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " ناول اور ناولٹ میں بظاہر فرق ان کے حجم سے ہوتا ہے۔ اگر تقریباً سو صفحہ کے اندر اندر ایک کہانی آجائے تو وہ ناولٹ کہلاتی ہے مگر میرے نزدیک ناول اور ناولٹ میں کوئی خاص فرق نہیں سب میں کردار نگاری ہوتی ہے' حادثات اور واقعات ہوتے ہیں کوئی مطلب یا موضوع بھی ہوتا ہے۔"

البتہ 'ایک چادر میلی سی' کے خالق راجیندر سنگھ بیدی کا خیال کسی حد تک ٹھیک لگتا ہے وہ دونوں میں فرق کرتے

ہوئے لکھتے ہیں ۔

" ناول نسبتاً بڑا ہوتا ہے ۔ ناولٹ' ناول
کی طرح اِدھر اُدھر بکھر جانے کی اجازت نہیں
دیتا ۔"

عصمت چغتائی بڑی بیباکی سے اسی بات کو اپنے انداز میں کہتی ہوئی لکھتی ہیں :

" ناول ایک گروہ' ایک خاندان ایک ملک
کے باشندوں کے بارے میں ہوتی ہے اور
ناولٹ میں کم کردار حصہ لیتے ہیں (شائد لکھ سکتی
ہوں بتا نہیں سکتی) جو تحریر طویل ہو گئی انھیں
ناول سمجھ لیا اور جو صفحات میں کم رہی وہ ناولٹ
بن گئی ۔"

آخر میں ان تمام مباحث خصوصیات اور متفرقات کو سامنے رکھ کر اس نتیجہ پر پہونچا جا سکتا ہے کہ طویل افسانے اور ناول کے مقابلے میں ناولٹ ایک الگ صنف ادب ہے جس کی تعریف یوں ترتیب دی جا سکتی ہے ــــ " ناولٹ زندگی یا سماج کے کسی اہم مسئلے اور اس کے خاص پہلوؤں کا مختصراً جائزہ لیتا ہے جس کی اپنی الگ تنظیم ہوتی ہے جو ناول سے قدرے مختصر مگر طویل افسانے سے زیادہ طویل اور تفصیلی ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ناولٹ پر طویل افسانے یا پورا ناول ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے ۔ بہرکیف جو چیزیں ناولٹ کو ناول اور طویل افسانے سے منفرد کرتی ہیں وہ ہیں "مسئلہ" اور "دائرۂ عمل" ناول میں زندگی اور سماج کے مختلف النوع اور پُرپیچ مسئلے ہوتے ہیں جس کے باعث اس کا کینوس وسیع ترین ہوتا ہے اور ناول کا خالق زندگی کے گوناگوں مسائل کو طے کر کے اس کی ترجمانی کرتا ہے اس کے برعکس افسانہ اور طویل افسانے میں کسی ایک مسئلہ کا ایک گوشہ ہی پیش کیا جاتا ہے جب کہ ناولٹ میں کسی اہم مسئلہ کے خاص پہلوؤں کی ترجمانی بڑی چابکدستی اور باریک بینی سے کرنی پڑتی ہے ظاہر ہے تخلیقی توانائی پھیلاؤ سے نہیں بلکہ گہرائی سے اظہار پاتی ہے یہ گہرائی شدت تاثر کو جنم دے کر زندگی پر ایک مخصوص اور انفرادی زاویے سے روشنی ڈالتی ہے یہی ناولٹ کا فن ہے ۔

اب ناولٹ کے عناصر کا جائزہ لینا ہوگا کہ اس کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو ناول کے لیے وضع کیے گئے ہیں یا اس سے مختلف ۔ ظاہر ہے کہ اجزائے ترکیبی تقریباً وہی ہونگے مگر برتاؤ (Treatment) اور تکنیک کے لحاظ سے فرق ضروری ہے ۔ بنیادی طور پر ناولٹ کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ کردار' مسئلہ یا موضوع' زبان و بیان اسلوب اور تکنیک کا ہونا اشد ضروری ہے اور ان اجزا کو یکجا کرنے پر اس کی اپنی تنظیم بنتی ہے ۔

مختصراً یہ کہ اس مشینی دور میں جب آدمی کو کہیں جائے پناہ نہیں ہے اور ہر وقت تناؤ اور ذہنی انتشار کا سامنا ہے ایسی صورت میں مختصر افسانہ جہاں تشنگی پیدا کرتا ہے اور ضخیم ناول پڑھنے کی فرصت نہیں ہے ۔ ایسے میں ناولٹ (Novelette) کا مستقبل روشن و تابناک نظر آتا ہے ۔

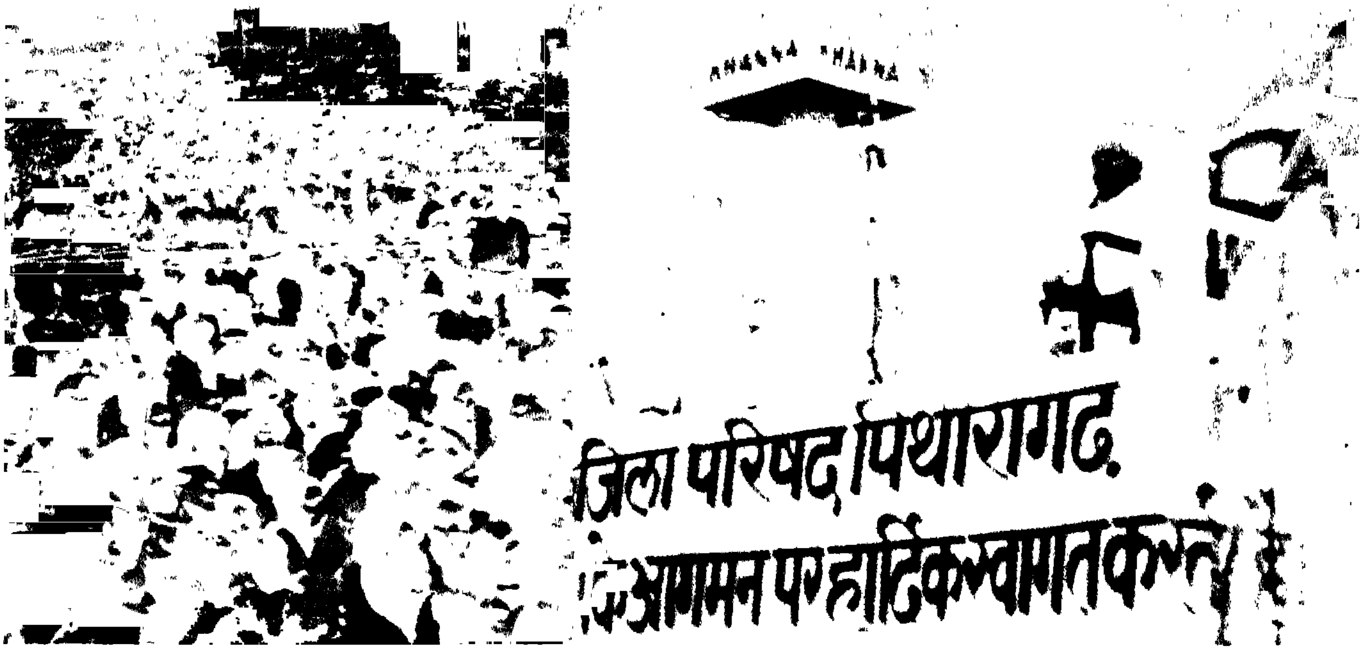
اپنی بات ...... ص۲ کا بقیہ

امن و قانون کی صورت حال بھی یقیناً حوصلہ افزا ہے ۔ روزنامہ "عزائم" لکھنؤ کے لفظوں میں " وزیر اعلا نرائن دت تیواری نے سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لیکر اہم ترین اور دھماکہ خیز مسائل کو بھی کم از کم اتنا بے ضرر ضرور بنا دیا ہے کہ وہ امن و امان کے لیے خطرہ نہیں بن پا رہے ہیں ۔ انھوں نے ابھی تک بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے نام پر ٹکراؤ کو روک رکھا ہے' فسادات کی کسی لہر کو اُبھرنے نہیں دیا ہے ۔"

عازمین حج کو بہتر سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے ریاستی حج کمیٹی کی سالانہ گرانٹ پانچ لاکھ روپئے سے بڑھاکر دس لاکھ روپئے کر دی گئی ہے اردو زبان و ادب کی ترویج و توسیع کے لیے اتر پردیش اُردو اکیڈمی کی سالانہ گرانٹ بھی بڑھاکر ۳۷ لاکھ ۹۵ ہزار روپئے کر دی گئی ہے ۔



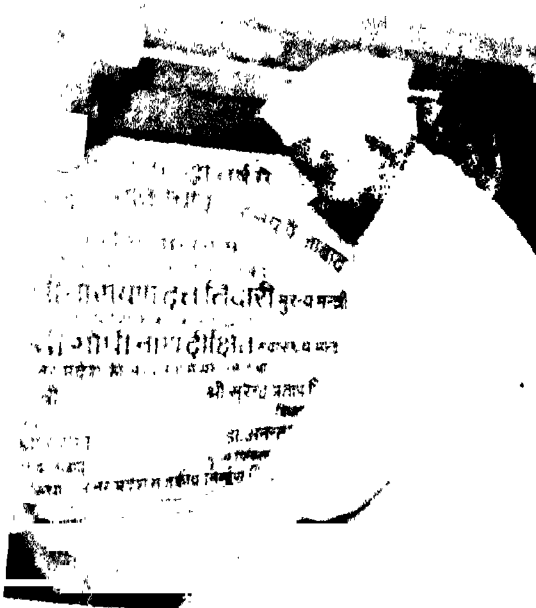


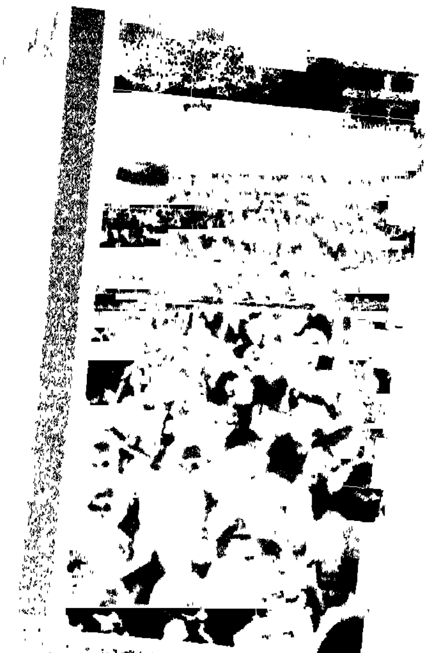


जिला परिषद पिथौरागढ़
आगमन पर हार्दिक स्वागत करते हैं



PRESS
WELCOMES





وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۲۰/جون کو فیض آباد میں ایک اسپتال کا سنگ بنیاد [illegible]
گوپی ناتھ دکشت [illegible]

وزیر ریاست برائے اطلاعات شری [illegible]
[illegible] ایک تقریب میں شرکت کی۔ [illegible]







غزلیں

ڈاکٹر فریاد آزرؔ

۸۸/۲۔ گوونند پوری
نئی دہلی

خبر ہوئی تو قیامت کا دُکھ ہوا تھا اُسے
کہ میں بدن کے علاوہ بھی چاہتا تھا اُسے

مجھے قریب بُلانے کی بھُول کی اُس نے
میں دُور رہ کے فرشتہ سمجھ رہا تھا اُسے

وہ رُوح بن کے بدن میں مرے سما بھی گیا
زمانہ جسم کے جنگل میں ڈھونڈھتا تھا اُسے

خدا سے اپنے لیے مانگتا نہ تھا کچھ بھی
نہ جانے کس کی دُعاؤں کا آسرا تھا اُسے

جب کبھی نہ مری گفتگو پسند آئی
مری خموشی پہ کتنا بُرا لگا تھا اُسے

نئی رُتوں کا پرندہ تھا وہ مگر آزرؔ
گئی رُتوں کا تصوّر بُلا رہا تھا اُسے

■

وحید دیوانہ

کھراد۔ ۱۔۳۔۱۴ نزد چنڈی گڑھ

وقت کی موجوں میں چھُپ کر بھی عیاں ہو جاؤں گا
میں سمندر میں جزیرے کا نشاں ہو جاؤں گا

میں فضا کی مٹھیوں میں اک اکیلا لفظ ہوں
اپنے ہونٹوں پر سجالے داستاں ہو جاؤں گا

میں تو اک قطرہ ہوں لیکن تجھ سے مل جانے کے بعد
وسعتیں پائیں تو بحرِ بیکراں ہو جاؤں گا

میرے شعروں میں ہے تیری قربتوں سے روشنی
تجھ سے بچھڑا تو چراغوں کا دُھواں ہو جاؤں گا

وہ پرندہ ہوں کہ جس کے پر ہوا میں جل گئے
تو اگر آواز دے گا پرفشاں ہو جاؤں گا

دل تو دل ہے آنکھ میں بھی اب کوئی رہتا نہیں
دیکھ لینا کل میں اک خالی مکاں ہو جاؤں گا

میں ہوں دیوانہ کتابوں کی تہوں میں بند ہوں
کل ادب کے راستوں میں اک نشاں ہو جاؤں گا

مہدی حیدر زیدی

۵۴۔ نیو بلڈنگ۔ ہائی کورٹ
الٰہ آباد

ہمیشہ ساتھ وہ اپنی سپر بھی رکھتا ہے
دفاع کے لیے تیار سر بھی رکھتا ہے

میں اس لیے شبِ تاریک میں نکل آیا
چراغ کوئی سرِ رہ گزر بھی رکھتا ہے

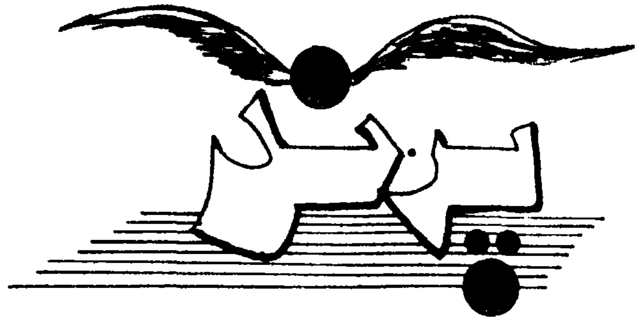
طلوع کرتا ہے سُورج تو وہ خدا سب کے
سروں پہ سایۂ شاخِ شجر بھی رکھتا ہے

زبان اس کو ملی ہے زباں ہمیں بھی ملی
مگر وہ اپنی زباں میں اثر بھی رکھتا ہے

نہ جانے کیوں مجھے صحرا کا دھیان آتا ہے
مرا مکان تو دیوار و در بھی رکھتا ہے

□

شورش صدیقی
ڈی ۱۶/۱ پیپر مل کالونی
لکھنؤ



'پر' کاریگری کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے۔ بہت کم چیزیں اس کے مقابلہ کی ایسی ہوں گی جو حرارت کو روک سکیں یعنی انسولیٹر (INSULATOR) ہوں اور کوئی چیز اس سے بہتر ہوا میں اڑ سکنے والی نہیں ہے۔ پروں کو بنانے والا مادہ کیراٹن (KERATIN) ہوتا ہے جس سے جانوروں کے سفنے (SCALES) اور انسان کے ناخن بنتے ہیں۔

ایک ڈنڈی (SHAFT) کے دونوں طرف سو سے زیادہ ریشے اور ہر ریشے سے جڑے مہین ریشے۔ روئیں دار نہایت ملائم اور ہوا کی تیزی کو روکنے میں مددگار ہیں۔ اڑنے والے پروں کی خصوصیت اس سے بھی افضل ہے۔

پروں کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لیے ایک ہنس (SWAN) کو لیا جا سکتا ہے جن کے پروں کی تعداد ۲۵ پچیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ پرندوں کی تمام خصوصیت جو انھیں دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے پر ہیں۔ اسی لیے انھیں پرند کہا جاتا ہے۔

اڑنے والے جانوروں کے لیے جسم کا ہلکا ہونا ضروری ہے ہڈیوں کا بھاری وزن ان کے اڑنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے آرکو پیٹرک کی ہڈیاں بہت بھاری تھیں اس لیے وہ اڑ نہیں سکتا ہوگا۔ پرندوں کی ہڈیاں یا تو کاغذ جیسی ہلکی ہوتی ہیں یا کھوکھلی ہوتی ہیں جن کو چند ہڈیوں سے ٹیک ملتی ہے۔ پرندوں کے پھیپھڑے ہوا کے تھیلوں جیسے جسم کی خالی جگہ میں پھیلے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے جسم اور ہلکا ہو جاتا ہے اور ہوا پر ان کے جسم کا بوجھ کم پڑتا ہے اور وہ آسانی سے اڑ سکتے ہیں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی دم سے جڑی ہوئی بھی نہیں ہوتی اس کے علاوہ ان کی دم کے پر بہت ہلکے ہوتے ہیں اور کوئی ہڈی نہیں ہوتی اگر منہ میں جبڑے اور دانت ہوں تو اڑنے میں سر جھکا رہے گا اور اڑنے میں توازن قائم نہیں رہے گا اس لیے پرندوں کے جبڑے اور دانت نہیں ہوتے کیراٹین (KERATIN) کی ہلکی چونچ ہوتی ہے۔

بہترین چونچ بھی چیزوں کو چبا نہیں سکتی اس لیے چڑیوں کو اپنی غذا توڑ کر نگل لینا پڑتی ہے۔ پرند سنگریزے نگل لیتے ہیں جو ان کے پوٹے (GIZZARD) میں جمع ہوتے ہیں۔ پتھر کے ٹکڑے غذا کو کوٹنے پیسنے میں معاون ہوتے ہیں پوٹا جسم کے بیچوں بیچ پروں کے درمیان ہوتا ہے اس لیے اڑنے میں بوجھ نہیں بنتا۔

عام طور پر چڑیاں مچھلی' بیج کا گودا' پھولوں کا رس' کیڑے لاروے' اناج' شکر رکھنے والے پھل کھاتی ہیں جن میں کیلوری بھرپور ہوتی ہیں۔ چڑیاں ان ہی چیزوں کو کھانا پسند کرتی ہیں تاکہ اڑنے کے لیے کافی طاقت مل سکے۔ ان کے جسم سے پروں کی وجہ سے زیادہ گرمی نکل نہیں سکتی اس لیے جسم کی گرمی قائم رہتی ہے اور کم خرچ ہوتی ہے۔

پر سمور (FUR) سے زیادہ کارآمد ہیں۔ ان کی مدد سے

نگوئین برفانی مقامات جیسے انٹارکٹکا میں پروں کی مدد سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان پروں کے نیچے چربی کی ایک تہہ بھی ہوتی ہے جو گرم خون رکھنے والے پنگوئین کو صفر سے ° ۔ ۲ سنٹی گریڈ نیچے کے درجۂ حرارت کی ٹھنڈک کو برداشت کرنے کے قابل بناتی ہے اور وہ کچھ دن بغیر کھائے بھی زندہ رہ لیتے ہیں۔

چڑیوں کے پر سال میں ایک مرتبہ جھڑ جاتے اور نئے نکل آتے ہیں۔ چڑیاں پروں کی بہت حفاظت بھی کرتی ہیں انھیں پانی میں دھوتی اور مٹی سے رگڑ کر صاف کرتی ہیں۔ بکھرے پروں کو ٹھیک سے سجاتی ہیں اور ٹوٹے پروں کو چونچ سے سیدھا کرتی ہیں دم کے پروں کی جڑوں میں ایک طرح کے چکنے روغن کے غدود ہوتے ہیں جسے چونچ میں لے کر پروں پر ملتی اور انھیں چکنا بناتی ہیں۔

بہت سی چڑیوں کے جسم اور دم کی جڑ کی جگہ تیل کے غدود ہوتے ہیں جن سے چونچ میں تیل نکال کر وہ پروں پر لگاتی اور انھیں چکنا بناتی ہیں۔ طوطے کے پروں کے بیچ میں ایک طرح کا چکنا پوڈر ہوتا ہے۔ جسے چونچ سے وہ اپنے پروں پر لگاتے اور انھیں چکنا بناتے ہیں۔ اس طرح پانی پروں پر جمتا نہیں اور جلدی بہہ جاتا ہے ورنہ بھیگے پروں سے اڑنا مشکل ہو جائے۔ بطخ اور کچھ چڑیاں پانی میں غوطے لگا کر مچھلیاں پکڑتی ہیں اور کئی کئی گھنٹے پانی میں رہتی ہیں ان کے پر بالکل بھیگ جاتے ہیں اور اڑنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے جب شکار کر چکتی ہیں، تو کسی پہاڑی یا اونچے درخت پر سورج کی طرف پر پھیلا کر انھیں سکھاتی ہیں۔

جوئیں اور پسو پروں میں اچھی طرح چھپ جاتے ہیں اور پرندوں کا خون چوستے ہیں۔ اس سے چڑیوں کو بہت پریشانی ہوتی ہے وہ اپنے پروں کو کھڑا کر لیتی ہیں اور ان طفیلیوں کو پکڑ کر کھا جاتی ہیں۔ کچھ چڑیاں اپنے پروں پر چھوٹے کیڑے اور چیونٹے چڑھا لیتی ہیں کہ ان طفیلیوں کو پکڑ کر کھا جائیں۔ چیونٹوں کے بل پر اپنے پروں کو پھیلا دیتی ہیں تاکہ پریشان ہو کر چیونٹے ان پر چڑھ جائیں۔ کبھی کبھی وہ چیونٹے نرمی سے اپنی چونچ میں لے کر اپنے پروں کے اندر گھسیڑ لیتی یا رگڑتی ہیں کہ وہ طفیلیے کیڑوں کو پا سکیں یا ان کے منہ سے نکلا مادہ انھیں مار دے دبانے اور رگڑنے سے چیونٹے خفا ہو کر لعاب نکالتے ہیں اور پسو اور جوئیں اس لعاب سے مر جاتے ہیں پہلے تو چڑیاں ضرورتاً ایسا کرتی تھیں اب عادتاً ایسا کرتی ہیں چڑیاں دھوئیں یا آگ سے پروں کی سنکائی کر کے بھی چھپے پسوؤں کو مار دیتی ہیں۔ کسی چمنی کے منہ پر وہ آدھا آدھا گھنٹے بیٹھ کر اس کام کو کرتی ہیں۔

صفائی کا کام فرصت کے وقت کیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ اڑتے وقت ملتا ہے اچھی طرح سجائے اور صاف کیے پر اڑنے میں مدد کرتے ہیں اور ان پر ہوا کا دباؤ کم پڑتا ہے۔

چڑیوں کے پر مختلف فرائض انجام دیتے ہیں جیسا ہوائی جہاز کے پر کرتے ہیں۔ چڑیا کو اڑنے میں مدد کرنے کے علاوہ یہ ایک انجن کا کام بھی کرتے ہیں جو ہوا میں سمت بدلنے اور مڑنے میں مددگار ہیں۔

چھوٹے مڑے پر شکرے، بہری باز یا دوسرے شکاری پرندوں کی طرح جنگی ہوائی جہازوں کے بنائے جاتے ہیں تاکہ وہ آسانی سے جھکائی دے سکیں اور تیزی سے کسی طرف پلٹ کر نکل جائیں یا جھکائی دے کر دشمن کے حملے کو ناکام کر دیں۔ آج کے ہوائی جہاز اپنے پر پیچھے کی طرف کر کے بہت تیز رفتار حاصل کر لیتے ہیں جیسا پرند کرتے ہیں۔ کچھ شکاری پرند پروں کو سکیڑ کر ہوا میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اس وقت ان کی رفتار ۱۳۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ تک پہونچ جاتی ہے اور جھپٹ کر شکار پکڑ لیتے ہیں۔ گلائڈر کے تھین لمبے پر بنائے جاتے اور انھیں کسی اونچی جگہ سے بغیر کسی دوسری مدد کے ہوا میں قائم رکھا جا سکتا ہے۔ البٹراس (ALBATROSS) جو بہت بڑا پرند ہے اسی طرح ہوا پر گھنٹوں تیرتا رہتا ہے۔ گدھ اور شکرے بہت دھیمی رفتار سے ہوا میں چکر لگاتے ہیں ان کے چوڑے تکونے پر دھیمے اڑنے والے جہازوں کے سے ہوتے ہیں

ملک برڈ (HUMMING BIRD) کی نقل کرکے ہیلی کاپٹر بنا
یا ہمنگ برڈ اپنے جسم کو ایک دم سے اوپر اٹھا کر اڑ جاتی ہے
۔ایسا کرنے کے لیے اسے اپنے پروں کو ایک سکنڈ میں اسّی
بہ مارنا پڑتا ہے وہ نیچے بھی اتر سکتی ہے اور فضا میں بغیر پر
ے چکر لگاتی اور قائم رہ سکتی ہے۔

کوئی بھی جاندار اتنی دور اتنا تیز نہیں اڑ سکتا نہ دوڑ
سکتا ہے جتنا پرند اڑتے ہیں۔ ان کی تیزی بے مثال ہے۔ ایشیا
ایک پرند ابابیل (SWALLOW) ہے ایک گھنٹے میں ایک
ستر کیلومیٹر فاصلہ طے کر لیتی ہے اور کیڑے پکڑنے کے لیے ایک
ن میں نو سو کیلومیٹر تک اڑتی چلی جاتی ہے۔ کیڑے اس کی
ص غذا ہیں۔ اس کے جسم کا ہر حصہ اس کی مدد کرتا ہے۔
ں کے پیر پھیل کر پروں سے نکلے ہک سے نظر آتے ہیں۔ ان
ے پر کی گولائی ایسی ہوتی ہے کہ زمین پر بیٹھی چڑیا کو پہلے ہی
ہ دور دوڑ کر اور اچک کر اڑنا پڑے لیکن یہ پرند کسی پہاڑی
کسی اونچی جگہ سے تو ایک پر مارے بغیر اڑ جاتا ہے۔ کچھ
رند ہوا میں جوڑا بھی لگا لیتے ہیں۔ مادہ بہت اونچی ہوا میں اڑتی
ئی پروں کو پھیلائے رہتی ہے اور نر پیچھے سے آکر اس کی پیٹھ
ر چڑھ جاتا ہے چند لمحوں کے لیے دونوں تھوڑا نیچے گرتے
لے آتے ہیں اور اتنی دیر میں کام ہو جاتا ہے۔ یہ پرند افزائش
سل کرنے کے علاوہ کبھی نیچے ہی نہیں آتا اور لگاتار نو مہینے
ک اڑتا ہی رہتا ہے۔ اسے بھی ایک اور پرند نے مات دے
ی ہے۔ سوٹی ٹرن (SOOTY TERN) کے لیے کہا جاتا ہے
ہ اپنا گھونسلا چھوڑنے کے بعد متواتر اڑتا ہی رہتا ہے اور تین
ار سال بعد گھونسلے میں لوٹ کر آتا ہے۔

پرندوں کی کچھ انواع بہت لمبے سفر کرتی ہیں۔ روس کا
یک لق لق (STORK) ہر سال سردی کے موسم میں اڑ کر افریقہ
ا جاتا ہے اور موسم بہار میں لوٹ آتا ہے۔ اس کی پہچاننے کی
صلاحیت اور اس کی لوٹ کر ٹھیک اسی جگہ اپنے گھونسلے میں آنا حیرت
انگیز ہے۔ ہر سال وہ ایسا ہی کرتا ہے۔

قطب شمالی کے برفیلے علاقہ کا ایک پرند جس کے لمبے پر
ہوتے ہیں اور آرکٹک ٹرن (ARCTIC TERN) کہلاتا ہے
سب سے طویل یعنی تقریباً اٹھارہ ہزار کیلومیٹر کا سفر کرتا ہے
وہ گرمی میں تو قطب شمالی اور گرین لینڈ (GREENLAND)
میں اپنے گھونسلے بناتا ہے اور انڈے دیتا ہے۔ سردی آنے
پر اڑ کر جاتا ہے۔ اور قطب جنوبی کے نزدیک تک پہونچ جاتا ہے
اس طرح وہ زیادہ تر سورج کی روشنی میں رہتا ہے اس لیے مئی
کے مہینے میں لوٹتے ہوئے بھی سورج کی روشنی ملتی رہتی ہے

طویل سفر کرنے میں اس کی قوت ضرور صرف ہوتی ہے
لیکن اس کے فائدے بھی ہیں وہ راستے بھر بہترین غذائیں حاصل
کرتا ہے اور ایسے میوے کھاتا ہے جو سال میں صرف چھ مہینے ہی
پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ان غذاؤں کے اتنی دور ملنے کی خبر کیسے
ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو وہ اتنے طویل سفر نہیں کرتا تھا
لیکن برفانی دور ختم ہوا تو وہ آگے سے آگے جانے لگا اور اب
اپنی غذا کے لالچ میں جاتا ہے۔

یہ چڑیاں اپنا راستہ کیسے پہچانتی ہیں اس کا کوئی واحد
جواب نہیں ہے۔ وہ بہت سے طریقے استعمال کرتی ہیں۔ کچھ
طریقے سمجھ میں آتے ہیں اور کچھ آج تک محض راز بنے ہوئے
ہیں۔ عادت پڑ جانے کا امکان ہو سکتا ہے۔ چڑیاں ضرور جغرافیائی
حالات سے واقف ہیں۔ گرمی میں اڑنے والی چڑیاں افریقہ کے
ساحل کے کنارے کنارے اڑ کر جاتی ہیں اور جبرالٹر پار کر
لیتی ہیں تو انھیں یورپ دکھائی دینے لگتا ہے تب وہ آلپس (ALPS)
پہاڑ کی وادیوں سے گذر کر اپنے گرمی کے مکانوں میں پہونچ جاتی ہیں
دوسرا گروہ مشرقی راستہ اختیار کرتا ہے اور باسفورس
(BOSPHORUS) ہوتا ہوا آتا ہے۔

بہرحال سب چڑیاں ایک دم سیدھا راستہ اختیار
نہیں کر سکتیں مثلاً بحر اٹلانٹک کا پھیلاؤ تین ہزار کیلومیٹر ہے

جہاں رکنے کی جگہ بھی نہیں ہوتی اور ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہو تو کسی پہچان کی جگہ ہونا ممکن نہیں۔ جغرافیائی پہچان بھی صحیح نہیں لگتی۔ شاید وہ سورج کے آسمان پر جگہ بدلنے سے اندازہ لگاتی ہوں لیکن بادل بھی رہتے ہیں اور رات بھی ہوتی ہے شاید ستاروں سے اندازہ لگالیتی ہوں۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح وہ ٹھیک سیدھا راستہ اختیار کرلیتی ہیں۔

دن کے وقت تو سورج سے سمت کا اندازہ لگ سکتا ہے وہ بھی اگر پرندوں کو وقت کا پورا اندازہ ہو۔ شاید ان کے دماغوں میں قطب نما جیسا کوئی آلہ لگا ہو۔ بہر حال انسان تو ان چیزوں کی مدد کے بغیر اتنے طویل راستے طے نہیں کرسکتا جبکہ چڑیوں کے بچے جو صرف چند ماہ پہلے پیدا ہوئے ہوں ان راستوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور سیدھی اڑان کرلیتے ہیں۔

یہ خصوصیت بھی بہت معمولی لگتی ہے جب تجربے کے لیے ایک سمندری پرند (SHEARWATER) کو جو عام طور پر اسکاک ہوم (SKOKHOLM) ویلز (WALES) کے قریب کے جزیرے پر رہتا ہے پکڑ کر پانچ ہزار ایک سو کیلومیٹر دور ہوائی جہاز سے امریکا کے بوسٹن شہر میں لے جاکر چھوڑ دیا گیا اور وہ ساڑھے بارہ گھنٹے بعد لوٹ کر اپنے گھونسلے میں آگیا۔

پروں کی مدد سے اڑنے کی غیر معمولی صلاحیت تو پرندوں کو حاصل ہی ہے لیکن پروں کے اور استعمال بھی ہیں۔ پرند اپنے پروں کو کھڑا بھی کرلیتے ہیں اور ان سے جھنڈے اور پہچان کا کام بھی لیا جاتا ہے وہ پروں سے پیغام رسانی بھی کرتے ہیں۔ عام طور پر پرندوں کی زندگی گمنامی کی زندگی ہوتی ہے لیکن افزائش نسل کے موسم میں ان پروں کی اہمیت ہوجاتی ہے۔ ان پروں سے پیغامات پہونچا کر مادہ کو اپنی طرف راغب کیا جاتا ہے نر کو اپنے علاقہ سے دوسرے نروں کو بھگانے کے لیے پر کھڑے کرکے ڈرانا اور سینہ کے پر پھلاکر لڑنا ہوتا ہے۔ پروں کے رنگ اور بناوٹ دکھا کر اور آوازیں نکال کر اپنی نوع کا اعلان کیا جاتا ہے اور مادہ کو لبھا کر قابو میں کیا جاتا ہے۔

عام طور پر شرمیلی چڑیاں جنگلوں میں بے نام و نشان زندگی گذارتی ہیں لیکن کچھ چڑیوں کی خوش الحان آوازیں ان کی پہچان اور شناخت کراتی ہیں وہ مختلف ملکوں میں اپنے مخصوص ناموں سے مشہور ہیں۔

کچھ خوبصورت پروں کی بدولت مشہور ہیں سب سے خوبصورت پروں کے مالک ہیں مور، فیزنٹ (PHEASANT) اور طوطے۔ انھیں اپنے پروں پر بہت اعتماد ہوتا ہے۔ اور غرور بھی موقع پڑتے ہی یہ اپنے پروں کی نمائش کرنے لگتے ہیں۔ نر اپنے حریفوں پر حملہ آور ہونے پر بھی پروں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

پروں سے اظہار اور بولیوں سے اعلان کرنا جوڑا لگانے کے وقت بہت ضروری ہوجاتا ہے۔ خالی پروں کے مظاہرے سے دھوکہ بھی ہوسکتا ہے مثلاً واربلر (WARBLER) اور چف چیف (CHIFF-CHAF) بالکل یکساں پر رکھنے والی چڑیاں ہیں جنھیں دیکھ کر ماہر بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ صرف ان کی بولی سے ان کی پہچان ہوتی ہے۔ خود مادہ تک دھوکا کھا جاتی ہے۔ رنگ، قد، وضع قطع یکساں ہو تو بڑی دقت ہوتی ہے۔ کچھ رنگین پروں کی چڑیاں ایک ہی علاقے میں رہتی ہیں ساری دنیا میں بطخیں ایک ساتھ جھیلوں میں رہتی ہیں۔ لیکن ان کے پر، ان کی کلغیاں، ان کے بازو، سروں کی بناوٹ مختلف ہوتی ہیں اور ہر ایک کی مادہ اپنی نوع کی پہچان کرکے نر کے پاس جاتی ہے۔

پرندوں کو اپنی جنس کا اظہار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ نر بطخیں اپنے سر کی بناوٹ سے اس کا اعلان کرتی ہیں سمندری پرندوں اور شکاری پرندوں میں نر مادہ کا فرق نمایاں نہیں ہوتا وہ بالکل یکساں لگتے ہیں۔ اس لیے انھیں اپنی جنس پہچانانے کے لیے اپنی آوازیں اور دوسرے طور طریقے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ پنگوئن کو اور بھی

وقت ہوتی ہے اس لیے وہ ایک عجیب و غریب طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ نر ایک چھوٹا پتھر اپنی چونچ میں لے کر دوسرے پنگوئن کے پاس جاتا ہے اور پتھر اس کے سامنے زمین پر رکھ دیتا ہے اگر دوسرا پنگوئن لڑنے پر آمادہ ہو جائے تو گویا وہ بھی نر ہے اور اگر وہ اس پتھر پر بالکل توجہ نہ دے تو گویا وہ مادہ تو ہے مگر جوڑا لگانے پر تیار نہیں یا اس کا جوڑا کسی اور پنگوئن سے لگ چکا ہے۔ نر اسے اپنی چونچ میں اٹھا کر آگے بڑھ جاتا ہے اور کسی دوسرے پنگوئن کے سامنے جا کر اسے زمین پر رکھ دیتا ہے۔ اگر وہ پنگوئن جھک کر اس کا استقبال کرے تو سمجھو اسے اپنا جوڑا مل گیا نر اپنی گردن جھکا کر خوشی کا اظہار کرتا ہے اور دونوں اپنی گردنیں باہر نکال کر شور مچاتے ہیں گویا اپنی شادی کا اعلان کر رہے ہیں۔

یورپ کی ایک نہایت خوبصورت پانی کی چڑیا گریب (GREBE) ہے وہ پنگوئنس سے بھی مختلف طریقہ استعمال کرتی ہے۔ موسم بہار میں انھیں جنسی خواہش ہوتی ہے لیکن نر اور مادہ کے پروں کا رنگ یکساں ہوتا ہے۔ سینہ کی بناوٹ، کالے پروں کا گچھا، سروں پر چکنے بال ابھر آتے ہیں اور دونوں بالکل یکساں لگتے ہیں جنس کا پتہ لگانے کے لیے دونوں اپنی گردنیں اونچی کر کے ایک دوسرے سے چونچیں ملاتے ہیں۔ بازوؤں کے پر کھل جاتے ہیں ساتھ ساتھ پانی میں غوطے لگاتے ہیں ناچتے ہیں اور پانی کا ایک پودا اپنی چونچ میں لے کر ایک دوسرے کو پیش کرتے ہیں اور ان رسومات کے بعد دونوں ساتھ ساتھ چلنا شروع کرتے ہیں۔ پیروں سے پانی اچھالتے ہیں گردنیں اترا اترا کر گھماتے ہیں۔

ان کا یہ میل ملاپ کئی ہفتے چلتا رہتا ہے اور اسی طرح کھیل ہوتا رہتا ہے۔ جوڑا الگ جاتا ہے مادہ انڈے دیتی ہے اور نر مادہ باری باری انھیں سیتے ہیں۔ چونکہ دونوں ایک جیسی ہیں تو بار بار کھیلوں سے پہچان کرائی جاتی ہے کہ دھوکہ نہ ہو جائے اکثر جوڑا لگاتے وقت مادہ نر کے اوپر بھی چڑھ جاتی ہے۔

فیزنٹ :-

کچھ انواع کا جنسی اظہار نمایاں ہوتا ہے چاہے وہ بہت معمولی ہی ہو مثلاً چھوٹی سی داڑھی کی نشانی یا نر کے سر پر ایک کالی پٹی کا ہونا یا مختلف قسم کے طوطے مادہ سے دوستی چلاتے وقت اپنی آنکھیں گھما گھما کر ایک دوسرے کو بار بار دکھاتے اور اپنی نوع کی ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ فیزنٹ (PHEASANT) گروس (GROUSE) اور مانکن (MANAKIN) اپنے رنگ برنگے خوبصورت پروں سے پہچانے جاتے ہیں۔ فیزنٹ کی مادائیں عام طور پر بدرنگ یا بھدے رنگوں کی ہوتی ہیں اور جوڑا لگانے کے بعد الگ جا کر انڈے دیتی ہیں اور بچے پالتی ہیں۔ نر کو ان کاموں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا وہ محض دوسری ماداؤں سے باری باری جوڑا لگاتا رہتا ہے۔

آرگس فیزنٹ (ARGUS PHEASANT) کے پروں کی سجاوٹ سب سے خوبصورت ہے ان کی دلکشی بے مثال ہے اور یہ بتانا کہ سب سے اچھے پر کس کے ہیں مشکل ہے۔ ان میں کچھ کے پر تو ایک میٹر تک لمبے ہوتے ہیں جن پر ابھری آنکھوں کے جیسے نشانات بنے ہوتے ہیں جو دلکشی کے علاوہ گویا آنکھیں ہیں اسی لیے وہ اپنے پروں کو اٹھا کر دکھاتا اور لبھاتا ہے پرندوں کا نظام زندگی بہت انوکھا ہے وہ ہمارے ماحول کو خوبصورت اور رنگا رنگ بناتے ہیں اور فضاؤں اور ہواؤں کے مالک ہیں۔

غزلیں

ڈاکٹر عرفی
فتح گنج۔ فیض آباد

تُند طوفاں اگر اتنا مغرور ہے
میری کشتی بھی لڑنے پہ مجبور ہے

تم ازل سے ہو وعدہ شکن بے وفا
یہ کہانی زمانے میں مشہور ہے

جبر کا راستہ کون روکے گا اب
نم میں سقراط کوئی نہ منصور ہے

وقت کے تیز طوفاں سے تم بھی ڈرو
کل جو مختار تھا آج مجبور ہے

سلسلے وار کانٹوں کی ہیں وادیاں
لوگ کہتے ہیں منزل بہت دور ہے

اب کسی کے کرم کی ضرورت نہیں
قت کا فیصلہ ہم کو منظور ہے

توڑتا میں نہ عرفی جو زنجیر پا
گ ـــ با مرا عشق مجبور ہے

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی
شعبۂ اردو۔ ودیانت ہندو ڈگری کالج
لکھنؤ

ہلکا ہلکا، بکھرا بکھرا بادل سا
بستی بستی گھوم رہا ہوں پاگل سا

تنہائی کی شدّت بھی کیا شدّت ہے
شانوں پر محسوس ہوا ہے آنچل سا

بھولے بسرے یگ بیتا، لیکن شاید
دل میں اس کا زخم ہرا ہے تجا دل سا

اس کے کالے نین، رسیلی جامن سے
زلفوں کا انداز گھنیرے بادل سا

اب تو یقیں نے توڑ دیا ہے دم عصمت
سچّا تل لگنے لگتا ہے، کاجل سا

جاوید برقی جون پوری
۴۴، جوہری محلہ لکھنؤ

جادو دلوں میں آج یہ کیسا اتر گیا
رشتوں سے خاندان کا احساس مر گیا

کھودا گیا تھا کل جسے پانی کے واسطے
انسان کے لہو سے وہ تالاب بھر گیا

مٹی اٹھا کے گاؤں کی ہم پوچھتے رہے
سیلاب میں مکان ہمارا کدھر گیا

اب دوپہر کی دھوپ میں جائیں تو کس طرف
میں تو ادھر گیا مرا سایا جدھر گیا

جاوید شب کو آنکھ ہماری جو لگ گئی
ہر حادثہ ہمارے ہی گھر میں ٹھہر گیا

عزیز نیسن
ترجمہ: مشتاق احمد نوری
ڈسٹرکٹ پبلک ریلیشنز آفیسر
مستی پور (بہار)

ترکی کہانی

دس انچ زمین

کئی راتیں جاگتے ہوئے گزری تھیں۔ دل و دماغ پر اتنا تناؤ تھا کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کسی نے ایک دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر کا نام بتادیا۔ اس کے پاس پہنچا تو اس نے پہلا سوال کیا۔

"آپ دن بھر میں کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں؟"

"سولہ سے بیس گھنٹے" اُسے یقین نہیں ہوا۔ کہنے لگا۔

"واقعی آپ کا مرض تھکاوٹ ہے۔ آخر آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟"

جی میں آیا اس سوال کا جواب دینے کی بجائے ڈاکٹر کو جی بھر کے گالیاں دوں۔ خدا کے بندے بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں کوئی شوقیہ تو اتنے گھنٹے کام کرتا نہیں۔ خیر ڈاکٹر نے اپنی جانچ کے مطابق کچھ نیند کی گولیاں لکھ دیں جن سے دماغی تناؤ عام طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ نیند کی گولیاں تو کھالیں مگر بقول شاعر؂

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اب بستر پر لیٹ کر جوں ہی آنکھیں بند کرتا ہوں دماغ کے کسی دھندلے گوشہ میں مکان مالک کی منحوس صورت نمودار ہو جاتی ہے۔ گزشتہ تین ماہ کے بقایہ کرایہ کا تقاضہ کرتی ہوئی آنکھیں میرے پورے وجود میں گڑنے لگتی ہیں۔ اب نیند آئے تو کیسے؟

بس لیٹے ہی لیٹے من ہی من میں حساب لگانا شروع کردیتا ہوں۔ پینسٹھ میں سے پچاس نکالے، بچے پندرہ، پانچ میں سے پانچ گئے باقی بچا صفر، چھ میں سے چار نکالے باقی بچے دو۔ وغیرہ وغیرہ جب یوں زبانی حساب سے تسلی بخش نتیجہ نہیں نکلا تو اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کاغذ پنسل تلاش کرتا ہوں پھر نئے سرے سے کاغذ پر رقمیں لکھ کر حساب کرتا ہوں ساتھ ہی نیند کی ایک گولی نگل لیتا ہوں کہ شاید اثر کر جائے۔ جب نیند کا ایک معمولی سا جھونکا محسوس ہوتا ہے تو اکدم دوبارہ بستر پر دراز ہو جاتا ہوں۔ آنکھ لگنے کو ہی ہوتی ہے کہ خیال آتا ہے اگر میں ہر مہینے دس روپیہ بچاؤں تو سال بھر میں کتنی رقم جمع ہو جائے گی۔؟

یہ کمبخت گھر کا کرایہ میری جان لے کر ہی رہے گا۔ کاش اس دنیا میں اپنے لئے سر چھپانے کی تھوڑی سی جگہ پر کسی طرح ہمارا نام بھی لکھ دیا گیا ہوتا۔

ہفتہ بھر میں مشکل سے پانچ گھنٹے سو سکا ہوں۔ ایک رات جب حالت بہت ہی خراب ہونے لگی تو اخبار ہاتھ میں لے کر اس خیال سے لیٹ گیا کہ شاید پڑھتے پڑھتے نیند آجائے پہلے ہی صفحہ پر ایک خبر تھی۔

"جہانگیر پور میں ایک پلاٹ چالیس لاکھ روپئے میں فروخت ہوا" چالیس لاکھ روپئے۔ پلاٹ کا رقبہ ۱۶۲۴ مربع گز تھا۔ میں نے ۱۶۲۴ سے چالیس لاکھ کو تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ زندگی بھر کوئی کام حساب سے نہیں کیا پھر بھی حساب کا شوقین ہوں معلوم ہوا کہ اس پلاٹ کی قیمت تقریباً ۲۵۰۰ روپئے فی مربع گز ہے۔

"مان لو۔ یہ پلاٹ خریدنا چاہوں تو۔۔۔؟"

پلاٹ کی قیمت چالیس لاکھ روپئے۔ میری ماہانہ تنخواہ پانچ سو روپئے۔۔ اگر۔۔۔۔

اتنے میں باہر سے بیگم نے چلانا شروع کر دیا۔

"آپ سوتے کیوں نہیں جاتے۔؟" میں نے غصہ سے جھاڑا۔

"سوؤں کیسے۔؟ دیکھتی نہیں حساب کر رہا ہوں۔"

ہاں تو میری تنخواہ پانچ سو روپئے۔ بہت تنگی سے گزارہ وں تو ہر مہینے کتنی رقم پس انداز کر سکتا ہوں۔؟ مانا کہ آج کل ت تو ایک طرف ہر مہینہ اُدھار لے کر گزارہ کرتا ہوں۔ حساب لگانے میں کیا حرج ہے۔

مان لو ہر ماہ سو روپیہ بچاؤں تو سال بھر میں بارہ سو پیہ جمع کر پاؤں گا۔ دس سال میں بارہ ہزار۔ اگر ہزار برس ہ رہوں اور ہر مہینہ پیٹ کاٹ کر سو روپئے بچاتا رہوں تو ف بارہ لاکھ روپئے بچا سکتا ہوں۔

نہیں نہیں۔ یوں کام بنتا نظر نہیں آتا۔ محلے کے مرغے ہ بانگ دی۔ میرے دل میں پلاٹ خریدنے کا ارادہ مضبوط سے بوط تر ہونے لگا۔

میرا حساب لگانے کا شوق بہت پرانا ہے۔ جب میٹرک ں پڑھتا تھا تو کئی کئی دن کھائے پیئے بغیر صبح سے شام تک یہی ب لگاتا رہتا تھا کہ اگر میں بھاگنا شروع کر دوں تو کتنے وقت ں چاند، سورج یا دنیس پہنچ سکتا ہوں اس وقت کے حساب کے مطابق ے لئے پیدل چل کر چاند تک پہنچنا آج کے حساب کے مطابق ٹ خریدنے سے کہیں آسان تھا۔

صبح ہو گئی ہے اور میں ابھی تک پلاٹ کا حساب لگانے چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔ اگر تین ہزار سال کی زندگی پاؤں تو کام نہیں بنتا۔ میں نے حساب میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی۔ ن لو اپنی ساری تنخواہ ہر ماہ جمع کرتا رہوں اور بال بچوں کا پیٹ دھار سے دعائیں مانگ کر بھرتا رہوں تو کیا حساب رہے گا؟ نی دیر کی جمع باقی سے معلوم ہوا کہ اگر پورے ۶۶۶ سال زندہ رہوں اور نوکری کرتا رہوں تب کہیں جا کر پلاٹ کی قیمت اکٹھی کر سکتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے یہ حساب بھی درست نہیں ہے۔

اب میں نے نیند کی دو گولیاں اور کھا لیں۔ بستر پر لیٹا مگر دماغ پہ پلاٹ خریدنے کا جنون اس بُری طرح طاری تھا کہ اس نے نیند کو کوسوں دور بھگا دیا۔ اس لئے تھوڑی دیر بعد پھر اُٹھ کر کھڑا ہوا اور سوچنے لگا۔

مان لو میں روزانہ سولہ گھنٹے کی بجائے لگاتار چوبیس گھنٹے کام کر کے اپنی آمدنی دوگنی کر لوں اور اپنی پوری تنخواہ کا پائی پائی جمع کرتا جاؤں تو جناب یہ پلاٹ خریدنے کے لئے مجھے آج کی تاریخ سے پورے ۳۳۳ سال اور زندہ رہنا ہوگا اور رات دن نوکری کرنی ہوگی

اتنے میں چھوٹی بیٹی نے آواز دی۔

"ابا جان۔ خدا کے واسطے سونے کی کوشش کیجئے۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میرے حساب میں خلل نہ ڈالو" میں نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔

"جب تک یہ پلاٹ خرید نہ لوں، نیند میرے لئے حرام ہے۔"

اس بار میں نے حساب الٹی طرف سے لگانا شروع کیا۔

یعنی اس پلاٹ کی قیمت چکانے کے لئے میری ماہانہ آمدنی کتنی ہونی چاہئے اور اس میں سے ہر ماہ کتنی رقم بچت کرنی ہوگی؟

سوچا اگر ہر مہینہ دو ہزار روپئے جمع کر سکوں تو ۱۶۷ سال بعد ہی یہ پلاٹ خرید سکوں گا۔

جہنم میں جائے یہ پلاٹ جو کسی بھی حساب سے میری سمجھ کے دائرے میں سمٹ کر نہیں آ رہا ہے۔ میں نے خود سے کہا۔

"دیکھو میاں۔ آخر جس شخص نے یہ پلاٹ چالیس لاکھ روپئے میں خریدا ہے وہ بھی تو کوئی انسان ہی ہوگا۔ اس نے بھی محنت کی ہوگی۔ پیٹ کاٹ کر اتنی رقم بچائی ہوگی۔ اس نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ پیسہ جمع کرنے کے لئے زیادہ محنت اور کم کھانا بہت ضروری ہے۔"

خیر اس کمبخت نے کچھ بھی سوچا ہو، یہ سچ ہے کہ اس نے چالیس لاکھ کی رقم نقد نکال کر پلاٹ مالک کی ہتھیلی پر دھری

ہو گی۔ اور پلاٹ خرید لیا ہوگا۔

اُف۔ میرے خدا میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے نیند کی ایک گولی اور کھالی۔ بیگم نے پھر آواز لگائی۔

"خدا کیلئے قلم اور کاغذ رکھو اور سوجاؤ" میں نے جھلا کر جواب دیا

"تم میرا پیچھا چھوڑو گی یا نہیں۔ چلو اپنا کام دیکھو۔"

"اچھا تو یہ دیکھا جائے کہ جس شخص نے یہ پلاٹ خریدا ہے آخر اس نے اتنی کثیر رقم کس طرح کمائی ہوگی" یہ لیجئے۔ حساب کرنے کے لئے دماغ میں ایک اور خیال آدھمکا۔ جس آدمی نے چالیس لاکھ روپئے کی زمین خریدی ہے اس کے پاس اور چالیس لاکھ روپیہ ضرور ہوگا۔ یعنی پورے اسی لاکھ کا آدمی کو خدا جانے کیا کام کرتا ہوگا۔

اگر وہ سب سے اونچے درجے کا سرکاری افسر ہو تو ماہانہ تنخواہ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار ہوگی۔ چالیس لاکھ جمع کرنے کے لئے پینسٹھ سال کا سارا مشاہرہ جمع کرنا ہوگا۔

خدا غارت کرے اس نامراد پلاٹ کو۔ میرا تو سر پھٹا جارہا ہے۔ ہاں لو وہ آدمی ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹروں کی کمائی بہت زیادہ ہوتی ہے ہر معائنے کی تیس روپئے فیس ہتھیا لیتے ہیں۔

"جناب صبح ہوا چاہتی ہے۔ اب تو تھوڑی دیر کے لئے سوجاؤ" بیگم نے پھر آواز دی۔

"اُف تم میرے خیالات کا سلسلہ توڑنے آدھمکیں" فوراً دور ہوجاؤ یہاں سے"

ہاں تو میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ڈاکٹر ہر روز دس مریضوں کا معائنہ کرے تو دن میں تین سو روپئے کماسکتا ہے۔ یعنی نو ہزار روپئے ماہانہ۔ اگر اس آمدنی میں سے ہر ماہ چھ ہزار روپیہ جمع کرے تو کم از کم ساٹھ سال پریکٹس کی ضرورت ہے۔ مطلب یہ کہ اس پلاٹ کا خریدار ڈاکٹر بھی نہیں ہوسکتا۔

اور اگر کوئی سوداگر ہو جو ہر مہینے دس ہزار روپئے کماتا ہو تو بھی ممکن نہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں تھک کر تکیے پر سر رکھتا ہوں اور آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔ نیند کوسوں دور۔ ناامیدی کی حالت میں سر پھوڑ لینے کی خواہش ہورہی تھی کہ یکایک بجلی کی طرح ایک نیا خیال ذہن میں کوندا۔

اپنی ساری جیبیں ٹٹولیں۔ پورے ساڑھے بارہ روپئے برآمد ہوئے۔ بیگم سے دریافت کیا

"تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟" بیگم کی جیب سے ساڑھے پانچ روپئے اور بچوں کی بچت بینک کے ڈبوں سے ایک روپئے تیس پیسے نکلے۔ سب ملاکر انیس روپئے تیس پیسے بنے۔ سوچا سارے کا سارا پلاٹ خریدنا کوئی ضروری تو نہیں۔ جیب میں جتنی پونجی ہو کیوں نہ اُسی کے مطابق پلاٹ کا کچھ حصہ خرید لیا جائے زمین کی قیمت چونکہ ڈھائی ہزار روپئے فی مربع گز تھی اس لئے ایک مربع گز زمین بھی خریدنا اپنے بس سے باہر نظر آرہا تھا۔ اپنی ضرورت کو اور کم کرتے ہوئے ایک مربع فٹ کی قیمت لگائی وہ بھی اپنے بوتے سے باہر نکلی۔ انچوں کا حساب شروع کیا تو پتہ چلا کہ جیب میں موجود رقم سے پورے دس مربع انچ زمین خریدی جاسکتی ہے۔ خوب۔ بہت خوب۔

گھڑی پر نظر ڈالی۔ سورج نکلنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ بیگم اور بچوں نے شور مچایا۔

"سوجائیے۔ سوجائیے۔ خدا کے لئے اپنی صحت کا کچھ تو خیال کیجئے"

میرا ارادہ قوی اور عزم مستحکم تھا کہ صبح ہوتے ہی زمین کے مالک کے پاس جاؤں گا اور پوری سنجیدگی سے عرض کرونگا۔

"کاٹو بھائی مجھے دس مربع انچ زمین کا ٹکڑا چاہیئے"

دس مربع انچ زمین۔ اگر مرنے کے بعد اس زمین پر لیٹنا پڑے تو بدن کا زیادہ تر حصہ پڑوس کی قبریں ٹھکانہ ڈھونڈنے پر مجبور ہوگا۔ شاید اس پلاٹ پر ایک پاؤں پر کھڑے ہوکر زندگی کے باقی دن یا موت کے بعد کا وقت گزار سکوں۔

میں نے بیوی بچوں کو جمع کیا اور پوری سنجیدگی سے اپنی اپنی بات شروع کی۔

"تم لوگوں کے لئے اس سرزمین پر کوئی جگہ نہیں ہے۔ کوئی

(باقی ص ۴۵ پر)

افسانہ

تحسین عابدی

۱۰۴۔ شاہ نور علی گنج
الہ آباد

تلاش

دل سے اب دھواں سا اٹھنے لگا تھا۔ شاید دل پوری طرح جل چکا تھا بس یادوں کی چنگاریاں باقی تھیں جو رہ رہ کر سلگ اٹھتی تھیں۔ سامنے گلاب کی کیاری میں لگے پھول باسی ہو کر کمھلا چکے تھے جو کل تک بالکل تازے تھے مگر آج سوکھ کر بکھر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

زندگی کی اس کربناک منزل پر کھڑی ترنم اس چہرے کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی جس سے کبھی اسے سخت نفرت تھی وہ چہرہ کسی اور کا نہیں اس کے اپنے شوہر کامران کا تھا جس نے شادی کے چند دنوں بعد ہی ترنم کو طلاق دے دی تھی۔ ابھی ہاتھ کی مہندی بھی نہیں چھوٹی تھی جب کامران نے اس سے کہا— "ترنم میں تمھیں طلاق دینا چاہتا ہوں"۔ ترنم پر تو جیسے بجلی گر پڑی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لب خشک ہو گئے یکایک کامران کے مزاج میں یہ تبدیلی دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ کامران نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے یہ بات کہہ کر منھ دوسری جانب موڑ لیا۔

"طلاق؟ کہیں آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں اسے مذاق مت سمجھو۔ میں نے جو کچھ کہا پوری سنجیدگی سے کہا اور یہ فیصلہ میں نے سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے"۔

کیا میں طلاق کا سبب جان سکتی ہوں؟" ترنم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"سبب بتانا میں ضروری نہیں سمجھتا"۔

"آپ کو سبب بتانا ہی ہوگا۔ بنا کسی سبب کے آپ مجھے یوں کوڑا کرکٹ سمجھ کر گھر سے باہر نہیں نکال سکتے۔ کیا قصور کیا ہے میں نے؟ میں کہیں کی گری پڑی نہیں ہوں۔ آپ مجھ سے باقاعدہ نکاح کر کے میرے والدین کے گھر سے لائے ہیں"۔ وہ ایک سانس میں ساری باتیں کہہ گئی۔ آنسوؤں کے قطرے ڈھلک کر اس کے رخساروں پر آ گئے تھے۔ "بتائیے نا کیا قصور کیا ہے میں نے؟" اس نے اپنا سوال دوہرایا۔

"قصور تو میں نے کیا ہے جو تم سے شادی کی۔ بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے طلاق لے کر اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ"

"ایسا ظلم مت کیجئے۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اگر آپ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کیجئے لیکن مجھے خود سے جدا مت کیجئے۔ ایک طلاق شدہ عورت کی کسی کی نظر میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ مجھے بیوی نہ سہی ایک خادمہ سمجھ کر ہی اس گھر کے کسی کونے میں جگہ دے دیجئے۔ ساری زندگی اُف نہیں کروں گی"۔ یہ کہتے کہتے ترنم کی ہچکی بندھ گئی۔

"بجائے اس کے کہ تم اس گھر کے کسی کونے میں خادمہ کی سی زندگی بسر کرو دوسری شادی ہی کیوں نہ کر لو" کامران کے اس جملے پر ترنم تلملا اٹھی اور بپھر کر بولی "میں نے آپ سے رائے نہیں مانگی۔ اگر آپ مجھ سے ہمیشہ کے لیے ناطہ توڑنے پر آمادہ ہیں تو آپ کو میری ذاتی زندگی کے سلسلے میں بھی کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں"۔

"تم اپنے والدین کے پاس چلی جاؤ" یہ کہکر کامران کمرے سے باہر نکل گیا۔

"چلی جاؤں گی۔ اور خدا نے چاہا تو آج کے بعد کبھی آپ کی صورت نہیں دیکھوں گی" یہ جملہ ترنم نے چیخ کر کہا اور دوپٹے کا آنچل منھ میں بھر کر سسکیاں لینے لگی۔

جب شوہر نے اس سے منھ موڑ لیا تو وہ لاچار ہو کر اپنے والدین کے گھر چلی آئی۔ ماں باپ ضعیف تھے پنشن پر گذارا تھا۔ ترنم نے اپنا بوجھ خود اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ایک اسکول میں ملازمت کر لی۔ اب اس کی زندگی میں دو ہی کام تھے۔ صبح سے شام تک اسکول میں بچوں کو پڑھانا اور رات میں اپنے مقدر پر آنسو بہانا۔ اس کا دل بار بار اس سے ایک ہی سوال کرتا۔ "آخر اس کا قصور کیا تھا؟" اور جب اسے اس سوال کا جواب نہ مل پاتا تو بے ساختہ آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے۔ کامران نے اس کے دل میں نفرت کا جو بیج بویا تھا اس کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں اور دن بدن پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس کا دل چاہتا وہ ابھی جا کر کامران کا کالر پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالے اور کہے۔ "مجھے آپ سے نفرت ہے۔ میں آپ کو نفرت کی اس آگ میں جلا کر راکھ کر دوں گی اور اس دنیا سے آپ کا نام و نشان مٹا دوں گی۔ اسی نفرت اور کشمکش میں زندگی گذرتی رہی۔

اس روز موسم خوشگوار تھا۔ رات بھر بارش ہونے کے بعد صبح مطلع صاف تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ گلی میں کہیں کہیں پانی بھر جانے کی وجہ سے پھسلن پیدا ہو گئی تھی۔ ترنم آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی اسکول کی جانب جا رہی تھی پھسلن کی وجہ سے راستہ چلنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ اپنے تئیں وہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم بڑھا رہی تھی لیکن یکایک پاؤں پھسل گیا۔ بیگ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود بھی گرتی کسی کی مضبوط باہوں نے اسے سنبھال لیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اس کی آنکھیں اس مددگار کی جانب اٹھیں تو ایکبارگی نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا کیونکہ وہ مددگار کوئی دوسرا نہیں وہی بے رحم کامران تھا جس نے اس کی زندگی کی نیا کو بیچ منجھدھار میں چھوڑ دیا تھا۔ اور آج اسے اس گلی میں سہارا دے رہا تھا۔ اس نے نفرت سے اپنا منھ موڑ لیا اور بیگ اٹھا کر اسکول کی جانب چل دی۔

وہ رات ترنم نے بہت اضطراب میں کروٹیں بدل بدل کر کاٹی۔ کامران کا چہرہ رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا اور وہ نفرت سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی وہ سوچتی اتنی نفرت کے باوجود کامران کی یاد کیوں سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے وہ کیوں نہیں اسے بھول جاتی لیکن وہ کیا کر سکتی تھی یہ نفرت ہی تھی جو اسے کامران کی یاد دلاتی رہتی۔

دسمبر کی جان لیوا سردی آ گئی تھی۔ ہواؤں میں نمی تھی۔ آفتاب طلوع ہو چکا تھا لیکن کہرے نے نور کو اپنے آنچل میں چھپا لیا تھا۔ سردی کے سبب ہاتھ پاؤں برف ہو رہے تھے۔ ترنم حسب معمول ہاتھ میں بیگ لیے اسکول کی طرف جا رہی تھی۔ اچانک اسے لگا کہ بجلی کے کھمبے کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ جب وہ آگے بڑھی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ شخص اس کا پیچھا کر رہا ہے وہ تیز قدم بڑھانے لگی۔ دل میں ایک ہلکا سا خوف پیدا ہوا لیکن وہ اسی طرح چلتی رہی اور وہ شخص سائے کی مانند اس کے پیچھے چلتا رہا۔ اسکول تک یہ سایہ اس کے ساتھ ساتھ رہا مگر اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔ واپسی میں بھی ایسا ہی ہوا اور گھر کے قریب پہونچ کر اسے اس سائے سے نجات مل گئی۔

دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، آدھی راہ طے کرنے کے بعد جب

ترنم سے برداشت نہ ہوا تو وہ غصے سے تلملا اٹھی اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح تیزی سے پلٹی۔ سامنے کامران کھڑا تھا۔

"آپ؟" اس نے نہایت استعجاب سے پوچھا۔

'ہاں میں' کامران نے نرمی سے جواب دیا۔

'تو آپ ہی کل سے میرا پیچھا کر رہے ہیں؟' اس کے لہجے میں شدید برہمی تھی۔

'ہاں!'

'کیوں؟ اب کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟'

'میں جاننا چاہتا ہوں تم کیسی ہو؟'

'آپ کون ہوتے ہیں میرا حال پوچھنے والے۔ آپ سے اب میرا کیا ناطہ ہے؟ میں اب آپ کے لیے غیر ہوں اور ایک غیر لڑکی سے اس کا حال پوچھنے کی آپ نے ہمت کیسے کی؟ کیا شرافت کا لبادہ آپ نے بالکل اتار کر پھینک دیا ہے؟'

'مجھے غلط مت سمجھو ترنم....'

'نام مت لیجئے میرا۔ مجھے آپ سے سخت نفرت ہے اگر آپ میرا نام اپنی زبان پر لائے تو شاید مجھے اپنے نام سے بھی نفرت ہو جائے' ترنم اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"اتنی نفرت ہے مجھ سے؟"

"اور کیا امید رکھتے ہیں آپ اپنے لیے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

'میں اپنے لیے یہی امید رکھتا ہوں لیکن اس نفرت کی آگ میں تم اپنی زندگی کو جلا کر راکھ مت کرو۔ میں تمہارا پیچھا صرف یہ کہنے کے لیے کر رہا تھا کہ تم دوسری شادی کر لو'۔

'کامران!' ترنم چیخ پڑی۔ خبردار جو اس کے آگے ایک لفظ بھی کہا' وہ غصے سے کانپنے لگی

'ہاں ترنم میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ تمہارے سامنے ابھی ام زندگی پڑی ہے اور زندگی کا راستہ بہت دشوار ہے بغیر کسی سہارے کے تنہا سفر طے کرنا مشکل ہو جائے گا' اس بار کامران کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ لیکن ترنم کے دل کو یہ آنسو پگھلا نہ سکے بلکہ نفرت کے شعلوں کو بھڑکانے کے لیے ان آنسوؤں نے مٹی کے تیل کا کام کیا۔ ان آنسوؤں کو اس نے صرف مکاری سمجھا۔ اس نے محسوس کیا کہ کامران کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے۔

'لگتا ہے آپ کی بیوی نے آپ کو ٹھکرا دیا ہے اور تب آپ کو میرے درد کا اندازہ ہوا'۔

'بیوی؟ میں نے شادی ہی کب کی؟' اس جواب پر ترنم حیران رہ گئی۔ اسے لگا کامران اس سے دوبارہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہے تو اس نے اسے طلاق کیوں دی؟

"کیا آپ کا مقصد یہ تو نہیں کہ آپ مجھ سے دوبارہ شادی کریں"۔ ترنم نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

"نہیں! میں تم سے شادی نہیں کرونگا۔ تم کسی اور سے شادی کرلو"۔

"میں آپ کو ایک بار پھر یاد دلا دینا چاہتی ہوں کہ آپ کا مجھ سے اب کوئی رشتہ نہیں ہے اور میں آپ سے جتنی نفرت کرتی ہوں اس کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے اپنی صورت بھی نہ دکھائیں۔ آج کے بعد پھر کبھی میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو انجام برا ہوگا'۔ یہ کہہ کر وہ بغیر کچھ سنے آگے بڑھ گئی۔ اس نے یہ جاننے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ جب کامران کو دوسری شادی بھی نہیں کرنی تھی تب اس نے اسے طلاق کیوں دی۔ اور اب اس سے دوسری شادی کرنے کی ضد کیوں کر رہا ہے؟ طلاق دیتے وقت اس کے لہجے میں سختی تھی لیکن آج وہ کتنی نرمی سے باتیں کر رہا تھا۔ آخر کیوں؟ ان سوالوں کے ساتھ ساتھ ترنم کی زندگی بھی ایک سوال بن کر رہ گئی تھی۔ اس کو اپنی زندگی الجھن کی زنجیروں میں جکڑی نظر آئی۔ اور اس الجھن کو پیدا کرنے والا کامران تھا۔ صرف کامران۔ جتنا زیادہ وہ اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی اتنا ہی وہ اس کے قریب آتا۔ جب وہ اپنی بالکنی میں کھڑی ہوتی تو گلی میں اسی بجلی کے کھمبے کے پاس

ں نظر آتا جو اس کی راہ دیکھتا رہتا اور جب وہ گھر سے باہر
تو کامران کے اس برتاؤ پر وہ بُری طرح جھلا اٹھی۔ آخر
صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تو ایک روز وہ کامران پر برس
اور اسی گلی میں اسے ڈانٹنے پھٹکارنے لگی۔ شور سنکر
راہ گیر اکٹھا ہو گئے اور ترنم سے اس کا سبب پوچھا تو وہ بے
سے بول اٹھی۔ "یہ بدمعاش روز میرا پیچھا کرتا ہے اور
سے الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے"۔ ترنم کی اس شکایت
ن لوگوں نے کامران کو بہت پیٹا اور اسے دھکے دے کر
سے باہر نکال دیا۔ اس دن ترنم کے دل کو تھوڑا سکون
۔ اسے لگا اس کے دل میں سلگتی آگ کی تپش کچھ کم ہو گئی ہے
ھا ہی ہوا جو اس نے کامران کو پٹوا دیا۔ کم از کم اسی بہانے اس نے
مران کی زیادتی کا انتقام تو لے لیا۔

اس واقعہ کو گذرے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا جب کامران
دوست اقبال ترنم کے ساتھ اپنی شادی کا پیغام لے کر اس کے گھر
یا۔ ترنم کا خون کھول اٹھا۔

'آخر آپ دونوں دوستوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ میری
اتی زندگی میں یوں دخل دینے کا حق آپ کو کس نے دیا؟'
ہ دانت پیس کر بولی۔

'دونوں؟ میں سمجھا نہیں۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'

'مجھے اتنا بیوقوف مت سمجھئے مسٹر اقبال۔ میں سب
سمجھتی ہوں۔ جب وہ اس گلی سے جوتے کھا کر بھاگ لیے تو
انھوں نے آپ کو بھیجا'۔

"کس نے؟ تم صاف صاف بتاؤ۔ پہیلیاں کیوں بجھا رہی
ہو" اقبال نے بڑی متانت سے پوچھا۔

'پہیلیاں وہ کیا بجھائے گا جو خود ایک پہیلی ہو۔ بہر حال
مجھے آپ سے کچھ کہنا سننا نہیں ہے۔ آپ جا کر اپنے عزیز دوست
کامران کو سمجھا دیں کہ وہ میری زندگی میں دخل نہ دیں تو بہتر ہے'۔
کامران سے تو میرا جھگڑا ہو گیا ہے۔ اسی طلاق کی بات کو

لے کر۔ میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن اس نالائق کو پتہ نہیں کیا ہو گیا
تھا۔ سچ پوچھو تو وہ دوستی کے لائق ہے ہی نہیں۔ اور تمھیں یہ جان
کر شاید خوشی ہو کہ دو تین روز پہلے اس نے یہ شہر بھی چھوڑ دیا ہے۔

'خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے اللہ کرے اب وہ صورت مجھے
کبھی نظر نہ آئے'، ترنم نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کر
لیں۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اقبال جا چکا تھا اور میز پر
ایک پرچہ پڑا ہوا تھا۔ ترنم نے وہ پرچہ اٹھا کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"ترنم زندگی کو ہنسی مذاق مت سمجھو۔ تمھارے ماں
باپ کے بعد تمھاری حفاظت کرنے والا کون ہو گا میں تمھاری بھلائی
کے لیے تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ فیصلہ تمھارے ہاتھ میں
ہے۔ اقبال"۔ اس خط نے ترنم کے ذہن میں طوفان برپا کر دیا۔

"تمھارے ماں باپ کے بعد تمھاری حفاظت کرنے والا کون ہو گا؟"
اس جملے میں کتنی صداقت تھی۔ سچ مچ اس دنیا میں اس کا محافظ کون
ہو گا؟ اس کے بُرے وقت میں اس کا ساتھ دینے والا کون ہو گا؟
اگر اس نے شادی نہیں کی تو اس کی موت کیڑے مکوڑوں کی مانند
ہو گی۔ چند جملوں کا خط اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح
لگنے لگا۔ اس کے منھ سے ایک دبی سی آواز نکلی۔ "میں کیا
کروں؟" اس سوال کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ
گھبرا کر کھڑکی کے پاس چلی آئی۔ دیکھا امّی جان آنگن میں بیٹھی
دھوپ کھا رہی ہیں۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے وہ دوڑ کر
امّی جان کے پاس چلی گئی اور ان کے قدموں میں گر کر بے ساختہ
رونے لگی۔ امی جان اس کا درد جانتی تھیں۔ آنکھیں بھر آئیں
لیکن اس وقت ترنم کو تسلی دینا انھوں نے زیادہ ضروری سمجھا
اس لیے اپنے آنسو پی کر بولیں۔ "دل کیوں چھوٹا کرتی ہے
بیٹی! میں جانتی ہوں تو کیوں رو رہی ہے۔ اقبال سے میری بات
ہو چکی ہے۔ اگر وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس میں
برائی کیا ہے؟ کب تک تو اپنے آپ پر ظلم کرتی رہے گی۔ میں
چاہتی ہوں تو اپنا گھر بسا لے۔ اس طرح تیرے سارے غم

دور ہو جائیں گے۔ کامران کی یاد تیری زندگی تباہ کر دے گی ۔۔۔ !

"مجھے تو ان سے نفرت ہے" ترنم سسکیاں لیتے ہوئے بولی ۔

"پھر کیا رکاوٹ ہے ؟" انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں ؟"

"اس میں سوچنے سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اقبال اچھا لڑکا ہے ۔ تیرے ابا جان کی بھی یہی مرضی ہے تیری حالت اب ان سے دیکھی نہیں جاتی ۔ ہم دونوں تجھے بے سہارا چھوڑ کر کیا چین سے مر سکیں گے ؟"

للہ ایسامت کہیے امی جان مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے میں سوچ فیصلہ کروں گی، یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آگئی ۔ سامنے قدِ آدم آئینہ اسے دیکھ رہا تھا۔ ترنم آئینے کے قریب گئی آئینہ اس سے کہہ رہا تھا "حماقت مت کر، سب کا کہنا مان لے دیکھ تیری کیا حالت ہو گئی ہے ؟ تیرا چہرہ جو کل تک تازہ گلاب کی مانند خوش رنگ تھا آج مرجھا کر کیسا بدرنگ ہو گیا ہے ؟ لبوں کی سرخی پر سیاہی حاوی ہو گئی ہے ۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں ۔ کل تک جب یہ لمبی لمبی پلکیں اٹھتی تھیں تو لوگ تیری آنکھوں کی گہرائی میں گم ہو جاتے تھے لیکن آج جب یہ پلکیں اٹھتی ہیں تو ایسا لگتا ہے اب یہ آنکھیں باہر نکل آئیں گی ۔ چاند کی مانند دمکنے والی پیشانی پر چند لکیریں ابھر آئی ہیں ذرا سوچو کیا تم خود پر یہ ظلم نہیں کر رہی ہو ؟ نفرت تو تمھیں کامران سے ہے ۔ اپنے آپ سے تو نہیں ۔ پھر کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو ؟" آئینہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے ۔ امی جان کی بات بھی اسے بے چین کر چکی تھی ۔ اس لیے اس نے آئینہ کی اس صلاح پر ہامی بھر دی اور مسکرا کر کہا "تم ٹھیک کہتے ہو ۔ یہ ظلم میں اپنے آپ پر ہی نہیں بلکہ اپنے والدین پر بھی کر رہی ہوں اس لیے میں تمھاری رائے سے متفق ہوں" اس نے ایک گہری سانس لی اور مطمئن ہو کر بالکنی میں جا کر کھڑی ہو گئی ۔ گلی میں چہل پہل تھی اس نے ایک نظر بجلی کے کھمبے پر ڈالی تو اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھر آئی ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کامران کا خیال آگیا تو دل کے کسی گوشے میں نفرت سر اٹھانے لگی ۔ کامران تین چار دنوں سے یہاں نظر نہیں آ رہا تھا ۔ جوتے کھانے کے بعد اس نے یہ گلی ہی نہیں یہ شہر بھی چھوڑ دیا ۔ اس پر ترنم کو ہنسی آگئی ۔ اس وقت اسے اپنی اس کامیابی پر ایک عجیب سی مسرت کا احساس بھی ہوا ۔ لیکن وہ زیادہ دیر بالکنی میں کھڑی نہ رہ سکی ۔ شاید اسے اس کھمبے سے بھی نفرت ہو گئی تھی جس کے نزدیک کھڑے ہو کر کامران اس کا انتظار کرتا تھا ۔ کامران کی وجہ سے ترنم نے بالکنی میں جانا بند کر دیا تھا لیکن آج جب اسے معلوم ہو گیا کہ کامران نے یہ گلی ہی نہیں بلکہ شہر بھی چھوڑ دیا ہے تو وہ خوشی سے پھولی نہیں سمائی اور بالکنی میں چلی آئی لیکن بالکنی میں آ کر وہ ٹھہر نہ سکی کیونکہ سامنے ہی وہ بجلی کا کھمبا تھا اور اس کھمبے سے وابستہ تھیں کامران کی یادیں ۔ جسے اب وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے نزدیک نہیں لانا چاہتی تھی ۔ اب اس کے دل میں ایک نئی چاہ پیدا ہو چکی تھی ۔ پل بھر میں اس نے اپنے خوابوں کا ایک حسین محل تعمیر کر ڈالا تھا ۔ ایک نئے ڈھنگ سے جینے کا انداز اس نے سیکھ لیا تھا ۔ اب اگر اسے کسی کا انتظار تھا تو آنے والے کل کا ۔ وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی اور سوچنے لگی جب اقبال میرا فیصلہ سنے گا تو خوشی سے پاگل ہو جائے گا ۔ لیکن اس کا خیال غلط نکلا ۔ اقبال اس کا فیصلہ سننے نہیں آیا ۔ وہ روز اس کا انتظار کرتی لیکن نتیجہ وہی مایوسی ' اداسی اور تنہائی ۔۔۔ ہفتوں گذر گئے مگر اقبال نے اس دن کے بعد سے اپنی شکل تک نہیں دکھائی لیکن یہ کہہ کر وہ دل کو تسلی دے لیتی کہ اقبال کسی ضروری کام سے باہر گیا ہوگا ورنہ ضرور آتا ۔ اور وہ آئے گا ۔ لیکن ایک رات وہ اپنے کو سنبھال نہیں پائی ۔ دل ایک دم بھر آیا ۔ ہونٹ کانپے ، ڈبڈبائی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ تاریکی ۔ سن سن کرتی تیز ہوائیں کھڑکی

کے پردوں کو جھولا جھلا رہی تھیں۔ کمرے کی ہر شے نہایت خاموشی سے اس کے غم میں شامل تھی اور اس کی تنہائی پر آنسو بہا رہی تھی گلی میں کتے بھونک رہے تھے۔ رات بھی ترنم کے ساتھ گریہ کناں تھی۔ عجیب وحشت اور بے کلی کا عالم تھا اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے اور رات کی یہ اذیت ناک خاموشی توڑ دے اور اپنی پوری طاقت سے اسقدر چلائے کہ سارا شہر جاگ اٹھے زندگی میں اتنی بے چینی اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی جتنی آج محسوس کر رہی تھی۔ پہاڑ جیسی رات کتنا مشکل ہوگئی۔ کروٹیں بدل بدل کر کسی طرح اس نے یہ رات کاٹی اور آخر کار چار سو سیاہی مائل صبح نمودار ہوئی۔ کمرے کی زیادتی سے دم گھٹا جاتا تھا۔ رات بھر کی جاگی ترنم جو بے صبری سے صبح کا انتظار کر رہی تھی فوراً بستر سے اٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ تبھی اس کی نظر گھڑی پر پڑی جو اسے اسکول جانے کی یاد دلا رہی تھی اس نے اسٹینڈ پر پڑا تولیہ اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور اپنے کھلے بالوں کو سمیٹتے ہوئے دروازے کے پاس آگئی۔ اچانک اس کی نظر آئینہ پر پڑی۔ اور وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ گال دھنسے ہوئے تھے۔ اس نے ایک آہ بھری اور آئینہ سے پوچھ بیٹھی "کیوں مجھے حسین خواب دکھائے تو نے؟ ——— میری سوئی تمناؤں کو کیوں جگا دیا؟ اب یہ میرے دل میں سوئی کی طرح چبھ رہی ہیں۔ میرا دل چھلنی ہوا جا رہا ہے۔ پرانا زخم تازہ ہوگیا ہے میں کیا کروں؟ جواب دے مجھے۔ تو خاموش کیوں ہے؟

اسی دوران کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ چونک پڑی۔ اتنی صبح صبح کون آگیا؟ اس نے سوچا۔ دل میں ایک انجانا سا خوف جاگا اور اس نے ہولے سے پوچھا۔ "کون؟"

'میں اقبال ہوں'۔ اقبال کی آواز سنتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ سوجی ہوئی آنکھوں میں اچانک چمک آگئی ہونٹوں پر تبسم لیے اس نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔

'آپ آگئے؟ لیکن اتنے دنوں تک کہاں تھے؟ میرا فیصلہ سننے بھی نہیں آئے؟ کیا آپ کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں میں غلط فیصلہ نہ کروں؟ گھبرائیے نہیں میں نے بہت صحیح فیصلہ کیا ہے جسے سن کر آپ خوشی سے جھوم اٹھیں گے'۔ ترنم بولتی چلی گئی۔ پھر وہ یکایک خاموش ہوکر اقبال کو غور سے دیکھنے لگی۔ اقبال بالکل خاموش تھا۔ اس کے کپڑے بھی میلے تھے۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ چہرے پر گہری اداسی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر سویا نہیں ہے۔ ترنم اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ کیا قسمت نے اس کے ساتھ پھر کوئی تلخ مذاق کیا ہے؟ لیکن کیسا مذاق؟ اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ تو سامنے تھی۔ یعنی اقبال۔ لیکن اتنا خاموش اور اتنا اداس؟ آخر کیا وجہ ہے؟ 'اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی'۔ اقبال کی آواز نے اس کی سوچوں کا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔

'آئیے'۔ اس نے دبی آواز میں کہا۔ اقبال اندر آکر بھی خاموش رہا۔ اس کی خاموشی فضا میں زہر گھول رہی تھی۔ جب اس خاموشی سے ترنم کا دم گھٹنے لگا تو اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ 'کیا بات ہے؟ اقبال نے کوئی جواب نہیں دیا۔

'کیا آپ کہیں باہر گئے ہوئے تھے'؟

'ہاں! دہلی'۔

'کب آئے؟

'کل رات'۔

'آپ ہر سوال کا جواب اتنا مختصر کیوں دے رہے ہیں؟ کب تک میں اس خاموشی کو توڑنے کی کوشش کرتی رہوں گی؟ بتائیے نا کیا بات ہے؟ کون سا ایسا غم آپ پر ٹوٹ پڑا ہے جس نے آپ سے کچھ بتا سکنے کی بھی طاقت چھین لی ہے'؟ اس سوال پر اقبال کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے ترنم کی سوالیہ آنکھوں میں جھانکا اور پھر قمیص کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ 'تمہارے ہر سوال کا جواب اس لفافہ میں موجود ہے'۔ یہ کہتے ہوئے

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے دروازے کے باہر نکل گیا
ترنم حیرت زدہ آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے لفافہ کھول کر اس میں رکھا ہوا خط نکالا اور پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

"ترنم جب تمھیں یہ خط ملے گا تب تک میں تم سے بہت دور جا چکا ہوں گا۔ جانے سے پہلے میں تمھیں طلاق کا وہ سبب بتا دینا چاہتا ہوں جسے جاننے کے لیے تم بے حد مضطرب تھیں۔ وہ سبب یہ تھا کہ مجھے بلڈ کینسر ہو گیا تھا۔ شادی کے بعد مجھے اس بیماری کا پتہ چلا مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ بہت جلد موت مجھے اپنے شکنجے میں لے لے گی اس لیے میں چاہتا تھا کہ تم دوسری شادی کر لو۔ میں تمھاری زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ اگر تمھیں طلاق کا اصل سبب معلوم ہو جائے گا تو تم کبھی دوسری شادی کرنا گوارہ نہیں کرو گی۔ اس لیے میں نے پہلے تمھارے دل میں اپنے لیے نفرت پیدا کرنا ضروری سمجھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی تو دوسری شادی بھی کر لو گی لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔ تب میں نے تمھاری گلی میں آکر تمھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ جب اس بار بھی کامیابی نہیں ملی تو میں نے اقبال سے کہا کہ وہ تمھیں سمجھا بجھا کر تمھیں اپنا بنا لے۔ لیکن اقبال کی باتوں سے لگا کہ تم اب بھی راضی نہیں ہو اقبال اچھا لڑکا ہے۔ میرا اقبال سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ وہ تو تمھیں پانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔ میری موت بہت قریب آ گئی ہے۔ اقبال ہر وقت میری خدمت میں مصروف رہتا ہے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ زندگی میں تو میں تمھاری دوسری شادی کی خوشخبری نہ سن سکا لیکن مرنے کے بعد میری یہ خواہش پوری کر دینا۔"

بدنصیب کامران

"نہیں" ایک دردناک چیخ کمرے میں گونج اٹھی۔ خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اور وہ تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی بالکنی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ گلی خاموش تھی۔ بجلی کا وہ کھمبا خاموش و ساکت کھڑا تھا۔ اس کی بے چین آنکھیں گلی میں دور دور تک کامران کو تلاش کرنے لگیں۔ "وہ ضرور آئیں گے میں ان کی ہوں صرف انکی اور ہمیشہ ان کی رہوں گی؛ وہ اپنے خود سے کہنے لگی اور کھمبے کو اس طرح دیکھتی رہی گویا کامران ابھی یہاں آکر اس سے کہے گا۔ "ترنم تم دوسری شادی کر لو۔ تب وہ دوڑ کر اس سے لپٹ جائے گی اور کہے گی "میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ میری شادی تو آپ سے ہو چکی ہے۔ میں آپ کی ہوں صرف آپ کی" اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ شاید اب کچھ کہنے کی سکت اس میں نہیں تھی۔ وہ تھک گئی تھی لیکن اس کی آنکھیں نہیں تھکی تھیں جو اب بھی بجلی کے کھمبے پر مرکوز تھیں۔

کہرا اب چھٹ چکا تھا۔ کیاری میں لگے گلاب کے مرجھائے پھول پر شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

✦

دس انچ زمین

۳۸ کا بقیہ

ایسی جگہ جہاں تم لوگ اپنا سر چھپا سکو۔ مجھے صرف اپنے لئے اس دنیا میں پاؤں ٹکانے کی جگہ مل سکی ہے۔ جاؤ تم سب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ جاؤ اور تم سب بھی اپنے اپنے پاؤں ٹکانے کا خود کوئی نہ کوئی انتظام کر لو۔"

بیگم اور بچے سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ سب نے خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے سے کھسر پھسر شروع کر دی۔

"راتوں کی لگاتار بے خوابی نے ان کے دماغ پر بھی اثر ڈال دیا ہے"

"ڈاکٹر کو بلوائیں۔ ؟ مگر فیس کہاں سے دیں گے ؟!"

"اے خدا۔ ہمارے ابا جان کی حالت پر رحم فرما!"

نقد و تبصرہ

تبصرہ کیلئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "تلاش و تعبیر"

مصنف: رشید حسن خاں   قیمت: پینتالیس ۴۵ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی

رشید حسن خاں کے مضامین کا زیر نظر مجموعہ "تلاش و تعبیر" جو حال ہی میں شائع ہوا ہے وہ ان کے پچھلے ۲۵، ۳۰ برسوں کے بہت سے مضامین کا انتخاب ہے اور اس کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کی توجہ کا مرکز بھی ہمارا شعری ادب ہے۔ چنانچہ اس مجموعے کے نصف سے زائد مضامین ایسے ہیں جن میں شعراء کے کلام کا مختلف حیثیتوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ تحقیقی مضامین کا تعلق بھی شعراء سے ہے۔

رشید حسن خاں اس صف کے ادیبوں میں ہیں جن کی ذہنی تربیت فارسی اور عربی کے وسیع مطالعہ سے ہوئی۔ اور اردو ادب کے گہرے مطالعہ کے نتیجہ میں اس کے سارے شہ پارے ان کی نظروں کے سامنے آتے رہے۔ انھیں کو رشید حسن صاحب نے ادب کا معیار قرار دیا اور انھیں میں ان کی اثر پذیری اور جاذبیت کی بنیادیں تلاش کیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچھے اور اعلا ادب کی خوبیاں اور ان خوبیوں تک رسائی کے ذرائع انھوں نے اردو ادب ہی میں تلاش کیے اور اس تلاش اور تحقیق کا جو نچوڑ تھا وہ ان کے مقالہ "زبان و بیان کے بعض پہلو" سے واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ "اعلا شاعری کے لیے حسنِ بیان، فصاحت کلام اور معانی و بیان کے ضروری قاعدوں پر عبور" کے ساتھ ساتھ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "فن اور اس کے ضابطے تلاش کے طلبگار ہوتے ہیں" اور اچھی شاعری کے لیے مشق اور فکر و تامل کی اہمیت کا احساس بنیادی شرط ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی خاص نظریہ کے تحت تخلیق کردہ ادب اعلا ادب نہیں ہو سکتا، اور اسی طرح کسی نظریہ کا پابند ہو کر ادب کا مطالعہ ادبی محاسن کے برملا اعتراف کی مسرت سے محروم کردیتا ہے۔

جن جن شعراء کے کلام پر رشید صاحب نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے، اس کی قدر و قیمت کا تعین رشید صاحب نے مذکورہ بالا پیمانوں سے کیا ہے۔ "سیماب بلند خیالی کے ساتھ بلند الفاظ کے موجد تھے" اور "غیر صالح عشقیہ عناصر کو لعنت سمجھتے تھے جس کے نتیجہ میں ان کی غزلوں کا بڑا حصہ بے کیف ہو گیا۔" اس صورتِ حال کو رشید صاحب نے سیماب کے کلام سے ہی واضح کیا ہے۔ مومن کے کلام میں "بیان کی غیر ضروری اور غیر پسندیدہ پیچیدگی سے جو ناہمواری پیدا ہو گئی" اس کی مثالیں رشید صاحب نے مومن کے کلام ہی میں تلاش کرلیں۔ حالی نے جب سماجی بغاوت اور قومی اصلاح کے جذبہ کے تحت شعر کہے تو ان کی غزلیں سپاٹ پھیکی اور بے کیف ہو کر رہ گئیں۔ اس کا ثبوت بھی رشید صاحب نے حالی کے کلام سے فراہم کردیا۔ جوش کی شاعری کو لفظی اصراف نے جس طور پر تاثیر سے محروم کردیا۔ اس کے ثبوت کے لیے رشید صاحب نے جوش کے کلام کے بہت سے اقتباسات پیش کردیے اور جوش کی متعدد طویل نظموں کے حوالے سے اپنی بات ذہن نشین کرادی۔ فیض کی شاعری میں زبان و بیان کے جو عیوب رشید صاحب کو نظر آئے ان کی نشان دہی انھوں نے فیض کے کلام سے کردی اور فیض کی طرح اس عہد کے دوسرے ممتاز شعراء (سردار جعفری، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، مجروح اور ساحر وغیرہ) جس طرح زبان و بیان سے بے نیازی برت رہے ہیں یا ایسی صنائع کا استعمال کرنے لگے ہیں جو ہماری زبان کے مزاج کے خلاف ہیں اس کی مثالیں رشید صاحب نے پیش کردی ہیں اور اپنی بات کی تائید

یں جو مواد رشید صاحب نے فراہم کیا ہے وہ ہر غیر جانب دار پڑھنے والے کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ رشید صاحب نے ان شعراء کی قیمتی تخلیقات سے چشم پوشی اختیار کی ہو بلکہ کشادہ نظری سے ان کی ستائش کی ہے اور اس طور پر سخن فہمی اور اعلا ادب سے لطف اندوز ہونے کا ایک معیار ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اور یہ بڑی بات ہے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے جب ان شعراء کے کلام کا تجزیہ کیا ہے تو ان کے سامنے اپنے ہی ادب کے صالح روایات اور اپنے ہی ادب کے اعلا نمونے تھے۔

آجکل جو مغربی ادب سے متاثر ہو کر اور مغربی نقادوں کے نظریات کے تحت ادب کا جائزہ لیا جانے لگا ہے اور جس طور پر مغربی نقادوں کے حوالے اور ان کی اصطلاحات ہمارے تنقیدی مضامین میں جگہ پا رہی ہیں ان کے خلاف رشید صاحب کے تنقیدی مضامین ایک کھلا چیلنج ہیں۔

تنقیدی مضامین کے علاوہ اس مجموعے میں متعدد تحقیقی مضامین ہیں۔ تحقیق و تدوین ہی رشید صاحب کا مشغلہ رہا ہے۔ اس باب میں ان کی کئی قیمتی تصانیف ہمارے سامنے آ چکی ہیں ان کے بارے میں کسی تفصیل میں جائے بغیر یہ کہنا ہے کہ رشید صاحب کے تحقیقی مقالے اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ہمارے ادب کے کتنے ہی اہم گوشے ایسے ہیں جو تحقیق طلب ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب کشادہ نظری سے پڑھنے اور بار بار پڑھنے کی دعوت دیتی ہے۔

——— شبیر حسن خاں

نام کتاب :۔ **طناب** (شعری مجموعہ)
شاعر: وقار طاہری　　قیمت: بیس روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ دین و ادب۔ امین آباد لکھنؤ

وقار طاہری نے اپنا اولین شعری مجموعہ "طناب" پورے یقین و اعتماد اور وثوق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یقین و وثوق کی یہ دولت انھیں اس لیے حاصل ہے کہ وہ شعر کے اس پیچیدہ طلسم سے واقف ہیں جو لفظیات کے بے کراں جہانوں کو عبور کرتا ہوا روح کی گہرائیوں تک خود کو لے جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر اس کا وجود پھر خود کچھ نہیں رہتا بلکہ ایک اکائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ان کی شاعری کے ہر ایک پہلو کو اگر انفرادی طور پر بیان کیا جائے تو بات کچھ بنتی ہوئی نظر نہیں آئے گی ہاں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وقار طاہری کی غزل میں ان کا عہد سانس لیتا ہے (میں نے ان کی غزل کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل بھی وہ جسے جدید غزل کے نام سے پکارا جاتا ہے) اور کرب میں ڈوبی ہوئی یہ آواز بہت موثر اور فعال ہے ؎

صدیوں کو شکست دینے والا
لمحوں سے نبرد آزما ہے

وقار طاہری اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ کس طرح غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنا کر اس سے مفاہمت کر لی جاتی ہے اور کس طرح ہر لمحہ حیات سے کسبِ نشاط کیا جا سکتا ہے۔

وقار طاہری جدید و قدیم کے مسئلے میں نہیں الجھتے لیکن جدید لفظیات کو برتنے کا سلیقہ جانتے ہیں ؎

مرے لیے تو فقط نشۂ بدن ہے بہت
اٹھا کے یہ مے و مینا گلاس رکھ دینا

اپنے شعری لہجہ کے بارے میں انھوں نے مشہور عربی شاعر زہیر ابن ابی سلمیٰ کا ایک قول اپنی کتاب کے دیباچے میں نقل کیا ہے جس سے ان کے نظریات کا سراغ ملتا ہے۔

مجموعہ کے شروع میں بھی ابن رشیق کا ایک قول موجود ہے جو ان کے وسیع مطالعہ کا غماز ہے۔

مجموعی طور پر کتاب دیدہ زیب ہے اور صرف قابلِ مطالعہ ہی نہیں بلکہ کچھ اشعار یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ گرد پوش کی خوبصورتی اور دلکشی کے لیے احتشام صدیقی قابلِ مبارکباد ہیں۔

——— عشرت ظفر

نام کتاب: "ناگزیر"

مصنف: مناظر عاشق ہرگانوی   قیمت: تیس روپئے

ملنے کے پتے: (۱) مکتبۂ توازن۔ ۴۵۴، نیاپورہ، مالیگاؤں۔ ناسک

(۲) نیو کتاب منزل۔ تاتارپور، بھاگلپور ۲ بہار

تنقید اور تحقیق کی جولاں گاہیں یوں تو دیکھنے میں بہت کچھ ہموار نظر آتی ہیں لیکن جب کوئی نقاد یا محقق اس میدان میں اُترتا ہے تو اسے ایسے ایسے ہفت خوان نظر آتے ہیں جن کے بارے میں اس نے کبھی خواب وخیال میں بھی نہ سوچا ہوگا۔

"ناگزیر" مناظر عاشق ہرگانوی کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا تازہ مجموعہ ہے اس سے قبل ان کے چار مجموعے تنقید اور تحقیق سے متعلق شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی تحقیق اور تنقید کو ابھی وہ اعتبار حاصل نہیں ہو سکا جس کی وہ مستحق ہیں "ناگزیر" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر جگہ ان کی تنقید میں مکتبی تنقید کا سا انداز در آتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ان کی تنقید کے معتبر بننے میں مانع رہی یا پھر دوسروں کے حوالوں سے اپنی بات کہنے کا انداز۔ یہ سچ ہے کہ ہر نقاد اور محقق نہ تو کلیم الدین احمد ہو سکتا ہے اور نہ قاضی عبدالودود۔ لیکن اس کو اپنی بات کہنے کا سلیقہ ضرور آنا چاہیے اور ناگزیر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مناظر عاشق کو اپنی بات کہنے کا سلیقہ آتا جا رہا ہے۔

—— وقار ناصری

جمیل مہدی ایک بیباک صحافی ص ۵۶ کا بقیہ

تے تھے۔ اس وقت بھی ان کی گفتگو کی دلکشی اور جاذبیت میں میں نے کوئی کمی محسوس نہیں کی اور انتقال سے تین روز قبل جب میں نے اسپتال جاکر ان کی مزاج پرسی کی تو انھوں نے میر کے اس شعر سے جواب دیا ؎

تھا میر جن کو عشق کا آزار مر گئے
کتنے ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

یہ شعر سن کر میں نے پہلی دفعہ ان کے اندر سے جھانکتی ہوئی مایوسی کو محسوس کیا۔ لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا اور پھر ماحول میں بے تکلف ہنسی مذاق کا ماحول پیدا کر دیا۔

خدا نے ان کو مختلف النوع خصوصیات سے نوازا تھا۔ وہ اپنی فکر اور اپنے عقیدے کے اعتبار سے ایک مرد آہن تھے جس کے پایۂ ثبات کو کسی طرح کا بھی خوف اور کسی طرح کا لالچ متزلزل نہ کر سکا۔ میں نے کتنے ہی پہاڑوں کو وقت کے زلزلوں سے ڈگمگاتے ہوئے دیکھا، کتنے ہی تناور درختوں کو زمانے کی تیز آندھی سے اکھڑتے دیکھا لیکن اس مرد قلندر کو ہمیشہ اٹل اور مضبوط پایا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی طوفان نہ آیا ہو، کوئی آزمائش نہ آئی ہو۔ انھوں نے بہت سی آزمائشوں، بہت سے طوفانوں اور سیلابوں کو اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا جن میں ان کے گرد و پیش کے کتنے ہی قد آور لوگ خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے لیکن وہ "شجر تنہا" کی طرح ثابت و مستحکم رہے۔

مرحوم جمیل مہدی کسی مدرسے کے فاضل یا کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ نہیں تھے۔ انھوں نے کسی مدرسے یا کسی یونیورسٹی کے احاطے میں جاکر اپنی ذہنی اور فکری پرواز کو کسی خاص موضوع کے دائرے میں مقید نہیں کیا بلکہ اپنے سامنے علم وادب اور صحافت کے متعدد میدان کھلے رکھے اور ہر میدان میں اپنے منفرد اسلوب کے لازوال نقوش چھوڑے۔ وہ خود علم وادب کا چلتا پھرتا ایک ادارہ، ایک انسائیکلوپیڈیا بلکہ ایک لائبریری تھے۔ اور میں یونیورسٹیوں کے کئی ایسے اسکالرز سے واقف ہوں جنھوں نے اپنے مقالوں اور پروجکٹوں کی تکمیل میں اس چلتی پھرتی لائبریری سے استفادہ کیا ہے۔

ایک ایسا انسان جو بے پناہ فطری اور کسبی صلاحیتوں کا مالک تھا اگر چاہتا تو دنیا کی کون سی ایسی نعمت تھی جو اسے حاصل نہ ہو سکتی تھی لیکن وہ ہمیشہ مال وزر اور عہدہ ومنصب سے بے نیاز رہا۔ اس نے دردِ دل جیسی دولت کے مقابلے میں دنیا کی تمام نعمتوں کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں اور ساری زندگی ایک ایسی رہ گزر میں کاٹ دی جس میں حد نظر تک نہ کوئی منزل تھی، نہ کوئی سایہ تھا۔

قرۃ العین حیدر
نئی دہلی

جمیل مہدی ایک منفرد صحافی



جمیل مہدی مرحوم و مغفور سے صرف دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ایک بار لکھنؤ میں علیک سلیک، زیادہ گفتگو کا وقت نہ مل سکا آخری بار ۱۹۸۶ء میں، جب وہ دہلی تشریف لائے تھے۔ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ فرمایا:

"اب تو ہم جو کہتے ہیں یا لکھتے ہیں اسکو سمجھنے والے بھی نہیں رہے۔"

اس قدر حوصلہ شکن حالات کے باوجود نہایت پابندی کے ساتھ عزائم جاری رکھا جو صحیح معنوں میں مرحوم کی ہمت، اصول پرستی اور انسان دوستی کا آئینہ دار رہا۔ جمیل مہدی مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد والی صحافتی روایت کے نام لیوا تھے۔ آج سے اٹھارہ سال قبل انھوں نے ایک اداریہ میں تحریر کیا:

"میری سمجھ میں یہ بالکل نہیں آتا کہ جب میں اجتماعی گمراہیوں، اجتماعی غلط روی اجتماعی غلط کیشی اور غلط سیاست کو صاف صاف دیکھ سکتا ہوں تو صاف صاف اس کا اظہار کیوں نہ کروں؟"

مرحوم ایک ایسے درویش صفت انسان تھے جو منافقت اور مصالحت کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے۔ لکھنؤ کے شرمناک شیعہ سنی جھگڑوں کے دوران جو اداریے انھوں نے لکھے وہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن ہماری قوم کے اوصاف حمیدہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پرانی مخاصمت اور تعصبات ہرگز فراموش نہیں کرتی۔ ہوش مندی کی باتیں فوراً بھلا دیتی ہے

جمیل مہدی کے پاس کوئی یونیورسٹی ڈگری نہیں تھی لیکن وہ ایک وسیع المطالعہ صحافی اور صاحب طرز نثر نگار تھے۔ ان کی مؤثر تحریریں ان کے خلوص اور درد مندی کی بہترین ترجمان تھیں۔ جدوجہد آزادی کے متعلق کافی عرصہ ہوا انھوں نے عزائم کا ایک ضخیم خصوصی نمبر شائع کیا تھا، وہ ان کی تاریخی اور سیاسی بصیرت کی ایک روشن مثال ہے۔ معلوم نہیں کتنے لوگوں نے اسے پڑھا، یا اس سے کوئی سبق حاصل کیا۔ نہ معلوم اس شمارے کا ہندی اڈیشن چھپ سکا یا نہیں کیونکہ وہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

عزائم کے اداریے پڑھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ جن خیالات اور نظریات کی ملک گیر اشاعت ضروری ہے، اردو کی موجودہ بے بسی اور تہی دامنی کی وجہ سے کتنا محدود طبقہ ان سے آشنا ہوتا ہے۔ اردو کے سنجیدہ پریس کے حلقہ اثر کا یہی عالم ہے۔

جمیل مہدی کا شمار ہندستان کے بڑے صحافیوں میں ہونا چاہیے لیکن وہ بطور ایک آزاد اخبار نویس ایک سمٹی ہوئی زبان میں لکھ رہے تھے، چند ہزار قارئین کے علاوہ کتنے اہل ہند تک ان کی آواز پہنچی؟ دوسری ہندستانی زبانوں بالخصوص ہمارے انگلش پریس کے اڈیٹر بے اندازہ وسائل و رسوخ کے مالک ہیں۔ اقتدار کے بین الاقوامی ایوانوں تک ان کی رسائی ہے۔ عوام و

(باقی ص۵۳ پر)

سید حامد
ہمدرد نگر
نئی دہلی

جمیل مہدی

ایک حق اندیش اور حق شناس صحافی

اُنسیت اکثر قرب سے پیدا ہوتی ہے اور اسی کے سائے میں پروان چڑھتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھی شکل کی ایک جھلک نے ہمیشہ کے لیے دل میں جگہ بنالی۔ گویا دید کا انحصار یاد کی طوالت میں بدل گیا۔ اچھی صورت سے بھی زیادہ کاری وار اچھی سیرت کا ہوتا ہے۔ آپ نے کسی صاحب کردار شخص کی ایک جھلک دیکھی اور آپ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جن کا سامنا، چند لمحوں کے لیے ہی سہی، کسی اچھی سیرت اور مضبوط کردار والے انسان سے ہوگیا ہو صحافت میں یہ جنس اور بھی کمیاب ہے، کیونکہ کوئی غرور قلم کے غرور سے زیادہ ظالم نہیں ہوتا۔ اور غرور کو انصاف سے سدا بیر رہا ہے۔ قلم جادو رقم دیکھتے ہی دیکھتے استحصال پیشہ بن جاتا ہے۔ مطلق العنانی کے جوہر دکھانے لگتا ہے۔ قلم کا نشہ حسن، جوانی اور دولت کے نشہ سے زیادہ قاتل ہوتا ہے۔ اچھے خاصے توازن پیشہ آدمی کے ہاتھ میں صحافی کا قلم دے دیجیے وہ بہکنے لگے گا بھٹکنے لگے گا۔ دولت اور حسن کو داد ایک محدود حلقہ سے ملتی ہے۔ صحافی کے قلم کی پہنچ بہت بڑے حلقے تک ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ چوتھی ریاست یا چوتھے ایوان کا ستون ہے، جس شخص کی شہرت چاہے بنا دے، جس شخص کی شبیہ چاہے بگاڑ دے۔ اس کے علاوہ صحافی جو کچھ لکھتا ہے قلم برداشتہ لکھتا ہے۔ تیز رفتاری میں توازن قائم رکھنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے افراد تو پھر افراد ہیں اس کے قلم کی چوٹ سے حکومتیں دہل جاتی ہیں۔ سیاسی پارٹیاں لرزہ براندام ہو جاتی ہیں۔ صحافت بہت کٹھن آزمائش ہے انسان کے ظرف، اس کی آزادیِ فکر اور جرأت حق گوئی کی، جو اس آزمائش میں پورا اترے اسے صاحبِ کردار کہنا پڑے گا۔

جمیل مہدی کو میں نے شاید ایک یا دو بار چند لمحوں کے لیے دیکھا پہلی ہی جھلک میں یہ بات دل نشین ہوگئی کہ جس انسان پر اس آن ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پڑی ہے وہ سچا، کھرا، جری اور غیور انسان ہے۔ اس کے چہرے کی شرافت نے اس کے ظواہر کی خستہ حالی کے باوجود میرے سخت گیر دل کو موہ لیا۔ میں نے اس میں قلندری کی شان اور مجذوبی کی دمع کو بھانپ لیا۔ پہلی نظر اپنا کام کر گئی۔ اس زمانہ میں جب کھوٹ کا ہر طرف سکہ چلتا ہے، جب ذاتی غرض کے بغیر کسی کو حرکت نہیں ہوتی، جب ضمیر اور ایمان اور قلم سر بازار بکتے ہیں، ایک بے لوث، حق اندیش اور حق نگار صحافی کا دیدار جاں بخش ثابت ہوا۔

یہ میری طبعی کوتاہی ہے کہ مجھے جمیل مہدی سے ربط و ضبط بڑھانے کی، اس کی بصیرت سے سبق اندوز ہونے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مکروہاتِ زمانہ نے موقع ہی نہیں دیا لیکن یہ غیر ملفوظ احساس تو دلاسا دیتا ہی رہا کہ ایک عمر پڑی ہے کبھی جم کر بیٹھیں گے۔ حالانکہ ایک لمحہ کا اعتبار نہیں، دونوں میں سے کسی کا بلاوا کسی وقت آجاتا

جمیل مہدی کا بلاوا آ ہی گیا۔ اچانک آ گیا اور میرے ہاتھ سے تفصیلی ملاقات کی امید کھلونے کی طرح گر کر ٹوٹ گئی۔

جمیل مہدی صاحبِ طرز تھا۔ اس کے مضامین کی سطح عام روش سے اونچی تھی اور اس کا اسلوب نگارش زیبا، گویا اور معنی خیز تھا۔ اس کے جملے اکثر طویل ہوتے ہیں۔ یہ جملے زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ ہمیں مفاہیم کے ایک کارواں کو منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے۔ طویل جملے لکھنا آسان نہیں۔ اس اہتمام کے ساتھ کہ وہ صبر آزما نہ ہو جائیں بلکہ شگفتگی اور نظم اور روانی کو برقرار رکھیں۔ راقم کے سامنے ۱۷ مئی ۱۹۸۸ء کا عزائم کھلا ہوا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے:۔ " سیاست میں بنیادی غلطی کا دوطرفہ عمل

مسلمانوں اور سکھوں کی سیاست کا جائزہ

(مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۸۵ء)

اس سے بلا انتخاب ایک جملہ پیش کر رہا ہوں:۔

مسلم لیگ کا دو قومی نظریہ تو حقائق کی دیواروں سے ٹکرا کر اس طرح ٹوٹا کہ پاکستان کی آبادی کی اکثریت والا صوبہ مشرقی پاکستان جس میں مغربی پاکستان سے کہیں زیادہ تعداد میں مسلمان بستے ہیں، پاکستان سے جغرافیائی، لسانی اور تہذیبی بنیادوں پر الگ ہو گیا اور وحدتِ کلمہ اور مذہبی یک رنگی اس علاحدگی کو روکنے میں ذرا بھی کار آمد اور مددگار ثابت نہ ہو سکی۔"

غور کیجیے، طویل جملے کے بہاؤ اور مومنٹم سے استدلال کو خود بخود طاقت مل رہی ہے۔ آگے چلیے:

" آزاد ہندوستان میں ایک قومی نظریہ کے بجائے سیاست پر کثیر القومی اثرات غالب آ گئے اور جہاں آزادی سے پہلے صرف ہندو مسلم مسئلہ سیاست کا دردِ سر تھا وہاں اب علاقائی بنیاد پر ذیلی قومیں اپنی حدود سے بڑھ کر مستقل قوتوں کی شکل میں ڈھلنے کے لیے زور مارنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا ملک لسانی قومیتوں کے ایک مجموعے میں تبدیل ہو گیا جس میں سے ہر ایک لسانی ریاست زیادہ سے زیادہ خود مختاری اور مرکز کے اقتدار سے زیادہ سے زیادہ گلو خلاصی کے لیے جدوجہد میں مصروف دکھائی دینے لگی۔"

ایک اور مضمون کا اقتباس دیکھیے جس کا عنوان ہے:

" الفاظ بے جان ہیں یا ہم بے روح ہو گئے ہیں

عذابِ الٰہی کا خوف دل سے اٹھ گیا ہے"۔

اس آئینہ میں بعض علما کے چہرے صاف نظر آ رہے ہیں:

" کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ کہیں نہ کہیں کوئی مجلس کہیں نہ کہیں کوئی اجتماع، کہیں نہ کہیں ایسا جلسہ منعقد نہ ہوتا ہو جہاں وہ لوگ عامۃ المسلمین کے سامنے فضل و کمال کے جوہر دکھاتے اور خشیتِ الٰہی کی نمائش کرتے نظر نہ آتے ہوں۔ لیکن ان کی خطابت، بیان اور تقریروں کے موضوعات پرانے قصے کہانیوں، روشن ماضی کی جھلکیوں اور غازیانِ اسلام اور شہدائے اعظم کے کارناموں کے تذکروں اور آیاتِ قرآنی کی تشریحات سے آگے نہیں بڑھتے ایسی باتوں کی ترغیب، جن کی عملی تردید وہ خود اپنے عمل و کردار سے کرتے ہیں۔ ایسے سورماؤں کی تعریف جن کے کردار کی ادنیٰ سی جھلک بھی خود ان کی زندگی میں نظر نہیں آ سکتی، احکامِ قربانی کی ایسی تفسیر جس کی عمل آوری کے نمونے اب مفقود ہو چکے ہیں۔"

دیکھیے کتنا بے لاگ اور بے خوف تبصرہ ہے اور زبان میں کتنی روانی ہے!!

۱۶ اپریل ۱۹۸۸ء کے عزائم میں جمیل مہدی نے "اکثریت اور اقلیت کے تعلقات کا مسئلہ ۔ اپنی غلطی کا احساس کرنے کی بھی ضرورت" کے عنوان سے شاہ مضمون لکھا ہے۔ پہلے انھوں نے امریکہ کی اقلیت کا ذکر کیا ہے اور اس پس منظر میں کہا ہے:

" ہندوستان میں آج کل اقلیت اور اکثریت کے تعلقات کا مسئلہ ایک بار پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نازک مرحلہ سے گزرنے والا ہے کیونکہ ۱۹۴۷ء کے

بعد غالباً یہ پہلی بار ہے کہ سبھی حلقوں میں مسلمانوں کے بارے میں مباحثہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور آسام میں بڑے پیمانے پر فساد کے بعد زیادہ تشویش انگیز اور زیادہ خوفناک بن گیا ہے اور یہ پہلا موقع ہے — جنوبی ہند میں ہریجنوں کے قبول اسلام کے پیہم واقعات کے باعث، جسے خوفناک اور اکثریت کے لیے خیال انگیز اور توجہ طلب بنانے میں خود وہاں کے مسلمان رہنماؤں اور اخبار نویسوں کا حصہ سب سے زیادہ رہا ہے جنھوں نے دس بیس خاندانوں کے مسلمان ہونے پر اتنے زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا تھا کہ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ دن آیا ہی چاہتا ہے کہ کفر کی تاریکی اس ملک سے دور ہو جائے گی اور ظلمات سے روشنی میں نکال دینے کا خدائی وعدہ پورا ہوگا۔"

جملہ کی جامعیت، اس کے دروبست، اس کی معنویت دیکھیں یا ان افکار پر نظر کریں اور اس باہمی ارتباط پر غور کریں جن کو اس نے زبان دی ہے۔ اندابت رائے نے ایک روز بھی خامہ مہدی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

"عمل ردعمل کی لہروں کا ایک سمندر"

اس عنوان سے ۱۲ را پریل ۱۹۸۸ء کے عسنۂ میں جمیل مہدی کا ایک مضمون شائع ہوا۔ اس میں پنجاب کے المناک واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد صاحب مضمون لکھتا ہے:

"جس طرح سمندر کی موجوں کا مرکز اس جگہ سے بہت دور ہوتا ہے جہاں وہ غیظ و غضب کے عالم میں سر پٹکتی اور بل کھاتی نظر آتی ہیں، اسی طرح سیاسی سطح پر رونما ہونے والے کسی بھی غیر معمولی واقعہ کا اصل مرکز بھی دور ماضی میں کہیں پوشیدہ ہوتا ہے۔"

اسباب و علل، عوامل و محرکات اور عواقب و نتائج کے بارے میں جمیل مہدی عام صحافیوں کے برعکس تاریخ سے بصیرتیں، آگہیں اور روشنیاں لے کر آتا ہے۔ اس نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور تاریخ نے اس کے افق کو وسیع کیا ہے اور اس کی نظر کو گہرائی بخشی ہے۔

دو باتیں جمیل مہدی کو ممتاز کرتی ہیں: ایک تاریخی شعور جس کا اطلاق وہ گہری فراست کے ساتھ حالیہ صورتِ حالات، رجحانات اور حوادث پر کرتا ہے۔ اس کے اسٹیج کو ایک وسیع پس منظر کی دل کش اور معنی آفریں کمک حاصل ہے۔

دوسرے، وہ زبان کا استعمال تخلیقی اور فکری حسیت کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی عبارت پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ ملق سے نازل ہو رہے ہیں۔ دراصل ان کا ایک سرچشمہ ذہن ہے اور دوسرا دل۔ قاری کو جلد ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ایک محسوس کرنے والا دل اور غور و فکر کرنے والا ذہن رکھتا ہے اور جب وہ لکھنے بیٹھتا ہے تو قلم کے سرے کو ان دونوں سرچشموں سے جوڑ دیتا ہے ع

پھر دیکھیے انداز گل افشانیِ گفتار

اسلوب پر یہ قدرت آنکھ جھپکاتے حاصل نہیں ہوتی، اس کے لیے جمیل مہدی کو برسوں ریاضت کرنا پڑی ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں عبارت آرائی اور بلند پروازی اور اظہار زور بیان کی مثالیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے فکر کی گرفت مضبوط ہوئی اور ما فی الضمیر خارج سے ابھرتا گیا اور دردمندی نے ڈیرہ ڈالنا شروع کیا قدرت بیان کے اظہار کی جگہ معانی اور مطالب کے اظہار نے لے لی۔ لائق صحافی یہ مراحل طے کر رہا تھا کہ موت نے ایک بے حد مؤثر اور دل آویز قلم اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

جمیل مہدی نے جو کچھ حاصل کر لیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اس کے امکانات کا۔ فاضل اہل قلم کے تجزیات، اس کی یہ صلاحیت کہ مختلف حالات کا بصیرت کے ساتھ موازنہ کر سکے اور قارئین کو تدبر و تفکر کی دعوت دے۔ اس کے مضامین کو اخباروں کے اداریوں اور رہنما مضمونوں کی عام سطح سے اوپر اٹھا دیتی ہے جمیل مہدی کے مضامین کو اس کے تاریخی شعور نے گہرائی دی ہے۔ زمان و مکان دونوں سے اسے تحول ملا ہے۔ اس کی نگاہ نہ صرف پیچھے کی طرف جاتی ہے اور وہاں سے تجربہ اور بصیرت حاصل کرتی ہے بلکہ وہ

مکان میں سفر کرتی ہوئی یہ بھی دیکھتی ہے کہ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے وہ جانتا ہے کہ ہم اپنے ملک کے حال کو نہ اس کے ماضی سے جدا کر سکتے ہیں نہ باقی دنیا کے حال سے اور اس احساس نے ان کی نگاہ کو ژرف بین بنا دیا ہے اور ان کی تحریروں کو تمول بخشا ہے۔

جمیل مہدی کی خستہ حالی اور بے نیازی گودڑ میں لعل کا سماں دکھاتی تھی۔ انسانوں کا جہاں تک تعلق ہے، لعل گودڑ میں زیادہ ملیں گے اور کمخواب میں بہت کم۔ لیکن اس دور میں جب نقل اور جعل نے ایک منفعت بخش فن کا روپ دھار لیا ہے، ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے جو قلندری اور بے نیازی کا دم بھرتے ہیں اور استحصال کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں ایسے ہاتھوں میں قلم ابلیسی اوزار بن جاتا ہے لیکن مثبت سے منفی کی طرف سفر کیوں کیا جائے۔ ہماری نظر کے سامنے اس وقت ایک ایسا شخص ہے جس نے زندگی بھر قلم کی آبرو رکھی۔ ایک اور شخص جس نے یہی کر دکھایا، نازش پرتاپ گڑھی تھا جس نے تمام عمر قلم کی پاک دامنی کی پاسبانی کی اور تہی دستی اور خستہ حالی کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ صارفیت کے دور میں ایسے لوگ کم ہی ملتے ہیں جو غیرت کو سینے سے لگائے رہیں، جو قلم کی آبرو کو اپنی زندگی اور اس کی آسائشوں سے ہمیشہ اوپر رکھیں۔ نازش پرتاپ گڑھی نے اپنی نظم میں قلم کی عظمت اور عصمت کی جو تصویر کشی کی ہے وہ احساس کی شدت سے تاباں ہے۔

اس دور میں جب قلم عام طور پر گردیں رکھے اور بیچے جاتے ہیں اور جب قلم غیرت اور عزتِ نفس کو پہلی فرصت میں خیرباد کہہ دیتے ہیں جمیل مہدی اور نازش پرتاپ گڑھی تو خیر اہلِ قلم کے لیے نمونے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ چھوٹتے ہی پوچھیں گے کہ ان کا انجام کیا ہوا؟ دنیا نے انھیں کیا دیا۔ وہ یہ نہیں سوچیں گے کہ یہ دونوں فلاکت زدہ اور غیرت مند اہلِ قلم دنیا کو بہت کچھ دے گئے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے جمیل مہدی کے طویل جملوں کی بات کو پورا کر لیا جائے۔ انگریزی نثر کا ظرف اس ذیل میں بہت وسیع ہے مربوط خیالات کے پرے کے پرے ایک جملہ میں سما جاتے ہیں۔ اردو میں طویل جملہ کو احتیاط اور سلیقہ کے ساتھ برتنا پڑتا ہے، تاکہ نہ ابہام پیدا ہو نہ سکان، نہ اکتاہٹ اور بنیادی مفہوم کا سرا ہاتھ سے جانے نہ پائے طویل جملے اس بات کی چغلی کھاتے ہیں کہ لکھنے والے کا ذہن سریع ہے اور مسئلہ کے پہلوؤں اور پیچیدگیوں سے باخبر ہے۔ وہ جلد ہی بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے بھی یہی کریں۔ یہاں جدید ریاضی کی مثال صادق آئے گی جہاں ایک عدد کے بجائے اعداد کے ایک پورے گروہ کو حساب کے تختہ پر لایا جاتا ہے اور ذرا سی دیر میں بڑے بڑے اعداد والے سوالوں کا حل نکل آتا ہے۔ طویل جملوں میں اگر پانی کا سا بہاؤ ہے اور روانی ہے تو وہ معنی خیز اور فرحت بخش ہوں گے، اگر نہیں ہے تو پڑھنے والے کے لیے الجھن کا سامان پیدا کریں گے۔ جمیل مہدی کے طویل جملے پہلی ردیف میں آتے ہیں۔ **

جمیل مہدی: ایک منفرد صحافی ــــ (ص۴۹ کا بقیہ)

خواص کے نظریات اور رویے بھی وہی تشکیل کرتے ہیں۔ ایک آزاد اردو اخبار کو ڈھنگ کا پریس بھی میسّر نہیں آتا۔ کیا اعلیٰ اردو صحافت کے لیے یہ بے مائیگی اور بے نوائی ضروری ہے؟ ایک بلند پایہ اردو اخبار نویس کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام عمر اپنے اصولوں کی خاطر لڑتا رہے اور جلد ہی میدان سے رخصت ہو جائے۔؟

جمیل مہدی: ایک یاد رہنے والا آدمی ص۵۵ کا بقیہ

جمع ہو گئے تھے، اسی لیے وہ ایک کامیاب صحافی تھے جنھیں اردو صحافت ہمیشہ احترام سے یاد رکھے گی، اور وہ ایک مشعل راہ ثابت ہوں گے تازہ واردانِ بساطِ صحافت کے لیے۔

جمیل مہدی پر آرام حرام تھا، اب وہ ابدی آرام میں ہیں۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر مرحوم جمیل مہدی کے حسب حال ہے ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

احمد سعید ملیح آبادی
ایڈیٹر "آزاد ہند" کلکتہ

جمیل مہدی
ایک یاد رہنے والا آدمی

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں یہ یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان سے کب اور کن حالات میں ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات کے بعد ہی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ہمیشہ سے جان پہچان تھی، اور جان پہچان ایک محبت اور دوستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے — جمیل مہدی بھی ایسے ہی چند لوگوں میں سے تھے۔

یہ ہمیشہ کی جان پہچان کا احساس صرف اسی آدمی کے ساتھ جاگ سکتا ہے جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو۔ جمیل مہدی میں نہ کوئی تصنع تھا اور نہ تکلف۔ بناوٹ، لگاوٹ اور دکھاوے والے آدمی وہ بالکل نہیں تھے۔ جیسے تھے انھیں دیکھتے ہی پہچانا جا سکتا تھا اور جمیل مہدی کا یہی وصف میرے اور ان کے درمیان اٹوٹ دوستی کی بنیاد تھا۔

ہمیں ایک دوسرے سے بہت کم ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر جب کبھی لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے کوشش کر کے ان سے ملاقات کا موقع نکالا۔ ہر ملاقات ایک ہی نہج پر شروع ہو کر ایک ہی طرح ختم ہوتی۔ دو صحافی جب عرصہ بعد ملیں اور جب ان کا اوڑھنا بچھونا صحافت ہو تو پھر تمام تر گفتگو صحافیانہ انداز کی ہی ہوگی۔ ہم ملتے تو گھنٹوں حالاتِ حاضرہ اور درپیش ملکی و ملی مسئلوں پر باتیں کرتے رہتے۔ جمیل مہدی کی رائے مختلف مسئلوں پر جچی تلی اور فیصلہ کن ہوتی تھی۔ شاید ہی کبھی ہمارے بیچ اختلاف رائے رہا ہو، زیادہ تر معاملات میں ہماری رائے ایک جیسی ہوتی اور یہ بات بھی ہماری دوستی کی مضبوط ڈوری بنی ہوئی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ جمیل مہدی کی تحریروں نے سب سے پہلے مجھے اس وقت متوجہ کیا جب انھوں نے اپنے قیام بمبئی کی یادداشتیں اپنے مخصوص طرز نگارش میں قلم بند کرنا شروع کیں۔ اس میں مرارجی ڈیسائی کے ساتھ جب وہ بمبئی کے وزیر اعلیٰ تھے، جمیل مہدی کی مڈبھیڑ کی داستان انتہائی دلچسپ اور معلوماتی تھی۔ ملاقات ہونے پر میں نے جمیل مہدی کے اس سلسلۂ مضامین کی دل کھول کر داد دی تو انھیں ایک گونہ مسرت حاصل ہوئی اور ہم دیر تک ان باتوں کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتے رہے۔

جمیل مہدی کے لکھنے کا اپنا ڈھنگ تھا، جو کافی دلچسپ ہوتا تھا اس کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر کھری کھری لکھتے تھے۔ واقعات نگاری میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔

جمیل مہدی ایک وضعدار آدمی تھے۔ سگریٹ کثرت سے پیتے تھے، مگر برانڈ نہیں بدلتے تھے۔ ان کے سامنے ہمیشہ کیونڈر سگریٹ کا پیکٹ دیکھا، جس میں سے وہ سگریٹ سے سگریٹ سلگانے کے عادی تھے۔ سگریٹ نوشی، بلانوشی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی جس نے ان کی صحت پر بہت خراب اثر ڈالا تھا۔

آخری ملاقات ۱۹۸۸ء کے اوائل میں اس وقت ہوئی جب وہ شدید بیمار ہو کر لکھنؤ میں بلرام پور اسپتال کے اسپشل وارڈ میں بستر مرگ پر تھے۔ میں ان سے ملنے اسپتال گیا۔ میرے ساتھ مغربی بنگال اسمبلی کے سابق ڈپٹی اسپیکر جناب کلیم الدین شمس بھی تھے۔ وہ لکھنؤ میں

فرقہ وارانہ مخالف کنونشن کرنا چاہتے تھے اور اسی کی تیاری کے سلسلے میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ کنونشن کے متعلق بعض غلط فہمیوں اور شکایات کے تحت جمیل مہدی کے اخبار "عزائم" میں مخالفانہ مضامین اور مراسلوں کی اشاعت ہو چکی تھی۔ مگر جب کلیم الدین شمس صاحب کو معلوم ہوا کہ میں جمیل مہدی کو دیکھنے اسپتال جا رہا ہوں تو وہ فوراً آمادہ ہو گئے کہ خود بھی چلیں گے۔ ہمارے ساتھ اور بھی چار چھ لوگ ہو گئے جو کلکتہ سے لکھنؤ پہنچے ہوئے تھے۔

اسپتال میں وارڈ تلاش کرنے میں بڑی دیر لگی اور اندھیرا ہونے پر جب یہ چھوٹا سا ہجوم جمیل مہدی کے کمرے پر پہنچا تو وہ اسے دیکھ کر کسی قدر پریشان سے ہو گئے۔ شدید تکلیف میں تھے اور بستر پر دراز تھے مگر جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی، بجھے ہوئے دھواں دھواں چہرے پر ایک ہلکی سی رونق چھا گئی اور آنکھیں چمک اٹھیں۔ اٹھ کر مصافحہ کیا اور پھر ہانپتے ہوئے لیٹ گئے۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر ذرا سا دبایا اور خود کو بے انتہا سنبھالنے کے باوجود انھوں نے میری آنکھوں میں غم کی نمی بھانپ لی۔ دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ ان کے بستر کے ساتھ اسٹینڈ پر ایک اگال دان لگا ہوا تھا جو ان کے خون آلود کف سے لبریز تھا، اسے دیکھ کر دل خون ہو گیا۔

میں نے رسمی ڈھارس بندھانے کے لیے امید افزا باتیں شروع کیں اور انھیں چھیڑ کر گدگدانے کے خیال سے سگریٹ نوشی کا ذکر کیا اور ان کے مخصوص برانڈ کو دو چار صلواتیں سنائیں۔ چہرے پر ایک کرب آمیز کیفیت طاری ہو گئی اور بولے:

"اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا: "خبردار جو میرے سامنے ایسی بات منھ سے نکالی "عزائم" کے ایڈیٹر کا عزم اتنا کمزور نہیں ہو سکتا۔ تمھیں یہ لڑائی جیتنا ہے اور جینا ہے۔"

بیزاری سے بولے: "کچھ اور باتیں کرو۔"

ان ہی دنوں رسالہ "برہان" دہلی کا "مفتی عتیق الرحمٰن نمبر" بہت ضخیم اور شاندار نکلا تھا جسے جمیل مہدی نے اپنی علالت کے باوجود انتہائی محنت سے مرتب کیا تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی وفات کے بعد جمیل مہدی نے "برہان" کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھال لی تھی۔ میں نے نمبر کی تعریف کی اور بعض مضامین کی نشاندہی کر کے ان کے معیار انتخاب کی داد دی۔ کرید کرید کر پوچھتے رہے کہ نمبر میں تم نے اور کیا کیا پسند کیا۔ اس وقت وہ ایک ایڈیٹر تھے جو دوسرے ہم عصر ایڈیٹر کی زبان سے اپنی محنت پر تبصرہ سننا چاہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ جمیل مہدی کو اس وقت جو خوشی ملی شاید یہ ان کی آخری خوشی تھی کیونکہ چند روز بعد ہی ان کی حالت زیادہ بگڑ گئی اور انھیں نیم جاں حالت میں علاج کے لیے دہلی کے اسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں انھوں نے پہلی بار زندگی سے ہار مان لی اور موت کے سامنے سپر ڈال دی۔

جمیل مہدی پر اردو صحافت کا ایک اور عہد ختم ہوا۔ وہ اپنے وقت کے نہ صرف عظیم صحافی بلکہ لکھاڑ تھے۔ ان کا قلم جب چلتا تھا تو بے تکان چلتا تھا اور جس موضوع پر قلم اٹھا دیتے، اس کا حق ادا کر دیتے۔ یہ کیفیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک صحافی کے اندر حق و صداقت کی بھٹی نہ جل رہی ہو، جس میں تپ کر وہ کندن بنتا اور اپنے پیچھے ایک لازوال میراث چھوڑ جاتا ہے۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ ایک اچھا شاعر بننے کے لیے اچھا انسان ہونا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ایک سچا اور اچھا انسان ہی ایک اچھا صحافی بن سکتا ہے۔ صرف ایسا ہی صحافی رائے عامہ بناتا اور حالات کا رخ موڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔ جمیل مہدی ایک کھرے، بے لاگ اور نڈر صحافی تھے، کیونکہ وہ سچے انسان تھے۔ اسی سچائی کی طاقت نے ان کے اندر شجاعت اور قناعت بھر دی تھی۔

اردو کے اچھے اچھے صحافی اور اہل قلم ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ لینے والے بہت کم پیدا ہو رہے ہیں۔ اردو صحافت کے لیے یہ ایک بڑا خطرہ ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ اچھا صحافی بننے کے لیے بڑی بڑی ڈگریوں کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ضرورت سچائی اور کام سے لگن کی ہے۔ صلاحیت، محنت اور کثرت مطالعہ لازمی شرطیں ہیں۔ جمیل مہدی میں یہ سارے اوصاف

(باقی ص۵۳ پر)

ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی
صدر شعبۂ عربی
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

جمیل مہدی

ایک بیباک اور مردِ قلندر صحافی

میں ساری زندگی اس رہ گزر میں کاٹ آیا ہوں
جہاں حدِ نظر تک بھی نہ منزل تھی نہ سایا تھا

یہ شعر جمیل مہدی مرحوم کی میت کے ساتھ دہلی سے دیوبند تک کی رفاقت کے دوران میرے ذہن کے افق پر اچانک طلوع ہوا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ شعر اس شخص کی پوری زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے جسے علماء، اہلِ قلم اور صحافیوں کے حلقے میں ایک بیباک نڈر، بے لوث اور مخلص انسان کی حیثیت سے قدر و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ میں نے عالموں، ادیبوں، لیڈروں اور صحافیوں کے ایک جمِ غفیر میں مشکل سے کوئی ایسا انسان دیکھا ہوگا جس کے سینے میں ملت کے لیے وہ بے پناہ درد پوشیدہ ہو جو جمیل مہدی مرحوم کا حصہ تھا۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلو تھے اور ہر پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

جمیل مہدی سے میری سب سے پہلی واقفیت جو براہ راست نہیں تھی، دیوبند میں اس وقت ہوئی جب میں نے وہاں کے معہدِ علمی میں ۱۹۵۶ء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا۔ فطری طور پر طبیعت اُردو شعر و ادب کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ وہاں بھی مجھے عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کے ماہرین سے زیادہ ان لوگوں کی تلاش ہوئی جو اُردو کا ادبی و شعری ذوق رکھتے ہوں۔ اس وقت مجھے جن شخصیتوں کے نام معلوم ہوئے ان میں جمیل مہدی کا نام سرفہرست تھا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں ان تک کس طرح اور کس ذریعہ سے پہنچا ہاں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ واقعی یہ شخص نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ اور قومی سیاست کا مردِ میدان ہے بلکہ اُردو ادب اور اُردو صحافت پر بھی اس کی گہری نظر ہے۔ میرا اور میرے کئی دوستوں کا یہ خیال ہے کہ جمیل مہدی مرحوم کو اساتذہ کے بے پناہ اشعار یاد تھے جنھیں وہ اپنی دل چسپ اور پُر لطف گفتگو کے دوران بہت ہی مناسب طور پر استعمال کرتے تھے۔

ان کا اندازِ زندگی جیسا کہ ان کے تمام واقفین کو معلوم ہے بہت ہی بے نظم تھا۔ ظاہری زندگی میں کسی ترتیب، دنیاوی سلیقہ یا کسی نظم و ضبط کے وہ بالکل قائل نہ تھے لیکن اس کے برخلاف فکری اور ذہنی طور پر نہایت ہی مربوط اور منظم انسان تھے جس کا ثبوت ان کی گفتگو اور ان کی تحریروں میں بہت واضح طور پر ملتا ہے۔ ظاہری اور معنوی زندگی کے اتنے بڑے تضاد (Contrast) کا اس سے بڑا مظہر شاذ و نادر ہی نظر آئے گا۔

کچھ عرصہ کے بعد ان سے قرابت بھی ہوگئی اور اس کے نتیجہ میں ان سے قربت بھی بڑھ گئی اور کئی دفعہ بے تکلف گفتگو کرنے کے مواقع بھی مل گئے اور آخری چند ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب وہ دہلی میں زندگی کی چند ساعتیں گزارنے

(باقی ص ۴۸۴ پر)

نیا دور

جلد ۴۴ | نمبر ۶

ستمبر ۱۹۸۹ء

(ایکٹنگ) ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون: ۴۴۰۵۹
۴۷۱۰۸

پبلشر: اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
زر سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو. پی. لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو. پی. لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

وزیر اعلا اتر پردیش شری نرائن دت تیواری نے اپنے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد گزشتہ ایک سال کے دوران جو پالیسی اور جو حکمت عملی اختیار کی اور ان کی قیادت میں ریاست کی ہمہ جہت ترقی کے لیے جو موثر اقدامات کیے گئے، ان سے بلاشبہ تمام ریاست میں ترقی و خوشحالی کے تعلق سے ایک نئی امنگ اور نیا جوش و خروش پیدا ہوا ہے۔ اقلیتوں میں تو خاص طور سے تحفظ کا ایک نیا احساس اور یقین و اعتماد کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ اقلیتیں بجا طور پر یہ محسوس کر رہی ہیں کہ ان کے مفادات اب پہلے سے کہیں زیادہ محفوظ ہیں اور ان کے مفادات پر پہلے سے کہیں زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔

اقلیتوں کی فلاح و ترقی اور ان کا معیار زندگی بہتر بنانے کی غرض سے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی ایما پر ریاست میں متعدد اسکیمیں اور پروگرام نافذ کیے گئے ہیں۔ وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے اقلیتوں کے مفادات کو اولین ترجیح دیتے ہوئے اقلیتوں کے لیے وضع کردہ پندرہ نکاتی پروگرام کی موثر عمل آوری کے لیے مبثت اقدامات کیے ہیں تاکہ اقلیتی فرقے کے لوگوں کو ترقی کے نئے مواقع اور وسائل دستیاب ہو سکیں۔

اقلیتوں کے تحفظ اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے ریاست میں جو اقدامات کیے گئے ہیں یا کیے جا رہے ہیں ان میں سے چند خصوصی اقدامات حسب ذیل ہیں:

اقلیتوں میں احساس تحفظ پیدا کرنے کے مقصد سے خصوصی حفاظتی فورس کی پانچ نئی بٹالینوں کی تشکیل کی جا رہی ہے۔ اقلیتوں کے لیے پندرہ نکاتی فلاحی پروگرام کو پورے خلوص اور مستعدی کے ساتھ عملی شکل دی جا رہی ہے اور اس پروگرام پر عمل درآمد کی نگرانی کے لیے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کی سربراہی میں نگراں کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔ ایسی ہی کمیٹیاں ضلعوں کی سطح پر بھی تشکیل دی جا رہی ہیں۔ اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ریاست میں ایک اقلیتی کمیشن بھی قائم کیا گیا ہے۔ سرکاری محکموں اور عوامی زمرے کے اداروں کی ملازمتوں میں اقلیتوں کی خاطر خواہ نمائندگی کو یقینی بنانے کی غرض سے سلیکشن کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کے ایک فرد کو شامل کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مسلم اوقاف کی املاک کے تحفظ اور بہتری کے لیے ریاست میں ایک مسلم وقف کارپوریشن بھی قائم کیا گیا ہے۔ اقلیتوں کی معاشی ترقی کے لیے ایک اقلیتی مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن بھی قائم کیا گیا ہے جو اقلیتی فرقے کے لوگوں کو زراعت اور تجارت کے لیے مالیاتی، تکنیکی، انتظامی اور خرید و فروخت سے متعلق امداد مہیا کراتا ہے۔ بینکوں کی مدد سے اقلیتوں کی فلاح و ترقی کے لیے اقلیتی مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن کو ہر ضلع کے لیے ایک ایک کروڑ روپے کی اسکیم تیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہ کارپوریشن اقلیتی فرقے کے نوجوانوں کے لیے بھرتی سے قبل کی تربیت کا بندوبست بھی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مقابلہ جاتی امتحانوں کے واسطے اقلیتوں کے لیے مختلف مقامات پر کوچنگ کی سہولت بھی مہیا کرائی جا رہی ہے۔ اقلیتوں کی معاشی ترقی کے لیے مختلف صنعتی تربیتی ادارے ـــــ مثلاً ہتھ کرگھا کارپوریشن، یوپیکا، براس ویئر کارپوریشن، برآری کارپوریشن، چرم ترقیاتی کارپوریشن وغیرہ بھی مختلف اسکیموں کے تحت کوشاں اور سرگرم کار ہیں۔ بیس نکاتی پروگرام سمیت مختلف ترقیاتی اور غریبی ہٹاؤ پروگراموں کے فائدے اقلیتوں کو بھی پہنچ سکیں۔ اس کے لیے ریاست، ضلع اور بلاک کی سطح پر بیس نکاتی پروگرام عملدرآمد کمیٹیوں میں اقلیتی فرقوں کے افراد کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اقلیتی فرقے کے نوجوانوں کو تکنیکی تعلیم کے مواقع مہیا کرنے کی غرض سے اقلیتوں کی کثرت والے علاقوں میں نئے صنعتی تربیتی ادارے اور پالی ٹکنیک قائم کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کی کثرت والے ضلعوں میں اقلیتی فرقوں کے روایتی پیشوں کو فروغ دینے کے مقصد سے صنعتی، تربیتی اداروں اور کثیر مقصدی پالی ٹکنیکوں میں ان روایتی پیشوں کی تربیت کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

ش.ق

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
قطب پور، ڈالی گنج ۔ لکھنؤ

ایک تواریخ گو شاعر

رائے سناتھ سنگھ بیدار، میر و مرزا کے زمانے کے فارسی گو شاعر تھے لیکن صرف تاریخیں کہتے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں پائی۔ وہ اپنا وطن گورکھپور بتلاتے ہیں۔ جس کی تصدیق ان کے ایک دوست بھگوان داس مصنف سفینۂ ہندی (نظرثانی ۱۲۱۹ھ) نے اس طرح کی ہے "از قرابتیان رائے بھوگ چند پیشکار نظامت شریفہ فردوس آرامگاہ۔ مولدش گورکھپور و منشا رادور شاہجہاں آباد . . . ." لیکن ان کے ایک دوسرے دوست ابوطالب اپنے تذکرہ خلاصۃ الافکار میں لکھتے ہیں کہ رائے سناتھ سنگھ بیدار دلی کے رہنے والے تھے۔ مگر انھیں ایک موضع ضلع گورکھپور میں جاگیر ملا تھا۔ اس لئے وہیں توطن اختیار کر لیا تھا۔ ان کی پوری عبارت یہ ہے :-

"رائے سناتھ سنگھ بیدار برادر زادۂ رائے بھوگ چند محمد شاہیست تولدش در . . . . . شاہجہاں آباد . . . . ودر خدمت خلاصۂ مشائخ و مشاہیر آں بلدہ چون شیخ محمد عظیم گوالیاری و شیخ محمد زبیر سرھندی و خواجہ میر درد و آبرو و غیرہم گذرانیدہ بود۔ بعد از انقلاب سلطنت ازاں طرفہا آوارہ شدہ بتقریب قلیل جاگیر دسکن چند نفر از اقوام بیمردت بشر بیر در موضع سکندر پور آمودہ کہ از قصبات معروفہ سرکار گورکھپورات، سکونت ورزیدہ۔ امّا دہقانان از خود دور بہ طمع آں قدر زمین پیوستہ وے را در رنج دارند و درین کہولت و فقدان طاقت مجبورش نمودہ، بدربار وزیر وعمال آں سرکارات می دوانند۔ لغات تحریر کہ سنہ ہجری بہ ہزار و دوصد و شش رسیدہ آں پیر فقیر در مسلک اجبار انتظام وہمدردان طرفہا مقام دارد دیوانے متضمن چہار پنج ہزار بیت از سخنانش تدوین یافتہ کہ سرتاپا مشتمل بر فن تاریخ است و درین صنعت وے را ملکہ ومہارتے است کہ بیان آں متحمل بر اغراق نمی شود۔ چونکہ چند نثر و قصائد طولانی در انست کہ بہ مناسبت معنوی و رعایت لفظی و مقالی از ہر فقرہ و مصرعہ آن مادۂ تاریخ بہم می رسد . . . ."

اگرچہ یہ اردو کے شاعر نہ تھے۔ مگر میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں ان کے حالات لکھے ہیں اور اس زمانے میں ان کی عمر ۷۰ سال بتائی ہے۔

میر حسن کا تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا گیا۔ گویا اس اثنا میں بیدار کی عمر ستر برس کی تھی۔ ابوطالب نے لکھا ہے کہ وہ ۱۲۰۶ھ تک بقید حیات تھے اور سفینۂ ہندی (۱۲۱۹ھ) میں ہے کہ "چند سال است کہ وفات یافت" اس کے معنی یہ ہوئے کہ انھوں نے نوے سال سے زیادہ بلکہ لگ بھگ سو کے عمر پائی ہوگی۔ صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

بیدار نے تمام عمر صرف تاریخیں کہیں اور انھیں یکجا کر کے مجموعے کا نام "کلیات تواریخ" رکھا۔ اس کا قلمی نسخہ لکھنؤ کے ایک قدیم مدرسے میں دریافت ہوا (یہ مجھے اپنے رفیق سید شبیہ الحسن صاحب کی وساطت سے دیکھنے کو مل سکا۔ اس کے لیے میں ان کا بہت ممنون ہوں)۔

اس نسخے کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس میں مصنف نے کچھ اپنے اور کچھ اپنی تاریخ گوئی سے متعلق ذکر کیا ہے۔ اسی میں اپنا توطن موضع سکندر پور آمودہ مضاف سرکار گورکھپور ملک سردار بتایا ہے۔ اپنی تعلیم و تربیت سے متعلق لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم دہلی میں شیخ محمد عظیم گوالیاری کی خدمت میں پندرہ مہینے حاصل کی۔ انھیں کی صحبت میں کچھ شعر و سخن سے واقفیت بہم پہونچائی۔ پھر خواجہ محمد ناصر اور ان کے

پیشے خواجہ میر درد اور سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا جان جاناں مظہر وغیرہ کے فیضان صحبت سے مستفید اور مستفیض ہوئے۔ اور انھیں تاریخ گوئی کا شوق پیدا ہوا پہلے کچھ تاریخیں کہہ کر حضرت شیخ محمد زبیر سرھندی کو دکھائیں اور جب انھوں نے پسند فرما کر دعائیں اور بشارتیں دیں تو یہ شاہجہان آباد کے مشاعروں میں اپنی تاریخیں سنانے لگے۔ یہ تاریخیں لوگوں نے اس قدر پسند کیں کہ بیاضوں میں لکھی جانے لگیں اور باہر بھی جانے لگیں۔ سلاطین اور امرا و مشائخ و فقرا فرمائش کر کے ان سے تاریخیں لکھواتے۔ جب ان کا ذخیرہ بہت ہو گیا تو چند قدر دانوں کی تحریک پر ان کے بیٹے منشی جیون لال آگاہ نے انھیں ۱۱۸۱ھ میں ترتیب دینا شروع کر دیا۔ بد قسمتی سے آگاہ کا ۱۱۸۴ھ میں انتقال ہو گیا۔ اب بیدآر نے دلی چھوڑ دی اور تلاش معاش میں اودھ اور پٹنہ ہوتے ہوئے مرشدآباد پہنچے۔ وہیں رائے سندر سنگھ کی استدعا پر یہ کلیات پھر مرتب کیا اور دہلی لکھنؤ اور پٹنہ میں جو تاریخیں کہی تھیں یا ان میں سے جو یاد آئیں اس میں درج کر دیں۔ اس کے بعد یہ اودھ واپس آ گئے۔ اور ہر سال اس مجموعہ میں جدید تاریخوں کا اضافہ کرتے رہے۔ فیض آباد، لکھنؤ اور پٹنے میں یہ کتنے عرصے اس کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ یا مرشدآباد سے سکندرپور کب واپس آئے، یہ بھی تحریر نہیں ہے اس کلیات میں ۱۲۰۳ تک کی تاریخیں مل جاتی ہیں۔ چونکہ ۱۱۸۱ء میں اس کلیات کی ترتیب شروع ہوئی تھی، ۱۲۴۴ھ میں نتائج الافکار کے مؤلف نے انھیں موضع سکندرپور میں موجود بتایا ہے۔ ممکن ہے اس سے بہت پہلے یہ یہاں آ گئے ہوں۔ کیونکہ میر حسن نے انھیں ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھنؤ میں دیکھا ہے یہ اپنی جاگیر کے بندوبست کے سلسلہ میں لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے۔ ممکن ہے یہیں انھوں نے کلیات کی نقل کسی رئیس کو دی ہو۔ کلیات کے آخر میں جو ترقیمہ ہے، یہ اگرچہ ایک طرف سے کٹا ہوا ہے، لیکن اتنی عبارت صاف پڑھی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے:

"بندہ ہیچمداں مانے سناتھ سنگھ بیدآر تخلص۔ ایں چند اجزا
نقل کلیات تواریخ طبع زاد خود را کہ ..... لالہ رام پرساد .....
بینا تخلص لالہ صاحبان مہربان ..... لعل صاحب .....
جلد اصل نسخہ آورد بنا بر مقابلہ و تصحیح و ..... فرستاد ... ہرچہ
درست و مقرون بہ صحت توانست بعمل آوردہ ...."

اپنی کتاب کا آغاز فارسی میں ایک طویل مقدمہ سے کیا ہے اس کے آخر میں یہ قطعہ لکھا ہے۔

قطعہ

بیدآر پیش اہل سخن ہرزہ گوئیم | گرچہ تمام مزخرفات است فی المثل
لیکن اگر ز دیدۂ انصاف بنگرند | گویند آفریں و بدانند بے خلل
رشک مورخان معاصر بجا بود | زیں رہ کہ من بعوصۂ ایں فن شدم مثل
جستم چوں سال ایں ہمہ ترتیب در دلم | ہاتف ز غیب گفت "تواریخ بیبدل (۱۱۸۱ھ)
از لفظ تواریخ حروف بدل کم کردہ باید شمرد

اس کے بعد کلیات ہے جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کی ابتدا میں چند تعارفی اشعار سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ پہلے باب کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

بنائے باب اول چوں نہادم | جہاں را از ولادت مژدہ دادم
بیا بشنو نوید سال فرزند! | کز دگر دو دل و جان تو خرسند
تامل کن بہر تاریخ ایں کار! | چنیں گفتن بود بے شبہ دشوار

یعنی پہلے باب میں انھوں نے تاریخ ہائے ولادت لکھی ہیں۔ دوسرے اور تیسرے ابواب کے وہ اوراق جن پر یہ تعارفی اشعار لکھے تھے۔ پیش نظر نسخے سے غائب ہیں۔ بقیہ اوراق موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک مذہبی تہواروں مثلاً عید الفطر، عید الاضحیٰ، ہولی، دیوالی، نوروز، سلونو وغیرہ سے متعلق تھا، دوسرا شادیوں کی تاریخوں سے متعلق۔ چوتھا باب خطاب و منصب و جنگ و فتح و ملالت و شفایابی کی تاریخوں کی بابت ہے، اس کا تعارف یوں کرایا گیا ہے

دریں باب چہارم گر در آئی | سرور جان و دل حاصل نمائی
کہ تاریخ خطاب و منصب و فیل | ہم از خدمت دراں باشد بہ تفصیل
دگر از آمد و رفت و عزیمت | ز جنگ و آشتی فتح و ہزیمت
دگر سال شفایابی بیمار | دریں درج است و دیگر از دو سہ کار

پانچویں باب میں تعمیرات کی تاریخیں ہیں ان کا سرنامہ یوں نظم کیا ہے:

بہ باب پنجمیں بشنو بشارت | کہ دارد سال ہر قسم عمارت
ز باغ و نہر و حوض آب و تالاب | ز حمام و حویلی و پل آب
دگر از باؤلی و مسجد و چاہ | ز مجلس خانہ و درہائے درگاہ
ز خط خواندن و گنج نو آباد | حصار و روضۂ فرخندہ بنیاد
مکان ماتم عام امامین | خداوندان شاہنشاہ دارین

بیا بکشا طلسم قفل ایں باب | خدا را لطف ہر تاریخ دریاب
شوم قربان حکم خواجۂ خویش | کہ تاریخات ایں بیدار درویش
پسند خاص و عام ہر بلادات | قبول حق شب و روزہ مرادات

چھٹے باب میں چند اختراعات اور دلچسپ واقعات کی تاریخیں ہیں۔ ان کی سرخی یوں قائم کی ہے۔

دریں باب ششم تاریخ ہر کار | دہد خوانندہ را تفریح بسیار
بیا سیرش کن اے یار سخن سنج | کہ ایں مجموعہ باشد بہتر از گنج

ساتویں اور آخری باب میں لوگوں کی وفات کی تاریخیں درج کی ہیں۔ اسکی سرخی یوں نظم کی ہے:

بود ایں باب ہفتم جائے عبرت | کہ دارد کثرت تاریخ رحلت
چوں ہر مخلوق را گزدی حیات است | ز تقدیر خدا آخر وفات است
خوشا مردے کہ از قید خودی رست | دل و جاں را بہ تسبیح خدا بست
بر ایں و آں نباید بست دل را | بقائے نیست جسم آب و گل را
ازیں دار فنا ہر کس کہ بشتافت | سوئے باقی حیات جاوداں یافت
الٰہی بخش توفیق چناں نم | کہ از یادت دمے غافل نمانم
بماند در جہاں تا زندہ بیدار | بذکر و فکر خود یارب نگہدار

ہر باب میں متعدد تاریخیں ہیں اور ہر قطعۂ تاریخ کا عنوان نیز عدد تاریخ سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

اب ہر ایک باب کی خاص خاص تاریخوں کے عنوانات مادہ ہائے تاریخ درج کئے جاتے ہیں۔ (ان کی ہر ایک کی باقاعدہ جانچ میں نے کی ہے)

باب اول (تاریخ ہائے ولادت)

۱۔ قطب الاقطاب حضرت شیخ محمد زبیر قدس اللہ سرہٗ : مخدوم زمانہ قطب الاقطاب آمد (۱۰۹۳ھ)

۲۔ حضرت امیر المحدثین خواجہ ناصر الدین محمدی (۱) وارث علم امامین و علی (۱۱۰۵ھ) (۲) آیت رحمت الٰہی (۱۱۰۵ھ)

۳۔ حضرت خواجہ میر درد تخلص مدظلہ العالی : آمد بوجود نقشبند ثانی (۱۱۳۳ھ)

۴۔ حضرت محمد میر، اثر تخلص مدظلہ العالی : آمدہ نور شمع امامت (۱۱۴۸ھ)

۵۔ میاں صاحب، صاحب میر سلمہ اللہ تعالیٰ : بداں ماہ تاباں برج ولادت (۱۱۵۲ھ)

۶۔ میاں احمد میر فرزند صاحب میر، سلمہ اللہ تعالیٰ
صبحگاہ ششم از ماہ ربیع الاول (۱۱۷۰ھ)

۷۔ میر محمد حسن فرزند دوم میاں صاحب سلمہٗ
ہژدہم روز سہ شنبہ از مہ شعبان رسید (۱۱۶۲)

۸۔ میر عبدالحیٔ صاحب ولد خواجہ احمد یار خاں (بنی عسم حضرت خواجہ میر درد) مرحوم
بر آمد آفتاب برج حیدر (۱۱۵۸ھ)

۹۔ پسر دوم محمد خان مرحوم : قرۃ العین علی و فاطمہ آمد، بگفت (۱۱۵۷ھ)

۱۰۔ میر عبدالقیوم پسر سوم محمد خان موصوف، گفت، سر گلشن امت دمید (۱۱۶۵ھ)

۱۱۔ فرزند شاہ عالم بادشاہ : زدر قم مہر سپہر تیمور (۱۱۶۸ھ)

۱۲۔ فرزند نواب عماد الملک وزیر : بشگفت گل از حدیقۂ آصف جاہ (۱۱۶۷ھ)

۱۳۔ پسر محمد سعید خاں نائب وزارت عماد الملک : یارب خلف سعید ماند ابدا (۱۱۶۷ھ)

۱۴۔ فرزند نواب مہدی خان بہادر : راحت جان اہل بیت نبی (۱۱۷۳ھ)

۱۵۔ فرزند سعید نور الحسن خان بہادر : آیت مصحف دولت مندی (۱۱۶۳ھ)

۱۶۔ فرزند نواب سعادت علی خاں بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ :
دمیدہ آفتاب گیتی آرا (۱۱۸۹ھ)

۱۷۔ فرزند سعید نور الحسن خان بہادر : برآمد آفتاب عالم افروز (۱۱۶۶ھ)

۱۸۔ نواب شجاع الدولہ : برآمد آفتاب از مطلع نور (۱۱۴۴ھ)

۱۹۔ تاریخ سالگرہ نواب انتظام الدولہ خانخاناں بہادر:
بلو عمرت ہزار سال فزوں (۱۱۷۹ھ)

۲۰۔ تاریخ سالگرہ نواب انتظام الدولہ خانخاناں بہادر
سال نو یارب بود افزوں ز حساب (۱۱۶۳ھ)

۲۱۔ تاریخ مکتب نشینی نواب آصف الدولہ بہادر
گفتن اقرار باسم ربک سالش بداں (۱۱۶۲ھ)

۲۲۔ تاریخ مکتب فرزند دوم نواب شجاع الدولہ بہادر
از طفیل پنجتن از علم یا داکامیاب (۱۱۹۹ھ)

۲۳۔ تاریخ ختنۂ فرزند وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر:
زیب ازیں بر سنت خلیل افزود (۱۱۹۹ھ)

باب دوم (تاریخہاے شادی)

۲۴۔ تاریخ شادی میاں صاحب محمد میر اثرؔ کہ درحویلی میر سید محمد صاحب و شب شادی بدیہہ گفتہ بنظر جناب اقدس خواجۂ دین و دنیا گذرانیدہ بود ؛ درشب نیک قران السعدین (۱۱۹۱ھ)

۲۵۔ شادی نواب عماد الدین وزیر با دختر علی قلی خان فرمائش برائے لوندہ راے ؛

اتصال دو نجم عالم تاب (۱۱۴۹ھ)
جلوۂ مشتری بمنزل ماہ (۱۱۶۹ھ)

۲۶۔ شادی نواب آصف الدولہ با صبیۂ انتظام الدولہ منظوم ؛

فزود نور قمر ز آفتاب باید گفت (۱۱۸۴ھ)

۲۷۔ شادی اول کنور سنگھ فرزند راجہ ٹکیت رائے بہادر ؛

تزدیج دو گہر دُرِ بیش بہا (۱۱۹۷ھ)

باب سوم

تواریخ شاہان و تواریخ نوروز و بسنت و عید وغیرہ

۱۔ جلوس احمد شاہ بادشاہ ؛ آمد بشارت از غیب سلطان ہفت کشور

_______________ (۱۱۶۱ھ)

۲۔ جلوس شاہ عزیز الدین عالمگیر ؛ بود رفاہ بر دم بدور عالمگیر (۱۱۶۷ھ)

۳۔ مسند آرائی نواب آصف الدولہ بہادر، فرمایش ایرچ خان ؛

مسند دولت جاوید مبارک باشد (۱۱۸۸ھ)

۴۔ تاریخ عید الفطر و عید الاضحیٰ و ہم تاریخ بسنت و ہولی و نوروز و دسہرہ

روز بسنت باد مبارک بصد نوید (۱۱۶۱ھ)

۵۔ تاریخ بسنت برائے نواب آصف الدولہ بہادر ؛

صد ہمایوں بود سرور بسنت (۱۱۹۲ھ)

۶۔ نیز تاریخ ہولی ؛ ترا ہولی مبارک باد و نوروز (۱۱۹۷ھ)

۷۔ عید برائے شاہ عالم بہادر شاہ ؛

عید ہر صبح از مبارکباد گویانِ تو باد (۱۱۶۷ھ)

۸۔ برائے عماد الملک وزیر عالمگیر ثانی ؛ نوروز ترا مبارک جاوید (۱۱۶۹ھ)

۹۔ برائے احمد شاہ بادشاہ ؛ شاہ را عید مبارک باشد (۱۱۶۱ھ)

۱۰۔ برائے جناب امام العارفین امیر المحدثین خواجہ دنیا و دین

عید ماہ صیام باد افرخ (۱۱۵۹ھ)

۱۱۔ بہ مرشد زادۂ حضرت صاحب میر مدظلہٗ :

شکر خدا کہ ہاتف شایان داب عالی
عید الضحیٰ مبارک در گوش من بفرمود (۱۱۹۶ھ)

۱۲۔ برائے نواب امیر الدولہ بہادر ؛

گفت عید الضحیٰ مبارک باد (۱۲۰۳ھ)

باب چہارم

متعلق تواریخ حصول خطاب و منصب نیز جنگ و فتوحات وغیرہ

۱۔ تاریخ نظامت صوبجات دکن بہ شاہزادہ عالی جاہ

فرق اعدائش جدا کردہ سروشم مژدہ داد
شاہ عالی جاہ بادشاہ شاہان دکن (۱۱۷۱ھ)

۲۔ صوبہ داری بنگالہ جعفر علی خاں نائب شاہزادہ

یافت رونق دیار بنگالہ (۱۱۷۰ھ)

۳۔ صوبہ داری صوبہ اودھ بہ نواب اقتدار الدولہ ؛

یافتہ صوبہ رونق دیگر (۱۱۸۹ھ)
صوبہ داری ترا مبارکباد (۱۱۸۹ھ)

۴۔ دیوانی تن راجہ ناگرمل ؛ شکر اللہ کہ جاں بتن آمد (۱۱۶۱ھ)

۵۔ وزارت نواب آصف الدولہ ؛

تاریخ آں وزارت ہندوستاں رسید (۱۱۹۰ھ)

۶۔ نیابت نواب آصف الدولہ مختار الدولہ مرتضیٰ خاں

فزود زینت دیگر بمال و ملک وزیر (۱۱۸۹ھ)

۷۔ خطاب راجگی بہ رائے رایاں ناگرمل :

کرد ز تیغش سر حاسد جدا گفت مہاراجہ بجا شد خطاب (۱۱۶۷ھ)

۸ - خلعت وتاج از حضور شاہ عالم بہادر بادشاہ بہ شاہزادہ جہاندار شاہ فرمائش مرزا مغل وبارگر قلی خاں ؛ ہمایوں بود تاج شہنشاہی (۱۱۹۹ھ)

۹ - پیش خیمہ محمد شاہ بدافعہ احمد درآنی بہ سرہند بموجب حکم حضور گفتہ شد :

دیدم تاریخ فتح شہنشاہی (۱۱۶۰ھ)

۱۰ - کوچ وفتح نواب صفدر جنگ بمقابلہ افاغنہ وروہیلہ

نوید فتح وزیر مجسم مبارکباد (۱۱۶۴ھ)

۱۱ - فتح عماد الملک وزیر بر قطب خان افغان

ہر طرف باد فتح آصف جاہ (۱۱۶۹ھ)

۱۲ - برآمدن شاہ عالم بہادر از محاصرۂ حویلی جعفر خاں بکشتن چند کسان عماد الملک ؛ گفت ، سلطان محمود کار رستم (۱۱۷۱ھ)

۱۳ - اخراج قوم روہیلہ بعد کشتن حافظ رحمت خان ؛

اخراج روہیلہ ابد آباد ہمایوں (۱۱۸۸ھ)

۱۴ - مصالحت نواب صفدر جنگ با عماد الملک بعد جنگ شاہجہاں آباد وقت رخصت صوبہ ؛ گفت ، الصلح خیر ، قال اللہ (۱۱۶۶ھ)

۱۵ - تشریف آوردن حضرت صاحب میر مدظلہٗ بفیض آباد :

کحل دیدۂ بینا باد خاک پائے تو (۱۱۹۱ھ)

۱۶ - مراجعت نواب سعادت علی خان بہادر از مشرق ؛

بدر کامل بر آمد از مشرق (۱۱۹۳ھ)

۱۷ - نابینا شدن شاہ عالم بہادر ؛ گفت آہ دو زصدقہ برآ در چشم شاہ (۱۲۰۲ھ)

چند صحتیابی کی تاریخیں بھی اسی باب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہیں۔ ان کے نمونے بھی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

تاریخ صحت نواب آصف الدولہ بہادر از عارضہ دوبارہ ..... در یک سال

یافت عمر دوبارہ آصف جاہ (۱۱۹۹ھ)

تاریخ صحت برائے ہلاس رائے :

بگفت ساقی بر حق شفائے عاجل داد (۱۲۰۵ھ)

بیدار نے اردو میں تاریخیں نہیں کہیں۔ لیکن ان سے راجہ (کرن سنگھ نے) کسی کی تاریخ فوجداری گورکھپور کی اردو میں فرمائش کی۔

افسوس کہ یہ دو شعر کی تاریخ کرم خوردہ ہے۔ جو کچھ پڑھا جا سکا ہے وہ یہ ہے :

آمودہ میں تمہارے آونے کی سنی تاریخ جب چاروں برن نے

کہا بیدار نے سب کو مبارک .... راجہ کرن نے

باب پنجم

متعلق تعمیرات ہر قسم !

۱ - تاریخ باغیچہ خواجہ منظور اسحاق خاں کہ متصل لال دروازہ دار الخلافت ساخت بموجب مرضی حضرت خواجہ میر درد گفتہ شد و بعد یک سال وقت کتابہ بر سنگ سفید در انشاد آں قدم غلطی سہو ظاہر شد بیت دوم سرانجام یافت ، مقدور من بے ہنر ہیچمداں نبود محض بعنایت الٰہی و بہ یمن حکم آں جناب بخاطر رسیدہ ؛

بموجب فرمائش اول ؛

ہست تاریخ بنائے ایں باغ رشک فردوس قدم گاہ علی (۱۱۵۱ھ)

بموجب فرمائش دوم ؛

ہست تاریخ بنائے ایں ریاض جنت الاقصیٰ قدم گاہ رسول (۱۱۵۲ھ)

۲ - تاریخ باغ و نہر و تالاب نواب عمدۃ الملک امیر خاں ، در تخرجہ تاریخ بنائے باغ و نہر و تالاب ؛

بے شبہ نعیم و کوثر و تسنیم است (۱۱۵۹ھ)

۳ - تاریخ نور افشان باغ فرمایش ایلچ خان مرحوم ؛

تواں نوشت بآب طلا ریاض نعیم (۱۱۸۱ھ)

۴ - تاریخ تعمیر حسن باغ نائب وزیر آصف الدولہ بہادر

(۱) گفت رشک جہاں ہمیشہ بہار (۱۱۹۲ھ)

(۲) خضر آمد و گفت ، باغ آصف جاہی (۱۱۹۳ھ)

۵ - باغ راجا نکیت رائے ؛ گفت بیکنٹھ عالم است ہیں (۱۱۹۳ھ)

۶ - محل کرنیل مارٹن بہادر لب دریائے گومتی ، لکھنؤ

کار فرنگ کردہ ہویدا دریں مکاں کل نل کلو دزیدۂ انگریزاں تیں

۱۱۹۷ھ ۱۱۹۷ھ

۷ - تالاب و چاہ و نہر و حوض درگاہ حضرت شاہ مرداں فرمائش نواب بہادر

جاوید خان ؛

بگفتا، چشمۂ شیریں برآمد (۱۱۶۵ھ)

۸۔ تعمیرات باغ و باولی و حمام و آئینہ محل و حویلی دوبارہ دری آصف الدولہ

جنت بجہاں ہیں مکانت (۱۱۹۰ھ)

۹۔ مسجد درگاہِ شاہ مردان دہلی۔ عبادت خانۂ جاوید آباد (۱۱۶۵ھ)

۱۰۔ مسجد سعید الدولہ فرمائش سراج الدین خان آرزو — بیت معمور مطلع الوار (۱۱۶۵ھ)

۱۱۔ تاریخ خطبہ در مسجد طلائی جاوید خان، پیش قلعہ ؛

خطبہ در مسجد نو باد مبارک بجہاں (۱۱۶۴ھ)

۱۲۔ مسجد و امام باڑہ نواب وزیر آصف الدولہ بہادر ؛

ہست بیت اللہ دائم مسجد اہل جہاں (۱۲۰۰ھ)

۱۳۔ تاریخ مسجدے کہ جناب اقدس قدس اللہ سرہٗ (خواجہ محمد ناصر) تعمیر فرمودہ بودند و بندہ بدیہہ عرض کردہ

سال این قبلۂ دین و دنیاست مسجد خواجہ محمد ناصر (۱۱۵۵ھ)

۱۴۔ تاریخ حیدر گنج، فرمائش شاہ عبداللہ کابلی ؛

(۱) رونق گنج حیدر است دوام (۱۱۶۳ھ)

(۲) رونق دہلی ز گنج حیدر است (۱۱۶۳ھ)

۱۵۔ تاریخ عالمگیر گنج کہ پیش از احداث آں بنا بر امتحان بدیہہ گوئی بقید نام حکم کردہ پس مہتاب باغ متوجہ شدند و بوقت مراجعت چوں در صحن دیوان خاص مصرع تاریخ بہ نظر گذشت، بکلمات نوازش فرمودند "بہتر از صد ہزار تاریخ است، فکر دگر نخواہی کرد مورد عنایات خواہی شد"

خسرو عالم چو بہر راحت و آرام خلق
عزم آبادی این گنج نکو بنیاد کرد
بندۂ بیدار حسب الحکم تاریخش بگفت
شاہ عزیز الدین عالمگیر گنج آباد کرد (۱۱۷۱ھ)

۱۶۔ روضۂ منورہ حضرت شیخ محمد زبیرؒ کہ در بلدۂ سرہند تعمیر شدہ، زیارتگاہ عالم است ؛ القاشک روضۂ حبیب سبحان (۱۱۵۴ھ)

۱۷۔ تعمیر مزار لامع الانوار امام عارفین امیر المحدثین حضرت خواجہ ناصر صاحب 'نالۂ عندلیب' (۱) خیر دین و نجات می باید اب (۱۱۷۳ھ)

(۲) بر آستانہ قدسی بکن بہ نیچ جبیں سائی (۱۱۷۳ھ)

۱۸۔ دروازۂ امام باڑہ مرشد آباد ساختہ نواب مظفر جنگ خانخاناں بہادر

باب فیض امام باڑہ کشاد (۱۱۸۵ھ)

۱۹۔ حویلی اول راجہ نکیت رائے بہادر صاحب

گفت، دار السرور عیش مکاں (۱۱۹۳ھ)

۲۰۔ حمام راج محل تعمیر نواب وزیر آصف الدولہ ؛

گفت، بے مثل ہست ایں حمام (۱۱۹۶ھ)

تاریخ تصنیف تازہ جناب ...... حضرات و سخنوران عصر !

(ا) خواجہ میر درد کی کسی تصنیف پہ نام درج نہیں ؛

زہے معارف نصرت ندا ز غیب رسید (۱۱۵۳ھ)

(ب) علم الکتاب از حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ

الہام شد معارف خاص محمدی " (۱۱۸۴ھ)

(ج) نسخۂ واردات از حضرت خواجہ میر درد ؛

بگفتا "وارادت درد عرفاں" (۱۱۷۱ھ)

(د) رسالہ درد دل (حضرت خواجہ میر درد)

" درد دل جلوۂ اثر دارد " (۱۱۹۶ھ)

(ہ) رسالہ نالۂ درد (حضرت خواجہ میر درد)

" نالۂ درد است ایں باید شنید " (۱۱۹۰ھ)

(و) رسالہ آہ سرد (حضرت خواجہ میر درد)

آہ سرد است ایں کہ آمد آں ز درد دل بلب (۱۱۹۶ھ)

(ز) نسخۂ چمنستاں، انشائے بندہ زادہ منشی جیون رام آگاہ

" چمنستان بود ہمیشہ بہار " (۱۱۸۴ھ)

(ح) تاریخ اتمام تحریر کلام اللہ برائے نواب قدسیہ محل فرمائش عصمت اللہ خوشنویس ۔ خرد بگوش دلم "حسن خاتمہ" فرمود (۱۱۶۴ھ)

(ط) تاریخ سفینۂ صاحب محل، فرمائش بسنت خان خواجہ سرا محمد شاہی ؛

"بیاض دلکشا" سالش رقم شد (۱۱۶۸ھ)

(ی) تاریخ نورالانشا تصنیف لالہ کیم رام (کذا آمدہ) منشی سید نورالحسن خان
بیدار بخت "نورِ حسنِ انشاست" (۱۱۸۶ھ)

(ک) تاریخ رسالۂ نجوم تصنیف جامع کمالات ہر علوم لالہ بھگونت رائے جو
"باب شرح قواعد تنجیم" (۱۱۹۶ھ)

(ل) تاریخ مثنوی لالہ رتن لعل آفریں تخلص الہ آبادی کہ در تعریف بلدۂ بنارس
بخوبی اشتہار یافتہ ۔ بشنو از ابتدائے بسم اللہ
مدح و تعریف بلدۂ کاشی (۱۱۹۲ھ)

(م) تاریخ انشا فرمایش سرب سکھ رائے ہمراہی راجہ صورت سنگھ
گوش کن" داستان دہ یار است" (۱۱۹۷ھ)

(ن) تاریخ مرقع (سدانند) تحفہ نادر از نگار قلم" (۱۱۹۶ھ)

(س) تاریخ تذکرۂ بھگوان داس ہندی تخلص کہ آں را حدیقۂ ہندی می
گویند (۱) نام خوبش حدیقۂ ہندیست (۱۱۹۹ھ)
(۲) چمنستاں زلال ہندیست (۱۱۹۹ھ)

باب ششم
متفرق در ایجادات و واقعات دلچسپ

۱۔ تاریخ اختراعات حضرت خواجہ کوس رحمت اللہ علیہ :

(ا) تاریخ ایجادات پرتلہ و دوال "در باب کرامت الہیٰ ست" (۱۱۹۷ھ)

(ب) تاریخ ایجاد وسادہ ۔ بداں وسادۂ آرام ہر فقیر و امیر (۱۱۶۰ھ)

(ج) تاریخ ایجاد عرشہ ۔ شہ نشیں از بہر ہر یکجا، بداں (۱۱۹۹ھ)

(د) تاریخ ایجاد بازی ہوش افزا ۔ ایں چہ بازیست عقل و ہوش افزا (۱۱۵۵ھ)

(ح) تاریخ ایجاد حربۂ ناصری ۔ نصرت از چوب ناصری بطلب (۱۱۵۲ھ)

۲۔ دستار بدل شدن عماد الملک با شجاع الدولہ :
دیدم دو برادر اند دستار بدل (۱۱۶۳ھ)

۳۔ گزرانیدن جھاڑ روشنی بدرگاہ نظام الدین قدس سرہ
ملہم غیبش بشب از روے ماہ
ساختہ روشن شجر شمع طور ! (۱۱۹۸ھ)

۴۔ زیارت درگاہ بہرائچ ؛ مقصدم آنچہ بود حاصل گشت (۱۱۹۴ھ)

۵۔ دان تُلا وقت کسوف ماہ برلب گنگا :
مبارک باد ایں وزن تولا دادن (۱۱۸۶ھ)

۶۔ تاریخہائے شکار شیر و فیل برائے نواب وزیر (آصف الدولہ)
(۱) گفتا شکار گور و گوزن و پلنگ و پیل (۱۱۸۲ھ)
(۲) فیل جنگلی شکار کرد وزیر (۱۱۹۱ھ)
(۳) پنج دہ سہ فیل مگر در گرفت (۱۱۹۱ھ)
(۴) فیل یک حلقہ بزنجیر در آورد وزیر (۱۲۰۳ھ)
(۵) پنجہ و پنج شکار شیراں (۱۲۰۳ھ)

۷۔ تاریخ کشتہ شدن فیل سر حلقہ در صحرائے بہرائچ بشکار ، از دست شاہزادہ
جہاندار شاہ ؛ گفت از روئے آفریں ہاتف
والی ملک پیل صحرا کشت (۱۱۹۹ھ)

۸۔ تاریخ خشک سالی قحط عظیم ؛ آبروے من نگہدار خدا (۱۱۹۸ھ)

۹۔ تاریخہائے شنیدن مرثیۂ امام در عاشورہ محرم اول فرمایش خواجہ
باسط مرحوم ؛ جنت مجلس باد و لعنت بہ یزید (۱۱۹۴ھ)
(چھ تاریخیں اس سلسلے کی مختلف سنین کی لکھی ہیں۔ آخری
۱۱۹۸ھ کی ہے)

باب ہفتم
در تاریخہائے رحلت

۱۔ تاریخ وصال قطب الاقطاب شیخ محمد زبیرؒ
بخاک زد سر خود آسماں و کرد ندا
کہ آفتاب بزیر زمیں نہاں گردید (۱۱۵۳ھ)

۲۔ وصال امیر المحدثین حضرت خواجہ محمد ناصر قدس سرہ
(۱) گفت ترحیل امام العارفین (۱۱۷۲ھ)
(۲) فرمود آفتاب جہاں قطب وقت بود (۱۱۷۲ھ)
(۳) قریب شام دوم ماہ شعباں (۱۱۷۲ھ)
(۴) ناصر دین محمد بود، محبوب خدا (۱۱۷۲ھ)

(۳) وصال حضرت شاہ گلشن سعد اللہ قدس سرہ :

ہاتف از اوج فلک ادش خبر   بدردیں وگلشن اسرار بود   (۱۱۵۰ھ)

۴۔ وصال اول المحمدین حضرت خواجہ میر دَرد :

ہائے بود آدینہ وبست وچہارم از صفر   (۱۱۹۹ھ)

۵۔ تاریخ وفات میر کلو صاحب خویش حضرت دَرد :

گفتند مقام میر کلو بہ بہشت   (۱۱۹۶ھ)

۶۔ وصال میر سید محمد صاحب علیہ الرحمہ ،

ہاتف از روئے رضا وہمت وخیرش بگفت

دوم از ماہ جمد الثانیِ ، یوم الاحــد   (۱۲۰۹ھ)

۷۔ شاہ مبارک آبرو تخلص کو الیاری

ہاتف از دیدہ آب ریختہ گفت   آبرو بود آبروئے سخن   ۱۱۴۶ھ

۱۱۴۶ = ۱۱۵۰ھ   - ۴

۸۔ ارتحال فردوس آرامگاہ محمد شاہ غازی بادشاہ :

ہائے رفت از جہاں محمد شاہ   (۱۱۶۱ھ)

۹۔ انتقال نواب نظام الملک :

در بہشت آسود آصف جاہ، تاریخش بگفت (۱۱۶۲ھ)

۱۰۔ شہادت نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خان :

بیست ودوم روز آدینہ ربیع الاول است (۱۱۶۱ھ)

۱۱۔ تاریخ فیروز جنگ غازی الدین خان ، فرمایش میرزا جانجاناں مظہر

بگفتا غازی دنیا ودیں بود   (۱۱۶۵ھ)

۱۲۔ تاریخ صمصام الدولہ پسر نواب خان دوران

حیف بست وچہارم شوال بود   (۱۱۶۹ھ)

۱۳۔ تاریخ نواب صفدر جنگ فرمایش میر لطف اللہ ۔

جنت آرامگہ صفدر جنگ   (۱۱۶۷ھ)

۱۴۔ تاریخ نواب شجاع الدولہ بہادر

ہاتف از روئے الم سالش گفت   مہر پنہاں بزمیں شد ہیہات (۱۱۸۸ھ)

۱۵۔ تاریخ شہادت نواب عمدۃ الملک امیر خاں :

مسکن آں نبی خلد بریں   (۱۱۵۹ھ)

۱۶۔ تاریخ حکیم علوی خان محمد شاہی :

ہاتف از روئے الم سالش گفت

رفت افسوس فلاطونِ زمان   (۱۱۶۱ھ)

۱۷۔ تاریخ رفیقۂ حیات خود (بیدآر)

مرا رفیقۂ ہمدم نماند صد افسوس   (۱۱۷۱ھ)

۱۸۔ تاریخ وفات رانی مہاراجہ تکیت رائے بہادر :

دہام سکینہ یافتہ مسکن   (۱۲۰۳ھ)

بیدآر واقعی بڑے پایہ کے تاریخ گو تھے ۔ عموماً صاف ستھری تاریخیں بغیر کسی تعمیہ یا تخرجہ کے نکالنے کا فن انھیں بخوبی آتا تھا ۔ کہیں کہیں یہ بھی کمال دکھایا ہے کہ ممدوح کی تعریف میں پورا قصیدہ لکھ گئے ہیں اور ہر مصرعے سے تاریخ نکالی ہے یا کسی کی شان میں موقع ومحل کی مناسبت سے متعدد نثری فقرات لکھ دیئے ہیں اور ہر فقرے سے تاریخ نکلتی ہے ۔ اگر کہیں تعمیہ یا تخرجے سے کام لینا پڑا ہے تو اسے بھی نہایت خوبی سے نبھایا ہے ۔ مثلاً کسی رئیس نے ایک کنواں بنوایا ۔ انھوں نے اس کی تاریخ (۱۱۷۸ھ) اس طرح نکالی ــ

آب ازیں چاہ بے نظیر برآر

اس میں 'چاہ بے نظیر' کے اعداد (۱۱۸۱) میں سے 'آب' کے ۳ عدد نکالنے سے ۱۱۷۸ حاصل ہو جاتے ہیں[۵] ۔

ان کی تاریخوں کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے کیوں کہ ان کے کلیات میں ایسی اہم تاریخیں مل جاتی ہیں جو کتب تواریخ میں عموماً نہیں ملتیں ۔ خواجہ میر دَرد کے خاندان سے جو انھیں عقیدت تھی ، اس کی رعایت سے خواجہ محمد ناصر عندلیب اور دَرد کے حالات اور کارناموں سے متعلق جو تاریخیں کہی ہیں وہ اردو ادب کے طلبا کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہیں ۔ اگر ان کی یہ کتاب ضروری حواشی کے ساتھ شائع ہو سکے تو اردو کے مستند ماخذی ادب میں ایک اہم اضافہ ہو سکتا ہے ۔

حواشی :

[۱] میر حسن کے تذکرہ (مطبوعہ ۱۹۴۰ء انجمن ترقی اُردو صـ۳۸) میں ان کا نام ریسناتھ سنگھ درج ہے ۔ غالباً میر حسن نے ان کا لقب رائے اور نام یکجا کر کے رایسناتھ سنگھ   (باقی صـ۳۳ پر)

غزلیں

اقبال متین
۴/۹۰-۹-۱۵-۹، نزد عرفات مسجد
احمد پورہ کالونی
نظام آباد (اے پی)

دل سے احساس کا نشتر لے جا
آئینہ خانے سے پتھر لے جا

مجھ کو جینے دے تری یاد ہوں میں
میرے صحرا میں گلِ تر لے جا

آگ سینے میں لگا کر رکھ دے
اشک جتنے ہیں اُٹھا کر لے جا

راہ کی خاک ہوں پلکوں پہ سجا
آ، مجھے بھی کبھی گھر گھر لے جا

کبھی دل میں کبھی آنکھوں میں چھپا
اور چھپ جاؤں تو باہر لے جا

تو بھی پھٹنے کو ہے اقبال متین
نیند کے شانوں پہ بستر لے جا

ڈاکٹر مدحت الاختر
نیا گودام
کامٹی - ۴۴۱۰۰۲

تجھے چھو کر ابھی دیکھا نہیں ہے
چھوئیں گے یہ کبھی سوچا نہیں ہے

سبھی خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں
کوئی تجھ کو ابھی سمجھا نہیں ہے

قدم کیوں آگے بڑھتے جا رہے ہیں
اگر یہ راستا گھر کا نہیں ہے

بہت کم لوگ ہیں پہچان والے
یہاں ہر جسم پر چہرا نہیں ہے

جو اپنے شہر کو جنت بنا دے
کوئی اس شہر میں ایسا نہیں ہے

ملے ہیں بارہا مدحت سے ہم بھی
وہ اچھا ہے مگر اتنا نہیں ہے

محمد انصار اللہ
۵۸۵ سرسید روڈ
سرسید نگر۔ علی گڑھ

قدسی کی نعت

اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو گو شعرا ر عام طور سے فارسی سے بھی واقف ہوتے رہے ہیں اور اُن کے دواوین میں تبرکاً ہی سہی لیکن دو ایک غزلیں، قطعے، رباعی فارسی میں بھی معمولاً ہوتی تھیں بلکہ بعض بعض اردو گو شاعروں نے تو فارسی میں بھی اپنا دیوان تک مرتب کر ڈالا ہے۔ اتنا ہی نہیں، اُردو کے شاعروں کا قلم جب روانی پر آتا ہے تو مصرعے کے مصرعے فارسی میں موزوں ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً ؏

فطرت لیجاں، فکر جماعت، حسنِ بیاض وغصۂ حمرا — ذوق
نقش ناز بت طناز بہ آغوشِ رقیب — غالب
سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات — اقبال
اے پرستارِ حرم سوئے کلیسا منگر — نظر

قصیدوں اور نعتوں کے لیے فارسی کا استعمال اُردو گو شاعروں کے معمولات میں رہا ہے۔

الہ آباد میں شاہ خوب اللہ کا گھرانا علم و شعر کے گہوارہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہ صاحب کے بیٹے، پوتے، پرپوتے اکثر علم دوست اور شاعر ہوئے ہیں۔ زمانہ مابعد میں جب اردو شاعری کا چلن ہو گیا تھا اور اس خانوادے کے شاعروں نے اُردو گوئی کو اختیار کر لیا تھا۔ اس وقت بھی یہ لوگ فارسی سے بے تعلق نہیں ہوئے تھے۔ شاہ غلام اعظم افضل وغیرہ اگرچہ اردو میں صاحب دیوان ہوئے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے رہے تھے۔ اسی صاحب علم گھرانے میں سید محمد اکبر نامی ایک شخص نے اپنا تخلص قدسی رکھا تھا۔ افسوس ہے کہ اس قدسی کے نہ تو زیادہ حالات کا علم ہے اور نہ اس کے کلام کے بارے میں ہی تفصیلات دستیاب ہیں۔ اتنی بات البتہ ظاہر ہے کہ اس شاعر کو قدسی مشہدی کی شخصیت اور شاعری سے کسی نہ کسی درجے میں دل چسپی ضرور تھی۔ اغلب ہے کہ اس دل چسپی اور تخلص کی یکسانیت کے سبب اس شاعر کو بھی عام طور سے سید محمد جان کہا جانے لگا تھا۔ شاعروں کے معاملے بھی بہت دل چسپ ہوتے ہیں۔ وہ جس نام سے مشہور ہو جاتے ہیں وہی باقی رہ جاتا ہے اور ان کا اصل نام عموماً فراموش ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس قدسی کا ایک ہمعصر شاعر اپنے تخلص مظلوم کی رعایت سے شاہ مظلوم کر کے مشہور ہو گیا تھا۔ بیشتر تذکروں نے اس کے اصل نام کا خیال بھی نہیں کیا اور لکھا کہ "نامش شاہ مظلوم" یا "مظلوم شاہ"۔ ٹھیک یہی معاملہ اس قدسی کے ساتھ بھی ہوا۔ لکھنے والوں نے عموماً اس کو "سید محمد جان قدسی" لکھا ہے اور نتیجہ کے طور پر ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے اسے "قدسی مشہدی" خیال کر لیا ہے۔

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کے قدسی مذکور کے ساتھ اچھے روابط معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں اس کا بیٹا پیدا ہوا تو نادر نے تاریخ کہی جو ان کے "رسالۂ نو" (قلمی) میں ذیل کے عنوان سے درج ہے:

"قطعۂ تاریخ تہنیت ولادتِ سید علی اکبر فرزند ارجمند سید محمد جان قدسی۔"

اس عنوان میں قدسی کا اصل نام تو نہیں آیا ہے لیکن اس کے زمانے اور علاقے کے بارے میں شبہ یا اشکال کی کوئی وجہ نہیں ہے نادر نے اپنے تذکرہ "شوکتِ نادری" میں قدسی کا تو نہیں، لیکن اس کے والد سید شاہ علی جعفر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شوکتِ نادری کی تالیف (۱۲۴۷ھ م ۳۲-۱۸۳۱ء) تک شاعر کی حیثیت سے قدسی متعارف نہیں ہوا تھا۔ اغلب ہے کہ اس وقت تک اس کی عمر پندرہ سولہ برس کے قریب رہی ہوگی۔

نادر نے ۱۲۸۳ھ م ۱۸۶۷ء میں اپنے خمسوں کا مجموعہ "دیوانِ غریب" کے نام سے مرتب کیا۔ اس میں انھوں نے قدسی کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"قدسی[۲]، سید محمد جان، دختر زادۂ شاہ محمد اجمل، باشندۂ دائرہ الہ آباد، صاحبِ دیوان، شاگرد حضرتِ آتش۔"

یہاں بھی قدسی کے اصلی نام کو نادر نے فراموش کر دیا ہے۔ اس کا پتہ سید محسن علی محسن نے اپنے تذکرے میں دیا ہے۔ لکھا ہے:

"قدسی[۳] سید محمد اکبر عرف شاہ محمد جان قدسی ولد شاہ علی جعفر دختر زادۂ حضرت شاہ اجمل علیہ الرحمۃ۔ اجمل باشندۂ الہ آباد، دائرہ شاہ اجمل۔ واسطے سیر کے لکھنؤ میں آئے تھے۔ اصلاح شعر کی خواجہ حیدر علی آتش سے لی۔ صاحب دیوان۔"

ڈپٹی[۴] عبد الغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرے میں اسی تعارف کو معمولی فرق کے ساتھ نقل کر لیا ہے۔ محسن نے جو غزل لکھی تھی انھوں نے بھی قدسی کی اسی غزل کے شعر نقل کر دیے ہیں اور اسی غزل پر نادر نے بھی دیوانِ غریب میں خمسہ لکھا ہے۔ وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اس زمانے میں قدسی موجود نہ ہوگا اور اس کی اور کوئی تازہ غزل نادر کو دستیاب نہ ہو سکی ہوگی۔ نادر نے اپنے دیوان غریب کا آغاز قدسی کی مشہور نعت کی تضمین سے کیا ہے، جس کا ایک بند یہ ہے ؎

حشر میں حد سے فزوں ہوے گی جب تشنہ لبی
اور قریب آئے گا ہنگام شفاعت طلبی
عرض حضرتؐ سے کرے گا یہی ہر ایک نبی
مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

قدسی کی اس نعت پر میر علی اوسط رشک نے بھی تضمین کی ہے۔ ان کے مخمس میں اس نعت کا متن اس طرح ہے ؎

مرحبا سید مکی مدنی و عربی!
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

نسبتِ نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم، تو چہ عالی نسبی

منِ بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگِ کوے تو بس بے ادبی

ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی

نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

روزِ معراج عروج تو ز افلاک گذشت
بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

چشمِ رحمت بکشا، سوئے غریباں بنگر
اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی

سیدی انتَ حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوے تو قدسی پے درماں طلبی

میر رشک کے اس خمسہ پر عنوان اس طرح مندرج ہے:

"مخمس جناب سید علی اوسط صاحب رشک کہ مصارع بر غزل حاجی محمد جان قدسی (گفتند)"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدسی نے حج بیت اللہ سے بھی شرف پایا تھا گمان غالب ہے کہ یہ نعت اس نے وہیں کہی ہوگی۔ شعر ۸ میں "دریں

ملکِ عرب" اور مقطع میں "آمدہ" کے کلمات صاف اس پر دلالت کرتے ہیں، البتہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیا تکلیف یا پریشانی تھی جس کے لیے شاعر "درماں طلب" ہوا تھا۔ اس کے لیے قدسی کے حالات کی جستجو کی جانی چاہیے۔

قدسی کی اس نعت کے لیے شاید قدیم ترین ماخذ میر رشک کے دیوانِ سوم کا یہ خمسہ ہے۔ اسی میں پہلی بار اُسے "حاجی" کہا گیا ہے۔ ظاہراً میر رشک بھی اس قدسی سے براہِ راست واقف تھے اور انھوں نے اس نعت کا جو متن اختیار کیا ہے اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے زمانۂ مابعد کے خمسوں میں بعض شعروں کا اضافہ بھی ملتا ہے چنانچہ ڈاکٹر سمیع الدین صاحب نے[9] درج ذیل شعروں کی نشان دہی کی ہے ؎

عاصیانیم زما نیکیِ اعمال مپرس
سوے ما ردے شفاعت بکن از بے سببی

بر درِ فیض تو استادہ بصد عجز و نیاز
رومی و زنگی و طوسی یمنی و حلبی

در حریم حرم کعبہ و صلش نہ رسی
دست در دامنِ اولادِ نبی تا نہ زنی

ان شعروں کو الحاقی خیال نہ کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

میر رشک کا دوسرا دیوان ۱۲۶۱ھ م ۱۸۴۵ء میں مرتب ہو کر قطعی صورت میں ۱۲۶۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ عام حالات میں ان کے تیسرے دیوان میں اس سال کے بعد کا کلام ہوگا۔ اس بنا پر قدسی کی اس نعت کی تخمیس انھوں نے ۱۲۶۱ھ میں یا اس سنہ کے بعد ۱۲۶۷ھ م ۱۸۵۱ء سے پیشتر کسی وقت کی ہوگی۔ خیال کیا جانا چاہیے کہ تقریباً وہی زمانہ اس نعت کے نظم کیے جانے کا بھی ہوگا۔

محسن کا کہنا ہے کہ قدسی لکھنؤ بھی آیا تھا۔ گمان غالب ہے کہ اس نے حج پر جاتے وقت (یا ممکن ہے واپسی میں) لکھنؤ کی سیر کی ہوگی۔ اس سے پہلے بھی قدسی کی نعت کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں قیاسِ بالا کی تائید ہوتی ہے۔ لکھنؤ اور الہ آباد کے آس پاس کے مقاموں میں اس نعت کو نسبتاً پہلے رواج ملا ہوگا۔

عبداللہ خاں علوی تخلص، دہلی کے باکمال فارسی داں عالم اور شاعر شیخ امام بخش صہبائی کے استاد تھے۔ انھوں نے بھی قدسی کی نعت پر خمسہ کہا تھا۔ حدیثِ قدسی میں ان کا خمسہ ذیل کے عنوان سے درج ہے۔

"مولانا مولوی حکیم محمد عبداللہ صاحب رئیس پورہ مفتی
ضلع الہ آباد، واردِ حال دہلی، تخلص علوی"

اگر اس پر اعتماد کیا جا سکے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ علوی اور قدسی کے مابین ہم وطنی کا تعلق تھا۔ علوی بنیادی طور پر فارسی کے عالم اور استاد تھے۔ قدسی کی فارسی نعت قدرتی طور پر ان کی دل چسپی کا سبب بنی ہوگی۔ مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر عمر میں علوی مرزا دولھا رئیس شمس آباد (نواح فرخ آباد) کی رفاقت میں تھے۔ وہیں انھوں نے ۱۲۶۳ھ م ۱۸۴۷ء میں وفات پائی تھی۔ لکھنؤ اور فرخ آباد، شمس آباد وغیرہ کے مابین شاعروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ میر رشک کی تو فرخ آباد میں کچھ قرابت بھی تھی۔ غرض قدسی کی نعت کے وہاں پہنچ جانے کے لیے مواقع موجود تھے۔ یہ یقینی ہے کہ یہ نعت ۱۲۶۳ھ سے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ اب تک کی معلومات کے مطابق اس نعت پر خمسہ کہنے والوں میں سب سے پہلے وفات پانے والے علوی ہی تھے۔

قدسی کی نعت اچھی تھی مؤثر تھی۔ پھر ہم وطنی کا تعلق تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علوی نے اس نعت اور اپنے خمسے کو دہلی میں اپنے شاگرد امام بخش صہبائی کے پاس بھیجا۔ وہاں علوی کے اشارے پر صہبائی ان کے بیٹوں، شاگردوں اور دوستوں نے بھی اس پر مخمس لکھے۔ اس خیال کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ دہلی[10] میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں اس نعت کی تضمینیں پڑھی گئیں۔ لیکن یہ ایسا قیاس ہے جس کی تائید واقعات سے نہیں ہو سکتی۔ جو بھی صورت پیدا ہوئی ہو۔ دہلی کے چھوٹے بڑے بہت سے شاعروں نے اس نعت پر خمسے لکھے۔ خمسے لکھنے والے دہلوی شعرا میں حافظ عبدالرحمان خاں احسان (۱۱۸۳ھ تا ۱۲۶۷ھ) غالباً سب سے سن رسیدہ تھے۔ کم سن شاعروں میں عبدالکریم سوز پسر صہبائی کا نام قابلِ ذکر ہے۔

مرزا قادر بخش صابر نے تحسین تخلص کے ایک شخص کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:[11]

"تحسین تخلص محمد حسین خاں، ساکن شاہ جہان آباد،

جوانِ سعادتمند کا... چند سال سے کتابیں چھاپنے کا
کارخانہ اپنے کاشانۂ دولت میں مقرر کیا اور اس مطبع
کا نام مصطفائی رکھا ہے۔ ہر چند اس شہر میں کثرتِ
مطبع اتنی ہے کہ حوصلہ شمار کا ان کی تعداد سے تنگ ہے
لیکن اس ہوشیارِ طبع کے سلیقے سے نسخہائے مطبوعہ
کی صحت اور درستیٔ خط مشہورِ آفاق ہے... الخ"

قدسی کی مذکورہ نعت کو جو قبولِ عام حاصل ہوا، اس نے تحسین کو بھی متوجہ کیا۔ اور جناب کالی داس گپتا رضا کے قول کے مطابق[11] اس نے پہلی بار "خمسہائے غزلِ قدسی یا چمنِ مدحِ نبیؐ" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کر کے اپنے مطبع سے شائع کر دیا۔ اس مجموعے کا ایک نسخہ جناب رضا کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے اور اس کے آخر میں رضا صاحب کے بیان کے مطابق ۱۲۶۹ھ، ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۷۱ھ کے قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ ان قطعات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مجموعہ مرتب کرنے کا خیال تحسین کو ۱۲۶۹ھ میں ہوا تھا۔ اور دو برس بعد اس مجموعے کی طباعت کا کام مکمل ہوا۔

اس مجموعے کے آخر میں تحسین کا کہا ہوا ایک قطعہ "در ذکرِ شعراء" ہے جس میں بہ شمول مرتب ایک سو سات شاعروں کا ذکر ہوا ہے۔ جناب رضا نے ان شاعروں کی فہرست تو نہیں دی ہے لیکن ان کے اور ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اکثریت اُن کی تھی جو دہلی کے رہنے والے تھے یا دہلی میں آ کر رہنے لگے تھے۔ مثلاً ظفر، غالب، تحسین، نازنین وغیرہ۔

تحسین کے مجموعے نے تحریک کی اور ایک برس بعد قاضی محمد عمر نامی ایک شخص نے قدسی کی نعت کے خمسوں پر مشتمل ایک دوسرا مجموعہ "حدیثِ قدسی" کے نام سے مرتب کیا جو مطبعِ مصطفائی، کان پور میں باہتمام بدیع الزماں چھپ کر شائع ہوا۔ قاضی محمد عمر کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ حدیثِ قدسی کے آخر میں شامل قطعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی شاعر تھے اور قاضی تخلص کرتے تھے۔ سید شمشیر علی مرتب "صحیفۂ قدسی" کا کہنا ہے کہ:

> "میری نظر سے حدیثِ قدسی گزری جو ۱۲۷۳ھ میں
> قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی۔"

لیکن جناب[12] کالی داس گپتا رضا کا دعوا ہے کہ اس کا "۱۲۷۳ھ میں چھپنا قرینِ قیاس نہیں کیونکہ یہ رسالہ خمسہ ہائے غزلِ قدسی از تحسین ہی کی نقل۔" اگر قاضی کا مجموعہ تحسین کے مجموعے کی نقل ہو تو بھی ۱۲۷۳ھ میں حدیثِ قدسی کا چھپ جانا قرینِ قیاس کیوں نہیں ہے۔ یہ بات بالکل ناقابلِ فہم ہے خصوصاً جب کہ ایک دیکھنے والا اس بات کا شاہد بھی ہے۔ دراصل جناب رضا قاضی کو سارق ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ یہ جانتے ہوئے کہ حدیثِ قدسی کے متعدد ایڈیشن نکلے تھے، ایک عینی شاہد کے بیان کو بھی خلافِ قیاس ٹھہرانا ضروری سمجھتے ہیں۔

قاضی کی کتاب "حدیثِ قدسی" کے آخر میں "غزل از فکرِ ناقہ قاضی محمد عمر مولف مجموعۂ ہٰذا در ذکرِ شعراء" بھی شامل ہے۔ اس غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ شعراء کی تعداد ایک سو انیس ہے۔ ڈاکٹر سمیع الدین صاحب نے اس غزل کو اپنی کتاب میں نقل کرنے کے ساتھ[13] شاعروں کے ناموں کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ جناب کالی داس کا دعوا ہے کہ

> "قاضی[14] صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے
> نہیں بڑھایا۔"

لیکن ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کی فراہم کردہ اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ "حدیثِ قدسی" میں خمسوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ قاضی پر سرقہ کا الزام لگانے والے کے لیے لازم تھا کہ وہ دونوں مجموعوں کا تفصیلی مقابلہ بھی کرتا۔

قاضی کا مرتب کردہ مجموعہ "حدیثِ قدسی" بہت مقبول ہوا۔ خود جناب کالی داس کا کہنا ہے کہ ان کے کتب خانہ میں اس کے تین ایڈیشن موجود ہیں۔ امکان ہے کہ اور بھی ہوں۔ حدیثِ قدسی سے متاثر ہو کر حاجی سید شمشیر علی و میر عزیز اللہ صاحب، ساکن گوہانہ، ضلع رُہتک (مقیم دہلی) نے بھی ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں قدسی کی مذکورہ نعت کی تضمینوں کا ایک مجموعہ "صحیفۂ قدسی" کے نام سے مرتب کر کے محمود المطابع، دہلی سے چھپوایا۔ اس مجموعے میں شاعروں کی کُل تعداد ایک سو اکیاون[15] ہے۔ حاجی شمشیر علی نے قاضی محمد عمر کے مجموعے کی اہمیت کے اعتراف میں خود اپنے مجموعے کو "حدیثِ قدسی حصۂ دوم" قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سمیع الدین صاحب نے اس کے بارے لکھا ہے کہ

> "حقیقتاً[16] مجموعہ صحیفۂ قدسی، حدیثِ قدسی کا حصۂ دوم نہیں ہے"

لیکن محض اس بنا پر کہ یہ نسخہ موخر تھا اور حدیثِ قدسی کے
بعد تیار کیا گیا تھا، مرتب نے اس کو یہ نام دے دیا،
ورنہ حقیقتاً دونوں الگ اور جداگانہ کوششیں ہیں۔"

لیکن جناب کالی داس صحیفۂ قدسی کی ترتیب کو بھی "برائی پوری" بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو مطلوب ہے۔

جناب کالی داس نے مدراس کے ایک اخبار "جریدۂ روزگار" کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"غزلِ قدسی پر جتنی تضمینیں اس اخبار میں شائع ہوئی ہیں شاید اور کہیں نہیں ہوئیں۔ چار سال ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء کے پرچوں میں دو سو سے زائد خمسے تو میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ خمسوں کی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب ہوگی۔"

سمجھا جانا چاہیے کہ جتنے خمسے موصوف کے کتب خانے میں موجود ہیں، ان سب کو تو انھوں نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ ان سینکڑوں خمسوں کے عنوانوں میں موصوف کو براہ راست تو کیا، بالواسطہ بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں مل سکا جو اس نعت کے مصنف کو قدسی مشہدی ثابت کرتا ہو۔ اتنی بات بھی اس حقیقت کے اعتراف کے لیے کافی تھی کہ قدسی مشہدی سے اس نعت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

قدسی کی نعت کی جتنی تضمینیں آج تک دستیاب ہو سکی ہیں، ان میں (الف) ایک بھی ایسی نہیں ہے جو تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر سے پہلے کی ہو۔

(ب) کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں ہے جس سے یہ خیال ہو کہ قدسی کی شاعری کا زمانہ تیرھویں صدی ہجری کے وسط سے پہلے کا ہے۔

(ج) کسی شخص نے بھی قدسی کا تعلق شمالی ہند کے سوا کسی جگہ سے نہیں بتایا ہے۔ حاجی سید شمشیر علی نے البتہ قدسی کو "مولانا" اور "دہلوی" کہا ہے۔ ان کے سامنے حدیثِ قدسی تھی، اور اس زمانے تک قدسی کی نعت دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ حاجی صاحب کا حال یہ تھا کہ قدسی ہی نہیں "حدیثِ قدسی" کے مرتب سے بھی ان کو عقیدت تھی اور اس عقیدت کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں بخوبی کیا ہے۔ صحیفۂ قدسی کی ترتیب سے بہت پہلے بہ گمان غالب قدسی کا انتقال ہو چکا تھا۔ حاجی شمشیر علی دہلی کے رہنے والے نہیں تھے۔ دہلی کی مرکزیت اور قدسی سے عقیدت کے سبب انھوں نے اس شاعر کو دہلی والا سمجھ لیا ہوگا اور انھوں نے اس کو

"حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی"

لکھ دیا۔ اس عقیدت مندانہ اندراج سے کسی غلطی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدسی وہی ہے جس کا مفصل تعارف محقق نے اپنے تذکرے میں کرایا ہے۔ اس قدسی کی نعت کے بارے میں پروفیسر اسلم فرخی نے راقم کو لکھا ہے کہ

"اس نعت کے بعض اشعار خالص ہندی طرز کی غمازی کرتے ہیں۔ ایرانی شاعر اس قسم کا انداز اختیار نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے ؎

ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور
زیں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

دوسرے مصرعے میں 'زیں سبب' کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ یہ ہندی سبک ہے جس کا ایران سے کوئی تعلق اور علاقہ نہیں۔"

پروفیسر سمیع الدین کا بھی یہی خیال ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"نعتِ مذکور کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس کا انداز گزشتہ صدی کے کسی خالص ہندستانی شاعر کا ہے اور قدسی مشہدی کے اسٹائل اور طرزِ شاعری سے بہت مختلف ہے۔"

اس نعت کی زبان اور اس کے فقروں کی ساخت پر غور کریں تو ایرانی فارسی کے روزمرہ سے مختلف صورت بیشتر مصرعوں میں ملے گی۔ اس نعت میں کئی مضامین شاعر نے اپنے حسب حال نظم کیے ہیں اور ان تک کما حقہ رسائی کے لیے ضروری ہے کہ سید محمد اکبر عرف محمد جان قدسی الہ آبادی کے تفصیلی حالات اور معاملات کی جستجو کی جائے۔

(باقی صـ ۴۸ پر)

قمر ادیب
ادریس گنج۔ بردوئی

۳ نظمیں

منظر پس منظر

دن کا سونا
رات کی چاندی
باہم جب گھل مل جاتے ہیں
لمحوں کی شوخی پر
اکثر ——
بوڑھی صدیاں
ہنس ہنس کر
اپنا ماضی دہراتی ہیں

ربطِ جاوداں

مہکتی کتابوں کے اوراق دیکھو
جو دھڑکن غزل بن گئی تھی
وہ لفظوں کے پھولوں میں
زندہ ہے
اور کہہ رہی ہے
"گئے موسموں میں تو پامال تھے ہم
مگر اب
فضاؤں میں تحلیل ہو کر
تمھارے لبوں سے
یہ ہم بولتے ہیں"

دو زاویے

تم دھوپ میں
اوس کی بوندوں کے
—— اطراف
نہ جانے کیوں مجھ کو
رنگوں کی نمو دکھلاتی ہو
اک روز
مرے ہمراہ چلو
ویران درختوں کے نیچے
پھولوں کی دلائی اوڑھے ہوئے
موسم کو سسکتے دکھلاؤں

صاحب علی خاں
۲۳ - سی - آر - ایم - ہال
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اردو شاعری میں تلمذ کی روایت

اردو شاعری کی کلاسیکی شکل فارسی شاعری کا چربہ ہے لیکن فارسی میں استادی شاگردی کی روایت نہیں ملتی۔ رودکی، فردوسی، انوری، نظامی، عطار، سنائی، خیام، رومی، سعدی اور جامی جیسے مشہور و معروف اور عہد ساز شعراء کے استادوں کے نام کہیں نہیں ملتے۔ مکتبوں، مدرسوں میں ہی شعریات اور عروض کی تعلیم ان بزرگوں کے لئے کافی تھی۔ لیکن اردو میں شاگردی کی روایت شمالی ہند میں اس کے ابتدائی دور میں ہی قائم ہوگئی۔ فارسی کے علی الرغم اردو شاعری کی روایت میں اس بنیادی اضافے پر اظہار خیال کرتے ہوئے صاحب "شعر الہند" رقمطراز ہیں۔

"شعرائے عرب صرف خدا کے شاگرد ہوتے تھے۔ دنیا میں ان کو کسی استاد کی ضرورت نہ تھی۔ شعرائے ایران میں جو مشہور اساتذہ گزرے ہیں انھوں نے بھی غالباً اپنا کوئی استاد نہیں بنایا۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں بھی غالباً ہر شخص خود اپنا استاد رہتا تھا۔ چنانچہ شعرائے دکن میں میر حسن نے صرف فخری کو ولی کا شاگرد لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو دکنی شعراء کے اساتذہ کا حال معلوم نہیں۔ لیکن قدماء کے پہلے دور سے اردو شاعری نے بالکل ایک کسبی فن کی صورت اختیار کرلی اور شاگردی استادی کا باضابطہ سلسلہ قائم ہوگیا۔ اس لئے شعرائے اردو کے کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ جسکو اردو شاعری کے تدریجی سلسلے سے الگ نہیں کیا جاسکتا، تلامذہ کی ترتیب و پرداخت ہے،،[1]

استادی شاگردی کے سلسلہ میں مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی شاعری میں چاسر، فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کسی کے شاگرد نہیں تھے اور وہ ثبوت میں مشہور عربی قول "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی بات کی مزید تصدیق کے لئے دانائے فرنگ کا حوالہ دیتے ہیں کہ "شاعر اپنی شاعری ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے،،[2]

اُردو شاعری میں استادی شاگردی کی روایت کا باضابطہ آغاز قدماء کے پہلے دور سے ہوتا ہے۔ خان آرزو اور جان جاناں مظہر کے ذریعے اردو شاعری میں استادی شاگردی کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اس دور کے اکثر بڑے بڑے شاعر یا تو براہ راست انھیں دونوں اساتذہ کے شاگرد تھے یا پھر انھوں نے بالواسطہ ان کی تربیت کے اثرات قبول کئے تھے۔ محمد شاہی دور کے سب سے بڑے شاعر شاہ مبارک آبرو، خان آرزو کے شاگرد تھے۔ شرف الدین مضمون کو میر تقی میر اور میر حسن دہلوی نے خان آرزو کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔

مصطفےٰ خاں یکرنگ، ٹیک چند بہار اور آنند نرائن مخلص انھیں کے شاگرد و تربیت یافتہ تھے۔ نئی نسل کے شعراء میں میر، سودا، درد نے خان آرزو کی ہی صحبت سے فیض اٹھایا تھا۔ میر اپنا ابتدائی کلام اپنے ماموں خان آرزو کو دکھاتے تھے[3]۔ اس کے علاوہ دوسرے شعراء اور اہل علم و ادب اپنا کلام اور مسودات انھیں اصلاح کے لئے بھیجتے تھے۔ خوشگو نے اپنا تذکرہ "سفینۂ خوشگو" اصلاح کے لئے خان آرزو کی خدمت میں پیش کیا تھا[4] حکیم لاہوری نے لکھا ہے کہ میں نے اپنا دیوان ان کی خدمت میں پیش کیا کہ غور و فکر کی نظر سے دیکھ کر اس کے حسن و قبح سے آگاہی بخشیں[5]۔ خواجہ محمد یحیٰی خاں خرد نے بھی اپنی غزل آرزو کے سامنے اصلاح کے لئے پیش کی تھی[6] مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد انعام اللہ خاں یقین دہلوی، شیخ علی حزیں اور دردمند تھے۔ اس کے علاوہ خواجہ احسن دین خاں بیان بھی مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں اپنے شاگردوں کی اصلاح و تربیت ہی کے لئے اردو میں فکر سخن کیا کرتے تھے[7] عبدالوہاب یکرو، محمد حسن فدوی، تاجی، سید غلام غلام، شہاب الدین ثاقب اور محمد عارف عارف

صلاح الدین اور میر مکھن پاکباز، یکرنگ کے شاگرد تھے۔ ان شاگردوں کے علاوہ کچھ ایسے شعرا بھی تھے جنھوں نے براہ راست زانوئے تلمذ تو تہ نہ کیا تھا لیکن آرزو، مظہر اور آبرو کے رنگِ سخن سے فیض اٹھایا تھا۔ شاہ حاتم نے مرزا محمد رفیع سودا کو "دیوان زادہ" میں اپنے شاگردوں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ وہ اپنی اس خوش قسمتی پر نازاں بھی تھے کہ انھیں ایسا استادِ زمانہ شاگرد ملا۔ یہ روایت مشہور ہے کہ شاہ حاتم جب سودا کی غزل کو اصلاح دیتے تھے تو اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

از ادب صائب خوشم ورنہ در ہر وادیے
رتبۂ شاگردیے من نیست استاد مرا

میر قاسم نے لکھا ہے کہ حاتم نے "دیوان زادہ" کے دیباچے میں اپنے ۴۵ شاگردوں کا نام درج کیا ہے۔ جن میں سودا، تاباں، مرزا عظیم بیگ عظیم مرزا محمد یار بیگ، مرزا سلیمان شکوہ، بقا اللہ خاں بقا، شیخ محمد امان نثار، لالہ مکند سنگھ فارغ، بیدار اور رنگین کے نام مشہور ہیں۔

صوفیوں کے سلسلوں کی طرح اردو شاعری میں بھی استادی شاگردی کے باقاعدہ سلسلے قائم ہوئے اور انھیں صوفی سلسلوں کی طرح شاعری میں بھی جانشین استادی روایت نے جنم لیا۔ بعض اوقات جانشینی کے لیے بیک وقت کئی دعویدار پیدا ہو گئے۔ سائل دہلوی کے شاگردوں نے دہلی میں خوب خوب ادھم مچایا۔ کچھ شاگردوں نے نوح ناروی کو جانشین مانا تو اہل بہار نے مبارک عظیم آبادی کو داغ کا جانشین قرار دیا۔ اسی طرح بنگال میں بھی وحشت کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کا قضیہ بے خود اور شاکر کلکتوی کے ماننے والوں کے درمیان کچھ عرصہ تک کشیدگی کا باعث رہا۔

اردو شاعری کے چھوٹے بڑے کئی مراکز تھے جو اپنے طور سے اردو شعر و ادب کی خدمت کر رہے تھے۔ دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، رامپور، مرشدآباد اور کلکتہ وغیرہ میں شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور اہلِ کمال شعرا اپنے شاگردوں کو لے کر شعری نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ مذکورہ بالا مراکز میں دہلی کو اولیت حاصل تھی۔ اردو شاعری کی باضابطہ ابتدا یہیں سے ہوئی اور یہیں پر اساتذۂ فن نے اسے پروان چڑھایا۔ مگر جب دہلی پر تباہی آئی تو تمام شعرا نے یہاں سے ہجرت کر کے دوسرے شہروں میں پناہ لی۔ یہ اساتذۂ فن جہاں کہیں بھی گئے استادی شاگردی کی روایت ساتھ لے کر گئے۔ چنانچہ ان مراکز میں اگر استادی شاگردی کی کڑیاں تلاش کی جائیں تو ناسخ لکھنوی کے سلسلے کے سوا بقیہ سلسلوں کی آخری کڑی کسی نہ کسی دہلوی استاد کے ہاتھ میں نظر آئے گی۔ مثلاً مرثیہ کو جو فروغ لکھنؤ میں ہوا اور فنی تکمیل کی جس بلندی پر یہاں پہونچا اس کی کوئی مثال اردو شاعری کے دوسرے مراکز بلکہ خود دہلی میں نہیں ملتی۔ لکھنؤ میں مرثیہ کے فروغ کا یہ سلسلہ بھی براہ راست دہلوی شعرا سے مل جاتا ہے۔ چنانچہ میر خلیق کے والد میر حسن نے سودا سے اصلاح لی تھی۔ میر خلیق نے مرثیہ کے جدید طرز کی بنیاد ڈالی اور ان کے بیٹے میر انیس نے اسے فنی کمال کی انتہا تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد ان کے بیٹے میر نفیس نے بھی اس روایت کو قائم رکھا۔ اس طرح یہ سلسلہ بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوتے میر عشق، عاشق اور تعشق تک چلا اور پھر اس سلسلے کے بعد مرثیے میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ حتیٰ کہ آرزو لکھنوی جیسا ماہر زبان و فن مرثیے کے میدان میں کوئی نمایاں کارنامہ نہ انجام دے سکا میر ضاحک، ضمیر، خلیق، دبیر و انیس اور انکے جانشینوں نے مرثیہ کو ایسی ترقی دی کہ شاعری میں اسے مستقل اور اہم فن کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ درحقیقت لکھنؤ میں مرثیہ کی باقاعدہ فنی ترقی خلیق سے شروع ہوئی جو سلسلۂ مصحفی کا فیضان ہے خلیق اور ضمیر مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر تھے۔

انشا، مصحفی، آتش و ناسخ، غالب، مومن اور ذوق دہلوی کے سلسلے دہلی سے لکھنؤ، عظیم آباد، رام پور اور کلکتہ وغیرہ شعری مراکز تک کچھ اس طرح پھیلے کہ کڑیاں الجھ کر رہ گئیں۔ اگر صرف مصحفی ہی کے سلسلے پر غور کریں تو یہ سلسلہ مصحفی کے شاگرد اسیر، اسیر کے شاگرد امیر مینائی اور امیر مینائی کے شاگرد وسیم خیرآبادی اور وسیم خیرآبادی سے ہوتا ہوا فراق گورکھپوری تک آتا ہے۔ دراصل جتنے استادِ فن سلسلۂ مصحفی میں نکلے اتنے کسی اور کے سلسلے کو نصیب نہیں ہوئے۔

استادی بہت سے شعرا کے لیے ذریعۂ معاش بھی رہی۔ مصحفی مالی پریشانیوں کے سبب اپنے اشعار فروخت کر دیتے تھے۔ رام بابو سکسینہ مصحفی کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "مشاعروں کے لیے بکثرت غزلیں کہتے۔ معمولی غزلیں خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب اشعار اپنے لیے رکھ لیتے تھے"۔[9]

اس خیال کی تائید مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں بھی کی ہے۔ شاکر کلکتوی کو بھی انکے شاگردوں کی جانب سے ماہانہ ملتا تھا۔ بہزاد لکھنوی کے استاد ذاکر لکھنوی فی غزل ایک روپیہ بطور نذرانہ لیتے تھے۔

استادی شاگردی کی روایت میں ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ اکثر شعراء اساتذۂ فن کے سامنے اس وقت تک زانوے شاگردی تہ نہیں کرتے تھے جب تک کہ اساتذہ کی شاعرانہ و فنکارانہ استعداد کو پرکھ نہیں لیتے تھے۔ اس سلسلہ میں نوح ناروی کا دلچسپ واقعہ بیان کرنا غیر ضروری نہ ہوگا۔

نوح ناروی نے ایک بار ایک غزل اصلاح کے لئے امیر مینائی کے پاس رام پور بھیجی۔ انھوں نے اصلاح دیکر غزل نوح ناروی کو واپس بھیج دی نوح نے امیر مینائی کی اصلاح کردہ غزل مزید ایک غزل کے ساتھ جلال لکھنوی کے پاس بھیجدی۔ جلال نے دوسری غزل پر اصلاح دے ہی دی اس کے ساتھ امیر مینائی کی اصلاح کردہ غزل میں بھی ترمیم کردی اور تحریر کیا کہ اصلاح کا معاوضہ فی غزل ایک روپیہ لوں گا۔ پھر جس نئی غزل پر جلال نے اصلاح دی تھی اسے امیر مینائی کے پاس بھیج دیا۔ امیر مینائی نے اصلاح شدہ غزل میں بہت کچھ تبدیلیاں کردیں ان اصلاحوں کو دیکھ کر نوح ناروی دونوں طرف سے ہی بددل ہو گئے چنانچہ ایک نئی غزل بغرض اصلاح داغ دہلوی کے پاس حیدرآباد بھیج دی۔ وہاں سے غزل اصلاح ہوکر واپس آگئی۔ اب نوح ناروی نے اس اصلاح شدہ غزل کی دو نقلیں کیں ایک امیر مینائی اور دوسری جلال لکھنوی کے پاس اصلاح کے لئے بھیج دی اس پر دونوں اساتذہ نے کوئی نقطہ نہیں کہا اس طرح داغ دہلوی کی اصلاحیں مکمل طور سے کسوٹی پر پوری اتریں اور نوح ناروی داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے اور انھیں سے اصلاح لینے لگے۔

اردو شاعری میں استادی شاگردی کی روایت مفید بھی ہے اور نقصاندہ بھی۔ مفید اس لئے کہ زبان وبیان، محاورہ وروزمرہ اور فن شعر کی باریکیاں اساتذۂ فن سے مشورہ کے بغیر گرفت میں نہیں آتیں۔ اور بے استاد شاعر کی پکڑ کہیں نہ کہیں ضرور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اساتذۂ فن نے اپنے شاگردوں کے کلام کی غلطیوں پر نشاندہی کیں اور اصلاحیں دیں۔ مثلاً غالب نے منشی حبیب الدین سوزاں سہارنپوری کے ایک شعر پر اصلاح دی اور غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اصلاح کا جواز بھی فراہم کیا۔ شعر ہے

جو دل میں ہے وہ کہہ نہیں سکتا کسی طرح

چپ ہوں اگرچہ لذت حلوہ چشیدہ ہوں

غالب نے اصلاح دی

جو دل میں ہے کہا نہیں جاتا زبان سے

میں مثل گنگ لذت حلوہ چشیدہ ہوں

اصلاح دینے کے بعد غالب نے فرمایا کہ دونوں مصرعوں میں تصرف اس حسن سے کیا گیا ہے کہ شعر میں روانی و سلاست کے علاوہ لطف زبان پیدا ہوگیا ہے۔ "کہا نہیں جاتا زبان سے" اس ٹکڑے کی کیا بات ہے اور دوسرے مصرعے میں "مثل گنگ" کی کیا تعریف ہو۔ بے ساختہ یہی مصرعہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

ایک شعر داغ دہلوی کے شاگرد حضرت سجادہ کا بھی ملاحظہ ہو۔ اصل شعر یہ تھا ؂

اس کو خنداں دیکھ خنداں جام خنداں رہ گیا

شیشۂ گریاں بھی مجھ گریاں پہ گریاں رہ گیا

استاد داغ کی اصلاح کے بعد شعر کی صورت یوں ہوگئی

اس کو خنداں دیکھ کر خنداں رہا جام شراب

شیشۂ گریاں میرے گریہ پہ حیراں رہ گیا

اصلاح سے قبل شعر نہایت بے کیف اور زبان شعر بے حد ناہموار تھی پہلے مصرعہ میں "خنداں" تین مرتبہ ایک دوسرے سے متصل آئے تھے داغ نے ان میں ایک "خنداں" کم کیا مزید یہ کہ "جام شراب" کی ترکیب کے ذریعہ مصرعہ کی بندش چست کی۔ اس بندش میں "رہ گیا" کی جگہ داغ کے "رہا" نے معاونت کی۔ دوسرے مصرعہ میں ہر تین مرتبہ "گریاں" آیا تھا۔ جس میں داغ نے ایک مرتبہ کے گریاں کی جگہ "حیراں" رکھا ہے یہ ایک نفسیاتی صورت حال تھی مزید یہ کہ بقیہ دو گریاں میں بھی ایک کی انفی آواز (یعنی نون غنہ) کم کیا جس سے شعر میں بے جا تکرار کا عیب دور ہو گیا ہے۔ چنانچہ اصلاح کے بعد اسی مفہوم پر شعر کی زبان وبیان میں صفائی اور روانی آگئی ہے۔

اسی طرح لکھنؤ شاعری کے آخری نمائندہ امیر مینائی نے اپنے ایک شاگرد کے کلام پر غلطیوں کی نشاندہی کرکے اصلاحیں دیں۔ شاگرد زاہد کا

ــہ

آہ ہم سے دوستوں نے دشمنی کی اس قدر
دشمنوں کی دشمنی کا سب گلہ جاتا رہا

اصلاح امیر مینائی۔

دوستوں نے دوست بن کر دشمنی کی اسقدر
دشمنوں کی دشمنی کا سب گلہ جاتا رہا

بعد اصلاح فرماتے ہیں کہ بیان میں سلاست اور بندش میں فراچستی ہے اور الفاظ کا تناسب بھی ٹھیک ہوگیا ہے۔

زاہد کا یہ شعر۔

گیا جو وقت اسے سمجھو گیا، پھر کر نہیں آتا
نہ پاؤگے نہ پاؤگے کہیں دیکھو کہیں ڈھونڈو

استاد امیر مینائی نے اصلاح دی

گیا جو وقت وہ پھر کر نہیں آتا نہیں آتا
نہ پاؤگے نہ پاؤگے کہیں دیکھو کہیں ڈھونڈو

امیر مینائی فرماتے ہیں کہ مصرعہ ثانی میں جو "نہ پاؤگے" کی تکرار مقید تاکید
ں کے مقابلہ مصرعۂ اولیٰ میں "نہیں آتا" کی تکرار زیادہ مناسب و موزوں [۱۰]

استادی شاگردی کے افادی پہلو پہ مالک رام نے ان الفاظ میں روشنی ہے۔

"اگر استاد شاگرد کے کلام پر فنی پہلو سے اصلاح دے اسے عروض کے نکات بتائے، زباں کی نزاکتوں سے آگاہ کرے فصاحت کے مدارج کی تعلیم دے۔ دوسرے لفظوں میں اگر وہ اپنے خیالات ورجحانات شاگرد پر نہ ٹھونسے بلکہ صرف اسکی ذاتی قابلیتوں کی تربیت کرے یا اسکی مخفی شاعرانہ قوتوں کو ابھارنے میں اس کی مدد کرے تو وہ شاگرد استاد سے استفادہ کرنے کے بعد ماہر فن ہو جائے گا۔ اور اگر واقعی قدرت نے اس میں صحیح شاعرانہ ذوق ودیعت کیا ہے تو اس کی شاعری غیر معمولی طور پر کامل عیار ہو جائے گی۔" [۱۰]

یہ روایت نقصان دہ اس لئے ہے کہ ہر شاگرد اجتہادی فطرت کا مالک نہیں ہوتا۔ وہ استاد کی لکیروں کا فقیر بن کر اپنی شخصیت کھو بیٹھتا ہے۔ استاد چاہتا ہے کہ شاگرد اس کا ہم خیال ہو، ورنہ بجائے اصلاح مصرعوں کے مصرعے بدل ڈالتا ہے، چنانچہ بہت سے شاگرد چاہتے ہوئے بھی استاد کے رنگ سخن کو ترک نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ اس دور کے مزاج کے خلاف تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شاگردوں کی اپنی شخصیتیں استاد کی شخصیت میں ضم ہوگئیں اور ان کی ذاتی استعداد کی جلا نہ ہوسکی۔ استادی شاگردی کے منفی پہلو کو رام بابو سکسینہ نے ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے۔

"شاگرد عموماً اپنے استاد کا تتبع کرتے ہیں۔ استاد سے انحراف کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس اتباع کی وجہ سے قدرتی ذہانت اور طباعی کا خون ناحق ہوتا ہے۔ اور شاعری ہی رسمی رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی البتہ کوئی خاص آدمی اس دائرہ اتباع سے علیحدہ ہوکر شہرت حاصل کر لیتا ہے" [۱۱]

استادی شاگردی کے منفی پہلو کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے کیا صحیح لکھا ہے کہ

"استادی شاگردی کی روایت صنعتی معیار سے آگے بڑھ کر شاعر کی رائے کو مقید کرتی تھی" [۱۲]

"شعر الہند" کے مصنف نے شاعری کے کسبی (اکتسابی) اور وہبی فن ہونے کی بحث کو بھی اس روایت سے منسلک کیا ہے۔ شاعری کی صلاحیت وہبی ہے۔ یہ اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس میں شاعری کا مادہ ہوتا ہے وہی شاعر بنتا ہے۔ شاعری کی سب سے پہلی علامت موزونیٔ طبع ہے جو انسان یہ ملکہ ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ خود بخود شاعری کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اور شعر کہتے کہتے معراج کمال حاصل کر لیتا ہے اس کی وضاحت مولانا الطاف حسین حالی ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"جن لوگوں کی فطرت میں اس کا ملکہ ہوتا ہے ان کی طبیعت ابتدا ہی سے راہ دینے لگتی ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے اسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے، تو طبیعت کا اقتضا ان کو جبراً اسکی طرف کھینچ کر لاتا ہے۔ وہ جب اس کی طرف

توجہ کرتے ہیں تو ان کو کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوتی ہے۔ اور اس لئے ان کا دل روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ان کو اپنی قوت ممیزہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام کی برائی بھلائی کا بغیر اس کے کہ کسی سے مشورہ یا اصلاح لیں، آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ہر حالت اور ہر واقعے سے، خواہ وہ حالت اور واقعہ خود ان پر گزرے یا زید و عمر پر یا جیونٹی پر، متاثر ہونے کی قابلیت ہوتی ہے اور اس قابلیت سے اگر وہ چاہیں تو بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں انکو خارج سے اپنی شاعری کا مسالہ فراہم کرنے کی صرف اسی قدر ضرورت ہوتی ہے جس قدر کہ بیے کو اپنے گھونسلے کے لئے پھونس اور تنکوں کے باہر سے لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ وہ سلیقہ جو الفاظ و خیالات کی ترتیب و انتخاب کے لئے درکار ہے۔ وہ اپنی ذات میں اسی طرح پاتے ہیں جس طرح کہ بیا گھونسلہ بنانے کا ہنر اور سلیقہ اپنی ذات میں پاتا ہے۔"[۱۲]

حالی نے مندرجۂ بالا اقتباس میں ملکۂ شاعری کے وہبی ہونے کی توثیق کی ہے۔ ایک حقیقی شاعر کے لئے کسی استاد سے وابستہ ہونا ضروری نہیں کیوں کہ یہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ وہ صلاحیت ہے جسے روایتی "اصلاح" کی چنداں ضرورت نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاحِ سخن کے ذریعہ شاعری کو جلا ملتی ہے استاد اصلاحِ فن سے زبان و بیان اور شعر کے تمام عروضی و فنی نکات درست کر سکتا ہے مگر شاگرد میں شاعری کا مادہ نہیں پیدا کر سکتا۔ چنانچہ اس سے نفس شعر میں ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ تو شاگرد ذاتی استعداد ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی رقمطراز ہیں :-

" ہمارے ملک میں جو شاعری کے لئے ایک استاد قرار دینے کا دستور ہے اصلاح کے لئے ہمیشہ اس کو اپنا کلام دکھلانے کا قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اس سے شاگردی کے حق میں کوئی معتدبہ فائدہ مرتب ہونے کی امید نہیں ہے استاد شاگرد کے کلام میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے کہ کوئی گرامر کی غلطی بنا دے یا کسی عروضی یا لغوی کی اصلاح کر دیں، لیکن اس سے نفسِ شعر میں کچھ ترقی نہیں ہو سکتی۔ رہی یہ بات کہ استاد شاگرد کے پست کلام کو بلند کر دے یا شاگرد کو اپنا ہمسر بنا دے، سو یہ امر خود استاد کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے اگر استادوں میں شاگردوں کو اپنا ہمسر بنانے کی طاقت ہوتی تو ملا نظامی صاحبزادے کو یہ نصیحت نہ کرتے

در شعر مپیچ و در فنِ او ۔۔۔ چوں اکذبِ اوست احسنِ او

اور اگر کمالِ شاعری کے لئے کسی کا تلمذ اختیار کرنا ضروری ہوتا تو سنائی، نظامی، سعدی، خسرو اور حافظ ضرور ایسے استاد نکلتے جنکی شہرت شاگردوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر یا ان سے کم تر ضرور ہوتی۔[۱۵]

اس کے باوجود شاعری میں " اصلاح" کی روایت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جہاں شاگردوں میں تنقیدی بصیرت کو تقویت اور جلا ملتی تھی وہیں انھیں مشق کی بھی عادت پڑتی تھی تاکہ ان کے کلام میں فن شعر کے تسامح کا امکان باقی نہ رہے۔ مشق و محنت ہی سے اعلیٰ درجے کا کلام وجود میں آتا ہے۔ بقول اقبال؀

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

بیشتر شعرا نے شعر کو "صناعی" کے مترادف قرار دیا ہے۔ آتش کا مشہور شعر ہے؀

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا!

حالی لکھتے ہیں کہ جس طرح زچہ اپنے بدشکل بچوں کو چاٹ چاٹ کر چکنا اور چکدار بناتی ہے اسی طرح شاعر اپنے شعر کو سنوارتا ہے۔

درحقیقت اکتسابی فن سے، زبان و بیان کی خامیوں سے ہماری شاعری عہد بہ عہد پاک ہوتی رہی۔ اکتسابی شاعری کا حال یہ ہے کہ وہ اصول سے ناپ کر اور قواعد سے تول کر شعر کہنے کی عادت ڈلواتی ہے۔ شاعری کے

اکتسابی اور وہبی فن کی مختصر سی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہبی شاعری عروض وقواعد کے جامد اصولوں سے مبرّا ہوتی ہے۔ جبکہ اکتسابی شاعری عروض وقواعد اور قوافی وردیف کے جامد اصولوں کی جکڑ بندیوں میں پھنسی رہتی ہے۔ اکتسابی اور وہبی شاعری کی حدود کے سلسلہ میں مالک رام رقمطراز ہیں :

"جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے یہ نبوت کی طرح
ایک وہبی چیز ہے۔ اور اسے اکتساب سے حاصل نہیں کیا
جاسکتا۔ رہا اس کا خارجی لباس یعنی الفاظ تو ظاہر ہے
کہ چیز علم وفن سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسرے علوم و
فنون کی طرح اسے بھی باقاعدہ حاصل کرنا پڑے گا"[۱۵]

دورِ حاضر میں استادی شاگردی کی روایت کو وہ اہمیت نہیں حاصل ہے جو ماضی قریب میں تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اب اردو شاعری زبان وبیان اور قافیہ پیمائی سے آگے نکل کر آزاد ہو چکی ہے۔ جو شعراء زبان وبیان اور قافیہ وبحر کے جامد اصولوں پر شاعری کی بنیاد رکھتے تھے اب وہ چند لوگ رہ گئے ہیں مگر استادی شاگردی کی روایت سے اردو شعر وادب کو جو فائدہ پہونچا اس سے کسی کو انکار نہیں ••

حواشی

۱ہ عبدالسلام ندوی۔ شعرالہند حصہ اول، ص ۱۰۷، طبع چہارم، اعظم گڈھ ۱۹۴۹ء

۲ہ آب حیات۔ محمد حسین آزاد، ص ۸۳، طبع سات، لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۳ہ نکات الشعراء۔ میر تقی میر مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۱۵، طبع دوم ۱۹۳۵ء

۴ہ سفینۂ خوشگو۔ مرتبہ عطا کاکوری، ص ۳۱۸ پٹنہ ۱۹۵۹ء

۵ہ مردم دیدہ۔ عبدالحکیم لاہوری، مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۵۵ء تا نومبر ۱۹۶۰ء

۶ہ ایضاً ص ۵۷، ۵۸

۷ہ تذکرہ ہندی۔ مصحفی، ص ۲۰۳، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۳ء

۸ہ مجموعہ نغز جلد اول۔ مرتبہ محمود شیرانی ص ۱۸۰ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۳۳ء

۹ہ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ، ص ۲۴۰، طبع اول، دہلی، ۱۹۶۶ء

۱۰ہ تلامذۂ غالب۔ مرتبہ مالک رام دیباچہ ص ۶، طبع اول، دہلی

۱۱ہ تاریخ ادب اردو، ص ۷۷

۱۲ہ نئے اور پرانے چراغ۔ پروفیسر آل احمد سرور، ص ۱۹۶، طبع سوم لکھنؤ ۱۹۵۵ء

۱۳ہ مقدمہ شعر وشاعری۔ خواجہ الطاف حسین حالی ص ۹۸، طبع، دہلی ۱۹۸۱ء

۱۴ہ ایضاً " ص ۹۹

۱۵ہ تلامذۂ غالب۔ ص ۵

اترپردیش کا ترقیاتی منظرنامہ

ص ۴۵ کا بقیہ

کرنے نیز ترقیاتی کام انجام دینے اور دیگر اسکیمیں چلانے کی ذمے داری بھی سونپی گئی ہے۔ یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ جن گاؤں سبھاؤں میں خواتین کا ۳۰ فیصد رزرویشن کا کوٹہ مکمل نہیں ہوسکا ہے، وہاں ان کی رکنیت کے لیئے مزید جگہیں نکالی جائیں تاکہ یہ کمی پوری کی جاسکے۔

پنچایت راج اداروں کے انتخابات کے علاوہ ایک طویل عرصے کے بعد شہری بلدیاتی اداروں کے انتخابات کرائے گئے اور ان اداروں کی ذمے داری عوامی نمائندوں کو سونپ دی گئی ہے۔ انمیں ریاست کی تمام نگر مہاپالیکائیں، نگر پالیکائیں، ٹاؤن ایریا اور نوٹی فائڈ ایریا کمیٹیاں شامل ہیں۔ ان کے انتخابات پر امن طور پر مکمل ہوگئے۔

اسی مدت میں طویل عرصے سے معرض التوا کا شتکار امداد باہمی اداروں کے انتخابات بھی کرائے گئے اور ان کا بندوبست بھی عوامی نمائندوں کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ حکومت کی جمہوری قدروں سے وابستگی کا مظہر ہے۔

ترقیاتی کاموں میں عوام کی حصے داری کو یقینی بنانے کی غرض سے لامرکزی منصوبہ بندی کی حوصلہ افزائی کی گئی ضلعی منصوبوں کے مصارف کو بڑھا کر ۹۳ ر ۸۴۸ ، ۶ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔ ••

حق بنارسی
۱۲۲/۴۵۳ بابو پوروہ۔ کان پور

غزل

ادا ادا سے نمایاں گریز بے جا تھا
اگر مجھے وہ نہ پہچانتا تو اچھا تھا

یہ فیصلہ مرے حالات کا تقاضا تھا
وگرنہ ترکِ تعلق کسے گوارا تھا

یہ کون سوچتا زور آندھیوں میں کتنا تھا
چراغِ زیست کی کم ہمتی کا چرچا تھا

نجانے کیوں مری آنکھوں میں اشک بھر آئے
بڑے خلوص سے اس نے مزاج پوچھا تھا

رُخ اپنا موڑ کے سیلابِ غم کدھر جاتا
اسے تو صرف مرا گھر تباہ کرنا تھا

تمام شہر میں تقریبِ سنگباری تھی
تمام شہر میں شیشوں کا دل دھڑکتا تھا

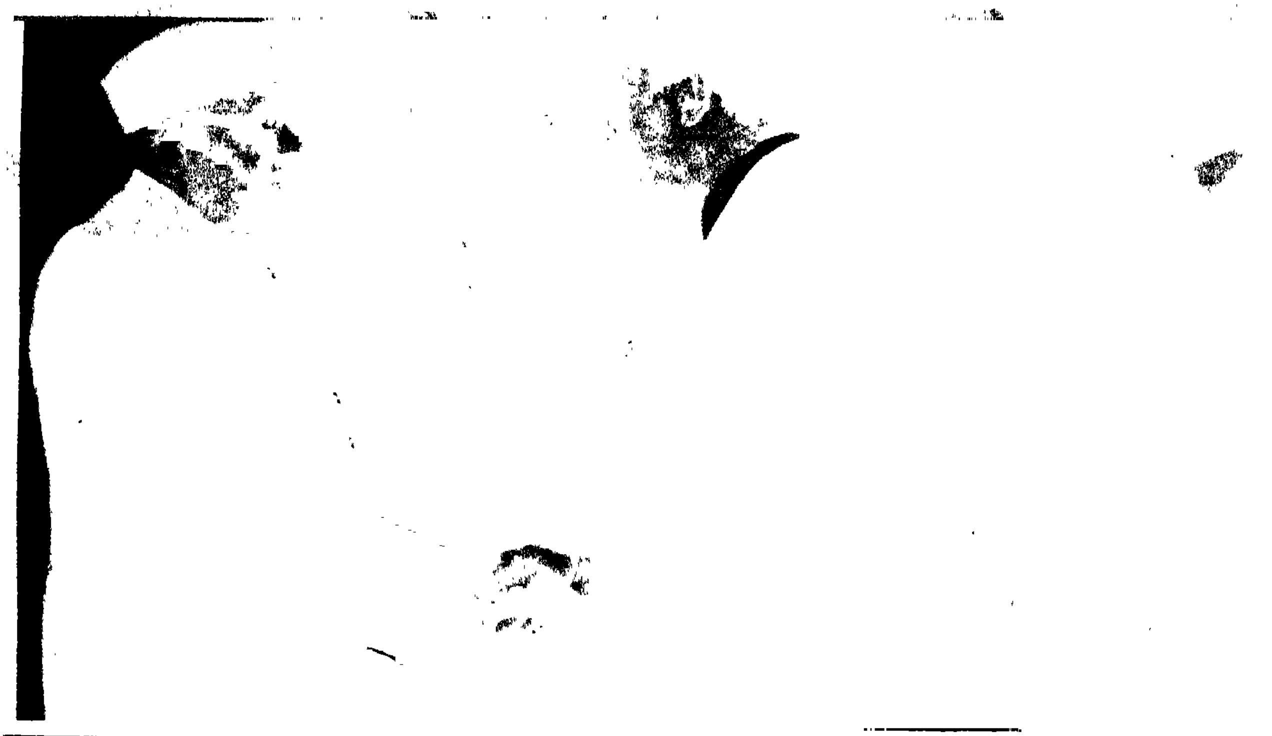
مہ و نجوم قدم بوس تھے کبھی اے حق!
ہمارے سامنے کس کا چراغ جلتا تھا

عشرت ظفر
روزنامہ "انوارِ قوم"
۱۰۱/۵۵۴ نعیم آباد کالونی۔ کان پور

سفر مدام سفر

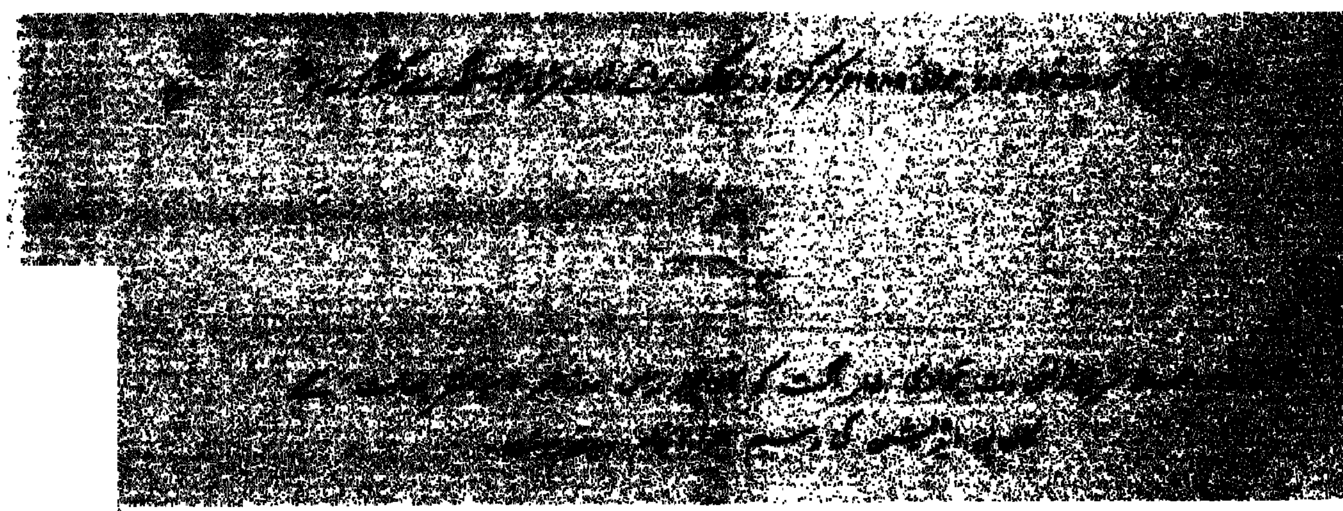
اتر رہی ہے شفق برگ و بارِ دل کے قریب
لہو میں بھیگے ہوئے رنگ موسموں کے ہیں
سحر کے چہرے سے خاشاکِ شب ہے لپٹی ہوئی
بساطِ نور پہ آثار ظلمتوں کے ہیں
نواحِ جاں میں سلگتی ہوئی یہ گردِ سیاہ
اسی کی تہہ میں خد و خال بستیوں کے ہیں

منارہ دُور سے آتا نہیں نظر کوئی
سفید روئی کے گالوں کی طرح اڑتا ہوا
فضا کے شانوں سے بے چین کہرے کا سیلاب
اتر رہا ہے در و بام اور منڈیروں پر
خود اپنی سبز لوؤں کو نگل چکے ہیں چراغ
کسی طرح یہ سفر ختم ہی نہیں ہوتا
فضا میں ہو گئے معدوم منزلوں کے نقوش
یوں ہی ازل سے ابد تک یہ دشتِ لامحدود
وسیع ہوتا ہوا دم بدم یہ نقطۂ ذات
سراغ دیتا ہے بے انتہا مسافت کا
نشانِ بے وطنی اور سبز ہوتا ہے
سحابِ روز و شب آنسو زمیں میں بوتا ہے



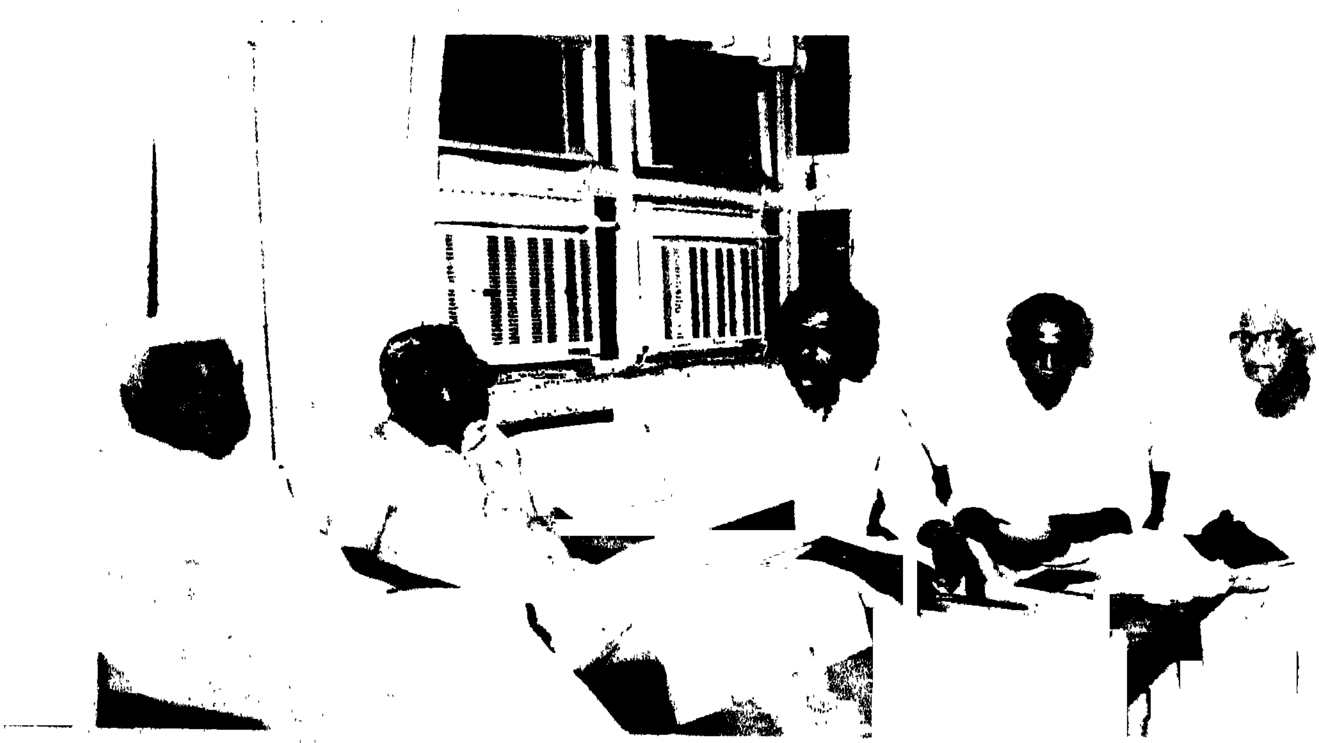














[illegible] ۲۰ اگست کو کمیٹی ہال (کمرہ) میں برطانوی پارلیمانی وفد کے
اعزاز میں منعقدہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے۔

[illegible] اطلاعات شری [illegible] چندر، ۲۰ اگست کو محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش کے
[illegible] جلسے کے ڈپٹی ڈائرکٹروں اور ضلع اطلاعات افسروں کو خطاب کرتے ہوئے۔
تصویر میں اترپردیش کے ڈائرکٹر اطلاعات شری [illegible] بھی نظر آرہے ہیں۔



ظفر اوگانوی
۲- اے، شمس الہدیٰ روڈ
(گراؤنڈ فلور)
کلکتہ - ۷۰۰۰۱۷

افسانہ

بے وزن

میں اسے قبر کی گہرائیوں میں لٹا کر جب اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ گوبرا قبرستان سے لوٹ رہا تھا تو مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ ہم دونوں نے زندگی کی وسعتوں کو بہت ہی صحیح ڈھنگ سے سمیٹا تھا، اور ایک مکمل اور بھرپور زندگی جینے کے بعد وہ مجھ سے ایسے بچھڑی تھی جیسے یہ تو ہونا ہی تھا اور ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہونا تھا۔ لیکن میں اپنے بیٹے حامد کو کس طرح یقین دلاتا کہ اس کی ماں جس سفر پر نکل چکی ہے اس کی تیاریاں تو اس نے بہت پہلے ہی کرلی تھیں۔ اب بچا ہی کیا تھا، اس کو کرنے کے لئے۔ ماں کی آرزوؤں کا دائرہ کتنا چھوٹا ہوا کرتا ہے، بیٹا پڑھ لکھ کر بڑی سی نوکری پر لگ جائے یا باپ کی تجارت کو کچھ اور پھیلا لے۔ پھر ایک چاند سی بہو ہو، اور پوتے پوتیوں کی کلکاریاں۔

یہ سارا کچھ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح اس نے چاہا تھا مگر جب رات آئی تو سارے عزیز و اقارب ایک تھکن کے احساس کے ساتھ مجھ سے جدا ہو کر شہر میں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے مجھ سے، میرے بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں سے ہمدردی کا بھی اظہار کیا تھا شاید، اور میں اپنی مسکراہٹ کے ساتھ ان کے جذبات کا شکریہ ادا کرکے ان کو رخصت کرتا رہا تھا۔

ایک ایک کرکے جب سب چلے گئے تو حامد نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ آج رات میرے ساتھ یہیں گذارے گا وہ سوچ رہا ہوگا کہ کم سے کم آج کی رات تو ڈیڈی کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ لیکن میں نے کہا کہ اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے یہاں بہو اور بچوں کو تکلیف ہو جائے گی۔ تم لوگ اپنے فلیٹ چلے جاؤ اور آرام کرو، میرے اصرار پر اتنا ہوا کہ بہو، بچوں کو لے کر چلی گئی۔ مگر حامد میرے پاس ہی رہ گیا۔ میں نے بھی سوچا کہ یہاں رہ کر وہ اپنی ماں کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرنا چاہتا ہو شاید۔

نوکر نے کھانا لگا دیا تھا مگر نہ میں کھانے کے موڈ میں تھا اور نہ حامد۔ میں تو بس آنکھیں بند کرکے ان راستوں اور مرحلوں کو دیکھنا چاہتا تھا جو میں نے پچھلے پنتیس سال میں اس کے ساتھ گذارے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حامد بغل کی پلنگ پر کپڑے تبدیل کرکے لیٹ چکا ہے۔ نوکر نے بلب آف کر دیئے تھے، میرے کمرے میں ہمیشہ دو پلنگ ہوا کرتے ہیں۔ ایک پر میں سویا کرتا تھا، اور دوسرا خالی پڑا رہتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی عزیز آجاتا تو اس پر سو جاتا ورنہ اس کی سفید چادر پر کبھی شکن نہ پڑتی۔ بغل کے کمرے میں بھی اسی طرح دو دیوان تھے۔ ایک حامد کی ماں کے لئے تھا، اور دوسرا کبھی حامد کے لئے ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس نے جیسے ہی میری تجارتی حدوں کو آگے بڑھانے میں کامیابی حاصل کرلی میں نے اس کی آسائش کے لئے ایک مہنگے علاقے میں بڑا اور آرام دہ فلیٹ خرید کر اس کے حوالے کر دیا۔ نئے ماڈل کی کار بھی اسے مہیا کر دی۔ اور اپنے تاجر دوست کی اکلوتی بیٹی سعدیہ سے اس کی شادی بھی انجام پا گئی۔ ان سارے پروگراموں میں وہ کتنا کم تھی اور میں کتنا زیادہ تھا۔ کبھی ہم نے سوچا ہی نہیں۔ اس لئے کہ اب تک ہم ایک ساتھ، ایک ہی انداز میں

سوچتے آئے تھے شاید ۔

ہم ایک دوسرے کو کچھ یوں محسوس کرتے تھے، رات کا کھانا ٹیبل پر لگا ہوا ہے ۔ ہم آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے ہیں ۔ اس نے میری پلیٹ میں کھانا لگا دیا ہے ۔ پھر خود لیا ہے پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے اپنے نوالے اٹھائے ۔ مگر اس نے اپنا ہاتھ روک لیا ۔ اسے کچھ یاد آ گیا

"..... ایسا ہے کہ حامد ....."

میں نے اشارہ سے اس کو خاموش کیا اور اپنا لقمہ نگلنے کے بعد فوراً بول پڑا ۔

" تم کہنا چاہ رہی ہو کہ حامد کے لئے ایک خوبصورت سا فلیٹ خرید لیا جائے "

" بالکل صحیح ۔ میں یہی کہنا چاہتی تھی "

" کسی اور موقع پر جب میں نے اس طرح بات شروع کی تھی ۔"

" ہماری کار بہت پرانی ہو چکی ہے "

اس نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا ۔

" حامد کے لئے نئی کار کا ڈی لکس ماڈل خرید لیجئے اور اس کی سالگرہ پر پریزنٹ کر دیجئے "

کبھی کبھی مجھے لگتا کہ ہم دونوں میں اس حد تک ہم آہنگی کا ہونا کہیں مافوق الفطری عمل تو نہیں ۔ کبھی کبھی لگتا ہم دونوں کا دماغ کمپیوٹر بن چکا ہے ۔ کبھی محسوس ہوتا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے ، ورنہ پینتیس سال کی رفاقت میں کبھی تو اس کو مجھ سے کوئی شکایت ہوئی ہوتی ۔ اس کو نہیں تو مجھے اس سے کسی بھی مسئلے پر اختلاف ہوا ہوتا ۔ میں نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا کوئی بھی لمحہ مجھے ایسا یاد نہیں آ سکا جب اس کی وجہ سے مجھے یا میری وجہ سے اس کو کبھی کوئی پریشانی ہوئی ہو ۔

لیکن ایک بار ایک دلچسپ صورت اس وقت ضرور پیدا ہو گئی تھی جب ہم حامد کی شادی کی تیاریوں پر نظر ثانی کر رہے تھے ۔ پانچویں دن بارات کی تاریخ تھی دعوتی کارڈ تقسیم کئے جا چکے تھے ۔ حامد کے فلیٹ کو انٹیریر ڈیکوریٹر مکمل طور پر سجا چکا تھا ۔ دوسرے صوبوں سے دور اور قریب کے رشتہ دار، احباب آنا شروع ہو چکے تھے، سبھوں کے لئے شہر کے ایک مشہور ہوٹل کے کمرے بک تھے حامد کا شاہانہ لباس تقریباً تیار ہو چکا تھا ۔ بہو کے لئے زیور، اور بنارسی ساڑیاں خریدی جا چکی تھیں ۔ انھیں تیاریوں کے ہجوم میں ایک روز اس نے مجھے اپنی ساڑی اور میرا سوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا :

" ذرا ان کو غور سے دیکھئے تو ....."

میں نے دیکھا ۔ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا ۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی ۔ میں نے اس سے پوچھا :

" آخر کیا ہے اس میں ۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو ۔"

میں نے پھر دیکھا ، الٹ پلٹ کر دیکھا ، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا ۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی ۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی ۔ تب مجھے پہلی بار لگا تھا کہ میں اس کے ذہن کو نہیں سمجھ پایا ہوں ۔ کمپیوٹر میں کہیں کچھ گڑبڑی ہو گئی ہے ، میں نے اس سے پھر کہا :

" کھل کر بتاؤ آخر کیا چکر ہے "

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا :

" دیکھئے جناب ! نہ آپ جوان رہے اور نہ میں ۔ اور میری وزنی ساڑی ، یہ سرخ شوخ رنگ ۔ اور آپ کے سوٹ کا یہ ڈیزائن ۔ لوگ کیا کہیں گے ۔ آپ کو یاد ہے نا آپ نے اس سال اپنی ساٹھویں سالگرہ منائی ہے ۔"

" تو یہ بات ہے ۔ مگر مسئلہ ہمارا یا ہماری پسند کا نہیں ہے "

" تو کس کی پسند کا ہے ؟ "

" بھئی ! یہ حامد اپنی پسند سے لایا ہے ، اور ہم اس کا دل تو نہیں توڑ سکتے ہیں نا "

" تو یوں ہے ۔ میں نے تو ایسا سوچا ہی نہیں تھا "

میں نے محسوس کیا کہ حامد سوچ چکا ہے ، مگر میری آنکھوں میں

ند کہاں تھی، میں تو ماضی کی پگڈنڈیوں پر بھاگتا پھر رہا تھا، بھاگتے بھاگتے تھکن کا احساس بھی یہ سوچ کر نہیں تھا کہ مدگی کے باقی دنوں میں وہ میرے ساتھ ہوگی۔ مجھے یاد آیا اس ز وہ کتنی خوش تھی۔ اتوار کی شام تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ٹھنڈی راؤں کی گدگداہٹ ـــ میں شال اوڑھے، صوفے میں دھنسا ،آلب کی غزلوں کا کیسٹ سن رہا تھا: مہدی حسن کی آواز سکا ،ادو ماحول کو اپنے اثر میں لے رہا تھا، جب اس شعر نے ـــ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

بیرے دل کو جکڑنا شروع کیا ہی تھا کہ وہ میرے پاس آگئی ور بیٹھتے ہی اس نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن کر دیا۔ اس کا طلب تھا کہ وہ کوئی بہت اہم بات کرنا چاہتی ہے۔ اس نے س طرح شروع کیا تھا:

" دیکھئے آپ ستّر کے ہو چکے ہیں اور میں ساٹھ کی۔"

" یعنی تم یاد دلا رہی ہو کہ ہم کھوسٹ بوڑھے ہو چکے ہیں۔"

اس نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا:

" اس طرح نہیں سوچتے مائی ڈیرا سوچنا یہ ہے کہ اب ہمارے آخری سفر کا نقارہ کسی وقت بھی بج سکتا ہے۔"

" تو ہمیں اب اپنی موت کا انتظار کرنا ہی چاہیئے۔"

اس نے بہت ہی لگاوٹ کے ساتھ مجھے دیکھا:

" مگر ایک مسئلہ ہے۔ کہ ہم میں سے پہلے کون جائے گا؟"

میں نے جواب دیا:

" پہلے میں موت کا استقبال کروں گا۔"

وہ مسکرائی:

" یعنی آپ مجھے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ بیوفا کہیں کے۔"

لیکن آخری سفر پر پہلے کون نکل کھڑا ہوگا۔ یہ کس کو پتہ ہے۔ یہی سوچ کر شاید اس نے پروگرام بنایا تھا کہ ہم دونوں علیحدہ علیحدہ ریڈیو کیسٹ پر ایک ایک پیغام ریکارڈ کر دیں۔ جیسے ہم ایک دوسرے سے کیا چاہتے ہیں، جیسے مرنے کے بعد تم مجھ سے یا میں تم سے کس طرح صبح و شام کرنے کی توقع رکھتی ہوں۔ جیسے تم اپنی موت کے بعد کیا چاہو گے کہ میں کس طرح کے کھانے کھاؤں۔ کون سے لباس پہنوں ـــ نہیں نہیں! مجھ سے سفید ساڑی بالکل نہیں پہنی جائے گی۔ یعنی ساری تفصیل، ساری جزئیات ہم ایک دوسرے کے لئے ریکارڈ کر جائیں گے۔ مگر ایک شرط ہوگی کہ ہم میں سے ایک کے بچھڑنے کے بعد ہی دوسرا اس ریکارڈ کو سن سکے گا۔ تو شرط منظور ہوگئی، اور اسی شام ہم نے ایک دوسرے سے الگ ہو کر وہ سارا کچھ ٹیپ کر ڈالا جس کی بعد میں ہم سے کسی ایک کو ضرورت ہوگی۔

حامد کے خراٹے کی آواز کمرے کے اندھیرے میں ابھرنے لگی تھی، اور مجھ سے نیند کوسوں دور تھی۔ ایسے میں مجھے کیسٹ یاد آیا کیوں نہ ابھی سنا جائے۔ شاید دل کو کچھ قرار آجائے۔ اس احساس کے ساتھ ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ جانے کیا کچھ اور کس لہجے میں اس نے مجھ سے کہا ہوگا۔ مگر حامد کی نیند ٹوٹ گئی تو۔ اس ڈر سے میں آہستہ آہستہ اپنے پلنگ پر سے اٹھا۔ اندھیرے ہی میں ٹیبل پر سے ٹیپ ریکارڈر اٹھایا۔ اور ڈراور سے کیسٹ نکال کر بغل کے کمرے میں چلا آیا۔ درمیان کا دروازہ ہولے ہولے بھڑ کایا اور پردے کھینچ دیئے تاکہ روشنی اور آواز سے حامد کی نیند خراب نہ ہو میں نے روشنی کی۔ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کر پلیر آن کر دیا، اور دل تھام کر ہمہ تن گوش بن گیا۔ کوئی آواز۔ نہیں۔ گھر رگھر۔ شاید شروع کا کیسٹ خالی ہو۔ اسپیڈ نمبر بھاگتے رہے، پھر کھٹاک کی آواز کے ساتھ کیسٹ کا ایک سائڈ ختم ہوگیا۔ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی پھر بھی میں نے اپنے حواس کو قابو میں کر ہی لیا، سوچا کیسٹ کے دوسرے حصے میں اس نے ٹیپ کیا ہو شاید۔ سائڈ بدل کر میں نے پلیر آن کر دیا، پھر گھر رگھر کی ایک بھاگتی آواز، اور پھر وہی کھٹاک کی آواز کے ساتھ یہ دوسرا سائڈ بھی ختم۔ تبھی مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں خلاؤں میں ایک بےوزن وجود بن کر بے مقصد ڈولنے لگا ہوں۔ ★

بی۔اے بہادر محشر بریلوی
۴۶۶- بی، ریلوے اسٹیڈیم کالونی
گورکھپور

کل کے ہندستان ہیں

گاندھی جی کے ہم سپنے ہیں نہرو کے ارمان ہیں
آج تو ہم ہیں بچے لیکن کل کے ہندستان ہیں

سب لوگوں سے ہمیں محبت سب سے بھائی چارا ہے   گاندھی جی کے آدرشوں پر چلنا کام ہمارا ہے
ہر مذہب کے لوگ ہیں اپنے دھرم سبھی کا پیارا ہے   سب نے اپنے خون سے گلشن سینچا اور سنوارا ہے
بھارت ماں ہے جننی اپنی ہم اس کی سنتان ہیں
آج تو ہم ہیں بچے لیکن کل کے ہندستان ہیں

جو نہ ابھی تک ہو پایا ہے وہ کر کے دکھلائیں گے   اپنا ترنگا سب سے اونچی چوٹی پر لہرائیں گے
مل جل کر دھرتی کو اپنی ہم سب سورگ بنائیں گے   ہر قیمت پر دیش کو اپنے منزل تک لے جائیں گے
کس میں طاقت ہم کو روکے ہم آندھی طوفان ہیں
آج تو ہم ہیں بچے لیکن کل کے ہندستان ہیں

کریں گے رکشا بن پراتی کی لاکھوں پیڑ لگائیں گے   ہر دشمن کو دیش سے اپنے کوسوں دور بھگائیں گے
ریگستانوں میں نہروں کا ہر سو جال بچھائیں گے   پیاس کی ماری جو دھرتی ہے اسکی پیاس بجھائیں گے
ان کو بھی آباد کریں گے جو خطے ویران ہیں
آج تو ہم ہیں بچے لیکن کل کے ہندستان ہیں

گھر گھر جا کر پڑھنا لکھنا ہم سب کو سکھلائیں گے   شہروں شہروں گاؤں گاؤں علم کا دیپ جلائیں گے
اپنے ہر اک منصوبے کو ہم پروان چڑھائیں گے   ہر شعبے کو ہر صنعت کو راہیں نئی دکھائیں گے
ناممکن کو کریں جو ممکن ہم ایسے انسان ہیں
آج تو ہم ہیں بچے لیکن کل کے ہندستان ہیں

ذرہ ذرہ وقت پڑنے پر اک پربت بن جائے گا   ہم سے جو بھی ٹکرائے گا اپنے منہ کی کھائے گا
برسوں اپنی نادانی پر رو دے گا پچھتائے گا   بھارت ماں کی سنتانوں کے کون مقابل آئے گا
بازو بھی فولادی اپنے سینے بھی چٹان ہیں
آج تو ہم ہیں بچے لیکن کل کے ہندستان ہیں

ڈاکٹر خوشحال زیدی
۸۰- انتظار لاج، غفار منزل ایکسٹینشن
جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵

بچّوں کا قدیم ادب

از امیر خسرو تا ۱۸۵۷ء

اردو میں ادب اطفال ــ ان درسی کتب کی حیثیت سے وجود میں آیا جو بچوں کی تعلیم و تربیت کی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی تھیں یہ تعلیم انھیں گھر یا مدرسوں میں دی جاتی تھی۔ مکتب یا مدرسے ہی انیسویں صدی کے وسط تک ہندستان میں تعلیم و ترتیب کا وسیلہ رہے۔ انیسویں صدی سے قبل تعلیم کا تصوّر امراء اور حکمراں طبقے اور ان کی پیروی کرنے والے متوسط طبقے تک ہی محدود تھا۔ عوام کی غالب اکثریت پسماندہ اور جاہل تھی۔ حکمراں اور اعلیٰ طبقہ نیز ان کے ہمنوا متوسط طبقے کے شرفاء اپنے گردو پیش کی اکثریت کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے یا ان کے بچوں کے لیے تعلیم کی ضرورت کا احساس ہی نہ تھا۔

مسلمانوں کی ہندستان میں آمد کے ساتھ مقامی زبانوں پر فارسی اور عربی کے اثرات پڑنے لگے۔ یہ نو وارد قوم ہندستان کی مقامی زبانوں مثلاً سنسکرت اور پالی سے ناآشنا تھی۔ فاتح اور مفتوح قوموں کے باہمی ارتباط کے نتیجے میں عربی، فارسی، سنسکرت پالی اور ہندستان کی دیگر علاقائی زبانوں نے ایک دوسرے سے اثر قبول کیے اور ایک نئی زبان نے جنم لیا، جس کو ابتدأ "ہندوی" یا ہندستانی کا نام دیا گیا۔ بتدریج ترقیوں سے گذر کر یہی زبان آگے چل کر اُردو کہلائی۔

فارسی ابتدا سے ہی اُردو کی تمام اصناف ادب پر اثر انداز رہی ہے۔ چونکہ فارسی روزمرہ بول چال کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طویل مُدت تک، ہندستان کی سرکاری زبان بھی رہی اس لیے بچوں کے ادب میں جو ابتدائی کتابیں ملتی ہیں، ان پر فارسیت غالب ہے۔ "نصاب الصبیان" اس اعتبار سے سر فہرست ہے۔ یہ کتاب ابتدائی اردو میں نصابی نوعیت کی کتابوں کے لیے مثالی نمونے کا کام دیتی ہے، اس ضمن میں مولانا محوی صدیقی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"غالباً گذشتہ صدی کے آخر میں بچوں کو پڑھانے کے لیے چھوٹی اور آسان کتابیں اس مقصد سے لکھی جاتی تھیں۔ ان ہی میں ایک صنف 'نصاب' کہلاتی تھی۔ نصاب کے معنی تھے۔ "نظم میں چھوٹی سی لغت کی کتاب" ــ جس سے بچوں کو دوسری زبان سیکھنے میں آسانی ہو اور شعر کی وجہ سے الفاظ کے معانی جلد یاد ہو جائیں۔ اس قسم کی قدیم کتابوں میں ابوالنصر فراہی کی "نصاب الصبّیان" بہت مشہور ہے اور مدتوں رائج رہی ہے۔ اس میں عربی کے الفاظ فارسی اشعار میں بتائے گئے ہیں[۱]"

ابوالنصر فراہی کی نصاب الصبّیان اور اسی نوع کی

دوسری تدریسی تصنیفات دراصل عربی فارسی کی مختصر منظوم لغات تھیں۔ لیکن کچھ محققین کو اس بارے میں شبہات ہیں اور وہ اسے زیادہ مستند نہیں مانتے اور امیر خسرو (۱۳۲۵-۱۲۵۳) کی تصنیف " خالق باری" کو بچوں کے ادب کی پہلی کتاب مانتے ہیں۔ " خالق باری" بھی ایک مختصر لغت ہے جو نظم کی ہیئت میں ہے اور اس نظم میں مختلف اجزاء مختلف بحور میں موجود ہیں۔

بچوں کی ابتدائی کتب کے بارے میں محمود الرحمان رقمطراز ہیں۔ " اردو میں بچوں کے ادب کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے ہوتا ہے۔ اس زمانے میں نو عمر افراد کے لیے متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں جو زیادہ تر لغت پر مشتمل تھیں مثلاً " خالق باری" ایزد باری، اللہ باری، صفت باری وغیرہ ان کتابوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ بچوں کو نہایت آسان اور دلچسپ اشعار کے ذریعہ عربی و فارسی الفاظ کے معنی سے متعارف کرایا جائے"۔ ؎

" خالق باری" میں روزمرہ استعمال میں آنے والے فارسی الفاظ کے معنی واضح کیے گئے ہیں۔ مثلاً

بیا برادر — آرے بھائی
بنشیں مادر — بیٹھ ری مائی

امیر خسرو کے یہاں " خالق باری" کے علاوہ بھی بچوں کے کے لیے پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور دوسخنے ملتے ہیں۔ جو بڑوں اور بچوں دونوں میں یکساں طور پر مقبول رہے ہیں۔ مثلاً

دوسخنے:-

سموسہ کیوں نہ کھایا — جوتا کیوں نہ پہنا (تلا نہ تھا)
انار کیوں نہ چکھا — وزیر کیوں نہ رکھا (دانا نہ تھا)

کہہ مکرنیاں:-

آٹھ انگلی کا ہے وہ اصلی — اس کے ہڈی نہ اس کے پسلی
لٹا دھاری گرو کا چیلا — اے سکھی ساجن نہ سکھی کیلا

پہیلیاں:-

ایک تھال موتیوں سے بھرا — سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے — موتی اس سے ایک نہ گرے (آسمان)

حالانکہ امیر خسرو کے دوسخنوں، کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں وغیرہ میں بالغوں کے لیے زیادہ مواد ملتا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ چیزیں بہر صورت بچوں کے ادب میں شمولیت کا استحقاق اور اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے امیر خسرو بچوں کے پہلے شاعر ہیں اور خسرو کی تصنیف " خالق باری" بچوں کے ادب کی پہلی تصنیف ہے۔

" خالق باری" (امیر خسرو) کی تقلید میں اسی اسلوب اور پیرایہ میں بچوں کے لیے بہت سی نصابی کتابیں لکھی گئیں۔ ایسی کتابوں میں عباس رفعت بھوپالی کا " عباس نامہ" اور عبدالصمد بیدل کی " حمد باری" قابل ذکر ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ہم کئی صدی آگے نکل آئے۔ ورنہ عباس رفعت بھوپالی اور عبدالصمد بیدل سے بیشتر دکن میں ادب اطفال پر نظر ڈالی جائے تو بچوں کے لیے بہترین منظوم ادب سامنے آ سکتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ حسین ذوقی کی مثنوی " ماں باپ نامہ" کو دکن کی جانب سے ایک اضافہ سمجھنا چاہیئے جو بچوں کی نصابی ضرورت کے تحت نہیں لکھی گئی بلکہ اس کے ذریعہ شاعر نے بچوں کو اپنے والدین کی خدمت اور احترام کرنے کی نصیحت کی ہے۔

ابتدائی اٹھارھویں صدی عیسوی میں ولی دکنی اور ان کے دیوان کی دہلی آمد کے بعد سے شمالی ہند میں بھی لکھنے والے

اردو میں ادبی تخلیقات پیش کرنے کی جانب مائل ہوئے جن میں بچوں کا ادب بھی شامل ہے۔ چنانچہ میر تقی میر جیسے عظیم المرتبت غزل گو کی کلیات میں بچوں کے لیے مثنوی نما نظمیں مل جاتی ہیں۔ یہ نظمیں اپنے موضوع اسلوب اور زبان ہر اعتبار سے بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ ان نظموں میں بطور خاص "موہنی بلی" "بکری اور کتے" "مور نامہ" "مچھر" "کھٹمل" وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں جن کو اہم "ادب اطفال" میں شامل کر سکتے ہیں۔ بقول اظہر علی فاروقی :-

"اگر نظیر اکبر آبادی کا "گلہری کا بچہ" اور "ریچھ کا بچہ" مولوی اسماعیل میرٹھی کی "گائے" شفیع الدین نیر کا "ریچھ والا" اس رجحان (بچوں کا ادب) کو پورا کر سکتے ہیں اور ان نظموں کو بچوں کی شاعری کے تحت رکھتے ہیں تو بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ میر تقی میر کی "موہنی بلی" "بکری اور کتے" ...... کیوں اس ضمن میں نہ رکھے جائیں" ۳۵

بچوں کے نفسیاتی رجحانات کی ایک کڑی کھیل تماشے سے بھی ملتی ہے۔ ان کھیل تماشوں کے جیتے جاگتے مرقعے میر کی بعض نظموں میں فطری انداز میں پیش کیے گئے ہیں ایسی نظموں میں "مرغوں کی لڑائی" بطورِ خاص قابل ذکر ہے۔

بچوں کے لیے شعر و ادب کا مقصد ان کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ ان کو اخلاقیات کی تعلیم بھی دینا ہے۔ میر کی بعض نظمیں اس مقصد سے مزین نظر آتی ہیں۔ جانوروں سے محبت غمزدہ انسانوں سے ہمدردی لین دین میں دیانت داری، سماجی پستی سے تاثر وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو میر تقی میر کی اس شاعری میں موجود ہیں جسے ہم نے بچوں کی شاعری سے تعبیر کیا ہے۔

میر تقی میر کے بعد بچوں کے شاعر کی حیثیت سے نظیر اکبر آبادی (۱۷۴۰ء - ۱۸۳۰ء) کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ نظیر نے بچوں کے لیے بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خوبی سادہ زبان ہے جو عربی فارسی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے پاک ہے۔ نظیر کی نظمیں بچوں میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے جذبے کے ساتھ، ان کی شخصیت میں اخلاقی اقدار اور قومی تشخص کے نقوش کو ابھارتی ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں نظیر معلم پیشہ بھی تھے اور ساتھ ہی قادر الکلام شاعر بھی۔ اس طرح ادب اطفال میں ان کی حیثیت دو آتشہ ہوگئی انھوں نے بچوں کے لیے کافی نظمیں مختلف عنوانات کے تحت تخلیق کیں اس ضمن میں نظیر کی "ایامِ طفلی" "معصوم بھولے بھالے" "تربوز" "کن کوے اور پتنگ" "گلہری کا بچہ" "پودے اور گڑھ پنکھ کی لڑائی" "ریچھ کا بچہ" "تل کے لڈو" "ہرن کا بچہ" وغیرہ بچوں کی پسندیدہ نظمیں ہیں۔ بچوں کے لیے جتنا کچھ نظیر اکبر آبادی نے لکھا ہے۔ ان سے قبل اردو میں کسی دوسرے شاعر نے نہیں لکھا۔ ان کی نظموں کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں اخلاق اقدار اور پند و نصیحت پر موثر انداز میں زور دیا گیا ہے۔

اردو میں ادب اطفال کی ابتدا اور نشو و نما شاعری ہی سے ہوئی دکنی اور شمالی ہند میں بچوں کے ادب کے تحت منظومات کا اضافہ ہوتا رہا۔ نثر میں اٹھارھویں صدی کے اواخر تک کوئی قابل ذکر تصنیف ایسی نہیں ملتی جس کو ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کر سکیں۔ ۱۷۹۳ء میں سب سے پہلے لکھنؤ کے انشاء اللہ خاں نے جو نظیر اکبر آبادی کے ہم عصر تھے بچوں کے لیے نثری تصنیف "رانی کیتکی کی کہانی" پیش کی۔ "رانی کیتکی کی کہانی" نہ صرف بچوں کے لیے سب سے پہلی نثری کہانی ہے بلکہ ہندی اور اردو دونوں کے افسانوی ادب کی ابتداء ہی اس کہانی سے ہوتی ہے انشاء کی اس کہانی کا نمایاں ترین امتیاز اس کی خالص ہندستانی زبان ہے۔

اردو کے ادب اطفال میں نثر کی ابتداء بلاشبہ "رانی کیتکی کی کہانی" سے ہوتی ہے۔ انشاء کے بعد ایک طویل مدت تک ایسی کوئی تصنیف نہیں ملتی جس کو ہم بچوں کے ادب سے

تعبیر کرسکیں نظم کے میدان میں نظیر اکبر آبادی کے بعد محمد صابر کا نام آتا ہے جنھوں نے بچوں کے لیے ایک طویل نظم "چراغِ فوائد" کے عنوان سے لکھی۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقعہ پر کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کا سرسری ذکر کر دیا جائے جس کا قیام ۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز عہدہ داروں کو محکوم ہندستانی قوم کی زبان اور تہذیب سے روشناس کرنے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین و مترجمین کی تصانیف اور تراجم ظاہر ہے کہ بالغوں کے لیے تھے لیکن طرزِ عام سے ہٹ کر یہ چیزیں شعوری طور پر انتہائی آسان اور عام فہم زبان میں لکھی گئی تھیں تاکہ ہندستان میں نو وارد انگریز انھیں کسی دقت کے بغیر سمجھ سکیں۔ اس لیے ان میں سے اکثر تصانیف بچوں کے سمجھ میں بھی آسکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ابتدائی اور ثانوی درجات کی درسی کتب میں ان کے اقتباسات شامل کیے جاتے رہے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی ایسی متعدد کتابوں میں سے بطورِ خاص "باغ و بہار" (میر امن) "اخلاق ہند" (بہادر علی حسین) "آرائشِ محفل" "قصہ حاتم طائی" اور "صد حکایات" (حیدر بخش حیدری) بیتال پچیسی (مظہر علی ولا) "سنگھاسن بتیسی" (للو لال جی) وغیرہ ایسی تصنیفات اور تراجم ہیں جن میں بچوں کی دلچسپی کا وافر سامان موجود ہے۔ اردو میں اچھی استعداد رکھنے والے بچے انھیں بہت ذوق و شوق سے پڑھتے چلے آئے ہیں اور موجودہ دور میں زبان پر کم استعداد رکھنے والے بچوں کے لیے ان میں سے اکثر کتابوں کو مزید آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں مرزا غالب کا "قادر نامہ" بھی بچوں کے ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے قادر نامہ بھی امیر خسرو کے "خالق باری" کی طرز پر لکھی گئی ہے اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا دل نشین اسلوب ہے۔ "قادر نامہ" مرزا غالب نے اپنے بھتیجے زین العابدین عارف کے بیٹوں (باقر علی اور حسین علی) کی درسی ضروریات کے پیش نظر لکھی تھی۔ ان بچوں کی پرورش غالب نے کی تھی۔ 'قادر نامہ' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۵۶ء میں شائع ہوا تھا

"قادر نامہ" میں بھی "خالق باری" کی طرز پر فارسی کے کثیر الاستعمال الفاظ کے معنی اردو میں نظم کیے گئے ہیں مثلاً

چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں
دود کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں
ہندی میں عقرب کا بچھو نام ہے
فارسی میں بھَوں کا ابرو نام ہے

محوی صدیقی "بالک باغ" میں صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں کہ "قادر نامہ" میں بچوں کے لیے غالب کی تخلیق کردہ دو غزلیں بھی شامل ہیں ان غزلوں کے چند اشعار ؎

لال ڈگی پر کرے گا جا کے کیا
پل پہ چل ہے آج دن اتوار کا

وہ چرائے باغ میں میوہ جسے
پھاند جانا یاد ہو دیوار کا

پل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ
ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا

کیا کہوں کھائی ہے حافظ جی کی مار
آپ ہنستے آج جو کھل کھل نہیں

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

ان اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں۔ "اس بات کا ثبوت ہیں کہ غالب بچوں کے ادب کی ضرورت سے غافل نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ غالب کی پرواز بہت اونچی تھی اور اس سطح پر زیادہ دیر نہیں رہ سکتے تھے" [۳]

محوی صدیقی 'قادر نامہ' کے بارے میں لکھتے ہیں:۔ "نظامی مطبوعہ کانپور کے نسخے میں مجھے اچھی طرح یاد

ہے کہ آخر میں اردو کی بہت سی نظمیں، قطعات اور مثنوی کی صورت میں دو دو، تین تین، چار چار، پانچ پانچ شعروں کی مختلف عنوانات پر تھیں۔ مثلاً "ڈھیل جھیلی" "گائے" "ہاتھی" وغیرہ۔ یہ کتاب ہندستان کے اکثر پریسوں میں لاکھوں کی تعداد میں چھپی اور بے حد مقبول ہوئی ہے۔ تقریباً ہر بچہ پڑھتا تھا"۵

باوجود تلاشِ بسیار کے مطبع نظامی کانپور کا زیرِ بحث نسخہ نہیں مل سکا۔ ورنہ بالخصوص محولہ بالا دونوں غزلوں اور محوی صدیقی کی متذکرہ نظموں کے غائر مطالعہ اور تجزیہ سے نہ صرف اردو کے ادبِ اطفال بلکہ غالبیات کے میدان میں بھی کارآمد اور نئی باتیں کی جاسکتی تھیں۔

ہندستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی ۱۸۵۷ء سے قبل تک ادبِ اطفال کی ارتقائی رفتار بے حد سست رہی اور اس دور کا ادبِ اطفال عموماً درسی نوعیت کا رہا ہے۔ بقیہ ہمہ دیگر ہندوستانی زبانوں کے بچوں کے ادب اور اس عہد کے اردو ادبِ اطفال کا تقابلی مطالعہ ہمیں اس دلچسپ اور لائقِ فخر نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ جہاں دوسری زبانوں میں عظیم المرتبت فنکار ادبِ اطفال کی طرف سے بے اعتنائی برتتے نظر آتے ہیں۔ وہاں اردو میں اس عہد کے فنکاروں نے شعوری اور لاشعوری طور پر بچوں کے ادب کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ اردو زبان کے آغاز کے ساتھ ہی امیر خسرو جیسا دیوقامت فنکار ادبِ اطفال کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اس دور میں بچوں کے ادب کو میر تقی میر اور مرزا اسد اللہ خاں غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر بھی مل جاتے ہیں۔

●●

حواشی

۱۔ محوی صدیقی، "بالک باغ" معیارادب بکڈپو بھوپال ۱۹۷۶ء ص۲۴۔

۲۔ محمود الرحمان، "آزادی کے بعد بچوں کا ادب" ماہنامہ کتاب (لاہور) بچوں کا ادب نمبر جنوری ۱۹۷۹ء ص۹۔

۳۔ اطہر علی فاروقی، "میر تقی میر اور بچوں کی شاعری" ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی اپریل ۱۹۷۶ء ص۱۹۔

۴۔ پروفیسر جگناتھ آزاد "بچوں کا ادب" مشمولہ" ماہنامہ آموزگار" جلگاؤں جنوری ۱۹۸۹ء ص۵۔

۵۔ محوی صدیقی "بالک باغ" معیارادب بھوپال ۱۹۷۶ء ص۲۶۔

✶✶

بیدار ـــــ ص۱۰ کا بقیہ

ص۱۰ کا بقیہ

لکھا ہوگا جو بعد کو ریسناتھ ہوگیا۔ البتہ میر حسن نے اپنے تذکرے کی ترتیب چونکہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی ہے اس لیے تعجب ہے کہ انھوں نے بیدار کی رعایت سے ان کا ترجمہ ب کے تحت کیوں نہیں لکھا بلکہ ث میں لکھا۔ شاید ثناتھ سنگھ نام سمجھے ہوں یا بعد کے کاتبوں نے تصحیح فرمادی ہو۔ بعض جگہ ان کا نام سیاناتھ سنگھ بھی لکھا ملتا ہے۔ خود جناب حبیب الرحمان خاں شیروانی مرتب نے اپنے مقدمۂ تذکرۂ میر حسن میں ان کا نام سیاناتھ سنگھ لکھا ہے (ص۳۲) یہ سب نام غلط ہیں، اور سناتھ سنگھ اگرچہ غیر معمولی نام ہے، مگر صحیح یہی ہے۔

۲۔ اس میں ۲۳۹ صفحات ہیں ۱۵ سطری۔ تاریخوں کی تعداد ڈیڑھ یا دو ہزار کے قریب ہوگی۔ آخری صفحہ سے پہلے کے دو چار صفحے غائب ہیں۔

۳۔ ایک کے تعمّہ کے ساتھ

۴۔ تعجب ہے کہ یہاں 'آب' کے ۳ عدد کے بجائے ۴ کیوں شمار کیے جبکہ انھوں نے کہیں اور اپنی تاریخوں میں الف ممدودہ کے ۲ عدد شمار نہیں کیے ہیں، نہ لفظ 'آبرو' میں۔ (ہاشمی)

۵۔ از تذکرہ شعرائے اردو۔ میر حسن

محمد اسحٰق صدیقی
اے ۔ ۵ ، گوئن تالاب،
لکھنؤ ۔ ۲۲۶۰۱۸

چار پاؤں کا انجینیر: بیور

اندازہ کیا جاتا ہے کہ انسان اس زمین پر تقریباً دس لاکھ سال سے آباد ہے۔ اب سے چند ہزار سال پہلے اس نے لکڑی، پتھر اور مٹی کے گھر بنا کر رہنا شروع کیا۔ اس سے پہلے وہ غاروں میں رہا کرتا تھا لیکن انسان سے لاکھوں سال پہلے سے زمین پر ایک ایسا چوپایا پایا جاتا ہے جو انسان کی طرح لکڑی، پتھر اور مٹی جمع کر کے گھر بناتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اپنا گھر خشکی پر بناتا ہے اور وہ پانی میں۔ یہی نہیں وہ دریاؤں میں سیکڑوں فٹ لمبے ڈیم (Dam) یعنی بند بھی بناتا ہے اس چار پاؤں کے انجینیر کا نام ہے بیور۔



عبدالحق کی انگلش اردو ڈکشنری میں بیور (Beaver) کے معنی دیئے ہیں: "سنجاب؟ سگ آبی؟ اود بلاؤ" سنجاب اور سگ آبی کے سامنے سوالیہ نشان سے خود لغت نویس کے شبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ غالباً یہ مختلف جانور ہیں۔ اود بلاؤ بھی ایک دوسرا جانور ہے جسے انگریزی میں آٹر ([illegible]) کہتے ہیں۔ اس لئے بیور کا ترجمہ نہ کرنا ہی مناسب ہے۔

یوں تو بیور شمالی یورپ (ناروے، سوئیڈن، پولینڈ) اور شمالی ایشیا (سائبیریا) میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان کا خاص وطن شمالی امریکا ہے۔ جب یورپ کے لوگ شمالی امریکا پہونچے تو وہاں بیور نہایت کثرت سے پائے جاتے تھے۔ سو مربع میل کے علاقے میں ان کا لاکھوں کی تعداد میں ملنا کوئی تعجب کی بات نہ تھی، لیکن ان کا نرم و گرم سمور حاصل کرنے کے لئے صدیوں تک بے دردی سے شکار کیا جاتا رہا جب بیور کے سمور کی تجارت عروج پر تھی تو یورپ میں ان کی سالانہ تقریباً ½۲ لاکھ کھالیں فروخت ہوتی تھیں۔ بیور کے سمور کے مشہور تاجر ہڈسن بے کمپنی (Hudson Bay Co) نے ۱۸۵۳ء اور ۱۸۷۷ء کے درمیان تقریباً ۳۰ لاکھ کھالیں فروخت کیں (اس کے شکار کا ایک سبب اس کے غدود سے نکلنے والا خاص طرح کا مشک بھی رہا ہے جو عطر اور دواؤں میں استعمال ہوتا ہے) جب اس کی نسل ناپید ہونے کے قریب ہو گئی تو اس کے شکار پر پابندی عائد کر دی گئی اور اب محفوظ جنگلوں کے سوا بہت کم جہاں تہاں پائے جاتے ہیں۔

بیور کا تعلق کترنے والے جانوروں کے خاندان سے ہے جس میں چوہے

گلہریاں اور خرگوش وغیرہ شامل ہیں۔ خاص فرق یہ ہے کہ یہ جانور خشکی پر رہتے ہیں اور بیور کی زندگی کا بیشتر حصہ پانی میں گزرتا ہے

بیور خرگوش جیسا ایک بھاری بھر کم جانور ہے جو تقریباً چار فٹ لمبا ہوتا ہے۔ اس میں اس کی ایک فٹ لمبی دُم بھی شامل ہے۔ اس کا وزن پیدا ہونے پر تقریباً ایک پونڈ اور بالغ ہونے پر ۳۰ اور ۷۰ پونڈ کے درمیان ہوتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ اس کی باڑھ کبھی رکتی نہیں اور اس کا وزن بڑھتے بڑھتے ۱۰۰ پونڈ تک پہونچ سکتا ہے۔

کُترنے والے جانوروں کی طرح بیور کے منہ میں بھی سامنے کی طرف چار دانت ہوتے ہیں، دو اوپر، دو نیچے، یہ دانت پیچھے کی طرف مڑے ہوتے ہیں۔ باہر کی طرف ان کا رنگ گہرا نارنجی ہوتا ہے یہ زندگی بھر بڑھتے رہتے ہیں اور ان پر دھار ہوتی رہتی ہے۔ یہ اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ اُن کی مدد سے وہ ۲۴ انچ تک موٹے درختوں کے تنے کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔

بیور کے منہ میں دو حفاظتی پردے ہوتے ہیں۔ جب وہ پانی میں منہ کھولتا ہے یا لکڑی کترتا ہے تو ان پردوں سے حلق کا سوراخ خود بخود بند ہو جاتا ہے تاکہ پانی یا چھیپٹیاں حلق کے اندر نہ چلی جائیں۔ جب وہ پانی پیتا یا لکڑی کی چھال کھانا چاہتا ہے تو یہ پردے ہٹ جاتے ہیں۔

بیور کی دم زبان جیسی چپٹی اور بالوں سے خالی ہوتی ہے۔ اُس پر ویسے ہی کھپرے (scales) ہوتے ہیں جیسے مچھلی کے جسم پر ہوتے ہیں۔ پچھلی ٹانگوں پر بیٹھتے وقت یہ دُم تپائی کا کام دیتی ہے اور پانی میں تیرتے وقت پتوار کا۔ خطرہ محسوس کرنے پر وہ زمین یا پانی پر دُم مار کر آواز پیدا کرتا ہے، جسے سن کر اُس کے ساتھی تتر بتر ہو جاتے ہیں۔

بیور کے جسم پر سرخی مائل بھورے رنگ کے بڑے بڑے بال ہوتے ہیں جو اُسے سردی اور پانی سے بچاتے ہیں۔ اس کے پیٹ کے باہر دو غدود ہوتے ہیں جن سے خاص قسم کا تیل نکلتا ہے۔ اس تیل کو وہ اپنے بالوں پر ملتا ہے تاکہ پانی کا اثر نہ ہو۔ پورے جسم پر تیل کی مالش کرنے میں آدھا گھنٹہ لگتا ہے۔ پانی میں بھیگے بالوں کو صاف کرنے کے لئے اس کی پچھلی ٹانگوں میں کنگھی کرنے کے لئے دو ناخن ہوتے ہیں۔

وہ اپنی اگلی ٹانگوں سے ہاتھوں کا کام لیتا ہے اور پچھلی ٹانگوں کی مدد سے تیرتا ہے۔ اسی لئے دونوں کی بناوٹ میں فرق ہوتا ہے۔ پچھلے پنجوں کی انگلیوں کے درمیان بطخ کے پنجوں کی طرح جھلّی ہوتی ہے۔ اگلے پنجوں میں یہ جھلّی نہیں ہوتی۔

بیور ایک اچھا تیراک اور ماہر غوطہ خور ہے۔ تیرتے وقت کان اور ناک کے سوراخ خود بخود بند ہو جاتے ہیں تاکہ پانی اندر نہ جا سکے آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ پانی سے حفاظت کے لئے ہر آنکھ پر ایک شفاف خول چڑھا ہوتا ہے جو عینک کے شیشے کا کام دیتا ہے۔

تیرنے کے لئے وہ اپنی اگلی ٹانگیں سینے سے ملا کر پچھلی ٹانگیں پورے طور پر پھیلا لیتا ہے۔ پھیپھڑوں میں اتنی ہوا بھر لیتا ہے کہ پانی کے نیچے آدھ میل تک بغیر اوپر آئے تیر سکتا ہے۔ خطرے کی صورت میں پانی کے اندر ۱۵ منٹ تک رہ سکتا ہے۔ خطرہ محسوس کرنے پر بار بار اپنی دم مار کر آواز پیدا کرتا ہے یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھی بھاگ کر پانی میں بنے اپنے اپنے گھروں میں چھپ جائیں۔ خطرے سے آگاہ کرنے کے بعد وہ خود بھی پانی میں غوطہ مار کر غائب ہو جاتا ہے

بھیڑیے، بھالو، بلّی کے خاندان کے بڑے جانور اور شکاری پرند بیور کے جانی دشمن ہیں جن سے بچنے کے لئے وہ چشمے، دریا، جھیل یا تالاب کے گہرے پانی میں اپنا گھر بناتا ہے۔ اُس کے گھر کو ماہرین حیوانات لاج (lodge) کہتے ہیں۔ یہ گھر لکڑی کے لٹھوں پتلی شاخوں اور گیلی مٹی سے بنایا جاتا ہے اور بسا اوقات ۳۰ سال تک کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ اُن کا پشتینی مکان ہوتا ہے جس کی آنے والی نسلیں برابر مرمت کرتی رہتی ہیں۔

بیور کا گھر باہر سے دیکھنے میں لکڑی اور مٹی کا ڈھیر جیسا لگتا ہے اندر سے اس کی بناوٹ گنبد نما ہوتی ہے۔ پانی کی سطح پر اوسط درجے کے گھر کا پھیلاؤ تقریباً ۱۲ فٹ اور بلندی لگ بھگ ۶ فٹ ہوتی ہو اُس کی چھت تقریباً ایک فٹ موٹی ہوتی ہے۔ اس میں ہوا اور

روشنی کے لئے چند سوراخ ہوتے ہیں۔ چھت کے نیچے ایک گول کمرا ہوتا ہے
جس میں دن کے وقت ہلکی ہلکی روشنی رہتی ہے۔ کمرے کا گول فرش پانی
کی سطح سے اونچا ہوتا ہے اس کا قطر سات آٹھ فٹ ہوتا ہے۔ اگر یا
اس میں آدمی بخوبی لیٹ سکتا ہے۔ اس چبوترے پر لکڑی کی کترن بھی
ہوتی ہے جس پر بیور اور اس کے بال بچے بیٹھتے ہیں۔ ایک گھر میں ایک
کنبہ رہتا ہے یعنی میاں بیوی اور تین چار بچے۔

چبوترے کے دونوں طرف پانی میں آنے جانے کے لئے
عام طور پر دو بل ہوتے ہیں۔ کبھی صرف ایک بل ہوتا ہے اور کبھی
دو سے زیادہ۔ ان بلوں کے ذریعہ وہ جب چاہے پانی کے اندر ہی اندر
اپنے گھر میں آجا سکتا ہے۔ بسا اوقات بیور کے گھر میں دو کمرے ہوتے
ہیں ایک رہنے کے لئے اور دوسرے میں کھانے کے لئے درختوں کی شاخیں
رکھی جاتی ہیں۔

بیور دریا میں اپنا گھر اور بند کیسے بناتے ہیں، یہ منظر دیکھنے سے
تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لئے وہ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ ان کے
گھر عام طور پر کالونی یعنی نو آبادی کی صورت میں ہوتے ہیں۔ گھر بنانے کے
لئے دریا کے کنارے کے درخت کاٹے جاتے ہیں، درخت کاٹنے کے
لئے بیور اپنی پچھلی ٹانگوں پر دم کے سہارے بیٹھ جاتا ہے۔ بیٹھنے کے بعد
جہاں تک اس کا منہ پہنچتا ہے وہ درخت کے تنے کو چاروں طرف سے
کاٹنا شروع کرتا ہے۔ کھانچا ہر جانب آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جاتا ہے
یہاں تک کہ تنے کے اوپر اور نیچے کے حصے برائے نام جڑے رہ جاتے
ہیں۔ ان کی وہ صورت ہوتی ہے جیسی دو پنسلوں کی نوکیں ملانے سے
پیدا ہوتی ہے۔ بیور اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ گرتے وقت درخت کا
رخ دریا یا چشمے کی طرف ہو تاکہ پانی میں لے جانے میں آسانی ہو۔ جب
وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب درخت ہوا کے جھونکے سے گر جائے گا، وہ
زمین پر بار بار دم مار کر آواز پیدا کرتا ہے جسے سن کر آس پاس کے
سارے بیور خطرے کی زد سے بھاگ نکلتے ہیں۔

جب بیور کے گروہ درخت کاٹنے میں مصروف ہوتے ہیں
تو ان کا ایک ساتھی کسی بلندی پر پہرہ دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں
اور کان دشمنوں پر لگے رہتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی درندہ یا شکاری
پرند نظر آتا ہے یا اس کی آہٹ سنائی دیتی ہے وہ زمین پر دم مار کر
اپنے درخت کاٹنے والے ساتھیوں کو خبردار کرتا ہے۔ وہ یہ آواز
سن کر ادھر ادھر بھاگ جاتے ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ
دشمن جانوروں سے بچنے کے لئے بیور اپنا کام عام طور پر شام سے
سویرے تک کرتے ہیں۔ تعمیری کام زیادہ تر گرمی کے موسم
میں کیا جاتا ہے۔

جب درخت گر پڑتا ہے تو کچھ بیور اس کے چھوٹے چھوٹے
ٹکڑے کرتے ہیں اور کچھ انھیں گھسیٹ کر یا لڑھکا کر پانی میں
لے جاتے ہیں۔ اگر دریا دور ہوتا ہے تو اس مقام سے جہاں درخت
کے یہ ٹکڑے پڑے ہوتے ہیں وہ دریا تک نہر کھود دیتے ہیں۔ یہ نہر
ایک گز چوڑی ایک گز گہری اور سیکڑوں فٹ لمبی ہو سکتی ہے۔
جب لکڑی کے چھوٹے بڑے لٹھے پانی میں بہنے لگتے ہیں، تو وہ
انھیں اپنے منہ سے پکڑ کر اس مقام تک گھسیٹ کر لے جاتے
ہیں جہاں تعمیری کام جاری ہوتا ہے۔

گھر بنانے کے لئے بیور پہلے اس کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں
جس کے لئے لٹھے ایک دوسرے سے ملا کر گولائی میں کھڑے کرتے
ہیں۔ پھر پتلی شاخیں ایک دوسرے میں پھنسا کر یا بن کر اسے
ہر طرف سے بند کرتے ہیں۔ خالی جگہ اور سوراخ بھرنے کے لئے
گیلی مٹی سے پلستر کرتے ہیں۔ یہ مٹی وہ کھود کر مزدوروں کی طرح
لے جاتے ہیں۔ مٹی کو سینے سے لگا کر دونوں ہاتھوں سے تھامے
رہتے ہیں۔ اگر ایک بیور مٹی لاتا ہے تو دوسرا اسے مناسب جگہ
پر لگا کر اپنے اگلے پنجوں سے انسان کی طرح تھپتھپاتا ہے۔

بیور آہستہ بہنے والے دریاؤں میں اپنا گھر بنانا پسند کرتے
ہیں۔ وہ دریا کے جس حصے میں گھر بناتے ہیں، اس کے سامنے
پانی کو گھیرا کرنے کے لئے ایک بند بنایا جاتا ہے۔ گھر کی حفاظت کے
لئے یہ نہایت ضروری ہے گرمی کے موسم میں جب دریا میں پانی
کم ہو جاتا ہے، بیور کے دشمن جانور پانی میں چل کر اس کے گھر
تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پانی اتنا کم ہو جائے کہ
اس کے گھر میں جانے والے پانی کے نیچے کے راستے یا بل نظر

آنے لگیں جنھیں کھود کر دشمن اندر داخل ہوسکتا ہے۔ جاڑے کے موسم میں پانی کا اتنا گہرا ہونا ضروری ہے کہ سطح کا پانی منجمد ہونے کے بعد بھی نیچے اتنا پانی باقی رہے کہ بیور اُس میں تیر سکیں

بیور کے بنائے ہوئے بند بڑے لمبے چوڑے ہوتے ہیں اُن کی لمبائی ۱۰۰۰ فٹ تک بلندی ۱۰-۱۲ فٹ چوٹی پر چوڑائی ۵ فٹ اور پانی کے نیچے ۱۵-۱۶ فٹ تک ہوسکتی ہے۔ اتنے بڑے بند کو بہت سے بیور مل کر بناتے ہیں۔ انھیں مضبوط بنانے کے لئے لکڑی اور پتھر کا مسلسل اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو پانی کا ریلا بند کو بہالے جائے۔ دریا پار کرنے کے لئے جنگلی جانور اس بند کو پل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جانوروں کے چلنے پھرنے سے بند جا بجا ٹوٹ جاتا ہے۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی فوراً مرمت کی جاتی ہے۔

بند دریا میں ایسی جگہ بنایا جاتا ہے جہاں پانی کا بہاؤ سست ہو اور بڑے بڑے پتھر ہوں۔ پتھروں کے درمیان لٹھے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ کچھ لٹھے کیچڑ میں دبا کر کھڑے کئے جاتے ہیں۔ لٹھوں کو بہنے سے بچانے کے لئے درختوں کی شاخیں اور جھاڑ جھنکاڑ بھی کام میں لاتے ہیں جنھیں لٹھوں اور پتھروں کے درمیان پھنسا کر آپس میں الجھا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دریا کی تھاہ سے کیچڑ نکال کر باہر کی طرف پلستر کیا جاتا ہے۔ جدھر پانی کا بہاؤ ہوتا ہے اُدھر کیچڑ خود بہہ کر آتی ہے اور شگافوں کو بند کر دیتی ہے۔ بند کی دیکھ بھال اور مرمت برابر جاری رہتی ہے۔

جب بند سے پانی بہنے کی آواز آتی ہے تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ کہیں سوراخ ہوگیا ہے۔ اُس کا پتہ لگتے ہی وہ فوراً ضرورت کے مطابق موٹی لکڑیاں لاکر سوراخ بند کرکے مٹی تھوپ دیتے ہیں۔

برسات کے زمانے اور بہار کے موسم میں جب برف کے پگھلنے سے دریا میں اتنا پانی بڑھ جاتا ہے کہ بند کے ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے تو پانی کا زور کم کرنے کے لئے وہ خود بند کا درمیانی حصہ توڑ دیتے ہیں اور جب پانی کا زور کم ہوجاتا ہے تو بند کی مرمت کر دیتے ہیں۔ اگر پانی کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے تو تو گھروں اور بند کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے لکڑی، پتھر اور مٹی لاکر انھیں اونچا کر دیتے ہیں۔ خزاں کے موسم میں اپنے گھروں پر مٹی کا پلستر کرتے ہیں۔

جاڑے میں جب برف گرتی ہے تو بیور کے گھر کی چھت جو لکڑی اور مٹی کی بنی ہوتی ہے برف جمنے پر اتنی مضبوط ہوجاتی ہے کہ کوئی بھی درندہ سوائے ریچھ کے اُسے کھود کر اندر داخل نہیں ہوسکتا۔ باہر سے منجمد یہ گھر انھیں سردی اور سرد ہواؤں سے بھی بچاتا ہے۔

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے ہوا اور روشنی کے لئے بیور اپنے گھر کی چھت میں چند سوراخ چھوڑ دیتے ہیں۔ گرمی یا بہار کے موسم میں جب کوئی درندہ بند کو پار کرکے اس کے گھر کی چھت پر پہنچ جاتا ہے تو وہ بیور کی بو پاکر چھت کھود ڈالتا ہے۔ ایسی صورت میں بیور گھر چھوڑ کر پانی کے اندر بلوں سے نکل کر غائب ہوجاتے ہیں شکار نہ ملنے پر درندہ چھت کو توڑ پھوڑ کر چل دیتا ہے۔ جب وہ اپنا غصہ اتار کر چلا جاتا ہے تو بیور مل کر اپنے مکان کی مرمت شروع کر دیتے ہیں۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ انسان کی طرح بیور بھی ضرورت کے مطابق اپنے گرد وپیش کے ماحول میں تبدیلی کرتے ہیں لیکن اس تبدیلی سے قدرت کو نقصان نہیں پہونچتا بلکہ فائدہ ہوتا ہے بیور جو بند بناتے ہیں اُن سے مٹی کا کٹاؤ رکتا ہے۔ پانی کی سطح اونچی ہوجاتی ہے جس سے بہت سے جانوروں کو فائدہ پہونچتا ہے۔ بھنبیری، مچھر اور بہت سے دوسرے کیڑے اس پانی میں انڈے دیتے ہیں۔ ان سے نکلنے والے بچے مچھلیوں کے لئے غذا کا کام دیتے ہیں۔ اور جب مچھلیاں بڑھتی ہیں تو انھیں کھانے کیلئے پانی کے کنارے مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے رہنے لگتے ہیں۔

بیور کی غذا سرد ملکوں میں اُگنے والے خاص درختوں کی چھال ہے۔ گرمی کے موسم میں وہ چھال کے علاوہ پتیاں اور پانی کے پودے بھی کھاتا ہے۔ چھال کھانے کے لئے پہلے وہ پتلی شاخوں

کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیتا ہے اور پھر ہر ٹکڑے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس طرح گھما گھما کر چھال کھاتا ہے جیسے ہم بھٹا کھاتے ہیں۔

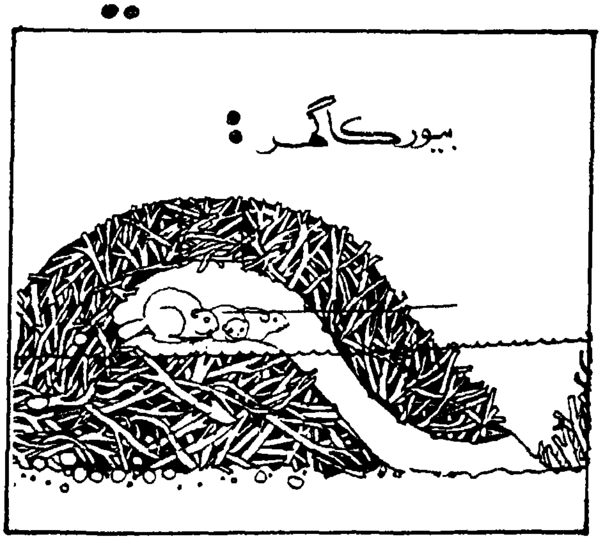
گرمی اور بہار کے موسم میں دریا کے کنارے درختوں کی چھال اور پتیاں آسانی سے مل جاتی ہیں اس لئے انھیں ذخیرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خزاں کے موسم میں وہ جاڑے کے لئے اپنی غذا کا بندوبست کرتا ہے اور اس کے لئے تب تک انتظار کرتا ہے جب تک درختوں کی پتیاں زرد نہیں ہوجاتیں اس زمانے میں درختوں کا رس اور غذائی اجزا چھال کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ پت جھڑ کے بعد وہ بے پتیوں کی شاخیں کاٹ کر اپنے گھر کے آس پاس پانی کے نیچے دبا دیتا ہے جہاں نہ تو وہ مہینوں سڑتی ہیں اور نہ ان کی غذائیت میں کمی ہوتی ہے۔ لکڑی کا یہ انبار جاڑے کے موسم میں، جب اوپر کا پانی جم جاتا ہے تو کھانے کے کام آتا ہے۔ جب بھوک لگتی ہے تب وہ شاخوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے بل کے راستے گھر کے اندر لے جاتا ہے۔ خود کھاتا ہے اور اپنے بال بچوں کو کھلاتا ہے۔ چھال کھانے کے بعد صاف ستھری لکڑی گھر کے باہر کیچڑ میں دبا دیتا ہے۔ یہ سب چھال کی لکڑیاں بہار کے موسم میں گھر اور بند کی مرمت کے کام آتی ہیں۔

آخر میں بیور کی گھریلو زندگی کا جائزہ لینا ضروری ہے، ایک گھر میں ایک کنبہ رہتا ہے۔ بیور "چھوٹا پریوار سکھی پریوار" میں یقین رکھتے ہیں۔ جاڑے کا موسم ان کی افزائش نسل کا زمانہ ہے جاڑا ختم ہونے پر یا موسم بہار کے آغاز میں مادہ عام طور پر دو سے چار تک بچے دیتی ہے۔ کبھی کبھی آٹھ نو بچے پیدا ہوتے ہیں، جن میں سے زیادہ تر مر جاتے ہیں یا والدین انھیں خود مار ڈالتے ہیں۔ مادہ کے جسم میں مناسب فاصلے پر چار پستان ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک وقت میں چار سے زیادہ بچوں کو دودھ نہیں پلا سکتی۔ اگر چار سے زیادہ بچے جیتے رہتے ہیں تو انھیں ایک دوسرے کو دھکا دے کر اپنا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ بچوں کو دودھ پلانے کے لئے مادہ اپنی پچھلی ٹانگوں اور دم کے سہارے سیدھی بیٹھ جاتی ہے۔

بچے ماں کے پیٹ میں ۱۰۰ سے لے کر ۱۱۰ دن تک رہتے ہیں۔ پیدا ہونے پر بچے کا جسم بالوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور دانت بھی نکلے ہوتے ہیں ایک مہینے کا بچہ چھال اکھاڑ اکھاڑ کر کھانے لگتا ہے جب والدین اپنے کام میں لگے ہوتے ہیں تو بچے پانی میں کھیلتے کودتے رہتے ہیں۔ دو یا ڈھائی سال کی عمر میں وہ بالغ ہو جاتے ہیں۔ بالغ بچوں کو والدین اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ انھیں بھگا دیتے ہیں یا وہ خود اپنا گھر بنانے کے لئے کہیں دور چلے جاتے ہیں۔ بسا اوقات نوجوان بیور اس کے لئے ۳۰ میل تک لمبا سفر کرتے ہیں۔ بیور شادی کا پیغام بھی دیتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ نر مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بنا کر نمایاں مقامات پر رکھ دیتا ہے جنھیں دیکھ کر کوئی نہ کوئی شادی کی خواہش مند مادہ وہاں آجاتی ہے اور نر کا انتظار کرتی ہے۔ نر مادہ کا ساتھ زندگی بھر کا ہوتا ہے۔

یہ ہے مسٹر بیور کی زندگی کی مختصر کہانی اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے کہ اس کی کاریگری محض جبلت کا نتیجہ ہے یا باقاعدہ غور و فکر کا؟

••



فاخر جلالپوری
پوسٹ جلال پور
فیض آباد

غزل

پھول کی آڑ میں برسا کیے پتھر کیا کیا
مہرباں بن کے نظر آئے ستمگر کیا کیا

ہم تو مجبور ہوئے خوئے وفا سے اپنی
ورنہ یوں ہم کو ملے آپ سے بہتر کیا کیا

چاند کو چہرہ کہا، زُلف کو ساون کی گھٹا
تم کو تو ہم نے کہا اس سے بھی بڑھکر کیا کیا

صلح کے نام پر اس شہر وفا میں لوگو!
آستینوں میں چھپائے گئے خنجر کیا کیا

شیشہ و سنگ کبھی، جلوۂ صد رنگ کبھی
آدمی کے بھی ہیں دُنیا میں مقدر کیا کیا

بے رُخی، خامشی اور کم نگہی میں فاخر
ان کے اندازِ تغافل کے ہیں تیور کیا کیا

جُنید حزیں لاری
۴۲/۹۷ C.K. دال منڈی
وارانسی

زخمِ تمنّا

اک پھول کا چمن میں طلبگار میں ہوا
وہ پھول کھل رہا تھا سرِ شاخِ آرزو
وہ پھول صد ہزار گلستاں میں انتخاب
وہ پھول دلکشی کی کہانی کا شوخ باب!
دوشیزگی کا خواب، بہاروں کی آب و تاب
ہر پنکھڑی نزاکت و نزہت لیے ہوئے
وہ گل تھا عطر دانِ محبّت لیے ہوئے

جذبات کی تپش سے مچلنے لگا تھا میں
گرمیٔ آرزو سے پگھلنے لگا تھا میں
ریشم کا جسم رکھتے ہوئے خار بن گیا
وہ پھول میری جان کا آزار بن گیا!

اک روز میرے ساتھ ہوا واقعہ عجب
بیتاب ہو کے دستِ طلب جب کیا دراز
حاصل جو سامنے تھا بہت دلخراش تھا
مانوس انگلیاں جو ہوئیں نوکِ خار سے
ایک ایک قطرہ
ان سے ٹپکنے لگا لہو
وہ ٹیس تھی کہ
مجھ کو
خدا یاد آگیا!

وہ پھول جا چکا تھا کسی اور ہاتھ میں
اور مسکرا رہا تھا مری سمت دیکھ کر!
دل کانپتا ہے
سوچ کر
اس بات کو حزیں
میں صاحبِ فراش تھا
صدمے کی چوٹ سے
حیراں ہوں!
کیسے؟
واقعے کی تاب لا سکا!

غزلیں

پروفیسر انیس سلطانہ
۶۳ - عقب موتی مسجد
بھوپال

میرا ماضی مرے چہرے سے جھلکتا ہے ضرور
مجھ کو حالات کی گرمی کی شکایت نہ غرور

مصلحت جان کے کانٹوں کی قبا لائے تھے
گل کی رنگین قبائی کو پرکھنا تھا ضرور

کون سے بھیس میں مل جائیں فرشتے ہمدم
خدمتِ انس و بشر اپنا فریضہ ہے حضور

وقت کے ساتھ بدلنے لگا احساس کا رنگ
مجھ کو اس بات کا پہلے سے نہ تھا کوئی شعور

آپ بے وجہ انیس آج پشیماں نہ ہوں
اب کہاں یاد انھیں وہ دلِ سادہ کا قصور

راشد جمال فاروقی
اے ۱۵۲۸ آئی ڈی پی ایل
ویربھدر، رشی کیش، دہرہ دون

بس اک تلاشِ مسلسل مزاج بن جاتی
یہ چند قطرے نہ ملتے تو پیاس کیوں بڑھتی

ہمارا نام پتہ سرپھروں میں شامل ہے
نظر نظر میں کھٹکتی ہے اپنی خوش ذوقی

ہزار وصل کی راتیں گزر گئیں لیکن
وہ پہلے لمس کا لمحہ نہیں مرا اب بھی

ہم اپنے ایسے تماشائی تھے کہ دور رہے
کبھی قریب سے دیکھا تو آنکھ بھر آئی

قبولیت کے سبھی در کھلے رہے لیکن
دعا کو ہاتھ نہ پھیلے عجیب ساعت تھی

در و دیوار سے ابھرے مہیب سناٹے
زمیں میں تیر بجھانے لگی ہے تنہائی

ام ہانی
مقبول لاری منزل
نزد سٹی اسٹیشن لکھنؤ

دستِ جنوں میں اب کوئی خنجر نہ آئے گا
ساکت بدن کے واسطے پھر سر نہ آئے گا

کچھ اور تیز کر ذرا طوفاں کی زد میں لو
قبل از فنا سکوں کا کوئی در نہ آئے گا

مقتل سے اشک و خون بہا لے گئے اُسے
پھر دار تک کبھی وہ ہنرور نہ آئے گا

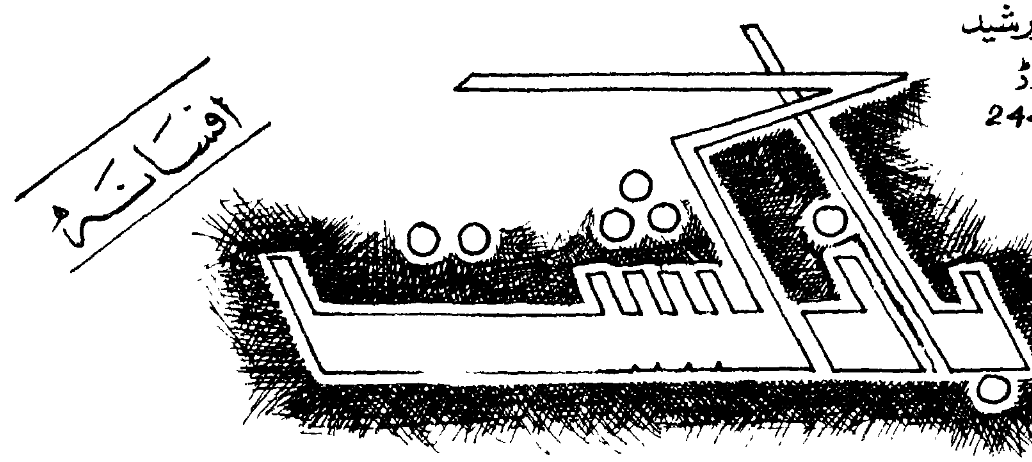
امواجِ بحر میں بھی کبھی تو اتر کے دیکھ
تیرے سفینے میں تو سمندر نہ آئے گا

صیقل لہو سے کر اسی بوسیدہ نقش کو
پھر سے نوشتہ کوئی مقدر نہ آئے گا

اشک و لہو و درد سے تجھ کو شغف نہیں
تجھ میں فنِ لطیف کا جوہر نہ آئے گا

ہانی تمام عمر تمازت سے کر نباہ
سایہ کرے جو سر پہ وہ شہپر نہ آئے گا

ابنِ حسن خورشید
54 ۔ جیل روڈ
رام پور ۔ 244901



کرائے کے مکان کی بوسیدہ دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی کی دونوں سوئیاں نیچے اوپر تھیں۔ سیکنڈ کی باریک سوئی ٹِک ٹِک کرتی ہوئی اپنے مخصوص انداز میں آگے بڑھی یعنی وقت خود کو دوہرا رہا ہے۔ جو کل تھا وہی آج۔

رمیش کی اداس اور بے نور آنکھیں، جن میں اب حسرت و یاس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، اس گھڑی پر جمی ہوئی تھیں جو اس کی بیوی جہیز میں لائی تھی، رمیش اپنے بستر پر ساکت پڑا ہوا گھڑی کو تک رہا تھا، اچانک اس کی نظروں میں گھڑی کی سوئیاں الٹی گردش کرنے لگیں۔

سجے سجائے منڈپ میں رمیش روایتی انداز میں دولہا بنا بیٹھا تھا شبھ مہورت میں ابھی تھوڑی دیر باقی تھی۔ رمیش کے باپ اور ہونے والے سمدھی کو ایک طرف لے جاکر کچھ بات کرنے لگے۔ ان دونوں میں کیا بات ہو رہی ہے اس کی خبر پوری طرح رمیش کو بھی تھی لیکن وہ فرماں بردار اولاد کی طرح خاموش تھا پھر بھی اس کو یہ بات عمر بھر کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی جو اس کے باپ نے شادی کے منڈپ میں اپنی گلابی پگڑی کے سنہری طرے کو لہراتے ہوئے اس کے ہونے والے سسرے کہی تھی۔ رمیش چاہتا تھا کہ باپ کی بات سے انکار کردے، لیکن باپ کے غصے کی وجہ سے وہ بالکل خاموش رہا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ برداشت کرتا گیا۔ اس کو وہ منظر ہمیشہ یاد رہا جب اس کے باپ ایک فاتح کے انداز میں مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اس کے پاس آئے تھے۔ اور قریب ہی بیٹھے ہوئے پنڈت سے مسکرا کر کہا تھا۔

" پنڈت جی! اب دیر کاہے کی ہے شبھ گھڑی بیتی جا رہی ہے۔"

اس وقت۔ بھلا رمیش کی عمر اور تجربہ ہی کیا تھا۔ اسکول کی چہار دیواری کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے کے بعد کچہری کی چہار دیواری سے واسطہ پڑا۔ جو ہاتھ ابھی پوری طرح قلم کے بوجھ سے بھی واقف نہ ہوئے تھے، ان نازک ہاتھوں کو لوہے کے بھاری اور بھدے اوزاروں سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ اس نے دنیا میں کچھ بھی تو نہیں دیکھا تھا۔ بھلا اس کا ناپختہ شعور کوئی اہم اور بروقت فیصلہ کس طرح کرتا۔ مجبوراً رمیش نے وہ سب کچھ منظور کر لیا جو اس کے باپ کا فیصلہ اور حکم تھا، گو کہ اس کے مدنظر سسر کی مجبوری اور بے بسی بھی تھی۔

موسم بہار کی آمد تھی، شام ڈھلے رمیش نے گھر میں قدم رکھا اور حسب عادت اپنی تنخواہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دی، اور خود اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی بیوی منتظر تھی۔ تب ہی رمیش کی ماں کے ہونٹ ہلے۔

" بہو کے لچھن بتا رہے ہیں بھگوان نے چاہا تو بہو کے لڑکا ہی ہوگا۔"

" رمیش کی ماں! لڑکی تو بھاگوں کے ہوتی ہے" پاس ہی

بیٹھے ہوئے رمیش کے باپ نے اپنی عینک کا ڈورا کان پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

" دیکھا نہیں ہمارے چھ لڑکے ہوئے، لڑکی ایک بھی نہیں۔" اوران کی آنکھوں میں بڑھتی ہوئی چمک ایک دم مایوسی میں بدل گئی۔ مری ہوئی آواز میں بولے۔"

" یہ بھگوان کی اچھا کہ ان کو عمر نہیں دی۔ اگر آج سب زندہ ہوتے ...." اور وہ آگے کچھ نہ بول سکے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئے۔

" ہے بھگوان یہ سب تری لیلا ہے۔ چھ بیٹوں کی کمائی سے گھر بھر جاتا۔" یہ کہتے ہوئے رمیش کی بوڑھی ماں کی آواز اور بوڑھی ہو گئی۔

ان دنوں رمیش کی بیوی سب کے واسطے ہاتھ کا چھالا بنی ہوئی تھی۔ ساس تو ہل کر پانی بھی نہیں پینے دیتی۔ رمیش کے والدین بہو کو دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں سماتے۔ ساس ، سسر ہر وقت ناز برداری میں مصروف نظر آتے۔ اور بہو کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہوتے جیسے مہاجن سود کی کمائی سے تجوری کو بھرتا دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہوتا ہے۔ بہو بھی ان دنوں کسی تجوری کی طرح بھاری بھرکم چوڑی چکلی ہو رہی تھی لیکن اس تجوری کی چابی وقت کے ہاتھ میں تھی اور اس تجوری میں رمیش سمیت اس کے والدین کی آرزوئیں بند تھیں۔ اور جب وقت کی چابی تجوری کے تالے میں گھومی تو سب سر تھام کر بیٹھ گئے۔

" لڑکی مبارک ہو، آپ کی بہو کے لڑکی ہوئی ہے۔"

مڈوائف نے پیام مسرت دیا۔

"ہے بھگوان ـــــ !" رمیش کی ماں پر جیسے بجلی گر پڑی۔

جہاں ڈھول اور تاشوں کا انتظام تھا، وہاں شمسان جیسی خاموشی اور سناٹا چھا گیا۔ لڑکی کی خبر سن کر جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔

" رمیش ـــ ! اپنی سسرال کہلا بھیجو کہ چھو چک کا پربندھ کرلیں۔" رمیش کے باپ نے جیسے پہلے ہی سود در سود کا حساب لگا لیا تھا۔

رمیش کے گھر ایک کے بعد ایک چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ وہ ٹوٹ گیا، لیکن ہمت نہ ہاری۔ کبھی کبھی وہ سوچتا چار لڑکیوں کا مطلب ہوا کم از کم ایک لاکھ روپیہ۔ اور یہ سوچ کر وہ بدحواس ہو جاتا۔ ایک لاکھ روپیہ تو اس کے باپ نے بھی پوری عمر میں نہیں کمایا تھا۔

اولاد کی کثرت، قلیل آمدنی اور روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی نے رمیش کو اپنی عمر سے کئی سال آگے ڈھکیل دیا تھا۔ لیکن وہ حالات سے برابر لڑتا رہا۔ اُس میں ابھی حوصلہ باقی تھا، وہ کسی فرض شناس سپاہی کی طرح میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔

رمیش کی ماں تو پوتے کا ارمان لئے پرلوک سدھار گئیں لیکن باپ کی موجودگی نے گھریلو حالات کو اور تلخ بنا دیا تھا، جو بہو کبھی ساکشات لکشمی تھی وہ اب ابھاگن اور کلچھنی تھی۔ رمیش کی بیوی کا دوش صرف اتنا تھا کہ وہ ابھی تک ایک لڑکے کو جنم نہ دے سکی تھی۔ اور اس جرم کی سزا میں اسکا معذور سسر اسکو اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیا کرتا۔ لیکن یہ بہو کی شرافت یا پھر بزدلی تھی کہ وہ کبھی کسی گالی کا جواب نہ دیتی۔ اور وہ جواب دیتی بھی کیسے ؟ وہ تو بھارتیہ آدرش ناری تھی، جس کو دان کیا جاتا ہے اور دان کی جانے والی ہر چیز حقیر ہوا کرتی ہے۔ وہ تو گالیاں سن خاموش رہتی۔ البتہ رمیش کبھی کبھی اس کی جانب سے بول اٹھتا

" لڑکے کو جنم دینا بھی کیا انسان کے ہاتھ میں ہے ؟ جن کے لڑکے نہیں ہوتے وہ سب ابھاگے ہیں۔" رمیش پریشان ہوکر باپ سے کہتا ہے۔

بیٹے کی بات سُن کر اپاہج باپ کچھ نہ کہتا، لیکن نفرت سے تھوک دیتا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ جورو کے غلام تیرے ہی ونش کا انت ہو رہا ہے !

پھر رمیش باپ کو سمجھانے کوشش کرتا۔

" ہمارے دیش میں عورت کو دیوی کہا جاتا ہے، اور انیک روپ میں اس کی پوجا ہوتی ہے۔ اور آپ کی نظر میں عورت کلٹا ہے"

اتنا سن کر رمیش کا باپ چیخ اٹھتا۔ اور کہتا۔

" مورکھ یہ ہمارا ہی دوش ہے جو تجھ کو دو کتابیں پڑھوا دیں۔ چلا ہے جورد کا پاٹ لینے۔"

رمیش کی بڑی لڑکی سُمن نے ہائی اسکول امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ وہ اس کی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ سُمن کا رجحان تعلیم کی جانب دیکھتے ہوئے رمیش بھی یہی چاہتا تھا کہ سُمن کی تعلیم جاری رہے۔ لیکن وہ حالات سے مجبور تھا، اس نے سوچا، کیوں نہ اپنے فنڈ سے کچھ رقم نکلوالے اور سُمن کی تعلیم جاری رکھے۔ وہ اسی کشمکش و پنج میں مبتلا تھا۔

رمیش کے گھر میں پہلا پتھر گرا تو اس کو احساس ہوا کہ اسکے گھر میں جواں سال درخت بھی ہے۔ وہ سوچ بچار میں تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ کبھی وہ سوچتا کیوں نہ سُمن کی تعلیم جاری رکھی جائے۔ پھر وہ زاویہ بدل کر غور کرتا، کیوں نہ فنڈ کی رقم سے سمن کے ہاتھ پیلے کردیئے جائیں۔ فیصلہ کرنا اس کے واسطے بیحد مشکل ہوگیا۔ وہ سوچتا عورت بھلے ہی دنیا کا بڑے سے بڑا معرکہ سر کرلے، علم وفن کے دریا بہادے لیکن اسکا آخری مقام؟ اسکا آخری مقام تو کسی سماجی دیوتا کے قدموں ہی میں ہوتا ہے۔ کہلائے گی وہ چرنوں کی داسی۔ یہ سوچ صرف رمیش ہی کی نہیں بلکہ سماج کے ہر اعلیٰ اور باشعور فرد کا یہی خیال ہے کہ عورت کی آخری معراج کسی مرد کے پلّو سے بندھنا ہے۔ رمیش نے بھی اسی روشنی میں فیصلہ کیا۔ بھلا جو کام کل کرنا ہے وہ آج ہی کیوں نہ کرلیا جائے

لڑکا برسر روزگار اور شکل وصورت کا بھلا۔ رمیش کو اپنے حالات بہتر ہونے کی کوئی امید نہ تھی، اس نے سُمن کے رشتے کی منظوری دے دی۔

گھڑی کا پینڈولم برابر ہل رہا تھا، اور سوئیاں اپنے محور پر ٹِک ٹِک کی آواز کے ساتھ گردش میں تھیں۔

سُمن کی بارات آئی۔ منڈپ میں دونوں جانب کے مہمان موجود تھے۔ ابتدائی کارروائی جاری تھی۔ سب ہنسی خوشی چل رہا تھا ــــ دولہا کے باپ نے رمیش کو ایک جانب لے جاکر کچھ کہا۔ کیا کہا اس کا علم تو سب کو نہ ہوسکا، لیکن یہ سب نے دیکھا کہ رمیش کا ہنستا ہوا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ لمحہ بھر میں رمیش پر کیا گذری یہ تو اسی کا دل جانتا ہے۔ لیکن بظاہر وہ یرقان کا مریض نظر آنے لگا تھا۔ وہ دولہا کے باپ کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔

گھڑی جس کا کام صرف وقت کو دُہرانا ہے، اس کی سوئیاں گردش کرتے کرتے ایک خاص مقام پر آگئی تھیں۔

رمیش نے اپنی پگڑی اتار کر ہونے والے سمدھی کے پیروں پر ڈال دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے رمیش کے باپ کے قدموں پر اس کے سسر نے اپنی پگڑی ڈالی تھی۔ رمیش اس وقت دولہا کے روپ میں بے بس خاموش کھڑا تھا۔ دولہا تو آج بھی خاموش تماشائی ہے۔ لیکن کل کا دولہا آج لڑکی کے باپ کے روپ میں بے بس اور لاچار ہے۔

رمیش بھری محفل میں دولہا کے باپ سے منت سماجت کرتا رہا جیسے کوئی بھکاری کسی سنگ دل کے روبرو بار بار التجا کرتا ہے۔ وہ بدحواسی کے عالم میں کانپ رہا تھا۔ شاید اس کو علم تھا کہ اگلے پل کیا ہونے والا ہے، لیکن وہ آنے والے خطرے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھا۔ جیسے تباہ شدہ کشتی کا مسافر ٹوٹے تختے کے سہارے سمندر پار کرنے کی آخری سانس تک جدوجہد کرتا ہے۔

مہورت کے حساب سے شُبھ گھڑی ٹل گئی تھی۔ منڈپ میں چھپی پوترا گنی جو دو دلوں کے ملاپ کے واسطے ہوتی ہے۔ رمیش کی عزت اور ارمانوں کو بھسم کرکے شانت ہوچکی تھی۔ پنڈت کی زبان سے پوتر منتروں کا بہتا دھارا خشک ہوگیا تھا۔ اور معصوم سُمن کے بھاگیہ کی دھرتی چٹیل میدان کی طرح نظر آنے لگی۔

رمیش کی آنکھوں کے سامنے ماضی کا ایک ایک پل اسطرح گذر رہا تھا جیسے اسٹیشن چھوڑتے وقت سگنل کے پول سے ٹرین کا ایک ایک ڈبہ گذرتا ہے۔ اس کی قوت گویائی سلب ہوچکی تھی۔ لیکن اس کا ضمیر اس کو برابر کچوکے دے رہا تھا۔ کاش میں اس وقت کا ہیرو نہ بنا ہوتا! کاش میں نے بزرگوں کے احترام اور حالات سے چشم پوشی میں فرق کیا ہوتا!! مجرم تو میں خود ہی ہوں!!

(باقی ص۴۸ پر)

غزل

قائد حسین کوثر

۸۸/۳۹۹ چمن گنج۔ کان پور

پیر سے لپٹی یہ زنجیر سفر آور ہو
ہاں! یہ ممکن ہے کہ صحرا بھی شجر آور ہو

سوچتا ہوں نہ بکھر جائے کہیں شب کا طلسم
ایک ڈوبا ہوا تارا نہ سحر آور ہو

بے حسی برف کی مانند جمی چہرے پر
کیا پتہ سنگِ ملامت ہی شرر آور ہو

کیا ضروری ہے کوئی تاج محل ہو تعمیر
دھوپ میں تپتا ہوا خواب ثمر آور ہو

یہ سمجھ لو کہ یہاں معاملہ فہمی ہے بہت
ہمنوائی میں اٹھا ہاتھ ضرر آور ہو

ایک بے نام سے جذبہ کو ملا کیا عنواں
میں نے جس دشت کو چھانا وہ خبر آور ہو

حبیب الہ آبادی

۸۳۔ سی شجاعت گنج۔ کان پور

نواحِ خاک سے دشتِ بدن تک
سروں کا سلسلہ دار و رسن تک

نظر آتا ہے خوں آلود منظر
لباسِ وقت سے لے کر کفن تک

مری پیمائشِ قد غیر ممکن
قدم میرا ہے دھرتی سے گگن تک

مرے ہی اشک میرے کام آئے
ہوا خوش رنگ میرا پیرہن تک

ہواؤں کی رسائی ہو نہ پائی
کسی پژمردہ سورج کی کرن تک

حبیب اک دن جو آجائے عجب کیا
قدم کی دھول ماتھے کی شکن تک

گروبخش سنگھ بہار

نزد مندر بیجی لال۔ گاندھی نگر
تکلا گنج۔ گنگا گھاٹ۔ اناؤ

تری محفل نہ میری بات کا رنگ
کیا عجب شے غمِ حیات کا رنگ

زندگی کی سفید چادر کو
دے گیا کون حادثات کا رنگ

رنگ اس کے ظہور کا ہے سب
ورنہ کیا شے ہے کائنات کا رنگ

غنچہ و گل، صبا، دھنک، بجلی
سب نے لوٹا تری صفات کا رنگ

میری قسمت کی، تیری زلفوں کی
بات کچھ کہہ گیا ہے رات کا رنگ

میری نظروں میں ایک سا ہے بہار
وہ فنا کا ہو یا ثبات کا رنگ

اداریہ

اتر پردیش کا نیا ترقیاتی منظرنامہ

حصول آزادی کے بعد گذشتہ چالیس برسوں میں اتر پردیش کی ایک نئی تصویر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ یہ ان دبے کچلے طبقوں کی مخلصانہ خدمت کے سبب ممکن ہو سکا ہے، جنھیں بابائے قوم مہاتما گاندھی نہ صرف یہ کہ بے حد اہمیت دیتے تھے، بلکہ روحانی نقطۂ نظر سے بھی لائق احترام سمجھتے تھے۔

یہ بھی حکومت کی پر عزم کوششوں کے سبب ہی ممکن ہو سکا کہ اتر پردیش نے ۲۰ نکاتی پروگرام کی عمل آوری میں مسلسل چوتھی مرتبہ تمام ملک میں اولین مقام حاصل کیا۔ حکومت نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ کمزور طبقوں کی معاشی ترقی اور ان کے لیے سماجی انصاف کے بندوبست سے بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

اس سال کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ کافی عرصے سے بے اثر اور بے عمل رہنے والے جمہوری اداروں میں اس سال ایک نئی روح پھونکی گئی جس کے نتیجے میں مجموعی سماجی و اجتماعی ہیئت میں انقلابی تبدیلی آئی ہے، اور لوگوں میں اپنی معاشی فلاح و ترقی کے تئیں یقین و اعتماد کا ایک نیا جذبہ پیدا ہوا ہے۔

اسی مدت میں سہ منزلہ پنچایتی راج اداروں کے انتخابات مکمل ہوئے، تمام ۳۹۱۴، گاؤں سبھاؤں میں امید کی ایک نئی کرن پیدا ہوئی۔ منطقائی کمیٹیوں اور ضلع پریشدوں کے انتخابات سے جمہوری روایات کو زبردست تقویت حاصل ہوئی۔

اتر پردیش نے جو خاتمۂ زمینداری کے سلسلے میں بھی سرفہرست رہا تھا۔ پنچایتی راج نظام کو مستحکم اور طاقتور بنانے میں بھی تمام ملک کی رہنمائی کی۔ اتر پردیش نے ۲۸٫۳۰ کروڑ روپئے کی مال گذاری گاؤں سبھاؤں کو سونپنے میں بھی سبقت حاصل کی۔ اس رقم کی وصولی کی ذمے داری بھی گاؤں سبھاؤں کے سپرد کی گئی ہے۔ حکومت نے پنچایت راج کے مختلف کاموں کے لئے اپنے مالیاتی تعاون کا حصہ بھی بڑھا کر ۹۰ فی صد کر دیا ہے، اور گاؤں سبھاؤں کا حصہ پراجکٹ لاگت کے ۲۵٫۵۰ فی صد سے گھٹا کر صرف دس فی صد کر دیا ہے۔

چونسٹھویں آئینی ترمیمی بل کے توسط سے گاؤں، بلاک، اور ضلع کی سطحوں پر پنچایت راج اداروں کو آئینی تحفظ دیا گیا ہے۔ اس بل میں پارلیمنٹ اور اسمبلی کے انتخابات کی طرح ان اداروں کے براہ راست انتخابات بھی باقاعدہ کرانے کا بندوبست ہے۔

بل کے مطابق اتر پردیش میں پنچایتوں میں اقوام و قبائل درج فہرست اور خواتین کی نمائندگی کا بندوبست بھی کیا گیا ہے پنچایتوں کو ٹیکس لگانے، ٹول اور دیگر نوعیت کی وصولیابی

(باقی ص ۲۳ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرے کیلئے ہر کتاب کے ۲ نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "نغمۂ نور"

شاعر: ڈاکٹر ہنومان پرشاد سریواستوا جگر بستوی

قیمت: ۱۴ روپے

ملنے کا پتہ: پکوڑا کوٹھی کاماتا پرشاد مارگ۔ بستی

ڈاکٹر ہنومان پرشاد سریواستو جگر بستوی ایک معمر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنا دیوان "نغمۂ نور" قدما کی روش اختیار کرتے ہوئے اس وقت شائع کروایا ہے جب وہ فکر اور فن دونوں کی پختگی کی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ یوں تو یہ دیوان مختلف اصنافِ سخن کے نمونوں کا حامل ہے، مثلاً اس میں ایک نوحہ (بر وفات زوجۂ شاعر)' ایک سلام (بحضور شہید کربلا رض)، دو نعتیں، گیارہ نظمیں اور چھ قطعات بھی شامل ہیں۔ لیکن اس کے بیشتر صفحات غزلیات پر مشتمل ہیں، جن کی تعداد اڑسٹھ ہے جو دیگر تمام اصناف کے نمونوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ بنیادی طور پر جگر بستوی غزل کے شاعر ہیں اور ان کی غزلیں ہی ان کے فن کی پرکھ کی اصل کسوٹی ہیں۔

ڈاکٹر جگر بستوی کا انداز غزل گوئی مکمل طور پر کلاسیکی ہے ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد اور جدیدیت کے رجحان کے عروج کے ساتھ صنف غزل کی لفظیات میں جو زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں ان سے جگر بستوی بالکل ہی متاثر نہ ہوئے اور انھوں نے اپنا کلاسیکی انداز کلام نہیں بدلا۔ وہ ببانگ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ ؎

ہم نہ بدلیں گے انداز اپنا جگر
آپ بدلیں زمانہ بدلتا رہے

جگر بستوی غزل کی قدیم مروجہ لفظیات کے فنکارانہ استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کے پرانے علامتی الفاظ ہی سے اپنی غزل گوئی کا محل سجایا ہے لیکن انھیں الفاظ کے سہارے وہ ہر طرح کے موضوعات کا احاطہ کر لینے کا فن جانتے ہیں، خمریات سے تعلق رکھنے والے الفاظ — جام، پیمانہ، ساغر، خم، مینا میکش، ساقی، میکدہ، میخانہ، بادہ، شراب وغیرہ — ان کے سب سے محبوب الفاظ ہیں اور "نغمۂ نور" میں ان الفاظ کے حامل اشعار اگر گنے جائیں تو تعداد میں سب سے زیادہ نکلیں گے۔

مجروح سلطان پوری نے اس دیوان کے پیش لفظ میں صرف صرف اسی نوع کے کچھ اشعار کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور ان شعروں کے قابل تعریف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن انھوں نے اس نوع کے ایسے ہی اشعار اپنے تبصرے کے لیے منتخب کیے ہیں جن کے مضامین خالص خمریاتی ہیں۔ حالانکہ جگر بستوی کے اس قسم کے اشعار صرف پینے پلانے کے موضوع ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے خمریات سے تعلق رکھنے والے الفاظ کا ہمہ جہتی علامتی استعمال کیا ہے اور ان کی آڑ میں عشق مجازی سے عشق حقیقی تک اور مادی دنیا سے روحانی دنیا تک کے گوناگوں افکار و مسائل کو اشعار کا قالب عطا کیا ہے۔ یہی صورت ان کے کلام میں غزل کے دیگر قدیم مروجہ علامتی الفاظ کی بھی ہے۔ بہار و گلشن اور برق و آشیاں کی علامتیں ہوں یا کشتی و ساحل اور ناخدا و طوفان کے علائم، دیر و حرم اور شیخ و برہمن کی علامات ہوں یا جنون و صحرا اور جیب و دامن کے علامتی الفاظ، سب کے پردے میں جگر بستوی نے کلاسیکی غزل کے ایک ماہر فن کار کی طرح ہر قسم کے خیالات و موضوعات کو شعروں کے پیکر میں ڈھالا ہے۔

تغزل ڈاکٹر جگر بستوی کے کلام کی جان ہے۔ حسن و عشق کا وہ موضوع جو روز ازل سے غزل کا اہم ترین اور محبوب ترین موضوع رہا ہے، موصوف کی غزل گوئی کے آسمان پر بھی مست اور متوالی گھٹا کی طرح چھایا ہوا ہے۔ وہی معاملات محبت ہیں جو ہر غزل گو کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں، لیکن ایک اچھے اور کامیاب فن کار کی طرح

بستوی نے انھیں سادگی و پُرکاری کے ملے جلے انداز میں کچھ اس
ح ادا کیا ہے کہ ان میں ایک نیا نکھار آگیا ہے۔ مثال کے لیے ان
ے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دیکھ کر مجھ کو مسکرا کر رہ گئے
جب انھیں کچھ یاد آئی بھید کھُل جانے کی بات

اب چھپ نہ سکے گی مری بے تاب نگاہی
سب دیکھ رہے ہیں میں کدھر دیکھ رہا ہوں

جگر بستوی کی غزلوں کے فنی محاسن بھی جاذب توجہ ہیں اختصار
ے پیش نظر میں اس ضمن میں صرف ایک فنی خوبی کے ذکر پر اکتفا
وں گا۔ موصوف ایک ہی شعر میں اکثر پوری پوری بندش کی تکرار
س طرح کرتے ہیں کہ اگر کوئی ناپختہ کار اس کی جرأت کرے تو بہت
اعیب معلوم ہو لیکن ان کے شعر میں یہ تکرار لطف کے خزانے
ر دیتی ہے۔ مثلاً ؎

اک حادثۂ وقت ہے بربادیٔ گلشن
بربادیٔ گلشن کا سماں یاد نہیں کچھ

وہ پوچھ رہے ہیں مری رُودادِ محبّت
رودادِ محبّت مجھے اب یاد نہیں ہے

بندش کی تکرار کے علاوہ کبھی کبھی ایک ہی شعر میں کئی کئی
الفاظ پر مشتمل فقرے کی تکرار بھی وہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ
معر نگینے کی طرح دمک اٹھتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

کچھ یاد نہیں کب سے ہوں ویرانے میں آیا
کچھ یاد نہیں کب سے چمن بھول چکا ہوں

ڈاکٹر جگر بستوی کا دیوان "نغمۂ نور" ضخیم نہیں ہے لیکن
س میں اچھے شعروں کی تعداد کافی ہے۔ مجروح سلطان پوری نے
یوان مذکور کے پیش لفظ میں یہ درست فرمایا ہے کہ "ایسے اشعار
آپ کو متوجہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے اس دیوان میں ڈھیروں ملیں گے۔"

——— ڈاکٹر اختر بستوی

نام کتاب: "پیش رو" (سہ ماہی) پہلا شمارہ
مرتبین: انور پاشا، ابرار رحمانی، ابواللیث شمسی، شریف احمد قریشی،
منظر مہدی۔
ملنے کا پتہ: توحید اختر، ۱۵۵۔ کاویری ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی ۶۷
قیمت: فی شمارہ ۶ روپے

چند آشفتہ سر نوجوانوں نے جو تعلیمی زندگی کی آخری منزل اور عملی زندگی کی ابتدائی منزل کے بیچ میں معلق ہیں، اپنے سپنوں کو ساکار کرنے کے لیے اس ادبی پرچے کا اجرا کیا ہے۔ یہ سپنے وہی ہیں جو ہندستان کا تقریباً ہر نوجوان اپنی طالب علمی کی زندگی کے دوران دیکھتا ہے۔ یعنی ایک خوش حال معاشرہ، جس میں اس کو سر چھپانے کے لیے مکان، پیٹ بھرنے کے لیے دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا مہیا ہو۔ لیکن..... اس سپنے کے ساکار ہونے کی راہ میں متعدد مسائل درپیش رہے ہیں۔ ان نوجوانوں نے ان مسائل سے نپٹنے کے لیے گراس روٹ پر کام کرنے کا عزم کیا ہے اور عوام میں بیداری پیدا کر کے انھیں ان مسائل کے مدِ مقابل صف آرا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سہ ماہی جریدے میں سماجی، معاشی اور تعلیمی مسائل پر مضامین زیادہ ہیں جو قارئین کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتے ہیں اور انھیں کچھ کر گزرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اطمینان کا باعث ہے کہ اس پرچے میں اُردو زبان و ادب کی روایتوں کا بھی پاس و لحاظ رکھا گیا ہے اور عام قاری کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور اس کے ذوق کی تسکین کے لیے اس میں معیاری افسانے، نظمیں غزلیں اور مضامین شامل ہیں۔ مثال کے طور پر زیر نظر شمارے میں جو ان نوجوانوں کی پہلی کوشش ہے ——— جہاں ہندستان کے موجودہ حالات اور عصری مسائل وغیرہ پر مضامین شامل ہیں وہیں رتن سنگھ، ظفر پیامی کی کہانیوں مجروح سلطان پوری، شہاب جعفری، شریف احمد قریشی کی غزلوں

اور نظموں کے ساتھ سعادت حسن منٹو اور مجروح سلطان پوری پر خوبصورت مضامین بھی موجود ہیں۔

امید ہے کہ یہ پرچہ اپنے مواد اور اس کی پیش کش کی وجہ سے نہ صرف ادبی اور علمی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا بلکہ اُردو کا ہر سنجیدہ قاری اس کی پذیرائی کریگا

فوٹو آفسیٹ کی خوبصورت طباعت اور معیاری کتابت بھی اس پرچے کو قبول عام بخشنے میں معاون ثابت ہوگی۔

—— نجیب انصاری

قدسی کی نعت

ص ۱۶ کا بقیہ

حواشی

۱۔ انتخاب رمزی ص ۱۵۶	۲۔ تذکرۂ نادر ص ۱۲
۳۔ سراپا سخن ص ۱۸۴	۴۔ سخنِ شعراء ص ۲۸۴
۵۔ نظم آخریں	۶۔ نقدادبیات فارسی ص ۱۰۳ تا ص ۱۰۴
۷۔ حدیث قدسی ص ۶۳	۸۔ گلستان سخن ص ۳۶۴
۹۔ متعلقات غالب ص ۱۴ و مابعد	۱۰۔ گلستان سخن ص ۱۶۹
۱۱۔ متعلقات غالب ص ۲۰ و مابعد	۱۲۔ متعلقات غالب ص ۲۷
۱۳۔ نقدادبیات فارسی ص ۹۹ تا ص ۱۰۱	۱۴۔ " " ص ۲۶
۱۵۔ " " ص ۹۶	۱۶۔ " " ص ۲۹
۱۷۔ متعلقات غالب ص ۲۹	۱۸۔ نقدادبیات فارسی ص ۹۴

مآخذ

(۱) انتخاب رمزی مرتبہ محمد انصار اللہ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۸۱ء

(۲) تذکرۂ نادر " پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۷ء

(۳) سخن شعراء مؤلفہ ڈپٹی عبدالغفور خاں نسّاخ یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

(۴) سراپا سخن مؤلفہ سید محسن علی محسن موسوی مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۸ء

(۵) صہبائی، ایک مختصر تعارف مؤلفہ محمد انصار اللہ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۸۶ء

(۶) گلستانِ سخن مؤلفہ مرزا قادر بخش صابر دہلوی یو، پی اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

(۷) متعلقاتِ غالب مؤلفہ کالی داس گپتا رضا وِکل پبلی کیشنز بمبئی ۱۹۷۸ء

(۸) نظم آخریں: یعنی میر رشک کا تیسرا دیوان مرتبہ محمد انصار اللہ علی گڑھ (قلمی)

(۹) نقدادبیات فارسی مؤلفہ ڈاکٹر سمیع الدین مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۴ء

بازگشت

...... ص ۳۴ کا بقیہ

رمیش کی اداس آنکھیں جن میں اب حسرت دیاس کے علاوہ کچھ نہ تھا، دیوار پر ٹنگی اس گھڑی پر مرکوز تھیں جو اس کی بیوی جہیز میں لائی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں ایک مقام پر آکر آپس میں گڈمڈ ہوگئیں —— وقت کسی پر رحم نہیں کرتا —— اور پھر رمیش کی آنکھیں شاید پتھرا گئیں —— وقت اب اس کے واسطے بے مقصد تھا۔ سیکنڈ کی سوئی ٹِک ٹِک کی آواز کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ یعنی ہر پل ایک رمیش، ایک شمن اور پھر ایک نیا چیلنج۔

اپنے معاونین سے : اشاعت کی غرض سے

اپنی شعری و نثری تخلیقات کی اصل کاپی ہی ارسال کریں، فوٹو اسٹیٹ یا کاربن کاپی قابل قبول نہ ہوگی۔

* جواب طلب امور کے لیے اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ ضرور ارسال کریں
* اشاعت کیلئے جو بھی شعری یا نثری تخلیق ارسال کریں اس کی نقل اپنے پاس ضرور محفوظ کرلیں۔

—— ایڈیٹر

عنوانات

جلد ۴۴ | نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۸۹ء

(ایکٹنگ) ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون: ۴۳۰۵۹ / ۴۷۱۰۸

پبلشر: اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

اپنی بات

بابائے قوم مہاتما گاندھی نے جہاں اور مسائل کے سلسلے میں ملک وقوم کی رہنمائی کی، وہیں انھوں نے زبان کے مسئلے پر بھی مختلف موقعوں پر اظہار خیال کیا اور ایک راستہ دکھایا۔ وہ ہندی اور اُردو دونوں کے تہذیبی وسماجی پس منظر، ان زبانوں کی تاریخ اور ان کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندی اور اُردو ہی اس ملک میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانیں ہیں اسی لیے وہ ان دونوں زبانوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے اور ان دونوں زبانوں کو فروغ دینے پر انھوں نے بہت زور دیا۔

راشٹر بھاشا پرچار سمیتی کے ٹیچرس ٹریننگ اسکول وار دھا میں تربیت حاصل کرنے والوں کو خطاب کرتے ہوئے ۲۴ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو گاندھی جی نے کہا تھا، "قومی زبان کے پرچارکوں کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں پر پوری قدرت ہونی چاہیے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا تب تک آپ سچے راشٹر بھاشا پرچارک نہ بن سکیں گے۔"

اسی طرح ۲۵ر جنوری ۱۹۴۶ء کو انھوں نے مدراس میں دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کی سلور جبلی کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:-

"اگر ہم اپنے کو ہندستانی کہتے ہیں اور ہندستانی بننا اور کہنا چاہتے ہیں، تو میرا اور آپ کا فرض ہے کہ ہم دونوں لکھاوٹوں میں ہندستانی زبان سیکھیں۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ گاندھی جی دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں کی بقاء تحفظ اور ترقی پر ہمیشہ زور دیتے رہے۔ وہ ان لوگوں سے متفق نہیں تھے جو ہندی اور اُردو میں سے کسی ایک زبان کی حمایت کرتے ہیں اور دوسری کے مخالف ہیں۔

انھوں نے "ہریجن" کی ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا، "میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو محض اُردو یا محض ہندی کے باقی رہنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ تصور ایک خواب اور ایک ناپاک خواب ہی بنا رہے گا۔ تلسی اور سور داس کی زبان فنا نہیں ہو سکتی اور اس طرح وہ زبان بھی مٹ نہیں سکتی جس میں شبلی لکھا کرتے تھے۔"

"ہریجن" کی ۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں انھوں نے لکھا تھا "ہندی اور اُردو دو بہنیں ہیں۔ پھر ان کے باہمی میل جول میں کیا حرج ہے..... میں کسی بھی ایسے فرد کو نہیں جانتا جس نے اُردو لکھاوٹ پر زور دیے جانے کی وجہ سے کوئی لکھاوٹ سیکھنا چھوڑ دیا ہو اور مجھے ایسا کوئی اندیشہ نہیں کہ کبھی بھی ایسا ہوگا۔"

گاندھی جی کے یہ خیالات آج بھی لسانی اتحاد اور قومی یک جہتی کے سلسلے میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عملی زندگی میں ان گرانقدر خیالات پر کاربند رہیں تبھی ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کو وہ فروغ حاصل ہو سکے گا جس کی وہ مستحق ہیں۔

□ وزیر اعلا اتر پردیش شری نرائن دت تیواری کی سربراہی میں ریاستی کابینہ نے اُردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کا زبردست خیر مقدم ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بعض اہم اردو اخبارات نے جو ردعمل ظاہر کیا ہے وہ مختصراً اس طرح ہے :

معاصر "قومی آواز" (لکھنؤ) نے ۱۴ر ستمبر کو اپنے اداریہ میں لکھا ہے کہ "وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری اور ان کے کابینی ساتھی، نیز اُردو کے حقوق کی بحالی کے لیے جدو جہد کرنے والے اور اس کی بقا و ترقی سے دلچسپی رکھنے والے تمام ادارے اور افراد ایک پرانے وعدے کے ایفا اور ایک لمبی جدو جہد کی کامیابی کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

روزنامہ عزائم (لکھنؤ) نے بھی ۱۴ر ستمبر کو اپنے اداریے میں لکھا کہ، "یہ فیصلہ بہت جرأت مندانہ ہے۔ اس کی تعریف و اعتراف کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہ ایک بڑی ناسپاسی ہوگی اگر قومی سیاست میں لسانی تنگ نظری اور فرقہ واریت پر اس دلیرانہ وار کی داد نہ دی جائے۔"

(باقی ص ۴۴ پر)

شین قاف

بابائے قوم مہاتما گاندھی

ناوک حمزہ پوری
پوسٹ شیرگھاٹی
گیا

وہ اک درویش جو آیا تھا لے کے دیدۂ بینا
وہ جس کا دل مصفّا، سینہ جس کا مثلِ آئینا

وہ جس نے دانشِ افرنگ کے افسوں کو توڑا تھا
وہ جس نے آمریت کی کلائی کو مروڑا تھا

وہ جس نے وقت کی اُلجھی ہوئی زُلفیں سنواری تھیں
وہ جس کو حریت کی نعمتیں دل سے پیاری تھیں

وہ نفرت سے جسے نفرت تھی، اُلفت کا پیامی تھا
تشدّد سے جو تھا بیزار اہنسا کا جو حامی تھا

شرافت کا جو پیکر تھا، صداقت کا پجاری تھا
وہ امن و آشتی کا جذبہ جس کے دل میں ساری تھا

وہ جو عدل و مساوات و اخوت کا مبلغ تھا
پیامی صلحِ کُل کا تھا، محبت کا مبلغ تھا

برہمن اور ہریجن جس کی آنکھوں میں برابر تھے
وہ جس کے آگے ہندو اور مسلم سب برادر تھے

وہ جس نے خوبیِ تدبیر و سحرِ خوش کلامی سے
کرایا ہند کو آزاد غیروں کی غلامی سے

پیامِ امن و صلح و آشتی ہے فلسفہ اس کا
سراپا زندگی ہی زندگی ہے فلسفہ اس کا

لہو سے اپنے ہندوستاں کو بخشی زندگی جس نے
وطن کی راہ میں قربان کردی زندگی جس نے

اسی درویش خود آگاہ کو کہتے ہیں ہم گاندھی
رہیں گے چشمِ دُنیا میں ہمیشہ محترم گاندھی

کردی حقِ انساں کی بحالی اس نے

مہدی پرتاپ گڑھی
معرفت ایگزیکیوٹیو انجینیر
ایری گیشن ڈویژن
پرتاپ گڑھ

جو طبقے تھے پسماندہ اٹھایا اُن کو
سوئے تھے جو غفلت میں، جگایا اُن کو
قسطوں میں رہا جن کا مقدّر مرنا
جینے کا نیا طور سکھایا اُن کو

وہ ہم کو سکھاتا رہا جینے کا ہُنر
بے خوف گیا آگ کے دریا سے گزُر
ہر ظُلم، ہر اک جَور کو جھیلا اس نے
اور دے گیا آزادی کا خوش رنگ ثمر

بیدار رہا، کرتا رہا رکھوالی
مطلوب وطن کی تھی اسے خوشحالی
گُل ہی نہیں کانٹوں سے بھی تھا پیار اُسے
وہ تھا چمنِ ہند کا ایسا مالی

بھارت کو بنا دیا مثالی اس نے
کردی حق انساں کی بحالی اس نے
جس میں کہ تشدد کی نہ تھی گنجائش
اک راہ نئی ایسی نکالی اس نے

عابد سہیل

نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ
امین آباد، لکھنؤ

اردو ایک خوش آئند فیصلہ

اردو کو اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ ملک میں جمہوریت کی بقا اور مقابلہ آرائی کے بجائے مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کی جانب ایک نہایت بروقت، دانشمندانہ اور جری قدم ہے۔ یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جس کے اثرات صرف کسی مخصوص زبان کے بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ اس سے ملک میں ایک ایسے منظرنامہ کے فروغ میں مدد ملے گی جو کئی رنگوں، کئی تہذیبوں اور کئی ثقافتوں سے عبارت ہے۔

ہندی ملک کی مختلف ریاستوں کے درمیان رابطہ کی زبان ہے اور شمالی ہندستان کی متعدد ریاستوں کی سرکاری زبان۔ ان ریاستوں کے اسکول، کالج اور یونیورسٹی جانے والی تقریباً ساری آبادی ہندی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ وہ لاکھوں کروڑوں لوگ بھی جن کی مادری زبان اور گھر میں بولی جانے والی زبان اُردو ہے، ہندی جانتے، سمجھتے اور لکھتے پڑھتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور جاری رہنا بھی چاہیے۔

اُردو کی ترقی ہندی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے نہ بنے گی بلکہ اس کے پھیلاؤ میں مددگار ثابت ہوگی، ان علاقوں میں جہاں اس کی مخالفت ہوتی ہے، مخالفت کی دھار کو کُند کرے گی۔ کیونکہ ملک میں بمشکل ہی کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں اُردو بولنے والوں کی قابلِ ذکر تعداد نہ ہو۔ اس طرح اُردو پورے ملک میں ایک ایسا ماحول تیار کرنے میں مدد دے گی جس میں ہندی کو زیادہ سے زیادہ قبولِ عام حاصل ہوگا۔

ہندی اور اردو ہندستان کی دو ایسی زبانیں ہیں جن کے درمیان وہی رشتہ ہے جو دو سگی بہنوں کے درمیان ہوتا ہے۔ دونوں زبانوں کی نشو و نما کی بنیاد کھڑی بولی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بس اتنی ہی جُدا ہیں جتنی ایک درخت کی دو شاخیں ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں۔

ہندی ملک کے رابطہ کی زبان بھی ہے۔ رابطہ کی زبان کا کام دلوں کو توڑنا نہیں بلکہ جوڑنا ہوتا ہے کیونکہ رابطہ دلوں کے جوڑنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ رابطہ کسی چیز کا انہدام نہیں کرتا، علاوہ دُوریوں کے۔ کسی چیز کی نفی نہیں کرتا، علاوہ نفرتوں کے۔ بلکہ تعمیر کرتا ہے، ملاتا ہے، جوڑتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندی یہ عظیم کام اور بھی زیادہ سرگرمی سے انجام دے گی کیونکہ سوادِ منزل تک یہی راستہ جاتا ہے، کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

ہندی کے ساتھ اُردو بھی اس ملک کی ایک عظیم زبان ہے جس کی سات آٹھ سو سال کی تاریخ وطن عزیز کے موسموں، خوشبوؤں، پھولوں سگندھ اور چڑیوں کی چہکار سے مالا مال ہے۔ امیر خسرو سے لے کر، جن کی شاعری سے زیادہ کسی ملک کی تہذیب و ثقافت کا اظہار دنیا کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہوا ہے۔ میر، غالب، اقبال، پریم چند، برج نرائن چکبست، دیاشنکر نسیم، انیس، منٹو، راجندر سنگھ

بیدی، کرشن چندر، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری تک، ہندستان کی زندگی کا کون سا پہلو ہے جس کی جلوہ گری اس میں نہیں، مسرت کا کون سا لمحہ ہے جس سے اس کا دامن سرشار نہیں اور غم و اندوہ کا وہ کون سا آنسو ہے جو اس کی آستین کو بھگو نہیں گیا۔ پہلی جنگ آزادی میں ہزاروں ماؤں کی سونی ہو جانے والی گودیں ہوں یا ہزاروں عورتوں کی اجڑنے والی مانگ۔ انگریزوں کا جبر و استبداد ہو یا جنگ آزادی کی لاثانی قربانیاں یا آزادی کے جلو میں پروان چڑھنے والا خاک و خون کا سیلاب۔ آپ جب بھی پلٹ کر دیکھیں گے اس زبان اور اس کے ادب کو اپنا ہم رکاب پائیں گے۔

ہندی کے شانہ بشانہ اُردو بھی ملک کی ترقی، اس کی جمہوریت کی بقا، اس کے سیکولر اور سماج وادی کردار کی فتوحات میں ہاتھ بٹائے گی۔

وزیر اعلا کے اس اعلان نے کہ اُردو کو ریاست میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے ایک بل اسمبلی کے اگلے اجلاس میں پیش کیا جائے گا، اُردو کے حامیوں اور جمہوری اقدار کے پاسداروں میں جوش و خروش اور مسرت کی لہر دوڑا دی ہے اور ریاستی حکومت کی کابینہ کے فیصلے کا خیر مقدم ریاست کے گوشے گوشے میں کیا جا رہا ہے۔ اس فیصلے پر مسرت کا اظہار کرنے والوں میں ہندی بولنے والے عوام، ہندی کے متعدد ادیب، اور درجنوں تنظیمیں شامل ہیں۔ ان سب نے حکومت کے فیصلے کو ایک تاریخ ساز قدم قرار دیا ہے۔

مشہور قوم پرست اخبار "قومی آواز" نے جس کے بانیوں میں پنڈت نہرو، اچاریہ نریندر دیو اور رفیع احمد قدوائی شامل ہیں اور جس کے بانی مدیر مشہور ادیب اور مجاہد آزادی حیات اللہ انصاری رہ چکے ہیں، اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے اداریہ مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ء میں لکھا ہے:

"یہ اندیشہ اب بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے کہ اُردو ہندی سے رقابت رکھتی ہے یا اس کو راج سنگھاسن سے ہٹانا چاہتی ہے اُردو کے شاعر، ادیب، دانش وروں میں سے کسی نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کہی، اور اس لیے اُردو کی جدوجہد کو ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں کے بولنے اور لکھنے پڑھنے والے فاضلوں کی حمایت حاصل ہو گئی جس کا ان لوگوں نے علی الاعلان اظہار بھی کر دیا۔"

ریاستی راجدھانی کے دوسرے باوقار روزنامہ "عزائم" کے اسی دن کے اداریہ میں ممتاز صحافی حسن واصف عثمانی نے اس فیصلہ کو جرأت مندانہ قرار دیا اور لسانی تنگ نظری اور فرقہ واریت پر دلیرانہ وار کے لیے وزیر اعلا کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وزیر اعلیٰ نرائن دت تیواری نے اس پریس کانفرنس میں یہ بات بہت اہم کہی ہے کہ یہ فیصلہ لوک سبھا کے آنے والے الکشن کے پیش نظر نہیں کیا گیا ہے اور نہ ۱۹۸۴ء کے الکشن مینی فسٹو میں درج وعدے کو پورا کرنے والا قدم ہے بلکہ یہ فیصلہ اس وعدے کو پورا کرتا ہے جو اس سے بھی پہلے ۱۹۸۰ء کے الکشن کے وقت حکمراں پارٹی نے اپنے الکشن مینی فسٹو میں کیا تھا۔

وزیر اعلیٰ شری تیواری نے اس طرح اپنے اقدام کو ایک اصولی اقدام کا درجہ دیا ہے اور یہی اس فیصلہ کو قومی سیاست میں ایک اہم اقدام بناتا ہے۔ الکشن سے پہلے کے وعدے پورے کرنے کے لیے نہیں ہوتے لیکن بہرحال اُردو کے سلسلے میں ۱۹۸۰ء کے الکشن سے پہلے کا وعدہ پورا کیا گیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔"

مندرجہ بالا پیراگراف کا یہ جملہ کہ "الکشن سے پہلے کے وعدے پورے کرنے کے لیے نہیں ہوتے" اس رجحان کی غمازی کرتا ہے جو ہماری جمہوریت کو گھن کی طرح تباہ کر سکتا ہے۔ جمہوریت کی بنیاد اکثریت کی حمایت پر ہے اور اکثریت کی حمایت کا اظہار عوام کے ووٹوں سے ہوتا ہے جس کا فیصلہ وہ کسی بھی جماعت کی ماضی کی کارکردگی اور مستقبل کے لیے پالیسیوں اور پروگراموں کی بنیاد پر کرتی ہے چنانچہ انتخابی منشور کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس بات پر اصرار کہ یہ اقدام ۱۹۸۴ء کے نہیں بلکہ ۱۹۸۰ء کے انتخابی منشور میں کیے جانے والے وعدے کو پورا کرنے کے لیے کیا گیا ہے اس بات کا اعتراف ہے کہ اگر وہ اس وعدے کو پورا کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہ ہوتی تو اسے ۱۹۸۴ء میں جب اس کی بظاہر کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی، دہرایا نہ جاتا۔

قطع نظر اس کے کہ اس فیصلہ سے اُردو کو اس کے حقوق ملنے کی توقع پیدا ہوئی ہے، جمہوریت اور ملکی سیاست کے پس منظر میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ رائے دہندگان کو اب اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ انتخابی منشور محض کسی فرد، طبقہ یا گروہ کو خوش کرنے کے لیے اور اس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پیش نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ پارٹی اس کے بارے میں سنجیدہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر سیاسی جماعت وعدے کرنے سے پہلے کئی بار سوچے گی کہ ان پر عمل درآمد ممکن بھی ہے یا نہیں اور یہ کہ یہ فیصلہ ملک کے طویل مدتی مفاد میں ہوگا یا نہیں۔ اسے یہ بھی خوف لگا رہے گا کہ اگر وہ اپنے وعدے پورے نہ کر سکی تو رائے دہندگان اپنی حمایت واپس بھی لے سکتے ہیں۔

اس فیصلے سے ملک میں جمہوریت، سیاست میں سنجیدگی اور انتخابات میں اصولوں، نقطۂ نظر، تصورات اور پروگراموں کی اہمیت میں اضافہ ہوگا اور جذبات کے بجائے سنجیدہ فکر کو جگہ ملے گی۔

اتر پردیش کی آبادی کے ایک بڑے طبقہ کے ایک مطالبہ کی تکمیل پر ان کی خوشی فطری ہے اور یہ خوشی اس لیے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ ان لوگوں کے ایک بڑے طبقہ نے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے لیکن ہر حق کچھ ذمہ داریاں بھی اپنے ساتھ لاتا ہے یہی اس فیصلہ کے بعد بھی ہوگا۔ حکومت نے اپنا وعدہ پورا کیا اب اپنا عہد پورا کرنے کا کام اُردو سے محبت کرنے والوں کا ہے۔ اس کام کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ نہایت تعمیری انداز میں حکومت کے فیصلہ پر عمل درآمد کے لیے سازگار فضا بنائی جائے اور دوسرا یہ کہ آبادی کے اس طبقے کے دل و دماغ سے جس میں شکوک گھر کر گئے ہیں شبہات دور کیے جائیں۔

ہندی اور اُردو کو ایک دوسرے کے مزید قریب لانا بھی اب اُردو کے حامیوں کا کام ہے۔ ہندی کے بیشتر ادیبوں نے پچھلے چالیس برسوں میں اُردو کی حمایت کر کے اپنا تاریخی فرض انجام دیا ہے جس کے لیے وہ ہماری اور جمہوریت اور قومی یک جہتی کی جانب سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مبارک باد کے مستحق اُردو والے بھی ہیں جنھوں نے اس دوران صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑے بغیر پُرامن، قانونی اور جمہوری طریقہ سے اپنے حق کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ اب وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کوششوں کو زیادہ تعمیری، زیادہ مثبت اور زیادہ بامقصد بنایا جائے۔

ہندی کے تقریباً سارے جرائد اُردو کے ادیبوں کی تخلیقات شائع کرتے ہیں۔ یہی حال اردو کے ادبی جرائد کا بھی ہے۔ لیکن اب یہ کام زیادہ منظم طریقہ سے ہونا چاہیے، اور پہل اردو والوں کو کرنی ہے۔ ہندی کے مختلف اصناف سخن، اہم ادیبوں اور شاعروں پر خصوصی نمبر اور گوشے شائع کر کے ہم اردو والے اس فضا کو زیادہ سے زیادہ سازگار اور زیادہ خوش گوار بنا سکتے ہیں جو ریاستی حکومت کے اس فیصلے سے پیدا ہوئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندی بھی اس کام میں پیچھے نہیں رہے گی۔

یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ حکومت اُردو کو دوسری سرکاری زبان تو بنا سکتی ہے، سہولتیں بھی دے سکتی ہے، اس کی تعلیم و تدریس کو عام کرنے کے لیے اقدام بھی کر سکتی ہے لیکن ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے والے، انھیں بروئے کار لانے والے اور

(باقی ص ۱۳ پر)

غزلیں

فضا ابن فیضی
جمال پورہ
مئوناتھ بھنجن

کیا خبر تھی، کربِ افزا کاہشیں دے جائے گا
اب کے یہ موسم بھی، سوکھی بارشیں دے جائے گا

تیر چٹکی میں سنبھالوں گا تو پیرِ آسماں
ہاتھ میں اُتری کماں سی خواہشیں دے جائے گا

خوش نہ ہونا مٹھیوں میں بھر کے تم سُورج کی دھوپ
ابر کا ٹکڑا، سُلگتی سازشیں دے جائے گا

کیا سفر میں کام دے گا حیلۂ درماندگی
دائرہ، نقطے کو اپنے گردشیں دے جائے گا

ماجرائے ذات خونِ دل سے لکھ! یہ مشغلہ
کالے کاغذ کو اُفق کی تابشیں دے جائے گا

تجربوں کا یہ عمل ہے، زندگی کی بازیافت
تجھ کو تیری بھولی بسری دانشیں دے جائے گا

یہ مرا خوش عقدہ ناخن، کُند آنا بھی نہیں
حرف کو تیرے ہنر کی کاوشیں دے جائے گا

یہ جو ہاتھوں میں قلم ہے، دستِ رعشہ دار سا
ایک دن تجھ کو عصا کی جنبشیں دے جائے گا

اک ذرا اسلوبِ غالب کا تتبع بھی فضا
تیرے لہجے کو نئی آرائشیں دے جائے گا

بشیر بدر
۶۶۔ مالی پورہ روڈ
پیرگیٹ۔ بھوپال

تیرا ہاتھ مرے کاندھے پر دریا بہتا جاتا ہے
کتنی خاموشی سے دُکھ کا موسم گزرا جاتا ہے

نیم پہ اُٹکے چاند کی پلکیں شبنم سے بھر جاتی ہیں
سونے گھر میں رات گئے جب کوئی آتا جاتا ہے

پہلے اینٹیں، پھر دروازے، اب کی چھت کی باری ہے
یادنگر میں ایک محل تھا وہ بھی گرتا جاتا ہے

راکھ ہوئیں آنکھوں کی شمعیں آنسو بھی بے نور ہوئے
دھیرے دھیرے میرا دل پتھر سا ہوتا جاتا ہے

اپنا دل ہے ایک پرندہ جس کے بازو ٹوٹے ہیں
حسرت سے بادل کو دیکھے بادل اُڑتا جاتا ہے

ساری رات برسنے والی بدلی کا میں آنچل ہوں
دن میں کانٹوں پر پھیلا کر مجھ کو کھینچا جاتا ہے

ہم نے تو بازار میں دُنیا بیچی اور خریدی ہے
ہم کو کیا معلوم کسی کو کیسے چاہا جاتا ہے

سلیمان اطہر جاوید
شعبۂ اردو
ایس۔ وی کالج تروپتی
آندھرا پردیش

قلم کی کاشت
ایک مطالعہ

محمد عثمان عارف نقشبندی، ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ایڈوکیٹ، سیاست داں، وزیر باتدبیر، گورنر، صوفی منش اور شاعر۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی یہ جہات ایک دوسرے کو متاثر کیے بغیر رفعتوں کی سمت رواں دواں ہیں۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی لائق ذکر ہے کہ ان کے ایڈوکیٹ، سیاست داں، صوفی اور وزیر کے موقف نے ان کی شاعرانہ مرتبت میں اضافہ شاید ہی کیا ہو، ہاں ان کی شاعری نے ان کی ان حیثیتوں کو اور جلا بخشی ہے۔ کچھ اور دلآویز اور محترم بنا دیا ہے۔ اپنی دیگر مصروفیات اور معاملات سے وابستگی کے باوصف عثمان عارف اپنی شاعری پر اتنی ہی توجہ دیتے ہیں جیسے نہ ان کی اور کوئی مصروفیت ہے اور نہ وہ کسی اور معاملہ سے وابستہ! یہ کچھ ایسی تعجب خیز بات بھی نہیں۔ بیشتر زبانوں میں ایسی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔ خود برصغیر میں امیر خسرو کا نام نامی اہمیت رکھتا ہے۔ تو ادھر عصر حاضر میں حسرت موہانی، فیض، مخدوم، وجد اور قاضی سلیم کے اسمائے گرامی لائق ذکر ہیں۔

عثمان عارف نے اپنی شاعری پر توجہ دینے کے باوجود اپنی دیگر ذمہ داریوں کے سبب خصوصاً اپنے کلام کی اشاعت پر ایسی اور اس قدر توجہ نہیں دی، اس لیے بحیثیت شاعر کے انہیں وہ مقام نہ مل سکا جس کا ان کی شاعری استحقاق رکھتی ہے تا حال اگرچہ ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں "نذر وطن" (۱۹۷۶ء)، "عقیدت کے پھول" (۱۹۸۱ء)، "قلم کی کاشت" اور "نور زندگی" (۱۹۸۲ء) ـــــ یہ ایک قابل لحاظ سرمایہ ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے تنقید نے ان کے بارے میں توجہ نہیں دی۔ "قلم کی کاشت" عثمان عارف کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں اردو غزل کے سارے روپ جلوہ گر ہیں۔

عثمان عارف کی شاعری کی عمر اور ان کی دیگر مصروفیات خواہ کچھ ہوں لیکن ان کو ابتدا سے شاعرانہ ماحول ملا۔ عثمان عارف نے شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ ان کے والد حضرت مولانا محمد عبداللہ بیدل بیکانیری ایک نامور شاعر تھے جن کا شمار حضرت بیخود دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا۔ عثمان عارف کا رشتہ شوق قدوائی سے بھی ملتا ہے کہ کالج میں عثمان عارف کے استاد حکیم بادشاہ حسین رعنا لکھنوی تھے جو نبیرۂ شوق ہوتے ہیں۔ یوں عثمان عارف کا تعلق دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں سے ہو جاتا ہے اور ان دونوں دبستانوں کے بیشتر اوصاف حمیدہ سے ان کی شاعری مزین ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ عثمان عارف کی غزل میں اردو غزل کے سارے روپ

جلوہ گر ہیں۔ میرے نزدیک یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ عثمان عارف نے جہاں غزل اور غزل کی روایات کا گہرا مطالعہ کیا اور ان سے اخذ و اکتساب کیا ہے وہیں عصری زندگی اور اس کے مسائل اور تقاضوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ زندگی کو انھوں نے ہر زاویے اور ہر جہت سے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے برتا ہے اور یہ ساری جھلکیاں ان کی غزل میں مل جاتی ہیں۔

"قلم کی کاشت" میں عثمان عارف کی صرف غزلیں شامل ہیں اور اس کاشت کی آبیاری، کوئی شبہ نہیں، انھوں نے اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ میں یہاں سب سے پہلے "قلم کی کاشت" سے چند ایسے اشعار پیش کروں گا جو غزل کے ایسے روایتی رنگ کے حامل ہیں جس سے غزل، کچھ ایسی نیک نام نہیں۔ عثمان عارف نے یہ اور بات ہے کہ اس رنگ میں اپنے آہنگ کو برقرار رکھا ہے۔ یہ شعر ہے

کہاں غموں کی کڑی دھوپ میں قیام کریں
تمھاری زلفوں کا سایہ ملے تو شام کریں

پیرہن سے ہو رہا ہے اس طرح باہر شباب
جس طرح مے سے لبالب جام چھلکا جائے ہے

پھولوں سے بھی نازک ہے وہ شبنم سے خنک تر
جو شعلہ بدن، شعلہ رخ و شعلہ جبیں ہے

گرانا بجلیاں پردہ اٹھا کر   کرم یہ بھی ستم سے کم نہیں ہے

چمن میں لالہ و گل سے جو ہم کلام ہوا
تو یاد آگئی تیری ادا ادا مجھ کو

پیار خود آتا ہے آئینہ میں اپنے حسن پر
اب تو وہ اپنی ادا پر خود ہی شرما جائے ہے

ان اشعار کے موضوعات روایتی ہیں اور اسلوب بھی۔ عثمان عارف نے یوں روایتی غزل کے رنگ و آہنگ دونوں کے جمال کو بہ تمام و کمال برقرار رکھا ہے لیکن ان ہی حسن و عشق کے موضوعات پر ان کے اشعار غیر معمولی طرحداری کے حامل ہیں۔ خارجیت سے دور، روایتی انداز سے ہٹ کر بڑے ہی نکھرے ستھرے مہکتے چہکتے دلوں کو چھوتے ہیں ؎

یہ ہے خلوص ترکِ تعلق کے باوجود
آنسو نکل پڑے جو کبھی سامنا ہوا

محبت خود بخود ہے ایک عالم
شریک اس میں کوئی عالم نہیں ہے

اک ہوک سی دل میں ہے تو آنکھوں میں ہیں آنسو
اس محفلِ ویراں سے وہ گزرا سا لگے ہے

نرم خو، شیریں سخن، نازک بدن، رنگیں لباس
اب کوئی ایسا نظر آیا تو کتنا ڈر لگے

تصوف، اُردو غزل اور خاص طور پر روایتی غزل سے ملزوم نہ سہی تاہم ان دونوں کا باہمی رشتہ گہرا اور مضبوط ہے۔ آج عوام کا مزاج اور ماحول بھی تصوف کا کہاں؟ بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ عثمان عارف نسبتِ طریقت نقشبندی رکھتے ہیں۔ اور بقول خود "صوفی بھی" ہیں۔ اس طرح ان کی غزلوں میں تصوف کی کارفرمائی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہاں تصوف کا رنگ گہرا بھی، گیرائی کا حامل نہیں ہے۔ ان کے ہاں تصوف کے موضوعات اور مسائل کے حامل اشعار کچھ ایسی زیادہ تعداد میں نہیں ملتے۔ کم از کم زیرِ نظر شعری مجموعہ "قلم کی کاشت" میں اس نوع کے اشعار کی تعداد کم ہے۔ میں چند اشعار درج کرتا ہوں ؎

کوئی رہبر نہیں دیکھا نہ کوئی ہمسفر جانا
وہ جس نے شمع دل کو ہی چراغِ رہگذر جانا

نور ہی نور ہے نقشہ کہاں تحریر کہاں
آئینہ خانہ میں دیکھیں تری تصویر کہاں

کس کی عظمت کا ہے مظہر یہ جہانِ رنگ و بو
دیکھنا عارف نگاہِ معتبر سے دیکھنا

البتہ نقشبندی گھرانے سے وابستگی اور صوفیانہ رجحانات سے عثمان عارف نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اپنے ایک اور مجموعۂ کلام "نورِ زندگی" میں "حالاتِ مصنف" کے تحت انھوں نے لکھا ہے:-

"صلحِ کل میرا مشرب، خدمتِ خلق نصب العین زندگی
اور انسانیت میرا دین و ایمان ہے۔"

یہی بہت بڑی چیز ہے، بہت بڑی دین ہے۔ اسی وسیع النظری اور وسیع القلبی نے انھیں زندگی کے ہر شعبہ میں سرخرو اور سرفراز کیا ہے ان کی انسان دوستی کو اور محکم اور ان کے اخوت اور بھائی چارگی کے جذبات کو اور نکھار اور سنوار دیا ہے اور یوں ان کو احساس کی وہ دولت بیدار حاصل ہوئی ہے جو بہت کم کے حصے میں آتی ہے۔ شاعر کے جذبات کس قدر نازک ہیں۔ وہ غیر معمولی حد تک کس قدر حساس ہے، اس کا اظہار تو غزلوں کے بے شمار اشعار سے ہوتا ہے۔ یہاں عمومی نوعیت کے دو تین شعر پیش ہیں ؎

یہ کیا دستور ہے عارف، یہ کیا آئین دنیا کا
تہی دامن کوئی رہنا کوئی پھولوں سے بھر جانا

موت پر آہیں بھریں، ماتم کریں، آنسو بہیں
زندگی وہ سانحہ جس کا کہیں رونا نہیں

وہ جسم ہوں جو چوٹ سے شیشے کی نہ ٹوٹے
جو پھول کے لگنے سے ہو زخمی وہ بدن ہوں

ایسا بدن جو پھول کے لگنے سے زخمی ہو وہ کہاں تک سلامت رہ سکتا ہے، ٹوٹ ٹوٹ جائے، ریزہ ریزہ بھی ہو جائے تو کم ہے۔

یہ انتشار و اختلال، یہ اخلاقی قدروں کا زوال، تہذیب کا ماتم، عظیم روایات کا مرثیہ، کون کب تک دیکھتا اور پڑھتا رہے۔ فرقہ وارانہ فسادات، یہ بہیمیت۔ انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل، یہ شب و روز کوئی کب تک گوارا کرے۔ کب تک خون کے آنسو روتا رہے۔ عارف صاحب نے اپنے سیاسی موقف کو کئی جگہ واضح کیا ہے۔ اپنے شعری مجموعہ "نورِ زندگی" میں انھوں نے اس سیاست کی تائید کی ہے "جس کا نام حکمت ہے جو انسانیت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے خلاف نہ ہو" اور اب یہ اشعار پڑھیے جو صرف ایک انسان کے جذبات و احساسات کا اظہار ہیں ؎

کسے معلوم تھا بن جائے گا سب شہر ہی مقتل
بہت خوش تھے کہ باہر کوچۂ قاتل سے نکلے ہیں

ایک دیوانے کو سمجھا نہ سکے فرزانے
شہر کی سڑکوں پہ یہ خون اچھلتا کیوں ہے

انسان ہیں کہ شہروں میں خونخوار درندے
معلوم نہیں ہوتا جنگل ہے کہ بستی ہے

اک خون کا سیلاب ہے اک آگ کا دریا
جو امن کی دھرتی تھی وہ مقتل کی زمیں ہے

غنچہ و گل کیا کہیں گے وہ تو شعلہ بن گئے
حالتِ گلزار میرے جلتے گھر سے دیکھنا

پر سمیٹے، سہمے سہمے، دم بخود ہو پنچھیو
پاس کے جلتے مکاں سے شعلہ کیا آکر لگا

صرف فرقہ وارانہ فسادات ہی کیا، زندگی اور زمانے کے دیگر واقعات پیچ و خم، نشیب و فراز اور سیاہ و سپید کا بھی عثمان عارف نے بہ نظرِ غائر جائزہ لیا ہے۔ عصرِ حاضر کے اخلاقی زوال، مفاداتِ حاصلہ کی کش مکش، مادہ پرستی، کسادبازاری، دولت کی نامنصفانہ تقسیم،

مجرمانہ ذہنیت، ماحول کی تہی مائیگی، کھوکھلے پن، معاشرتی اختلال، سیاسی انتشار، غرض یہ اور ایسی کئی چیزوں کا وہ کما حقہٗ احساس رکھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر انسانیت دوست اور زندگی بردوش ہے۔ اپنی صوفی منشی اور جرأت و بے باکی کے باعث وہ اظہار بھی کسی رو رعایت کے بغیر کرتے ہیں۔ مزاج میں دردمندی ہے اس لیے بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ غرض اس عصری حسیت سے ان کے کلام میں ایک اپنائیت اور یگانگت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ انھوں نے اپنے اطراف و ماحول اور "آج" سے پیار کرنا سیکھا ہے۔ وہ فرسودہ روایات اور از کار رفتہ رسم و رواج سے دامن بچا کر ایک نئی صبح کے منتظر ہیں؎

جانے دو ڈوبتے سورج کی جو لالی جائے
زندگی ایک نئی صبح میں ڈھالی جائے
کیسے بوسیدہ روایات کو قائم رکھیں
کس سے گرتی ہوئی دیوار سنبھالی جائے

یہ اور ایسے کئی اشعار، جو شاعر کی عصری حسیت کی دستاویز ہیں۔ جیسے اشعار نہیں مرقعے ہیں، عصری زندگی کے مختلف رخوں کے مختلف پہلوؤں کے؎

وہ خوف و ہراس ہے، پتھر بنے ہیں لوگ
پوچھیں جو حالِ ظلم کسی سے کہا نہ جائے

آسائشِ حیات کے ساماں کے باوجود
کاندھوں پہ زندگی کا جنازہ دکھائی دے

کیسی وفا، کہاں کی محبت، خلوص کیا
چھوڑو گزر گیا وہ زمانہ گزر گیا
ساحل کہاں ہے امن کا طوفانِ زندگی
انسان آج قلزمِ خوں میں اتر گیا

بہت اداس بہت مضمحل بہت غمگیں   یہ زندگی ہے اسے نذر کس کے نام کریں

قیمت ہو کم و بیش تو یہ بات جدا ہے
بازار میں دنیا کے ہر اک شخص بکا ہے

سونا حرام، شام و سحر جاگتے رہو
انسانیت کا غم ہے اگر جاگتے رہو

اور پھر اس غزل کے بیشتر اشعار کئی مسائل حاضرہ کو اپنے میں سمیٹے، شاعری کی عصری حسیت کی جامع اور وقیع تصویریں ہیں۔ میں چند شعر درج کرتا ہوں؎

مجھے تم اپنی بابت جو بھی کہہ دو مان لیتا ہوں
یہ دنیا تو تمھاری داستاں کچھ اور کہتی ہے
تمھیں دھوکے میں رکھتا ہے تبسم لالہ و گل کا
مجھے حالات، برقِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے
بہت ممکن امیرِ کارواں کی کوئی منزل ہو
مگر رفتارِ اہلِ کارواں کچھ اور کہتی ہے

عثمان عارف نے گویا یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر انسان کے دل میں خلوص اور دردمندی ہے اور وہ انسان کو انسان سمجھتا ہے تو سب سے پہلے وہ انسان کے دکھ پر روئے گا، اس کی خوشی پر مسکرائے گا خواہ وہ انسان اپنا ہو یا پرایا۔

یہی انسان دوستی، دردمندی، اخلاص، پیار اور اپنائیت کے جذبات عثمان عارف کی شاعری کے عناصر ترکیبی ہیں۔ ان سے ان کے کلام میں ایک ایسی دل نوازی اور دلکشی پائی جاتی ہے کہ غزل اور نکھر جاتی ہے۔ یہ اشعار آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے؎

اخلاص و محبت کے حسیں پھول کھلے ہیں
ہم جس سے ملے جی سے ملے دل سے ملے ہیں

اس دورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے
عارف خدا بہت ملے انسان کم ملے

ہونے کو تو اس دور میں کیا چیز نہیں ہے
انسان کو ڈھونڈا یہاں، انساں بھی کہیں ہے

سپردِ مرگ کیا، کیسی بے وفا نکلی
تمام زندگی جس زندگی کے ساتھ چلے

تغزل، غزل کا وصف خاص ہے۔ یہ کہنا لایعنی ہے کہ تغزل الفاظ کی رنگینی، مرصع کاری اور تشبیہات واستعارات کی دلآویزی سے پیدا ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے لیکن تغزل کے لیے دراصل خیال کی رنگینی اور دلآویزی اولین شرط ہے۔ مشاہدہ کی گہرائی احساس کی شدت، اظہار کی بے ساختگی اور خیال واظہار میں ہم آہنگی بھی — بطور مثال ایسے بے شمار اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں کہ سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ کے باوجود فکر و خیال کی چاشنی و سرشاری سے وہ ہمارے ادبی سرمایے کا گراں بہا حصہ بن گئے ہیں۔ تغزل کے لیے موضوع کی بھی کوئی قید نہیں۔ یہاں مختلف موضوعات کے حامل ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں الفاظ کی رنگینی اور چکا چوند کی کیفیت ہو یا نہ ہو، تغزل کے اچھے نمونے ہیں ؎

وقت بھی کیسا مصوّر ہے تری یاد کے ساتھ
کتنی تصویریں بناتا ہے مٹا دیتا ہے

نقاب چہرے سے کس نے اٹھائی پچھلی رات
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں چاند مدھم ہے

جنونِ عشق میں منزل کو جا لیا ہم نے
بھٹک کے رہ گئے جو آگہی کے ساتھ چلے

اب یہاں ایسے بھی اشعار پیش کروں گا جن سے ظاہر ہو گا کہ کوئی فن کار اپنے زمانے کی رو اور رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ رو اور رجحانات اچھے ہوں کہ بُرے، خوب ہوں کہ خراب، شستہ ہوں کہ شکستہ، بہرکیف اپنی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہاں مجھے جدید شاعری کے معائب اور محاسن کے بارے میں کچھ عرض کرنا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر دور کی شاعری معائب کی بھی حامل ہوتی ہے اور محاسن کی بھی۔ کم یا زیادہ، یہ اور بات ہے۔ عثمان عارف اپنے مزاج کے اعتبار سے اگرچہ اردو شاعری کی کلاسیکل روایات سے قریب ہیں لیکن غزل کے جدید رجحانات کی کارفرمائی بھی ان کے یہاں ملتی ہے اولاً وہ اشعار جن سے جدید شاعری کی طرحداری اور بانکپن کا اظہار ہوتا ہے ؎

کیسے بوسیدہ روایات کو قائم رکھیں
کس سے گرتی ہوئی دیوار سنبھالی جائے

وہ خوف و ہراس ہے پتھر بنے ہیں لوگ
پوچھیں جو حالِ ظلم کسی سے کہا نہ جائے

قیمت ہو کم و بیش تو یہ بات جُدا ہے
بازار میں دُنیا کے ہر اک شخص بکا ہے

زخم دھرتی کے ہیں کتنے انگنت
شہر کی سڑکوں پہ کچھ دیکھا بھی ہے

اچھے اچھے اپنے چہروں سے ڈرے
وقت کے ہاتھوں میں آئینہ بھی ہے

لیکن اسی کے ساتھ ایسے اشعار بھی ہیں جو مجموعی طور پر عثمان عارف کے مزاج سے ہم آہنگ تو نہیں، بس لگتا ہے جدید شاعری کی رو نے انھیں متاثر کر دیا اور یہ اشعار آپ ہی آپ ہو گئے۔ ان اشعار کی تعداد "قلم کی کاشت" میں زیادہ نہیں، تاہم چند ایک ضرور ملتے ہیں مثلاً یہ اشعار ؎

بھڑکی ہوئی ہے آگ مچھیرے کے پیٹ میں
مچھلی کے حلق میں ہے جو کانٹا لگا ہوا

'ابرائے' میں جو ساتھ حسینہ تھی کل تر سے
ہنستی تھی آج ، تاج ، میں اک نوجوان سے

گاؤں کی گوری کہاں ، گھونگھٹ کہاں
سامنے نہریں بھی ہیں دریا بھی ہے

مجموعی طور پر "قلم کی کاشت" اُردو شاعری میں ایک اچھا اضافہ ہے ۔ عثمان عارف نے زندگی کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے ۔ احساس کی ندرت ، جذبات کی شدت ، مشاہدے کی گہرائی ، اظہار کی طرفگی کے باعث ان کے کلام میں خاصی دیدہ زیبی اور لالہ کاری ہے ۔ انھوں نے بلاشبہ ماحول کی تہی مائیگی ، اخلاقی بحران اور معاشرتی زوال پر آنسو بہائے ہیں لیکن وہ انسان اور انسانیت سے مایوس نہیں ۔ یہی رجائیت شاعر کا بہت بڑا سرمایہ ہے ۔ رجائیت کے حامل کئی اشعار ان کے مزاج کے اس رُخ کی آئینہ داری کرتے ہیں ۔ اسی رجائیت کے باعث کہا جا سکتا ہے کہ عثمان عارف کی شاعری آج کی نہیں ، کل کی شاعری ہے ۔ زندگی کی اثباتی قدروں ، امید ، ایقان ، اعتماد اور اعتبار کی شاعری ـــ اور آخر میں بس ایسے چند اشعار ـــ

ڈوبنے والے سے طوفاں کی حقیقت مت پوچھ
ڈوبنے والا ہی ساحل کا پتہ دیتا ہے

اک صبح نو کی شوخ کرن کی امید میں
رکھتا ہوں ذہن و دل کا دریچہ کھلا ہوا

مجبوریوں کو ان کی بھی رکھو خیال میں
آئیں گے وہ ضرور ، مگر جاگتے رہو

جنونِ عشق میں منزل کو جا لیا ، ہم نے
بھٹک کے رہ گئے جو آگہی کے ساتھ چلے

اُردو ـــ ص٦ کا بقیہ

تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند لوگ پیدا نہیں کر سکتی ، اور نہ یہ اس کا کام ہے ۔ یہ کام اُردو والوں کا ہے اور اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو اس کی ذمہ داری اُن کی اور صرف اُن کی ہوگی ۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ان افراد اور اداروں کو بھی یاد کیا جائے جنھوں نے اردو کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کسی وقت مایوسی کو خود پر طاری نہ ہونے دیا ۔ ان انجمنوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے لیکن ان میں انجمن ترقی اُردو ، انجمن ترقی پسند مصنفین ، نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرز ، جن وادی لیکھک سنگھ ، اُردو محافظ دستہ اور اُردو رابطہ کمیٹی نیز اُردو اکادمی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ۔

چونکہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اس لیے کسی بھی زبان سے محبت کرنے والوں میں ہر مذہب اور ملت کے لوگ شامل ہوتے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت تو غیر مسلم اُردو مصنفین کی وہ دو کانفرنسیں تھیں جن میں غیر مسلم اردو ادیبوں اور شاعروں کی فہرست کا کتابچہ دیکھ کر اُردو کے ایک مسلم ادیب نے کہا تھا : " مسلمان یہاں بھی اقلیت میں ہیں ۔ "

اُردو پریمیوں میں پنڈت سندر لال ، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو ، پنڈت کشن پرشاد کول ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، فخر الدین علی احمد ، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ، ڈاکٹر عبد العلیم ، قاضی عبد الغفار ، پنڈت آنند نرائن ملّا ، سید احتشام حسین ، قاضی عدیل عباسی ، رام لعل ، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ، ابراہیم پرویز ، دیو نرائن پانڈے وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ۔ ان میں سے کچھ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں ۔ اُردو اور ہندی کے اس ملاپ کے موقع پر ہم ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ان کی روحیں مسرور و شاداں اور اس بات کی متمنی ہوں گی کہ ہم اُردو اور ہندی کو ساتھ ساتھ لے کر ایک ایسے ہندوستان کی تشکیل میں ہاتھ بٹائیں جس کے خواب انھوں نے دیکھے تھے ۔

غزلیں

نشتر خانقاہی
کوٹھی نہال سنگھ محلہ جٹانی
بجنور

اب ہفت روزہ ہاٹ میں جاکر دکاں نہ لے
ہر دم کے کاروبار میں شغلِ زیاں نہ لے

پھر سے مراجعت کی توقع، ملن کی آس
لمبا سفر ہے، موم کی بیساکھیاں نہ لے

بسنے سے پہلے راہ نکلنے کی ڈھونڈ لے
پتھر کی اس فصیل کے اندر مکاں نہ لے

محظوظ ہو خود اپنی رفاقت کے لطف سے
واقف نہیں تو جن سے وہ تنہائیاں نہ لے

محسوس کر وہ بات جو میں نے کہی نہیں
پچھلا پہر ہے رات کا، انگڑائیاں نہ لے

مانا کہ بے کنار ہے خیمہ نجوم کا
لیکن اس ایک چھت کے عوض آسماں نہ لے

اب وضعِ جاں نثاریٔ یاراں بدل گئی
اچھا یہی ہے دوست مرا امتحاں نہ لے

شجاع خاور
۴۴ - آفیسرس فلیٹ، پولیس اسٹیشن
مندر مارگ، نئی دہلی

ہوا تو ہے عدو کا کچھ دباؤ کم
پر اب بھی ہے مری جانب جھکاؤ کم

حوالہ دو سمندر کی خموشی کا
ندی شاید کرے اپنا بہاؤ کم

اسے چھوڑو زمانے سے ہی مل آؤ
کرو تو شخصیت کا کچھ تناؤ کم

کرو کچھ استفادہ دوسروں سے بھی
بیانِ غم سنو زیادہ سناؤ کم

طبیعت اور الجھتی ہے حقیقت سے
اب اپنے خواب خود کو بھی بتاؤ کم

لگی اندر کی جب تیزی سے بڑھتی ہے
تو ہو جاتا ہے باہر سے لگاؤ کم

توجہ ان کہی نظموں پہ زیادہ ہے
جبھی اپنی غزل پر ہے رچاؤ کم

اکبر حیدری کاشمیری
شعبۂ اُردو۔ سنٹرل یونیورسٹی
حیدرآباد

مخطوطہ دیوان طالب علی خاں عیشی

مکتوبہ ۱۲۳۲ ہجری

طالب علی خاں نام، عیشی تخلص۔ والد کا نام میاں علی بخش تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں کلیات فارسی کے دو مخطوطے محفوظ ہیں۔ نسخۂ اول ۱۲۳۲ھ اور نسخۂ دوم ۱۲۷۳ھ کا مکتوبہ ہے۔ دونوں نسخوں کی ابتدا میں خطبۂ کلیات میں درج ہے کہ:

"دریں ایام فرخندۂ انجام کہ از ہجرۂ مقدسہ نبویہ
یک ہزار و دو صد و سی و دو سال گذشتہ و پیک
سبک تگ عمرم از منزل زندگانی بنائے ہستی سی و پنج
مرحلہ در نوشتہ است۔"

اس حساب سے عیشی ۱۲۳۲ھ میں ۳۵ برس کے تھے اور ان کا سال ولادت ۱۱۹۷ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مصحفی عیشی کو الماس علی خاں خواجہ سرا (متوفی ۱۲۲۳ھ) کا متوسل لکھتے ہیں۔ ناصر کے قول کے مطابق وہ ان کے "خانہ زاد" تھے۔ ناصر یہ بھی کہتے ہیں کہ عیشی، مرزا تقی ہوس (متوفی ۱۲۵۱ھ) کی سرکار سے وابستہ تھے۔ عیشی مرزا قتیل (متوفی ۱۲۳۳ھ) اور انشا (متوفی ۱۲۳۳ھ) کے شاگرد تھے۔ ناصر نے ان کا ترجمہ قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ کہتے ہیں:

"عیشی۔۔۔۔۔ شیر بیشۂ سخن گوی، خوش لہجہ خوش بیان، استاد دو زبان، نازش مرزا قتیل مایۂ بساط میر انشا اللہ خاں، اکثر امرا اس کی دولت سخن سے نام آور اور غربا ر صحبت سراسر افادت سے سخنور ہوئے۔ مرزا خانی صاحب۔۔۔۔۔ (متوفی ۱۲۷۱ھ) فرماتے تھے کہ مرزا قتیل کے مرض الموت میں شیخ ناسخ (متوفی ۱۲۵۸ھ) اور ہم واسطے عیادت کے گئے تھے۔ استفسار کیا کہ مرزا صاحب کا قائم مقام کس شخص کو زمرۂ تلامیذ میں سمجھا جائے۔ فرمایا کہ طالب علی (عیشی) کو۔ ارشاد مرزا صاحب کا اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہے۔ نواب عاشور علی خاں کی زبانی میں نے یہ سنا ہے کہ جو تاریخ فارسی شیخ ناسخ نے کہی ہے مصرعے اس کے تصنیف کیے ہوئے عیشی کے ہیں اور شیخ کا یہ قول تھا کہ بسبب کم توجہی کے دیوان ہندی اس کا اغلاط سے مملو تھا۔ میں نے بیاض یک جہتی اسے درست کر دیا۔۔۔۔۔۔ افسوس کہ عین موسم میں چراغ اس کی زیست کا باد صرصر ہیضۂ وبائی سے بجھ گیا۔"

ناسخ نے تاریخِ وفات کے کئی قطعات کہے ــــ ایک قطعہ یہ ہے ؎

آہ ! طالب علی عیشی رفت
ناگہاں زیں سرائے رنج و محن
مرضش ہیضہ وبائی بود
کہ ازو رفتہ جان او از تن
بود اے وائے طبع موزونش
بلبلِ نغمہ سنج باغِ سخن
از بہارِ کلام رنگینش
مے شدی بزمِ شعر رشکِ چمن
گفت سالِ وفاتِ او ناسخ
"ہائے افسوس اے سخنور من"

۱۲۴۰ ہجری

ایک اور تاریخ میں ناسخ نے عیشی کی تاریخ وفات ۵ ار صفر روز پنجشنبہ ۱۲۴۰ھ کہی ہے ۔ یہ تاریخ ہنوز دیوانِ ناسخ کے ایک پرانے قلمی نسخے میں محفوظ ہے جو راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔

تذکرہ نگاروں نے متفقہ طور پر عیشی کو اُردو اور فارسی کا ایک باکمال اور قادر الکلام اُستاد قرار دیا ہے ۔ انھیں نظم و نثر دونوں اصناف میں ید طولیٰ حاصل تھا ۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے اور دونوں دواوین ہنوز غیر مطبوعہ ہیں ۔ اُردو دیوان راقم نے کئی نسخوں سے مرتب کیا ہے ۔

ادبی معرکوں میں عیشی ہمیشہ مصحفی کا ساتھ دیتے تھے ۔ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں مصحفی کے دیوانِ ششم کا ایک عمدہ اور مکمل نسخہ ہے ۔ یہ ۱۲۲۴ھ میں مرتب کیا گیا تھا اور اس پر جو ترقیمہ ہے اس پر ۱۲۳۰ھ کی تاریخ ہے ۔ دیوان کے دیباچے میں مصحفی لکھتے ہیں :-

"...... عیشی تخلص ، بہ تیغ دوزبان نظم و نثر ذوالفقار از نیام بر آوردہ ۔ سر اعدائے باطل آہنگ را بہ بریدن داد تا اینکہ معاندین و دعویٰ داران بہ سوراخ خویش خزیدند" ۔

عیشی اُردو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر ہیں ۔ بقولِ ذکا انھوں نے اُردو میں دس ہزار اور فارسی میں سولہ ہزار شعر کہے ہیں ۔ راقم کی نظر سے کلیاتِ فارسی میں کوئی تیس مثنویاں گزری ہیں ۔ خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی نے اپنی کتاب "آبِ بقا" میں عیشی کو صاحبِ تذکرہ و تصانیفِ کثیرہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے چار فارسی دیوان ایک تذکرہ شعرائے عجم ، دو فارسی مثنویاں ایک مثنوی اردو ، ایک دیوانِ اُردو ان کی نظر سے گزرے ہیں ۔ راقم حروف نے عیشی کے کلیاتِ فارسی کے دو نسخے راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں دیکھے ہیں ۔ ایک ۱۲۳۲ھ اور دوسرا ۱۲۷۳ھ کا مکتوبہ ہے ۔ اول الذکر کلیات کے ساتھ دیوانِ اُردو بھی شامل ہے اور دونوں ایک ہی کاتب کے معلوم ہوتے ہیں ۔ کلیاتِ فارسی کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں بھی ہے ۔ اسی لائبریری میں دیوان اردو کا ایک نسخہ بھی موجود ہے عیشی نے کوئی تذکرہ "شعرائے عجم" کے نام سے نہیں لکھا ۔

ــــ محمد حسین آزاد (آبِ حیات ص۳۷۰) ، مرتب "شعلۂ جوالہ ۔ مجموعہ واسوخت" جلد دوم ص۶۸۳ اور ڈاکٹر گیان چند جین (اُردو مثنوی شمالی ہند میں ص۴۲۸) نے عیشی صاحب کی کتاب "سرو چراغاں" کو اُردو مثنوی کہا ہے جو غلط ہے ۔ یہ اُردو کے مختلف شعرا کی غزلیات کا مجموعہ ہے ۔ تفصیلات کے لیے "جائزۂ مخطوطاتِ اُردو" مخطوطہ نمبر ۱۸۶ صفحہ ۱۱۰۳ ملاحظہ ہو ۔

تمام تذکرہ نگاروں نے عیشی کے کلام کو سراہا ہے ۔ وہ اپنے زمانے میں مُنتظر ، گرم ، آتش وغیرہ کے ہم پایہ تھے ۔ کلام نہ چھپنے کی وجہ سے ان کی شہرت زیادہ نہ ہو سکی ۔ راقم حروف نے ان کا دیوان اُردو مکتوبہ ۱۲۳۲ھ کئی نسخوں سے مرتب کیا ہے ۔ سب سے قدیم نسخہ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ ایک نسخہ رامپور اور دوسرا نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ نسخہ ندوہ کرم خوردہ اور خطِ شکست میں ہے ۔ اس طرح راقم نے تین قلمی نسخوں سے دیوانِ عیشی کو مرتب کر کے تیار کیا ہے

مختار نسخہ راجہ صاحب کا ہی تقدم زمانی کے اعتبار سے رکھا گیا ہے۔ اس کی ابتدا ورق ۱۱ الف تک مثنوی ہے۔ اس میں ۳۱۳ شعر ہیں۔ عنوان ہے: "مثنوی عاشق شدن برہمن زادہ برزنے" حسرت موہانی نے اسے اُردوئے معلّٰی بابت دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں اکثر و بیشتر شعر غلط چھپے ہیں۔ اُردوئے معلّٰی کا یہ شمارہ راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ دیوان میں مثنوی کے بعد غزلیات ہیں۔ تفصیلات یہ ہیں:-

ردیف۔ الف ۴۴، ردیف د۔ ۲، ردیف ر۔ ۵،
ردیف م۔ ۱، ن۔ ۲۱، واو۔ ۴، ے۔ ۴۹،
کل تعداد:- ۱۱۶

دوسرے نسخوں میں غزلوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ پہلی غزل میں ۹ شعر ہیں۔ مطلع ؎

ہے قصور اے ہم نشین سر تا سر اپنی دید کا
ورنہ ہر ذرّے میں تاباں نور ہے خورشید کا

غزلیات کے بعد ۱۲ بند ہیں۔ مسدس واسوخت ہے۔ یہ راجہ صاحب محمود آباد کے کلیات فارسی مکتوبہ ۱۲۷۳ھ میں موجود ہے اس کا ایک نسخہ ادبیات اردو حیدرآباد میں بھی محفوظ ہے۔

واسوخت پہلی مرتبہ "شعلۂ جوالہ" موسوم بہ "مجموعہ واسوخت" جلد دوم ص۶۸۳ میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپا تھا۔ یہ کتاب اب شاذونادر ہی کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ جناب سید مسعود حسن رضوی مرحوم کے کتب خانہ میں اس کی دونوں جلدیں محفوظ ہیں۔ اس میں عیشی کے بارے میں لکھا ہے:

"عیشی تخلص ہے۔ طالب علی خاں مرحوم ابن علی بخش خاں باشندۂ لکھنؤ دیوان فارسی مع قصائد اور دیوان ہندی اور مثنوی "سرو چراغاں" ان سے یادگار ہے۔ نظم و نثر میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ شاگرد جناب مرزا محمد قتیل مغفور، اکثر ان کی ابتدائے شاگردی میں فرماتے ہیں ؎

پارۂ خواہد شد از یں دست گریبانی چند

واسوخت کے بعد انیس، ہوس اور ترقی کی غزلوں پر تضمینیں ہیں۔ آخر میں ایک مرثیہ بھی ہے۔ ذیل میں چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ؎

ہماری خاک پر گر ہو گئی ہے
صبا بھی خاک بہ سر ہو گئی ہے

کھلی ہے شاید اس کی عنبریں زُلف
ہَوا یکسر معطّر ہو گئی ہے

خیال زلف جب سے ہے طبیعت
پریشانی سے خوگر ہو گئی ہے

ہے آمد باغ میں کس سرو قد کی
نسیم صبح مضطر ہو گئی ہے

چھپاتے ہو عبث تم خونِ عیشیؔ
میاں یہ بات گھر گھر ہو گئی ہے

جلا دے طور اے سوز نہانی
اٹھاوے کون نازِ لن ترانی

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

نہ پیری میں ستا اے محنتِ عشق
اٹھائی تھی ترے صدمے جوانی

کیا خاکِ درِ میخانہ مجھ کو
جزاک اللہ دَورِ آسمانی

شبِ غم میں ہُوا جل جل کے عیشیؔ
سزا ہے شمعِ محفل کی زبانی

مسدس واسوخت

عشق کا پھر سر و ساماں ہے خدا خیر کرے
پھر جنوں سلسلہ جنباں ہے خدا خیر کرے
گریہ آمادۂ طوفاں ہے خدا خیر کرے
صحبت دست و گریباں ہے خدا خیر کرے

قرعۂ غم زدہ ام تاکہ کند دل شادم
باز ویراں شدہ ام تاکہ کند آبادم

گر کروں سر بسر آشفتہ سری اپنی بیاں
مو بہ مو ہو سبب دردِ سرِ زلفِ بتاں

حالِ سوزِ غمِ دل لاؤں اگر تا بہ زباں
ہو شرر بیز نفس موج ہوا شعلہ فشاں

نو بہ نو ہر نفسم داغِ کہن می سوزد
آتش از گرمیِ ہنگامۂ من می سوزد

یادِ ایّام کہ تھا یہ دلِ ویراں آباد
مایۂ صبر و تحمّل نہ ہوا تھا برباد

اب نہ دل ہے کہ غم و درد کے سہیے بیداد
لذّتِ رنج اٹھا دے وہ کہاں خاطرِ شاد

برق تو جلوہ فروشد منِ محزوں چہ کنم
خرمنے بود مرا سوختم اکنوں چہ کنم

عیشی نے اردو میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو عشقیہ ہے اور میر کے رنگ میں ہے۔ ہم نے اسے تین نسخوں سے ترتیب دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین یہ مثنوی پہلی مرتبہ "سوز و ساز" کے بجائے "جگر سوز" کے غلط نام سے ۱۲۴۸ھ میں مطبع مصطفائی شاہجہاں آباد میں چھپی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہی نام ہو گا لیکن قلمی نسخوں میں اس کا عنوان یہ ہے:-

"مثنوی عاشق شدن برہمن زادہ بر زنے"

عیشی نے مثنوی کو خوبصورت تشبیہات و استعارات سے آراستہ کیا ہے۔ ذیل میں چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ؎

اک شہر میں ایک برہمن زاد
تھا کانِ عشقِ فتنہ بنیاد

تھا گرچہ وہ باغِ حسن کا گل
پر دل نے کیا تھا اس کو بلبل

کرتا تھا وہ رشکِ سرو شمشاد
قمری کی طرح مدام فریاد

تھا شعلۂ عشق پائے تا فرق
تھی سینے میں جائے دل نہاں برق

سرکاسۂ بادۂ جنوں تھا
دل غنچۂ باغِ جوشِ خوں تھا

ہر چند وہ رشکِ بوستاں تھا
پروانۂ حسنِ گل رخاں تھا

دل غم نے کیا تھا بسکہ خونناب
تھا رشکِ صراحیِ مے ناب

رو رو کے کیا بجاں محزوں
ہر جامِ حباب اس نے پُرخوں

القصّہ وہ مستِ بادۂ عشق
صبر و دل و ہوش دادۂ عشق

اک کوچہ میں ناگہاں جو آیا
اس پر یہ بلا سپہر لایا

اک حور وش آگئی مقابل
خورشید لقا پری شمائل

تھی شعلۂ حسن پائے تا فرق
رشکِ مہ و مہر غیرتِ برق

سرتاپا جلوہ سربسر ناز
کامل خوبی تمام انداز

ہم جلوۂ شعلۂ سرِ طور
ہم چشمِ غزال چشمِ بد دُور

داغِ دل لالہ خالِ رخِ گل
قامتِ شمشاد بال سنبل

آشوبِ جہاں خرامِ مستی
قد سروِ چمن طرازِ ہستی

وہ جعد سیاہ مارِ پیچاں
دزدیدہ نگاہ دشمنِ جاں

(باقی صـ۳٦ پر)

شباب للت
[illegible]
شملہ

وصال

تم بھلے ہی اس کو مقناطیس کے پہلو میں
رکھ دو
اس پہ کیا ہوگا اثر جذب و کشش کا ؟
زنگ آلودہ ہے لوہا
وصلِ مقناطیس کے سارے جتن
بے کار ہوں گے

زنگ اس کا صاف کر دو
اور دیکھو معجزہ پھر
چاہے کتنا دور بھی رکھا ہو
مقناطیس اس کو کھینچ لے گا اپنی جانب
والہانہ اس سے ہم آغوش
ہو جائے گا لوہا
فاصلے مٹ جائیں گے سب درمیاں کے
ہے یہی قانونِ قدرت
جو اٹل ہے

اُف ! یہ میرا من
جو زنگ آلود لوہے کی طرح
اب بھی
گناہوں کی کثافت سے بھرا ہے
خواہشوں کی زرد پرتیں
واسناؤں کی وِشیلی موٹی موٹی
پپڑیاں
جس پہ جمی ہیں
حُسنِ لافانی کے
اُس اُجلے مُقدس مقناطیسی
اور نورانی بدن سے
کیسے
ہم آغوش ہوگا ؟

جاوید اکرم
۱/۱۶۵ سول لائنس
فتح گنج ۵

جستجو

اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا
کہ میں
ندیا سے پوچھوں
کیوں اکیلی
روز و شب
بہتی ہے بے مقصد
نہ منزل ہے نہ کوئی ہمسفر اس کا
مگر جاری ہے روز و شب سفر اس کا

ندی کی موجیں اُبھریں، مسکرائیں
اور پھر
دھیمے سُروں میں یہ کہا مجھ سے
ندی کو جستجو ہے
گہرے
ساگر کی !!

*

محمد جعفر کاشمیری
خوشی پورہ (ایچ۔ ایم۔ ٹی)
سری نگر

اُردو نثر کی تین اہم کتابیں

باغ و بہار ۔ گلشنِ نو بہار ۔ فسانۂ عجائب

اُردو نثر کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو فورٹ ولیم کالج کے منتظم اعلیٰ تھے نثر اُردو کے جد اعلیٰ کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ گلکرسٹ ہی کی کوششوں سے ملک کی دیسی زبان یعنی اُردو سرکاری زبان بننے کے لائق ہوئی اور ۱۸۳۲ء میں یہ سرکاری اور درباری زبان مقرر ہوئی۔ ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے وہ ۱۷۵۹ء میں ایڈنبرا میں پیدا ہوئے۔ جان گلکرسٹ بلاشبہ اُردو کے ان چند مخصوص محسنوں اور سرپرستوں میں سے ہیں جن کے بار احسان سے اُردو زبان کبھی سبک دوش نہ ہوسکے گی بلکہ رہتی دنیا تک ان کا نام اُردو ادب میں باقی رہے گا۔ ان ہی کی بدولت اُردو نثر کے قالب میں جان پڑی اور اردو زبان نثر کی کتابوں سے مالا مال ہوگئی۔ ڈاکٹر موصوف نے زبان اُردو کے لیے ایسی راہیں نکالیں جن پر چل کر اہل قلم نہایت نمایاں اور درخشاں کارنامے چھوڑ گئے۔

جان گلکرسٹ کے حالاتِ زندگی سے اُردو کے اکثر تذکرے خالی ہیں لیکن انگریزی کتابوں اور فورٹ ولیم کالج کی تاریخوں سے ان کے حالاتِ زندگی معلوم ہوتے ہیں۔

ان کا پورا نام جان بارتھوک گلکرسٹ تھا، پیدائش ۱۷۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک شہر اڈنبرا میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اسی شہر کی ایک درس گاہ جارج ہیرٹ میں پائی۔ ۱۷۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے خواہاں ہوئے اور ۱۷۸۳ء میں بحیثیت ڈاکٹر اسی کمپنی سے وابستہ ہوکر بمبئی پہنچے۔ اسی سال گلکرسٹ کو کلکتہ بھیجا گیا۔ وہ اپنی لغت کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"ہندوستان آنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک میں اس ملک کے باشندوں کی عام زبان سے واقف نہ ہوجاؤں، میں نہ تو اپنے فرائض اچھی طرح سے انجام دے سکوں گا اور نہ ہی اپنی زندگی سکون کے ساتھ بسر کرسکوں گا۔"

چنانچہ گلکرسٹ ۱۷۸۵ء میں ہی کلکتہ سے فیض آباد چلے گئے جہاں انھوں نے ہندوستانیوں کی معاشرت اختیار کی اور اُردو زبان کے تحقیقی مطالعہ میں مصروف ہوگئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندستان کے مشہور شہروں کا بھی دورہ کیا جیسے دہلی۔ بنارس، لکھنؤ وغیرہ اور ہندو مسلمان پنڈتوں اور منشیوں سے مدد لے کر نہ صرف خود اُردو زبان کے ماہر بن گئے بلکہ اُردو کی انھیں اس قدر مشق ہوگئی کہ ساری عمر اسی زبان کی تحقیق، توسیع و اشاعت میں صرف کردی۔ ان کا انتقال ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو ۸۸ برس کی عمر میں ہوا۔

لارڈ ولزلی گورنر جنرل نے گلکرسٹ کے مفید کارناموں کے خاطر خواہ نتائج دیکھ کر ان کو وافر مالی امداد بھی دی اور کالج کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا۔ یہ کالج جو بعد میں فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہوا ۱۸۰۰ء میں اس غرض سے قائم ہوا تھا کہ اس میں کمپنی کے انگریز

ملازمین کو ملک کی دیسی زبانوں میں تعلیم دی جا سکے۔ گل کرسٹ زیادہ عرصہ تک اس کالج میں نہ رہ سکے۔ علالت کی وجہ سے مستعفی ہوگئے اور ۱۸۰۲ء میں پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔ اُردو زبان سے ان کو اتنی محبت تھی کہ لندن میں انھوں نے امیدوارانِ انڈین سول سروس کو مشرقی زبانوں میں پرائیوٹ طور پر تعلیم دینا شروع کی۔ ۱۸۱۸ء میں وہ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر ہوگئے جس کو اسی سال ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن میں قائم کیا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں یہ انسٹی ٹیوٹ بند ہوگیا۔ لیکن ڈاکٹر گلکرسٹ اس کے بعد بھی تقریباً ایک سال تک پرائیویٹ طور پر اُردو پڑھاتے رہے اور اپنے بعد فاربس کو اپنی جگہ مقرر کر گئے۔

ان کی پوری کتابوں کی فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" کی جلد نہم میں دی ہے۔ ان کی بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱) انگریزی ہندستانی ڈکشنری مطبوعہ ۱۷۹۳ء
(۲) مشرقی زبان دان مطبوعہ ۱۷۹۸ء
(۳) ہندستانی گرامر مطبوعہ ۱۷۹۶ء

فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں میں تین شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: (۱) میر امن دہلوی، (۲) میر شیر علی افسوس، (۳) حیدر بخش حیدری۔ ان میں سب سے زیادہ مقبولیت میر امن دہلوی کو حاصل ہوئی۔ اس کالج سے وابستہ رہ کر میر امن نے صرف دو کتابیں تحریر کیں۔ ان میں بھی صرف ایک ہی کو شہرت نصیب ہوئی وہ ان کی شاہکار کتاب "باغ و بہار" ہے۔

باغ و بہار

میر امن دہلوی اپنی شہرہ آفاق کتاب "باغ و بہار" کی بدولت زندہ جاوید ہیں۔ ان کی اس کتاب کی بہار ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اس کو تالیف ہوئے ۱۸۷ برس کا زمانہ گزر گیا لیکن اس کی مقبولیت میں آج تک کوئی کمی نہ ہوئی۔ انھوں نے اس کتاب کو ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں لکھنا شروع کیا اور اسے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں ختم کیا۔ خاتمۂ کتاب میں میر امن لکھتے ہیں: ـــــــ

"جب یہ کتاب فضل الٰہی سے اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اسی میں تاریخ نکلے۔ جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا، باعث عدم فرصت کے بارہ سو سترہ کی ابتدا میں انجام پذیر ہوئی۔ اسی فکر میں تھا کہ دل نے کہا "باغ و بہار" اچھا نام ہے۔ ہم نام وہم تاریخ اس میں نکلتی ہے تب میں نے یہی نام رکھا۔"

"باغ و بہار" کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۱۷ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ اس میں چار درویشوں کی روداد ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق، حامد حسن قادری، سید محمد وغیرہ کا یہ کہنا درست نہیں کہ ایک اور کتاب "نوطرز مرصع" کے نام سے محمد غوث زریں نے لکھی ہے جس میں انھیں چار درویشوں کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ دراصل محمد غوث زریں نے ۱۱۹۸ھ مطابق ۸۳-۱۷۸۲ء میں فارسی میں "قصہ چہار درویش" کو مختصر کر دیا اور پھر اسے ۱۲۱۷ھ میں اور مختصر کر کے اپنے مُربی سیتل پرشاد کو دکھایا تو انھوں نے ۱۹ سال کے بعد اسے اُردو کا جامہ پہنایا۔ اس ترجمہ کا نام باغ و بہار رکھا ہے۔ باغ و بہار تاریخی نام ہے ؎

بنا کر یہ گلدستۂ روزگار
لکھی اس کی تاریخ "باغ و بہار"

عجیب بات یہ ہے کہ زریں نے تحسین کی کتاب کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن نام وہی تحسین والا رکھا۔ محمد غوث زریں نے کتاب کا نام "قصۂ چہار درویش" رکھا تھا۔ "نوطرزِ مرصع" ان کا لکھا ہوا نام نہیں ہے یہ کاتب نے اپنے نسخہ میں لکھا تھا جو اغلاط سے مملو تھا اسی نسخے کو جری لکھنوی نے درست کر کے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں شائع کیا۔

زریں نے دیباچے میں امیر خسرو کی مفروضہ کتاب "قصہ چہار درویش" میں خواجہ نظام الدین کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے "قصۂ چہار درویش" کے نام سے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ آخر قصۂ چہار درویش کس کی تصنیف ہے؟

اس کے بارے میں جناب محمود شیرانی صاحب نے بڑی اچھی اور مفید تحقیق کی ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اپنی مرتبہ "نوطرز مرصع" میں شیرانی صاحب کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"یہ قصہ دراصل پہلے فارسی میں لکھا گیا۔ فارسی کے قدیم مؤلفین میں سے دو نام ہم کو اب تک معلوم ہو سکے، ایک حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں کا، دوسرے انجب کا، جس کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرہ "عقد ثریا" میں کیا ہے۔ انجب کا قصہ چہار درویش اب ناپید ہے۔ بعد کے مؤلفین میں میر احمد خلف شاہ محمد کی فارسی تالیف زیادہ مشہور ہوئی اور کئی بار چھپ کر ملک میں رائج ہوئی۔ اب تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ "قصہ چہار درویش" دو اشخاص نے لکھی۔ ایک حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں اور دوسرے مؤلف کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرہ "عقد ثریا" میں کیا ہے اور لکھتے ہیں محمد خلف شاہ محمد کی ہے"۔

فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام جو کتابیں تالیف ہوئیں ان میں سب سے زیادہ مقبولیت و شہرت میر امن کی تصنیف "باغ و بہار" کو حاصل ہوئی۔ اُردو نثر کی تاریخ میں سلاست و سادگی کے اعتبار سے یہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک بیسیوں ایڈیشن ہندستانی اور انگریزی مطبعوں سے شائع ہوئے۔

"باغ و بہار" کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ۱۸۱۳ء میں ایل۔ ایف۔ اسمتھ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا جو پہلی مرتبہ ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا۔ اسمتھ کے علاوہ ڈنکن فاربس نے بھی ۱۸۵۷ء میں اس کا خلاصہ انگریزی میں طبع کرایا۔ گارساں دی تاسی نے بھی فرانسیسی میں ترجمہ کر کے ۱۸۸۲ء میں پیرس میں ایک ایڈیشن شائع کیا ہے۔

"باغ و بہار" کی مقبولیت و شہرت کا اصل راز اس کی زبان اور طرز بیان ہے۔ میر امن دہلی کے باشندے تھے، دہلی کی اردوئے معلیٰ ان کی زبان تھی۔ لہٰذا "باغ و بہار" انھوں نے اسی ٹکسالی زبان میں لکھی ہے۔

"باغ و بہار" اس زمانے کے تمدن و معاشرت کا آئینہ ہے۔ اسلامی عقائد، خورد و نوش، وضع قطع، مشاغل و معمولات، آداب و اخلاق، غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ "باغ و بہار" کا اسلوب بیان، سادہ، شگفتہ، برجستہ، بے تکلف، فصیح اور سلیس ہے۔ یہ خوبی اس کتاب کے ہر لفظ، ہر جملے اور ہر حصے میں پائی جاتی ہے۔ میر امن کے پاس الفاظ کا خزانہ موجود ہے وہ جانتے ہیں کہ کون سی بات کتنے لفظوں میں بیان ہونی چاہیے۔ وہ کبھی کبھی قواعد سے بھی روگردانی کر جاتے ہیں لیکن اس سے روانی اور برجستگی میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ میر امن کو کہانی ختم کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ یہی داستان گوئی کی خوبی ہے نہ وہ بے جا طوالت سے کام لیتے ہیں اور نہ ہی بے حد اختصار سے۔ میر امن نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں اتنے زیادہ ہندی الفاظ استعمال نہیں کیے کہ کتاب سمجھنا مشکل ہو جائے۔ ان کی زبان، تراکیب اور متروک الفاظ وغیرہ کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

تباہی کھلنا۔ یہ اس زمانے کا مخصوص محاورہ ہے

وہ کی جمع وے۔ اب بالکل متروک ہے

میر امن نے اس کتاب کو اس قدر صاف، سلیس اور بامحاورہ عبارت میں لکھا ہے کہ بقول سرسید مرحوم جو مرتبہ میر تقی میر کو نظم میں حاصل ہے وہی میر امن کو نثر میں ہے۔ میر امن کا یہ قصہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ ان کی زبان میں لوچ بھی ہے۔ جگہ جگہ ان کے جملوں میں الفاظ کچھ اس طرح ترکیب پاتے ہیں کہ ایک عجیب دل لبھانے والی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ باغ و بہار کے مطالعہ سے زمانہ قدیم کے طرز زندگی اور سماجی حالات کا بعینہ نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

غرض "باغ و بہار" اس زمانے کے طرز معاشرت، شادی بیاہ، موت و حیات وغیرہ کے رسم و رواج اور عوام الناس کے معتقدات اور اوہام وغیرہ کا ایک صحیح مرقع ہے اور سماجی زندگی کے مظہر افسانوی ادب میں اس کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

اسلوب کی ان ہی خصوصیات کی بناپر "باغ و بہار" آج بھی مقبول

ومعروف ہے اور زبان و بیان کے اعتبار سے اُردو کے داستانوی ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

گلشنِ نوبہار

اردو نثر کے ارتقا میں مہجور کی "گلشن نوبہار" لکھنؤ کے عظیم الشان داستانوی ادب کا ایک قابل قدر حصہ ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں تحریر کی جانے والی اس داستان کو شمالی ہند میں اردو کی نثری داستانوں میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس ادبی تخلیق سے اُردو ادب ابھی پوری طرح روشناس نہیں ہوا ہے۔ مہجور کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ پہلی بار مصحفی نے تذکرہ "ریاض الفصحا" میں ان کے مختصر اور ناکافی حالات بیان کیے لیکن اس کے بعد تذکرہ نویسوں نے اس میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے مصحفی کے بیان کردہ حالات سے جو معلومات دستیاب ہوئے ہیں انھیں یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

مہجور کا پورا نام شیخ محمد بخش اور مہجور تخلص ہے۔ ان کی پیدائش ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۱ء (کے لگ بھگ) لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کی نثری تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی، فارسی اور اس عہد کے دیگر علوم سے بھی واقف تھے۔ قصے کہانیاں پڑھنے کا شوق انھیں لڑکپن سے تھا جس کا اظہار انھوں نے "گلشن نوبہار" میں کیا ہے۔ تحسین کی مشہور داستان "نوطرز مرصع" ان کی پسندیدہ کتاب تھی اس کے طرز انشا سے وہ بہت متاثر تھے۔

مہجور کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اس لیے کم عمری میں ہی وہ جرأت لکھنوی کے شاگرد بنے اور ان کی شاگردی پر فخر و مباہات کرتے تھے۔ مہجور کو شعر گوئی کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی بے حد شوق تھا۔ مصحفی نے تذکرہ "ریاض الفصحا" میں ان کی اُردو نثر کی تین کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مہجور کے سالِ وفات کا کسی کو علم نہیں ہے۔ محسن لکھتے ہیں کہ وہ ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں حج بیت اللہ کے لیے گئے اور وہیں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس تحریر سے گمان ہوتا ہے کہ اسی سال انھوں نے دنیا سے کوچ کیا ہوگا۔

مہجور صاحبِ تصانیف تھے۔ اُردو نثر میں ان کی تین کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، جن میں ان کی مشہور و معروف تصنیف "انشائے گلشنِ نوبہار" بھی ہے۔ ان کتابوں کے بارے میں مہجور کا ایک بیان درج ذیل ہے:

"اگرچہ اس نالائق، رد خلائق نے سابق میں "انشائے گلشنِ نوبہار" غیرت گلزار اور "انشائے چار چمن" دل لگن، پراز قصص دلفریب افسانہ ہائے عجیب بہ عبارت رنگین اور مضمون نو آئین زبان اُردو میں تحریر و تسطیر کی ہیں۔ مگر اس زمانہ تعطیل و زندگی قلیل میں بلبلِ فکر گلشنِ خیال میں یوں چہچہا زن ہوا کہ اب اور سادہ عروس کاغذ کو حلیہ نگارش افسانہ رنگین اور حکایاتِ نگارین سے مجلّیٰ کیجیے اور زلفِ معشوقہ سخن کو شانہ کاری زبان خامہ جادو طراز سے بصد آراستگی سنوار کر نام دل آرام اس نیک انجام کا "انشائے نورتن" رشکِ چمن، گلزار جہاں میں سرسبز کر دیے اور اس کا گلدستہ نوباب پر مرتب کیجیے۔"

"گلشن نوبہار" مہجور کی ایک غیر معروف نثری داستان ہے۔ یہ شہزادہ مہر افروز اور ملکہ ماہ پرور کے عشق کے قصے پر مبنی ہے۔ اس داستان کا سال تصنیف ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء ہے جیسا کہ خود مہجور کے ایک قطعے سے ظاہر ہوتا ہے ؎

رقم کر قصۂ رنگین دل آویز
کیا کلکِ تصور نے یہ بہر نقش
عنانِ طبع سے تاریخ کا اب
بمیدانِ سخن چمکایئے رخش
اسی ہی فکر میں بیٹھا تھا خاموش
ندا ہاتف نے دی ہے یہ "فرح بخش"
۱۲۲۰

"گلشن نوبہار" مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد کے اہتمام میں انھیں کے مطبع (مطبع مسیحائی) واقع لکھنؤ سے ۱۲ رمضان المبارک ۱۲۶۲ھ

مطابق ۱۲ ستمبر ۱۸۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ صفحات کی کل تعداد مع غلط نامہ ۳۹۱ ہے۔ "گلشن نوبہار" کا قصہ دلچسپ ہے اور اس میں افسانوی کشش بھی موجود ہے۔ لیکن یہ مہجور کا طبع زاد نہیں ہے۔ قصّے کے مختلف اجزا اس عہد کے دوسرے قصہ کہانیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مصنف نے کتاب میں قصّے کی تمام کڑیوں کو اس طرح جوڑا ہے کہ بالکل ایک نئی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ مہجور نے لکھنؤ میں کافی عمر گزاری تھی۔ انھوں نے اودھ کا شاہی جلال و جمال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لہٰذا مصنف نے یہ تمام واقعات اس داستان میں درج کیے ہیں۔

مہجور کے زمانے میں شاہی دربار کی سرپرستی کی وجہ سے مذہب کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ لہٰذا شعر و ادب کا مذہبی افکار و خیالات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ اس کتاب میں مہجور نے ماحول کے اثر کے تحت آیاتِ قرآنی، احادیث، تلمیحات، دُعائیں اور عربی فقرے وغیرہ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ داستان میں اس وقت کے نذر و نیاز کی ان رسموں کا بھی ذکر کیا ہے جو مشکل وقت اور مصائب کو ٹالنے کے لیے اس عہد میں رائج ہو گئی تھیں۔

گلشنِ نوبہار کے اسلوب پر بحث کرنے سے پہلے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ کتاب اس زمانے میں لکھی گئی جب سارے ملک میں فارسی زبان رائج تھی۔ علوم و فنون کی کتابیں فارسی میں ہی ہوتی تھیں۔ فارسی انشا پردازی کا یہ رجحان کسی نہ کسی شکل میں ملا وجہی کی "سب رس" فضل کی "دہ مجلس" اور تحسین کی "نوطرزِ مرصع" میں بھی پایا جاتا ہے۔

مہجور کے عہد میں تحسین کی انشا پردازی کی بڑی دھوم تھی۔ ان کی تصنیف "نوطرزِ مرصع" کا دقیق اور رنگین اسلوب اردو نثر نگاری میں نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مہجور نے بھی "گلشن نوبہار" میں تحسین کے طرز کی بالاعلان تقلید کرتے ہوئے اس زمانے کے ادبی پس منظر میں مسجع و مقفیٰ عبارتیں لکھنے کی کوشش کی ہے اور قادرالکلامی کے ساتھ اپنی کتاب "گلشن نوبہار" کو شاعرانہ صنعتوں، مبالغے کے زور و شور، شوخ و برجستہ فقروں اور موقع محل سے فارسی، اردو اساتذہ کے منتخب اشعار سے مزین کیا ہے پھر بھی "گلشن نوبہار" کے اسلوب تحریر میں کسی طرح کی پیچیدگی نظر نہیں آتی ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے نہایت شگفتہ، عام فہم، صاف ستھری اور با محاورہ زبان لکھی ہے۔ نثر کی یہ خوبیاں خاص طور پر ان کے مکالموں میں نظر آتی ہیں یا ان مقامات پر پائی جاتی ہیں جہاں انھوں نے رنج و فراق کی کیفیات بیان کی ہیں۔ ان حصوں میں مہجور نے داستانوں کے روایتی انداز سے گریز کیا ہے اور بغیر کسی کوشش کے برجستہ و بے ساختہ نثر لکھ کر اپنے قلم کا جادو جگایا ہے۔ میرے نزدیک یہ "گلشن نوبہار" کا اسلوب ہی ہے جسے ہم اس زمانے کی اصلی اور معیاری زبان کا درجہ دے سکتے ہیں۔

"گلشن نوبہار" مہجور کے زمانے کی نہایت ترقی یافتہ زبان کا نمونہ ہے۔ مہجور کی زبان تحسین کی "نوطرزِ مرصع" کے مقابلے میں بہت صاف ستھری ہے جس میں اردو کا فطری لب و لہجہ اور ہندی کی مٹھاس کے ساتھ ساتھ فارسی کی حُسن کاری بھی موجود ہے۔ "گلشنِ نوبہار" میں انگریزی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ مثلاً پلٹن (PLATOON)، گلاس (GLASS)، لالٹین (LANTERN) وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں ہی انگریزی الفاظ اردو نثر میں استعمال ہونے لگے تھے۔

غرض کہ "گلشن نوبہار" مہجور کی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا نمونہ ہے جس میں مصنف نے اپنی فنکاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ یہ کتاب ادبی، تاریخی اور لسانی تینوں حیثیتوں سے قابلِ قدر ہے — اسے ہم "نوطرزِ مرصع" اور "فسانہ عجائب" کی درمیانی کڑی کہہ سکتے ہیں۔

فسانۂ عجائب

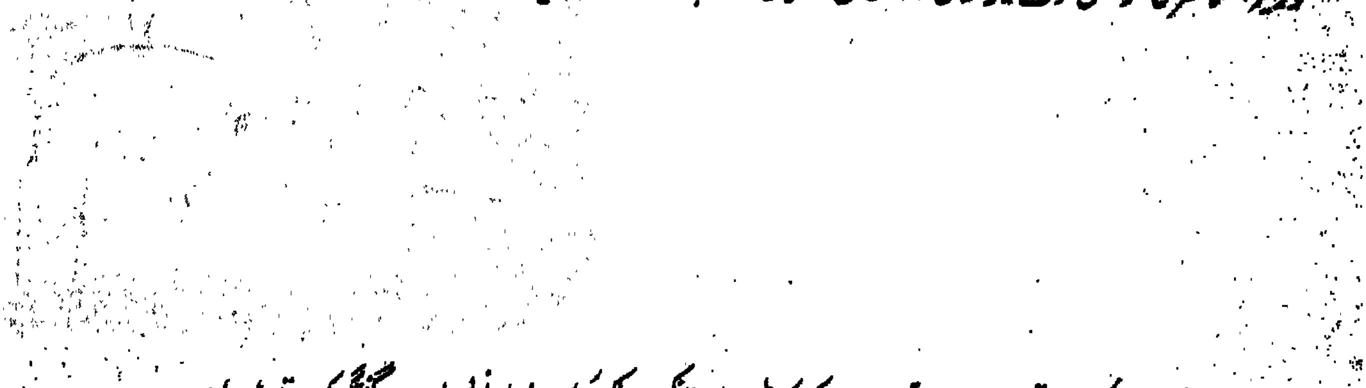
رجب علی بیگ سرورؔ کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "فسانہ عجائب" ہے۔ اسی سے سرورؔ کا نام زندہ ہے۔ یہ کتاب باغ و بہار کے ٹھیک ۲۳ برس بعد لکھی گئی ہے۔ اس کو سرورؔ نے ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں تالیف کیا۔ یہ ایک داستان ہے۔ داستانیں فرصت کے زمانے کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اس لیے اس میں قصے سے قصہ پھوٹتا ہے، بات سے بات نکلتی ہے، فرصت جو ٹھہری۔ اس کتاب میں بھی آپ یہی دیکھیں گے۔ بندر جڑی مار کی







وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ودھان بھون اتر پردیش کے ایک فن کارانہ ماڈل کا معائنہ کرتے ہوئے۔



وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۱۳ ستمبر ۱۹۸۹ء کو سکریٹریٹ (انیکسی) لکھنؤ میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے۔





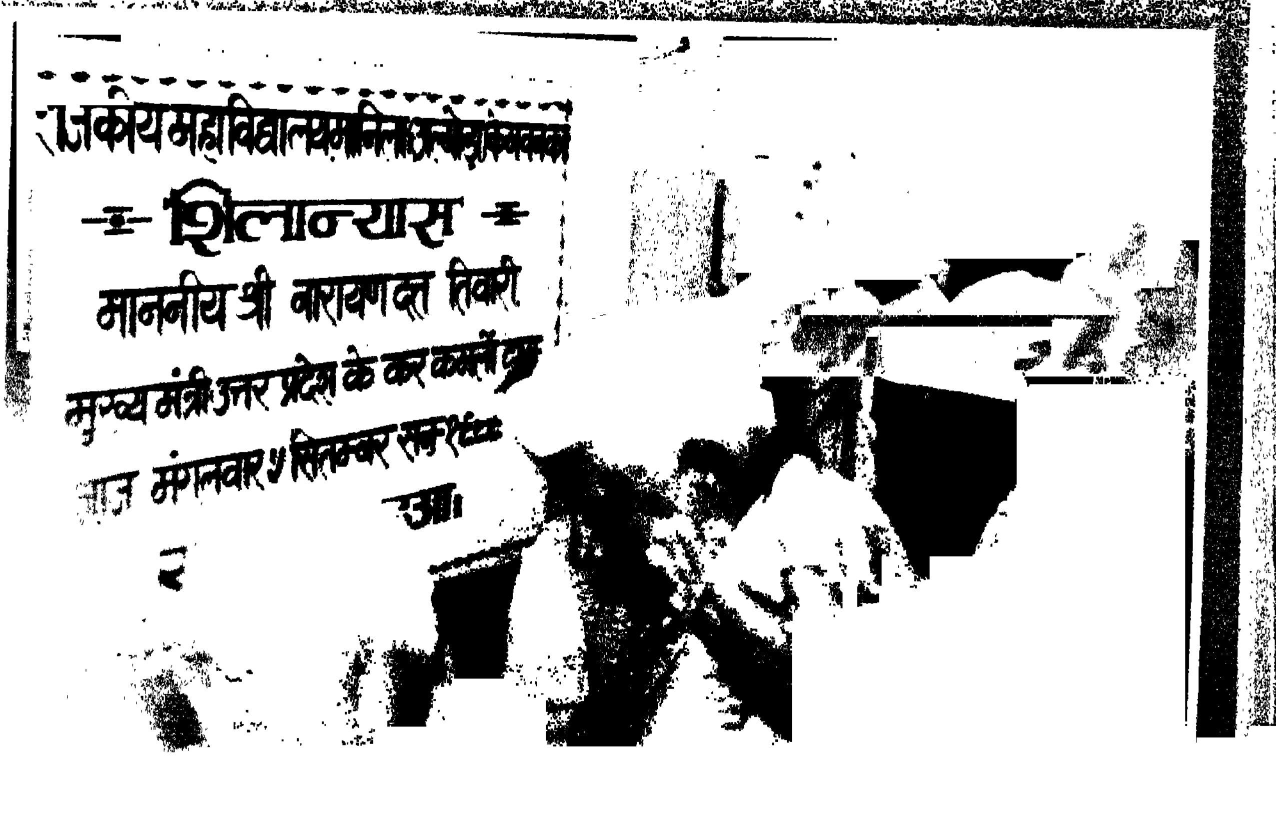






[illegible] سیلز ٹیکس اور تفریح ٹیکس کے محکموں کی پیش رفت
[illegible] ہوئے

[illegible] کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے



بیوی سے کہتا ہے:

"لالچ سے باز آ اور مجھے شہزادے کے ہاتھ
مت بیچ۔ خواہ مخواہ میری جان جائے گی۔ تو نے
خدا دوست کا قصہ نہیں سنا کہ اللہ کے راستے میں
ایک سلطنت دی اور دو پائیں۔"

عورت پوچھتی ہے:

"ہنومان جی وہ کیسے؟"

اور ہنومان جی بھی قصہ شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جڑواں بھائیوں کی کہانی درمیان میں آجاتی ہے۔ فسانۂ عجائب کا قصہ حسن و عشق کا معمولی قصہ ہے۔ اس کے واقعات میں کوئی جدت نہیں ہے اور عبارت بھی اسی زمانے کی مروجہ فارسی کی تقلید میں پرتکلف و پرتصنع اور مقفیٰ و مسجع ہے۔ یہ ایک فرضی افسانہ ہے جس میں سحر، طلسم، دیووں سے لڑائی، جادوگروں سے مقابلے، پریوں، شہزادوں شہزادیوں وغیرہ کی داستان مصنف نے اس طرح بیان کی ہے کہ قاری کے ذہن پر ایک عجیب سا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی عبارت پرتکلف ہے مگر اس میں واقعات کی فراوانی نہیں ہے۔ بعض فقرے ضرور ایسے ہیں جو مثل نظم کے دلچسپ اور ادبی مرصع کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔

دراصل یہ افسانہ اس وقت لکھا گیا جب میر امن دہلوی نے انگریزوں کی فرمائش پر باغ و بہار تالیف کی۔ اس میں میر امن نے دہلی کا باشندہ اور اہل زبان ہونے پر فخر کیا ہے۔ لکھنؤ والوں کو یہ بات ناگوار ہونی لازمی تھی۔ لکھنؤ اور دہلی کے ادیبوں میں برابر چوٹیں ہوتی رہتی تھیں۔ فسانۂ عجائب بھی ایسی ہی ایک چوٹ ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے یہ کتاب لکھ کر میر امن کی "باغ و بہار" کا جواب دیا ہے۔

میر امن نے اپنی کتاب آسان زبان میں لکھی تھی، سرور نے ادبی زبان کو پسند کیا۔

فسانۂ عجائب کا دیباچہ بہت دلچسپ ہے کیونکہ اس میں سرور نے شہر لکھنؤ کی سوسائٹی، وہاں کے طرز معاشرت، امرا و روسا کی وضعداریوں ان کے پرتکلف جلسوں، شہر کے رسم و رواج کھیل تماشوں، دلچسپ مناظر، مختلف پیشوں اور اہل کمال کے حالات بازاروں کی چہل پہل، سودا فروشوں کی آوازوں وغیرہ کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ اس کتاب میں سرور نے آدمیوں کا حال بیان نہیں کیا ہے بلکہ چیزوں کا مرقع کھینچا ہے۔

"فسانۂ عجائب" نثر کی اس طرز خاص کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس کی بنیاد تصنع اور بناوٹ پر ہے اور جس کی دلآویزی کا منبع مصنوعی حسن رہا ہے۔ ایک زمانے میں یہ افسانہ انشا پردازوں میں بہت مقبول تھا لیکن کچھ تو غالب کی تقلید اور کچھ انگریزی ادب کے اثرات سے لوگوں نے اس کو ترک کر دیا۔ فسانۂ عجائب میں جو شاعرانہ نثر ہے وہ شعر اور نثر دونوں کی خوبیوں سے عاری ہے اور دونوں کے عیوب سے پُر ہے۔ فسانۂ عجائب میں سرور نے ایسی زبان اپنائی ہے جس کو مقفیٰ عبارت کہتے ہیں اور جس کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس افسانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زبان کا مزا تو آتا ہے مگر بات سمجھ میں نہیں آتی۔

فسانۂ عجائب دراصل جانِ عالم اور انجمن آرا کی داستان ہے جس کو سرور نے بہت ہی خوبصورت اندازِ بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سرور نے فسانۂ عجائب کا قصہ ایک سال میں قلم بند کیا ہے۔ وہ اس قصے کو ایک عرصہ قبل لکھنؤ کی ایک صحبت میں سنا چکے تھے اور ان کے احباب نے انھیں مجبور کیا تھا کہ وہ اس قصے کو قلم بند کریں۔ چنانچہ جب وہ ۱۲۲۰ھ میں چند در چند اسباب کی بنا پر کانپور گئے تو وہاں انھیں اس قصے کو قلم بند کرنے کا موقع ملا۔ فسانۂ عجائب کی تاریخ حسبِ ذیل ہے ؎

جس نے سنا اس کو جی میں یہ لگا کہنے
یارب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا
تاریخ سرور اس کی منظور ہوئی جس دم
بیساختہ جی بولا "نشتر ہے رگ دل کا"

۱۲۴۰ھ

جس طرح انشا پردازی میں یہ کتاب مشہور ہے اسی طرح لکھنؤ کی اُس زمانہ کی معاشرت کی بھی ہو بہو تصویر ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سرور کا لکھنؤ وہ شہر خموشاں ہے جس کا نقشہ ٹینی سن (Tennyson)

نے اپنی مشہور نظم "ڈے ڈریم" (DAY DREAM) میں کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے :

"کہیں ٹیلر (خانساماں) اپنے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں بیٹھا ہے .... اور کہیں بڈھا اسٹوورڈ (باورچی) اپنے کام میں مصروف ہے۔ کہیں حسین میڈ (ماما) کا ہاتھ نوعمر خادم (پیج) نے پکڑ لیا ہے۔ میڈ کچھ کہنے کے لیے اپنا منھ کھولا چاہتی ہے۔ پیج بوسہ کے واسطے منھ لپکاتا ہے اور شرم کی سرخی میڈ کے رخساروں پر دوڑ جاتی ہے ۔"

"فسانۂ عجائب" میں سرور نے جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ اس زمانے کے مطابق ہے جس زمانے میں وہ کتاب لکھی گئی۔ مقفیٰ اور مسجع عبارتیں اس وقت اس درجہ مقبول تھیں کہ ان سے احتراز مشکل تھا۔ وہ شاعرانہ نزاکتوں کا دور تھا۔ اُردو میں جو کچھ لکھا جاتا تھا اس کی بنیاد فارسی کی آراستہ و پیراستہ اور پُرتکلف عبارتوں پر رکھی جاتی تھی اور قدم قدم پر فارسی کی تقلید ضروری سمجھی جاتی تھی اس تقلید پر سرور کو کمال حاصل تھا۔ اس لحاظ سے فسانۂ عجائب ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ یہ کتاب رجب علی بیگ سرور کا شاہکار سمجھی جاتی ہے اور اُردو کی تدریجی ترقی میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔

طالب علی خاں عیشی

صہ ۱۸ کا بقیہ

سیمیں ذقن و کشیدہ ابرو
غنچہ دہن و کمند گیسو
انداز و ادا خرام و چپ گھات
آشوب فساد، فتنۂ آفات
غمزہ ستم اور عشوہ قاتل
مژگانِ سیاہ، آفتِ دل
گھر میں گئی اپنے وہ پری وش
در پہ یہ کھڑا رہا فغاں کش
وہ بے خبر اس کے حالِ دل سے
یہ جاں برلب ملالِ دل سے
دل زندگیِ عزیز سے سیر
کھینچا گیا انتظار تا دیر
کی آہ نے تا فلک رسائی
پر تا درِ خانہ وہ نہ آئی
عیشی یہ دراز داستاں چھوڑ
خاموش ہو عشق کا بیاں چھوڑ
لب آبِ عقیق گوں سے تر کر
کونین سے مجھ کو بے خبر کر

**

حاشیہ :

لہ عیشی کے لیے دیکھیے : (۱) عمدۂ منتخبہ صہ ۴۴۲ (۲) گلشنِ بے خار صہ ۱۳۷ (۳) سخن شعرا صہ ۳۴۰ (۴) سراپا سخن صہ ۳۷۴ (۵) تذکرۂ عشق (دوم) صہ ۹۲ (۶) ریاض الفردوس صہ ۲۱۴ (۷) گلستانِ سخن صہ ۱۹۷ (۸) خوش معرکۂ زیبا (اول) صہ ۳۲۶ مرتبہ مشفق خواجہ (۹) ریاض الفصحا صہ ۲۱۴ (۱۰) طبقات شعرائے ہند صہ ۳۷۶ (۱۱) آبِ حیات صہ ۳۷۰ (۱۲) جلوۂ خضر جلد دوم صہ ۱۳۵ (۱۳) شعلۂ جوّالہ (مجموعہ واسوخت) مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ (۱۴) طالب علی عیشی : از سید محمود حسین قیصر امروہی "معارف" اعظم گڑھ، اپریل۔مئی ۱۹۶۰ء (۱۵) جائزہ مخطوطات اُردو جلد اول صہ ۶۰۶ مرتبہ مشفق خواجہ کراچی۔

اپنے معاونین سے

ارسال کردہ تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں عجلت کا مظاہرہ نہ کریں۔ کیونکہ تخلیقات کی ایک بڑی تعداد پہلے ہی منتظر اشاعت ہے۔

(ایڈیٹر)

غزلیں

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۱۰ ریوا بلڈنگ لیڈر روڈ
الہ آباد - ۳

روش روش پہ جہاں آج گل کھلے ہیں بہت
اُسی چمن سے ہمیں زخم بھی ملے ہیں بہت

نہ جانے عشق کی منزل بھی کیسی منزل ہے
تمام عمر چلے پھر بھی فاصلے ہیں بہت

یہ دیکھنا ہے کہ منزل کسے میسّر ہو
رواں دواں تری جانب تو قافلے ہیں بہت

وہ کیا ملے کہ پھر اپنی بھی کچھ خبر نہ رہی
یہی ہے قرب کا عالم تو فاصلے ہیں بہت

ہمارے دم سے سلامت ہے شوخی و رندی
وگرنہ شہر میں کہنے کو منچلے ہیں بہت

یہ کس مقام پہ لائی ہے گمرہی جوہر
کہ منزلیں تو ہیں نزدیک فاصلے ہیں بہت

ڈاکٹر فوق کریمی
کریمی لاڈنگ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

زخم دل تازہ ہوئے تو اُن کی یاد آئی بہت
کچھ دنوں سے چل رہی ہے اب کے پروائی بہت

آپ کو اپنا سمجھ کر کر لیا تھا اعتبار
اک ذرا سی بھول تھی لیکن سزا پائی بہت

ایک نے بھی بڑھ کے قاتل کے نہ روکا وار کو
بھیڑ میں تھے یوں تو میرے بھی شناسائی بہت

اب وہ مانیں یا نہ مانیں یہ ان کو اختیار
بات سمجھانے کی حد تک ہم نے سمجھائی بہت

اب تکلف اُن سے ملنے میں کریں تو کیوں کریں
اب تو گھر گھر ہو چکی ہے اپنی رسوائی بہت

جب تصوّر میں دریچے کھل گئے ماضی کے فوق
یاد اُن کی آئی بھی تو آ کے شرمائی بہت

ہوش ملیح آبادی
ملیح آباد لکھنؤ

مجھ پر کرمِ گردشِ ایّام بہت ہے
اس واسطے جینے کا بس اک کام بہت ہے

یہ کون سی منزل ہے مرے ذوقِ وفا کی
ہر سانس یہ کہتی ہے ابھی کام بہت ہے

دُنیا کے سہاروں کی ضرورت نہیں مجھ کو
میرے لیے اپنا دلِ ناکام بہت ہے

دامن کہیں مل جائے نہ اس شب کا سحر سے
کیوں آج اُداسی یہ سرِ شام بہت ہے

پینے کو تو تا عمر پیو کچھ نہیں حاصل
پینے کا سلیقہ ہے تو اک جام بہت ہے

پھر کیوں نہ مجھے ملتی مرے عشق کی منزل
جب جوشِ جنوں ہوش کا ہر گام بہت ہے

مختصر افسانہ

اقبال مجید
آکاش وانی، لکھنؤ

برادری والے

وہ آئی اور دو منٹ چپ کھڑی رہی۔

میں نے دیکھا سامنے محلے کے نکڑ پر ادھر ادھر کے اوباش لونڈے اسے دیکھ کر آپس میں جملے بازی کر رہے تھے۔ میں نے دہلیز پر اندر جانے کے لئے قدم رکھا، اور اس سے پوچھا۔

"کیوں ری؟ تو پھر آگئی؟"

وہ بے ڈھنگے طور پر دانت نکال کر ہنس پڑی۔ اٹھارہ یا بیس کی عمر چہرے پر ہلکے چیچک کے داغ رنگ ہلکا سانولا۔ بدن پر چپکی ہوئی میلی سی چولی اور بٹے گھیر کا لہنگا۔ ہو یا نہ ہو یہ عمر ہی کافی تھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے۔ وہ اپنی چکر کرتی ہوئی آنکھوں سے دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر دیکھنے لگی۔

میری بیوی نے اس کی جھولی میں ایک چٹکی آٹا ڈال دیا، جب وہ چلی گئی تو بیوی مجھ سے بولی۔

"یہ کمینی بڑی قیامت کی بنی ہوئی ہے۔"

"کیوں — ؟ خیریت تو — ؟"

وہ بولیں — "اس کے دیدے دیکھے تھے آپ نے کیسے پھٹے پھٹے ہیں، ایسے گھور رہی تھی آپ کو جیسے کھا جائے گی؟ میں ہنسنے لگا۔ وہ کبھی کبھی اپنی گلی کی طرف ضرور آتی۔ کبھی صبح صبح اور کبھی دوپہر اور آکر دروازے کے پردے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور اس کی مخصوص آواز سنائی دیتی۔

"بی بی، تنی ایک چٹکی آٹا دے دیو —" پہلے تو میری بیگم صاحبہ دور ہی سے اسے ایک دھتکار سنا دیتیں لیکن جب وہ ان کی ان سنی کر کے مستقل ایک ہی رٹ لگائے رکھتی تو وہ مجبوراً جان چھڑانے کی خاطر اس کی جھولی میں ایک چٹکی آٹا ڈال دیتیں۔ میں نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ عموماً میرے سامنے میری بیگم صاحبہ اس کو ایک منٹ نہ ٹکنے دیتیں۔ شروع شروع تو میں یہ بات نہیں پکڑ سکا، لیکن ایک دن مجھے اس طرح کا احساس ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز وہ میرے دروازے پر نمک مانگنے آئی میں نے اس سے یونہی بات کرنا شروع کر دی۔

"کیوں ری — ؟ تو کہاں رہتی ہے؟"

"رہت کہاں ہیں بابو — دیس دیس مانگت پھرت ہیں۔"

وہ اونچی آواز میں بولی:

"تیرے ماں باپ تو ہوں گے —" میں نے پوچھا۔

"باپ مرگوا، ماں جندا ہے —" اس نے جواب دیا، اور ابھی میں بات کر ہی رہا تھا کہ بیوی کی آواز آئی۔ "اچھا لے یہ آٹا اور چلتی بن —" وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میری بیگم صاحبہ نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ کہنے لگیں۔

"یہ آپ کو فقیرنی کا پتہ ٹھکانا پوچھنے کی کیا ضرورت آن پڑی"

"کچھ نہیں بس یونہی —" میں نے تیور دیکھ کر کچھ گھبراہٹ کا اظہار کیا۔

"کیوں کیا میں نے کوئی بڑی خطا کر ڈالی۔"

وہ حل کر لیں ۔۔۔" میں بھی اس کے باپ دادا کا پتہ لگا کر اس کو شاید اپنے گھر بٹھائیں گے ۔" یہ سن کر مجھے شرارت سوجھی اور بولا ۔

" آخر اس میں حرج ہی کیا ہے ۔ وہ بھی تو انسان ہے۔ اور پھر پٹاخہ ہے پٹاخہ ۔" بیگم صاحبہ کا دن بھر موڈ آف رہا۔

ایک دن میرے دل میں جانے کیا آئی کہ میں اپنی بیگم سے اس کو گھر میں اوپر کام کرنے کے لئے ملازم رکھنے کی سفارش کر بیٹھا ۔ ہوا یہ کہ اس بار جب وہ آئی تو میں نے اس سے تفصیل سے بات کی میں نے کہا ۔

" اس طرح گھر گھر بھیک مانگتی ہے کہیں نوکری کر لے"

پہلے تو اس نے میری بات ٹال دی آخر کار وہ بولی ۔

" بابو ہم کا کام کوئی ناہیں دیت ہے ۔"

" کیوں ۔۔۔ ؟ " میں نے پوچھا وہ بولی

"ہم کا کوئی جانت پہچانت ناہیں ہے ۔ بینا اعتبار کے کوئی کاہے کام دے دیہے ؟ "

" اچھا اگر تجھے نوکری ملے تو تو کرے گی ۔۔۔" اس سوال پر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی ۔ اس طرح اپنی بیگم سے تھوڑا سا جھگڑا فساد مول لینے کے بعد میں نے ان کو اُسے نوکر رکھ لینے پر راضی کر لیا ۔

اس کا نام جُھلیا تھا ۔ تھرکتی آنکھیں ، بھرے بھرے ہونٹ ، رنگ میں ملاحت اور چال میں ہلکی سی دہقانیت ۔ جُھلیا گھر میں کیا نوکر ہوئی میری گلی کے جیسے دن پھر گئے ۔ محلے کے آوارہ لونڈوں کے طواف ہونے لگے ، سیٹی اور کھنکھاریں ۔ میرے گھر کے آنگن میں لگی بیری کی یہ شاخ جب بھی جھومتی تو باہر سے کنکر بھی آتے ، یہ بیری میں نے ہی لگائی تھی اور میں ہی ان کنکروں پر پچھتا رہا تھا ۔

ایک دن میری بیوی نے کہا :

" میں کہتی ہوں کہ آپ نے یہ بلا کیوں مول لی ہے ؟ "

" وہ بلا تو نہیں ہے ۔۔۔ ؟ " میں نے کہا ۔ بیوی چڑھ گئیں

" ایسی ایسی آبرو باختہ لڑکیاں بہت ماری ماری گھومتی ہیں ۔ آپ دیکھتے ہیں سارا محلہ اپچ گیا ہے ، لوگ گھر کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں ۔ یہ سب آپ کو اچھا لگتا ہے ۔"

" غریب لڑکی کو آبرو باختہ سمجھنا بہت آسان ہے ، اور اٹھی ہوئی انگلیاں حلف تو نہیں ہوتیں ۔" جُھلیا سے مجھے کوئی شکایت نہیں تھی ۔ سوائے اس کے کہ کھانے کی چیزیں کبھی کبھی نکال کر کھا جاتی تھی ۔

کام بھی بُرا نہ کرتی تھی ۔ دن بھر گھر میں رہتی تھی ۔ رات کو بھی گھر میں ہی سوتی ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ملتی تو وہ اپنے گھر چلی جاتی جُھلیا اپنی اس نئی زندگی سے مطمئن تھی کہ نہیں اس کا احساس مجھے تھا وہ قطعی مطمئن نہیں تھی ۔ ہر وقت کی خاموشی اور کھوئے کھوئے سا رہنا اس بات کا ثبوت تھا ۔ لیکن جب وہ چھٹی کر کے واپس آتی تو ایک آدھ دن کافی ہشاش بشاش رہتی ۔ ویسے جُھلیا میں کچھ تبدیلی بھی آچکی تھی ۔ میری بیوی نے اس کو اپنے دو ایک پرانے جوڑے بھی دے دیئے تھے ۔ ہفتے میں دو بار نہانا ، کپڑوں کو نسبتاً صاف رکھنا بالوں کی وہ ویرانی اور بے ترتیبی اب ترتیب میں بدل چکی تھی اور اور سب ملا کر اس میں قدرے تیکھاپن آگیا تھا ۔

ایک دن عجیب بات ہوئی ، جُھلیا چھٹی پر گھر گئی ۔ شام کو میں بازار کچھ سامان لینے گیا ، وہاں میں نے دیکھا کہ بازار کے نکڑ پر مجمع کے درمیان میلی کچیلی پوشاک پہنے لوگوں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر بھیک مانگتی پھر رہی تھی ۔ اس کے ہاتھ میں المونیم کا ایک کٹورہ تھا ۔ پیروں پر خاک جمی ہوئی تھی اور سر کے بال بے ترتیب تھے ، ایک لمحے کے لئے میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا ۔ اور پھر خاموشی کے ساتھ گھر لوٹ آیا ۔ میں نے بیگم سے کچھ نہ کہا میں نے سوچا ۔۔۔" نالی کا کیڑا نالی میں گرتا ہے ۔ یہ جنم جنم کی عادتیں ایسے تو چھوٹ نہیں سکتیں ۔ مجھے افسوس ہوا ۔ جیسے میں کوئی چیز بناتے بناتے بگاڑ بیٹھا تھا ۔

دوسرے دن جُھلیا گھر آئی ۔۔۔ خوش خوش بنی سنوری ۔ میں اسے دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو گیا ، اور اسے اپنے پاس بلا کر کہا " کل سے تمہارے یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے ۔" جُھلیا نے ایک بار میری طرف دیکھا ، اور پھر وہ تھرکتی ہوئی آنکھیں جیسے کوئی بھید پا کر ٹھٹھر گئیں ۔

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

ایم کوٹھیاوی راہی
ایڈیٹر اشتراک ... ویکلی - قاضی پور خرد گورکھپور

افسانہ

پانچویں سمت کا مسافر

دونوں کچھ دُور چُپ چُپ چلتے رہے۔ کوئی ایسا موضوع نہیں رہ گیا تھا جس پر بات کرسکتے۔ آخر وہ کہنے لگا۔ "سیہ پوش اندھیرا سر نہوڑھائے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا میرا وجود بس رات بھر کا ہے۔ سورج اُسے اَن گنت بار نگل چکا ہے مگر ہضم نہیں کر پایا ہے۔ سورج کا ہاضمہ کتنا خراب ہے ....."

"تمہارے ہاضمے کی طرح"۔ دوسرے نے بات کاٹی۔ "اس مہمل موضوع میں بھی اَب دَم نہیں رہا۔"

"دُنیا کا ہر موضوع مہمل ہے"۔ پہلے والا بولا۔ "بہتر ہے ہم چُپ ہی رہیں"! مگر اب مجھ سے چُپ نہیں رہا جاتا۔"

"تو میرا ساتھ چھوڑ دو!"

"تمہارا ساتھ بھی؟ گویا تم بھی اکتا گئے مجھ سے!"

اب وہ اکیلا تھا، اس نے کالے آسمان میں لہو بھرے تاروں پر نظر ڈالی، اسے سُرخ تاروں کے آگے ایک دنیا نظر آئی۔ اور اس دنیا کا سُونا پن بھی۔ مگر اس سُونے پن میں اُسے ایک سکون سا نظر آیا، شاید اسی سکون کا نام خدا ہے۔

سکون کی کیفیت اس دنیا میں دو مختلف تاثر رکھتی ہے ــــ ایک تاثر طوفان کے آنے کا، ایک تاثر طوفان کے جانے کا۔ مگر اس دنیا کا سکون ایک اور ہی تاثر رکھتا تھا نہ طوفان کے آنے کا، نہ طوفان کے جانے کا، اس سکون کا تاثر کی ایک اور ہی کیفیت تھی جو بہر حال ناقابلِ بیان ہے۔ وہ لہو بھرے تاروں کے اس پار والی دنیا، وہ اس کے سونے پن اور سکون میں دیر تک کھویا رہا۔

"آسمان میں کیا دیکھ رہے ہو؟" ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے گھوم کر نظر ڈالی، ایک دھندلی سی لڑکی نہ جانے کب سے اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

"کچھ نہیں ــــ مگر تم کون ہو؟" اس نے پوچھا۔

لڑکی نے بھی اِس سوال کو دُہرا دیا۔

"کچھ نہیں ـــ مگر تم کون ہو؟"

"جو تم نہیں ہو وہ میں ہوں!"

"اور میں بھی، جو تم نہیں ہو وہ میں ہوں!"

"عجیب بات ہے!"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں!"

دونوں کچھ دیر چُپ کھڑے رہے۔

وہ سوچ رہا تھا ــــ شاید تنہائی میرے نصیب میں نہیں، کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی مِل ہی جاتا ہے، اُس نے اپنے اُس آخری ساتھی کے بارے میں سوچا جو بولنے پر بھی پابندی لگا دینا چاہتا تھا۔ جس کی نظر میں ہر موضوع مہمل تھا ــــ وہ سوچتا رہا: جب ہر طرف مہملیات ہوں تو آخر اس کا کیا علاج ــــ وقت اور حالات سے سمجھوتا کیے بغیر زندگی خود ایک مہمل سی شئے ہو کر رہ جاتی ہے ــــ نہیں نہیں ــــ زندگی مہمل نہیں ہو سکتی "زندگی کو مہمل مت کہو"، اُس کی سوچ اس کے منہ سے نکل گئی۔

"میں نے اپنی زندگی کو مہمل کب کہا؟" دھندلی لڑکی بول اٹھی۔

"کیا بکنے لگے تم؟"

"میں نے تو کچھ نہیں کہا!"

"ابھی ابھی تم نے یہ کہا ہے!"

"کیا کہا ہے؟"

"زندگی کو مہمل مت کہو!"

"تو کیا زندگی واقعی ایک مہمل سی شئے ہے؟"

"نہیں تو ——— مگر یہ تم نے کیوں کہا ——؟" وہ پوچھے جا رہی تھی۔

"تم نہیں سمجھو گی، اچھا ایک بات بتاؤ!"

"پوچھو!"

"تم کون ہو؟"

"یہ بھی کوئی بات ہوئی —— کیا میں تم کو نظر نہیں آ رہی ہوں؟"

"دیکھ رہا ہوں!"

"میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ مہینوں، برسوں سے دیکھ رہی ہوں، روزانہ اسی وقت اسی جگہ رک رک جاتے ہو اور آسمان کو گھورنے لگتے ہو، تمہارے ساتھ والا آدمی تمہیں اس مقام پر لا کر اکیلا چھوڑ جاتا ہے ——!"

"یہ کون سا مقام ہے، کون سی جگہ ہے اور وہ کون سا آدمی ہے، کون سا شخص ہے اور تم کون ہو ——— کہاں کی مخلوق ہو؟؟"

"مجھے پتہ نہیں وہ کون ہے، تم کون ہو، ہاں یہ جگہ اس بستی کا انت ہے، جس بستی کے لوگ چن چن کر زندہ جلا ڈالے گئے تھے۔۔۔۔۔۔!"

"اور تم کون ہو ——؟"

"اس اندھیرے میں شاید مجھے پہچان نہیں پاؤ گے، آؤ اس بستی کے اس انت کو بھی چھوڑ دیں، دیکھو! اس طرف شاید کوئی مشعل ہے، پیلا سا ایک دھندلا نشان۔۔!"

دونوں چپ چپ چلتے رہے، پہروں۔ گھنٹوں۔

پیلا سا وہ دھندلا نشان جہاں تھا وہاں وہ ابھی پہنچ نہیں پائے تھے۔

"تم تھک تو نہیں گئے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"نہیں تو ——!"

"تمہاری رفتار کم ہوتی جا رہی ہے!"

"نہیں تو" اس نے کہا۔

"کچھ بات کرو!" وہ بولی۔

"بات کرنے کے لئے کوئی موضوع چاہئے" وہ اکتا کر بولا۔

"بہت سے موضوع ہیں" وہ اٹھلا کر بولی۔

"مثلاً ——؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی بھی!"

"آخر!" اس نے زور دے کر پوچھا —"چاہتی کیا ہو؟"

"تم اپنی درماندگی کے احساس کو فراموش کر دو ——!"

"میں درماندہ کب ہوں؟"

"تم پر تھکن غالب آتی جا رہی ہے۔!"

"اگر یہ درست ہے تو کیا اس تھکن کا علاج بے تکی باتوں میں ہے؟"

"میں بے تکی باتوں کے لئے نہیں کہہ رہی ہوں، کوئی ایسا موضوع ہو گا جس پر ہم کچھ دیر گفتگو کر سکیں۔۔۔۔۔"

"کوئی ایسا موضوع باقی نہیں رہا!"

"تو پھر پیار ہی سہی ——!"

"ہونہہ! پٹا پٹایا موضوع ——!"

"ہر موضوع پٹا پٹایا ہے، کوئی موضوع نیا نہیں ہے۔ جب کسی نئے موضوع کی تلاش ذہن کو تھکا دیتی ہے تو پھر کوئی پٹا ہوا موضوع ہی سہارا بنتا ہے اور میں سمجھتی ہوں پیار سے زیادہ پٹا ہوا اور کوئی موضوع نہیں، کیا خیال ہے؟"

"مجھے چپ چاپ چلنے دو!"

"مگر میں دیکھ رہی ہوں، تم تھکتے جا رہے ہو!"

"یہ غلط ہے!"

"تم اپنی تھکن کو چھپا رہے ہو، یہ مرد کی فطرت ہے، عورت کے سامنے وہ سدا تنہا ہی رہنا پسند کرتا ہے!"

"یہ کیا بک رہی ہو؟"

"میں صحیح کہہ رہی ہوں!"

"تم میرا ساتھ چھوڑ دو!"

"میں اس پیلے دھندلے نشان تک ساتھ رہوں گی!"

"میں لوٹ جاؤں گا!"

"اب تم جدھر بھی جاؤ گے وہ نشان دکھائی دے گا اور وہ نشان جب تک دکھائی دے گا میں تمہارے ساتھ رہوں گی!"

یہ اس کی دوسری سمت تھی۔

مگر اس سمت کے سفر میں بھی وہ اس کے ساتھ تھا۔

یہ اس کی تیسری سمت تھی ——

اس سمت کے سفر میں بھی ۔

یہ اس کی چوتھی سمت تھی ـــــ

اس سمت کے سفر میں بھی

اور رات ابھی باقی تھی

وہ تھک کر چور چور ہو چکا تھا ۔

اس کی ٹانگیں پھوڑوں کی طرح دکھنے لگی تھیں مگر اس دھندلی لڑکی کا وہی عالم تھا.

وہ اچانک رُک گیا ۔

لڑکی نے اُس کے شانوں کو تھپ تھپایا

"تھک گئے مسافر ۔ ؟"

"نہیں تو !"

"رُک کیوں گئے ـــــ ؟"

"یونہی !"

"وہ پیلا دھندلا نشان دیکھ رہے ہو نا ؟"

"ہاں !"

"یہ چوتھی سمت ہے !"

"تو کیا ہوا ـــ ؟"

"پیار پر بات کرو ـــ یہی موضوع اب ٹھیک رہے گا ـــ !"

"آسمان اب کالا نہیں ہے !" وہ بولا ۔

"آسمان کا پیلا پن آہستہ آہستہ لوٹ رہا ہے !" ـــ وہ بولی.

"ہاں لوٹ رہا ہے !" اس کے لہجے سے تھکن ٹپکنے لگی تھی ۔

"اور وہ پیلا دھندلا نشان۔ ۔ ۔ ۔ ۔" لڑکی کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

"ہاں ہاں وہ بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس کے لہجے میں ہار تھی ۔

"اور وہ لہو بھرے تارے کیا ہوئے مسافر ؟" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لڑکی نے چوٹ کی ۔

"اس بستی کے لوگ ایک ایک کر کے جلا ڈالے گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی یادوں کی طرح وہ لہو بھرے تارے بھی گم ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لئے اب آسمان بھی زمین کی طرح ـــــ !"

دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو ! مسافر دیکھو ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پیلا دھندلا نشان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب دھندلا نہیں رہا ۔ ۔ ۔ ۔ !" اچانک اس لڑکی کا لہجہ بدل گیا ، اس نے دیکھا ، وہ لڑکی واضح ہوتے ہوئے پیلے نشان کی ، نیم سُرخ روشنی میں اسے کچھ عجیب سی لگی ۔ ۔ ۔ جیسی داستانوں کی فلاکت زدہ شہزادیاں لگتی ہیں ، جو اپنے شہزادوں کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی اکثر عام بازاروں اور گلی کوچوں میں نکل آیا کرتی ہیں ۔

اسے محسوس ہونے لگا ۔ اب وہ بھی عام بازاروں اور گلی کوچوں میں نکل آیا ہے ۔ یہاں تک پہنچا کر اس نے لمبی سرد آہ بھری اور بولی : " اچھا مسافر ! خدا حافظ چلتی ہوں ـــ !"

پورب کے آسمان پر واضح ہوتا ہوا دھندلا نشان اب ایسا لگ رہا تھا جیسے رات کا اگلا ہوا سُورج ـــــ !

برادری والے

بقیہ ص ۲۹

وہ آہستہ سے بولی :

" کاہے بابو جی ہم سے کوئی گلتی ہو گئی ۔"

" غلطی کا سوال نہیں ہے ، بس کل سے تم مت آنا ۔"

اس نے کچھ جواب نہ دیا ۔ چپ کھڑی رہی ۔ میں اسے گھورتے ہوئے بولا ۔

" ایک بات پوچھوں سچ سچ بتائے گی ـــ" اس نے اقرار میں گردن ہلا دی ۔

" تو اپنی چھٹی کے دن کیا کرتی ہے ـــ ؟" یہ سن کر اس نے گردن جھکا لی ۔ کچھ دیر پیر کے انگوٹھے سے زمین کھودتی رہی پھر بولی : " بھیک مانگت ہوں بابو جی ۔"

میں اس کی اس صاف گوئی پر چکرا گیا ۔ میں سمجھا تھا وہ کوئی بہانا بنائے گی ۔ میں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا ۔

" کیوں کیا ستر روپے مہینہ اور روٹی میں تجھے پورا نہیں پڑتا ؟"

" ہم کب کہا بابو ـ" اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں ۔

" تو پھر تو بھیک کیوں مانگتی ہے ۔" میں نے تیزی سے سوال کیا ۔

" بھیک نہ مانگیں بابو تو برادری حقہ پانی بند کر دے ۔" وہ آہستہ سے بولی ۔ " برادری چھوٹ جئے ہے تو ہمرا گونا کس ہوئے ہے ۔" میں نے دیکھا کہ یہ کہہ کر جُلیا نے اپنی چادر کے پلو میں اپنا منہ چھپا

غزلیں

مشتاق لکھیم پوری

مہاراج گنج، لکھیم پور کھیری

صلیب و دار سے کوئی خطر نہیں ہوتا
جو بات سچ ہو تو کہنے میں ڈر نہیں ہوتا

سمجھ لو دُنیا کو اپنی سنوارنے والو
ہو مختصر جہاں رہنا وہ گھر نہیں ہوتا

ہمارے دل ہوئے جب سے خلوص سے خالی
ہماری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا

قدم قدم پہ تمہارا خیال آتا ہے
رہِ حیات میں جب ہمسفر نہیں ہوتا

وفا کی رکھو نہ اُمید بے وفاؤں سے
یہ وہ درخت ہیں جن میں ثمر نہیں ہوتا

دلوں میں جرأتِ پیکار بھی ضروری ہے
کوئی بھی معرکہ باتوں سے سر نہیں ہوتا

تمہارا شہر ہے مشتاق ایسا شہر جہاں
سحر تو ہوتی ہے نورِ سحر نہیں ہوتا

طاہر انجم

معرفت اشتراک ویکلی، قاضی پور خرد
گورکھپور

کشتی میں ہو موجوں پہ نظر بھی نہیں رکھتے
تم آمدِ طوفاں کی خبر بھی نہیں رکھتے

آسان نہیں منزلِ جاناں پہ پہنچنا
یہ راستے وہ ہیں جو شجر بھی نہیں رکھتے

کیا موسمِ باراں کا مزہ ان کو ملے گا
جو سینۂ ہجراں میں شرر بھی نہیں رکھتے

جب زخم دکھاتے تھے تو ہنستا تھا زمانہ
ہم وہ ہیں جو اب دیدۂ تر بھی نہیں رکھتے

کیا جانیے صورت یہ نگاہوں میں ہے کس کی
ہم اور کسی شے پہ نظر بھی نہیں رکھتے

جب سے کہ ترے شہر سے لوٹ آئے ہیں جاناں
ہم مشغلۂ شام و سحر بھی نہیں رکھتے

اُن پیڑوں کے نیچے بھی ٹھہر لیتے ہیں انجم
سایہ جو نہیں دیتے ثمر بھی نہیں رکھتے

راشد ندیم

معرفت سعید آفاقی صاحب
بروزئی، شاہجہاں پور

نظر کے راستے دل میں اُتر نہیں جا
ہمیں خود اپنے سے بیگانہ کر نہیں جا

دیے ہیں غم جو کسی نے وہ اک امانت ہیں
کسی کے سامنے با چشمِ تر نہیں جا

اٹھائی جس کے لیے مشکل سفر ہم نے
اسی نے اپنا کبھی ہم سفر نہیں جا

مجھے تو عزم کی دیوی نے یہ سکھایا ہے
کوئی بھی آندھی ہو لیکن بکھر نہیں جا

بھڑک اُٹھے گی یقیناً یہ نسلِ نو اک دن
زمانہ اس کے تقاضے اگر نہیں جانا

یہ اشک ہی تو مری زندگی کا حاصل ہیں
مگر کسی نے انھیں معتبر نہیں جا

تھکن تو روکے گی تیرے قدم مگر راشد
رہِ طلب میں کہیں تو ٹھہر نہیں جا

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی
مہاتما گاندھی ڈگری کالج ــــ سنبھل

بھارتیندو ہریشچندر کی اردو شاعری

عہد آفریں شخصیت و تاریخ ساز تخلیق کار و ڈرامہ نگار بھارتیندو ہریشچندر نے ہندی ادب میں منفرد و غیر فانی درجہ حاصل کیا۔ انھوں نے اپنی گراں قدر تخلیقات و نگارشات سے ہندی ادب کا دامن مالا مال کیا اور ہندی صحافت ـــــ و ڈرامہ نویسی کی تاریخ میں انقلابی فن کار کی حیثیت سے امر ہو گئے۔ وہ صحیح معنی میں بھارتیندو (بھارت کا چاند) تھے جو آسمان ادب پر اس طرح طلوع ہوئے کہ اپنی روشنی سے زندگی کے ایوان جگمگا دیئے جب تک ہندی کی تاریخ باقی ہے، ان کا نام اور فن زندہ و تابندہ رہے گا۔ ہندی ادب کے اس چاند کی ضیا باری سے اردو ادب بھی فیضیاب ہوا ہے پیش نظر تحریر میں اسی پہلو پر روشنی ڈالنے کی جسارت کی گئی ہے۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ مایہ ناز و تاریخ ساز شہر بنارس جہاں راجہ ہریش چندر سچائی کی آن کی خاطر نیلام ہوئے، اسی کی آغوش میں وہ سارناتھ ہے جہاں مہاتما گوتم بدھ کا پیغام:

"بدّھم شرنم گچھامی۔۔۔ بدّھم شرنم گچھامی" ـــــ کی صدا آج بھی گونج رہی ہے۔
اسی دھرتی پر سنت کبیر کی امر باتی بلند ہوئی اور اسی کی خاک سے جنمے عظیم شاعر تلسی داس نے "رام چرت مانس" جیسا شاہکار تخلیق کیا اور ۱۸۵۰ء کی ۹ ستمبر کو، پیر کے دن اسی مایہ ناز شہر بنارس میں ایک چاند طلوع ہوا جسے دنیائے ادب بھارتیندو ہریشچندر کے نام سے جانتی ہے۔

بھارتیندو ہریش چندر کے والد بابو گوپال چند عرف گردھر رائے بنارس کے ذی حیثیت و متمول خاندان کے فرد تھے۔ وہ ہندی، سنسکرت، بنگلہ اور اردو کے معروف عالم اور ادب نواز شہری تھے۔ ان کے گھر پر ادبی محافل منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ وہ برج بھاشا میں شاعری بھی کرتے تھے اور ادیبوں و شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے تھے۔ بھارتیندو نے اسی ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور ادبی فضا میں پروان چڑھے۔

شاعری کا ذوق فطری تھا۔ ۵ سال کی عمر میں پہلا دوہا کہا۔ اور والد سے خراج تحسین و شاباشی حاصل کی۔ ۱۲ سال کے سن سے تخلیق شعر و ادب کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ۱۸۶۵ء میں جب ان کی عمر صرف ۱۵ سال تھی، اہل خاندان کے ہمراہ جگن ناتھ کا سفر کیا۔ سفر کے دوران انھوں نے بنگلہ ادب کا مطالعہ کر کے جدید رجحانات سے آگاہی حاصل کی اور یہ محسوس کیا کہ ہندی میں ان موضوعات و مسائل کو جگہ نہیں ملی ہے جن پر بنگالی زبان میں لکھا جا چکا ہے۔ اس احساس نے ان کو عصری آگاہی اور انقلابی تصور سے آشنا کیا اور وہ وقت کی آواز پر لبیک کہنے کی طرف راغب ہوئے۔ ۱۸۶۸ء میں انھوں نے بنگلہ ناٹک "ودیا سندر ناٹک" کا ہندی ترجمہ کر کے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ جو ہندی میں نئے اسلوب کا محرک رہا۔ اسی سال انھوں نے "کوی وچن سدھا" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ ۱۸۷۳ء میں دوسرا جریدہ "ہریشچندر میگزین" جاری کیا۔ آٹھ شماروں کی اشاعت کے بعد اس کا نام "ہریش چندر چندریکا" ہو گیا۔ اس رسالے میں وہ خود بھی لکھتے تھے اور دوسرے ادیبوں سے بھی لکھواتے تھے۔ ان رسائل سے ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۷۴ء میں انھوں نے پہلا طبع زاد ڈرامہ "ویدکی ہنسا ہنسا نہ بھوتی" تخلیق کیا جس میں تصنع و ریاکاری کی عبادات کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اسی سال بھارتیندو جی نے عورتوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے مقصد سے ایک پرچہ "بالا بودھنی" نکالا۔

بھارتیندو ہریش چندر نے تقریباً ۲۲ سال تک ہندی شعر و ادب، ڈرامہ و صحافت اور دیگر اصناف ادب میں قلم کے جوہر دکھائے۔ انھوں نے لگ بھگ ساٹھ کتابیں لکھیں شاعری، ڈرامہ، مضمون نگاری، صحافت کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح، تنقید و تاریخ وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ ہندی ڈرامہ نگاری میں انھوں نے منفرد و ممتاز مقام حاصل کیا انھوں نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ اسٹیج پر آکر اداکاری و ہدایت کاری کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کئے،

نیشنل تھیٹر" اور "آریہ ناٹک سبھا" کے قیام میں اہم کردار نبھایا اور ان اداروں کے ذریعہ پیش کئے جانے والے ڈراموں میں اداکاری و ہدایت کاری کا بہترین مظاہرہ بھی کیا۔

ڈراموں اور صحافت کے ارتقا میں انھوں نے گہری دلچسپی لی۔ "کاشمیر کسم" اور "بادشاہ درپن" جیسی کتابیں لکھ کر تاریخ نگاری کو نئی سمت عطا کی۔ وہ ہندی سنسکرت، فارسی، بنگلہ زبانوں کے اچھے واقف کار اور انگریزی کے شناسا تھے۔ انھوں نے ۱۹ ناٹک لکھے۔ طبع زاد ڈراموں میں ویدکی ہنسا ہنسا نہ بھوتی، چندراولی بھارت درردشا، نیل دیوی، اندھیر نگری، پریم یوگنی اور ترجمہ کئے ہوئے ناٹکوں میں ودیا سندر، پاکھنڈ وڈمبن، دھننجیہ وجے، کرپور منجری، مدرا راکھشس، ستیہ ہریش چندر بھارت جننی مشہور و معروف ہیں۔

بھارتیندو ایک حساس اور دردمند فن کار تھے۔ قومی، ملکی، سیاسی اور سماجی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنی ذات سے انجمن بھی تھے اور انجمن ساز بھی۔ ادیبوں و شاعروں کی حوصلہ افزائی و سرپرستی کا جذبہ ورثے میں پایا تھا۔ انھوں نے ہندی ادب کو ایک نیا تصور بھی عطا کیا اور نئی جہات سے بھی روشناس کرایا۔ ان کی غیر معمولی خدمات کے باعث ہی ان کے عہد کو 'بھارتیندو یگ' کا نام دیا گیا۔ وہ آسان اور عام فہم ہندی کے بانی بھی کہے گئے اور ہندی ڈرامہ نگاری و صحافت نگاری کے معمار اول بھی۔ ہندی نثر میں انھوں نے صاف ستھرا، متین اور متوازن طرز نگارش اختیار کیا تو شاعری میں بھکتی، شرنگار، عشق حقیقی اور واردات قلبی کی ایسی ترجمانی کی کہ ان کی تحریریں دلکشی و تاثیر کا مرقع بن گئیں۔ بھکت سروسو، بھکت مال، پریم ملکہ دان لیلا، پریم ترنگ، پریم مادھری، کرشن چرت جیسی تخلیقات ان کے نظریہ عشق اور تصور عبادت (بھکتی) کی مظہر ہیں۔ ست سئی شرنگار، پریم پھلواری، پریم سرودر میں شرنگار رس کی رعنائیاں جلوہ گر ہیں اور اندر سبھا، بکری وِلاپ، ہولی ورشا و نود، راج سنگرہ، مدھو مکل، وسنت، شری رام لیلا، پربودھنی میں طنز و مزاح کی چاشنی اور اصلاح معاشرہ کی خواہش نہاں ہے۔ نیز وجے وجینتی، بھارت ویرتو، وجے بلری، سمن انجلی میں وطن پرستی اور دیش پریم کے جذبات و احساسات کی کارفرمائی ہے۔[٢]

اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارتیندو ہریش چندر نے اپنی خدمات و تخلیقات کے ذریعہ ہندی ادب کی تاریخ میں جو غیر فانی مقام حاصل کیا وہ بہت کم تخلیق کاروں کو حاصل ہوا ہے۔ ان کے جیسے غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ادیب و شاعر چند ہی ہوئے جنھوں نے فکر و فن کے ایسے چراغ روشن کئے جن سے نگاہیں آج بھی خیرہ ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ بھارتیندو ہریش چندر کئی زبانوں کے ماہر و شناسا تھے۔ ان میں اردو بھی ہے ان کی اردو شاعری کے ذکر کے بغیر نہ تو ان کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے اور نہ اردو شاعری کی تاریخ مکمل کہی جا سکتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندی کے اس جید عالم اور انقلابی تخلیق کار نے عروس سخن کے گیسو بھی سنوارے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں اردو نظم و نثر کے دلکش نمونے پیش کئے ہیں۔ انھیں اردو الفاظ، اردو اصطلاحات، اردو محاوروں اور کہاوتوں پر قدرت حاصل تھی۔ ان کے ڈراموں کی بعض بعض عبارتیں اور مکالمات تو خالص اردو کے ہیں۔ جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

بھارتیندو کو غزل سے گہری انسیت تھی۔ ان کا تخلص رسا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا ناقدین ادب کا کام ہے کہ کلام رسا کی فنی و ادبی حیثیت کیا ہے اور انھیں کس درجہ پر فائز کیا جائے؟ اردو کے طالب علموں کے لئے یہ بات کم اہم نہیں ہے کہ اردو ادب کی آبیاری کرنے والوں میں بھارتیندو ہریش چندر بھی شامل ہیں اور کشت فن کی نمو میں ان کا خون جگر صرف ہوا ہے۔

بھارتیندو کے ادبی سرمائے میں جا بجا اردو اشعار اور غزلیں ملتی ہیں جن کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کلام رسا میں زبان کی سادگی، رعنائی، دلکشی اور روانی پوری طرح جلوہ افروز ہے۔

غزل

بیٹھا جو شام سے ترے در پر سحر ہوئی — افسوس اے قمر نہ کیوں مطلق خبر ہوئی
ارمانِ وصل یوں ہی رہا سو گئے نصیب — جب آنکھ کھل گئی تو یکایک سحر ہوئی
پچھتا تا ہوں کہ آنکھ عبث تم سے لڑ گئی — برچھی ہمارے حق میں تمہاری نظر ہوئی
چھانی کہاں نہ خاک نہ پایا کہیں تمہیں — مٹی مری خراب عبث دربدر ہوئی
دھیان آ گیا جو شام کو اس زلف کا رسا — الجھن میں ساری رات ہماری بسر ہوئی

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس باقی ترا آباد مے خانہ
سنبھل بیٹھو ارے مستو ذرا ہشیار ہو جاؤ
کہ ساقی ہاتھ میں مے کا لئے پیمانہ آتا ہے
خدا ملے تو ملے آشنا نہیں ملتا
کسی کا کوئی نہیں دوست سب کہانی ہے[٣]

بھارتیندو سچے محب وطن اور نڈر قلم کار تھے۔ انھوں نے نظم و نثر میں انگریزی سامراج کے جور و ستم کے خلاف کھل کر آواز اٹھائی ان کی نظر میں انگریزی سامراج کی تصویر کیا تھی؟ انھیں کی زبانی ملاحظہ کیجئے:۔

انگریزی راج سکھ ساج سجے بھاری　　　پے دھن ودیش چلی جات اتی خواری

انھوں نے امیر خسرو کی طرز پر کہہ مکرنیاں بھی کہی تھیں۔ ان میں بھی گہری چوٹ اور تیکھا طنز موجود ہے۔

تن بلا دے تیرہ آدے انج نج دیتا رو کسا دے　　　آنکھیں پھوٹی بھرا نہ پیٹا کیوں سکھی سجن نہیں انگریز

انگریزی سامراج کی برکتیں تو دیکھ لیں۔ انگریزی عہد حکومت کی لعنتوں اور ہندوستانیوں کی درگت کا احساس ہندوستانیوں میں کتنا تھا اور وہ کس نشے میں مست و بے خود تھے۔ اس کا حال بھی بھارتیندو جی سے سنئے۔ بھارت دُردشا، میں ہندوستانیوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دنیا میں ہاتھ پیر ہلانا نہیں اچھا　　　مر جانا پے اٹھ کے کہیں جانا نہیں اچھا
رہنے دو زمیں پر مجھے آرام یہیں ہے　　　چھیڑو نہ نقش پا ہیں، مٹانا نہیں اچھا
اٹھ کر کے گھر سے کون چلے یار کے گھر تک　　　موت اچھی ہے پر دل کا لگانا نہیں اچھا
فاقوں سے مریے پر نہ کوئی کام کیجئے　　　دنیا نہیں اچھی ہے، رمانا نہیں اچھا
سجدے سے گر بہشت ملے، دور کیجئے　　　دوزخ ہی سہی سر کا جھکانا نہیں اچھا
مل جائے ہند خاک میں ہم کاہلوں کو کیا　　　اے میرفرش رنج اٹھانا نہیں اچھا

ایک اور مزاحیہ ڈرامے 'بندر سبھا' میں شوخی و ظرافت اور طنز و مزاح کے پردے میں کیسی کیسی چوٹیں کی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سبھا میں دوستو بندر کی آمد آمد ہے　　　گدھے و فولوں کے افسر کی آمد آمد ہے

وہ موٹا تن، وہ تھل تھل دھندلا سا منہ کنجی آنکھ　　　وہ موٹے ہونٹ پھندر کی آمد آمد ہے

پاجی ہوں میں قوم کا بندر میرا نام　　　بن فضول کودے پھرے مجھے نہیں آرام

آج محفل میں شتر مرغ پری آئی ہے　　　گویا محفل میں وہ لیلیٰ اتری آئی ہے

گاتی ہوں میں او ناچ سدا کام ہے میرا　　　اے لوگو! شتر مرغ پری نام ہے میرا
پھندے سے مرے کوئی نکلنے نہیں پاتا　　　اس گلشن عالم میں بچھا دام ہے میرا

راجہ بندر دیس میں رہیں الٰہی شاد　　　جو مجھ سی ناچیز کو کیا سبھا میں یاد

آمد سے بسنتی کے ہے گلزار بسنتی　　　ہے فرش بسنتی در و دیوار بسنتی
آنکھوں میں حماقت کا کنول جب سے کھلا ہے　　　آتے ہیں نظر کوچہ و بازار بسنتی

بھارتیندو جی نے اپنے ایک مختصر ڈرامے 'نیل دیوی' میں بھی اسی طرح کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

امرا جو کہیں رات تو ہم چاند دکھا دیں　　　رہتا ہے سفارش سے بھرا جام ہمارا
کپڑا کسی کا کھانا کہیں سونا کسی جا　　　غیروں ہی سے ہے سارا سر انجام ہمارا
ہو رنج جہاں پاس نہ جائیں کبھی اس کے　　　آرام جہاں ہو وہے وہاں کام ہمارا
جو تھے سپن سے

ایک اور ڈرامہ" ویدکی ہنسا ہنسا نہ بھوتی" جس کے انتساب میں فارسی کا یہ شعر درج ہے۔

چشم من بہ چشم تو چشمان تو جائے دگر　　　من تماشائے تو بینم تو تماشائے دگر

یہ ڈرامہ سماجی برائیوں و بداعمالیوں پر تیکھے نشتروں سے مزین ہے ڈرامے میں طنز کی شدت کا اندازہ اس شعر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

ایسی گاڑھی بیجئے تیوں موری کی کیچ　　　گھر کے جانے مرگئے آپ نشے کے بیچ

غرض یہ کہ ہریشچندر کی تخلیقات و نگارشات میں اسی طرح کے خیالات و نظریات بڑی جرأت و بے باکی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں ان کی شاعری کی طرح نثر نگاری میں عصری مسائل اور تقاضوں کی مصوری بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ بھکمری، غریبی جہالت، مے نوشی، چھوت چھات، تعلیم نسواں، کم سنی کی شادی جیسے موضوعات پر انھوں نے کھل کر لکھا ہے۔ اس زمانے کے ہندوستان کی زبوں حالی و پستی کا ذکر کس درد کے ساتھ کرتے ہیں۔

" ہائے بھارت کو آج کیا ہو گیا ہے؟ کیا نِسندیہہ (بلا شک و شبہ) پرمیشور ہی اس سے روٹھا ہوا ہے؟ ہائے! کیا اب بھارت کے وہ دن پھر سے نہ آویں گے؟ ہائے! یہی وہ بھارت ہے جو کسی وقت ساری پرتھوی کا شرومنی (زمین کا سرتاج) گنا جاتا تھا۔"

بھارتیندو ہریش چندر نے دو دہائیوں سے زائد عرصہ تک چمنستان ادب کو گلہائے رنگا رنگ سے مزین کیا اور صرف ۳۴ سال ۴ ماہ کے بعد، داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اگرچہ وہ ۶ جنوری ۱۸۸۵ء کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے

(باقی ص ۴۰ پر)

اسعد بدایونی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

احسن مارہروی شخصیت اور خدمات

مرزا داغ نے اُردو شاعری کو جتنے مشہور شاگرد دیے وہ ان سے پہلے کے جملہ اساتذۂ سخن سے بہت زیادہ ہیں غالباً ان سے پہلے کے کسی استاد کو یہ سعادت نصیب نہ ہوئی کہ اس کے شاگردوں کی اتنی بڑی تعداد ہو اور ان میں سے بیشتر کا شمار مشاہیر میں بھی ہو۔ داغ کے شاگردوں کی تعداد کا صحیح تعین نہیں ہو سکا لیکن بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد کئی سو کے قریب تھی۔

داغ کے مشہور تلامذہ میں سے جن حضرات کو ادبی دنیا بخوبی جانتی ہے۔ ان میں اقبال، جگر، سیماب، سائل دہلوی، بیخود بدایونی، بیخود دہلوی، محبوب علی خاں آصف، نظام دکن، نوح ناروی، جوش ملسیانی، مولانا ظفر علی خاں، ناطق گلاوٹھی اور محمد دین فوق کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حضرت احسن مارہروی کا شمار بھی داغ کے اہم ترین شاگردوں میں ہوتا ہے اور استاد سے جس تعلقِ خاطر کا ثبوت انھوں نے عملی طور پر پیش کیا ہے اس سے ان کے عقیدت و محبت کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ داغ کے آخری دیوان "یادگارِ داغ" کی اشاعت رسالہ "فصیح الملک" کا اجرا، اور داغ کی سوانح عمری "جلوۂ داغ" ان کے وہ کارنامے ہیں جو لائق صد تحسین ہیں۔

حضرت احسن کا تعلق اس نسل سے تھا جو اپنے بزرگوں کے کارناموں کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی تھی اور ان کے افکار و خیالات کو آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ سمجھتی تھی۔ اپنے اس رویے میں وہ نسل بڑی حد تک حق بجانب بھی تھی کہ ماضی سے رشتہ قائم کیے بغیر کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ نئی نسل کا المیہ یہ ہے کہ اس کا رشتہ ماضی سے منقطع ہو گیا اور اسے اپنی عظیم الشان روایات کا قطعاً علم نہیں ورنہ کیا احسن مارہروی بذاتِ خود بھولنے کی چیز تھے؟ جس شخص نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ خدمتِ ادب کے لیے وقف کر دیا ہو اسے انتقال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس طرح بھلا دیا جائے کہ جیسے وہ پیدا ہی نہ ہوا تھا، یقیناً یہ ایک خطرناک ذہنی رویہ ہے۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے اور اپنے احتساب کے لیے کچھ وقت ضرور نکالنا چاہیے، ورنہ آئندہ نسلیں ہمیں معاف نہ کریں گی، اور مورخ ہمیں بے حس لکھے گا۔

مولانا احسن مارہروی کی پیدائش ضلع ایٹہ کے مشہور و معروف قصبہ مارہرہ میں ۱۰ نومبر ۱۸۷۶ء مطابق ۲۲ شوال ۱۲۹۳ھ کو ہوئی۔ عہد اورنگ زیب میں شاہ برکت اللہ الملقب بہ صاحب البرکات مارہرہ آئے جو سادات بلگرام کے خاندان سے تھے انھوں نے یہاں آکر رشد و ہدایت کے لیے ایک خانقاہ قائم کی جو آج بھی "سرکار خورد" (چھوٹی سرکار) کے نام سے مارہرہ میں موجود ہے۔ اسی خاندان میں حضرت

احسن کی ولادت ہوئی۔ والد گرامی کا نام مجتبیٰ حسن تھا، گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ اس زمانے کے شرفا کے قاعدے کے مطابق تعلیم کی ابتدا کلام مجید کے حافظہ سے ہوئی۔ بعد ازاں مشرقی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ والد کے ساتھ حج بیت اللہ کو تشریف لے جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مارہرہ کو علم و ادب کا گہوارہ رہنے کا شرف عرصۂ دراز تک حاصل رہا ہے۔ تمام بستی کا ماحول شعر و ادب کے لیے سازگار تھا۔ حضرت احسن کو شاعری سے فطری مناسبت تھی مگر مذہبی ماحول اور خانقاہی سلسلے سے منسلک ہونے نیز والد گرامی سے حجاب کے سبب اپنی خواہش کی تکمیل فوراً نہ کر سکے اور حج سے واپس آنے کے بعد ۱۸۹۴ء میں مرزا داغ کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ شروع میں سلسلۂ شاگردی بذریعہ خط و کتابت قائم ہوا تھا، جب آتشِ شوق بھڑکی اور استاد کی محبت کا نقش گہرا ہوا تو مرزا داغ سے ملاقات کے لیے ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور کئی برس تک استاد کی خدمت میں رہ کر ذوقِ شعر کو جلا دی۔ قیامِ حیدرآباد کے ابتدائی دنوں میں حضرت احسن کا قیام محلہ دارالشفا میں رہا۔ ڈھائی سال بعد حضرت داغ کے مکان واقع محبوب گنج (افضل گنج) سے متصل ایک کمرہ کرائے پر حاصل کر کے رہنے لگے۔ حیدرآباد کے قیام کی مدت تقریباً آٹھ برس ہے۔ کچھ عرصہ حضرت احسن کا قیام لاہور میں بھی رہا جہاں انھوں نے "خم خانۂ جاوید" جلد اول کی تدوین میں لالہ سری رام کو مدد دی۔

حضرت احسن نے اپنا آخری زمانہ شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی سے منسلک ہو کر گزارا۔ وہ یہاں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۸ء تک رہے اور پنشن ملنے کے دو سال بعد یعنی ۳۰ر اگست ۱۹۴۰ء کو مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

مرض الموت کی تفصیل مولانا طفیل احمد اس طرح بیان کرتے ہیں:

"...... جولائی ۱۹۴۰ء میں کل ہند اردو کانفرنس میں بمقام بریلی تشریف لے گئے تھے وہاں سے واپسی پر پشت پر چند پھنسیاں نمودار ہوئیں۔ ان میں سے ایک نے زیادہ تکلیف دی جو بڑھ کر کاربنکل ہو گئی۔ ۹ر اگست کو اپنے بڑے صاحبزادے سید محمد احسن بی اے اسسٹنٹ رجسٹرار کے پاس بغرض علاج تشریف لائے جہاں ۱۷ر اگست تک حکیم شبیر احمد صاحب کے مشورے سے جڑی بوٹی کا علاج ہوتا رہا۔ تخفیف نہ ہونے پر ۱۸ر اگست کو ان کے منجھلے صاحبزادے سید سعید احسن نے انھیں ان کے سنجھلے صاحبزادے ڈاکٹر سید انعام حسین ایم بی بی ایس کے پاس پٹنہ پہونچا دیا۔ وہاں میڈیکل کالج میں ۲۲ر اگست کو پھوڑے پر بجلی کے ذریعہ عمل جراحی کیا گیا۔ ۲۸ر اگست تک حالت قابلِ اطمینان تھی کہ ۲۹ر کو یکایک گردوں نے اپنا فعل چھوڑ دیا اور اسہال کبدی شروع ہو گئے۔ میڈیکل کالج کے قابل ترین ڈاکٹروں اور استادوں نے امکانی تدابیر اختیار کیں مگر بقول میر ع

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اور ۳۰ر اگست ۱۹۴۰ء مطابق ۲۵ر رجب المرجب ۱۳۵۹ھ بروز جمعہ بوقت چھ بجے شام اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی..."

(علی گڑھ میگزین ص۱۹)

حضرت احسن مارہروی کے قد و قامت کا اندازہ اردو ادب کے چند اکابرین کی آرا سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق فرماتے ہیں:

"آپ ان بزرگان ادب سے تھے جن کی تمام عمر ادب کی خدمت میں صرف ہوئی... شعر میں آپ کا رنگ کلاسیکل لطافت اور مضمون آفرینی کی نفاست کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ آپ منکسر المزاج اور شریف النفس واقع ہوئے تھے۔"

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا ارشاد ہے:-

"مولانا مرحوم جتنے بڑے شاعر تھے اس سے بڑے انشا پرداز تھے، اور اردو کی خدمت کے سلسلے میں انھوں نے جوانی کے عہد سے زندگی کے آخری لمحوں تک یعنی تقریباً نصف صدی تک جو کام کیے ان کے

لحاظ سے ان کو ثانی الاردو کہنا بالکل بجا ہے۔"

ان کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کے رفیق کار پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس سے مولانا کی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان کی محنت و دیانت کا اعتراف بھی ہوتا ہے :۔

" مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے، زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کے ان لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کے پیش روؤں سے ان تک پہنچی تھیں، بایں ہمہ وہ ادب و شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے بیگانہ تھے نہ بیزار، علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے..... جو استفسارات باہر سے شعبۂ اُردو میں آتے ان پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکے کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسارات کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

ان کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا، بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ نوجوانوں میں جوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے ان سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں، لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی، یعنی زبان اور شاعری کے اسقام۔ کہتے تھے کہ زبان کی غلطی کیسے سن لوں ساری عمر اسی میں گزری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔"

زبان کے سلسلے میں مولانا کا اتنا محتاط رویہ حضرت داغ کی شاگردی کا نتیجہ تھا جو ان کے تمام شاگردوں کا امتیاز ہے۔

حضرت احسن نے تو استاد کے مشورے سے "فصیح اللغات" کی تیاری اسی مقصد کے لیے شروع کی تھی کہ زبان داغ کو مزید فروغ دیا جا سکے۔ لیکن یہ لغت داغ کی وفات کے سبب مکمل نہ ہوسکی ورنہ یقیناً اُردو کی اہم لغات میں سے ایک ہوتی۔

مولانا احسن خوش وضع، خوش پوشاک، خوش خوراک اور خوش طبع آدمی تھے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر ایک صالح اور صحت مند ماحول میں ہوئی تھی شرفاء کے تمام اوصاف ان میں موجود تھے۔ شاعری کے علاوہ علم رمل، خوش نویسی اور فن کشتی سے بھی مولانا کو دلچسپی تھی۔ مولانا کے انکسار کی تعریف ان کے تمام واقف کاروں نے کی ہے۔ اپنے علم کا بے جا رعب کسی پر ڈالنا انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ ان کی شخصیت میں انانیت کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ہر چند کہ وہ جامع کمالات تھے۔

مولانا احسن نے اپنے پیچھے کثیر تعداد میں اہم تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ یہاں سب کا ذکر تفصیل سے ممکن نہیں لہٰذا ایک فہرست ان کی تصانیف نظم و نثر کی پیش کی جاتی ہے :

(۱) جلوۂ داغ (سوانح عمری داغ دہلوی)
(۲) کلیاتِ ولی دکنی (ترتیب و تدوین)
(۳) کسوف الشمسین (عنیم شبلی و ماتم حالی)
(۴) اُردو لشکر (نظم) (۵) نمونۂ منثورات (تاریخ نثر اُردو)
(۶) کارنامۂ غم (رباعیات و سلام)
(۷) انشائے داغ (مکاتیب داغ دہلوی)
(۸) شاہکار عثمانی (نظام دکن کی فارسی نثر کا اُردو ترجمہ)
(۹) منتخب داغ (انتخاب کلام داغ)
(۱۰) احسن الکلام (بعد مرگ) شاعری۔ مرتبہ سعید احسن
(۱۱) گلدستہ ریاض سخن (ریاض خلیل) کئی شمارے
(۱۲) رسالہ فصیح الملک (۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۰ء)

مولانا احسن نے یوں تو جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی طبیعت کا میلان غزل ہی کی طرف رہا ہے اور وہ غزل کے اس اسلوب کے دلدادہ رہے ہیں جو داغ اسکول سے عبارت ہے جس میں روزمرہ، زبان کی صفائی، شوخی اور خالص عشقیہ انداز بیان داری

اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے رموز و علائم پرانی شاعری سے قطعاً مختلف نہیں۔ داغ کے جملہ شاگردوں نے ایک طرح سے استاد ہی کے اسلوب کی پیروی کی ہے اور معاملہ بندی، صفائیٔ زبان اور محاورہ کے استعمال پر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے۔ جن چند شاگردوں نے صفائیٔ زبان و بیان اور محاورہ کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی اور طبیعت کی روانی کے سبب اپنی راہ تھوڑی سی الگ کی ہے ان میں احسن مارہروی بھی ہیں۔ جوش ملسیانی نے ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل ٹھیک لکھا ہے ؛

" ان کے یہاں وہ چونچلے نظر نہیں آتے جو حضرت داغ کی خداداد شوخ طبعی کا حصہ تھے۔"

(احسن الکلام ص ۲۲)

ان کی شاعری ایک رچے ہوئے ذوق کی تسکین میں ہر طرح کامیاب ہے۔ تغزل کی چاشنی اور اندازِ بیان کی گھلاوٹ ان کے اسلوبِ بیان کا سب سے دلکش پہلو ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

قطرۂ خون تمنا ہے کہ نیرنگ طلسم !
بہہ گیا تو اشک ٹھہرا جم گیا تو دل ہوا

لائے ہو جنازہ تو مجھے دفن بھی کر دو
اٹھے ہیں جہاں چار قدم ایک قدم اور

شمع گھل گھل کر دیا کرتی ہے شعلے کو فروغ
سوز ہے مظلوم کا ظالم کا سازِ زندگی

ٹھہر ٹھہر کے چل او جلد باز عمرِ رواں !
روا روی میں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

دیکھنے کے لیے آتا ہے زمانہ اس کو
اک تماشہ ہے مسافر بھی سفر سے پہلے

کسی دن بے خودی میں جا پڑا تھا ان کے سینے پر
بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلا میرا پتھر سے

عشق کیا چیز ہے اے حضرتِ دل کر دیکھو
یہی جینے کا نتیجہ ہے کہیں مر دیکھو

کیا کروں کیا نہ کروں بات اسی حسرت میں
چپ کھڑا رہتا ہوں پہروں تری تصویر کے ساتھ

پھیلا ہوا، ہوا میں ہے دامانِ یار کی
ورنہ بساط کیا تھی ہمارے غبار کی

پھنس کے دامِ عشق میں کیوں سب نادانی ہوئی
میں تو دیوانہ تھا کیا دنیا بھی دیوانی ہوئی

بھارتیندو ہریش چندر ص ۳۶ کا بقیہ

لیکن ان کی یادوں کے گلاب ابھی مہک رہے ہیں، سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کا نام اور فن زندہ و تابندہ ہے اور جب تک دنیا قائم ہے بھارت کا یہ چاند ادب کے آسمان پر روشن رہے گا اور آنے والی نسلیں اس کی روشنی سے استفادہ کرتی رہیں گی۔ ●●●....

حواشی

۱، ۲ بھارتیندو ہریشچندر کے کوائف و انتخاب کلام کے لئے بھارتیندو گرنتھاولی مرتبہ شیو پرشاد مشرا مطبوعہ ۱۹۷۰ء ناگری پرچارنی سبھا کاشی اور ہندی ساہتیہ کا اتہاس مولفہ رام چندر شکلا مطبوعہ ۱۹۷۰ء ناگری پرچارنی سبھا کاشی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۳ ناٹک درلبھ بندھو (بھارتیندو گرنتھاولی صفحہ ۵۵۵)۔

۴ بھارت دُردشا چوتھا حصہ (بھارتیندو گرنتھاولی صفحہ ۴۴۴)۔

۵ ناٹک ہندر سبھا (بھارتیندو گرنتھاولی صفحہ ۲۷۹)۔

۶ ڈرامہ نیل دیوی (بھارتیندو گرنتھاولی صفحہ ۱۰۶ تا ۱۲۶)۔

۷، ۸ ڈرامہ ویدکی ہنسا ہنسا نہ بھوتی (بھارتیندو گرنتھاولی صفحہ ۱۷)۔

غزلیں

قمر [illegible]

یہ کچھ نہ کچھ آج ہے ہونے والا
کوئی سوئے گا نہ سونے والا

مجھ کو مل جائے گا بچھڑا بچپن
جب بھی آئے گا کھلونے والا

اب صداؤں کی فصل کاٹے گا
گہری خاموشیاں بونے والا

نیند اس کو بھی آ ہی جائے گی
کب تلک روئے گا رونے والا

آج ہم دل کی بات کہہ ڈالیں
ہونے دیں جو بھی ہے ہونے والا

ملکہ نسیم
E 7/273 اریرا کالونی
بھوپال

رہرو راہِ وفا کی ہے کوئی منزل کہیں
آگ کا دریا ہے اک جس کا نہیں ساحل کہیں

زندگی اس دور میں سیماب بن کر رہ گئی
ہے یہ ناممکن کہ حاصل ہو سکونِ دل کہیں

عزمِ ساحل جب سلامت ہے تو پھر کیا غم ہمیں
روک سکتا ہے خیالِ دوریِ منزل کہیں

گاؤں میں معصوم و سادہ پیار سے بھرپور دل
جگمگاتے شہر میں رہزن کہیں قاتل کہیں

ملگجے سے اس سویرے کے دھندلکے میں نسیم
شاید آجائے نظر تابندہ مستقبل کہیں

جانتی ہی نہیں کہ کیا ہوں میں
کیسی الجھن میں مبتلا ہوں میں

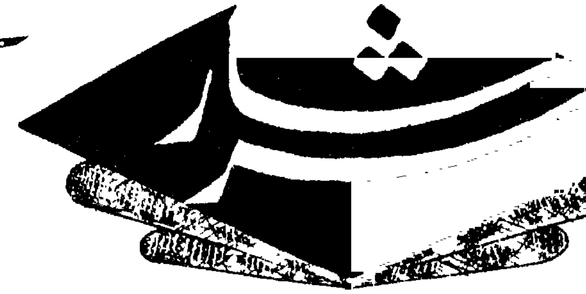
یوں ہر اک سانس پر گماں گزرے
جیسے بجھتا ہوا دیا ہوں میں

میرا جیون ہے چاندنی کی طرح
اپنے ماں باپ کی دعا ہوں میں

مجھ کو سمجھو نہ لمحۂ مفرور
آتے لمحوں کی اک صدا ہوں میں

وقت کے ساتھ ساتھ بہتی ہوں
جیسے مہکی ہوئی ہوا ہوں میں

محبوب جہاں
۳۳۔ ناسخ لین
وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ



سرشار کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے متعلق عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں مشاہدۂ نفس مفقود ہے یعنی وہ اپنے کرداروں کے ذہنی عمل کو نہیں دیکھ پائے ہیں مختلف نقادوں نے ان پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔ مثلاً " سرشار مشاہدۂ نفس کی صلاحیت سے محروم ہیں۔" (پروفیسر خورشید الاسلام۔ تنقیدیں)

" سرشار کے پاس کردار کو اجاگر کرنے کے لئے نفسیاتی اوزار نہیں۔"

(عزیز احمد۔ "ترقی پسند ادب")

" سرشار ماہر نفسیات نہیں تھے۔ انھوں نے انسان کے دل و دماغ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

(آنند نرائن ملاّ۔ "کچھ نثر میں بھی")

سرشار پر کئے جانے والے ان اعتراضات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخلیق کردہ کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو نہیں سمجھ پاتے ہیں۔ لیکن جب ہم ان اعتراضات کی روشنی میں سرشار کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے لئے مندرجہ بالا اعتراضات سے اتفاق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ سرشار نے اپنی تصانیف فسانۂ آزاد۔ سیر کہسار۔ جام سرشار۔ پی کہاں۔ بچھڑی ہوئی دلہن کامنی۔ کڑم دھم وغیرہ میں جتنے بھی کردار پیش کئے ہیں ان میں کئی کردار ایسے ملتے ہیں جو سرشار کی قوتِ مشاہدہ پر دلالت کرتے ہیں مثال کے طور پر فسانۂ آزاد کے خوجی۔ بی اللہ رکھی۔ اور شہسوار کو ہی لے لیجئے یوں تو خوجی ایک مسخرہ ہے جو اپنی اول جلول حرکتوں اور مضحکہ انگیزی سے لوگوں کو ہنساتا ہے لیکن حقیقت میں اسکی مضحکہ انگیزی کے پیچھے اس کی نفسیاتی کمزوری پوشیدہ ہے یوں تو قاری اس کی مضحکہ انگیزی پر ہنستا ہے اور اس کی شکل وصورت کا مذاق اڑاتا ہے لیکن جب اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ خوجی اس قسم کی حرکتیں محض اپنی نفسیاتی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے کرتا ہے تو قاری کے دل میں اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ اس کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو محسوس کرکے اس پر ترس کھائے بغیر نہیں رہتا۔ بی اللہ رکھی کا کردار بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جس کی تخلیق میں سرشار نے بڑی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ اللہ رکھی کی شادی کم عمری میں ایک مرد پیر سے کر دی جاتی ہے، جس کے ساتھ وہ ذہنی طور پر کبھی بھی ہم آہنگ نہیں ہو پاتی ہے کیونکہ وہ اس شادی کو اپنی نسوانیت کی توہین سمجھتی ہے۔ لہٰذا اس کے انتقال کے بعد میاں آزاد کی تلاش میں جسے وہ چاہتی تھی اور جو چند دنوں کے لئے سرائے میں آکر ٹھہرا تھا۔ گھر سے بھاگ جاتی ہے حالانکہ گھر سے بھاگنے کے بعد اسے اور زیادہ ذہنی الجھن کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ جہاں وہ جاتی ہے اس کے حسن کے بیسیوں خریدار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اپنی عزت وناموس کو بچانے کے لئے وہ مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے کبھی بی شبو جان بن جاتی ہے تو کبھی اللہ رکھی کبھی بھٹیارن تو کبھی بیٹرن کبھی ثریا بیگم تو کبھی جوگن غرض کہ تمام قصے میں اس کی سیرت مسلسل ذہنی اور نفسیاتی الجھن کا شکار رہی ہے کہیں اسے سکون نصیب نہیں ہوا۔

شہ سوار بھی سرشار کا اسی طرح کا ایک کردار ہے اس کی سب سے بڑی نفسیاتی کمزوری حسن آرا اور سپہر آرا ہیں۔ کیوں کہ وہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ حسن آرا یا سپہر آرا کی شادی اگر اس سے نہیں ہوتی ہے تو کسی اور سے ہوجائے لہذا وہ میاں آزاد کا جن کے ساتھ حسن آرا کی شادی اور ہمایوں فر کا جن کے ساتھ سپہر آرا کی شادی طے ہوتی ہے جانی دشمن ہوجاتا ہے اسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہوکر ہمایوں فر کو تو قتل ہی کر ڈالتا ہے اور پکڑے جانے کے خوف سے شہر شہر بھاگتا پھرتا ہے، لیکن وہ جہاں بھی جاتا ہے اس کو چین نہیں ملتا، چنانچہ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ سیر کہسار کی نواب نادر جہاں بیگم بھی تمام قصے میں ذہنی الجھن کا شکار رہی ہیں شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی شوہر کی وہ محبت اور رغبت نہ پاسکیں جس کی وہ حق دار تھیں وہ اپنے شوہر کی عاشق مزاجی سے ذہنی طور پر کافی پریشان رہتی تھیں کیوں کہ ان کے شوہر کی زندگی تو شراب و شباب کی محفلوں میں گزرتی ہے لیکن وہ گھر کی چہار دیواری میں اف تک نہیں کرسکتی تھیں اتنا ہی نہیں بلکہ نواب کی منظورِ نظر بیوائیں ان پر حکومت کرتی ہیں، وہ حاکم ہوتے ہوئے بھی محکوم ہیں۔ سرشار نے ان کی نفسیاتی الجھن اور اضطرابی کیفیت کو ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

سیر کہسار میں قادر کا کردار بھی ذہنی الجھن کا مرتکب ہے یہ ایک ایسا کردار ہے جس کی بیوی شوہر کو چھوڑ کر نواب عسکری کے گھر پڑی رہتی ہے بیوی کے غم میں قادر حیران و پریشان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت عجیب ہوجاتی ہے کیوں کہ اس سے کسی سے نہ یہ کہتے بنتا ہے کہ اس کی بیوی اِس کو چھوڑ کر فلاں نواب کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور نہ ہی خاموش رہتے بنتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلتا جاتا ہے اس کی اضطرابی کیفیت اور ذہنی کشمکش کو ہم بخوبی محسوس کرسکتے ہیں۔

بچھڑی ہوئی دلہن کی بی بی۔ رادکا۔ پی کہاں کی نورجہاں اور صاحب زادہ بھی اسی قبیل کے کردار ہیں بی بی جو کہ ناول کی ہیروئن ہے اوائل عمری میں شادی ہوجانے اور شوہر سے بچھڑ جانے کے بعد بھی تمام قصے میں یہ فیصلہ نہیں کرپاتی کہ دوسری شادی کرے یا نہ کرے وہ مسلسل اسی کشمکش میں مبتلا رہی ہے، اس کے علاوہ رادکا کا کردار بھی بڑے غضب کا کردار ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کی بہن ہے جو ڈاکو ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ذلیل اور اوباش قسم کا آدمی ہے اس کی ذلالت کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقی بہن تک سے جنسی اختلاط کا مطالبہ کرتے نہیں جھجھکتا رادکا کی اپنے بھائی سے نفرت کا بیان سرشار نے جس انداز میں کیا ہے اِس سے ان کی مشاہدۂ نفس کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

پی کہاں کی نورجہاں اور صاحب زادہ بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے، بڑے ہونے پر ان کی شادی مختلف جگہوں پر طے کردی جاتی ہے۔ یہ دونوں مارے اس خوف کے کہ کہیں ان کی محبت کا راز افشا نہ ہوجائے، زبان سے کچھ نہیں کہتے، لیکن غمِ ہجر کے سبب ذہنی طور پر اتنا زیادہ پریشان ہوتے ہیں کہ بسترِ مرگ پر پہونچ جاتے ہیں اور دوبارہ جانبر نہیں ہو پاتے۔ اس خصوصی نفسیاتی کیفیت کو بھی سرشار نے نہایت کامیابی سے پیش کیا ہے۔

کامنی میں کامنی کا کردار بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جو شادی کے چند دنوں بعد شوہر کے میدانِ جنگ میں چلے جانے اور یہ خبر پانے کے بعد بھی کہ اس کا شوہر میدانِ جنگ میں کام آگیا اس کا انتظار کرتی ہے جب کہ اسکو لوگ دوسری شادی کا مشورہ بھی دیتے ہیں لیکن وہ ایک پتی ورتا عورت ہونے کے ناطے اس امید پر زندہ رہتی ہے کہ اس کا شوہر ایک دن ضرور آئے گا۔ جب کہ سرن نامی بدمعاش اس کی خوبصورتی کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے وہ کامنی کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے عاجز آکر کامنی جوگن بن جاتی ہے اور جنگل میں کٹیا بنا کر رہنے لگتی ہے۔ شوہر کے میدانِ جنگ میں جانے کے بعد سے وہ جس نفسیاتی اور ذہنی الجھن کا شکار رہی ہے اس کو قاری بخوبی محسوس کرسکتا ہے مندرجہ بالا کرداروں کے علاوہ قمرن۔ ظہورن اور نوشابہ بھی اِسی قبیل کے کردار ہیں جو ناول میں کہیں نہ کہیں ذہنی الجھن کا شکار ضرور ہوئے ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

اتر پردیش میں اقلیتوں کی فلاح و ترقی

مثبت اقدامات

● ریاست میں اتحاد اور فرقہ دارانہ خیر سگالی کے جذبہ کو مستحکم کرنے کی غرض سے قومی یک جہتی کونسل نیز ضلع یک جہتی کمیٹیوں کو فعال بنایا گیا ہے۔

● سماج میں فرقہ دارانہ اتحاد اور خیر سگالی کے جذبہ کو مضبوط بنانے کی غرض سے شہری دفاعی کمیٹیوں نیز ہوم گارڈ تنظیموں کو خصوصی طور پر منظم کیا گیا ہے۔

● اقلیتوں میں احساسِ تحفظ کو مستحکم کرنے کے مقصد سے خصوصی حفاظتی فورس کی پانچ نئی بٹالینوں کی تشکیل کے لیے حکومت ہند سے درخواست کی گئی ہے

● ۱۵ نکاتی پروگرام کی پیش رفت کے جائزہ کے لیے وزیر اعلا کی سربراہی میں ایک نگراں کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے۔ اسی طرح عمل آوری پر نگرانی رکھنے نیز اس کی پیش رفت کے جائزہ کے لیے ضلع کی سطح پر بھی کمیٹیاں تشکیل کی جا رہی ہیں۔

● محکمۂ قومی یک جہتی نے بھی ایک سیل اسی غرض سے قائم کیا ہے تاکہ ۱۵ نکاتی پروگرام اور دیگر محکموں کی جانب سے انجام دیے جانے والے اقلیتوں سے متعلق ترقیاتی کاموں کی پیش رفت کا باضابطہ طور پر جائزہ لیا جا سکے۔

● اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے تشکیل شدہ اقلیتی کمیشن باضابطہ طور پر اپنا کام انجام دے رہا ہے نیز اس کے مشوروں پر ہر ممکن طریقے سے عمل کیا جا رہا ہے۔

● سرکاری ملازمتوں نیز عوامی زمروں کی ملازمتوں میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی کو یقینی بنانے کی غرض سے سلیکشن کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کے ایک فرد کو رکھے جانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

● وزیر اعلا نے علی گڑھ یونیورسٹی کو چھوٹی صنعت کے محکمے کے توسط سے ۴۰ لاکھ روپئے ٹریننگ کم پروڈکشن سنٹر کے قیام کے لیے فراہم کرائے ہیں۔

● لکھنؤ، آگرہ، میرٹھ، گورکھپور، علی گڑھ اور الہ آباد یونیورسٹیوں نیز شاہجہاں پور، لکھنؤ، گونڈہ و فیض آباد کے ڈگری کالجوں میں مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے پیشِ نظر اقلیتوں کے لیے کوچنگ کی سہولت فراہم کرائی جا رہی ہے۔ اسی طرح مرادآباد، وارانسی، اعظم گڑھ میں پری ریکروٹمنٹ کوچنگ سہولتیں فراہم کرانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

● اقلیتوں کو ٹیکنکل تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کی غرض سے اقلیتوں کی کثرت والے ضلعوں میں پالی ٹکنک اور آئی۔ ٹی۔ آئی قائم کیے جا رہے ہیں۔ سال ۸۹ ــ ۱۹۸۸ء میں مختلف پالی ٹکنکوں اور تربیتی اداروں میں اقلیتی فرقے کے ۴۵۴ طلبا کو داخلہ دیا گیا۔

● اقلیتوں کی معاشی ترقی کے لیے ہینڈلوم کارپوریشن، یوپیکا، براس ویر کارپوریشن، برآمدی کارپوریشن، اور چرم ترقیاتی کارپوریشن وغیرہ کی جانب سے چلائی جانے والی متعدد اسکیموں کے نفاذ کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سابقہ سال کے دوران ہینڈلوم و دستکاری کے توسط سے ۲۴۵۴ نیز براس ویر کارپوریشن کے ذریعہ ۵۱۴۱ اقلیتی افراد کو مستفید کیا گیا۔

● ۲۰ نکاتی پروگرام سمیت مختلف ترقیاتی اور غریبی ہٹاؤ پروگراموں کے تحت اقلیتوں کو بلاتفریق مکمل طور سے معاشی فائدہ پہنچانے کی غرض سے ریاست، ضلع اور بلاک کی سطح پر ۲۰ نکاتی پروگرام عمل درآمد کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کے افراد کو نامزد کیا گیا۔

● اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے چلانے کے سلسلے میں ہائر سکنڈری اسکولوں اور ڈگری کالجوں کا اقلیتی کردار بحال رکھنے کا حق دیا جارہا ہے ہائر سکنڈری اسکولوں سے متعلق امور اور معاملات کو جلد نپٹانے کیلئے وزیر اعلا کے سکریٹری (۱) کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل کی گئی ہے جو باضابطہ طور پر میٹنگ کرکے ان معاملات پر فی الفور فیصلے کر رہی ہے۔ گذشتہ دو ماہ میں ۱۵ ہائر سکنڈری اسکولوں کو اقلیتی کردار برقرار رکھنے کا حق دیا گیا ہے۔

سرشار

ص ۴۳ کا بقیہ

چنانچہ سرشار کے کرداروں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان پر کئے جانے والے اعتراضات غلط ثابت ہوتے ہیں۔ سرشار نے اپنے کرداروں کی تخلیق کرتے وقت ان کے ذہنی عمل پر بھی نظر رکھی ہے۔ اور ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے ان کی ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی کیفیات کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنے کرداروں کے ذہنی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا ذہن انسانی نفسیات، احساسات اور جذبات کا ایک ایسا نگارخانہ تھا جس میں مختلف قسم کی نفسیاتی صورتیں نظر آتی ہیں جو صفحہ قرطاس پر ابھر کر کہیں بی اللہ رکھی تو کہیں رادکا کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

اپنی بات

ص ۳ کا بقیہ

روزنامہ "سیاست جدید" کان پور نے اپنی ۱۲ ستمبر کی اشاعت میں اس فیصلہ کو ان الفاظ میں سراہا کہ اس اعلان سے تمام محبان اردو میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا اظہار برابر اخباری بیانات اور جلسوں کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ دوسری ریاستوں میں بھی یو پی کے اس مبارک قدم کا انتہائی خیر مقدم کیا گیا ہے"۔

ہفت روزہ "نئی دنیا" دہلی نے اپنی ۲۲ تا ۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں لکھا ہے:

"اس فیصلے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اردو ہندستان کی زبان ہے۔ اس نے ہندستان میں جنم لیا۔"

اس فیصلے پر ادارۂ نیا دور بھی وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری اور ان کی کابینہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

وسیم کانپوری
۲/۱۹ مہاپالیکا کالونی، نسیم آباد
کان پور

غزل

ستم بھی ہے مری قسمت میں ان کا پیار بھی ہے
خزاں خزاں ہی نہیں مژدۂ بہار بھی ہے

ہزار وعدۂ فردا ہو باعثِ تسکیں
تمھاری بات کا دنیا کو اعتبار بھی ہے

پناہ ڈھونڈ رہا ہے خرد کے سائے میں
جنونِ عشق زمانے کو سازگار بھی ہے

یہ مانتا ہوں کہ مجبور بھی ہے، بیکس بھی
قدم قدم پہ محبت کو اختیار بھی ہے

ہر ایک عرضِ محبت کی فکر میں گم ہے
کسی کی سمت مخاطب نگاہِ یار بھی ہے

یہ کر رہا ہے جو تلقینِ مے وہی واعظ
ستم تو یہ ہے حقیقت میں بادہ خوار بھی ہے

شبِ فراق میں تنہا نہیں وسیم ترا
ترا خیال بھی ہے تیرا انتظار بھی ہے

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب "چند ارباب کمال"

مصنف: مولانا ضیاء الدین اصلاحی   **قیمت:** ۲۵ روپے

ملنے کا پتہ: شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

مولانا ضیاء الدین اصلاحی، دارالمصنفین کے دیرینہ رفیق اور اُردو کے معروف اہل قلم ہیں۔ رسالہ "معارف" اور بعض اور رسالوں میں ان کے علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سوانحی مضامین کا یہ مجموعہ انھوں نے "چند ارباب کمال" کے نام سے شائع کیا ہے۔ پہلے باب میں عربی کے تین نامور ادیبوں اور شاعروں جاحظ، ابوالعلیٰ معری اور امرؤالقیس پر بہت تفصیل سے قلم اٹھایا ہے اور بڑے سلیقے سے ان کے حالات و تصنیفات کا تعارف کرایا ہے جو اُردو والوں کے لیے خاصے کی چیز ہے۔

دوسرے باب میں علامہ شبلی اور ان کے تلامذہ و منتسبین میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور اقبال سہیل پر مضامین قابل قدر ہیں۔ نیز مولانا امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے سوانحی خاکے بھی بہت اچھے ہیں۔

مصنف کی تحریروں میں رفقائے دارالمصنفین کی سیرت نگاری کا سلیقہ، تحقیقی ذوق اور ادبی شگفتگی موجود ہے اس کے علاوہ نقطۂ نظر کی صحت نے بھی اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے یہ مجموعہ بیک وقت علم و ادب کی سنجیدگی و شگفتگی کا حامل ہے اور علم و ادب کے شائقین کے لیے ایک تحفہ ہے۔

——— شمس تبریز خاں

نام کتاب "شہر آئندہ"

شاعر: فاروق شفق   قیمت: بیس روپے

ملنے کا پتہ: فاروق شفق۔ جی ۱۸۵، دھان کھیتی۔ گارڈن ریچ کلکتہ ۲۴

نئی غزل نے شاعری کی اس آواز کو جو کہیں گم ہو چکی تھی، پھر سے تروتازہ کر کے اسکی بازیافت کی ہے اور اس رہگذر پر روشنی کی ہے جہاں سارے چراغ جلتے جلتے مدھم ہو چکے تھے۔ وہ پرانے علائم جو استعمال ہوتے ہوتے اپنی معنویت اور توانائی کھو چکے تھے ان کی جگہ نئی غزل نے نئے استعارے اور نئی علامت کے ساتھ انہی لفظوں کو وہ جلا بخشی کہ وہ موجودہ شاعری کے سرخیل بن گئے۔ فاروق شفق نئی شاعری میں سرخیل ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی شاعری دل آویز ہے۔ "شہر آئندہ" کے بیشتر اشعار اپنے طنز اور بانکپن میں وہ دھار رکھتے ہیں جہاں تلوار کی کاٹ بھی اوچھی معلوم پڑتی ہے۔ انھوں نے غزل کے وسیلے سے وہی سب کچھ کہنے کی کوشش کی ہے جو دیگر شعراء کہہ رہے ہیں۔ مگر وہ اپنے نہج اور اسلوب سے بہت سے لوگوں سے الگ اور منفرد ہیں ؎

ہو گئے گم سرمئی ٹیلوں میں صبحوں کے سفیر
خود سنو اپنی صدا خود ہی صدا دیتے رہو

———

قریۂ دل میں ملے مجھ کو نہ قدموں کے نشاں
اس طرف سے جانے والے کس قدر چالاک تھے

———

پھر ہوئے آباد یادوں کے نگر   پھر منڈیروں پر کبوتر آ گئے

———

یہاں تک ہم کو یہ بے منظری اس واسطے لائی
مبادا اس خرابے میں کوئی منظر نکل آئے

———

دیکھتا ہوں سبز پریوں کو اترتے چھت سے میں
شام آئی پھر خیالوں کی شفق روشن ہوئی

بے شک فاروق شفق اچھے شاعر ہیں اور اچھے شعر کہتے ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں وہ کبھی کبھی اس طرح کے شعر بھی کہہ جاتے ہیں جو ان کی شاعری سے میل نہیں کھاتے ۔

نہ کام نکلا یہاں چل کے ان اصولوں پر
مرے بزرگوں نے آداب جو سکھائے تھے

آپ کے، ان کے، کسی کے بھی مکاں سے آئے
روشنی گھر میں مرے چاہے جہاں سے آئے

اس مجموعے میں جابجا اس طرح کے اشعار موجود ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں پر لفظ کی آواز دب گئی ہے۔ یا شعری ضرورت کے تحت بڑھا دی گئی ہے کہیں کہیں پر زبان و محاورہ بھی غلط نظم ہوا ہے۔

فاروق شفق کو چاہیے کہ وہ اس طرح کی لغزشوں سے اجتناب کریں تو وہ بہتر شعر کہہ سکتے ہیں۔ 'شہر آئندہ' کے بعد بھی شفق سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ آئندہ "شہر آئندہ" سے زیادہ بہتر اور خوش آیند ہوگا۔

——— وقار ناصری

نام کتاب: "شہر حرف" (شعری مجموعہ)

شاعر: شکیل شمسی قیمت: ۱۴ روپے

ملنے کا پتہ: شمسی آرٹس۔ جوہری محلہ۔ چوک لکھنؤ

شکیل شمسی کی شاعری کا بنیادی عنصر رومان ہے۔ یہ جذبہ کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ پوری شاعری پر محیط ہے۔ شاعری شکیل شمسی کو ورثہ میں ملی ہے۔ اپنی تحریر میں شکیل نے عروض سے ناواقف ہونے کا اعتراف کیا ہے اور اس خشک موضوع پر سر کھپانے سے بہتر یہ جانا کہ وہ شعر کہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعے کی تمام غزلیں رواں زمینوں اور مترنم بحروں میں ہیں۔ کہیں استادی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اختراعی بحر یا بحر میں ٹوٹ پھوٹ نظر نہیں آتی۔ الفاظ کے ساتھ ذہنی کشتی نہیں لڑی گئی ہے اور نفس مضمون کو بوجھل پن سے بچایا گیا ہے۔ شکیل نے روایت کا دامن بھی نہیں چھوڑا اور کوشش کی کہ مضمون کی خوش رنگی اور لطیف احساسات کو الفاظ میں ڈھالا جائے رومان کے ساتھ شکیل کی شاعری میں عصر حاضر کے مسائل کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔

اپنے بچّے پہ بوجھ ہوں میں بھی
آج کل کے نصاب کی صورت

آنکھوں سے اشک نکلے تھے تری تلاش میں
کچھ دور جا کے کھو گئے فکرِ معاش میں

نہیں ہے دل کے مسائل سے اب کوئی رشتہ
معاشیات نے پتھر بنا دیا ہم کو!

"شہر حرف" کا خالق دیہات سے وابستہ اسی فی صد ملکی آبادی کے مسائل سے بہت قریب ہے۔ خاص طور پر جدید دور میں دیہات کے URBANIZATION سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، انھوں نے شکیل کو بری طرح متاثر کیا ہے اور 'شہر' ان کی شاعری کا خاص موضوع بن کر ابھرا ہے ۔

شہروں میں مشینوں کے تلے پس چکی لیکن
دیہات میں ماں آج بھی باقی ہے محبت

چاروں جانب چھا گیا ہے کارخانوں کا دھواں
شہر والے گاؤں کو تحفے میں ساون دے گئے

شکیل کے بعض اشعار پر خوبصورت تصویر کا دھوکہ ہوتا ہے ۔

گلدان میں سجے ہوئے سوکھے گلاب پر
اس بدحواس تتلی نے دم توڑ کیوں دیا

ہیں دل میں محو سفر اس طرح تری یادیں
ندی میں جس طرح پوجا کے پھول بہتے ہیں

"شہر حرف" کی رومانی شاعری کا زیادہ تر حصہ واردات قلبی سے متاثر ہے اور بعض اشعار قاری کو کسی بھولے بھٹکے حادثہ یا واقعہ کی یاد دلا دیتے ہیں ؎

یہ آہٹیں تمہیں خبط الحواس کر دیں گی
کسی سے خط کا کبھی انتظار مت کرنا

کتنا حسین دور تھا وہ دور بھی کہ جب
ہم کو بھی چاہتا ہے کوئی یہ خیال تھا

گھر بھر میں پھیل جائے نہ تحریر کی مہک
خط کو مرے جلاؤ بڑی احتیاط سے

ایسے خط کون بھیجتا ہے مجھے
جن میں کچھ بھی لکھا نہیں ہوتا

سولہ صفحات پر مشتمل "شہر حرف" کا حصۂ نظم کافی وقیع ہے فلسطینی کی التجا، کیمپ ڈیوڈ، منڈیلا، نذر سالومن مہا لونگو، فتح دیت نام کے علاوہ پانچ خالص رومانی نظمیں ہیں جن پر براہ راست اختر الایمان کا اثر ہے۔

کتابت کی بعض غلطیوں اور لیتھو چھپائی کی نگیٹو مارکنگ کے بعد بھی "شہر حرف" کا وزن کم نہیں ہوتا۔

قائد حسین کوثر

نام کتاب: نویں صدی ہجری کے حوالے سے

مصری مورخین: ایک تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم

قیمت: لائبریری ایڈیشن: پچیس روپے۔ عام ایڈیشن: پندرہ روپے

ملنے کا پتہ: المجمع الاسلامی مبارک پور۔ اعظم گڑھ

زیر تبصرہ کتاب نویں صدی ہجری کے حوالے سے مصری مورخین: ایک تنقیدی مطالعہ' ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم صاحب کے اس مقالے کی مطبوعہ نقل ہے جسے موصوف نے پروفیسر مختار الدین احمد کی نگرانی میں ایم فل کے لیے تیار کیا تھا اور جس پر انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ماسٹر آف فلاسفی کی سند تفویض ہوئی تھی۔

اس کتاب کا 'پیش لفظ' پروفیسر نثار احمد فاروقی جیسے ممتاز محقق ادیب کے زور قلم کا مرہون منت ہے جبکہ "مقدمہ" خود مصنف کی دلکش تحریر، علمیت اور ذہانت کا آئینہ دار ہے۔ پوری کتاب تقریباً ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

پیش نظر کتاب میں نویں صدی ہجری کی جن بلند پایہ علمی شخصیات کی مورخانہ حیثیت کو موضوع قلم بنایا گیا ہے وہ اس طرح ہیں:

بدرالدین العینی	۷۶۲ - ۸۵۵ھ
ابن عرب شاہ	۷۹۱ - ۸۵۴ھ
ابن تغری بردی	۸۱۳ - ۸۷۴ھ
برہان الدین بقاعی	۸۰۹ - ۸۸۵ھ
شمس الدین سخاوی	۸۳۱ - ۹۰۲ھ

علامہ بدرالدین العینی نے فتح مصر سے لے کر اپنے عہد تک کی ایسی بلند پایہ تاریخ پیش کی جسے مصر کی انسائیکلو پیڈیا کے نام سے یاد کیا گیا۔ حافظ شمس الدین سخاوی نے فن تاریخ نگاری کے موضوع پر رہنما کتاب لکھی۔ علامہ ابن عرب شاہ فن تاریخ کے علاوہ عربی شعر و ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ علامہ ابن تغری بردی کو فن تاریخ نگاری میں مسلمہ شخصیت کا درجہ دیا گیا۔ برہان الدین بقاعی کی بہت سی شاہکار تصانیف ان کے علمی مرتبے کی بلندی پر شاہد عادل ہیں۔

اپنی صدی کے یہ نمائندہ علماء محض مورخ ہی نہیں تھے بلکہ اپنے عہد کی منتخب روزگار شخصیات کی حیثیت سے بھی زمانے میں مشہور ہوئے۔

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم صاحب نے اس کتاب میں عربی ادب کے مذکورہ مورخین اور سوانح نگاروں کے حالات زندگی اور ان کی مورخانہ خدمات کو انتہائی شرح و بسط کے ساتھ مستند مآخذ کی بنیاد پر پیش کیا ہے۔

اگرچہ ڈاکٹر انجم صاحب کا طرز نگارش بڑا صاف، سادہ اور عالمانہ ہے، پھر بھی کتاب میں جا بجا عربی زبان کے نامانوس الفاظ اور تراکیب کا استعمال ضرور کھٹکتا ہے۔

بلا شبہ نویں صدی ہجری کے ان پانچ اہم مورخین پر اردو میں یہ پہلا تاریخی و علمی انداز میں قابل قدر کام ہوا ہے۔ امید ہے کہ اسے علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

انور حسین خاں

نیا دور

جلد ۴۴	نمبر ۸

نومبر ۱۹۸۹ء

(ایکٹنگ) ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون: ۴۳۰۵۹
۴۷۱۰۸

پبلشر: اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش)

مطبوعہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
شرح سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

جدید ہندستان کے معمارِ اوّل پنڈت جواہر لال نہرو نے اس ملک کو منصوبہ بند ترقی کے راستے پر جس طرح گامزن کیا اور منصوبہ بندی کا جو تصور اس ملک کو دیا وہ نہ صرف یہ کہ ناقابلِ فراموش ہے بلکہ آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندستان کی تعمیرِ نو کی بنیاد نہرو جی نے ہی رکھی تھی۔ آزادی کے بعد غیر ملکی حکمراں جو ہندستان چھوڑ گئے تھے وہ لٹا ہوا کمزور اور غیر مستحکم ہندستان تھا، اسے مضبوط، مستحکم اور طاقت ور بنانے کے لیے انھوں نے منصوبہ بند ترقی کا راستہ اختیار کیا اور اس طرح ہندستان کی کمزور معیشت کو ایک نئی زندگی دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس ملک کو سائنسی مزاج دیا، اس ملک میں سائنسی شعور پیدا کیا، وہ چاہتے تھے کہ سائنسی اندازِ فکر عام ہو اور لوگ اپنے مسائل و معاملات کا تجزیہ سائنسی نقطۂ نظر سے کیا کریں۔ انھوں نے تاریخ کا سائنسی شعور پیدا کرنے کی بھی کوشش کی اور تاریخی حقائق کا تجزیہ بھی سائنسی نقطۂ نظر سے کیا۔ وہ ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی، تنگ نظری اور عصبیت سے کوسوں دُور تھے۔ وہ روشن خیالی اور ترقی پسندی کی علامت تھے اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہے۔

ہندستان کے مسائل و معاملات کو وہ پوری طرح سمجھتے تھے اسی لیے وہ جمہوریت اور سوشلزم کو ایک ساتھ لے کر چلے۔ جمہوریت اور سوشلزم کو ایک ساتھ لے کر چلنے کا یہ تمام دنیا میں پہلا تجربہ تھا، جس پر تمام دُنیا متوجہ ہوگئی اور چونک پڑی۔ نہرو جی اس ملک کی روایات اور اس کے تاریخی و ثقافتی پس منظر سے بخوبی واقف تھے، یہ پس منظر پوری طرح ان کی نظر میں تھا۔ اس ملک کا لسانی ورثہ اور لسانی پس منظر بھی پوری طرح ان کی نظر میں تھا۔ وہ ہندی اور اُردو کی ضرورت اور اہمیت سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ زبان کے معاملے نے بھی یہاں کس طرح فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرلیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ انھوں نے کہا ہے:

> "یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک میں کتنی ساری باتیں فرقہ وارانہ رنگ پکڑ لیتی ہیں، یہاں تک کہ زبان کا سوال بھی فرقہ وارانہ بن گیا ہے اور کسی نامعلوم سبب کی بنا پر اُردو مسلمانوں کی سرکاری چھاپ مانی جانے لگی ہے۔ پُورے احترام کے ساتھ میں اسے ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ میں اُردو کو اپنی زبان مانتا ہوں، جسے میں بچپن سے بولتا آیا ہوں .... اس لیے میں اس سوال کو پُوری طرح لسانی نظریے سے دیکھتا ہوں نہ کہ فرقہ وارانہ نظریے سے۔ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کریں۔"

ہندی اور اُردو کی ضرورت اور اہمیت پر انھوں نے ایک مضمون لکھا تھا جسے بابائے قوم مہاتما گاندھی نے "ہریجن" کی ۱۲ اگست، ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا، اس مضمون میں نہرو جی نے کہا تھا: "ہندستانی زبان بولنے والے علاقوں میں ہندی اور اُردو دونوں ہی کو اپنی اپنی لکھاوٹ کے ساتھ سرکار کی طرف سے تسلیم کیا جائے۔ سرکاری اعلان دونوں ہی لکھاوٹوں میں شائع ہوں۔ کسی عدالت یا دوسرے سرکاری دفتر میں عرضی پیش کرنے والا شخص کوئی بھی لکھاوٹ (ہندی یا اُردو) استعمال کرسکے اور اس سے دوسری لکھاوٹ میں عرضی کی نقل نہ مانگی جائے۔"

نہرو جی کے یہ اقوال و افکار اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ اس ملک اور اس کے عوام کی تمام ضرورتیں (چاہے وہ سماجی ہوں یا ثقافتی یا لسانی) پوری طرح ان کی نظر میں تھیں اور ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ان کے اقوال و افکار ہمیں آج بھی راستہ دکھا رہے ہیں۔

شین قاف

محمد عثمان عارف نقشبندی
گورنر اُتر پردیش

نہرو جی کی وصیت

مجھ کو جتنی شفقت اور پیار ملا
اپنے اہلِ ہند سے
چاہے جتنا میں کروں
ایک ذرّہ بھی بدل اس کا ادا نہیں ہوگا

اور سچ تو یہ ہے
محبت جیسی قیمتی شے کا
کہیں بدل پائیں
غیر ممکن ہے
قدر بہتوں کی ہوئی اس ملک میں
لیکن جو پیار مجھ کو حاصل ہوا
بے کراں، بے انتہا
ہند کے عوام سے
وہ چھا گیا ہے میری ہستی پر
میں اپنی عمر چند روزہ کے
باقی ماندہ سالوں میں
اس اُمید کا اظہار کر سکتا ہوں کہ
اپنے لوگوں کے پیار کا
غیر مستحق ہرگز نہیں ٹھہروں گا

میں بے شمار اور ان گنت
دوستوں اور احباب کے
شکریہ کا مقروض ہوں
ہم ان بڑی مہموں
اور اس کے ساتھ آنے والی کامیابیوں
مشکلوں اور مایوسیوں کے برابر کے شریک رہے ہیں
میں سچے دل سے اعلان کرتا ہوں
کہ
میری موت کے بعد کسی قسم کی مذہبی رسوم
ادا نہ کی جائیں
میرا ایسی رسوم میں یقین نہیں
اور ان کا اختیار کرنا
چاہے وہ رسمی ہو
ایک ریاکاری ہے
یہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو
دھوکا دینے کے مترادف ہوگا

جب میں مروں تو میری ارتھی جلائی جائے
اگر بدیش میں مروں تو وہاں ارتھی جلائی جائے
اور میرے پھول الہ آباد لائے جائیں
میری خاکستر مٹھی بھر گنگا میں
ڈال دی جائے

اور اس کا زیادہ تر حصہ اس طرح صرف کیا جائے
کہ
میری خاکستر کا کوئی حصہ نہ بچے
نہ محفوظ کیا جائے
جہاں تک میرا تعلق ہے
گنگا میں میری استھیوں کے پرواہ
کی کوئی مذہبی اہمیت نہیں ہے
اس معاملہ میں میرے کسی مذہبی جذبہ کا دخل نہیں
میں الہ آباد میں گنگا جمنا ندیوں سے
اپنے بچپن سے جڑا رہا ہوں
اور جتنا میں عمر رسیدہ ہو گیا ہوں
یہ تعلق بھی بڑھتا گیا ہے
میں نے موسموں کے بدلنے کے ساتھ ان کے بدلتے
مزاج بھی دیکھے ہیں
اور اکثر اس تاریخ روایت اور فرضی وخیالی
گانے اور کہانی کی بابت سوچا ہے
جو اس سے متعلق رہے ہیں
صدیوں سے
اور جو ان بہتے دریاؤں کا حصہ بن گئے ہیں
گنگا خاص طور سے
ہندستان کا دریا ہے
اس کے عوام کا محبوب
جس کے ارد گرد اس کی نسلوں کی یادگاریں
بنی ہوئی ہیں
اس کی امیدیں اور خوف
اس کی فتح کے ترانے
اس کی کامیابیاں اور ناکامیابیاں
وہ ہندستان کے زمانہ دراز کی

تہذیب و تمدن کی نشانی رہا ہے
ہمیشہ بدلتا ہوا بہتا ہوا
لیکن پھر بھی وہی دریائے گنگا ہے
وہ مجھ کو برف سے ڈھکی چوٹیوں کی یاد دلاتا ہے
اور ہمالیہ کی گہری وادیوں کی
جن کو میں نے اتنا پیار کیا ہے
اور اس کے نیچے زرخیز اور وسیع میدان
جہاں میری زندگی اور عمل زندگی کی تشکیل ہوئی
صبح کے خورشید کی کرنوں میں
مسکراتے ناچتے ہوئے
شام کی سیاہی میں لپٹی ہوئی افسردہ
شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں
پُر اسرار
جاڑے میں ایک تنگ، آہستہ بہتی ہوئی
شاندار ندی
اور برسات میں وسیع گرج دار شے
فراخدلی کے ساتھ سمندر جیسی
اور کچھ سمندر کی تخریبی طاقتوں کے ساتھ
گنگا میرے لیے ہندستان کے
ماضی کی یادگار رہی ہے
زمانۂ حال میں بہتی ہوئی
اور مستقبل کے وسیع سمندر میں گرتی ہوئی
حالانکہ میں نے پرانے رسوم و رواج کو کافی
رد کر دیا ہے
اور میری تمنا ہے کہ ہندستان تمام قسم کی
قیدوں اور بندھنوں سے آزاد ہو
جو اس کو باندھتے ہیں، محدود کرتے ہیں
اس کے لوگوں کو بانٹتے ہیں، اور ان میں

سے بہت سوں کو دباتے ہیں
اور جسم و رُوح کی آزادانہ ترقی کو روکتے ہیں
حالانکہ میں یہ سب کچھ چاہتا ہوں
لیکن اپنے آپ کو ماضی سے قطعی توڑنا نہیں چاہتا
مجھ کو اس عظیم ورثہ پر فخر ہے
جو ہمارا رہا ہے، اور ہے
اور مجھ کو احساس ہے کہ
میں بھی ہم تمام کی طرح
اس بغیر بکھری ہوئی زنجیر کی کڑی ہوں
جو ابتدائے تاریخ کے صفحات میں شامل ہوتی ہے
ہندوستان کے نہ بُھلائے جانے میں
ماضی میں
میں یہ سلسلہ منقطع نہیں کروں گا
یہ میرا خزانہ ہے اور اس سے
میں تحریک حاصل کرتا ہوں
میری اس خواہش کی گواہی کے لیے
اور ہندستان کے کلچرل ورثہ
کو آخری احترام پیش کرنے کے لیے
میں یہ عرض کرتا ہوں کہ میری مٹھی بھر
خاک الہ آباد میں گنگا میں
ڈال دی جائے۔ اس وسیع سمندر
میں لے جانے کے لیے جو ہندستان
کے کناروں کو پاک صاف کرتا ہے
میری خاک کا زیادہ تر حصّہ دوسری طرح
صرف کیا جائے
میں چاہتا ہوں کہ یہ ہوائی جہاز میں
اوپر ہوا میں لے جایا جائے
اور اس بلندی سے ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے
جہاں ہندوستان کے کسان مشقت
کرتے ہیں تاکہ میری خاک کے ذرّے
ہندستان کی دھرتی اور مٹی میں مل جائیں
اور ہندستان کا ناقابل شناخت
حصّہ بن جائیں !!

●●

"اگر کوئی مذہب یا دھرم (کو ماننے) والا یہ سمجھتا ہے کہ ہندستان پر اسی کا حق ہے، اوروں کا نہیں۔ تو اس نے ہندستان کی راشٹریتا، قومیت کو سمجھا نہیں ہے، ہندستان کی آزادی کو نہیں سمجھا ہے۔ بلکہ وہ ہندستان کی آزادی کا ایک معنی میں دشمن ہو جاتا ہے، اس آزادی کو ضرب لگاتا ہے، اس آزادی کے ٹکڑے ٹکڑے بکھیرتا ہے کیونکہ ہندستان کی جڑ ہے۔ آپس میں اتحاد اور ہندستان میں جو مختلف مذہب، دھرم ہیں، ذاتیں ہیں، ان سے مل کے رہنا۔ ان کو ایک دوسرے کی عزت کرنا ہے، ایک دوسرے کا لحاظ کرنا ہے۔"

"دوسروں کے مذہبی عقائد اور مذہبی رسم و رواج کے تئیں ہمارے اندر پوری رواداری ہونی چاہیے، جس میں ہر مرد، ہر عورت کو اپنے مذہبی عقیدے پر قائم رہتے ہوئے اس پر یقین کا اظہار کرنے اور اس کے بموجب چلنے کی پوری آزادی ہو۔ مذہب کے معاملے میں کسی کے کوئی بھی خیالات کیوں نہ ہوں، اس کے لیے اسے ستانا ہرگز نہیں چاہیے۔"

"اس ملک میں جو چیز ایک کو دوسرے سے الگ کرے، وہ ایک دیوار ہے، ہمیں اس کو ہٹانا ہے، ہمیں جو یہاں سامپردائکتا یعنی فرقہ پرستی ہے، اس کو ہٹانا ہے، کیونکہ ملک کو وہ کمزور کرتی ہے، ملک کے عظیم کنبے کو توڑتی ہے، ایک دوسرے کو دشمن بناتی ہے اور ہمیں پست کرتی ہے۔"

——— جواہر لال نہرو

ڈاکٹر سید حامد حسین
ای ۲/۴/۱۸۴ پروفیسرز کالونی،
بھوپال۔

پنڈت نہرو اور مسلم تاریخ کی ترجمانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی تین اہم تصانیف میں سے دو کا تعلق تاریخ سے ہے "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" ("تاریخ عالم کی جھلکیاں") اور "دی ڈسکوری آف انڈیا" ("تلاش ہند") دونوں میں انھوں نے کئی جگہ مسلم تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ "جھلکیاں" میں انھوں نے تاریخ عالم کے اہم واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اسلام کی ابتدا۔ عروج وارتقا کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی حکومت کا جائزہ لیا ہے جب کہ "تلاش" میں اُن کا موضوع بنیادی طور پر ہندوستانی ثقافت کو زیر غور لاتے ہوئے اس پر اسلامی اثرات کی جانب اشارہ کرنا ہے۔

"جھلکیاں" میں اسلام کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے اُس وقت عرب کی سیاسی اور سماجی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔ قبائلی رنجشوں اور لڑائیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اسلام ایک ایسی نئی طاقت یا خیال کی حیثیت سے اُبھرا جس نے عربوں کو بیدار کیا اور اُن میں خود اعتمادی اور توانائی کا نفوذ کیا۔ رسول اکرم صلعم نے سلاطین عالم کو جو خطوط تحریر فرمائے تھے اُن کے بارے میں نہرو تحریر کرتے ہیں کہ ان سلاطین کو تعجب ضرور ہوا ہوگا کہ یہ آخر کون غیر معروف شخص ہے جو اس طرح اُنھیں حکم دینے کی جرأت کر رہا ہے۔ نہرو اسے ایک زبردست خود اعتمادی اور پختہ عقیدہ کا نتیجہ بتاتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ اسی اعتماد اور عقیدہ کی بنا پر ریگستان عرب کے اِن باشندوں نے اُس وقت معلوم دنیا کے نصف حصے کو اپنا زیر نگیں کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسلام نے برادری اور ایک لحاظ سے جمہوریت کا پیغام بھی عام کیا اور مسلمان جہاں جہاں گئے وہاں خاص طور پر اس برادری کے جذبے نے لوگوں کا دل جیت لیا۔ رسول اکرم صلعم نے باہم دست بگریباں عرب قبائل کو ایک قوم کی شکل میں متحد کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اُن میں ایک مقصد کی روح پھونکی۔

پنڈت نہرو نے خاص طور پر اس امر کی جانب توجہ دلائی ہے کہ رسول اکرم صلعم نے اس وقت موجود سماجی نظام کے خلاف آواز بلند کی جس کے نتیجہ میں اسلام ایک ایسی طاقت کی شکل میں اُبھرا جس کی وقت کو بے حد ضرورت تھی۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُس وقت ملحقہ ممالک میں لوگ مطلق العنان حکمرانوں اور اسی قدر سخت گیر مذہبی پیشواؤں کی زیادتیوں سے تنگ آچکے تھے۔

وہ پُرانے نظام سے بددل ہو گئے تھے اور تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اسلام جس قسم کی تبدیلی لایا اُس کا انھوں نے خیر مقدم کیا۔ نہرو کا خیال ہے کہ اسلام نے کم از کم مسلمانوں کے درمیان استحصال کو کم کر دیا اور اُن میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ ایک بڑی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح عرب آگے بڑھتے رہے اور ایک کے بعد دوسری فتح اُن کے قدم چومتی رہی اور جیسا کہ نہرو کہتے ہیں بہت بار تو اُنھیں بغیر جنگ کئے فتح ملی۔ چنانچہ رسول اکرم صلعم کے وصال کے پچیس سال کے اندر اندر عرب جہاں ایک طرف پورے فارس، شام، آرمینیا اور وسط ایشیا کے کچھ حصے فتح کر چکے تھے تو دوسری جانب مغرب میں مصر اور شمالی افریقہ کا کچھ حصہ اُن کے تحت آچکا تھا۔

نہرو اس الزام سے اتفاق نہیں کرتے کہ عربوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو نذر آتش کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ عرب کتابوں کی جتنی قدر کرتے تھے اُسے دیکھتے ہوئے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ انھوں نے یہ جاہلانہ قدم اُٹھایا ہوگا۔ انھوں نے یہ قیاس ظاہر کیا ہے کہ شاید قسطنطنیہ کا شہنشاہ تھیوڈوسیس خود ہی اس تباہی کا جزوی یا کُلّی طور پر ذمہ دار ہو۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اس لائبریری

کا کچھ حصہ جولیس سیزر کے محاصرہ کے زمانے سے بہت پہلے ہی ضائع ہو چکا تھا۔ جہاں تک مسیحی شہنشاہ تھیوڈوسیس کا تعلق ہے وہ پرانے یونانی دیوی دیوتاؤں کو پوجنے والے مصنفین کی ایسی تحریرات کو جن میں اُن کے جاہلانہ اعتقادات اور افکار کی جھلک تھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا اور یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اِن کتابوں کو اپنا حمّام گرم کرنے کے لیے استعمال کروایا تھا۔

نہرو بتاتے ہیں کہ عرب دریائے سندھ تک پہنچے لیکن انھوں نے ہندوستان میں پیش قدمی نہیں کی اور سینکڑوں سالوں تک ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ اُن کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ نہرو نے عربوں کی رواداری کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ حالانکہ شروع شروع میں عرب اپنے مذہب کے بارے میں بڑے جوشیلے تھے لیکن یہ لوگ بڑے روادار تھے۔ اسپین میں مسیحیوں کی بڑی آبادی تھی اور انھیں عقیدہ کی پوری آزادی حاصل تھی۔

نہرو عباسی عہد کو اسلامی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق یہ ایک شاندار عہد تھا لیکن اس دور میں اُن جمہوری اقدار کی جگہ جنھوں نے اسلام کو آدھی دنیا میں پھیلا دیا تھا، شہنشاہیت کی آن بان نے لے لی۔ دنیائے اسلام میں جابجا خانہ جنگیوں نے سر اُٹھایا۔ نئی فتوحات کے دن نہ رہے بلکہ زیرنگیں علاقہ کی سرحدوں کے تحفظ پر توجہ صرف ہونے لگی۔ لیکن عباسی دور علوم کی ترقی کی وجہ سے خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ عربوں نے خاص طور پر طب اور ریاضی میں ہندوستان سے کافی کچھ سیکھا۔ عرب طالب علم ٹکسلا کی یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے آتے تھے۔ طب اور دوسرے موضوعات پر کئی کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ عربوں نے کئی چیزیں جیسے کہ کاغذ بنانا چینیوں سے سیکھا۔ خود عربوں نے سب سے پہلے دوربین اور قطب نما کی ایجاد کی۔

نہرو یاد دلاتے ہیں کہ عربوں کے ساتھ ہندوستان کے سینکڑوں سالوں کے تعلقات تھے۔ مسلمان ہندوستان آتے جاتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی انھوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کی اور لوگوں کو مسلمان بنایا۔ لیکن اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوا اور نہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی رنجش یا کشیدگی پیدا ہوئی۔

نہرو نے ہندوستانی زندگی اور یہاں کی تہذیب پر مسلم تہذیب کے تعمیری اثرات کی جانب جابجا اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام نے ہندوستان کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور ایک ایسے معاشرے میں جس کی ترقی بالکل رک گئی تھی اُس میں از سرِ نو ایک توانائی اور ترقی کا جذبہ پیدا کیا۔

مغلیہ سلطنت کا جائزہ لیتے ہوئے نہرو نے اکبر کی سیاسی پالیسی کی بڑی گرم جوشی کے ساتھ تعریف کی ہے جب کہ اورنگ زیب کے اندازِ حکومت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اکبر کو ہندوستانی قوم پرستی کے جدِّ اعلیٰ کے لقب سے نوازا ہے اور اشوک سے اکبر کا موازنہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں کی آواز میں ایسا لگتا ہے کہ بھارت ماتا خود مخاطب ہے۔

پنڈت نہرو نے ہندوستان کی سماجی زندگی پر اسلامی تہذیب کے تعمیری اثرات کا جابجا ذکر کیا ہے لیکن ۔۔۔ کے مظالم پر انھوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

"تلاشِ ہند" "تاریخ عالم کی جھلکیاں" کے تقریباً گیارہ سال بعد لکھی گئی اس دوران جہاں ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں تبدیلیاں آئیں وہیں خود پنڈت نہرو کے سیاسی اور سماجی شعور میں نئے گوشے اُبھرے اور اُن کے تجربے نے انھیں زیادہ محتاط اندازِ فکر و عمل کے لیے آمادہ کیا ہے لیکن بعض موضوعات پر ان کی فکر میں نئی جہات بھی پیدا ہوئی ہیں۔

"تلاشِ ہند" میں وہ افغانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ افغانوں کو غیر ملکی نہیں تصور کیا جانا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ افغان ہند آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اس وجہ سے ہندستانیوں کے ساتھ اُن کا قریبی تعلق ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ایک طویل عرصے تک افغانستان ہندستانی کا حصہ رہا ہے۔ اُن کی زبان پشتو بنیادی طور پر سنسکرت سے نکلی ہے اور ہندوستان میں اور باہر بہت کم مقامات ایسے ہوں گے جہاں ہندوستانی ثقافت کی اتنی یادگاریں یا نمونے ہوں گے جتنے کہ افغانستان میں ہیں۔

نہرو نے انگلستان میں اپنے زمانۂ تعلیم کے دوران معقولیت، روشن

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

سیّد احمد سحر
محلہ خلیل غربی
شاہجہاں پور

روشنی کا مینار

جمالِ آزادیٔ وطن کا بسا کے آنکھوں میں خواب تو نے
وطن کی دھرتی کو پھر سے بخشا ہے زندگی کا شباب تو نے
رہِ وفا میں قدم قدم پر سہے ہیں کتنے عذاب تو نے
کہ ایک اک قطرۂ لہو کا دیا ہے بیشک حساب تو نے
وطن کو چاروں طرف سے گھیرے تھے جبکہ مایوسیوں کے بادل
تب اس کے دامن میں لا کے ڈالا امید کا آفتاب تو نے
خروش سے جس کے تمتماتا ہے آج تک چہرۂ گلستاں
سجا دیا قوم کے لبوں پر وہ نعرۂ انقلاب تو نے
تو وہ مجاہد تھا جس کی ہمت پہ محوِ حیرت تھا اک زمانہ
نئے زمانے کی برکتوں کا وطن پہ کھولا ہے باب تو نے
تو امنِ عالم کا وہ پیمبر اٹھا تھا جو پنج شیل لے کر
بقائے باہم کے مسئلے پر کیا جہاں سے خطاب تو نے
مہک سے جس کی سدا رہے گی فضائے ہندوستاں معطر
روش روش صحنِ گلستاں میں کھلا دیئے وہ گلاب تو نے
کہیں ہزاروں میں ایک ہوتا ہے تیرا جیسا عظیم انساں
سوال جتنے تھے تیرے آگے دیئے سبھی کے جواب تو نے
تو روشنی کا تھا وہ منارا کہ تجھ پہ قوم و وطن ہے نازاں
کیے ہیں قلب و جگر میں روشن وہ پیار کے ماہتاب تو نے
وہ مہرِ تعبیر بن کے روشن ہے آج بامِ وطن پہ نہرو
حصولِ آزادیٔ وطن کا کبھی جو دیکھا تھا خواب تو نے

وطن کے بچّوں کے پیارے چاچا تری یہ جیوتی امر رہے گی
نہ تھا کسی کے جو کام بس کا، کیا تھا وہ انتخاب تو نے

آزادؔ سونی پتی
۱۶۴۳ - سیکٹر ۱۴
سونی پت

نہرو

ارفع ترے ارادے عزائم ترے بلند
گفتار دل پذیر تھی کردار دل پسند

پستی کی ذلتوں سے ہم اٹھ کر ترے طفیل
اب ڈالنے لگے ہیں ستاروں پہ بھی کمند

اہلِ وطن کو خستہ و بے حال دیکھ کر
خاموش رہ سکا نہ ترا قلبِ دردمند

ملتی نہیں جہان میں جس کی کوئی مثال
بخشا تھا وہ خدا نے تجھے مرتبہ بلند

تا عمر تجھ پہ ذاتِ خدا مہرباں رہی
پہنچا سکے نہ غیر بھی نہرو تجھے گزند

اظہارِ حق میں تو نہ ڈرا اہلِ جور سے
اس دور میں ہوا ہی نہیں تجھ سا حق پسند

حامد مینائی
محلہ تارین تکلی - تاروالا باغ - شاہجہاں پور

بیادِ جواہر لال نہرو

اے محبت کے پیامی رہبرِ عالی وقار
دردمندوں کے مسیحا بے قراروں کے قرار

دیکھتا ہوں جب کسی گوشے میں کوئی انتشار
تو ہی یاد آتا ہے مجھ کو جانِ جاں بے اختیار

زندگی کو جو نئے مفہوم دیتی جائے گی
تو نے بخشی گلشنِ ہندوستاں کو وہ بہار

درحقیقت تیرے ہی خوابوں کی وہ تعبیر ہے
آج جو کچھ بھی ہے اپنے ملک کا عزّ و وقار

کوئی چاہے بھی تو تیرا نام مٹ سکتا نہیں
معرکے تاریخ میں روشن ہیں تیرے بیشمار

قوم جن کی روشنی میں آگے بڑھتی جائیگی
ثبت ہیں ہر ہر قدم پر وہ نقوشِ اعتبار

تیرے ہونٹوں کا تبسم تیری آنکھوں کی چمک
بننے ہی والی ہے جلدی ایک صبحِ زرنگار

امن کی ہو جس میں مستی ایکتا کا نور ہو
تھے تصوّر میں ترے کچھ ایسے ہی لیل و نہار

تیرا درسِ زندگی حامد کو اب تک یاد ہے
ملک پر آئے نہ کوئی آنچ رہنا ہوشیار

ناوک حمزہ پوری
پوسٹ شیر گھاٹی - گیا

شمعِ فروزاں نہرو

تھے گلشنِ ہند کے گلِ تر نہرو
سنسار کو کر گئے معطّر نہرو
آرام شریعت میں تھا نہرو کی حرام
تھے علم و عمل کے زندہ پیکر نہرو

سرشارِ مئے حبِّ وطن تھے نہرو
ہاں روحِ چمن، جانِ چمن تھے نہرو
بھارت ہے اک انجمن کی مانند اگر
لاریب چراغِ انجمن تھے نہرو

ہر زخم کا، ہر درد کا درماں نہرو
ظلمات میں اک شمعِ فروزاں نہرو
تھا خدمتِ ملک و قوم ان کا مشرب
آزادیٔ بھارت کے نگہباں نہرو

بھائی چارے کے تھے پیامی نہرو
سمتا کے، مساوات کے حامی نہرو
سنسار کو شانتی کا پیغام دیا
روشن ہے جہاں میں نام نامی نہرو

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
۱۷۔ اشفاق اللہ مارگ لکھنؤ

حالیؔ اور تعلیم نسواں

(چپ کی داد کی روشنی میں)

مولانا حالی اپنے معاصرین میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستانی عورت کی زبوں حالی، بے کسی، جہالت اور مظلومیت کی طرف سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ توجہ کی اور اس کی اصلاح و فلاح، تعلیم و ترقی کے متعلق نثر و نظم دونوں میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ مظلوم طبقہ بھی معاشرے میں عزت و حرمت حاصل کرے اور اس پر صدہا برسوں سے جو ظلم و ستم ہوتا رہا ہے وہ ختم ہو جائے۔ وہ نصف بدتر سے "نصف بہتر" بن جائے اس کے ساتھ بھی انسانیت و شرافت، ہمدردی و محبت کا سلوک کیا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مناجات بیوہ، بیٹیوں کی نسبت، اور چپ کی داد، میں سماج کی زیادتیوں کو بڑے موثر پیرائے میں بیان کیا اور عورت کی بے کسی اور مظلومیت پر خون کے آنسو بہائے انھوں نے اس کے جائز حقوق کی پامالی کے خلاف آواز اٹھائی۔ مناجات بیوہ، مثنوی ہے۔ اس میں بیوہ کی حالت زار، حالی نے جس سوز و گداز اور درد و کرب کے ساتھ پیش کی ہے اس کو سن کر پتھر کا دل بھی موم ہو جاتا ہے۔ بیٹیوں کی نسبت، میں بے زبان لڑکیوں کی وکالت کی ہے کہ ان کی شادی کس طرح کی جاتی ہے اور شادی کے وقت کن باتوں کا خیال کیا جاتا ہے نیز شادی کے بعد، نہ صرف ان کو، بلکہ ان کے والدین کو بھی کتنی اور کیسی مصیبتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں وغیرہ کا اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چپ کی داد میں، عورت کی زندگی پر بچپن سے لے کر بڑھاپے تک، روشنی ڈالی ہے کہ خدا کی اس مخلوق پر ہمیشہ اور ہر حالت میں کیسے کیسے ظلم و ستم ڈھائے گئے۔ ہمیشہ وہ مردوں کا کھلونا بنی رہی اور بنائی جاتی رہی۔ اس نظم میں عورتوں کے فضائل، اوصاف، فرائض، معاشرے میں ان کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ان کی تعلیم پر زور دیا ہے۔ یہ نظم حیدرآباد کے ایک جلسے میں (جو تعلیم نسواں کے سلسلے میں ہوا تھا اور جس کی صدارت مہاراجا کشن پرشاد فرما رہے تھے) پڑھی تھی۔ یہ نظم ترکیب بند میں ہے اس میں کل ۸ بند اور ۷۳ اشعار ہیں۔ ترکیب بند میں خیالات کا تسلسل مضمون یا موضوع کے اعتبار سے انتہائی ضروری ہے۔ مولانا حالی کی رائے میں ترکیب بند کے ہر بند میں:

> "صرف ایک پوائنٹ (POINT) عمدگی سے بیان ہو سکتا ہے لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی بلکہ کم و بیش ہوتی ہے پس ضرور ہے کہ بند بھی چھوٹے بڑے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک بند دو تین بیت کا ہو اور دوسرا پندرہ بیس بیت کا اور یہ بات اس تناسب کے برخلاف ہے جو شعر کا جزو اعظم ہے۔"[۱]

حالی نے کوشش کی ہے کہ ترکیب بند میں، شعر کا جزو اعظم یعنی تناسب قائم رہے دو ایک شعر کی کمی بیشی سے تناسب نہ رہنے کا احساس نہیں ہوتا۔ جیسے چپ کی داد میں صرف تیسرا بند ۱۰ (دس) اشعار کا ہے باقی ۷ بند ۹، ۹ (نو، نو) اشعار کے ہیں۔ تناسب میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ حالی نے انسان کے انتہائی مقدس

پاکیزہ اور عزیز ترین رشتوں۔ ماں، بہن اور بیٹی کے نام سے مخاطب کر کے اس نظم کی ابتدا کی ہے۔ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دل میں عورتوں کی کتنی زیادہ عزت و حرمت ہے۔

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں قوموں کی عزت تم سے ہے

اس بند میں عورتوں کے عادات و خصائل، ان کی سیرت و شخصیت، ہمدردی و محبت، ایثار و قربانی نیکی و پارسائی کا تذکرہ کیا ہے۔ اسمٰعیل پانی پتی کے الفاظ میں:

"یہ اعلیٰ درجہ کی بے نظیر نظم جس میں نہایت سچی اور واقعی تعریف
فرقۂ نسواں کے اوصاف صبر و حیا اور مہر و وفا کی دل آویز طریقہ
پر بیان کی گئی ہے... بلحاظ اپنے اثر اور شہرت کے مقبول
ترین نظموں میں سے ہے۔ مولانا (حالی) کو خود بھی اس پر
بہت فخر و ناز تھا۔"

طبقۂ نسواں کے متعلق اس سے قبل حق و صداقت پر مبنی اتنے پاکیزہ خیالات کا اظہار شاید ہی کسی زبان میں کیا گیا ہو۔

نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمھاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے
مردوں میں مست والے جو تھے مست بیٹھے اپنا کب کا کھو
دنیا میں اے ستونتیو! لے دے کے اب مست تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی ڈھارس ہو تم بے کار کی
دولت ہو تم نادار کی عُسرت میں عشرت تم سے ہے

اگر مردوں میں ست باقی رہتا تو لڑکیوں کی پیدائش پر غم کے آنسو نہ بہاتا اور ان کو اپنے لیے، سماج کے لیے مصیبت نہ سمجھتا اسی لیے:

آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنی یہاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

یہ موہنی جب تک میکے میں رہتی ہے، ماں باپ بھائی بہن سب کی خدمت گزار رہتی ہے اور جب بیاہ کر سسرال جاتی ہے تو وہاں کی دنیا ہی دوسری ہوتی ہے، ہر وقت سب کی خوشنودی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ساس نند، شوہر، سسر ہر ایک کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اپنی تمام خواہشات، اپنے سکھ چین کو زندہ دفن کر دینا پڑتا ہے۔ دوسرے بند میں انھیں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
دن بھر پکانا، ریندھنا، سینا پرونا، ٹانکنا
بیٹھیں نہ گھر پر باپ کے خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اٹھ اٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے میں رویا اور ہوئیں بیدار تم

اور سسرال میں ہر وقت یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ:

وہاں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ وہاں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر، سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثل خار تم
پالا بڑوں سے گر پڑے بدخو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو گو دل میں ہو بیزار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر

شادی کے بعد اولاد کی تمنا ہوتی ہے اور جب اولاد ہوتی ہے تو سب خوشیاں مناتے ہیں، میکے اور سسرال میں سب کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں لیکن بچے کی پرورش و پرداخت میں ماں کو جو جسمانی تکلیفیں ہوتی ہیں وہ اسی کا کلیجہ ہوتا ہے جو ہنسی خوشی کے ساتھ برداشت کر لیتی ہے۔ تیسرے بند میں انھیں باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔

شادی کے بعد ایک اک کو تھی آرزو اولاد کی
تم پھنس گئیں جنجال میں خالق نے جب اولاد دی
کھانا پہننا اوڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم
بچوں کے دھندے میں تمھیں اپنی نہ کچھ سدھ بدھ رہی

تھا پالنا اولاد کا، مردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ اے دکھیا، یہ خدمت تمھارے سر پڑی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

جو تھا بند 'ماں' کی عظمت و عزت اور اس کے فیوض و برکات کی توضیح کرتا ہے کہ دین و دنیا کی رونق ماؤں کی بدولت ہے:

لیتیں خبر اولاد کی، مائیں نہ گر بچپن میں یہاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں
وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دنیا میں نورِ حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں
کیا صوفیان باصفا، کیا عارفان باخدا
کیا انبیا، کیا اولیا کیا غوث کیا قطب زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

لیکن یہ مقدس و محترم ہستی ظلم و ستم کا شکار رہی، اس کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کیا جاتا رہا، کمسنی ہی میں شادی کے عذاب میں مبتلا کیا جاتا رہا اور اگر وہ بیوہ ہو گئی تو پھر عمر بھر ذلت و اذیت، رسوائی اور بدنامی کی دوزخ میں جلائی جاتی رہی۔ پانچواں بند انھیں غم انگیز خیالات کا ترجمان ہے۔

افسوس دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائگاں
کیں تم نے جانیں تک فدا، کہلائیں لیکن بے وفا
گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یہاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یہاں

دنیا اور دنیا والوں کے جبر و تشدد کے باوجود:

کی تم نے اس دار المحن میں جس تحمل سے گزر
زیبا ہے گر کہیے تمھیں فخر بنی نوعِ بشر

سنگدلوں، سفاکوں اور ظالموں کا تو شیوہ ہی ظلم و ستم کرنا ہے۔ ان کی بے رحمیاں تمھارے خون کی ہمیشہ پیاسی رہیں لیکن تمھیں تو چین اپنوں سے بھی نہیں نصیب ہوا، شوہر، باپ، بھائی، بیٹے، سب زہر آلود اور دشمن نسواں سماج کے دیوا ستبداد کے غلام رہے اور تمھیں پستی اور جہالت، نفرت اور حقارت کے غار میں ڈھکیلتے رہے، اور اس پر تو سب متفق رہے کہ تم پر علم کا سایہ تک نہ پڑے، علم تمھارے لیے زہر ہلاہل ہے۔ اس بند میں حالی نے تعلیم نسواں کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے اور عورتوں کی تعلیم کے متعلق مردوں کے 'عقائد' کا ذکر کیا ہے

"پر نیک ہوں یا بد رہے سب متفق اس رائے پر"
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یہاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمھاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر

لیکن مایوس نہ ہو، وہ وقت جلد آنے والا ہے جب تمھاری حق تلفیوں کا حساب مردوں کو دینا ہو گا:

آتا ہے وقت انصاف کا، نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہو گا ان حق تلفیوں کا واں جواب

یہ کانفرنس تعلیم نسواں کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی، ساتویں اور آٹھویں بند میں تعلیم نسواں کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے، تعلیم نسواں کی مخالفت دانشور، حکما، فلاسفر اور دانا بھی کیوں کرتے رہے، حالی نے صاف صاف کہا ہے:

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے نہ پرچھائیں کہیں

ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پاکر آدمی بنا تمھیں زیبا نہیں
یہاں تک تمھاری ہجو کے گائے گئے دنیا میں راگ
تم کو بھی دنیا کی کہن کا آگیا آخر یقیں
علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہوگئیں مایوس تم
سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہیں
جو ذلتیں لازم ہیں دنیا میں جہالت کے لیے
وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں
آخر تمھاری چپ دلوں میں اہل دل کے چبھ گئی
سچ ہے کہ "چپ کی داد" آخر بے ملے رہتی نہیں

تمھاری مظلومی، خاموشی اور بے چارگی کا احساس ہونے لگا ہے۔

بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
آیا تمھارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں

دریائے رحمت جوش میں آگیا ہے وہ تمھاری اذیت و مصیبت، زحمت و جہالت کے خس و خاشاک بہالے جائے گا۔ آخری بند میں تعلیم نسواں کے حامیوں کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ان کو یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم کی تلقین کی ہے۔

گو ہے تمھارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یوں ہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا
پر فتح جب پائی سچائی ہی نے آخر پائی ہے

اس لیے:۔ اے بے زبانوں کی زبانو! بے بسوں کے بازوؤ
تعلیم نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے
یہ مرحلہ آیا ہے پہلے تم سے جن قوموں کو پیش
منزل پہ گاڑی ان کی استقلال نے پہنچائی ہے
ہے رائی بھی پربت، اگر دل میں نہیں عزم درست
یہ ٹھان لی جب جی میں پھر پربت بھی ہو تو رائی ہے
یہ جیت کیا کم ہے کہ خود حق ہے تمھاری پشت پر
جو حق پہ منہ آیا ہے آخر اس نے منہ کی کھائی ہے

حالی کو یہ یقین کامل تھا کہ طبقۂ نسواں کی جہالت، ذلت، نکبت، مظلومی، محرومی و پسماندگی کا خاص سبب علم سے محرومی ہے۔ انھوں نے تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کی اور ایک ماہر اور تجربہ کار حکیم کی طرح عورتوں کے سارے دکھ درد، ساری پریشانی اور بیماری کا علاج "اکتساب علم" قرار دیا۔ ان کی آواز میں درد و خلوص تھا، رفتہ رفتہ اس کا اثر ہوا یہ آواز اس عہد میں منفرد تھی ان کے تمام رفقا بھی اس سے متفق نہیں تھے۔ یہ نظم اپنے خلوص اور اثر کے لحاظ سے اردو شاعری میں لاجواب ہے بلکہ اس کا جواب:

"اردو تو کیا مشرق کی زبانوں میں بھی مشکل سے مل سکے گا اور یہ بھی حالی کے ان شاہکاروں میں سے ہے جن کا ایک ایک پارہ ان کی بقائے دوام کے لیے کافی ہے"[۳]

شاعر کا خلوص اور درد، سوز و گداز، ہمدردی و محبت ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے۔ زبان کی سادگی اور بیان کی روانی، دلوں کو موہ لیتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس نظم میں:

"ہندوستانی عورت کو اس شان سے جلوہ گر کیا کہ ساری پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی کر ڈالی۔ وہ جہاں کہیں عورت کا ذکر کرتے ہیں اسے انسانیت کے بلند ترین مقام پر جگہ دیتے ہیں۔"[۴]

---

۱ مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۲۷۶
۲ اقتباس کلیات نظم حالی جلد دوم صفحہ ۱۳۵
۳ حالی کا ذہنی ارتقا، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صفحہ ۱۹۴
۴ یادگار حالی۔ صالحہ عابد حسین صفحہ ۱۸۹

غزلیں

نور الحسن ہاشمی
قطب پور، ڈالی گنج لکھنؤ

شکایت آئی کب میری زباں تک
رہی محدود بس آہ و فغاں تک

خمارِ نشۂ ہستی نہ پوچھو!
ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

زر افشاں زلف لہرائی ہے کس نے
چمک اُٹھے ہیں تارے کہکشاں تک

جدھر دیکھو مناظر ہی مناظر
جو ہم دیکھیں تو کس کس کو کہاں تک

زہے پیچ و خمِ گیسوئے خوباں
خیال آرائیاں کیجے کہاں تک

یقیں کے راستے پر ہاشمی ہم
ابھی پہنچے ہیں بس وہم و گماں تک

فضل نقوی
۳۸، جوہری محلہ، لکھنؤ

کتابِ زیست کا، کس نے ورق یہ اُلٹا تھا
نہ جانے کون تھا، شاید ہوا کا جھونکا تھا

اُداس شہر میں یہ کون مل کے گزرا تھا
نظر اُٹھا کے جو دیکھا تو ایک سایا تھا

سکھا دیا اُسے سورج کی تیز کرنوں نے
سحر سے پہلے جو اک پھول کھلتے دیکھا تھا

نہ جانے کون سی منزل سے ہو کے آئے تھے
جھکی جھکی تھیں نگاہیں اُداس چہرا تھا

سما گئے تھے اُسی میں حیات کے لمحے!
وہ ایک آنسو جو دامن پہ میرے ٹپکا تھا

جبیں پہ جس کو لکیریں سمجھتی تھی دنیا
وہ ایک خط تھا، خدا جانے کس نے لکھا تھا

عجیب راہِ سفر سے گزر رہی تھی حیات
کبھی نظر میں اُجالا کبھی اندھیرا تھا

نہ جانے کس نے کہی فضل اور کس سے کہی
وہ ایک بات کہ ہر سمت جس کا چرچا تھا

نشتر خانقاہی
کوٹھی نہال سنگھ۔ محلہ جٹانی
بجنور

محمد عثمان عارف نقشبندی
ایک منفرد شاعر

یوں تو حالی کی اصلاحی تحریک کے بعد سے ہی، لیکن خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے زمانۂ عروج سے ادب کے مختلف پہلوؤں کو جہاں کئی معنوں میں توانائی ملی، وہیں ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ادب کا مطالعہ معروضی طور پر نہ ہوکر موضوعی ہوگیا۔ اس سے پہلے تک ادب کو بحیثیت ادب کے پرکھا جاتا تھا اور شعر کی کسوٹی محض شعری اقدار کی کسوٹی تھی، لیکن ترقی پسند تحریک کے زمانۂ عروج میں یہ فیشن عام ہوگیا کہ شاعری اور تخلیقی ادب کو اس کے ادبی معیار سے نہیں، بلکہ موضوعات کو بنیاد بناکر پرکھا جانے لگا۔ اردو ادب میں اس المیے نے ایسی صورت حال پیدا کردی کہ موضوعاتی شاعر صف اول میں نکل آئے اور حقیقی شاعر پس پشت جا پڑے۔ ہوتے ہوتے یہ بھی ہوا کہ جو شاعر مفروضہ طور پر عوامی شاعری نہیں کررہا تھا، مزدور اور کسان کے بارے میں نہیں لکھ رہا تھا، طبقاتی کشمکش کے بارے میں اس کا قلم حرکت میں نہیں تھا اور جو نام نہاد انقلاب کے بارے میں اپنے ذہن اور قلم کا استعمال نہیں کررہا تھا، وہ ثانوی ٹھہرا اور جن نام نہاد قلم کاروں نے ان مفروضہ موضوعات پر اچھی بری چیزیں لکھیں، وہ صف اول کے لکھنے والے ٹھہرے اس سے ادب کو بہت بڑا نقصان یہ پہونچا کہ جو لوگ ایمانداری سے اپنی سوچ اور فکر کو الفاظ کا روپ دے رہے تھے، ان کو دانستہ طور پر نظرانداز کیا گیا اور جو لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کو اپنے ادب کا وسیلۂ اظہار بنا رہے تھے چاہے وہ کتنا ہی کمزور رہو، وہ صف اول میں آ گئے۔

اس اندازِ نظر نے ایک ایسی صورتحال پیدا کردی، جس نے ادب کی کسوٹی کو موضوعات کی جدت تک محدود کردیا اور ادب کو اس کے معروضی مطالعے سے محروم کرکے ایک محدود نقطۂ نظر تک سوچنے اور سمجھنے کو مجبور کیا۔ انتہا یہ ہوئی کہ ادب کے ناقدین نے تخلیقی ادب کو ادب کی کسوٹی پر نہ پرکھ کر موضوعات کی کسوٹی پہ پرکھنے کی ایسی بنیاد ڈالی جس سے ادب کے معیارات معرض خطر میں پڑ گئے۔ انتہا یہ ہوئی کہ ادب کے ناقدین نے اقبال جیسے شاعر کو ملت کا شاعر، امت کا شاعر اور آفاقیت کا شاعر ہونے کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر زور آزمائی کی۔ لیکن اقبال بحیثیت شاعر کتنا بڑا شاعر تھا اس پر ایک بھی ناقد نے قلم اٹھانا گوارا نہ کیا، آج حالت یہ ہے کہ ہم اقبال جیسے عظیم شاعر کو قومی، ملی، اسلامی اور فلسفی شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن محض شاعر کے طور پر اس کے مرتبے سے ناواقف ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے شاعری کو موضوعاتی حدبندی میں جس طرح گرفتار کیا اس سے زیادہ جدیدیت کی تحریک بھی اس کی قصوروار ٹھہری۔ ترقی پسندوں نے جس طرح انقلاب، سرخ سویرا، مزدور اور کسان کے موضوعات مقرر کردیئے تھے، اسی طرح جدیدیت کے علمبرداروں نے انسان کی تنہائی، اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت، بھیڑ میں آدمی کا اکیلاپن اور سماج سے زیادہ آدمی کی اہمیت اور اس آدمی کی کسمپرسی جیسے موضوعات کو ادب کا معیار ٹھہرایا اور انھیں موضوعات پر جدیدیت کے علمبردار شاعر دھڑا دھڑ زور قلم صرف کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ترقی پسندوں کی تحریک کے زیر اثر ایک مفروضہ اور

بناوٹی انداز کا نام نہاد عوامی ادب تخلیق ہوا، وہیں جدیدیت کے زیر اثر ایسی شاعری اور نثری تخلیقات وجود میں آئیں، جو صرف تنہائی ذات کے اکیلے پن اور آدمی کی بے معنویت کے مفروضہ احساسات پر مبنی تھیں۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے جس ادب کی تخلیق پر زور دیا اور جدیدیت کے علمبرداروں نے جس ادب کے موضوعات کو فروغ دینے پر اصرار کیا۔ وہ دونوں زمین کے حقائق سے دور تھے۔ اس افراط و تفریط کے عالم میں ایسے نام نہاد شاعر اور ادیب جنہوں نے مذکورہ موضوعات اور فیشن کے مطابق ادب تخلیق کیا، شہرت اور ناموری کے بام عروج پر پہونچ گئے لیکن وہ جو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت سے ہٹ کر کام کر رہے تھے وہ پس پشت جا پڑے ایسے لوگوں میں بہت سے نام ہیں۔ جنہیں ان ادبی تحریکات نے نقصان پہونچایا۔ یہ ایک اچھا شگون ہے کہ اب ترقی پسندی اور جدیدیت کا کہرا چھٹ رہا ہے اور ناقدین کی نظر ان تخلیق کاروں تک پہونچ رہی ہے، جو خاموشی سے اور ایمانداری سے اپنے احساسات کو تخلیق کا روپ دیتے رہے اور انھوں نے ان ناقدین کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جو موضوعاتی ادب کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ ان تخلیق کاروں میں اور بھی کئی نام ہیں۔ لیکن جو نام فہرست کے آغاز میں آتا ہے، وہ محمد عثمان عارف نقشبندی کا ہے۔ اچھی بات ہے کہ عارف صاحب کی طرف اب ناقدین ادب کی نظر پہونچی ہے اور انہوں نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا معروضی مطالعہ شروع کیا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۲ء میں جب میں اردو کے مشہور ماہنامے "بیسوی صدی" دہلی" کو مرتب کر رہا تھا تب محمد عثمان عارف صاحب کی ایک غزل اشاعت کے لئے مجھے موصول ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ترقی پسندوں کا سحر ٹوٹ رہا تھا اور جدیدیت نے اپنے وجود کا اظہار نہیں کیا تھا میں بحیثیت شاعر اس نتیجے پر پہونچ چکا تھا کہ وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو لیکن تخلیقی ادب افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے اور اس صورتحال کو بدلنا چاہیئے۔ میں نے عثمان عارف صاحب کی غزل پڑھی اور محسوس کیا کہ یہ وہ شاعر ہے، جو کسی ازم، کسی فیشن اور فارمولے سے بندھا ہوا نہیں ہے۔ یہ صرف ان تاثرات کا اظہار ـــــ کر رہا ہے جو ادبی فیشن نے نہیں بلکہ اس کے حقیقی تجربات نے اسے دیئے ہیں۔ میں نے یہ غزل بیسویں صدی میں چھاپی اور خواہش کی کہ کبھی موقع ملے تو اس شاعر سے بذات خود ملاقات بھی کروں۔ کئی برس بعد مجھے اپنے ایک دوست کی وساطت سے جناب عثمان عارف سے ملنے کا موقع بھی نصیب ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ عثمان عارف جس شخص کا نام ہے وہ کوئی فیشن زدہ شاعر نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی معنوں میں شاعر ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کئی شاعر اپنے سرکاری عہدوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ جب تک وہ بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہیں تب تک رسائل و اخبارات انہیں خصوصیت کے ساتھ شائع کرتے ہیں لیکن عہدے سے ریٹائرڈ ہونے یا برطرف ہونے کے بعد انھیں کوئی پوچھتا تک نہیں ہے ہے۔ لیکن جب یہ سطور میں لکھ رہا ہوں ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عثمان عارف کی شاعری ان کی گورنر کی حیثیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ واقعتاً شاعری ہے اور اس نے شاعری میں کسی بھی ازم، فیشن اور فارمولے کا سہارا نہیں لیا ہے۔

محمد عثمان عارف ۵ اپریل ۱۹۲۳ء کو بیکانیر (راجستھان) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق ایک علمی اور مذہبی خاندان سے ہے عثمان صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ نہایت درجہ مذہبی اور ادبی انداز کا تھا۔ ان کے والد الحاج محمد عبداللہ نے بیکانیر میں ہندو اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے زندگی بھر لگاتار کوششیں کیں۔ محمد عثمان عارف بیکانیر میں انٹرمیجیٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آگرہ یونیورسٹی پہونچے۔ جہاں انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور ایم اے کرنے کے ساتھ ہی ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ عثمان عارف صاحب کے والد عربی، فارسی اور اردو، انگریزی کے جید عالم ہی نہیں تھے، بلکہ ایک معتبر شاعر بھی تھے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام بھی شائع ہوا تھا، جس میں اردو اور فارسی کی معتبر شاعری ملتی ہے۔ وہ اردو کے مشہور استاد شاعر حضرت بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔ راقم الحروف نے عثمان عارف صاحب کے والد جناب بیدل کا مجموعہ کلام پڑھا ہے اور ان کے اکثر فارسی اشعار

پرتڑپ تڑپ کرداد دی ہے ۔ جناب عثمان صاحب کے والد بیکانیر میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر فائز رہے ۔ ظاہر ہے کہ عثمان عارفؔ جیسا آدمی جس نے ایسے علمی اور ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی ہو وہ کیوں نہیں آگے چل کر اپنی صلاحیتوں کا براہ راست اظہار کرے گا ۔ مجھے نہیں معلوم کہ محمد عثمان عارفؔ نقشبندی نے شاعری کب شروع کی لیکن یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے خاندانی ماحول نے جو بیج ان کی فطرت میں بو دیئے تھے وہ بارآور ہوئے اور انھوں نے فارمولوں اور مفروضات سے ہٹ کر ایسی شاعری کی جس کو نہ رد کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔

اب تک محمد عثمان عارفؔ کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں میں یہاں ان کا الگ الگ کوئی تذکرہ نہیں کروں گا اور اپنے آپ کو ان کے صرف ان اشعار تک محدود رکھوں گا ، جن کی بنیاد وقتی فیشن پر نہیں ہے بلکہ بالیدگی نظر پر ہے ۔ یہ اشعار عصری آگہی پر بھی منحصر ہو سکتے ہیں اور آفاقی سچائیوں پر بھی ۔ عصری آگاہی کے بارے میں بتاتا چلوں کہ اس کی حیثیت وقتی نہیں بلکہ تاریخی ہوتی ہے ۔ جس سے ادب کے قاری یہ جان پاتے ہیں کہ ایک مخصوص دور میں آدمی اور اس کے سماج میں کیا واردات واقع ہوئی تھیں ۔ عثمان عارفؔ جب یہ کہتے ہیں کہ ؎

دودھ کے ڈیپو پر آدھی رات سے مجمع لگے
اک پیالی چائے کی یوں صبح لے پاتے ہیں لوگ

تو وہ اس کڑوی سچائی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں کہ بڑھتی ہوئی بھیڑ اور سکڑتی ہوئی اشیاء ضرورت کے درمیان اتنا بھیانک تضاد پیدا ہو گیا ہے کہ آدمی صبح کی ایک پیالی چائے کیلئے بھی دودھ لینے کی خاطر لمبی قطار میں کھڑا ہونے پر مجبور ہے یہ تجربہ وقتی نہیں بلکہ تاریخی نوعیت کا ہے ۔ جسے عثمان عارفؔ صاحب نے نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا ہے ۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ، عثمان عارفؔ کسی فارمولے اور فیشن کے شاعر نہیں ہیں ۔ بلکہ جو شاعری وہ کرتے ہیں وہ ان کی قلبی واردات اور احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ اس لئے یہاں جو اشعار ان کے میں پیش کر رہا ہوں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ عثمان عارفؔ نے کبھی اپنے ذاتی تجربات اور احساسات سے الگ ہٹ کر شاعری نہیں کی بلکہ وہی کچھ کہا جو وہ محسوس کرتے تھے ۔

مجھے چونکایا ان کے بہت سے شعروں نے ۔ یاد کرتا ہوں تو ان کے بہت سے اشعار ذہن میں گونج اٹھتے ہیں ۔ جیسے ۔

گلشن کو نہ برباد کریں ، پھول نہ توڑیں — احساس تو ہوتا ہے یہ کانٹوں کی چبھن سے
دل ٹوٹ کے آتا ہے جب آتا ہے کسی پر — عارفؔ یہ جوانی بھی قیامت کی بلا ہے
تم نے پوچھا بھی کبھی آج کے انسان کا غم — اپنی گفتار میں وہ زہر اگلتا کیوں ہے؟
برق بلا گری کہ قیامت گذر گئی — دنیا اسی کا نام ہے پتھر بنی رہی
رنگ سو سو نہ بدل اتنے تو منظر نہ بنا — پیاس اتنی نہ بڑھا دل کو سمندر نہ بنا
آسائش حیات کے ساماں کے باوجود — کاندھوں پہ زندگی کا جنازہ دکھائی دے

یہ اشعار میں نے ان کے مجموعہ کلام سے بغیر کسی تلاش کے چن لئے ہیں اور یہ اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ ان اشعار کو کہنے والا شاعر ٹھیٹ انسانی اقدار کا علمبردار ہے اور وہ کسی بھی ادبی فیشن سے متاثر نہیں ہے ۔

میں وثوق کے ساتھ اس بات کو کہنا چاہتا ہوں کہ کئی شاعر اپنے سرکاری عہدے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں لیکن یہ سرکاری عہدہ ان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو ان کی شاعرانہ حیثیت بھی پس پشت چلی جاتی ہے ۔ لیکن عثمان عارفؔ ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری ان کے عہدے اور حیثیت سے تعلق نہیں رکھتی ۔ بلکہ اپنے آپ میں قابل فکر اور قابل پذیرائی ہے ۔

مجھے خوشی یہ ہے کہ مردہ پرستوں کے اس عہد میں اتر پردیش سرکار کے محکمۂ اطلاعات اور رابطہ عامہ کے رسالے 'نیا دور' نے محمد عثمان عارفؔ کی شاعری پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا جس میں اردو کے مشاہیر ڈاکٹر محمد حسن ، شمس الرحمٰن فاروقی اور اسی سطح کے دوسرے ناقدین نے اپنی آراء کا اظہار کیا اور یہ بتایا کہ دراصل عثمان عارفؔ کی شاعری ہمیں تجربات کے کن پہلوؤں سے آشنا کرتی ہے ۔ مجھے پوری توقع ہے کہ اگر عثمان عارفؔ کسی سرکاری عہدے پر نہ بھی رہے تو بھی ان کی شاعری زندہ رہے گی ۔

نصیر پرواز
۸2/1092/B
گووند پورہ ۔ بھوپال

غزل

خود کا یقین ذات کے اندر بچایئے
آئینہ ریزہ ریزہ ہے پتھر بچایئے

ڈسنے لگی ہیں ذہن کو لہجے کی نرمیاں
اندھی رفاقتوں کو سنبھل کر بچایئے

ہمسائے اب کسی کو بھی پہچانتے نہیں
باقی اگر رہا ہو کوئی گھر بچایئے

جو یاد ایک اشک وہی اشک ایک یاد
آنکھوں میں رکھیے خشک لبوں پر بچایئے

تہذیب آدمی کا لہو چاٹنے لگی
پیاسا ہے سارا شہر سمندر بچایئے

گلیوں میں چیختے ہوئے ذہنوں کا اضطرار
بارش ہے پتھروں کی ذرا سر بچایئے

ممکن ہے راستے میں کہیں دھوپ بھی ملے
جو رہ گئی ہے سر پہ وہ چادر بچایئے

ہاتھوں کی چند گہری لکیروں کے باوجود
معصوم خواہشوں کا مقدر بچایئے

احساسِ نامراد تو بے روح ہو چکا
کس کے لیے وجودِ گلِ تر بچایئے

مٹی میں مل نہ جائے وراثت شعور کی
آوارہ آندھیاں ہیں تو چھپّر بچایئے

ڈوبی ہوئی ہے آگ میں شہروں کی آبرو
پانی ہوا سے خاک کا پیکر بچایئے

پرواز جس کے غم میں سلگتی ہے کائنات
اس آرزو کو جسم سے باہر بچایئے

عنبر بہرائچی
ٹائپ ۴، بی ۳۴۳ نیو بلاک
کھرکا کالونی ۔ جون پور

مجھے خبر ہے مجھے یقیں ہے

مجھے خبر ہے
یہ آبنوسی چٹان، جو دُوب کے سبز تختے پہ آگری ہے
نئی، سبک، نرم پتیوں کا سنگھار پی کر
سُنہرے لمحوں کی سانس میں پھانس بن کر اٹک گئی ہے
مجھے یقیں ہے
کہ موسموں کے طلسم پہ نیرگی اڑا کر
اسی سلگتی چٹان پر دوب کی سبز زلفیں بکھیر دیں گے
مجھے یقیں ہے
مرے کٹے بازوؤں کی طاقت مری رگوں سے نہیں گئی ہے
مرے لہو کے یہ سُرخ دھارے نئی حکایت کے پیش رو ہیں
نئی اُمنگوں، نئے اُجالوں، نئے شفق زار کے امیں ہیں
مجھے خبر ہے
کہ غول چڑیوں کے لشکرِ ابرہہ کی اب کچھ خبر نہ لیں گے ؟
ہماری آنکھوں میں روشنی ہے مگر دلوں میں سیاہیاں ہیں
اداسیوں کے گھنے دھوئیں میں چھپی ہوئی کامرانیاں ہیں
مجھے یقیں ہے
کہ اس فضا میں، فرازِ صحرائے بے اماں میں
ہزاروں معصوم اپنی ایڑی رگڑ چکے ہیں، رگڑ رہے ہیں
اُبل پڑے گا ضرور کوئی حیات افروز آب شیریں
صداقتوں کے بہار زاروں کو آخرش تازگی ملے گی
مجھے خبر ہے مجھے یقیں ہے

■■

محمود زکی
۱۳۱ ۔ مرزا نعیم بیگ روڈ ۔ اجین

شکنتلا کے اردو تراجم

اجین کے راجہ بکرما جیت کے نورتنوں میں شامل ایشیا کے عظیم شاعر کالی داس جنہوں نے اپنی لازوال تخلیقات کے ذریعہ ہندوستانی ادب اور ایشیائی ادب میں ہی نہیں بلکہ عالمی ادب میں اپنا اہم ترین مقام بنایا ہے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں کالی داس کی شہرہ آفاق تخلیق " شکنتلا " کے تراجم ہوئے ہیں جن زبانوں میں کالی داس کی اس عظیم تخلیق کے تراجم موجود ہیں ان میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، فارسی، لاطینی، پولش، سوئیڈش، ڈچ، ہسپانوی، ہنگری، نیپالی اور ہندوستان کی تقریباً سبھی اہم زبانیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور یہ ترجمے ایک بار نہیں کئی کئی بار ہوتے رہے ہیں۔ ناروے کے مشہور ماہر مشرقیات ڈاکٹر اسٹین کونو کا دعویٰ ہے کہ صرف جرمن زبان میں ہی کالی داس کی " شکنتلا " کے تیس ۳۰ تراجم موجود ہیں اور اردو زبان میں بھی وثوق کے ساتھ اب تک تینتیس ۳۳ تراجم کا ہونا بتایا جاتا ہے۔

شکنتلا کی کہانی ویسے تو مہابھارت سے ماخوذ ہے مگر اس میں پُرانوں اور رامائن سے بھی کچھ باتیں شامل کی گئی ہیں۔ کالی داس نے اسے اساطیری کہانی میں لازوال بنانے کے لئے اس میں کچھ دیگر دلچسپ اضافے بھی کئے ہیں۔ مہابھارت کی اصل کہانی میں راجہ دشینت کی انگوٹھی کا قصہ ہے اور نہ ہی درواسا رشی کے شراپ دینے کا ذکر ہے۔ یہ باتیں کالی داس نے راجہ دشینت کے کردار کو پُر عظمت بنانے کی غرض سے اختراع کی ہیں۔ اسی طرح اپسرا مینکا کو اپنی بچی شکنتلا کو جنگل میں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جانے کے الزام سے بری کرنے کے لئے بھی کالی داس کا تخلیقی ذہن یہ اضافہ کر دیتا ہے کہ جب راجہ دشینت شکنتلا کو بھول جاتا ہے اور ٹھکرا دیتا ہے اس نازک موڑ پر مینکا آسمان سے شعلہ بن کر نمودار ہوتی ہے اور شکنتلا کو وہاں سے اٹھا کر لیجاتی ہے اور کشیپ منی کے آشرم میں اسے چھوڑنے اور پھر وہاں راجکمار بھرت کے پیدا ہونے کا واقعہ جوڑ کر اس قدیم کہانی کی کمیوں اور کوتاہیوں پر کالی داس اپنے فن کا دلکش پردہ ڈال کر حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ ڈرامے میں شکنتلا کا کردار قدرت کا ایسا حسین اور دلکش شاہکار ہے جس میں پاکیزگی معصومیت اور سادگی کا حسین ترین امتزاج موجود ہے اسی فطری معصومیت اور حسن کی دلکشی کی وجہ سے راجہ دشینت اسکے ساتھ گندھرب وواہ کے لئے راغب ہوتے ہیں اور جب دشینت محل میں جاکر اسے فراموش کر دیتے ہیں تو وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتی ہے۔ اس کی اضطرابی کیفیت کا اظہار کالیداس کے فن کا کمال ہے اور ٹھیک اسی طرح جب انگوٹھی مل جانے پر دشینت کے دماغ میں بھولی باتیں اور شکنتلا کی یادیں ابھرتی ہیں تو اسکی بیقراری دیکھنے کے جذبات کی عکاسی بے پایاں تخلیقی قوت کا مظاہرہ ہے فن کی انہیں بلندیوں نے " شکنتلا " کو دنیائے ادب میں بے مثال شہرت اور اس کے خالق کالی داس کو شہرۂ آفاق فن کار کی حیثیت دلائی ہے۔

" ہسٹری آف دی سنسکرت لٹریچر " میں اس کے مولف اے اے۔ میکڈانلڈ نے لکھا ہے کہ سر ولیم جونس نے انگریزی میں " شکنتلا " کا پہلا ترجمہ ۱۷۸۹ء میں کیا تھا۔ اس کے دو سال بعد پروفیسر جی فورسٹر

نے ۱۷۹۱ء میں جرمن زبان میں ترجمہ کیا اور روسی زبان میں مشہور تاریخ داں این کرام زن نے ۱۷۹۲ء میں پہلا مگر نامکمل ترجمہ کیا تھا پھر دوسرا مکمل ترجمہ روسی زبان میں ۱۸۷۹ء میں پروفیسر ایلگزی پوٹیبانا نے کیا۔ اور فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ اے۔ایل چے زی نے ۱۸۳۱ء میں کیا ہے۔ ان حوالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ اور زندہ زبانوں میں کالی داس کی تخلیق کے تراجم کے سن معلوم ہو جائیں اور پھر یہ دیکھیں کہ ہماری ملکی زبانوں نے سنسکرت کی اس عظیم تخلیق کو کب اپنے یہاں جگہ دی۔

اردو ہندوستان کی وہ مایہ ناز زبان ہے جس نے اپنا دامن حسن و خوبی کے اپنانے کے لئے ہمیشہ کھلا رکھا اور بہت خلوص و محبت کے ساتھ دنیائے ادب کی اچھائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور زبان اپنے تشکیلی دور میں ہی کالی داس اور اسکی تخلیق شکنتلا کو اپنا چکی تھی اور اس عظیم تخلیق کو نظم کے قالب میں ڈھال کر پیش کر چکی تھی یعنی محولہ بالا تراجم سے پہلے اردو زبان کے ایک شاعر نواز نے ۱۶۸۰ء میں "شکنتلا" کو نظم کر دیا تھا "تذکرۂ طبقات شعرائے ہند" کے مولفین مولوی کریم الدین اور ایف فیلسن نے نواز کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شخص مسلمان ہے اس نے شکنتلا کا ترجمہ برج بھاشا میں کیا ہے پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی تاریخی کتاب "پنجاب میں اردو" میں لکھا ہے کہ عالمگیر کے فرزند اعظم شاہ کی خواہش پر نواز نے سنسکرت سے "شکنتلا" کا ترجمہ کیا تھا۔ آچاریہ رام چندر شکل نے بھی نواز کے ترجمے کو ۱۶۸۰ء میں ہونا بتایا ہے اور ڈاکٹر نگیندر نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ نواز نے خود اس ترجمے کی شان نزول بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ؎

بخت بلند، مہابلی، اعظم خان، امیر
داتا، گیاتا، سورما، سانچو، سندر، دھیر
اعظم خان نواز کو دینو ای فرمائی
شکنتلا ناٹک ہمیں بھاشا دیو بنائی

نواز کے منظوم ترجمے کا نمونہ دیکھئے ؎

بن میں مدھوکر بہت ستائی
شکنتلا تب ٹیر سنائی
ٹھاڑی رہیں، سکی نا ہیں ڈولیں
جیسے سور ہیں کچھو نا ہیں بولیں

نواز کی نظم میں برج بھاشا کے اثرات بہت بڑی تعداد میں صاف نظر آتے ہیں مگر یہ دور اردو کی تشکیل کا دور تھا اور تشکیلی زبان میں یہ ہونا بالکل فطری امر ہے۔ نواز کا یہ ترجمہ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان اور دنیا کی دیگر زبانوں میں پہلا ترجمہ ہے۔ اس سے اس پروپگنڈے کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ کالی داس ہندوستان میں جرمنی زبان سے لوٹ کر دوسری زبانوں میں آیا۔ اتنا ہی نہیں اردو زبان میں نواز کے اس ترجمے کے بعد جب اردو میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں شروع ہوا تب کاظم علی جوان نے ۱۸۰۱ء میں "شکنتلا" کا اردو ترجمہ کیا ان کا یہ ترجمہ نثر و نظم دونوں میں ملا جلا تھا۔ جوان کے ترجمے کا نمونہ دیکھئے کنٹر و مُنی جب نوزائیدہ بچی کو جنگل میں پڑا ہوا دیکھتے ہیں اس کیفیت کا بیان ہے ؎

"اس نوگل چمن کو گلستاں سے دور دیکھ
حیراں بہ رنگ بلبل تصویر ہو گئے
غلطاں در یتیم سی تھی لیک خاک پر
غلطانی اس کی دیکھ وہ دل گیر ہو گئے"

"اس پر انہیں ترس آیا۔ دوڑ کر خاک پر سے اٹھایا۔ گودی میں لے کر کہنے لگے یہ پری ہے یا جن یا کسی قوم کی ایسی خوبصورت لڑکی ہے کہ دیکھی نہ سنی کچھ کہا نہیں جاتا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کس نے اس جنگل میں لاکر خاک کے اوپر اس چاند کے ٹکڑے کو ڈال دیا ہے"۔

کاظم علی جوان مقفیٰ عبارت لکھتے تھے ان کے اس ترجمے کے بعد ۱۸۰۲ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے "شکنتلا" کا ایک ترجمہ سید محمد تقی کا "رشک گلزار" شائع ہوا تھا پھر ۱۸۴۹ء میں کلکتہ کے شاعر غلام احمد احمد نے مسدس کی شکل میں "شکنتلا" کا ترجمہ کیا "فراموش یاد" جیسے مثنوی

میں شمار کیا جاتا ہے پھر اُما شنکر جوہری جی کا ترجمہ ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا اور اسی سن میں نوشیرواں جی آرم جی نے غالباً اسٹیج کے لئے "شکنتلا" کا ترجمہ "شکنتلا عرف گنوایا ہوا چھلا" کیا ۱۸۷۴ء میں آگرہ کے جواہر لال نے "شکنتلا ناٹک" لکھا اس کے بعد لکھنؤ کے ایک رئیس کنور عنایت حسین نے پھر ایک منظوم ترجمہ "غازۂ تعشق" کے نام سے ۱۸۸۳ء میں کیا اس میں تقریباً پندرہ سو اشعار تھے یہ بریلی سے شائع ہوا تھا۔ تاریخ بھی ابتدائیہ میں اسی نام سے نکالی گئی ہے ۔

"ہے یہ گل تازۂ تعشق
نام اس کا ہے غازۂ تعشق ۱۸۸۳
تاریخ بھی نام سے ہے پیدا
سال اس میں ہے عیسوی ہویدا"

کنور عنایت حسین کا ترجمہ بھی مثنوی کی بحر میں ہے نمونہ دیکھئے تپسیا کا حال بیان کرتے ہیں ۔

"بسوامتر ایک تھے درویش
مرتاض، خدا شناس، حق کیش
جنگل میں وہ گوشہ گیر رہتے
دائم تکلیف و رنج سہتے
سردی میں جب پالا پڑتا
سردابے میں ہوتے جلوہ افزا
لہرا جاتی مزاج میں جب
کرتے دریا میں طاعت رب
گرمی میں جلائے آگ جاوید
بیٹھے رہتے تھے پیش خورشید
کچھ فکر نہ تھی یہاں وہاں کی
چھوڑیں سب نعمتیں جہاں کی"

نظم کے اختتام میں دعائیہ اشعار شامل ہیں دیکھئے ان میں وہ کس قدر شاعرانہ دعا کرتے ہیں ۔

"خالق ملے جس طرح یہ مہجور
سب اپنی مراد سے ہوں مسرور
سب پائیں جہاں میں نعمتیں چار
مے، چنگ، شباب، وصل دلدار
فرقت کا نہ پائے کوئی آزار
چھوٹے نہ کبھی کسی کا یار
کر سب کی اس طرح حمایت
دائم ہو بشاشت عنایت"

اس صدی میں کچھ اور تراجم ہوئے تھے ۱۸۸۵ء میں حافظ محمد عبداللہ فتحپوری نے اور ۱۸۸۹ء میں غلام حسین عرف حسینی میاں ظریف کے تراجم کا ذکر کیا جاتا ہے اور پھر بیسویں صدی میں ۱۹۰۱ء سے دلیپ رائے پران جیون کے ترجمے سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مولوی عزیز مرزا نے ۱۹۰۵ء میں اقبال ورما سحر نے ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے ۱۹۳۸ء میں قدسیہ زیدی نے ۱۹۵۶ء میں ساغر نظامی نے ۱۹۶۰ء میں منور لکھنوی نے ۱۹۶۳ء میں کامیاب تراجم پیش کئے جن کو عوامی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ اقبال ورما سحر کے ترجمے "نیرنگ سحر" جسے زمانہ پریس کانپور نے شائع کیا تھا۔ اس کا نمونہ دیکھئے "شکنتلا" اپنی سہیلیوں کے ساتھ آشرم کی کیاریوں میں پانی ڈال رہی ہے اچانک ایک بھنورا اس کے چہرے کو کھلے ہوئے کنول کا پھول تصور کر کے اس کے گرد منڈلانے لگتا ہے اس منظر کی عکاسی دیکھئے ۔

"اتر کر ناگاہ ایک بھنورا
چہرے پہ شکنتلا کے پہنچا
بھاگی وہ ادھر سے ہٹ گئی پھر
جھجکی، ٹھٹکی، سمٹ گئی پھر
ہاتھوں کو پٹک پٹک کر اڑایا
آنچل کو جھٹک جھٹک کر بھگایا
آخر چلائی ڈر کر مجبور

سکھیو دوڑو اسے کرو دور
پھر ہائے دیکھو وہ آرہا ہے
ناحق یہ مجھے ستا رہا ہے

شکنتلا کی سکھیاں مذاق کرتے ہوئے کہتی ہیں۔ مظلوم کی حفاظت کرنا تو راجا دشینت کا کام ہے انہیں کو پکارو۔ راجہ دشینت وہاں چھپے ہوئے خود موجود تھے وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر فوراً سامنے آگئے اور ؎

"پوچھا اے مہ وشانِ خوش رو
کیوں شور ہے کون ہے جفا جو
قاطع ہوا کون آشتی کا
دعویٰ کسے ہوا سرکشی کا"

پوری نظم میں یہی روانی اور سادگی برقرار ہے یقیناً یہ اپنے عہد کی قابل قدر چیز رہی ہوگی۔ منظوم ترجمہ کرتے وقت شاعر کو کچھ حذف و اضافے سے بچنا بہت دشوار ہوتا ہے اور اس نظم میں بھی ہوا ہے۔ لیکن جب ۱۹۴۸ء میں اختر حسین رائے پوری نے "شکنتلا" کا براہِ راست سنسکرت سے نثری ترجمہ کیا تو انھوں نے کالی داس کے فن کی باریکیوں پر پوری توجہ دی ان کی زبان اور اسلوب بھی کافی دلکش ہے۔ آشرم کی لتا کنج میں تخیل کی نزاکت کی حسین عکاسی دیکھئے ؎

"اس جگہ جہاں بیلوں نے گھنے کنج بنا دیے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ سیم تن ابھی ننھے پودوں کے جھنڈ سے ہوکر گزری ہے۔ جن ڈنٹھلوں سے پھول توڑے گئے ہیں ان کے گھاؤ ابھی ہرے ہیں اور جہاں پتیاں توڑی گئی ہیں ان کی کوروں پر ابھی دودھ کی بوندیں جھلک رہی ہیں"

اسی طرح شکنتلا کی تصویر میں مزید حسن و خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے راجہ دشینت کی خواہش کیا ہے ملاحظہ کیجئے کالی داس کی نازک خیالی کی ترجمانی اختر حسین رائے پوری کے ترجمے میں۔

"مالن ندی کا ایک منظر بنانا ہے جس کی ریت پر ہنس کے جوڑے کلیلیں کر رہے ہوں دونوں طرف ہمالہ کی پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہوں۔ اور ہرنوں کے جھنڈ جگالی کر رہے ہوں۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایسا پیڑ دکھایا جائے جس کی ڈالیوں پر چھال کے کپڑے سوکھ رہے ہوں اور نیچے ایک ہرنی اپنی بائیں آنکھ کسی کالے ہرن کے سینگ سے کھجا رہی ہو"

ایسے پرسکون ماحول اور قابل دید مقام پر شکنتلا رہتی ہے۔

شکنتلا کا ترجمہ کرنے والوں میں پریم پال اشک اور خود راقم الحروف بھی شامل ہیں۔ اتنے زیادہ تراجم کے بعد بھی اسٹیج کے لئے اور پوری معنویت کو لئے ہوئے ترجمے کی ضرورت اور کمی اردو میں محسوس کی جاتی ہے۔ ★ ★ ★

تاج لکھنوی

سیتاپور روڈ، کھدرا لکھنؤ

غزل

تیرا خلوص کیا کہوں تیرا خلوص عام ہے
رندوں کا بھی ہے یار تو زاہد کا بھی امام ہے

برق کے ربط و ضبط سے گھر ہی مرا اُجڑ گیا
اہلِ کرم نہ پوچھئے میرا کہاں قیام ہے

اے مرے ہم نشیں مجھے تو نے مٹا دیا مگر
میری انا سمجھ سکے تیرا خیالِ خام ہے

اونچے قدوں کے لوگ کیا سمجھیں وطن کی آبرو
چھوٹے قدوں کی زندگی اپنے وطن کے نام ہے

تاج فضائے گلستاں ڈوبی ہے سیلِ نور میں
ساقی کے دستِ ناز میں سورج ہے یا کہ جام ہے

ایس ۔ ایم ۔ عباس
مانی کلاں ——— جون پور

ایک چادر میلی سی

سماجی اور معاشرتی پس منظر میں

"جہاں بھی لوگ تمہیں بلند آواز سے ہنستے، قہقہہ لگاتے سنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا، چونکہ وہ دنیا کا ماتم نہیں کرنے آیا اور نہ فلسفہ دانی اس کا نصب العین ہے۔ وہ جو اندر سے ہے وہی باہر سے اس کے جیون کا رہسیہ ہی ہے کہ کوئی رہسیہ نہیں"

"وہ ایک ایسا پودا ہے رانی! جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پر پنپ سکتا ہے اس کی اپنی دھرتی کی وسعت اس کی نگاہ اور دل میں سما گئی ہے"

یہ ہیں راجیندر سنگھ بیدی کے وہ الفاظ جو انھوں نے پرلودھ اور میتری' میں اپنے کردار پرلودھ کی زبان سے ادا کرائے ہیں کیسی عقیدت، کتنا والہانہ پیار ہے بیدی کو پنجاب کی دھرتی سے۔ پنجاب کی مقدس سرزمین، جو صرف پنجابیوں کو ہی پیاری نہیں، ہم سبھی بھارت واسیوں کو جان و دل سے عزیز ہے۔ ہم سب کے لئے لائق صد احترام ہے کیونکہ وہ مادرِ وطن کا ایک ٹکڑا ہے، اور بقول شاعر ؎

خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

اور ان سطور کو پڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ بیچارے بیدی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں پنجاب کی لوبان سے معطر دھرتی پر جو خون آشام مناظر دیکھے، ان سے ان کی روح کو ضرور صدمہ پہنچا ہوگا اور آج بھی یہاں کا سماں دیکھکر ان کی روح بیقرار ہوگی۔

بہرحال بیدی کو پنجاب کی مقدس دھرتی سے بے پناہ عقیدت رہی ہے۔ انھوں نے بڑے ہی خلوص و محبت کے ساتھ پنجاب کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی تصویر کشی کی ہے بھی سادہ سی تصویر میں اپنے خونِ جگر کا رنگ بھر کر 'ایک چادر میلی سی'، کی صورت میں اس شاہکار تصویر کو ادب کے نگارخانے کی نذر کر دیا۔

بیدی نے کہانیاں لکھیں، ڈرامے، مضامین، مزاحیہ خاکے تحریر کئے اور فلمی ڈائلاگ بھی۔ ان کی تقریباً ہر تخلیق کا موضوع عوامی متوسط یا نچلے طبقہ کا دکھ درد ہے۔ معاشرہ کی وہ الجھنیں ہیں جو بافراغت اور اطمینان بخش زندگی کے لئے مسائل پیدا کرتی ہیں اور جن سے قدم قدم پر انسانی ظرف کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ اس امتحان گاہِ عمل میں وہی سرخرو و شادماں ہیں جو "موج حوادث" سے ہنستے کھیلتے گذر جانے کا فن جانتے ہیں۔ اسی نظریۂ فکر کو سامنے رکھ کر بیدی نے اپنا ناول "ایک چادر میلی سی" لکھا ہے اور صرف اسی ایک ناول نے ان کا شمار صفِ اول کے ناول نگاروں میں کرا دیا ہے۔

یوں راجیندر سنگھ بیدی اردو افسانہ نگاروں میں بھی ایک مقتدر اور معتبر نام ہے۔ لیکن جب کبھی اردو ناول کی بات چلے گی بیدی

کی 'ایک چادر میلی سی'، کا تذکرہ ضرور ہوگا۔

۱۹۶۴ء میں بیدی کا یہ ناول منظرِ عام پر آیا تھا۔ اپنے منفرد انداز بیان، منظر نگاری، واقعیت، ازدواجی زندگی کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی، ماحول و حالات کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کے نتیجہ میں یہ ناول اپنے کسی بھی قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے لفظوں میں ـــــ

" راجیندر سنگھ بیدی اگرچہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن "ایک چادر میلی سی"، لکھ کر انھوں نے ناول کے فن پر اپنا لوہا منوالیا ہے کم لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ بیدی کا اسلوب ان کے آرٹ کی جان ہے جسے ناول کو گریز پا تخیل کی رنگینیوں (رومانیت) سے نکال کر حقیقتوں کے عجائبات کے روبرو لا کھڑا کیا ہے۔ علی بابا کے دفینوں کی کلید اگر 'کھل جا سم سم' تھی تو اردو میں حیات انسانی کے رموز و اسرار کا ابجدی قفل بیدی کے حرفوں اور لفظوں نے کھولا ہے"۔

بیدی کا دل جامِ جہاں نما ہے۔ انھوں نے پنجاب کے غریب عوام کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور یہاں کے سارے پیچ و خم ان کی نگاہ میں سما گئے۔ حالات کی کسمپرسی میں بھی ان کا نقطۂ نظر کہیں تبدیل نہیں ہوتا کہ زندگی رونے دھونے اور صرف آنسو بہانے کی چیز نہیں۔ عزم و عمل کا کارواں لاکھ مشکلات کے باوجود بڑھتا رہا ہے۔ بڑھتا رہے گا۔ کائنات کی تسخیر میں زندگی کا کچھ نہیں بلکہ کل حصہ ہے۔ بیدی نے انتساب میں اس مصرعہ کو اپنا سرنامہ بنا کر ایک ازلی اور ابدی پیغام دہرایا ہے ؎

اپنا لہو بھی سرخیٔ شامِ سحر میں ہے۔

تاریخ شاہد ہے۔ مرد ہی نہیں، عورت بھی عزم و عمل کا پیکر ہے عورت میں ایثار و قربانی کا جذبہ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے محبت و قربانی سے ہی شاید اس کا خمیر اٹھا ہے۔ اسی پاکیزہ جذبہ سے ہی اس نے "تصویرِ کائنات" میں رنگ بھر دیا ہے ایثار و وفا کے میدان میں عورت مرد سے کہیں آگے نکل جاتی ہے وہ اکثر بڑی بڑی مشکلیں جھیل لیتی ہے لیکن اس کے ثبات قدم متزلزل نہیں ہوتے۔ وہ زندگی سے نباہ کے لئے حالات سے جنگ ہی نہیں اکثر سمجھوتہ بھی کر لیتی ہے۔ وہ لامحدود مصائب و آلام صبر و شکر سے جھیل جاتی ہے اور اس کی زبان پر کوئی حرفِ شکایت نہیں آتا۔

عورت کی یہ بھی ایک ادا ہے کہ وہ ناگوار کو بھی گوارہ کر کے، دل پر بھاری پتھر رکھ کر، ہر ظلم خاموشی سے سہہ لیتی ہے۔ اکثر اس کی روح بے چین ہوتی ہے۔ دل روتا ہے مگر چہرہ ہنستا رہتا ہے اس کی اس خندہ پیشانی میں دل کے آنسوؤں کو کون دیکھ سکتا ہے لیکن ایک شاعر، ایک ادیب، ایک مصور جب عورت کے بظاہر ہنستے ہوئے چہرہ میں اس کے زخمِ جگر کو تلاش کر لیتا ہے تو وہ حسرت و یاس کی اس دیوی، صبر و رضا کے اس پیکر پر قربان ہو جانا چاہتا ہے۔ تب ہی بیدی کی 'ایک چادر میلی سی' تخلیق ہو جاتی ہے یا مہادیوی ورما کہہ اٹھتی ہیں ؎

ابلا جیون ہائے تمہاری یہی کہانی
آنچل میں ہے دودھ اور آنکھوں میں پانی

'ایک چادر میلی سی'، کا تانا بانا پنجاب کے ایک غریب گھرانے کے گرد بُنا گیا ہے۔ اس کنبے میں کل آٹھ افراد ہیں۔ رانی (ناول کی ہیروئن) اس کا شوہر تلوکے۔ اس کا دیور اور بعد میں ہونے والا شوہر منگل، اس کی ساس جنداں، اس کا خسر حضورا سنگھ اور پہلے شوہر کی تین اولادیں، بڑکی، آتنے اور ستنے۔

رانی غیور اور خود دار ہے۔ وہ حسین اور جوان ہے۔ لیکن وہ غریب کی بیٹی ہے۔ وہ شوہر کی مار بھی کھاتی ہے۔ ساس کے طعنے بھی سنتی ہے لیکن نباہ کی ہر طور کوشش کرتی ہے۔ وہ زبان سے گھر سے نکل جانے کی بات ضرور کہتی ہے۔ مگر دل سے ایسا کبھی نہیں چاہتی ہے یہ اسی ذہن کی تصویر کشی ہے جو ہندوستانی عورت کا مزاج ہے۔ یہ ہماری تہذیب کی خوبی ہو، یا خامی، لیکن یہ معاشرہ کی ایک بلند ترین قدر سمجھی جاتی رہی ہے کہ ہندوستانی عورت جس گھر میں ایک بار بہو بن کر قدم رکھ دیتی ہے اس گھر سے مرکر ہی نکلنا چاہتی ہے۔

عورت کی اس مزاجی کیفیت کے علاوہ بیٹی کی بیل جب سسرال جا کر منڈھے چڑھ جاتی ہے تو مائیکے والے بس اس کو سدا سکھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس بیل کو سسرال کے منڈھے پر ہی بڑھتے

پھولتے پھلتے رہنے کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔

ہوتا بھی یہی ہے کہ بیٹی کی بیل جب سسرال کے منڈھے پر چڑھ کر پھیل جاتی ہے تو آنگن میں اس کی جڑیں اتنی گہرائی تک اتر جاتی ہیں کہ ہلائے نہیں ہلتیں۔

بیدی نے عورت کی زندگی یوں پیش کی ہے ــــــ

"رانو اندر جا کر ایک ٹرنکی میں کپڑے ڈالنے لگی۔ وہ جا رہی تھی، کہاں جا رہی تھی؟ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ وہ بس جا رہی تھی.... .... بیٹی تو کسی دشمن کے بھی نہ ہو بھگوان۔ ذرا بڑی ہوئی ماں باپ نے سسرال ڈھکیل دیا۔ سسرال والے ناراض ہوئے مائیکے لڑھکا دیا۔ ہائے یہ کپڑے کی گیند، جب اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے تو لڑھکنے جوگ بھی نہیں رہتی.."

غیور و خود دار رانو، شرابی شوہر کی گالی مار کھا کر، ساس کے طعن و تشنیع سن کر ایک پل بھی سسرال میں رکنا نہیں چاہتی، لیکن وہ بھیگی گیند بن چکی ہے۔ جو اب لڑھک نہیں سکتی ہے کوئی طاقت اس کا پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ گھر گرہستی کا بوجھ۔ بال بچوں کا خیال اور ہندوستانی عورت کا وہ مزاج، جسے آج تک کوئی نام نہیں دیا جا سکا ہے۔ یہ ذہنی کیفیت ملاحظہ ہو ــــ

"پیچھے؟ ـــ آگے؟..... رانو، خود دار رانو بہت کچھ جھینی جھپٹی لیکن تلوکے کی طرح اب اس کی باتوں میں بھی کوئی دم نہ رہ گیا تھا وہ کوئی بہانہ ہی چاہتی تھی جس سے وہ بھی رہ جائے اور عزت بھی۔"

زندگی کے فریضہ کو انجام دینے۔ اس کے بار گراں کو بہر طور اٹھائے رکھنے کا یہ جذبہ بھارتی سنکرتی اور سبھیتا کا مقدر ہے اور اس کی بلندی ہندوستانی عورت کی معراج کہی جا سکتی ہے۔

"ایک چادر میلی سی" پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بیدی نے ہندوستانی سماج کی قدروں اور بھارتی ناری کے مزاج کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے وہ جا بہ جا عورت کے ان بے زبان جذبات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں سمندر کا سا پُر وقار سکوت ہے لیکن جن کی تہہ میں بے پناہ طوفان مچل رہے ہیں۔ بڑے سے بڑا ظلم سہہ کر، دل میں سیکڑوں طوفان چھپا کر، ہر گام پر زندگی سے مفاہمت کے لئے آمادہ ہونا، عورت کے جذبۂ ایثار و وفاداری کے ساتھ ہی ہماری قومی تہذیب کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

لیکن ان باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستانی عورت بزدل اور بے حیا ہے۔ اُسے اپنے مرتبہ کا پاس و لحاظ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بھارتی سبھیتا نے عورت کو ہمیشہ اس کا حق پہچنوایا ہے۔ یہاں کی عورت کو اپنے مرتبے اور مقام کا بخوبی علم ہے وہ شوہر اور سسرال پر اپنا حق سمجھتی ہے۔ اکثر وہ شوہر سے اپنا حق منوانے کے لئے لڑائی بھی لڑ لیتی ہے۔ وہ اپنے حقوق کے لئے ساس سے بھی نہیں دبتی ہے اس لئے کہ اس کے شوہر کا گھر اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔

لیکن دراصل سسرال کا ناطہ بھی کتنا عجیب ہے۔ شوہر کے رہتے ہوئے یہ جتنا مضبوط ہوتا ہے، شوہر کے نہ رہنے پر اتنا ہی کمزور ہو جاتا ہے، اس بات کے کہنے میں عار نہیں کہ یہ ہماری پرمپرا کا ہی دوش رہا ہے کہ سماج میں بیوہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں مانی گئی۔ اسے کوئی مقام نہ دے کر اور ہر طرح نظر انداز کر کے اس کی شخصیت کو اس قدر مجروح کیا گیا کہ اس کا وجود خود اس کے لئے بار بن کر رہ گیا۔ وہ خود کو زمانہ بھر سے الگ، بالکل معذور و مجبور اور بیکار محض سمجھنے لگی۔ زمانے نے اسے اتنا دکھ دیا کہ شوہر کی موت اس کے لئے مستقل سزا بن کر رہ گئی۔

رانو بھی اسی سماج کی پروردہ ہے۔ تلوکے کی موت نے اسے بالکل بے یار و مددگار بنا دیا۔ وہ خود کو معذور و مجبور سمجھنے لگتی ہے طرح طرح کے وسوسوں اور خدشات نے اسے ہر سمت سے گھیر لیا ہے حالانکہ پنچوں کے حکم اور اصرار پر وہ منگل کے ساتھ چادر تان لیتی ہے اور رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جاتی ہے لیکن وہ پہلی سی رانو اب نہیں تھی جو تلوکے کے ساتھ (مار کھا کھا کر بھی) برابری میں لڑتی اور برابری میں لڑنے کو اپنا حق سمجھتی تھی۔ وہ حق جو شادی نے اسے بخشا تھا، تلوکے کی موت نے اس سے چھین لیا تھا۔ ہر چند کہ پنچوں کے سامنے اس نے منگل کے ساتھ چادر تان لی تھی لیکن پہلی رانو کا وجود ختم ہو چکا تھا اور دوسری رانو میں وہ دم خم نہیں تھا کہ (اسی گھر میں) دوسرے شوہر کے سامنے تن کر کھڑی بھی ہو سکے۔ وہ ہر لمحہ خدشات سے دوچار ہے۔ سماج کے رسم و رواج سے نباہ کرنے والی ایک مجبور عورت کے یہ خدشات کتنے فطری

میں یہ ایک اہم نفسیاتی موضوع ہے۔

"جوں جوں دن بیتنے لگے، گاؤں کی عورتیں رانو کو ڈانٹنے لگیں اور وہ سوچنے لگی ــ شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں ... ... وہ ڈرنے لگی، اپنے مستقبل سے، اپنے بچوں کے مستقبل سے، کیوں کہ بیچ بیچ میں منگل الف ہو اٹھتا تھا ــ "ہٹاؤ یہ سب ــ کیا تماشہ بنا رکھا ہے" اور رانو کانپ جاتی، وہ منگل کو کچھ بھی تو نہ کہہ سکتی تھی، اس پر اس کا حق ہی کیا تھا؟ ــ نہیں نہیں، حق تو تھا پنچایت کی موجودگی میں گاؤں کے سب مرد عورتوں کی گواہی میں، اس نے مجھ پر چادر ڈالی تھی ... ... سوچیں تو حق ہے بھی اور نہیں بھی۔ چادر کا کیا ہے؟ ــ اڑھائی تین گز کپڑا ... ... ایسا کہیں تو شادی کے پھیرے بھی کیا ہیں؟ یہ سب ٹھیک ہے، نہیں، کچھ بھی ٹھیک نہیں"

اور امید و بیم کی یہ کیفیت خود رانی کے لئے عجیب ہے ــــ

"... ... تلوکا بھی تو تھا، اس سے وہ اتنی خائف نہ رہا کرتی تھی، جو بھی منہ میں آتا دھڑ سے کہہ ڈالتی، چاہے بعد میں مار ہی کھاتی۔ میں اسے کیوں نہیں کچھ بھی کہہ سکتی؟"

بیدی نے اپنے تمام تر خلوص اور فن کارانہ صلاحیت کے ساتھ عورت کی نفسیات کے اس کمزور پہلو کو اور بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

سلامتی، منگل کی آشنا ہے، ایک رات جب بادل گھر رہتا ہے اور منگل، سلامتی سے ملنے کے لئے گھر سے نکلنا چاہتا ہے اور اپنی کرتی تلاش کرتا ہے تو رانو اسے روکنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے اندر روکنے کی طاقت جیسے سلب ہو گئی ہو ــ کیسے بے زبان ہیں یہ جذبات ــ

"میری وہ کرتی کہاں ہے؟"

رانو سہم گئی ... ... سنسنا گئی

"کہاں جا رہا ہے؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکل آیا

"دیکھتے نہیں بادل گھر رہے ہیں ــ"

"ہوں گے"، منگل نے کہا ــ "تو کون ہے روکنے والی؟"

رانو بے بضاعت سی ہو کر رہ گئی ــ بولی، "میں تو کوئی نہیں ... ... ایسے ہی پوچھا تھا"

یہیں پر بیدی نہایت فن کارانہ طور پر شادی اور دوسرے طریقوں سے قائم ہونے والے رشتے کے فرق کو بھی واضح کر دیتے ہیں۔ عورت شادی کے رشتے کو جتنا مضبوط سمجھتی ہے دوسرے طریقے سے قائم ہوئے رشتے کو اتنا مستحکم نہیں سمجھتی ہے۔

"اگر رانی اڑ جاتی ... ... جیسے تلوکے کے ساتھ اڑ جاتی تھی اور کہتی۔ "میں نہ روکوں گی تو اور کون روکے گا" تو منگل الف ہو جاتا لیکن وہ اپنی پھٹی ہوئی میلی، بوسیدہ سی چادر کے رشتے کو سمجھتی تھی"

پھٹی، میلی اور بوسیدہ سی چادر نے جہاں رانو سے بہت کچھ چھین لیا تھا، وہیں اس چادر کے رشتے نے اسے کچھ دیا بھی تھا۔ چادر کا و ہلکا سا رشتہ ہی مجبور رانو کے لئے حالات کے گھپ اندھیرے میں امید کی آخری کرن تھی، وہ اپنا بہت کچھ تو کھو چکی تھی، لیکن اب جو کچھ بھی بچ رہا تھا، اسے پھر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے وہ حالات کے ساتھ مفاہمت پر اتر آتی ہے۔ منگل جب اپنی کرتی مانگتا ہے اور یہ کہہ دیتا ہے کہ وہ رنڈی کے یہاں جا رہا ہے تو وہی میلی، بوسیدہ چادر مضبوط شامیانہ بن جاتی ہے۔ اور رانو کے اندر نہ معلوم کب سے خاموش عورت اپنا حق مانگنے کے لئے تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ خطرہ جس کے لئے عورتوں نے اسے آگاہ کیا تھا، اب اس کے سامنے تھا۔ اس خطرہ سے وہ ہشیار ہو جاتی ہے اور حالات سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

"منگل ... بات کو ختم کرنے کے انداز میں بولا

"جا رہا ہوں رنڈی کے ہاں"

یہ فقرہ شوہر عموماً اس وقت کہتے ہیں جب وہ واقعی رنڈی کے یہاں جا رہے ہوں اور بیویاں سمجھتی ہیں ان کا میاں کسی غلط جگہ پر نہیں جا رہا ہے ورنہ وہ ایسے کہتا؟ لیکن رانو کو حالات میں ہر لحظہ پیدا ہو جانے والے خطرے نے ایک ایسی سمجھ دے دی تھی جو اس کی دوسری بہنوں کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ یکایک وہ دیوی سے ایک عام، گوشت پوست کی عورت بن گئی ایک دم چالاک اور عیار ... ... حرافہ!"

اور پھر ان الفاظ نے ناول کی نبض پر انگلیاں رکھ دی ہیں

"ــــ کیا کرتی ــــ وہ مجبور تھی اور بے بس۔ آدمی پل پل حالات اور واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ بدلتا ہے ورنہ پرماتما نے اسے اتنا بڑا انسوں کا جال نہ دیا ہوتا۔"

اور پھر نفسیات کا یہ مطالعہ ــــ

کرتی کے مطالبے نے رانو کے شک کو یقین میں بدل دیا وہ تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے بھی نتھنے پھولنے لگے۔ جو منگل کو رانی کے ڈو بیٹے میں دکھائی نہ دیئے۔ ایک بیوی مقابلے کے لئے۔ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک بیوہ کی سطح پر اتر آئی تھی۔"

اس طور پر "ایک چادر میلی سی" کی پوری فضا میں جہاں پنجاب کی سماجی و معاشرتی زندگی سانس لیتی ہے وہیں ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز اور مختلف نفسیاتی پہلوؤں کی گہری عکاسی بھی ہے اور دونوں کے درمیان سے پسماندہ طبقہ کی جو تصویر ابھری ہے وہ بھوک، غربت افلاس واستحصال سے عبارت ہے۔ جس کے سامنے اکثر روٹی کی قیمت بیٹی کی محبت سے زیادہ ہے۔ اس کے حالات اتنے دل دوز ہیں کہ اکثر صبر کا پیمانہ چھلک اٹھتا ہے۔

بیدی نے جہاں، حالات کے جبر کی طرف اشارہ کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ آدمی مصلحت کا اسیر، حالات و ماحول کا قیدی ہے وہیں یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ حالات کے ساتھ جنگ اور مفاہمت میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے۔ گو، اکثر یہ مفاہمت بڑی مشکل، نہایت صبر آزما ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے لفظوں میں ــــ

"..... 'ایک چادر میلی سی' کا حسن تہذیبی تصویر کشی ہی میں مضمر ہے۔ مرکزی خیال تو صرف اتنا ہے کہ انسانی زندگی مفاہمتوں سے لبریز ہے۔ ہر قدم پر ناگوار حقیقتوں اور کبھی دشمن چہروں سے سابقہ تو کبھی ماضی کے ٹوٹے اور بے جوڑ رشتوں سے ـــ اور انسانی زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ حالات جن ناگوار حقیقتوں کی گود میں پھینک دیں انھیں سے سمجھوتہ کرلو، رانو کے لئے یہ سمجھوتہ بہت دل دوز تھا لیکن کہانی کا پس منظر اس کے پیش منظر سے کہیں آگے ہے ..."[٣] ★★

حواشی

۱؎ بیدی نے 'ایک چادر میلی سی' پر اپنا ایک پیش لفظ لکھا تھا جو اسٹار پبلی کیشنز کے پاکٹ ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔
(ملاحظہ ہو ماہنامہ آجکل "نئی دہلی اکتوبر ۱۹۸۴ء)

۲؎ تنقیدی تناظر ـــ ڈاکٹر قمر رئیس صفحہ ۹۸

۳؎ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو ناول ـــ ڈاکٹر محمد حسن نیا دور اگست ۱۹۷۶ء ●●

پنڈت نہرو اور مسلم تاریخ کی ترجمانی ـــ صفحہ ۷ کا بقیہ

پنڈت نہرو اور مسلم تاریخ کی ترجمانی ـــ صفحہ ۷ کا بقیہ

خیالی اور معروضیت کے جن اوصاف سے اپنے ذہنی رویّے کو بنانے میں مدد لی ہوگی، اُن کے واضح اثرات ان کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہرو جانبداری کے الزام سے گھبراتے ہیں اور جہاں تک ہوتا ہے وہ اپنے جوشِ طبیعت کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ مسلم تاریخ کا جائزہ لیتے وقت بھی وہ خود کو ایک غیر متعلق مصنف کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بیشتر مواقع پر کشادہ ذہنی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نازک معاملات کو مفاہمانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ "تلاش ہند" کی تصنیف تک ہندوستان میں فرقہ وارانہ سیاست تشویش ناک صورت حال اختیار کرچکی تھی چنانچہ "تلاش ہند" میں پنڈت نہرو زیادہ محتاط انداز سے قلم اٹھاتے ہیں لیکن یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اس وقت تک ہندوستانی قومیت کے بارے میں اُن کا ایک واضح نقطۂ نظر پیدا ہوگیا تھا اور وہ مسلم اثرات کو اُس طرح علیحدہ کرکے بیان نہیں کرنا چاہتے تھے جیسا کہ "جھلکیاں" میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

بہر حال ان دونوں کتابوں میں پنڈت نہرو نے مسلم تاریخ کی جس طرح ترجمانی کی ہے اُس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پنڈت نہرو نے مذہب کو سیاسی، سماجی، تہذیبی عوامل کی طرح تاریخ پر اثر انداز ہونے والے ایک عنصر کی حیثیت سے سمجھا ہے اور انھوں نے خود کو مذہبی جانبداری سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ انگریز مصنفین ہندستانی تاریخ کو مذہبی بنیادوں پر سمجھنے کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے، پنڈت نہرو نے یہ قابل قدر کوشش کی کہ ہندوستانی تاریخ کو مسلم حکمرانوں اور غیر مسلم رعایا کے معاملات کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے حکمرانوں اور رعایا کے عام معاملات کی روشنی میں سمجھنے پر توجہ دی جائے اور اس طرح اُس تلخی کو پھیلنے سے روکا جائے جو ان معاملات کو مذہبی رنگ دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنڈت نہرو اُن مورخین میں سے ایک ہیں جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کو سائنٹفک، معقول اور غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی طرح ڈالی۔ ●●

ڈاکٹر جعفر عسکری
ممتاز محل، بارود خانہ، گولہ گنج لکھنؤ

بحرِ تخلیق کا شناور جوش ملیح آبادی

عام طور سے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ شعری و نثری ادب میں پیش ہونے والی ہر تحریر تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔ حالانکہ حقیقتِ حال اس سے مختلف ہے۔ تخلیق کا درجہ تو صرف اسی شعری یا نثری فن پارے کو دیا جا سکتا ہے جس میں دردن الفاظ کا تصرف کیا گیا ہو، افکار و تخیلات کی بلند پروازی ہو، گہری معنویت ہو اور عصری شعور کی کارفرمائی ہو۔ مذکورہ خصوصیات کی عدم موجودگی میں کسی شعری یا نثری فن پارے کو تخلیق تصور کرنا درست نہیں کہا جا سکتا۔ تخلیقی ادب وہی فنکار پیش کر سکتے ہیں جو غیر معمولی خلّاقانہ صلاحیت کے حامل ہونے کے ساتھ ہی ایجاد پسند طبیعت نیز اختراعی ذہن و فکر کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر لحہ تغیر پذیر حالات کا عرفان رکھنے والے فنکار ہی کامیاب تخلیقی ادب پیش کر سکتے ہیں۔ سطورِ بالا میں پیش کردہ نظریات کی روشنی میں جب ہم عالمی ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ تمام عظیم تخلیق کار زبردست خلّاقانہ صلاحیتوں کے حامل رہے ہیں۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے قلی قطب شاہ سے لے کر سوداؔ۔ میرؔ۔ غالبؔ۔ انیسؔ۔ سرشارؔ۔ اقبالؔ۔ رسواؔ۔ پریم چند اور جوشؔ تک ایک طویل فہرست ایسے تخلیق کاروں کی ہے جو غیر معمولی خلّاقانہ فکر و ذہن لے کر ادب کے اسٹیج پر نمودار ہوئے تھے۔

یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں جوشؔ جیسی خلّاقانہ ذہن رکھنے والی معدودے چند شخصیتیں ہی دنیائے اردو ادب میں نظر آتی ہیں۔

جوشؔ کی شعری تخلیقات کا مرکز بظاہر ان کی اپنی ذات ہے۔ لیکن حقیقتاً ان میں ان کے اپنے عہد کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جیسا کہ اقتباس بالا میں عرض کیا جا چکا ہے۔ ایک بلند پایہ تخلیق کار کے لیے اختراعی ذہن و فکر نیز ایجاد پسند طبیعت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس روشنی میں جب ہم جوشؔ کی شعری تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جوشؔ فطری طور پر ایسی نادر تشبیہات، اچھوتے خیالات اور غیر مانوس الفاظ تک کو ایسی کامیابی سے پیش کرتے ہیں جس سے ان کے غیر معمولی خلّاقانہ ذہن اور اختراعی اندازِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی ایجاد پسند طبیعت ایسے نادر موضوعات کا انتخاب کرتی ہے جن میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا فنکاری اور مہارت سے مظاہرہ کر سکیں۔ ہر بڑے فنکار کی طرح موضوعات کے انتخاب میں بھی جوشؔ اپنی جدت پسندی اور انفرادیت کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ مثال میں ان کی نظم "کوہستانِ دکن کی عورت" (مطبوعہ نقش ونگار) کے چند مصرعے ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں، جو ان کے غیر معمولی خلّاقانہ ذہن کی غمازی کر رہے ہیں

یہ اُبلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں
واہ کیا کہنا ترا، اے حسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب
ہر سراپا بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تند چشمے، تیوریاں۔ جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

ایک اور مثال ان کی نظم "کیا گل بدنی ہے" سے پیش کی جاسکتی ہے، جس میں الفاظ کے پردے میں جو پیکر تراشی، جولانیٔ فکر، نادر تشبیہات نیز تخیل کی بلند پروازی نظر آتی ہے۔ یہ سب ان کی عظیم خلاقانہ صلاحیتوں کی روشن مثالیں ہیں۔ ثبوت میں دو ہی بند کافی ہوں گے۔ ؎

کاکل میں درخشاں ہے یہ پیشانیٔ رقصاں
یا سایۂ ظلمات میں ہے چشمۂ حیواں
ہاتھوں پہ ہے یہ چہرہ کہ ہے رحل پہ قرآں
اور چہرۂ گل رنگ میں غلطاں و خروشاں
رخشندگیٔ خونِ رگِ یاسمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

عشوے ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے
چھل بل ہے کہ چھاتی کو زمیں کوٹ رہی ہے
انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے
مکھڑا ہے کہ پربت پہ کرن پھوٹ رہی ہے
قامت ہے کہ بَرماہی سرو چمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

جوشؔ کے کل شعری سرمایہ سے ایسی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جن میں ان کے اندر کا تخلیق کار اپنی پوری جولانیٔ طبع اور تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ نمایاں ہوا ہے۔ ان کی خلاقانہ صلاحیتوں اور فنکارانہ مہارت کا حقیقی مظہر ان کی رباعیات کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں کوئی دوسرا رباعی گو شاعر جوشؔ کے مقابلے میں نہیں پیش کیا جاسکتا ہے۔ جوشؔ اپنی رباعیات کے آپ ہی موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ذیل میں صرف ایک رباعی کی مثال کافی ہوگی۔

عفریت، خبیث، دیو، اژدر، شیطاں
درویش، اقطاب، امام، مرسلِ یزداں
گیتی، گردوں، بہشت، دوزخ، اعراف
یہ سب ہیں مرے دل میں خروشاں و تپاں

مذکورہ رباعی صرف الفاظ کا مرقع نہیں، بلکہ بے مثل تخلیقی فن پارہ ہے۔

شاعری کے علاوہ نثر میں بھی جوشؔ نے اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کے وافر ثبوت فراہم کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کے مقابلے میں ان کی نثری نگارشات میں فنکاری تو ضرور ہے لیکن الفاظ کے استعمال پر وہ قدرت نیز زبان و بیان میں وہ ندرت اور انفرادیت نظر نہیں آتی، جسے جوشؔ کی نمایاں خصوصیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جوشؔ نے شاعری میں تخلیق کا جو بلند معیار قائم کیا، اسے وہ نثر میں قائم نہ رکھ سکے۔ پھر بھی ان کے بعض مقالات، شخصی خاکے، مکاتیب، اداریے اور خود نوشت سوانح عمری "یادوں کی برات" ان کے اہم نثری اور تخلیقی کارنامے ہیں جن میں سے اعلیٰ تخلیق کی مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مقامات پر مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی قارئین کے ذہن کو بوجھل بھی بنا دیتی ہے جوشؔ کی اختراعی فکر اور ایجاد پسند طبیعت، ایسا محسوس ہوتا ہے، انھیں ہر لمحہ اور ہر مقام پر اس بات کے لئے آمادہ کرتی ہے کہ ان کی تخلیقی انفرادیت نمایاں رہے۔ نیز دیگر تخلیق کاروں کے مقابلے میں، شاعری و نثر دونوں میں انھیں تقدم حاصل رہے۔ اس دُھن میں بعض مقامات پر ان کی خلاقانہ صلاحیتیں مکمل طور پر کامیابی کے ساتھ اجاگر نہیں ہوسکیں، کیوں کہ انھوں نے تمام تر قوت الفاظ کے پرشکوہ استعمال اور زبان کی تراش خراش پر صرف کردی ہے۔ یہ کیفیت ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں میں یکساں طور پر موجود ہے۔ بہرحال جہاں ان کی تخلیقات ان عیوب سے پاک ہیں، ان میں روانی، فنکاری، اور اعلیٰ تخلیقی خصوصیات بہ درجۂ اتم موجود ہوتی ہیں۔ ان کے مضمون " اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت" میں سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔ جو بہترین تخلیقی فن پارہ قرار دیا جاسکتا ہے،

" زمانے کے ایوان اور تاریخ کی محراب میں اب تک شکست خوردہ آوازیں گونج رہی ہیں، ان غریب "مصلحین" کی جو نورانی چہروں محیر العقول

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

غزلیں

سویتا کرن

۹۳-۲-۱۱
وسلے پلی، حیدر آباد

نہ جانے بدلے گا کب یہ روایتوں کا چلن
چتا کی آگ میں جلتی ہے آج بھی دُلہن

زمیں کا قرض چکانا ہے، منتظر رہیے
ہوائیں تیز ہیں اور جل رہی ہے شمعِ وطن

پتہ نہیں کہاں اپنا وجود کھو بیٹھوں
ہمیشہ ساتھ ہی رکھتی ہوں اپنے خاکِ وطن

ہے کون پردہ کے پیچھے نظر نہیں آتا
یہ کیسی رُت ہے کہ پھولوں کا جل رہا ہے بدن

بھٹک رہی ہے سہارا تلاش کرتے ہوئے
معاشرے میں اکیلی ہے آج بھی جوگن

وہ ایک صبح کہ جس کا ہے انتظار ہمیں
کبھی تو لائے گی وہ ساتھ نور کا درپن

کرن ہوں جھانسی کی رانی کی میں بھی وارث ہوں
کروں گی جان میں اپنی خوشی سے نذرِ وطن

کمال جائسی

کرنیل گنج ۔ کان پور

بہتے ہوئے پانی پہ جو نقش بنائے ہیں
الفاظ کے شیشے پہ اُمید کے سائے ہیں

یہ رات گئے کیسا جھُرمٹ ہے حسینوں کا
خوابوں کے جزیرے میں تارے اتر آئے ہیں

چلتا ہے جنوں پر کب جادوِ غمِ دوراں کا
ہم لوگ غرور اس کا مٹی میں ملائے ہیں

مینا نے ان آنکھوں کے مہکے ہیں تصور میں
گزری ہوئی راتوں کو ہم ڈھونڈ کے لائے ہیں

ممکن ہے کمال آئے وہ شوخ اسی جانب
ہم فکر کی راہوں میں آئینے سجائے ہیں

پروین مسعودی

نزد آیورویدک اسپتال
تلسی داس مارگ۔ لکھنؤ

جو ہم سے ثبوتِ وفا چاہتے ہیں
وہ خود کیا ہیں ہم پوچھنا چاہتے ہیں

وہی زندہ رہتے ہیں بعدِ فنا بھی
جو دُنیا میں سب کا بھلا چاہتے ہیں

نظر آئے جس میں دلوں کی کدورت
ہم ایسا کوئی آئینہ چاہتے ہیں

مرا دل تو ہے ایک نازک سا شیشہ
اسے آپ کیوں توڑنا چاہتے ہیں

سبھی پھول مہکیں سبھی مُسکرائیں
چمن کی ہم ایسی فضا چاہتے ہیں

تجھے حالِ پروین کی سب خبر ہے
تجھے کیا بتائیں کہ کیا چاہتے ہیں

طفیل احمد انصاری
مفتی محلہ - جون پور - ۲۲۲۰۰۱

اختر واسطی جونپوری

جون پور کے قصیدہ گو شعرا میں اختر واسطی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ قصیدہ نگاری کا فروغ دراصل درباروں سے وابستہ تھا لیکن امراء اور نوابین وغیرہ کے زوال کے بعد یہ صنف شاعری انحطاط کا شکار ہوتی چلی گئی رفتہ رفتہ قصیدہ گوئی کا زور بھی کم ہوتا گیا۔ لیکن حصول ثواب کے لئے حمد و نعت اور منقبت صحابہ کرامؓ اور بزرگان دین میں قصائد لکھنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اختر واسطی نے خصوصی طور سے ائمہ کرام کی شان میں قصائد لکھے ہیں جو زبان و بیان کی خوبیوں اور لطافتوں سے آراستہ ہیں۔ علی جواد زیدی نے "قصیدہ نگاران اتر پردیش" میں جونپور کے چند شعراء کے نام تحریر فرمائے ہیں جن میں اختر جونپوری نمایاں ہیں۔ آپ کی قصیدہ نگاری کے متعلق علی جواد زیدی صاحب یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"موجودہ دور کے منقبتی قصائد لکھنے والوں میں (اختر جونپوری) زیادہ فعال تھے۔ قصائد کی تشبیبیں اکثر موجودہ سیاسی اور سماجی حالات و کوائف پر مشتمل ہیں۔ ان میں انھوں نے بیشتر اپنے سیاسی معتقدات کا اظہار کیا ہے۔ ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب میں حالیؔ کا آہنگ نظر آتا ہے۔

پہلے دل میں تو کرو قوتِ ایماں پیدا
پھر تو ہر گام پہ ہے گلشن رضواں پیدا"[1]

اختر جونپوری کے قصائد کا مجموعہ "ضیائے اختر" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے طبع ہو کر شائع ہوا۔ جسے سید اصغر مہدی واسطی نے مرتب کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں اختر کی قصیدہ نگاری سے قطع نظر ان کی غزلیات کا تعارف پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ غیر مطبوعہ غزلیات مجھے ان کے نبیرہ اسلم انوار نقوی صاحب کے توسط سے دستیاب ہوتی ہیں۔ کاش غزلیات کا یہ مجموعہ بھی زیور طبع سے آراستہ ہو جاتا تو کلاسیکی اور روایتی شاعری سے شغف رکھنے والے ارباب ذوق کے تفنن طبع کا سامان فراہم ہو جاتا۔

سید علی اختر واسطی ۸ دسمبر ۱۸۹۲ء میں جونپور کے ایک ممتاز علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پدر سید آغا مہدی ابن سید لد حسین رئیس قصبہ منڈیاہوں جونپور تھے۔ علوم مشرقیہ کی تعلیم آپ نے مدرسہ ناصریہ جونپور میں حاصل کی جہاں مولوی منصب علی جونپوری اور مولوی عنایت حسین جونپوری سے ادب و منطق میں آپ نے درک حاصل کیا۔ منصب جونپوری حضرت امیر مینائی کے تلامذہ میں تھے۔ آپ کا یہ شعر زبان زد ہے ؎

یہ محفل میں جل مرنے کی خو ٹھیک نہیں پروانے میں
جب رازِ محبت فاش ہوا کیا لطف رہا مر جانے میں

۱۹۱۵ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ مزید تعلیم کے لئے الہ آباد گئے جہاں ایونگ کرسچین کالج سے ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۲ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جونپور میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

اختر جونپوری کو شعر و سخن کا بچپن سے ہی ذوق تھا گویا شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ آپ کے گھر کی فضا بھی شاعرانہ تھی۔ خاندان کے اکثر بزرگ آسمان شعر و سخن کے درخشندہ ستارے تھے۔ گھر کے باہر کی فضا

بھی نغمہ وشعر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسے شعری ماحول نے انھیں شاعری کی جانب مزید رغبت پیدا کی اور یوں آپ ۱۹۱۲ء سے باقاعدہ جہانِ شاعری میں داخل ہوگئے۔ ابتدا میں آپ نے مولوی نورالدین زیدی سے شاعری میں شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ زیدی صاحب اردو اور فارسی کے مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ "تجلیٔ نور" جو مختلف جلدوں میں ہے آپ کی بہت ہی وقیع اور مشہور تصنیف ہے۔ زیدی صاحب کے انتقال کے بعد اختر نے اپنے عمِ محترم سید حسن علی وقار جونپوری سے علم عروض میں مہارت حاصل کی۔

اس دور کا جونپور تہذیب و شرافت، علم و ادب اور شعر و شاعری کی قدیم روایت کا نہایت قابلِ قدر خطہ تھا۔ آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے جس میں بیرونجات کے شعرا بھی شریکِ بزم ہوتے اور دادِ تحسین حاصل کرتے۔ گویا پوری فضا نغمہ وشعر سے عبارت تھی جس سے جونپور رشکِ لکھنؤ بن گیا تھا پروفیسر رشید احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں۔

"میں نے جونپور میں اس کثرت سے شاعر دیکھے تھے کہ میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ ہر اردو داں شاعر ہوتا ہے اور جو نہیں ہوتا ہے وہ مجھ جیسا گیا گذرا ہوتا ہے۔" ؎

شاید اسی تناظر میں حضرت حفیظ جونپوری (متوفی ۱۹۱۸ء) نے بجا طور سے یہ دعویٰ کیا تھا ؎

اس شہر کو حفیظ کیا ہم نے لکھنؤ
ٹکسال چڑھ گئی ہے زباں جون پور کی

یہ تھا وہ شعری ماحول جسمیں اختر جونپوری کی شاعری نے نشو ونما پائی۔

اختر جونپوری قدیم رنگِ سخن کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے رنگینی شوخی، قافیہ پیمائی اور معاملاتِ حسن وعشق کے بیان پر ہی اپنی شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ گویا تغزل ہی ان کا سرمایۂ شاعری ہے۔ صاف اور دلکش اندازِ بیان سے اشعار میں لطف پیدا ہوگیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے

قدم قدم پہ کئے میں نے شوق کے سجدے زمینِ کوچۂ جاناں کا احترام کیا
ہماری خاک کہاں اور کہاں درِ جاناں مقامِ شکر ہے بادِ صبا نے کام کیا

پوچھا جو میں نے شکوۂ غم حشر میں کروں کس ناز سے کہا کہ تمہیں اختیار ہے

آج جی کھول کے رندوں کو پلادے ساقی دیر سے ابرِ کرم گھیرے ہے میخانے کو

شبِ فراق الٰہی یہ ماجرا کیا ہے سحر کا وقت ہے لیکن سحر نہیں ہوتی

اختر واسطی کو زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ شعر بھی بہت ڈوب کر کہتے تھے۔ غزل کے روایتی مضامین کو نہایت سلیقے اور فنکارانہ انداز میں پیش کرتے تھے۔ ان کی بعض غزلوں میں سوز وگداز کا عنصر شامل ہے۔ اشعار میں سلاست و روانی ہے۔ دور از کار تشبیہوں سے کلام بالکل پاک ہے اس لئے اشعار بوجھل نہیں ہونے پاتے۔ صفائی اور سادگی نے ان کے اشعار میں تاثیر کی شان بھی نمایاں کردی ہے ؎

بچا لیا تری رحمت نے حشر میں ورنہ
میرے گناہ کا یارب کوئی حساب نہ تھا

صدائے نغمۂ بلبل چمن سے آتے ہی بہار آگئی کیا اب گئی خزاں صیاد

ایک جوشِ محبت ہوتا ہے بے ساختہ سر جھک جاتا ہے
جس جا ہو تمہارا نقشِ قدم اس خاک پہ سجدہ کیوں نہ کریں

جو کبھی پوری نہ ہو ایسی تمنا کیجئے اور پھر محرومیٔ قسمت کا شکوہ کیجئے
اے دلِ مضطر وہ وعدے پر نہ آئیں گے کبھی کیوں لگا کر آسرا خونِ تمنا کیجئے

اس ضمن میں مشہور صوفی شاعر حضرت آسی سکندر پوری کا ایک خوبصورت شعر ملاحظہ کریں ؎

راہ تکتے تکتے آسی چل بسا
کیوں کسی سے آپ وعدہ کیجئے

اساتذہ میں حضرت نوح ناروی الفاظ اور جملوں کو دہرا کر شعر میں خاص لطف پیدا کر دیتے تھے۔ اختر جونپوری نے بھی الفاظ کی تکرار اور اس کی الٹ پھیر سے کام لیا ہے لیکن اس سے اشعار میں وہ کوئی خاص لطف پیدا نہ کر سکے۔ اختر کی بیشتر غزلوں میں معنی آفرینی اور تنوع کا بھی فقدان ہے۔ انھوں نے اکثر ایک ہی مضمون کو بار بار دہرایا ہے ؎

فریبِ عشق سے دل کو بچائیں گے کب تک بچائے جاتے ہیں جب تک بچائے جاتے ہیں

آپ آئے کہاں واعظ یہ بزم ہے رندانہ   میخواروں کا مجمع ہے میخانہ ہے میخانہ

ہو گیا خونِ تمنا بھی مرے خون کیساتھ   رو رہا ہوں میں تمنا کو تمنا مجھکو

کس دل سے شکوہ داورِ محشر سے کروں میں   اپنے ستم پہ آج وہ خود شرمسار ہے

پوچھا جو میں نے شکوۂ غم حشر میں کروں   کس ناز سے کہا کہ تمہیں اختیار ہے

سامنے جب داورِ محشر کے میں حاضر ہوا   دیر تک کس ناز سے دیکھا کیا قاتل مجھے

خدائے سخن میر تقی میر کا یہ ایک مشہور شعر ہے ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی   اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

فی الحقیقت اس بار امانت کو اٹھانے کا شرف روزِ ازل سے ہی حضرت انسان کا مقدر بن چکا تھا۔ اختر جونپوری نے اسی مفہوم کو اپنے دو شعروں میں یوں پیش کیا ہے ؎

بارِ الفت کا سوا میرے کسی سے نہ اٹھا   جو فرشتوں نے نہ پایا وہ ملا دل مجھکو

جو سینے میں دل ہے تو بارِ محبت   اٹھے یا نہ اٹھے اٹھانا پڑے گا

حفیظ جونپوری نے بھی اسی مضمون کو عرفان ذات کے ساتھ بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ؎

انسان کی یہ تھی تاب و تواں، جو بارِ محبت اٹھا سکا
اک یہ بھی ہے احسان ترا، کیا اس سے تو نے کام لیا

اس مضمون کو اکثر شعراء نے نظم کیا ہے لیکن میر صاحب کا شعر حسن بیان، سادگی اور روانی میں سب سے یگانہ اور منفرد ہے۔ یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میر صاحب کے اس پُر اثر شعر کا مضمون فارسی کے اس شعر سے ماخذ ہے ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اختر جونپوری کی شاعری میں معنی آفرینی اور جدت طرازی کا فقدان ہے۔ وہ قدیم طرزِ سخن کی روش پر ہی گامزن رہے۔ یوں تو انھوں نے مرثیہ اور رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن قصیدہ اور غزل ان کی محبوب اصناف تھیں۔ وہ نہایت اعلیٰ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ اپنی شاعرانہ صلاحیت کے اعتراف کے طور پر اکثر محفلوں میں یہ شعر ضرور پڑھتے تھے ؎

نغمہ پردازِ عنادل کو چمن میں دیکھو   مجھکو آئینۂ انوارِ سخن میں دیکھو

پیشۂ وکالت کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اختر جونپور اور بیرونجات کی مخصوص ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ مشن اسکول جونپور میں ایک بزم مشاعرہ کی طرح تھی ع

"آنکھوں سے گرے آنسو اور ختم تھا افسانہ"

اختر نے اس زمین میں بہت ہی کامیاب غزل پڑھی تھی جس پر انھیں دادِ تحسین سے بہت نوازا گیا تھا۔ اس غزل کے دو شعر پیش ہیں ؎

تھی دیر چھلکنے کی لبریز تھا پیمانہ   آنکھوں سے گرے آنسو اور ختم تھا افسانہ

تاخیر نہیں ٹھہرو یہ آخری ہچکی ہے   بیمار محبت کا اب ختم ہے افسانہ

لیکن وقار جونپوری کی تضمین کا شعر حاصل محفل ثابت ہوا جس کی دھوم پورے شہر میں مچ گئی ؎

اک آخری ہچکی لی بیمار محبت نے
آنکھوں سے گرے آنسو اور ختم تھا افسانہ

اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ سید امتیاز حسین ترمذی عظیم آبادی نے "ضیائے اختر" کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے۔ "دورانِ تعلیم ۱۹۲۱ء میں میور کالج الہ آباد میں ایک عظیم الشان طرحی محفل میں اختر نے ایک خوبصورت غزل پڑھی تھی جس پر انھیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا تھا۔"[۳] مصنف 'تاریخ شیراز ہند جونپور' اختر کے فکر و فن پر اس طرح اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔

"نہایت زود گو اور کہنہ مشق شاعر ہیں اور مذاقِ سخن اعلیٰ درجہ کا ہے"[۴]

وکالت کے پیشے کی مصروفیت کے باوجود اختر شعر و ادب کے فروغ کے خواہاں رہا کرتے تھے۔ اس غرض سے انھوں نے ایک ادبی انجمن کی تشکیل کی تھی جس کا نام "انجمن اصلاح سخن" تھا۔ اس انجمن کے ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے جس میں ادبی مقالے بھی پڑھے جاتے تھے۔

اختر جونپوری نے اپنی تمام عمر ادب و شاعری کی خدمت میں گذار دی۔ اردو کے بے لوث اور مخلص شاعر کی زندگی کا سفر ۱۹۸۰ء میں تمام ہوا ؎

زندگی ختم ہو گئی اختر   خطِ تقدیر کے مٹانے میں

حواشی: ۱؎ قصیدہ نگاران اتر پردیش ص۴۹ ۲؎ آشفتہ بیانی میری ص۵ ۳؎ دیباچہ ضیائے اختر ص۴
۴؎ تاریخ شیراز ہند جونپور ص۸۲۱

شاداب ذکی بدایونی
ذکی منزل۔ سوتھا۔ بدایوں (یوپی)

جولاںؔ بدایونی
آتشؔ کا ایک گمنام شاگرد

دبستان لکھنؤ کا ذکر آتے ہی جن شعراء کا نام سب سے پہلے زبان پر آتا ہے ان میں ناسخؔ اور آتشؔ سرِفہرست ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے الفاظ میں :

" جراٗتؔ ، انشاءؔ ، مصحفیؔ ، اور رنگینؔ کی شاعری کی ابتداء دہلی سے ہوئی ، مگر ان سب کا عروج لکھنؤ میں ہی ہوا اور انھیں کے اثر سے لکھنؤ میں شاعری کا ایک دبستان ناسخؔ اور آتشؔ سے شروع ہوا[1] "

اگر دونوں اساتذہ کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناسخؔ کے یہاں لکھنؤ اسکول کی خاص خوبی یعنی خارجیت کا عنصر غالب ہے ، مگر آتشؔ کی شاعری اس فضا سے بڑی حد تک پاک ہے۔ انھوں نے سطحی احساسات اور بے روح جذبات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے یہاں داخلی جذبات کی گرمی اور توانائی ہے۔ اور ان کی شاعری میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کی دھوپ چھاؤں ملتی ہے۔

آتشؔ کے تلامذہ نے استاد کے رنگ کو نہ صرف اپنے تک محدود رکھا بلکہ بقول شاہ عبدالسلام ـــ لکھنؤ کا پورا شعری مزاج ہی تلامذۂ آتشؔ کے رنگ میں رنگ گیا۔[2] آتشؔ کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان میں سے جنھوں نے خاص شہرت حاصل کی انمیں رندؔ۔ صباؔ۔ نسیمؔ۔ کیفؔ۔ آغا حجوؔ شرفؔ۔ اور شوقؔ وغیرہ اہم ہیں۔

"دبستانِ آتشؔ" کے پیش لفظ میں ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے تلامذۂ آتشؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

" میرے محدود علم کے مطابق تلامذۂ آتشؔ کی یہ ایک مکمل فہرست ہے اس کی تکمیل کے لئے جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل میں گئے بغیر اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ تمام اہم تذکروں کے علاوہ شعراء کے دواوین اور تاریخ کی کتابوں سے بھی مواد حاصل کیا گیا ہے[3] "

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے " دبستانِ آتشؔ " میں ۷۰ تلامذہ کا ذکرہ کیا ہے۔ بلاشبہ شاہ صاحب نے بڑی تحقیق سے یہ فہرست مرتب کی ہے ، مگر یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ شعراء کے اب تک شائع تذکروں میں سے کسی کو بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ تحقیق کے دروازے بند نہیں ہوتے۔ اور زمانے کی گرد میں چھپے ہوئے قادرالکلام شعراء کے نام و کام سے ہماری فہرست میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اس مضمون میں جس شاعر کا تذکرہ کیا جا رہا ہے وہ بھی تلامذۂ آتشؔ میں ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ اس گمنام شاعر کا نام الف خاں اور تخلص جولاںؔ تھا۔ جولاںؔ کا ذکر تذکرۂ گلستانِ سخن (از مرزا قادربخش صابرؔ)، شمیمِ سخن (از مولوی عبدالحئی صفاؔ بدایونی) خمخانہ جاوید جلد دوم (از لالہ سری رام) تجلیاتِ سخن[4] (مولانا نظامی بدایونی)

میں ملتا ہے۔ ان تمام کتابوں کے نام ڈاکٹر عبدالسلام نے کتابیات میں دیئے ہیں۔ مگر ان کی پہنچ جولاںؔ تک نہ ہو سکی۔

یہ ایک قابلِ افسوس بات ہے کہ پاکستان سے شائع تذکرہ شعرائے بدایوں "(۱۹۸۷ء)" میں شہیدؔ بدایونی نے بھی جولاںؔ کا ذکر کیا ہے۔

جولاںؔ سرزمینِ بدایوں کے فرزند تھے مگر مؤلف "تذکرۂ گلستانِ سخن" نے انھیں بریلوی لکھا ہے۔ وہ ان کے حالات میں رقمطراز ہیں:

"ہر چند حسب و نسب اور وطن کا حال اوس بزرگ وار سے استفسار کیا گیا، اس سب کے جواب میں یہ شعر اپنا پڑھا ؎

کیا بتائیں کہ کہاں ہے مسکن
کوئے قاتل میں رہا کرتے ہیں

"لیکن خارج سے دریافت ہوا کہ رؤسائے بریلی سے ہے اوّل الف خاں نام رکھتا تھا بعد ترک و تجرید کے الف شاہ کے ساتھ مشہور ہو گیا۔[5]"

یہ غلط ہے کہ جولاںؔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اکثر بریلی رہتے تھے[6] بدایوں میں محلہ الف خاں سرائے انھیں کا آباد کیا ہوا ہے۔ نہایت درویش صفت، وارستہ مزاج آزاد منش تھے۔ جب عالم فقر اختیار کیا سیاحی میں رہنے لگے۔ اور پھر پھرا کر آگرہ ضرور آتے تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی نامدار خاں تھا۔[7]

خمخانۂ جاوید، تجلیاتِ سخن، شمیم سخن اور تذکرہ شعرائے بدایوں میں انھیں آتشؔ کا شاگرد تسلیم کیا گیا ہے۔ لالہ سری رام کے مطابق ۱۲۶۴ھ میں ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔ اور آگرہ میں وفات پائی۔

جولاںؔ کے تذکرہ گلستانِ سخن میں ۶ شعر، خمخانہ جاوید میں ۱۰ شعر، تجلیاتِ سخن میں ۲ شعر اور تذکرہ شعرائے بدایوں میں ۹ شعر ملتے ہیں۔ کلام میں مضمون کی بلندی اور شاعرانہ تخیل کی تازگی کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان سادہ و سلیس ہے۔ خاندانی روایت کے مطابق ان کے یہاں روزمرّہ اور محاورات کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے ملتا ہے۔ مختلف تذکروں سے جو کلام دستیاب ہو سکا نمونۃً پیش ہے۔

غزل

ترکِ الفت میں بھی منہ تجھ سے نہ موڑا میں نے
آنا جانا ترے کوچے کا نہ چھوڑا میں نے

آپ نے عہد وفا باندھ کے توڑا سو بار
اس پہ بھی رشتۂ الفت کو نہ توڑا میں نے

خاک سے واں کی ہوا چشمۂ زمزم پیدا
جس جگہ دامنِ تر اپنا نچوڑا میں نے

توسنِ عمر رواں کا مری حافظ ہے خدا
لجۂ عشق میں ڈالا ہے یہ گھوڑا میں نے

سیکڑوں رنج اٹھائے ہیں بتوں کے جولاںؔ
عشق کے نام سے اب کان مروڑا میں نے

متفرق اشعار

ہم ہیں وہ صید وفا کیش کہ خوں روتے ہیں
ٹوٹ جاتا ہے تڑپنے سے اگر دم اپنا

کیا بتائیں کہ کہاں ہے مسکن
کوئے قاتل میں رہا کرتے ہیں

اٹھایا ہے گلی سے اس پری رو کی اگر مجھکو
تو لے چل وحشتِ دل اب جدھر چاہے ادھر مجھکو

معشوق پر بھی ہوتی ہے تاثیر چاہ کی
چٹکی کلی تو بلبل بے دل نے آہ لی

برنگ گل جو کشتوں کا ترے ہر زخم خنداں ہے
ترا کوچہ ہے اے سفاکِ عالم یا گلستاں ہے

★

افسانہ

فاطمہ حسن
معرفت شری امیر حسن
کستور با گاندھی مارگ۔ الہ آباد

فضول سامان

کڑاکے کی سردی اور اس میں دو دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی خود اپنے ہاتھ پیر سیدھے نہیں ہو رہے تھے پھر بھلا سامان کھولنے اور لگانے کو میری مدد کے لئے آئے آدمیوں کو میں کیا کہتی۔ چند دن پہلے تبادلے پر ہم اس نئے شہر اور نئے مکان میں آئے تھے ہمارے آنے کے اگلے روز ہی سے آسمان ابر آلود تھا اور آج دوپہر سے یونہی مسلسل برس رہا تھا۔ مجھے عجلت تھی کہ سارا سامان کھول کر ایک طرف سے سارے گھر میں ترتیب سے لگا دوں مگر سردی اور پھر بارش کی وجہ سے یہ کام آسان بھی نہیں تھا میری طبیعت جھنجھلا اٹھی۔

"نجانے یہ روز روز تبادلے کیوں ہوتے ہیں۔ یوں جلدی جلدی ایک گھر اجاڑنے اور پھر نئے سرے سے دوسرا گھر سنوارنے میں کتنی زحمت اور مصیبت ہوتی ہے یہ کوئی نہیں سمجھتا" میں اپنے آپ ہی بڑبڑاتی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتی اور سامان لگاتی رہی۔

ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی میں سارا سامان سمیٹنے اور باندھنے میں بری طرح تھک چکی تھی اور اب پھر وہی دردسر میرے لئے موجود تھا۔ خانہ بدوشوں کی طرح سامان اٹھائے اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں اب وہ پہلے جیسا لطف، ایک نئے پن کا مزہ اور نئی جگہ دیکھنے کا شوق بھی نہیں رہ گیا تھا بلکہ خاصی گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ ایک طرف تو بڑھتی ہوئی گرہستی جس میں پرانا نیا ہر قسم کا سامان اور دوسری طرف بچوں کے ہوسٹلوں میں جا کر رہنے سے اس سلسلے میں ان سے ملنے والی مدد کا دھیرے دھیرے ختم ہو جانا۔ اس لئے اب سامان کھولنے اور باندھنے کے دونوں موقعے میرے لئے بڑے صبر آزما ہوتے۔

اس بار میں نے طے کر لیا تھا کہ فضول سامان اور غیر ضروری چیزیں الگ کر کے نکال دوں گی۔ صرف اشد ضروری سامان ہی رکھوں گی تاکہ بوجھ زیادہ نہ ہو اس لئے سامان کھولنا شروع کرتے ہی میں ذہنی طور سے اپنے سامان کی ایک ایک چیز کے ضروری اور غیر ضروری ہونے کے بارے میں سوچنے لگتی لیکن طے کچھ بھی نہ کر پاتی۔ آخر میں پھر سے سوچنے اور الگ کرنے کے خیال سے اسکو کسی دوسری جگہ رکھ دیتی تھی۔ یوں کچھ زیادہ ہی دقت لگ رہا تھا۔ ابھی میں باورچی خانے اور پھر اپنے سونے کے کمرے میں تھوڑی بہت ترتیب دیکر اس میں استعمال کی چیزیں لگا پائی تھی۔ لیکن آج تو میں بس اِدھر اُدھر پڑا سامان اور بکسوں و پیٹیوں وغیرہ کو اندر کے دونوں کمروں میں روشن دان اور کھڑکیوں سے ذرا دور الگ الگ رکھوا دینے میں لگی رہی۔ تاکہ وہ برستے پانی کی بوچھار سے محفوظ رہیں۔ اور میں انھیں بغیر کسی کی مدد کے بآسانی کھول کر ضرورت کا سامان نکال سکوں۔

میں نے پھر ایک بار سامان سے بھرے بکسوں اور پیٹیوں پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا اس میں سے غیر ضروری سامان بھلا کیا

ہو سکتا ہے۔ میری نگاہ تصویروں سے بھرے ہوئے پاس پاس رکھے لکڑی کے دونوں بکسوں پر جم گئی۔ یقیناً یہ تصویریں فریم میں جڑی ہوئی خاصی جگہ گھیرتی ہیں اور پھر دیواروں میں انھیں لگانا خاصا وقت لینے اور تھکا دینے والا کام ہوتا ہے۔ ان کے فریم اور شیشوں کی ٹوٹ پھوٹ الگ رہی۔ ان تصویروں کا وزن بھی بہت ہو جاتا ہے یقیناً اس میں کچھ کمی کرنی ہوگی۔ مگر فوراً ہی خیال آیا۔ یہ سب تو ہمارے بچوں کی اُن کی پیدائش کے دن سے آج تک کی مختلف موقعوں اور وقت پر میرے شوہر کی خود کھینچی ہوئی ہیں۔ فوٹو گرافی ان کی ہابی ہے خاص طور پر میری اور بچوں کی اچانک تصویریں اتار لینا انھیں بہت اچھا لگتا ہے اور اس لیے عرصے میں نجانے کتنی تصویریں وہ اتار چکے ہیں ہر بچے کی پیدائش سے لیکر اب تک کی تصویروں کے الگ الگ بڑے موٹے موٹے البم تھے اور بہت سی تصویریں جو چھوٹے بڑے فریموں میں جڑی دیواروں، مینٹل پیس اور ریک وغیرہ پر سجی گھر کے ہر کمرے کی زینت بڑھایا کرتیں، وہ الگ رہیں — دوسرے بکس میں بھری آدی واسیوں کی تصویریں تھیں۔ جن سے میرے شوہر کو بڑی گہری دلچسپی ہے کیونکہ آدی واسی ان کے مطالعے اور ریسرچ کا بڑا اہم موضوع بھی ہیں۔ میں سوچ میں پڑ گئی کیوں نہ یہ سارے فریم کھول دوں اور ان تصویروں کو البم میں لگا دوں تاکہ تصویریں بھی محفوظ رہیں اور میں ساری طوالت اور مصیبت سے بھی بچ جاؤں۔ مجھے فی الحال یہی خیال مناسب لگا۔

دن کے تین بج رہے تھے بارش کچھ تھم گئی تھی۔ میری مدد کے لئے آئے ہوئے آدمی اپنے گھروں کو نکل جانا چاہتے تھے انھیں ڈر تھا کہ کہیں پھر بارش تیز ہو گئی تو جاتے ہوئے وہ بھیگ جائیں گے۔ میں نے انھیں چھوڑ دیا۔ اسی کمرے میں میں پھر واپس آگئی جہاں بند پڑی کھڑکیوں اور دروازوں کے اندر سارے سامان کے بکس اور پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مگر اب بغیر مدد کے کچھ اور کرنا میرے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ لیکن میرے شوہر کے آفس سے لوٹنے میں بہت وقت تھا اس دوران مجھے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں نے تصویروں والا لکڑی کا بکس کھولا اور اس میں سے ایک ایک کر کے تصویریں نکالنے لگی تھی۔ بچوں کی تصویریں دیکھنے اور نکالنے میں وہ تصویر میرے سامنے آگئی جس میں حمید ہمارے جڑواں بیٹوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی دھاری دار قمیص اور آنکھوں پر چڑھے سیاہ چشمے اور پیچھے کے پردے پر بنے شیروں اور جنگل کے منظر کو دیکھتے ہی مجھے ہنسی آگئی — اس وقت ہم لوگ فیض آباد میں تھے جب حمید نامی ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا بچوں کے کام کیلئے میں نے ملازم رکھا تھا۔ دو ڈھائی سال بعد وہ اچانک لاپتہ بھی ہو گیا تھا۔

میرے شوہر کے تصویریں کھینچنے کے شوق سے متاثر ہو کر وہ لڑکا حمید بھی سڑکوں کے کنارے لگائے رنگین پردوں کے سامنے اونچے کیمرے والے فوٹو گرافروں سے اپنے ساتھ ہمارے بچوں کی بہت سی تصویریں کھنچوا تا رہا اور انھیں لکڑی کے رنگین فریموں میں جڑوا کر لے آتا تھا — میرے شوہر ہر بار اسے کچھ روپئے دیتے اور بچوں کے ساتھ اس کی بھی تصویریں لیتے۔ اس وقت ایسی کئی تصویریں میرے سامنے موجود تھیں جس میں میاں حمید تھے اور پردے کے مختلف منظر اور اس میں کھڑے یا بیٹھے ہمارے بچے۔ جنھیں دیکھ کر میں اکیلی بیٹھی بار بار ہنس پڑتی۔ میں نے ان سب کو الگ الگ کر کے اردگرد کے بکسوں پر ڈال دیا اور پھر ایسی ہی بے تکی اور بھی تصویریں چھانٹنے لگی۔ جنھیں یا تو میں ہمیشہ کی طرح کل پھر واپس بکس میں ڈال دینے والی تھی یا پھر ان کو فریم سے الگ کر کے کسی البم میں لگا دینے کا میرا ارادہ تھا اس سے یقیناً کچھ فضول سامان کم ہو جاتا۔

میرے شوہر آفس سے آچکے تھے۔ مجھے پکارتے ہوئے وہ اسی کمرے میں آگئے اور بکسوں پر ادھر اُدھر ذرا دیر پہلے میری ڈالی ہوئی تصویریں اٹھا کر دیکھتے ہوئے وہ کبھی حمید کے اسٹائل اور پوز پر اور کبھی پس منظر پر زوروں سے ہنسنے لگے حمید کے ساتھ اپنے بچوں کی ایسی ہی مضحکہ خیز قسم کی اور بھی تصویریں میں نے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں — ان کے ساتھ میں بھی خوب ہنسی تھی۔ تصویریں یونہی چھوڑ کر میں نے دونوں کمروں کے دروازے اچھی طرح بند کئے اور باہری دروازے پر تالا بند کر دیا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے اپنے شوہر سے تصویروں کو فریم سے نکال کر البم میں منتقل کر دینے کا ذرا دیر پہلے کا اپنا بنایا ہوا پلان بتایا جسے انھوں نے فوراً نا منظور کر دیا۔

"اتنا بڑا سا گھر ہے یہ اس میں اب تصویریں بھی نہ لگیں ـــ تصویریں بچوں کی ہیں۔ چاہے حمید کے ساتھ ہوں یا ذٹ یا تصویر کھنچوائی ہوئی ان کا شمار تمہارے فضول سامان میں نہیں ہوتا ہے"

مجھے اپنے شوہر کی بات قطعاً مناسب نہیں معلوم ہوئی مگر میں نے بحث نہیں کی۔ دراصل میں جسمانی اور ذہنی طور سے بہت تھکی ہوئی تھی اس لئے خاموش رہی۔ میرے شوہر کچھ یاد کرتے ہوئے بولے . . . . .

"سنو۔ آج آفس میں ذکر تھا شہر میں چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ کوئی گینگ ہے جو ایک کاغذ کے ٹکڑے پر سرخ روشنائی سے اپنا نشان بنا کر چھوڑ جاتا ہے"

مجھے ان کی بات پر ہنسی آگئی۔ ایسی گپیں چھوڑ کر مجھے ڈرانا ان کی عادت ہے مگر وہ پھر مجھے یقین دلانے کے لئے کہتے رہے ـــ

"ارے اپنے دفتر کے کئی لوگ سوتے پڑے رہے اور ان کا گھر چوروں نے صاف کر دیا۔ بس وہی ان چوروں کا نشان لال لال روشنائی سے بنایا ہوا رکھا ملا"

وہ آگے بھی بتاتے گئے مگر کچھ تو تھکن اور کچھ موسم کی خرابی کی وجہ سے وقت سے کافی پہلے رات کا کھانا کھا کر ہم اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ باہر کڑک چمک اور گرج کے ساتھ مسلسل پانی برس رہا تھا۔ چوریوں کا ذکر ہوتا رہا مگر نجانے کب ہم گہری نیند سو گئے۔

رات کے کسی پہر میری آنکھ کھلی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گھر میں ہمارے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ اس بڑے سے گھر میں اس وقت بس ہم دو میاں بیوی ہیں۔ میں نے سوچا کچھ ہوا تو ـــ؟

بڑی زوردار گرج کے ساتھ بجلی چمکی میرے شوہر جاگ گئے میرا ڈر اور خوف سن کر وہ ہنس پڑے اور بولے ـــ

"تم شاید چوروں والی بات سے ڈر گئی ہو۔ وہمی مت بنو۔ کل سے رات میں دو ایک آدمی یہاں سونے کے لئے بلا دوں گا اپنے آفس سے"

ذرا سی دیر میں وہ پھر سو گئے مگر میں ویسے ہی بے سدھ پڑی جاگتی رہی ـــ صبح میرے شوہر نے مجھے تقریباً جھنجھوڑ کر جگایا۔ سامان والے دونوں کمروں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ میرا بند کیا ہوا تالا جوں کا توں بند تیرے دروازے پر لٹک رہا تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ اندر کمرے میں آکھڑی ہوئی۔ جہاں اوپر روشن دان سے ایک مضبوط رسی لٹک رہی تھی اور نیچے ہمارے بکس کا تالا ٹوٹا ہوا الگ پڑا تھا۔ میرا سارا بدن لرز اٹھا "تو چور اپنا کام کر گئے" یہ سوچ کر میرا سر چکرا گیا اپنے منوں وزنی قدم گھسیٹتی اس کمرے سے میں دوسرے کمرے میں آگئی جہاں کل شام میں نے حمید کے ساتھ بچوں کی برسوں پہلے والی ساری تصویریں الگ الگ کر کے ادھر اُدھر کی پیٹیوں پر ڈال دی تھیں پیٹیوں کے تختے اکھڑے ہوئے تھے جنہیں جگہ جگہ کیلیں لٹک رہی تھیں۔ جنہیں دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ "چوروں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا" ایک شدید جھٹکا سا لگا تھا مجھے میرے شوہر سہارا نہ دیتے تو شاید میں وہیں چکرا کر گر پڑتی۔ اچانک میرے شوہر بولے ـــ

"سنو وہ تصویریں تم نے کل شام کو ادھر اُدھر ڈالیں تھیں نا مگر اب دیکھو وہ سب کی سب کیسی ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں"

میں نے دیکھا دیوار کے سہارے پیٹیوں پر سب تصویریں لائن سے سجی تھیں مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا وہ مجھے چھوڑ کر آگے تصویروں کی طرف لپکے۔ ایک کے بعد دوسری تصویریں ہم دیکھتے گئے جس میں حمید کے ساتھ ہمارا کوئی نہ کوئی بچہ بھی موجود تھا۔ لیکن اب اس وقت ہم کسی بھی تصویر کی مضحکہ خیزی پر کل شام کی طرح ہنس نہیں پائے آخری تصویر کے نیچے ایک لمبا سا کاغذ دبا تھا جس پر لال روشنائی سے ٹیڑھے میڑھے الفاظ لکھے تھے۔

صاحب جی

بھیا لوگ اور بے بی کے ساتھ برسوں پہلے والا اپنا

فوٹو دیکھا تو دل لعنت کر اٹھا۔ ہم پہلے جانتے تو ادھر نہ آتے

ہم نے کچھ نہیں لیا ۔۔ فیض آباد سے میں بمبئی جانے کو بھاگا تو اس گینگ کا ساتھ ہو گیا ۔۔ بیگم صاحب سے چٹھی لکھنا پڑھنا تھوڑا سیکھا تھا ۔ یہ کاغذ اور سیاہی اپنے گینگ کا نشان ڈالنے کو ساتھ تو ہے پر لکھائی نہیں کر پا رہی ہے ابھی تک ہمارا فوٹو رکھا ہے ۔ آپ لوگوں کے دل میں ہمارا اتنا یاد ہے ۔ یہ بات اپنے سب ساتھی مان گئے بھول ہوئی اسے معاف کر دینا صاحب جی ۔

آپ کا

حمید

ہم اس پرچے کو پڑھ کر حیران کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ۔ پھر اچانک میرے شوہر چونکے اور بیٹیوں کے تختے اٹھا کے ان کے اندر جھانکتے اور کہنے گئے " ٹھیک سے پورا بھرا ہے ۔۔۔ ہاں دیکھو اس میں ۔ بھرا ہے نا "

میں نے لپک کر دوسرے کمرے میں رکھے ایک ٹرنک کا ڈھکن کھولا اس میں میرا رکھا سارا سامان جوں کا توں موجود تھا میں ایک کے بعد دوسرا بکس اور پھر ٹرنک کھولتی گئی اندر موجود سامان دیکھ کر اطمینان کی گہری سانس لیتی گئی ۔

آج دھوپ نکل آئی تھی اور دیواروں سے اتر کر اب صحن میں پھیل چکی تھی ۔ سامان کھولنے اور لگانے میں میری مدد کو کئی آدمی آ گئے تھے میں نے ان سے جگہ جگہ دیواروں میں کیلیں لگوائیں اور ان پر حمید کے ساتھ والی اپنے بچوں کی برسوں پہلے والی ساری تصویریں ایک ایک کر کے لگا دیں ●●●

بحر تخلیق کا شناور جوش ملیح آبادی ۔ صفحہ ۲۹ کا بقیہ

قوتوں ، فصیح خطبوں ، مضبوط سیرتوں ، مقدس ارادوں ، شفا بخش کلموں اور اپنے معتقدین کے سر فروش لشکروں کے ساتھ رشد و ہدایت کے آسمانی طبل پر چوبیں لگاتے ہوئے ، حیات کے افق پر مہتاب در بغل اور آفتاب بکف طالع ہوئے تھے ۔"

مختصر یہ کہ شاعری ہو یا نثر ، جہاں تک تخلیقی معیار کا تعلق ہے ۔ عہد حاضر میں جوش اپنی مثال آپ ہیں ۔ مجموعی طور سے انھوں نے ، شاعری و نثر دونوں میں یکساں طور پر تخلیقی قوتوں کو جلا بخشی ، زبان و بیان کو ایک نیا آہنگ عطا کیا ۔ نیز بے جان الفاظ کے پیکر میں حرکت و توانائی کی روح پھونکی ۔ جوش کی تخلیقات میں چاہے فلسفے کی رمق ، حکیمانہ شعور اور گہری معنویت بہت نہ بھی ہو تو بھی جس غیر معمولی خلاقانہ صلاحیت کا مظاہرہ جوش نے اپنی تخلیقات میں کیا ہے ، عصر جدید کا کوئی دوسرا شاعر یا ادیب اس سلسلے میں ان کے مقابلے میں نہیں پیش کیا جا سکتا ہے ۔ ان کی شعری و نثری تخلیقات کا سرچشمہ ان کی جدت پسند طبیعت اختراعی فکر ، ایجاد پسند تخیلات ، شدت جذبات اور بے مثل فنکارانہ مہارت کو قرار دیا جا سکتا ہے ، اردو کے تخلیقی ادب میں جوش کا مرتبہ نہایت بلند ہے ۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے ۔

غزل

سلیم اختر سیتاپوری
شیخ سرائے سیتاپور

دیکھ لے تو جو دیکھ سکتا ہے
دل ترے نام سے دھڑکتا ہے

خود جنوں بڑھ کے تھام لیتا ہے
اک خردمند جب بہکتا ہے

ساتھ میں ہے کسی کے یہ دنیا
اور تنہا کوئی بھٹکتا ہے

عشق چھپتا نہیں چھپانے سے
مشک کی طرح یہ مہکتا ہے

دل کی باتیں نہ سن سلیم اختر
یہ تو پاگل ہے یوں ہی بکتا ہے

جنید حزیں لاری
ڈی۔آر۔ایم۔آفس
کمرشیل برانچ، این۔ای۔ریلوے
وارانسی

انشائیہ

سازِ دوامِ زندگی

زندگی کیا ہے ؟

اور اس کی حقیقت و ماہیت کیا ہے ؟

بظاہر یہ ایک سیدھا سادا لیکن در حقیقت نہایت مشکل اور پیچیدہ سوال ہے ۔ اس کا ایسا متفقہ جواب جو اپنی معنویت اور جامعیت کے لحاظ سے مکمل ہو اور زندگی کے تمام روشن اور تاریک پہلوؤں کو محیط ہو، تقریباً ناممکن الحصول ہے ۔

پھر بھی ہر زمانے میں، مختلف علوم کی روشنی میں اس سوال پر غور کیا گیا ہے ۔ زندگی اور اس سے وابستہ مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں کی گئی ہیں اور دنیا کے ہر مکتبِ خیال کے مفکروں، دانشوروں اور شاعروں نے اس موضوع پر غور و خوض کرنے کے بعد اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے مگر ہنوز روزِ اول است ! بات جہاں پہلے تھی وہیں آج بھی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسرارِ حیات و کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کی جتنی کوششیں کی گئیں یہ مسئلہ اتنا ہی الجھتا گیا ۔ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں والا مضمون ہے ! زندگی کیا ہے اور اس کا مقصد و منشا کیا ہے ؟ یہ سوال آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اور اربابِ فکر و نظر کی توجہ کا طالب ہے ۔

ابھی تک زندگی کی کوئی ایسی جامع و مانع تعریف نہیں پیش کی جا سکی جو اس کی وسعت و ہمہ گیری، رنگینی و پرکاری، تغیر و تسلسل، ترنم و تلاطم، عظمت و رفعت، بلندی و پستی، جلال و جمال اور سوز و ساز کے ساتھ اس کے تمام خفی و جلی پہلوؤں اور روشن و تاریک امکانات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو ۔ غالباً یہ ممکن بھی نہیں کیونکہ سارے علوم و فنون اور فلسفہ و سائنس کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی زاویے سے براہ راست یا بالواسطہ حیات و کائنات ہی کے مسائل کا تجزیہ و مطالعہ پیش کرتے ہیں لیکن فلسفہ و سائنس کی رو سے زندگی کا جو مفہوم ہے، ضروری نہیں کہ وہ مذہب و اخلاق کے نقطۂ نظر سے بھی درست ہو ۔ اسی طرح سماجی علوم کی روشنی میں زندگی کی جو غرض و غایت متعین ہوتی ہے، اس کا ادب اور آرٹ کے پیش کردہ تصورِ حیات سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ۔ خود شعر و ادب کی دنیا میں کسی ایک نظریۂ زندگی کی حکمرانی نہیں ۔ ادب نام ہے زندگی کی عام تفسیر و ترجمانی کا ۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی بوقلمونی اپنے جلوۂ صد ہزار رنگ کے ساتھ ادب کے آئینے میں منعکس ہے ۔ انسانی طبائع کا اختلاف ناگزیر ہے ۔ نظریات و عقائد کا تنوع مسلّم ہے ۔ یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہے اسی لیے ادب یا زندگی میں کسی ایک مسلک یا کسی ایک نظریے کی پابندی یا اس پر اتفاقِ رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ؎

لو شمعِ حقیقت کی ہے اپنی جگہ قائم
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے اصغر

ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت تھی
رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی جگر

اب ذرا غور فرمائیے کہ ایک شخص کی مختصر زندگی، محدود علم اور معمولی صلاحیت کی بساط ہی کیا ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر زندگی کے اَن گنت مظاہر کی جلوہ گری کا مکمل طور پر مشاہدہ کر سکے اور اس طرح عالمِ ذرات کے علم و آگہی کے وسیلے سے ناقابلِ تجزیہ جہانِ کلیات کا ادراک حاصل کر سکے۔

ان حقائق کے باوجود ہر شخص اپنی علمی استعداد اور ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر زندگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی رائے میں صحت یا عدم صحت کی گنجائش موجود رہتی ہے اور تبدیلیٔ رائے کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے کیونکہ زندگی کسی جامد و ساکت شے کا نام نہیں ہے۔ یہ وقت کے عظیم اور بے کراں سمندر میں ہلچل پیدا کرتی رہنے والی تند و تیز موجوں کی مانند ہمیشہ رواں دواں اور متحرک رہنے والی چیز ہے۔ لہٰذا ہر آن بدلتے ہوئے اسباب و حالات کی بنا پر زندگی کے ساتھ انسان کا طرزِ عمل بھی بدلتا رہتا ہے۔ اسکی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کے زیرِ اثر اس کے خیال و عمل کی دنیا میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔

برٹرینڈ رسل نے "حقیقی زندگی کو انسانی وجود کے آدرش اور اس کے وسیع امکانات میں ایک مستقل مفاہمت سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن ایک انسان کی زندگی اس کے اپنے معیار کے مطابق کبھی مکمل اور آئیڈیل نہیں ہو پاتی۔ یہی سبب ہے کہ وہ کبھی مطمئن اور آسودہ حال نظر نہیں آتا۔ زندگی کے حقیقی مفہوم کی تلاش میں اور اپنے مقصودِ اصلی کی جستجو میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے۔ شاید یہی اس کا مقدر ہے، تشنگی اور ناآسودگی! سفرِ مدام سفر ہی غالباً زندگی کا دوسرا نام ہے ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
اقبالؔ

میں ہوں ازل سے گرمِ روِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے
اصغرؔ

کس کا خیال کون سی منزل نظر میں ہے
صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے
جگرؔ

زمانہ سفر میں ہے اور ایک زمانے پر ہی کیا منحصر ہے یہاں تو رات دن گردش میں ہیں۔ سات آسمان! دنیا کی کسی شے کو نہ ثبات ہے نہ قیام۔ ہر چیز رواں دواں اور متحرک ہے زندگی بھی ایک سفر ہے! کبھی نہ ختم ہونے والا ایک لمبا سفر جو ہمیشہ جاری رہے گا۔ میرؔ کا بہت مشہور شعر ہے ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

شعر کا مفہوم بالکل واضح ہے یعنی موت محض ماندگی کا ایک وقفہ ہے۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد آگے پھر چلنا ہے۔

مختلف شعراء کے افکار و خیالات کی روشنی میں زندگی کے متعلق غور و خوض مطالعے کے ایک دلچسپ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ فانیؔ بدایونی نے زندگی کو ایک ایسے معمّے سے تعبیر کیا ہے جس کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش اکثر رائیگاں جاتی ہے۔ ان کے الفاظ میں ؎

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی جیسی پیچیدہ اور ناقابلِ فہم شے کو "دیوانے کا خواب" کہہ کر شعر گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔ حسنِ ابہام کی داد دیجئے اور خود اندازہ کیجیے کہ دیوانے کے خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟

انسانی ذہن کا یہ کمال ہے کہ اس نے ہر مسئلہ کی عقدہ کشائی کی ہے اور سوال کے ہر پہلو پر مختلف زاویوں سے غور کرتے ہوئے تشفی بخش جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ فانیؔ کے متذکرہ بالا شعر کو دھیان میں رکھیے اور اعجاز حسین کا ایک شعر سنیئے جو لطف سے خالی نہیں ؎

یہ زندگی ہے ازل اور ابد سے ہم رشتہ
سمجھ سکے ہیں نہ سمجھیں گے اس کو دیوانے!

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زندگی گزارنے کے لیے زندگی کو سمجھنا بھی ضروری ہے ؟ اس کا جواب بھی ایک شاعر کی زبانی سنئے ۔ ذوقی دہلوی شمعِ زندگی سے یوں مخاطب ہیں ؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے !

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ زندگی کا مفہوم خواہ سمجھ میں آسکے یا نہ آئے ، اسے کسی نہ کسی طور گزارنا ہی پڑتا ہے ۔ یہ گزرنے والی چیز ہے اور گزر کر ہی رہتی ہے ۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک !

شام و سحر اور ماہ و سال کا چکر چلتا رہے گا۔ موسمی تغیرات واقع ہوتے رہیں گے ۔ صدیوں اور قرنوں کا الٹ پھیر ہوتا رہے گا اور زندگی ہر پل ایک نئی کروٹ بدلتی رہے گی ۔ انسان جیتے جی بالکل غیر محسوس طور پر کتنے چہرے بدلتا ہے ؟ کس کو فرصت ہے یہ سوچنے کی ؟ لیکن مجھے تو شفیق جونپوری کا ایک شعر یاد آرہا ہے کیا خوب کہا ہے انھوں نے ؎

زمانے کے تغیر کی کہانی پوچھئے کیا ہو ؟
کہ ہم سے آپ اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی !

قوموں کی زندگی ہو یا اشخاص و افراد کی ۔ ملکی تاریخ ہو یا سماجی تصویر ـــــ تغیر قدرت کا اٹل قانون ہے ۔ تبدیلی فطرت کا بنیادی اصول ہے ۔ زمانے کی دست برد سے کوئی شے محفوظ نہیں ہے ۔ خاموش تبدیلی کا عمل برابر جاری ہے ۔ انگریزی کی ایک کہاوت ہے :۔

Every thing under the sun is subject to the law of change

اسی اصول کے تحت تعمیر و تخریب کا سلسلہ جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

آہستہ آہستہ عمر کی منزلیں طے ہوتی رہیں گی لیکن آہستہ آہستہ ہی کیوں ؟ زندگی تو کبھی سست رفتار معلوم ہوتی ہے اور کبھی برق رفتار ، کبھی چیونٹی کی طرح رینگتی ہوئی اور کبھی ہر قدم پر اپنے خرامِ ناز سے ایک ہنگامہ برپا کرتی ہوئی ، ایک محشر اٹھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ بقول میر دردؔ ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے !

وقت کی میکانیکی تقسیم اور گھڑی کی سوئیوں سے زندگی کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ۔ اس کے لیے تو آلۂ احساس کی ضرورت ہے چنانچہ غالب جیسا ذہین اور بالغ نظر شاعر احساس کی ایک خاص سطح پر پہنچنے کے بعد ہی اس تجربے سے دوچار ہوا تھا ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں !

اقبال نے اپنے انداز میں اسے یوں محسوس کیا ؎

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام اتنا   قومیں کچل گئی ہیں اس کی رواروی میں

اور فراق گورکھپوری مشاہدے سے ادراک تک کے مرحلے طے کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ؎

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا !

جب وقت اس قدر سبک رفتار ہے اور دبے پاؤں سے چپکے سے نکل جاتا ہے تو اسے یوں ہی کھو دینا یا بے کار باتوں میں ضائع کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے ؟ وقت کی تیز رفتاری یا نیرنگی کا خیال آتے ہی لازمی طور پر اس کی قدر و قیمت کا احساس بڑھ جاتا ہے اور اسے بڑھنا ہی چاہیئے کہ یہ ایک صحت مند علامت ہے ۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے : Catch time by the forelock

میر صاحب کو بھی وقت کی قدر و قیمت کا احساس تھا ورنہ وہ یہ نہ کہتے ؎

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا ؟

اور پھر اس کے بعد ایک کام کی بات ؎

فرصت بود و باش یاں کم ہے　　کام جو کچھ کرو شتاب کرو !

جوشؔ ملیح آبادی جیسا تند مزاج شاعر وقت کی تیز گامی کی تاب نہ لا سکا اور اسے بھی یہ کہنا پڑا ؎

اے عمرِ رواں کی رات آہستہ گزر　　اے ناظرِ کائنات آہستہ گزر
اک شے پہ بھی جمنے نہیں پاتی ہے نگاہ　　اے قافلۂ حیات آہستہ گزر

لیکن اس کے باوجود زندگی کا سفر اپنی فطری رفتار سے جاری ہے۔ انسان کے پاس اس قافلے کے ساتھ چلتے رہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ وقت کی رفتار کو بریک کون لگا سکتا ہے ؟ گھڑی کی سوئی کہاں رکتی ہے ؟ حقیقت پسندانہ اعتراف کی حامل، مرزا یگانہ کی رباعی ملاحظہ ہو ؎

چارہ نہیں کوئی چلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکا کھانے، سنبھلتے رہنے کے سوا

ایک عام خیال ہے کہ اس عارضی زندگی کا انجام نہایت افسوسناک اور عبرت انگیز ہے۔ "آدمی بلبلہ ہے پانی کا" اور ایک دن یہ بلبلہ ٹوٹ جاتا ہے ! اکثر شعراء نے اس مضمون کو حسرت و تاسف کے ساتھ نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ؟
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا !　　میرؔ

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے　　میرؔ

بیانِ ہستیٔ فانی جو میں لگا کرنے
تو اس کے سنتے ہی بس اڑ گیا حباب کا رنگ　　مصحفیؔ

بلبلے کی حسیں عمارت میں
اک جہانِ شکست دیکھا ہے !　　عدمؔ

دنیا سرائے فانی ہے اور یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے۔ یہ خیال بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ ثبات و قیام کسی شے کو نہیں، زندگی کی بے ثباتی کا نقش کتنا گہرا ہے ؎

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی
انیسؔ

لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ وقفۂ زندگی نہایت مختصر ہے ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں !　　ظفرؔ

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانہ چاہا　　فانیؔ

وہ کون تھے جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت ؟
یہاں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے !　　فیضؔ

تمام عمر ترا انتظار کرلیں گے
مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے !　　نامعلوم

ہائے کیا بیچارگی ہے ! زندگی کے یہ چار دن بھی راحت و خوشی اور آرام و آسودگی کے ساتھ بسر نہیں ہوتے۔ آلام و مصائب سے پُر کانٹوں بھری اس زندگی کے دکھوں کا علاج کس کے پاس ہے، کون ہے جو ان زخموں کا مداوا کرے اور غموں کی کلفت سے نجات دلائے ؟ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں　　غالبؔ

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانیؔ
وجودِ دردِ مسلّم علاج نامعلوم

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانیؔ

زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا ! فانیؔ

جو بھی رہِ حیات سے گزرا وہ بدنصیب
کہتا ہوا غموں کی کہانی گزر گیا ! عدمؔ

دن گزرتا ہے حوادث کی تواضع کرتے
رات زخموں کی مدارات میں کٹ جاتی ہے جامیؔ

حوادث کے اس ہجوم میں امید کی ایک تابناک کرن اس خیال کے ساتھ ابھرتی ہے کہ سماجی و معاشرتی حالات خواہ کتنے ہی حوصلہ شکن اور مایوس کن کیوں نہ ہوں انسان عزم و استقلال سے کام لیکر ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ خود اعتمادی اور مستقل مزاجی کے سہارے ہر طرح کے خطرات سے نبٹا جا سکتا ہے زندگی ایک میدانِ عمل ہے۔ میدان کارزار ہے اور سچ پوچھئے تو جینے کا لطف تلخ حقائق کا سامنا کرنے ہی میں ہے۔ مردانگی مصائب کو جھیلنے ہی میں ہے۔ ان سے گریز میں نہیں ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم ! غالبؔ

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اِک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے ! شادؔ

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے ! جگرؔ

اس دھرتی پر شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس کو اپنی زندگی پیاری معلوم نہ ہوتی ہو اور جو اپنی زندگی کی ابدیت کا آرزومند نہ ہو۔ آخر وہ کون ہے جو اس زندگی کی بے پناہ وسعتوں، رنگینیوں اور رعنائیوں میں کشش نہ پاکر اس کی ساری نعمتوں اور برکتوں سے محروم ہو جانا چاہتا ہے ؟ قدم قدم پر ہزاروں مصائب و مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اور آئے دن اَن گنت مخالف قوتوں سے ٹکراتے ہوئے کیا ہم محض زندہ رہنے کے لیے اور محض اپنی بقا اور تحفّظ کے لیے سرگرم عمل نہیں رہتے ؟ ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے اصغرؔ

انتہائی مایوسی اور شکست خوردگی کے عالم میں بھی تلخ حقائق کے کڑوے کسیلے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کیا ہم زندگی سے اپنی بے پناہ محبت اور رفاقت کا اعلان نہیں کرتے ؟ ؎

زندگی تیرے لیے زہر پیا ہے ہم نے !

ہر لمحہ ایک نیا رُوپ بدلتی اور ہر آن ایک نیا جلوہ دکھاتی ہوئی زندگی کی نعمتوں اور برکتوں کا صحیح اندازہ ہو تو آدمی مثبت انداز میں سوچنے لگتا ہے اور کسی بھی حالت میں اپنے دل و دماغ پر منفی اثرات کی چھاپ نہیں لگنے دیتا۔ صہبا لکھنوی بہت واضح طور پر کہتے ہیں ؎

کتنے دیپ بجھتے ہیں کتنے دیپ جلتے ہیں
عزم زندگی لے کر پھر بھی لوگ چلتے ہیں
بحر و بر کے سینے بھی ، زیست کے سفینے بھی
تیرگی نگلتے ہیں روشنی اگلتے ہیں !

ایسا نہیں ہے کہ زندگی میں صرف دُکھ ہی دُکھ ہے اور خوشی کا نام و نشان نہیں بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تضادات کی اس دنیا میں دھوپ چھاؤں، رنج و راحت، یاس و امید، کامیابی و ناکامی، اچھائی برائی، سچ جھوٹ اور دوست دشمن غرض کہ سب لازم و ملزوم ہیں۔ ہر چیز کی پہچان اس کی مخالف جنس سے ہوتی ہے۔ اس لئے ان میں سے کسی ایک چیز کو اپنا کر دوسرے سے دامن بچا لینا تقریباً ناممکن ہے ؎

جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتا ہے

اسی لئے اقبالؔ کے بقول ؎

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے

فطرت نے کم و بیش تمام چیزوں کو متضاد صورت میں پیش کیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا جذبہ یا کوئی ایسی چیز ہو جسے اس اصول سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکے۔ انسان کی آزمائش اسی میں ہے کہ وہ مختلف و متضاد اشیاء و حالات کو سمجھے، پرکھے اور ان میں فرق و امتیاز کرے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ان مختلف متضاد اشیاء و حالات سے برابر اس کا سابقہ پڑتا

رہے ظاہر ہے کہ جس نے زندگی کے دکھ نہ جھیلے ہوں وہ خوشی سے کیا خاک لطف اندوز ہوگا؟ اور جس نے یادِ محبوب میں آنسو نہ بہائے ہوں اور ہچکیاں لے لے کر ہجر کی طویل وسیاہ راتیں نہ کاٹی ہوں وہ وصلِ یار کی حقیقی لذت سے کب آشنا ہوگا؟ بامقصد اور خوش حال زندگی بسر کرنے کے لیے زندگی کی حقیقتوں کا علم و عرفان ضروری ہے ؎

خوشی جہاں میں بہت ہے، ہمارے گھر نہ سہی
ملول کیوں رہیں، دنیا کے انتظام سے ہم — اکبر الہ آبادی

زندگی روز نئی لگتی ہے دل والوں کو
گرچہ ہر بار وہی لیل و نہار آئے ہیں — نامعلوم

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی — اقبالؔ

زندگی بذاتِ خود نہ طربیہ (comedy) ہے نہ المیہ (Tragedy)۔ رنج و راحت کا احساس ہمیں باہر سے لا کر کوئی نہیں دیتا بلکہ یہ ہمارا داخلی اور انفرادی احساس ہے جو مختلف سانچوں میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ارسطو نے بھی اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ انسان کی ذہنی کیفیت اور اس کی مزاجی حالت جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ زندگی کیسی ہوگی؟

اب زندگی چاہے جس رنگ میں بسر ہو، یہ واقعہ ہے کہ ہر شکل میں اور ہر رنگ میں زندگی ہی کے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ در اصل یہ قوتِ حیات ہی کی کارفرمائی ہے کہ ذرّے ذرّے میں ایک جہانِ مسرت و خوشی آباد ہے۔ دنیا کی ساری رنگینیاں اور دلفریبیاں، رونقیں اور ہنگامے آخر کس بات کی دلیل ہیں؟ وہ کون سی برقی قوت ہے جو ہر تحریک اور ہر تنظیم کی روحِ رواں ہے؟ کیا اسی کا نام زندگی نہیں ہے؟

دنیاوی دلچسپیوں کا میدان بہت وسیع ہے۔ شوق و جستجو کی تکمیل کے لیے نئے نئے مشاغل کی کمی نہیں۔ علم و فن سیکھنے کی بات ہو یا سیر و سیاحت کی، کھیل کود کے میدان ہوں یا مہم جوئی کے لیے سر بفلک چوٹیوں کی تلاش، ہر جگہ اور ہر میدان میں کامیابی کے روشن امکانات موجود ہیں۔ خدا کی اس دنیا میں کسی کو پست ہمت یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں خواہ حالات بظاہر کتنے ہی ناساعد اور ناموافق دکھائی دیتے ہوں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آدمی دانشمندی کا ثبوت دے اور مسلسل جد و جہد سے اکتا نہ جائے۔

دلوں میں عشقِ حقیقی کا نور ہو یا عشقِ مجازی کا سرور، نجاتِ اخروی کی فکر ہو یا دنیا طلبی کا سودا، حصولِ علم کی خواہش ہو یا کوئی دلچسپ مشغلہ اختیار کرنے کی لگن ——— زندگی کو پُر مسرت اور خوشگوار بنانے کے لیے ہر قدم پر نئے امکانات موجود ہیں ؎

اگر جمالِ حقیقت سے ربط محکم ہے
نفس نفس میں نئی زندگی کا عالم ہے! — جگرؔ

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا — اصغرؔ

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ عالم کو
کہ جو شے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے — جگرؔ

اب اگر زندگی کی حقیقت کے بارے میں کوئی یہ کہے کہ دنیا سرائے فانی ہے اور آدمی پانی کا بلبلہ ہے یا قیدِ حیات و بندِ غم ایک ہی شے کے دو الگ الگ نام ہیں تو ہم اسے غلط نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح اگر کسی کا خیال ہے کہ زندگی جاودانی ہے اور اس کے مسرت بخش احساس سے شبستانِ وجود جگمگا رہا ہے تو یہ بھی درست ہے لیکن جینے کا لطف تو جب ہے کہ زندگی کو بامقصد اور بامعنی بنایا جائے زندگی گزارنا ایک فن ہے، ایک ہنر ہے جس نے زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ لیا اور اس کے مقاصد کی شناخت کر لی اس نے گویا زندگی کا سب سے قیمتی راز پالیا۔ وہی شخص دنیا کے اسٹیج پر اپنا رول کامیابی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے جو اسرارِ زندگی سے واقف ہو۔ ایڈیسن (Addison) نے ایک بار کہا تھا:-

Whilst I yet live, let me not live in vain.

کیوں نہ ہم بھی میرؔ کے اس شعر کو اپنا نصب العین بنا لیں ؎

یارو دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

نام کتاب: "میخانۂ شارب" (شعری مجموعہ)
شاعر: شارب لکھنوی قیمت: نو روپے
ملنے کا پتہ: حکیم شارب لکھنوی۔ رستم نگر۔ نزد شبیہ نجف لکھنؤ

حکیم شارب لکھنوی۔ لکھنؤ کے ان کہنہ مشق نمائندہ اور ممتاز شعرا میں ہیں جنھوں نے اپنے روایتی لب و لہجہ اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ اُردو زبان و ادب کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ تقریباً درجن بھر مطبوعہ شعری مجموعوں کے خالق ہیں جن سے ان کی کہنہ مشقی اور مہارت فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک باکمال اور کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شارب صاحب ایک ماہر اور تجربہ کار طبیب بھی ہیں۔ طویل عرصہ تک حکومت یو۔پی کے محکمۂ صحت میں ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور آخر میں آیورویدک و یونانی ڈویزنل آفیسر کے باوقار عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آجکل وہ ذاتی طور پر طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی سماجی حیثیت بھی مسلم اور قابل قدر ہے۔

شارب صاحب کا نیا شعری مجموعہ "میخانۂ شارب" پیش نظر ہے
ایک دبستان کے طور پر لکھنؤ اور دہلی کی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے جس میں کسی اختلاف رائے کی بظاہر نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔
بنیادی اسباب و محرکات سے قطع نظر یہ بھی حقیقت ہے کہ شعرا لکھنؤ کے یہاں بالعموم پُر تکلف شعری اہتمام، رندی و ہوس ناکی، عریانیت اور ابتذال کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اساتذہ لکھنؤ اس شعری انداز کو معیوب بھی نہیں سمجھتے۔ ۶۰، ۷۰ سال قبل یہی ماحول اور مذاق شعری عام تھا جس کے اثرات شعرا لکھنؤ کے یہاں آج بھی ہیں۔ حالانکہ اب ماحول اور شعور شعری بڑی حد تک بدل چکا ہے۔ عصری احساسات، نظریات اور نئے خیالات بھی شعرا لکھنؤ کے یہاں نظر آنے لگے ہیں۔ اس پس منظر میں شارب لکھنوی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو بقول جناب صباح الدین عمر:

"موجودہ عہد کے ان لکھنوی شعرا میں جنھوں نے حالاتِ زمانہ کو سمجھا، بدلتے ہوئے اقدار سے سبق لیا اور دور حاضر کے تقاضوں کا احساس کیا ان میں حکیم شارب لکھنوی ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ لکھنوی تہذیب کے پرداختہ لکھنؤ کی شعری فضا میں پلے ہوئے، اساتذہ کی صحبت اٹھائے ہوئے شارب لکھنوی نے صرف زبان و بیان کی نوک پلک درست رکھنے تک اپنے کو محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے سماج، اپنے گردوپیش کے حالات اور بدلتی ہوئی دنیا کا بہ نظر غائر مطالعہ بھی کیا اور اس سے اثر پذیر بھی ہوئے۔ وہ اپنے مریضوں ہی کی نبض نہیں دیکھتے بلکہ نبض دوراں پر بھی ان کی انگلیاں رہتی ہیں۔ غزل کی ہیئت اور روایت کو مجروح کیے بغیر وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے اشعار کا پیکر عطا کرتے ہیں۔"

چند اشعار قارئین کی تفنن طبع کے لیے پیش ہیں ؎

یہ سنا ہے اس خطا پر مری انگلیاں کٹیں گی
جہاں روشنی نہیں تھی وہاں شمع کیوں جلائی

اس دور کے انساں کو ابھی اور جگاؤ
یہ خواب سے چونکا تو ہے بیدار نہیں ہے

بڑھتے بڑھتے آج کا ذرہ کل بن سکتا ہے سورج
گھٹتے گھٹتے آج کا سورج ذرہ بھی ہو سکتا ہے

صاحبِ حسن بہاروں کا اثر رکھتے ہیں
پھول کھلتے ہیں اُدھر پاؤں جدھر رکھتے ہیں

شارب صاحب کے شعری مزاج اور مرتبہ کی تعیین و تفہیم کے لیے "میخانۂ شارب" کے مطالعہ کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ یہ مجموعہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت یوپی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

ـــــــــــــ ڈاکٹر تسخیر فہمی

نام کتاب: "سارا دن دھوپ"
مصنف: غیاث احمد گدی قیمت: ۳۵/ روپے
ملنے کا پتہ: شبستان۔ نیوکریم گنج۔ گیا

کلام حیدری نے گدی کے انتقال کے بعد ان کے افسانوی مجموعے "سارا دن دھوپ" کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اس میں گدی کے بہترین افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ خود گدی کا لکھا ہوا ایک مختصر مضمون "میں اور میرے افسانے" بھی اس میں شامل ہے۔ "میں اور میرے افسانے" میں غیاث ایک جگہ لکھتے ہیں:

"الفاظ کی رفاقت نے مجھے تخلیقی اظہار کی ہمہ جہت نعمت ہی عطا نہیں کی، نگاہِ باریک بیں اور دور رس بھی بخشی ہے۔"

اور یہی باریک بینی اور دور رسی ان کے افسانوں کا خمیر ہے۔ انھوں نے جنگل سے سمندر تک ہر شے کھنگال لی اور ہر شے سے اس کے سارے حسن کو نچوڑ لیا۔ انھوں نے اوروں کی طرح پہلے روایتی افسانے لکھے لیکن جب نئے لکھنے والوں نے روایت سے انحراف کیا تو وہ بھی ان کے اس طرح ہم قدم ہوئے کہ انھیں پتہ بھی نہیں چلا کہ غیاث کب ہمارے ساتھ ہیں۔ انفرادیت کی تلاش میں ان کی عرق ریزی چاہے زبردست فن کارانہ نہ ہو مگر ہے۔

ان کے پاس منٹو یا بیدی کی طرح کوئی بہت بڑا سرمایہ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اتنی پونجی ان کے پاس ہے جو اردو کے بڑے سے بڑے افسانہ نگار کو میسر نہیں۔ جو چند اچھی کہانیاں ان کی ملکیت ہیں وہ ہی اتنی کافی ہیں کہ انھیں بہترین افسانہ نگاروں میں ممتاز کرسکیں۔ بیانیہ سے جدید اسلوب تک ان کا جو بھی افسانہ ہے وہ اپنے آپ میں مکمل ہے کیونکہ اس کے پیچھے ان کی انتھک محنت کے ساتھ ساتھ وہ سلیقہ مندی بھی ہے جو ڈراما ئیت سے بھرپور ہے۔ واقعات، پلاٹ اور کردار نگاری کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات پر ان کی گہری نظر ہے اور وہ وہی لکھتے ہیں جو لکھنا چاہتے ہیں۔

اپنے مضمون "میں اور میرے افسانے" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں

"میں اور میرے افسانے، میرے افسانے اور میں ہرگز الگ نہیں وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ اور ایک ہی زندگی کے دو پہلو ہیں۔"

اور یہ دو پہلو وہ ہیں جس سے غیاث احمد گدی کے سارے افسانے ظاہر سے باطن تک اُجلے اُجلے نظر آتے ہیں۔

ـــــــــــــ وقار ناصری

نام کتاب: سبزہ و گل (شعری مجموعہ)
شاعر: شاداں بدایونی قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: ہماری آواز۔ شکیل روڈ۔ بدایوں

"سبزہ و گل" شاداں بدایونی کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ اولین مجموعہ کلام کی خاطر خواہ پذیرائی نے ہی انھیں حوصلہ بخشا ہوگا کہ وہ دوسرا مجموعہ کلام پیش کریں۔ ایک صورت حال یہ بھی ہے کہ تخلیق کار تخلیق صرف اسی وقت کرتا ہے جب اس کی پذیرائی ہو۔ شاداں بدایونی کے ساتھ بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے لیکن ان کا کلام پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عوام و خواص دونوں ہی کی پسند کا خیال رکھتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہیں۔

غزل کی وہ تمام روایتیں جو اس کے لہجے سے عبارت ہیں رنگ بدل بدل کر ان کے اشعار میں سامنے آتی ہیں انھیں یہ ہنر آتا ہے کہ وہ کس طرح اڑتے لمحات کو الفاظ کے قفس میں قید کریں اور انھوں نے غزل کو خونِ جگر دے کر اپنے عہد کا پابند کیا ہے۔ یہی تخلیق کار کی کامیابی کی دلیل ہے، گویا ایک تاریخ ہے جو غم دوراں اور غمِ جاناں کی بساط سے گزر رہی ہے۔ مثلاً ؎

وفا ہے شہرِ نگاراں میں آج تک نایاب
میں پتھروں کا خریدار ہو نہیں سکتا

شاداں میں عزم سفر بھی ہے اور اس کی صعوبتیں برداشت کرنے کا حوصلہ بھی ؎

گوشۂ دل ہے اگرچہ دشتِ بے آب و گیاہ
حسرتوں کا پھر بھی میرے ساتھ ہے لشکر بہت

کہیں کہیں انھوں نے یہ انداز بھی اختیار کیا ہے ؎

ان کی مے پاشں نگاہوں نے وہ تسکین بخشی
آج تک جام کو ہونٹوں سے لگایا ہی نہیں

"سبزہ وگل" میں اس قسم کے اشعار کی کثرت ہے جو چٹانوں، کوہساروں اور بے آب وگیاہ زمینوں میں پھول کھلانے کے ہنر کا اظہار کرتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ آنسوؤں کی نمی بھی ہے ؎

جن درختوں سے رہا ہو نہ زمیں کا رشتہ
ان کے سائے میں جیا جائے کہاں تک آخر

اب رسائی دار تک ہو یا نہ ہو
لب کشائی کی جسارت کی تو ہے

سربلند اپنا لہو تھا سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اٹھا کر لے گئے

سبزہ وگل" ایک خوبصورت کتاب ہے، اس میں ظاہری حسن بھی ہے اور باطنی بھی۔ دو سو صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے میں کچھ اشعار زبان زد خاص و عام ہو سکتے ہیں۔ اس مجموعے کا مطالعہ دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

——— عشرت ظفر

نام کتاب "**دیوار کے پیچھے**" (ناول)
مصنف: **ارشاد امروہوی** قیمت: اٹھارہ روپئے
ملنے کا پتہ: سہیل پبلشرز ۳۔ نبی اللہ روڈ لکھنؤ

ارشاد امروہوی عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ اب تک ان کی دس ناولیں بازار میں آ چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کی گیارھویں کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ناول اول تا آخر دلچسپ ہے اور انداز سادہ اور واضح ہے۔

"دیوار کے پیچھے" میں یہ کوشش جگہ جگہ نمایاں ہے کہ قاری کہانی سے زیادہ مکالموں میں دلچسپی لے۔ اس سے مکالموں کا فطری حسن ختم ہو گیا ہے اکثر مکالمے موقع اور محل کی مناسبت سے نہیں ہیں۔ کردار نگاری اور منظر کشی اوسط درجے کی ہے ——— انداز تحریر کو دلنشیں بنانے کے لیے کردار اور ماحول کو فطری حسن عطا کرنے میں ناول نگار کسی حد تک کامیاب ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ جو مکالمہ ہو وہ بالکل ہوبہو ہو اور جو سچویشن ہو اس سے کوئی انکار نہ کر سکے۔ جو باب جہاں ختم ہو ایسا لگے کہ اسے وہیں ختم ہونا چاہیے تھا۔ ایسا نہ لگے کہ اب ناول نگار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ بات کیسے آگے بڑھائے اس لیے اس نے باب ختم کر دیا۔ فن کو کیسے پرکشش اور دلنشین بنایا جائے یہ کسی کو بتایا نہیں جا سکتا بلکہ خود تجربہ اور ریاض یہ وصف عطا کرتا ہے۔ اگر ناول ختم کرنے کے بعد ہر ہر طرح اور ہر ہر نقطہ نظر سے خود اس کا تجزیہ کیا جائے تو بہت کچھ نکھار آ سکتا ہے۔

"دیوار کے پیچھے" ایک عام قسم کی دلچسپ ناول ہے۔ یہ فارمولا ٹائپ کی ناول کے دائرے سے نکل نہیں سکی ہے۔ کتابت، طباعت مناسب ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور قیمت بھی کوئی زیادہ نہیں ہے۔

——— احمد ابراہیم علوی

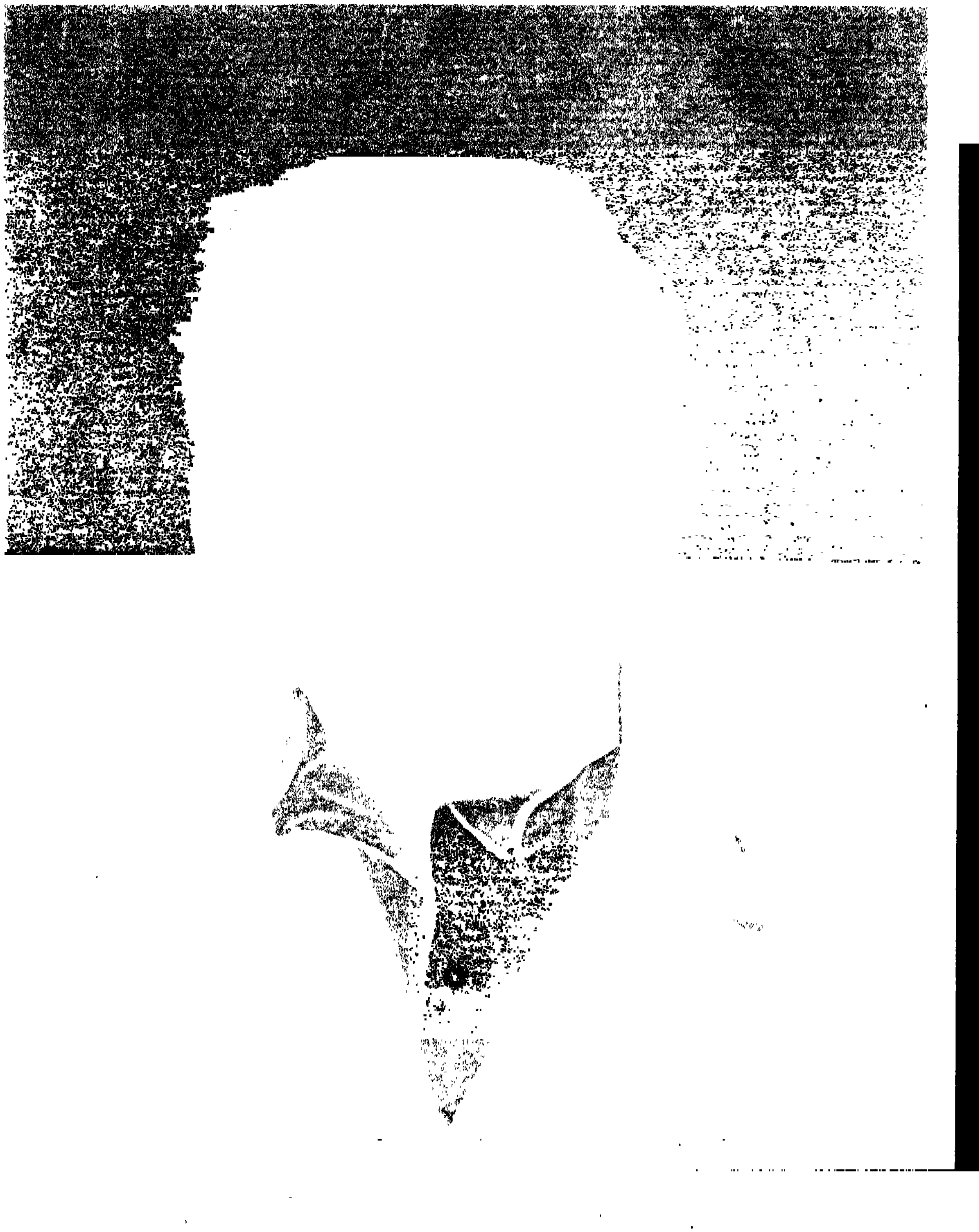
نام کتاب: "**جنگل کی امانت**"
مصنف: وکیل نجیب قیمت: بارہ روپے
ملنے کا پتہ: وکیل نجیب۔ نجیب منزل۔ لال اسکول، مومن پورہ ناگ پور

"جنگل کی امانت" فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی (حکومت اترپردیش) لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اور اردو ادب میں بچوں کی سبق آموز کہانیوں کا جو فقدان ہے اس کے پُر کرنے میں ایک اہم کڑی کا کام کرتی ہے۔

ہلکی پھلکی اور آسان زبان میں شیخ چلی کے نکھٹو کردار کے توسط سے، بچوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً بچوں کو متاثر کرے گا اور انھیں بہتر شہری بنانے میں معاون ہوگا۔

سرورق جاذب نظر، کتابت طباعت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔ امید ہے کہ بچوں میں یہ کتاب کافی مقبول ہوگی۔

——— دیاشنکر



اترپردیش کے نئے وزیر اعلا سٹری ملائم سنگھ یادو

عنوانات

جلد ۴۴ نمبر ۹

دسمبر ۱۹۸۹ء

(مینیجنگ) ایڈیٹر: شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون: ۴۳۰۵۹
۴۷۱۰۸

پبلشر: اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
زرِ سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن وپبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، یو۔پی۔ لکھنؤ

خط وکتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن وپبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ

اپنی بات

اترپردیش کے نئے وزیراعلا شری ملائم سنگھ یادو، سماجی نابرابری، ناانصافی، استحصال اور اقوام و قبائل درج فہرست نیز پسماندہ طبقوں کے مسائل کے سلسلے میں ابتدائی عمر سے ہی حساس رہے ہیں۔ کسانوں، مزدوروں، نوجوانوں، طلبا، اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے مفادات کے تحفظ اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے وہ گزشتہ تقریباً ۳۵ برسوں سے سرگرم عمل اور فعال ہیں۔ ان کا تعلق ایک کسان گھرانے سے ہے جہاں ان کی پیدائش ۲۱ر نومبر ۱۹۳۹ء کو موضع سیفئی ضلع اٹاوہ میں ہوئی۔ چنانچہ ان کی شخصیت میں مواضعات کی سادگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی شخصیت عوام، خاص طور سے دیہی عوام کی حقیقی معنوں میں نمائندگی کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کی دولت بھی انھیں حاصل ہے۔ وہ آگرہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے، بی۔ ٹی ہیں اور کرہل (مین پوری) کے جین انٹر کالج میں لکچرر بھی رہ چکے ہیں۔

شری یادو معروف سوشلسٹ رہنما ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور آنجہانی وزیراعظم چودھری چرن سنگھ کے نظریات سے متاثر رہے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں جب وہ محض ۱۵ سال کے تھے، ڈاکٹر لوہیا کی ایما پر انھوں نے "نہر ریٹ" تحریک میں حصہ لیا اور پہلی مرتبہ جیل گئے۔ اس کے بعد مختلف تحریکوں میں حصہ لینے کی پاداش میں وہ نو مرتبہ جیل گئے اور اس طرح تین سال سے زیادہ کا عرصہ انھوں نے جیلوں میں گزارا۔ ایمرجنسی کے دوران وہ ۱۹ ماہ جیل میں رہے۔

سال ۶۲-۱۹۶۱ء میں وہ اٹاوہ ڈگری کالج میں طلبا کی یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں وہ پہلی بار سنیکت سوشلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر جسونت نگر اٹاوہ سے اترپردیش اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔ اس وقت وہ اسمبلی کے سب سے کم عمر رکن تھے۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ء میں بھارتیہ کرانتی دل کے ٹکٹ پر اور ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کے ٹکٹ پر وہ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۲ء میں اترپردیش قانون ساز کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ کونسل میں وہ حزب مخالف کے لیڈر بھی منتخب ہوئے۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں وہ چوتھی بار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسمبلی میں بھی وہ حزب مخالف کے لیڈر رہے۔ اس طرح انھیں اترپردیش کے دونوں قانون ساز ایوانوں میں حزب مخالف لیڈر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حالیہ انتخابات میں بھی وہ جسونت نگر (اٹاوہ) سے اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں وہ جنتا حکومت میں وزیر امداد باہمی و افزائش مویشیان ہوئے۔ ان کے دور وزارت میں ریاست میں پہلی بار امداد باہمی اداروں میں ہر سطح پر اقوام درج فہرست کے لیے ریزرویشن کو یقینی بنایا گیا اور امداد باہمی قرضوں پر سود کی شرح کم کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا گیا۔

اس طرح شری یادو کو پارلیمانی و انتظامی امور اور وزارت سے متعلق کاموں کا خاصہ تجربہ ہے۔ جہاں تک ان کی خصوصی دلچسپی کا تعلق ہے، زرعی اور تعلیمی امور سے انھیں خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ وہ متعدد تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کمیٹیوں سے بھی وابستہ رہے ہیں۔

۵ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو اپنے عہدے کا حلف لینے کے بعد وزیراعلا شری ملائم سنگھ یادو نے اپنی کابینہ کے پہلے جلسہ میں بعض بڑے اہم فیصلے کیے۔ ان فیصلوں کے مطابق یہ احکامات جاری کر دیے گئے ہیں کہ کسانوں، بنکروں، بے زمین مزدوروں اور دستکاروں سے دس ہزار روپے تک کے قرضوں کی وصولی فوراً روک دی جائے۔ اس کے علاوہ بیوہ خواتین اور ضعیف العمر افراد کی پنشن ساٹھ روپے ماہانہ سے بڑھا کر سو روپے ماہانہ کر دی گئی ہے یہ اضافہ یکم جنوری ۱۹۹۰ء سے ہوگا۔ وزیراعلا نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ ضلع انتظامیہ کو زیادہ موثر اور مستعد بنایا جائے گا۔ ضلع میں امن و قانون کی صورت حال اور فسادات کے لیے وہی ذمہ دار ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ بدعنوانی اور ناکارکردگی کو قطعی برداشت نہیں کیا جائے گا اور گرانی، بے روزگاری اور کسانوں سے متعلق مسائل ترجیحی بنیادوں پر ایک مقررہ مدت کے اندر حل کیے جائیں گے۔

——— شین قاف

رام لعل
شانتی نکیتن، ڈی۔ ۲۲۹، اندرا نگر لکھنؤ

ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے

سوال ہوا، تم کون ہو؟

جواب ملا، مجھے نہیں معلوم۔

پھر پوچھا گیا، تم آئے کہاں سے ہو؟

بتا دیا گیا، یہ بھی نہیں معلوم۔

اچھا یہ تو بتا دو، تم جاؤ گے کہاں؟

معلوم ہوتا تو بتا نہ دیتا!

تب تو ہماری تمھاری دوستی پکّی۔ بڑھاؤ ہاتھ! میں بھی اسی الجھن میں گرفتار ہوں۔

یہ مکالمہ دو تخلیق کاروں کے درمیان کب ہوا تھا، ابھی تک تحقیق طلب ہے۔ لیکن اس دنیا میں جو بھی تخلیق کار آیا ہے، اُس نے چاہے الفاظ کا سہارا لیا یا رنگوں یا مختلف جسمانی اعضا۔ آنکھیں، ہاتھ، ہونٹ، سر، پاؤں وغیرہ کی حرکات کو وسیلۂ اظہار بنایا، اُس نے یہی محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے عظیم فن کار کی تیز نظروں کے سامنے اپنے کام میں مصروف ہے۔ اور وہ اُس کے وجود سے کسی بھی لمحہ بے خبر نہیں رہتا۔ لیکن وہ اُسے بسا اوقات 'چیلنج' ضرور کرتا رہتا ہے۔

بطور کہانی کار میں اس بات کا بلا جھجک اعتراف کر سکتا ہوں کہ کوئی بھی پیش رو کہانی اُس کے لیے رہنما اصول نہیں مہیا کرتی ہے۔ اُسے صرف ہمسفری کا احساس دلاتی ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت موجود ہے۔ خدا اس کائنات کو تخلیق کر لینے کے بعد کس حد تک مطمئن یا مضطرب رہا اس کا حال تو اسی کو معلوم ہوگا لیکن اس کے جس بندے نے اپنی تخلیقی اُرج (URGE) سے کام لینا شروع کیا وہ اُس کی اندرونی بے چینی کی غمازی کرتی ہے۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے میری بے چینی ہی راستہ دکھاتی ہے قلم اٹھانے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ لیکن قلم میرے ہاتھ میں ہوتا ہے اور میں کبھی کبھی ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا۔ وہ بھی ایک طرح کی تخلیقی بے چینی ہی ہوتی ہے۔

کچھ بھی لکھنے کی خواہش میری اندرونی بے چینی سے ایک فرار محض ہرگز نہیں ہے۔ اِسے دراصل ایک کرب کو دریافت کرنے کا عمل ہی کہا جانا چاہیے۔ جذباتی سطح پر باہر نکل آنے کا ایک عمل!

کوئی بات صاف صاف کہہ دینا۔ سیدھے اور سادہ الفاظ میں۔ اچھا لگتا ہے۔ لیکن یہ اُس کا پہلے سے طے شدہ ایک میکانکی طریقۂ کار نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق اسی بات سے ہوتا ہے اور اسی لمحے سے بھی ہوتا ہے جب اُس کی بیقراری ایک 'امیج'۔ کوئی ایک شکل اختیار کر کے پھوٹتی ہے۔ 'تم جو کچھ دیکھتے ہو، اُسے بیان کر دیتے ہو' والی بات اس میں نہیں ہوتی۔ بلکہ تم جو کچھ دیکھتے ہو، اسے پہلے شدت سے محسوس کرتے ہو، اُس کے بعد ایک پیکر تراشتے ہو۔ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کوئی پیکر بالکل سامنے کا ہوتا ہے، جیسا ہوتا ہے ویسی ہی گفتگو بھی کرتا ہے۔ یہاں گفتگو کی اہمیت گھٹ جاتی ہے۔ تخلیق کار اس کی گفتگو سے، بلکہ طرزِ گفتگو سے بھی خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہر پیکر ایک سا نہیں ہوتا۔ جیسے ہر انسان ایک سا نہیں ہوتا ہے۔

اُلجھی اُلجھی باتیں کرنے والے، برہمی کا اظہار کرنے والے اور اشاروں و کنایوں میں کچھ کہنے والے شخص کے ساتھ بھی ہم ایک قربت محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ دیکھنے میں ہمارے آپ جیسا ہی ہوتا ہے۔ اُسے جاننے اور سمجھنے کی خواہش میرے اندر ایک جبلت کیوں بن جاتی ہے میں اپنی مجبوری کا تجزیہ کرنے کے بجائے اُسے قابلِ مطالعہ بنانے پر زیادہ زور دوں گا۔ اس لیے کہ میرے لیے یہی بڑا مسئلہ ہے۔

میری ایک کہانی ہے۔ 'دوزخ سے واپسی'۔ ایک آدمی نیند میں چلتے چلتے ایک ایسے خطے میں پہنچ جاتا ہے جہاں آگ ہی آگ ہے۔ وہ گھبرا کر لوٹ آتا ہے تو اُسے اپنے مکان میں اپنا کوئی نہیں ملتا۔ اُن کے بارے میں وہ نئے مکینوں سے سوال کرتا ہے۔ نئے مکین اُس کی زبان نہیں سمجھتے۔ جو زبان وہ بولتے ہیں اُسے وہ نہیں سمجھ سکتا۔ اُسے احساس ہوتا ہے، اگرچہ اُسے اپنے گھر سے گئے ہوئے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے لیکن یہ مختصر سا عرصہ صدیوں سے بھی طویل ہو چکا ہے۔

میں اس مختصر ترین کہانی کو پھیلا کر لکھنے کی کوشش کرتا تو شاید اس کا سپاٹ بیان اس کے استعاراتی حُسن کو فنا کر دیتا۔ دوزخ، نیند میں سفر اور انسانوں کی بدلی ہوئی زبان اس کہانی کے بنیادی استعارے ہیں انھیں میں نے شعوری طور پر استعمال نہیں کیا۔ بلکہ یہ بجائے خود اس قسم کے اظہار کا ایک فطری تقاضا بن گئے۔ لیکن میرا اپنا فطری اظہار استعاراتی یا علامتی نہیں ہے۔ میں اپنی بات کو سرل اور سادہ ڈھنگ سے کہنے میں یقین رکھتا ہوں لیکن کوئی کوئی کہانی میری گرفت میں سے اچانک نکل کر خود اپنے آپ کو خلق کر لیتی ہے۔ آورد کے اِس پہلو کی ماہیت سے میں انکار نہیں کر سکتا، بھلے ہی میں اس کا قائل ہونے کا اِقرار نہ کروں۔

میری ایک اور کہانی 'چاپ' کے مرکزی کردار دکاس کا اپنے روپ ہمزاد کے ساتھ ایک مختصر سا مکالمہ ہوتا ہے اور اُسی کے کہنے پر وہ اپنے مکان میں دبا ہوا خزانہ کھود نکالنے کے لیے ایک بہت بڑا گڑھا بنا لیتا ہے جس میں اُس کا سارا وجود چھپ جاتا ہے۔ وہ مدفون خزانے کو پا لینے میں تو کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس دوران وہ بھوک پیاس کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ خزانے کا برتن اُٹھا کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ جن رشتوں ناطوں کو نظر انداز کر کے اُس نے یہ دولت حاصل کی تھی اُسے وہ لوگ اس کے ہاتھوں سے چھین لیتے ہیں اور اُسے اُسی گڈھے کے اندر دفن کر دیتے ہیں۔

اس طویل کہانی کو لکھنے کے لیے میں نے بیانیہ اور استعارے کو ملا کر ایک تجربہ کیا تھا۔ جب اِسے لکھنا شروع کیا تو یہ میرے لیے ایک جدید قصہ سنانے کا شعوری عمل تھا لیکن میں جوں جوں کہانی کے اختتام کی طرف بڑھنے لگا تو کہانی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ اور ایک طاقتور استعارہ بن کر مجھے خود بھی حیرت زدہ کر گئی۔ نہ صرف حیرت زدہ بلکہ اس نے مجھے ایک ایسی بے قراری میں بھی مبتلا کر دیا جس کی کسی ایک سطح پر اطمینان کا بھی ایک ٹھہراؤ یقیناً موجود تھا۔ تخلیقی عمل کے اس دھارے کے ساتھ ساتھ میں نے خود کو کئی بار بہتا ہوا محسوس کیا ہے۔ اگر یوں کہوں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ میں اس دریا میں کئی بار ڈوبا اور اُبھرا ہوں۔

علامت یا استعارے کا استعمال افسانے میں شعوری طور پر کرنا اکثر و بیشتر غلط ہوتا ہے۔ ایسا کرنے سے افسانہ بے اثر ہی نہیں ہو کر رہ جاتا بلکہ اس کو ایک چٹان کے ساتھ ٹکرا کر بالکل پاش پاش کر دینے کا مرادف بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

لکھنے والا اپنے تخلیقی عمل میں جتنا آزاد ہوتا ہے اُتنا ہی پابند بھی۔ وہ اپنی طویل ترین تحریر میں وسیع تر پیش منظر کو ایک ایسے نکتے پر سمیٹ دیتا ہے جو بیتے ہوئے کل کا ایک نشانِ محض بن کر رہ جاتی ہے لیکن ظاہر ہے اُس نشانِ محض کی حیثیت و اہمیت مینارۂ نور یا ٹاور آف لائیٹ کی سی ہوتی ہے۔ یا اُسے کسی پرانی قبر جسے وقت نے مٹا کر رکھ دیا ہو لیکن اُس پر لگا ہوا پتھر ابھی تک قائم ہو۔ سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ وہی تخلیق کار جب کسرِ نفسی سے کام لیکر محض اِشاراتی ضبط سے کام لیتا ہے تو اُس اختصار میں بھی پوری زندگی اپنی وسعت کے ساتھ جھانکتی ہوئی نظر آ جاتی ہے۔

تقریباً بیس سال پہلے جب میں نے اپنی ایک طویل کہانی "اکھڑے ہوئے لوگ" لکھی تو میرے ذہن میں زمین کے ساتھ جذباتی وابستگی کا خیال موجود تھا اور یہ تصور بھی کہ دو نسلوں کا زمین کے بارے میں ایک سا رشتہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کہانی میں زمین ایک علامت تو ہے لیکن اُس سے کہیں زیادہ طاقتور وہ رویہ ہے جو نسلوں کے درمیان

(باقی صفحہ ۲ پر)

صغیر احسنی

۷۰ - پیرزادگان - مظفر نگر

"نورس"

"نورس" ۹ رباعیات کا مجموعہ ہے مگر
بہ لحاظ موضوع ایک مسلسل نظم ہے
(ص-۱)

اے خود سر و خود فرامش و نافرماں
کیا تجھ کو کہوں اور ، وطن کے انساں
تھا تیرے پنپنے کا زمانہ امروز
لیکن ہے ترے سر میں جنوں کا ساماں

تجھ کو بدِ فطرت نے بنایا انساں
کردار سے اپنے ہی بنا ہے حیواں
تجھ میں ہیں نہاں فہم و فراست کے نشاں
کر فکر و نظر سے خیر و شر کا عرفاں

خالق سے کیا تھا جو وفا کا پیماں
وہ تو نے کیا زینتِ طاقِ نسیاں
مسجودِ ملائک کا پاکر تو شرف
افسوس بنا ہے آج ابنِ شیطاں

تو دھر کر کان سن نہ درسِ شیطاں
بھرپور رہے حسنِ عمل سے داماں
پیوستِ رگِ جاں کر لے سوز و گداز
اخلاص و محبت ہیں خلقِ انساں

نفرت کا زمانے سے مٹا نام و نشاں
کھل جائے اخوت کا گلزار یہاں
ہو جامِ دل "پریم رس" کا ساگر
ہوں خشک عداوت کے دریائے رواں

ہر مذہب ہر دھرم کا یہ ہے فرماں!
مل جل کر پیار سے رہیں سب انساں
رکھتا ہے عناد جو وہی ہے شیطاں
اس کا کچھ دھرم ہے نہ اس کا ایماں

یعنی ہے آشتی بنائے انساں
یہ گر ہے حقیقت کر اپنا عرفاں
اے مذہب دھرم کے علمبردارو!
اٹھو کہ بڑھا ہے نفرتوں کا طوفاں

ہر سمت محبت کی نظر اے انساں!
مخلوق کا پیار ہے خدا کا فرماں
کینہ نہ سینۂ شفاف میں رکھ
ناداں ہے یہی آتشِ دوزخ کا دھواں

اب بھی نہ بنے اگر دو قالب یک جاں
سمجھو اے نادانو! صوتِ یزداں
مذہب تو رہیں گے سب ، فتنہ کارو!
لے جائے گا تم کو ہی بہاکر طوفاں

اقبال مجید
(پروڈیوسر)
آکاشوانی۔ لکھنؤ

ریڈیو ڈاکومنٹری فیچر

کاش اخبار جھوٹ بولتے ہوں!

(موسیقی)

ڈاکٹر نارنگ: ڈاکٹر سلمہ۔ مریض کا نام؟

سلمہ: محمد شکیب۔

ڈاکٹر نارنگ: عمر؟

سلمہ: بتیس سال۔

ڈاکٹر نارنگ: تعلیم؟

سلمہ: ایم فل اور جرنلزم میں ڈپلوما۔

ڈاکٹر نارنگ: ڈاکٹر سلمہ! ہمیں ان گنت بار مسٹر شکیب کو انٹرویو کرنا ہوگا اس کے علاوہ مریض کی پوری کیس ہسٹری سمجھنے میں بار بار آپ کو ہماری مدد کرنا ہوگی ــ یہ آپ کے منگیتر تھے؟

سلمہ: ـ جی ہاں۔ گیس حادثے کے بعد دھیرے دھیرے ان کی دماغی حالت بگڑنے لگی۔ سارا سارا دن پتھر بنے بیٹھے رہتے۔ پھر انھوں نے پرانے اخبار پڑھنا شروع کر دیئے۔ پچاس پچاس بار پڑھتے ہیں ایک ایک اخبار کو۔ پھر اخبارات سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ پر اب، اب تو ڈاکٹر صاحب ایسا لگتا ہے جیسے شکیب اخباروں سے نہیں بلکہ اخبار شکیب سے باتیں کرتے ہیں۔

شکیب: (کچھ فاصلے سے) سلمہ! تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟ ادھر آؤ۔

سلمہ: ابھی آئی شکیب۔

نارنگ: چلئے مسٹر شکیب کے بیڈ پر چلتے ہیں۔ (قدم بڑھتے ہیں)

"تو آپ ہیں مسٹر شکیب!"

شکیب: آپ کی تعریف؟

نارنگ: مجھے ڈاکٹر نارنگ کہتے ہیں ــ ہم نے سنا ہے کہ اخبار آپ سے باتیں کرتے ہیں؟

شکیب: ٹھیک ہی سنا ہے ڈاکٹر۔ دنیا کے ہر ہوشمند انسان سے اخبار باتیں کرتا ہے۔ کیا پریس آپ سے باتیں نہیں کرتا ــ؟

نارنگ: پریس؟

شکیب: ہاں پریس! انسان کی بے بسی کے ہر ڈرامے کا بے جین تماشائی دنیا کا پریس ہی تو ہے۔ ڈاکٹر نارنگ! ہم لکھتے ہیں پریس چھاپتا ہے۔ پریس چھاپتا ہے ہم پڑھتے ہیں۔ ہم پڑھتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں۔ ہمارا کام پڑھتے رہنا ہے اور لکھتے رہنا ہے۔ اور ڈاکٹر! ہم نے لکھا۔ یقین کیجئے ہم نے لکھا۔

نارنگ: کیا لکھا آپ نے شکیب صاحب؟ ہمیں نہیں بتائیں گے۔

شکیب: ہم نے لکھا ــ

(موسیقی کی ایک تیز لہر ابھرتی ہے اور ڈوب جاتی ہے)

آواز: ۱۲ ستمبر ۱۹۲۱ء

(ان لفظوں میں گونج پیدا ہوتی ہے اور بکھر جاتی ہے پھر مغربی انداز کی موسیقی پس منظر میں ابھرتی ہے۔)

آواز : یہ مغربی جرمنی کے شہر اُپاؤ کا ایک کیمیائی کارخانہ ہے۔

(پر اسرار موسیقی ابھرتی ہے اور ڈوبتی ہے)

آواز: کارخانے کے تہ خانے میں ایک بھیانک دھماکہ ہوتا ہے اور پانچ سو اکسٹھ کامگاروں کو موت نوچ کر پھینک دیتی ہے۔

(پریس کی مشینوں کی آواز فیڈ آن ہوتی ہے)

شکیب : آزاد دنیا کے آزاد اخبار۔ جس طرح ڈاکٹر تمھارا کام نبض دیکھتے رہنا ہے۔ بس اسی طرح ہمارا کام لکھتے رہنا ہے۔ اور ہم نے لکھا ——

آواز نمبر ۲ : ۲۶ر اپریل ۱۹۴۲ء

(لفظوں میں گونج پیدا ہوتی ہے اور بکھر جاتی ہے اسی کے ساتھ چینی طرز کی موسیقی ——)

آواز نمبر ۲ : چین میں کوئلے کی ایک کھدان —— نام ہن کائکو کولری

(HON KEIKO COLLIERY)

(ایک دھماکے کی آواز)

آواز نمبر ۲ : بس ایک دھماکہ اور کھدان کے ایک ہزار پانچ سو بہتر مزدور لاشوں میں بدل گئے۔

(پریس کی مشینوں کی آواز پھر اُبھرتی ہے)

شکیب : ہمارا کام لکھتے رہنا ہے اور ہم نے پھر لکھا —— یقین کرو ڈاکٹر ہم نے پھر لکھا۔

آواز نمبر ۳ : ۸ر اگست ۱۹۵۶ء

(لفظوں میں گونج پیدا ہوتی ہے)

آواز نمبر ۳ : کیلی کولمبیا (CALI COLAMBIA) میں ڈائنامائٹ سے لدے کئی ٹرکوں نے آگ پکڑ لی اور ایک ہزار ایک سو لوگ جل کر راکھ ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹ر نومبر ۱۹۸۴ء کا منحوس دن۔ میکسیکو میں ساٹھ ہزار بیرل نیچرل گیس دھماکے سے اڑ گئی۔ ایسی آگ پھیلی کہ اکتیس ہزار بے گھر، چار ہزار زخمی اور ۴۵۲ لوگ موت کے گھاٹ اُتر گئے۔

(موسیقی۔ پھر (Change Over)

ڈاکٹر نارنگ : تو مسٹر شکیب۔ آپ کا خیال ہے کہ آپ خود ایک اخبار ہیں۔!

شکیب : جی ہاں! روز پیدا ہوتا ہوں اور روز مرتا ہوں۔ اخبار کی طرح۔

ڈاکٹر نارنگ: آپ کو اپنی دوست ڈاکٹر سلمہ کا خیال نہیں۔ وہ کتنا پریشان ہیں آپ کی وجہ سے۔

شکیب : کون ڈاکٹر سلمہ؟ اچھا آپ کا مطلب میری سلمہ سے ہے۔ یہ تو مجھے بہت پیار کرتی ہے ڈاکٹر صاحب!

نارنگ : لیکن آپ کو تو اخباروں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

شکیب : کیا کروں۔ ابھی بھی کتنا کچھ لکھنا ہے۔

نارنگ : مگر یہ آپ کس کے لیے لکھتے ہیں۔

شکیب: میں —— میں تو اپنی سلمہ کے لیے لکھتا ہوں۔

نارنگ : سلمہ کے لیے۔؟!

شکیب : ہاں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جو بھی لکھا جا رہا ہے وہ ہماری سلمہ کے لیے لکھا جا رہا ہے اس کے چہرے کے گلابوں کے لیے۔ اس کی آنکھوں کے چراغوں کے لیے اور اس کی سانسوں کی خوشبوؤں کے لیے ہی تو لکھتے ہیں ہم سب —— ٹھیک ہے نا سلمہ۔

نارنگ: اور کیا لکھا ہے آپ نے؟

شکیب : بہت کچھ لکھا ہے ہم نے

نارنگ: ہمیں بھی بتائیے نا۔؟

شکیب : ۳ر دسمبر ۱۹۸۴ء کی ایک بھیانک رات بھی لکھی ہے۔

(FADE IN SUSPENSE MUSIC)

۳ر دسمبر—— مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال۔ کہرے کی چادر اوڑھے شہر کی خوبصورت پہاڑیاں۔ پہاڑیوں پر ٹھٹھرتی روشنیوں کی جھلملاہٹ —— آدھی رات گزر چکی ہے، ہوائیں چپ ہیں۔ تب ہی شہر کے کنارے یونین کاربائیڈ کی فیکٹری کی اونچی چمنی سے دودھیا رنگ کے بادل نکلتے ہیں اور کہرے کی موٹی چادر کے نیچے ساکت ہواؤں کے کندھوں پر ٹک جاتے ہیں۔! موت، ویرانی اور بربادی کے زہریلے بادل —— لیکن

ہوائیں بھی اس زہر کو نہ سہہ سکیں اور گھبرا کر آسمان کی بلندیوں سے نیچے بھاگ پڑیں ـــــ نیچے ـــــ سوئے ہوئے شہر کے گلیاروں میں، ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں ٹاٹ سے لپٹی ہوئی جھگیوں میں ۔ جانوروں کے باڑوں میں اور دیکھتے ہی دیکھتے آدھے سے زیادہ شہر گیس چیمبر میں بدل گیا ! چھولا روڈ کی ایک جھگی میں رہنے والا وہ غریب منگتا رام

ـــــ وہ منگتا رام ۔

ڈاکٹر نارنگ : بولیے مسٹر شکیب کیا ہوا منگتا رام کو ۔

(شکیب چپ ہے) موسیقی

نارنگ : بولیے ۔

(شکیب چپ) موسیقی

نارنگ: میری طرف دیکھیے مسٹر شکیب ۔ !

سلمہ : نہیں دیکھیں گے اب یہ کسی طرف ۔ اب دیر تک یونہی ساکت بیٹھے رہیں گے یہ ۔ بس اسی طرح دورہ پڑتا ہے کبھی کبھی تو سارے دن کے لیے پتھر سے ہو جاتے ہیں ۔

نارنگ ، کیپ کوائٹ ڈاکٹر سلمہ ـــــ منگتا رام ۔ ہم لوگ ادھر ہیں منگتا رام ۔ منگتا رام آیا ہے مسٹر شکیب !

سلمہ ، کوئی بھی تو نہیں ڈاکٹر نارنگ ۔

نارنگ ، فار گاڈ سیک اپ ۔ مجھے اکزامن کرنے دیجیے ۔ مسٹر شکیب منگتا رام آپ سے ملنا چاہتا ہے ۔ کہتا ہے کہ اس کے بچوں کے گالوں کے گلاب آنکھوں کے چراغ اور سانسوں کی خوشبو آپ کے پاس ہے ۔ یہ آ رہا ہے منگتا رام ۔

شکیب ، منگتا رام ۔

سلمہ ، ڈاکٹر نارنگ، شکیب بول رہے ہیں ۔

نارنگ : آئی سے ڈونٹ ڈسٹرب! (I say dont disturb) ہاں شکیب صاحب بتائیے ۔ کیا ہوا منگتا رام کو ۔

شکیب ، کہاں ہو، منگتا رام تم ـــ ؟ منگتا رام ۔ ! دنیا کی صنعتی دلدل میں اٹھ کر پھوٹ جانے والا ایک معمولی بلبلہ ۔

چھ دسمبر ۱۹۸۴ء کے اخباروں میں کیا کہا تھا تم نے ؟

بتاؤ نا ڈاکٹر صاحب کو ۔ گھبراؤ نہیں منگتا رام ۔ یہ تو ہماری سلمہ کے دوست ہیں ۔

(موسیقی کے ساتھ ۔ Change over)

منگتا رام : میں ہی ابھاگا منگتا رام ہوں ـــــ صاحب ! ڈیڑھ بجے تھے رات کے ۔ پہلے گھر والی جاگی ـــــ چلائی ۔ میں سویا پڑا تھا ۔ زور سے میرے کو جھکورا اس نے ـــــ بولی کچھ گڑبڑ ہے ۔ میرے دو بچے صاحب ۔ ایک دو سال کا، ایک چار سال کا ـــ میں اٹھا صاحب ۔ اٹھا میں اور دروازہ کھولا ۔ بیچھے سڑک پر بھاگ رہے تھے لوگ باگ ـــ تب میری کوٹھری میں دھواں دھواں سا آ گیا ـــ میری سانس رکی ـــ بہت کھانسی چلی ۔ آنکھوں میں مرچا بھر گیا تھا ۔

سب بھاگ رہے تھے صاحب ـــ جب بے ہوش گھر والی کو اپن نے ایک لاری پر لادا تو سوچا بچوں کو بھی لانا ہے لاری چل دی ۔ میں اتر نہیں پایا ۔ کچھ پتہ نہیں کاہے کو نہیں اتر پایا ـــــ گھر والی عبیداللہ گنج کے راستے میں مر گئی ۔ گھر آیا تو بچے بھی نہیں تھے ۔ چھولا کے نیچے میدان میں گاڑ دیے گئے تھے ۔ سیکڑوں بچے گاڑ دیے گئے صاحب سیکڑوں بچے ۔

(منگتا رام رو پڑتا ہے ۔ موسیقی کی لہر ابھر کر ڈوبتی ہے)

ڈاکٹر نارنگ: کیس (case) بہت پیچیدہ ہے ڈاکٹر سلمہ ۔ ڈیمیج (damage) کافی ہو چکا ہے ۔ لیکن ناامیدی کی کوئی بات نہیں ہے ۔

سلمہ، ڈاکٹر ۔ میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں

نارنگ ، یہ بتائیے کہ کیا یہ کبھی ہوسٹائل (Hostile) بھی ہوتے ہیں ؟

سلمہ: نہیں ۔ کبھی نہیں ۔ مگر ایک بار مجھ سے خودکشی کرنے کی ضد کر رہے تھے ۔ کہہ رہے تھے کہ ہم دونوں کو مر جانا چاہیے ۔

نارنگ: انھیں اسائلم میں آبزرویشن میں رہنا ہوگا یہ تو آپ جانتے ہی
ہیں۔ لیکن جو دھکا انھیں پہنچا ہے اس سے باہر نکالنے کے
لیے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ان کی دوست کی
حیثیت سے بھی آپ کو ہمارے ساتھ کوآپریٹ کرنا ہوگا۔
آئیے میرے ساتھ۔

(دونوں کچھ دور چلتے ہیں۔ تب ہی فاصلے
سے شکیب کی آواز آتی ہے)

شکیب: سلمہ — سلمہ ڈیئر!

سلمہ: (واپس آتے ہوئے) یس شکیب! آئی۔ ایم جسٹ
کمنگ (I am just coming) تم بیٹھو نا

شکیب: احمد خاں!

سلمہ: احمد خاں! — کون احمد خاں؟

شکیب: منگا رام کا پڑوسی

سلمہ: کیا ہوا احمد خاں کو۔؟

شکیب: اپنی بیوی کو تلاش کر رہا ہے۔

ڈاکٹر: مسٹر شکیب۔ آپ آرام کیجیے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔

شکیب: احمد خاں۔ دیکھو ڈاکٹر صاحب جا رہے ہیں۔ ان سے
پتہ کرکے دیکھو نا؟

ڈاکٹر: آپ آرام کیجیے مسٹر شکیب۔

شکیب: تم بولتے کیوں نہیں احمد خاں — سناؤ اپنی کہانی —
بولو احمد خاں۔

(ایک جھنکار)

احمد خاں: (روتی آواز میں) کیا بولوں بابو — کیا بولوں۔
رات میں کسی پہر آنکھ کھلی۔ لگا کہ ہوا میں بدبو ہے!
سڑک پر شور تھا۔

(بیک گراؤنڈ میں بھیڑ کا شور۔ اسکوٹروں،
موٹروں کی آوازیں۔ جانوروں کی آوازیں
وغیرہ فیڈ آن ہوتی ہیں جن پر احمد خاں کا
مکالمہ سوپر امپوز ہوتا ہے —)

احمد خاں: آس پاس کے جانور زور زور سے چلا رہے تھے۔
جیپوں اور اسکوٹروں اور ٹیمپو کی ایک بھیڑ تھی جو بھاگ
رہی تھی۔ میں بھی اس بھیڑ میں اپنی بیوی کے ساتھ بھاگا
دم گھٹا جا رہا تھا۔ بدبودار ہوا ناک اور آنکھوں میں گھس
رہی تھی۔ ایسی بھاگ دوڑ زندگی میں نہیں دیکھی مالک۔
گاڑیاں ہارن بجا رہی تھیں۔ پر نکلنے کو کدھر بھی جگہ نہیں
تھی۔ میرے پیچھے سے ایک جیپ آئی۔ بیسیوں لوگ
بھرے تھے اس جیپ میں۔ اس نے میری عورت کو ٹکر
ماری اور اوپر سے نکل گئی۔ میں غصے سے پاگل ہو گیا۔
اس کو پکڑنے کے لیے پاگلوں کی طرح پیچھے بھاگا۔ میں چیخ
رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ اور پیچھے دوڑ رہا تھا۔
تب ہی مجھے اپنی عورت کا دھیان آیا۔ میں پیچھے کو پلٹا
پیچھے سے آتی بھیڑ کے ریلے کو چیرتا ہوا میں اپنی بیوی تک
پہنچا — پر وہاں بُوٹوں اور پہیوں سے کچلا ہوا خون میں
لتھڑا ہوا ایک جسم پڑا تھا۔ مجھے زور کی اُلٹی آئی —
بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے
بھاگتے ہوئے ایک ٹیمپو کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ جب مجھے
ہوش آیا تو میں جے پرکاش نرائن اسپتال میں پڑا تھا۔
میری عورت کہاں ہے بابو — میری عورت کہاں ہے!

(ایک جھنکار کے ساتھ۔ (Change over)

ڈاکٹر نارنگ: ہم احمد خاں کی عورت کو تلاش کرلیں گے شکیب صاحب
آپ اب آرام کیجیے۔

شکیب: آرام۔ دسمبر کے اس کالے مہینے میں کیا تم نے کچھ نہیں
دیکھا ڈاکٹر۔؟

ڈاکٹر: نہیں — ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔

شکیب: سلمہ۔ کیا انھوں نے شہر کی سڑکوں پر سینکڑوں مویشیوں
کی پھولی ہوئی لاشیں بھی نہیں دیکھیں؟

سلمہ: شکیب۔ پلیز! اب تم لیٹ جاؤ۔

شکیب: ڈاکٹر! تم نے اُبکائیاں لیتے، قے کرتے، جلتی آنکھوں کو

دونوں ہاتھوں سے تھامے ہزاروں لوگ تو دیکھے ہوں گے۔

ڈاکٹر: جی نہیں — میں نے نہیں دیکھے۔

شکیب: ٹرکوں میں بھری لاشیں۔ اسپتالوں کے برآمدوں میں بلکتی ہوئی ماؤں کی گود میں مرے ہوئے بچے تو دیکھے تھے؟

ڈاکٹر: میں نے کچھ نہیں دیکھا مسٹر شکیب۔!

شکیب: بھوپال ریلوے اسٹیشن پر ناچتی ہوئی موت۔ اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ اور میکینک کو بھی مرتے ہوئے نہیں دیکھا تم نے — سرکاری حساب کتاب کے مطابق صرف چھ دسمبر تک مردہ خانوں میں گنے والی لاشیں پانچ سو چوہتر ہو چکی تھیں ڈاکٹر

ڈاکٹر: صرف پانچ سو چوہتر —؟

شکیب: اس لیے کہ بھاگ کر راستوں میں مرنے والوں کو کون گنتا۔ بھاگے — لیکن اوجین اور دیواس میں مر گئے — بھاگتے رہے لیکن جبل پور، اٹارسی اور سیہور میں مر گئے — آشٹہ، راج گڑھ، ساگر اور ودیشہ میں پہنچے اور چوہوں کی طرح مر گئے — آؤ شہر کے تار اور ٹیلی فون گھروں کا منظر دیکھو — وہ آوازیں آج بھی میرے کانوں میں محفوظ ہیں:

(CHANGE OVER)

(ٹیلی گراف سگنل کی آوازیں۔ کاؤنٹر کا شور ابھرتا ہے)

مائک کے قریب (ON THE MIKE)

کاؤنٹر کلرک: آپ لوگ لائن سے آیئے

کسٹمر: ارے صاحب دو گھنٹے سے کھڑے ہیں۔

کلرک: ہم بھی تو کام ہی کر رہے ہیں صاحب۔ جہاں تین ہزار ٹیلی گرام روز ہوتے تھے وہاں سات ہزار ہو رہے ہیں۔

دوسرا کسٹمر: تو اور کاؤنٹر کھلوا لیجئے نا۔

کلرک: ارے صاحب۔ سولہ تو کاؤنٹر کھلے ہیں۔ لیکن جب پورا شہر ٹیلی گرام دینے کھڑا ہو جائے تو ہم بھی کیا کریں گے باہر سے آنے والے ٹیلی گراموں کا ڈھیر لگا ہے۔ کیسے بانٹیں گے اتنے تار۔

کسٹمر: ہم کو دیجئے، ہم بانٹیں گے۔ دوائیں بانٹ رہے ہیں، کھانا بانٹ رہے ہیں۔ تار بھی بانٹیں گے۔

آف دی مائک (OFF THE MIKE)

ایک آواز: ہلو — ہلو کانپور

دوسری آواز: میں بھوپال سے بول رہا ہوں — ہلو حیدرآباد

تیسری آواز: ہلو — ہلو — ہلو

چوتھی آواز: ہم سب خیریت سے ہیں۔ رحمت بھائی — ہلو — ہاں سب ٹھیک ہے۔

پہلی آواز: زور سے بولئے — ہلو 485209

دوسری: ہلو آپریٹر — ابھی بات نہیں ہوئی!

تیسری: ہلو — ہاں — ریکھا بول رہی ہوں۔

(سارے صوتی اثرات فیڈ آوٹ ہو جاتے ہیں)

(وقت آگے بڑھتا ہے)

سلمیٰ: ڈاکٹر! آج شکیب کی خاموشی کا دوسرا دن ہے۔

ڈاکٹر: ہاں۔ شاید ہم انھیں ان کی ضرورت کا لفظ نہیں پہنچا سکے ہیں وہ لفظ جو انھیں بولنے کے لیے مجبور کر دے۔

سلمیٰ: کیسے بتاؤں آپ کو۔ کتنا ویران بنا دیا ہے ان خاموشیوں نے میری زندگی کو۔

ڈاکٹر: ٹیک اٹ ایزی۔ (Take it easy) مس سلمیٰ۔ جاگتے ہوئے دماغ والوں کو کبھی کبھی ان کے اپنے ضمیر کی عدالت ایسی ہی سزا دیتی ہے۔

شکیب: عدالت! عدالت

سلمیٰ: ڈاکٹر نارنگ

شکیب: عدالت — کیا ہم عدالت میں ہیں۔؟

سلمیٰ: عدالت نہیں ہے شکیب۔ تم ڈاکٹر نارنگ کے مطب میں ہو

ڈاکٹر: اوہ پلیز مس سلمیٰ (دھیرے سے) مت ٹوکیے مسٹر شکیب کو ان کی ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کیجیے۔

شکیب: میں نے کہا تھا کہ مظلوموں کا خون رنگ لائے گا۔ ایک دن سب کو کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔

(CHANGE OVER)

ڈاکٹر: اب شکیب صاحب۔ مقدمہ عدالت میں پہنچ چکا ہے اور انصاف یہ جاننا چاہتا ہے کہ آخر اتنا بڑا حادثہ ہوا تو کیسے ہوا۔؟

شکیب: مائی لارڈ —— مجھے کچھ بولنے کی اجازت ہے ؟

ڈاکٹر: کہیے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

شکیب: پوچھیے شہر کے قاتلوں سے کہ ۲/۳ دسمبر کی رات فیکٹری کی ایک ٹنکی جس میں میتھائل آئسوسائنیٹ۔ (Methyl Isocyanate) نام کی تیس ٹن زہریلی گیس بھری ہوئی تھی، کس طرح ایک تڑاکے سے پھٹ پڑی۔ کہتے ہیں کہ اس ٹنکی میں پانی پہنچ جانے سے اس میں ایسی کیمیائی تبدیلیاں ہوئیں، جن سے اندر کا درجۂ حرارت خطرناک طور پر بڑھ گیا اور ساری قاتل گیس فلیئر ٹاور (Flare Tower) سے باہر نکل پڑی۔

ڈاکٹر: عدالت ہر حقیقت سے پردہ اٹھا کر رہے گی مسٹر شکیب۔

شکیب: جج صاحب!

ڈاکٹر: کہیے ——

شکیب: کہتے ہیں کہ جو حفاظتی انتظامات امریکہ کی ویسٹ ورجینیا کی فیکٹری میں برتے جاتے تھے، وہ بھوپال کی فیکٹری میں نہیں برتے گئے۔

ڈاکٹر: اور کیا کہتے ہیں لوگ۔؟

شکیب: کہتے ہیں ۱۹۸۳ء کے بعد فیکٹری کے اخراجات میں بھاری کٹوتی کی گئی جس کی وجہ سے بہت سے حفاظتی انتظامات بند کر دیے گئے۔

ڈاکٹر: اور ——

شکیب: سوال ایک یہ بھی ہے مائی لارڈ کہ اتنی بڑی مقدار میں اس قدر خطرناک اور زہریلی گیس کو فیکٹری میں لگاتار جمع کرتے رہنا بہت ضروری تھا — کیا اس مقدار کو کم نہیں کیا جا سکتا تھا؟

ڈاکٹر: اور کچھ ——

شکیب: کیا یہ درست ہے کہ باہر نکلنے والی زہریلی گیس کو بے اثر کرنے والے آلات اس لیے چالو حالت میں نہیں رکھے گئے کہ ان پر خرچ ہونے والی بجلی کے پیسے بچائے جا سکیں۔

ڈاکٹر: غالباً آپ کے الزامات کی فہرست ابھی ختم نہیں ہوئی ہوگی۔

شکیب: مائی لارڈ —— کیا اخباروں کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ایم۔ آئی۔ سی جیسی خطرناک گیس کو ٹھنڈے ٹینکوں میں رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ ان ٹینکوں میں درجۂ حرارت کا بڑھ جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ لیکن بھوپال کی فیکٹری میں ایم۔ آئی۔ سی کے ریفریجریشن کے نظام کو بند کر کے پچاس ڈالر روز کا خرچ بچایا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر: اور کیا کہہ رہے ہیں آپ کے اخبار —— عدالت یہ جاننا چاہتی ہے۔

شکیب: ایک اخباری رپورٹ کا تو یہاں تک کہنا ہے مائی لارڈ کہ فیکٹری کے بیٹری ڈویژن اور کیمیکل ڈویژن میں ایک آپسی لڑائی ۱۹۷۰ء سے جاری تھی۔ اس لڑائی میں بیٹری ڈویژن کے لوگوں کا پلّہ بھاری رہا، اور انھوں نے کیمیکل ڈویژن کے لوگوں کو نکال کر اپنے آدمی بھرنا شروع کر دیے اور یہ بھی نہ سوچا کہ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر: مسٹر شکیب۔ اخباروں میں چھپنے والی ہر خبر صحیح ہی ہوتی ہے عدالت اُسے نہیں مانتی، وہ بغیر ثبوت کے کچھ نہیں مانتی —— !

شکیب: جج صاحب! کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ اصل تباہی ایم۔ آئی۔ سی کے کیمیائی مرکب میں کسی ایسی نئی تبدیلی کی وجہ سے ہوئی ہے جو پہلے کبھی نہیں کی گئی ——

ڈاکٹر: آپ کا مطلب۔؟

شکیب: مطلب یہ کہ کچھ کیمیائی ماہرین کا خیال ہے کہ اگر یہ گیس صرف ایم۔ آئی۔ سی ہوتی تو اتنی تباہی نہ ہوتی!

ڈاکٹر: تو پھر کیا تھی یہ گیس؟

شکیب: مرنے والوں کے جسم میں کسی زرد مادّے کا پایا جانا اُن کے

خیال میں اس بات کا سُراغ دیتا ہے کہ اس میں فاس جین جیسی خطرناک گیس بھی موجود تھی ورنہ پھیپھڑے اتنے متاثر نہ ہوتے۔

(عدالت میں ہلکا سا شور اُبھرتا ہے)

ڈاکٹر: آرڈر آرڈر ـــــ

شکیب: اس طرح فاس جین اور ایم آئی سی کا ایک نیا مرکب تیار کیے جانے کا تجربہ کیا گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اس طرح کے نئے مرکب سے تیار کیے جانے والی دوا کی لاگت میں کمی ہوتی ہے کہ نہیں۔ لیکن نئے کیمیائی مرکب میں ٹنکی کے اندر دو گیسوں کے غلط تناسب سے حرارت کا دباؤ ایکا ایک بڑھ گیا اور ٹنکی سے موت کے بادل پھوٹ پڑے ـــ

(عدالت کا شور پھر اُبھرتا ہے)

ڈاکٹر: آرڈر آرڈر۔ تم ڈیفنس کے وکیل کی حیثیت سے بولو بولو نہ سلمہ!

سلمہ: یہ سب جھوٹ ہے مائی لارڈ۔ وکیل صاحب الزام پر الزام لگا رہے ہیں۔ عدالت اس طرح کی جھوٹی، بے بنیاد اور من گھڑت باتوں پر وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں بیٹھتی ہے۔

ڈاکٹر: دنیا کی ہر انتظامیہ اور ہر عدالت کا کام ہے تو بس اتنا کہ انسان کے ضمیر کو بیدار کر کے اس کی کھوئی ہوئی جنتیں اسے لوٹا دے۔ تمام فسادات ایک دن کسی فیصلے کی جانب لوٹتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہر فیصلہ ایک دن کسی نئے فساد کو جنم دیتا ہے۔ انسان کو یہ لڑائی لڑتے ہی رہنا ہے ـــ عدالت آج کے لیے برخاست ہوتی ہے۔

(عدالت کا ہلکا سا شور)

سلمہ: آج (observation) کا پانچواں دن ہے ڈاکٹر۔ کیا آپ کو شکیب میں کچھ IMPROVEMENT لگتا ہے۔؟

ڈاکٹر: کل کا دن پرسکون گزرا ہے۔ صرف شام کو نرس پر برس پڑے تھے۔

سلمہ: کیوں۔ کیا کہہ رہے تھے۔؟

ڈاکٹر: کہہ رہے تھے۔ نرس! تم گنی پگ ہو۔ صنعتی تجربوں کے کام میں لائی جانے والی تیسری دنیا کی بے بس چوہیا ہو تم۔ میں نے کہا وہ نرس آپ کی خدمت کے لیے ہے۔ آپ اس کو ایسا مت کہیے۔ تو انھیں برطانیہ میں ASBESTOS بنانے والا کوئی کروڑپتی یاد آ گیا۔

سلمہ: کیوں۔؟

ڈاکٹر: کہنے لگے۔ اس کی فیکٹری میں اگر کامگاروں کو Asbestosis نام کی خطرناک بیماری ہو جاتی ہے تو اس میں مرنے والوں کو لاکھوں ڈالر کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں تو ۳۳ فی صدی مزدور Asbes-tosis کا شکار ہو جاتے ہیں، تو کیا کمپنیاں ان کے لیے بھی وہی کچھ کرتی ہیں جو وہ اپنے ملکوں میں کرتی ہیں۔؟

سلمہ: کمپنیوں کے ڈبل اسٹنڈرڈ کی بات شکیب اکثر کرتے ہیں ڈاکٹر۔

(دور کچھ شور ہو جاتا ہے ـ ایک وارڈ بوائے آتا ہے)

وارڈ بوائے: ڈاکٹر صاحب ـ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر: کیا بات ہے؟

وارڈ بوائے: چلیے صاحب۔ وہ شکیب صاحب بہت چلّا رہے ہیں۔

سلمہ: اوہ مائی گاڈ۔

ڈاکٹر: چلو ـــ

(پیروں کی آواز دور ہوتی ہے۔ شکیب کی آواز قریب آتی ہے)

شکیب: (چلّاتے ہوئے) ڈاکٹر ـ میری بات مانو تم۔ ترقی کے نام پر ہم بے گناہ انسانوں کی قربانی بار بار نہیں دے سکتے۔ اگر بھوپال اور جاپان کے میناماٹا (Minamata) کے دردناک حادثوں کو ہم دوہرانا نہیں چاہتے تو صنعتوں میں کام کرنے والوں کی حفاظت کے ٹھوس ضابطے ہمیں عمل میں لانے ہوں گے۔

ڈاکٹر: (قریب آکر) کیا ہو رہا ہے یہ۔ کیوں شور مچا رہے ہیں آپ؟

شکیب: تم کو کس نے بلایا ڈاکٹر۔؟

ڈاکٹر: مجھے۔ مجھے سچائی کی تلاش نے بلایا ہے۔ مسٹر شکیب۔ آپ چپ چاپ لیٹ جائیے۔

شکیب: سچائی! ڈاکٹر۔ یونان کے فلسفی ہرق لاطیس (Heraclitus) کا کہنا تھا کہ سچائی کا پتہ اس بات سے نہیں لگ سکتا کہ ہمارے سامنے جو چیزیں ہیں وہ کیا ہیں۔ سچائی کا راز تو اس میں ہے کہ چیزیں وہ کیسے ہوئیں جو وہ ہیں۔ حقیقت تو نمو میں ہے —— becoming —— میں ہے۔ وجود میں نہیں۔

ڈاکٹر:- Becoming not being

شکیب: یس ڈاکٹر Not being - but becoming بہت آگ تھی سورج میں لیکن مزہ تو تب آیا جب اس سورج کی آگ کو یونان کے دیوتا پرومی تھیوس نے چوری کر کے انسان کے حوالے کر دیا۔

ڈاکٹر: اچھا تو آپ قدیم یونانیوں کے خدا زیوس کی حکم عدولی کرنے والے پرومی تھیوس کی بات کر رہے ہیں شاید!

شکیب: کر رہے ہیں۔ بالکل کر رہے ہیں۔ پتہ ہے تم کو زیوس کی نظر میں قصور کیا تھا بے چارے پرومی تھیوس کا؟ یہی کہ اس نے انسان کو بہت سے علم سکھائے اور پھر آگ بھی اس کو لا کر دے دی جو زیوس کا سب سے خفیہ راز تھی۔

ڈاکٹر: جانتا ہوں۔

شکیب: تم کچھ نہیں جانتے۔ پتہ ہے زیوس نے کتنی مار ماری ہے پرومی تھیوس کو اس حرکت پر؟ وہ دیکھو سارے جسم سے لہولہان پرومی تھیوس زیوس دیوتا کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ دیکھو ڈاکٹر۔ وہ ہم سے کچھ کہہ رہا ہے:

[بادلوں کی تیز گڑگڑاہٹ ابھرتی ہے اور اس میں سے پرومی تھیوس کی آواز گونجتی ہے:]

پرومی تھیوس: انسانو! میں نے تم کو آگ دی۔ اور اس کے ساتھ اُمید کے سدا بہار پھول بھی دیئے۔ دیکھو اُمید کے دامن کو کبھی ہاتھ سے مت چھوڑنا۔

زیوس: ارے پاگل! ہم نہ کہتے تھے کہ انسانوں کو آگ مت دے۔ ہمیں دیوتاؤں کا یہ راز مت بتا۔ اب دیکھ یہ چوہوں کی طرح مریں گے۔

پرومی تھیوس: نہیں زیوس! میں نے انسان کو صرف آگ ہی نہیں دی ہے۔ علم بھی دیا ہے۔

زیوس: لیکن انسان انسان ہی تو ہے دیوتا نہیں۔ ایک ذرا سی غلطی، ایک ذرا سی غفلت سب راکھ کر سکتی ہے۔ پرومی تھیوس! اس انسان نے اب اس دنیا میں بہت سے چرنوبال (CHERNOBYL) بنا رکھے ہیں۔

پرومی تھیوس: چرنوبال ——؟

شکیب: ہاں پرومی تھیوس! یہ ایک روسی نام ہے، جہاں ایک ایٹمی بھٹی میں کچھ عرصہ پہلے ایک بھیانک حادثہ ہو چکا ہے۔ یہ سوچ کر بدن کانپ اٹھتا ہے کہ اگر اس بھٹی کی آگ باقی کی تین بھٹیوں میں بھی لگ جاتی تو روس ہی نہیں بلکہ یورپ اور پھر شاید دنیا پر ہی قیامت ٹوٹ پڑتی۔

پرومی تھیوس: ایسا کیا ہوا چرنوبال کے حادثہ میں جو انسان اس قدر سراسیمہ ہے؟

شکیب: سات ہزار کلوگرام تابکاری مادہ کہا جاتا ہے کہ اس حادثہ میں Reactor سے باہر آگیا۔ اکتیس لوگوں کی جانیں گئیں۔ دوسو لوگ لاعلاج بیماریوں کا شکار ہوئے۔ آس پاس کے علاقوں سے ایک لاکھ پینتیس ہزار باشندوں کو اپنے گھر چھوڑنا پڑے۔ ہزاروں دودھ دینے والے جانوروں کو اس خوف میں ذبح کر دیا گیا کہ وہ تابکاری کے بھیانک اثرات کا شکار ہو گئے تھے۔ سیکڑوں کھیتوں کی فصلوں کو جلا دیا گیا۔ لاکھوں درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر زمین میں دفن کر دیا گیا۔

زیوس: دیکھ لیا پرومی تھیوس! جس تحفے کو آگ کی شکل میں تو نے انسانوں کو دیا اور جس کے لیے تو نے ہزاروں برس کی دردناک سزا کاٹی، اسی آگ کی انسان آج کیسی ناقدری کر رہا ہے۔

شکیب: سن باون میں کینیڈا کے ریسرچ ری ایکٹر میں بھی کسی طرح بارہ سو

لوگوں کی جان بچی تھی۔ برطانیہ کے ونڈ اسکیل میں بھی ایسا ہی
کچھ ہوا تھا۔ کہیں بھی، کبھی بھی یہ آگ باغی ہو سکتی ہے پرومی
تھیوس! تب اس دنیا کا کیا ہوگا؟

پرومی تھیوس: تم اسی آگ سے ڈرتے ہو جس کو تم نے اپنا غلام بنا لیا
ہے۔ گویا تم اپنے ہی غلام سے ڈرتے ہو۔

شکیب: پرومی تھیوس، جسے ہم تابکاری عمل کہہ کر پکارتے ہیں وہ ایک
ایسی آگ ہے جسے تم محسوس نہیں کر سکتے۔ دیکھ اور چھو نہیں
سکتے۔ سونگھ اور چکھ نہیں سکتے۔ جب یہ تمہارے جسم
میں داخل ہوتی ہے تو کوئی درد بھی نہیں ہوتا۔ ان جانے
میں حملہ کرنے والا یہ دشمن اپنے شکار کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مارتا
ہے۔

پرومی تھیوس: یہ قصور آگ کا نہیں ہے انسانو! یہ قصور تو تمہارے
علم و ہنر کا ہے۔ تمہاری عقل و دانش کا ہے۔

شکیب: کہیں ایسا نہ ہو کہ عقل و دانش کا نام کرنے والا بھی کوئی
نہ بچے۔!

پرومی تھیوس: تو پھر واپس کر دے اس آگ کو سورج دیوتا کو اور ساری
زندگی کے لیے اندھیرے سمندروں میں ڈوب جا۔ یا پھر
عقل اور علم پر بھروسہ رکھ اور اس کی مدد سے اس آگ
کو اپنا دوست بنا۔ اس کی روشنی میں اندھیروں کے پہاڑ
کاٹ۔ اپنے علم کو پرومی تھیوس کے دکھوں کا واسطہ دلا۔
اور امید کے نئے باغ لگا۔ یہ دنیا تجھ سے بھی حسین ہے اور تیرے
ہی ہاتھ اسے اور بھی خوبصورت بنائیں گے۔ خدا حافظ انسانو!
خدا حافظ۔

(ایک تیز گرج کے ساتھ فیڈ آؤٹ
ٹیلی پرنٹر کی آواز فیڈ آن ہوتی ہے۔)

شکیب: ٹیلی پرنٹروں کی آواز ـــ یہ آواز کیسی ہے؟

سلمہ: ٹیلی پرنٹر ـــ یہاں کوئی ٹیلی پرنٹر نہیں ہے شکیب۔

شکیب: سلمہ۔ تم۔ تم اخبار کے دفتر میں ـــ جاؤ یہاں سے
مجھے کام کرنے دو۔

سلمہ: نہیں شکیب۔ یہ کوئی دفتر نہیں ہے۔ تم آرام کرو۔ دیکھئے ڈاکٹر
یہ پھر بہکی بہکی باتیں.....

ڈاکٹر: مسٹر شکیب کیا کام کرنا ہے آپ کو۔؟

شکیب: مجھے ابھی اخبار کے کئی کالم بھرنا ہیں۔

ڈاکٹر: shut up ایک دن اخبار نہیں نکلے گا تو کیا ہوگا

شکیب: اخبار نہیں نکلے گا تو تہذیب مر جائے گی۔ انسان ایک ہزار
سال پیچھے ہو جائے گا۔

ڈاکٹر: ـــ oh shit ۔ جھوٹ بولتے ہیں تمہارے سارے کے
سارے اخبار۔

شکیب: کیا۔ اخبار جھوٹ بولتے ہیں۔ ایک بار پھر تو کہیئے۔

ڈاکٹر: جھوٹے ہیں۔ جھوٹے ہیں تمہارے اخبار۔

شکیب: سلمہ ـــ ادھر دیکھو۔ تب تو میری سلمہ تم کو مجھ سے کوئی
چھین نہیں سکتا۔ ڈاکٹر! تمہاری بھی تو ایک سلمہ ہوگی۔ دنیا
کی کروڑوں سلماؤں کی سلامتی کی قسم! کاش یہ سچ ہو۔ کاش اخبار
جھوٹ بولتے ہوں۔

سلمہ: شکیب! کاش ہمارا یقین بجا ہو۔

شکیب: ڈاکٹر! اخبار جھوٹ بولتے ہیں ـــ بولو ڈاکٹر۔ اخبار جھوٹ
بولتے ہیں نا۔ بولو ڈاکٹر بولو ـــ

(غم انگیز موسیقی کی لہر شکیب کی سسکیوں پر سپر امپوز
ہوتی ہے۔ اور دھیرے دھیرے فیڈ آؤٹ
ہو جاتی ہے۔)

ظفر مرزاپوری
میدان کی گلی ۔ دیلسلی گنج
مرزاپور

علم و فن کا گگن ہند ہے دوستو!

شوخ جھرنے کہیں پر ہیں گوہر فشاں
دل افروز گنگ و جمن کا سماں
یہ ہمالہ مرے دیش کا پاسباں
جلووں کی انجمن ہند ہے دوستو
جاں سے پیارا وطن ہند ہے دوستو

اپنا پنجاب ہے دلربا کس قدر
ہے یہ بنگال جادو بھرا کس قدر
ہے یہ کشمیر جنت نما کس قدر
کتنا خوش پیرہن ہند ہے دوستو!
جاں سے پیارا وطن ہند ہے دوستو!

تاج پانی میں جیسے کھلا ہو کنول
مینو کی طرح مینا یہ دہلی اٹل
یہ ہمکتے ہوئے پربتوں کے محل
حسن میں اک دلہن ہند ہے دوستو!
جاں سے پیارا وطن ہند ہے دوستو!

غالب و میر و مومن کہ ذوق و ظفر
نام اقبال و ٹیگور کا ہے امر
ہے یہ مٹی کبیر اور تلسی کا گھر
علم و فن کا گگن ہند ہے دوستو!
جاں سے پیارا وطن ہند ہے دوستو!

کتنا دلدار ہے گاؤں ہو یا نگر
اپنے کھیتوں میں پوشیدہ لعل و گہر
گیت گاتے ہیں اشجار شام و سحر
جان سرو سمن ہند ہے دوستو!
جاں سے پیارا وطن ہند ہے دوستو!

اک رنگین چمن ہند ہے دوستو!
جاں سے پیارا وطن ہند ہے دوستو!

ڈاکٹر اسلم حنیف
گنور ضلع بدایوں

رُباعیات

سمٹے تو معمہ ہے تو بھی، میں بھی
اور پھیلے تو خطرہ ہے تو بھی، میں بھی
پھر مجھ سے بتا کیوں ہے خجل اے طوفاں
موہوم سا سایہ ہے تو بھی، میں بھی

اپنی ہی انا پہ ضرب کاری ہوں میں
مقتول نہیں، شہید غازی ہوں میں
جرأت کو یہ تلوار نہ بننے دے گی
جس ٹیم کا بارھواں کھلاڑی ہوں میں

یہ لشکرِ دود میں مچلتی ہوئی شام
شب رنگ حدود میں مچلتی ہوئی شام
کچھ دیر میں خود چھوڑ کے بھاگے گی محاذ
یہ ذوقِ نمود میں مچلتی ہوئی شام

عشرت ظفر
روزنامہ "انوار قوم"
نسیم آباد کالونی۔ کانپور

کولرج اور حسنِ فطرت

سیموئیل ٹیلر کولرج کا دائرہ افکار اپنے معاصر شعرا میں سب سے ممتاز و منفرد ہے۔ اس نے ہر خیال کو ایک نئی تابناکی اور وسعت دی ہے۔

یہ بات انتہائی فکر انگیز ہے کہ حسنِ فطرت سے متعلق موضوعات کو کولرج کے معاصر شعرا نے بھی اپنے اپنے طور پر برتا، اس کے سربستہ رازوں کا انکشاف کیا، لیکن اس میدان میں کولرج کی چشمِ بصیرت کی افسوں طرازی ایک انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ حسنِ فطرت کے ادراک کی سطح پر اس کا موازنہ صرف شکسپیر سے کیا جا سکتا ہے جو حسنِ فطرت کے داخلی و ظاہری سمندروں کا ایک مشاق شناور تھا۔ کولرج کا تعارف بھی فطرت کے لمس کی اس لذت سے تھا جس سے شکسپیر بہت پہلے متعارف ہو چکا تھا۔

کولرج نے اپنی سیاحتِ فکر کے دوران بیش بہا اشیا حاصل کر کے اپنی نظموں کے نگارخانوں کو سجایا نیز غیر ارضی اور مافوق الفطرت ہستیوں کے حسن کو ارضی پیکر دے کر اپنے فن پاروں میں ایک عظیم الشان دنیا ہی نہیں آباد کی بلکہ انسانی وجود کے داخلی تناظر کے جلوے بھی پیش کیے۔

اس کی نظموں کے عمیق مطالعے کے بعد ہم پر اس کے تصورات و خیالات کا صرف تغیر ہی آشکار نہیں ہوتا بلکہ اس کے نظریات کے سلسلے میں دلچسپ انکشافات بھی ہوتے ہیں۔ یہاں میں اس کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کر کے اپنی بات کہنے کی کوشش کروں گا، پہلا دور تو وہ تھا جب اس کا مطالعہ اساطیری کہانیوں اور پراسرار واقعات تک محدود تھا، اس عہد کی نظموں کو پڑھ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ فطرت سے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ تمام مظاہر میں ایک بے کراں سرخوشی کی لہر رواں ہے جو نگارِ فطرت کو حیات کی رعنائیوں سے ہم آغوش رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر اس کی نظم "عندلیب" قابلِ مطالعہ ہے، جس میں اس نظریے کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے کہ نگارِ فطرت کا پیکر مسرتوں کا بے مثال خزانہ ہے نیز اداسی اور افسردگی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے

دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ جرمنی کا سفر کرتا ہے اور جرمن مفکرین کے نظریات و خیالات کا صرف مطالعہ ہی نہیں کرتا بلکہ ان تصورات کی چٹانوں پر اس کا شعری عقیدہ ایک نئے اور مستحکم روپ میں نمودار ہوتا ہے۔ اس عہد کی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ تمام مظاہرِ فطرت ذہن کے اسکرین پر چلنے والی تصاویر کی طرح ہیں جن میں مشاہد اپنے احساسات کے مطابق رنگ بھرتا ہے خواہ وہ نشاطیہ کیفیات ہوں یا کرب و غم کی حلاوتیں ہوں۔ اس طرح یہ بات وضاحت کی حدوں کو چھو لیتی ہے کہ ہر شخص انفرادی طور پر جمالِ فطرت کا نظارہ کرتا ہے۔ اگر وہ اداس ہے تو تمام نگار خانۂ فطرت افسردہ و خموش ہے۔ اگر وہ سرخوشی کے عالم میں ہے تو بحرِ فطرت کے قلبِ عمیق سے مسرتوں کے آبشار اُمڈ رہے ہیں، فطرت بذاتِ خود ایک بے جان شے ہے، فرد کی ذہنی کیفیت ہی اسے زندگی عطا کرتی ہے اس سلسلے میں کولرج کی دو نظموں "نغزِ یاس" اور "لیوٹی" کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

زیرِ نظر مضمون میں اس بات کا ذکر کرنا انتہائی ضروری ہے کہ کولرج اور ورڈس ورتھ قریبی دوست ہونے کے باوجود جمالِ فطرت کے سلسلے

ین نظریاتی اصطلاحات سے حامل ہے، چنانچہ اس کی تقابلی صورت یوں پیدا ہوتی ہے کہ فطرت کے متعلق ورڈس ورتھ کا نظریہ یہ تھا کہ فطرت ایک سرچشمۂ نشاط ہے۔ جبکہ کولرج کا خیال یہ تھا کہ فطرت ایک بے روح شے ہے جو انفرادی طور پر غم و نشاط کی کیفیتوں سے ہم کنار ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اول الذکر نے اسے معلم اخلاق کہا جب کہ آخرالذکر نے اسے کسی شخصیت کے روپ میں تسلیم نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ کولرج نے تمام مظاہر فطرت میں پراسراریت محسوس کی اس کی شاعری پراسراریت اور مافوق الفطرت اشیاء سے مملو ہوتی گئی۔ کولرج کے احساسات و نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے مشہور نقاد ایس۔ بروک نے لکھا ہے:

"ہم جسے فطرت کا نام دیتے ہیں وہ شے ہمارے
اندر ہی موجود ہے اور ہم ہی اس کے خالق ہیں اسے
(یعنی فطرت کو) زندہ صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہم
زندہ ہیں اگر ہمیں اس سے کوئی تاثر حاصل ہوتا ہے
تو وہ گویا ہمارا اپنا ہی تاثر ہے جو ہمیں میں پیدا ہوتا ہے
اور ہمارے ہی خیالات کی تخلیق بھی ہے اس طرح
جو ہم سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اس کا نام فطرت
ہے۔"

ایسے ہی تمام نظریات کی روشنی میں جب ہم دیکھتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ نگارخانۂ فطرت کی چار خاص و اہم اشیاء روشنی، رنگ، خوشبو اور آواز کولرج کی شاعری کو توانائی عطا کرتی ہیں اور یہی وہ عناصر اربعہ ہیں جن پر کولرج کے ایوانِ فکر کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ انھیں چہار عناصر کی عکس ریزیوں سے اس کی فکر جہاں تاب کا چمن لہلہا رہا ہے۔ خود کولرج نے اپنے نثر پاروں میں حسن کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"حسن کیا ہے، تجریدی اعتبار سے اگر دیکھا جائے
تو یہ کثیر الجہت کی وحدت ہے، مختلف النوع کا ادغام ہے
ٹھوس شکل میں یہ ہیئتی اعتبار سے متناسب زندگی کا قوت
حیات سے امتزاج ہے۔"

مذکورہ بالا مثال کے علاوہ بھی کولرج نے اپنے نثری شہ پاروں میں حسن کے متعلق بڑی فکر انگیز باتیں کہی ہیں اور اپنے فکری تجربات و احساسات کو ان تحریروں میں اس طرح بند کیا ہے کہ اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ حسنِ فطرت کے ادراک کے سلسلے میں ہم ہنوز روزِ اوّل میں ہیں اور یہ کہ ہمارا فکری افق کتنا محدود اور غیر وسیع ہے۔

اس سے پہلے کہ میں کولرج کی نظموں میں آباد اس عظیم الشان دنیا کی سیر پر نکلوں جو جمالِ فطرت کے بے مثال جلوہ ریزیوں سے معمور ہے، میں چاہتا ہوں کہ مشہور تنقید نگار سر فلپ سڈنی کے ایک تنقیدی مضمون "شاعری کا جواز" کی چند سطور آپ کے سامنے پیش کروں:

"فطرت نے زمین کو ایسے رنگین ملبوسات سے
آراستہ نہیں کیا اور نہ ایسے دل کش دریاؤں، پھل دار درختوں
اور خوشبو دار پھولوں سے، اور نہ ان اشیاء سے جو محبوب
زمین کو اور محبوب بنا دیتی ہیں۔ لیکن شاعروں نے فی الواقعی
اسے آراستہ کر کے دکھایا۔"

مذکورہ بالا سطور میں جن شاعروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کولرج بھی انھیں کے قبیل کا ایک شاعر ہے جس نے محبوب زمین کو اپنے افکار و خیالات کی قوس قزح میں غسل دے کر محبوب ترین بنا دیا ہے اب مناسب ہوگا کہ سر فلپ سڈنی کی رائے کی روشنی میں فطرت کے ان عطیات رنگ، خوشبو، آواز اور روشنی کا کولرج کے اشعار میں مشاہدہ کیا جائے تاکہ ہمیں یہ پتہ چل سکے کہ کس طرح کولرج نے ان لطیف و جمیل عناصر کو مختلف النوع پیکر عطا کر کے انھیں حیات ابدی سے ہم کنار کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حسنِ فطرت کس طرح حواس انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے نیز انسانی جذبات کا پرتو حسنِ فطرت پر کس طرح پڑتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ کولرج نے اپنی شاعری کے عناصر اربعہ میں ان اشیاء کا انتخاب کیا ہے جن کا انسانی حواس سے گہرا رشتہ ہے اور جن سے حواس کسی نہ کسی طرح متحرک رہتے ہیں، مثلاً روشنی کا تصور پیدا ہوتے ہی ہمارے حواس کے افق پر بصری پیکروں کے شہاب ثاقب نمودار ہوتے ہیں اسی طرح رنگ لمسی اور بصری دونوں پیکروں کی تخلیق کرتا ہے آواز استماعی پیکر کو مستحکم کرتی ہے خوشبو ہمارے شامہ کی فضاؤں کو ہی متاثر نہیں کرتی بلکہ ہمیں موسیقی کے ان جزیروں میں بہا لے جاتی ہے جہاں ہمارا سامعہ عاجز نظر آتا ہے مگر محسوسات کی بے کرانیت ایک نشۂ بے مثال و خوش گوار سے سرشار

رہتی ہے۔ ان تمام حواسی پیکروں کے ساتھ ذائقہ کی ہر شستگی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب کولرج کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارا احساس پنج رنگی جدول کی گرفت میں آجاتا ہے۔

کولرج کی نظموں کی وہ خصوصیات جو حواسی رنگوں سے مملو ہیں، اس طرح ہیں، بجلی کی کڑک، ہواؤں کا شور، لہروں کا اضطراب۔ چاند، سورج، پھول، شفق، آسمان، بادل اور ستارے یہ تمام مظاہر فطرت کولرج کے یہاں قدم قدم پر موجود ہیں۔ یہ سب حسن فطرت کے شاہکار ہی نہیں بلکہ انسانی ذہن و حواس کے ہر لمحہ تغیر و تبدل کی فضا سے ہم کنار ہونے والی کیفیات کی علامت ہیں۔ اس سلسلے میں چند مثالیں دیکھئے ؎

چاروں طرف، چاروں طرف
زبردست گڑگڑاہٹ اور شور ہیں
موت کے شعلے ساری رات رقص کرتے رہے
پانی آتش گیر سیال کی طرح ابلتا رہا
سبز، نیلگوں، سفید
ہوائیں دہاڑ رہی تھیں
بادبان کی سرسراہٹ مسحور کن تھی
پھر موسلادھار بارش کا آغاز ہوا
ایک سیاہ بادل سے
جس کے کنارے پر چاند جگمگا رہا تھا
رفتہ رفتہ سیاہ بادل چھٹتا گیا
چاند اس کے پہلو میں مقیم تھا
پانی کسی نشیبی چٹان سے ٹکرا رہا تھا
اور بجلی بے تاب لہروں کی طرح مچل رہی تھی۔

یہ چودہ مصرعے کولرج کی مشہور نظم "قدیم الحج جہازی کا گیت" کے ہیں۔ آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ ان مصرعوں میں کولرج نے اپنی فن کارانہ چابکدستی کے ذریعے کس طرح روشنی، آواز اور رنگ سے بصری، لمسی اور استماعی پیکر تخلیق کیے ہیں۔ اب اسکی نظم "بوسہ" کا یہ بند دیکھئے جس میں رنگ اور روشنی اپنا جلوہ پیش کر رہے ہیں مگر خوشبو کے وجود سے انکار ممکن نہیں ؎

اور وہ (یعنی بوسہ) شبنم کی چمک کی طرح
گلاب کے رنگوں پر بکھر جاتا ہے
شرم سے چور گلاب اپنا سر جھکا لیتا ہے
حیا کی سرخی اس کے رنگ و رخسار کو اور گہرا کر دیتی ہے

ملاحظہ فرمائیے کہ گلاب کے پھول پر شبنم کی چمک ہمارے سامنے بصری و لمسی دونوں ہی پیکر پیش کرتی ہے۔ حیا کی سرخی کے ساتھ ہی گلاب کے اپنے رنگوں کی آمیزش ایک خالص بصری پیکر ہے۔ علاوہ ازیں پھول اور خوشبو کا لازم و ملزوم ہونا ہمیں مثالی تجربے سے ہمکنار کر کے ہمارے حواس پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے اور ہمیں حسی پیکر سے متعارف کراتی ہے کولرج نے ان مصرعوں میں بوسے کو قطرۂ شبنم اور رخسار کو صرف گلاب کا نام ہی نہیں دیا ہے بلکہ دونوں کو ہم آغوش کر کے ذائقہ کی لطیف کیفیت کی تخلیق کی ہے۔ اس نے جابجا ان عناصر کو نئے نام دیئے ہیں اور یہی اس کی شاعری کا خاصہ ہے۔ اپنی ایک اور نظم "نوجوان گلاب" میں وہ گلاب سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے اور اسے ایک نیا نام عطا کرتا ہے ؎

اے آغاز بہار کے خوبصورت پھول
میں تیری مسکراہٹوں کا نظارہ کرتا ہوں
اف وہ تیرا اپنے نامکمل کنج سے جھانکنا
اے موسم بہار کے خوشبودار قاصد
تو بساط ارض کے لیے پیام سرخوشی ہے

اسی طرح اس نے اپنی ایک نظم میں فلک بوس پہاڑوں کو زمین کے قلب سے اٹھنے والے عود کے دھوئیں سے تشبیہ دی ہے۔ عود کے خوشبودار دھوئیں کا نشیب سے فراز کی طرف سفر کرنا، کوہساروں کا آسمان کی بلندیوں سے ہم سفر ہونا ان دونوں کی آمیزش سے کتنا خوبصورت بصری پیکر تخلیق ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کولرج کی کچھ اور نظموں سے مثالیں بھی دیکھئے جو حسن فطرت کی رعنائی اور حواس کو متحرک کرنے والے تجربات سے مملو ہیں، سب سے پہلے "ستارہ شام" کے یہ مصرعے دیکھئے ؎

اے طائفہ نجوم کے سب سے حسین و دلنشین رکن
تو دختران شب میں سب سے زیادہ حسین و جمیل ہے

وہ پرسکون مسرت اور خالص خوشی میری
محبوبہ کو بھی حاصل نہیں، جو تیرے وجود
کا حصہ ہے۔

اس نظم کے سیاق و سباق میں جو چیز خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ ہے شاعر کا ستارۂ شام سے تخاطب۔ اس نے شفق کی گردِ سرخ اور شام کی نگھی دھول سے طلوع ہونے والے ستارے کو تمام گروہ نجوم کا سب سے حسین و اولین رکھی کہہ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ستارہ جو بساطِ افق پر سب سے پہلے نمودار ہوا ہے اور اپنے بعد آنے والوں کے حسین و جمیل ہونے کا پیغامبر ہے۔ پھر شاعر نے دُختران شب میں اسے سب سے زیادہ خوبصورت بتایا ہے۔ دختران شب سے شاعر کی مراد خوشۂ پروین اور بنات النعش سے تعلق رکھنے والے ستارے ہیں جو رات کے حسن و جمال میں ایک نئی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ شام کے آغاز کے ساتھ محبوبہ سے ملاقات کا تصور بھی وابستہ ہے چنانچہ وہ یہاں تک کہہ اٹھتا ہے کہ محبوبہ کا جمالِ دلنشین بھی ستارۂ شام کا مرہون منت ہے۔ اور وہ سکون و طمانیت محبوبہ کو بھی حاصل نہیں جو اس عزیز نور کا حصّہ ہے۔

رنگ و آواز کے حسین امتزاج اور اس ماحول کی بھرپور کیفیت "قدیم العمر جہازی کا گیت" کے ان مصرعوں میں بھی موجود ہے ؎

دلھن کمرے میں داخل ہو چکی تھی
وہ گلاب کی طرح سُرخ تھی
اور مسحور کُن سازوں سے آراستہ
مغنی رقاصوں کا طائفہ
اس کے سامنے سے گزر رہا تھا

ان پانچ مصرعوں میں بظاہر تو ایک منظر نامہ پیش کیا گیا ہے مگر جب ہم الفاظ کے بحر بسیط میں شناوری کرتے ہیں، معنی کو کھنگالتے ہیں، ماحول کا جائزہ لیتے ہیں تو ان مصرعوں کے اسرار ہم پر فاش ہوتے ہیں۔ پہلے مصرع میں دلہن کا کمرے میں داخلہ رنگوں کے طلوع کی علامت ہے کیوں کہ رنگوں کا ایک ہجوم دُلہن کے لفظ کے ساتھ وابستہ ہے پھر دوسرا مصرع رنگوں کے تلاطم کو اور ہیجان انگیز بنا دیتا ہے یعنی دُلہن کا گلاب کی مانند سُرخ ہونا، اول تو یہ کہ دلہن کا لباس سرخ ہے جو ظاہری طور پر اسے گلاب سے مماثل کرتا ہے پھر اس کی نوخیزیت اور کم سنی بھی گلاب کی طرف اشارہ کرتی ہے، گویا یہ ظاہر ہو گیا کہ دلہن ہر طرح گلاب کی طرح ہے اور گلاب کے ساتھ دلہن کا تصور لازمی ہے۔ دوسری طرف سُرخ ملبوس میں بھی خوشبو مسکن گزیں ہے کیونکہ یہ ملبوس دُلہن سے وابستہ ہے۔ اس طرح لباس کا سُرخ ہونا گلاب کی علامت بھی ہے اور اس کے ساتھ خوشبو کا تصور بھی۔ دلہن کا گلاب کی طرح ہونا اس کی نوخیزیت اور اس کی خوشبو یعنی جوانی کی مہک سے ہمارا تعارف کراتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ دونوں مصرعے براہ راست ہمارے باصرہ کو متوجہ اور متحرک تو کرتے ہی ہیں ہمارے شامہ کو بھی لذت انگیزیوں کا پیام دیتے ہیں، بعد کے تین مصرعوں میں جادوگری کا حسن ہے یعنی دلہن کے سامنے سے مسحور کن سازوں سے آراستہ مغنی رقاصوں کا طائفہ گزر رہا ہے۔ تینوں مصرعے اگرچہ بصری فضا تخلیق کرتے ہیں لیکن مسحور کن سازوں کا ذکر اور رقاصوں کا مغنی ہونا ہمارے سامعے کو دلچسپ طلسمی ماحول میں لے جاتا ہے جہاں ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مسحور کن سازوں کی لے پر خوبصورت نغمے جنم لے رہے ہیں۔ استماعی اور بصری لذتوں میں نہائے ہوئے اس کی مشہور نظم "کرسٹابیل" کے یہ خوبصورت مصرعے دیکھئے ؎

رات یخ بستہ، جنگل بے لباس ہے
صرف ہوا سسکیاں بھر رہی ہے
مگر وہ بھی تیز نہیں ہے
کہ کرسٹابیل کے رُخساروں سے گیسوؤں کو ہٹا سکے

رات کی یخ بستگی، جنگل کی بے لباسی، موسم خزاں کا انتہائی عروج ہے کرسٹابیل کے رخساروں پر گیسوؤں کا بکھراؤ، یہ سب بصری پیکر ہیں۔ رخسار اور گیسوؤں میں ایک لمسی رشتہ بھی ہے یعنی گیسو رخساروں کو چوم رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مصرعوں میں رات اور گیسوؤں دونوں کی موجودگی شاعرانہ رعایتوں کے انضباط و ارتباط کی دلیل ہے پھر ہوا کا سسکیاں بھرنا، تیز نہ ہونا، ایک خاص استماعی فضا کی تخلیق کرتا ہے، اب یہ مصرعے دیکھئے جس میں بصری پیکروں کا ایک ہجوم ہے ؎

نہ تو پُرپیچ راستوں سے گزرنے والی میری آنکھ
اوپر پھیلے ہوئے دشت نجوم کا سفر کرتی ہے

نہ تو متجسس نگاہوں سے، میں جگنوؤں کا مشاہدہ کرتا ہوں
جب سبز چمکدار گھاس کے قریب سے گزرتا ہوں
وہ گھاس جو زمرد کے مانند ہے

مذکورہ بالا پانچ مصرعوں میں سے سب سے پہلے مصرع میں لفظ "آنکھ" کا استعمال کرکے شاعر نے بصارت کی مکمل فضا قائم کی ہے پھر دشتِ نجوم جو لبیط بھری فضا ہے، علاوہ ازیں جگنوؤں کے مشاہدے میں روشنی کا تصور بھی موجود ہے ۔ روشنی اور بصارت لازم و ملزوم ہیں ۔ پھر چمک دار گھاس وہ بھی زمرد جیسی ! کتنے حسین پیکر دیے ہیں کولرج نے ۔

اس طرح یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کولرج مابعد الطبیعیاتی طرزِ فکر کا سب سے بڑا شاعر ہے ، اور یہی وہ منزل ہے جب اشیا کی اصل ان کی تصویروں میں ظاہر ہوتی ہے ۔ اس نے کراں تا کراں پھیلی ہوئی بسیط کائنات کو انسانی جذبات و کیفیات کے تناظر میں دیکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کوئی چیز خوبصورت نہیں ہے، صرف مشاہدہ کرنے والی آنکھ ہی اسے مختلف کیفیات سے معمور کر دیتی ہے ۔

کولرج شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ رومانی تنقید کا پیش رو بھی تھا، اس نے اپنے فکری ڈھانچے کو ارسطو کے عقائد و نظریات کی روشنی میں مرتب کیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے معاصرین اس کے افکار کی گرد بھی نہ پا سکے، جب تک کہ نقدِ شعر کی روایت زندہ ہے اس کے افکار و خیالات سے روشنی حاصل کی جاتی رہے گی ۔

مضمون کے اختتام پر میں اس کی مشہور نظم "پکھیوں کا نغمہ" کے چند مصرعے پیش کر دوں تاکہ آپ کا ذہن ایک خوش گوار فضا میں اپنا سفر طے کر سکے ۔

جب چاند تیز مُردہ ہو کر پیلا پڑ جاتا ہے
اور بادل ہواؤں میں اڑ جاتے ہیں
اور نمودِ صبح سے پہلے
مشرق گلابی روشنی میں نہا جاتا ہے
ہم شبنم آلود خوشبوؤں کا شروب پیتے ہیں
ہمارے ملبوسات قوسِ قزح ہیں
ہم خوبصورت پھولوں کے کنج میں کھیلتے ہیں ۔ **

ہزار رستے ہیں اہل دل کے — ص ۲ کا بقیہ

ایک ذہنی تناؤ پیدا کر دیتا ہے ۔ لگ بھگ یہی رویّہ میری ایک اور کہانی "آنگن" میں بھی اسی شدّت کے ساتھ موجود ہے جو میں نے "اکھڑے ہوئے لوگ" سے چند برس پہلے تحریر کی تھی ۔

دو تین سال پہلے لکھنؤ ٹیلی ویژن پر ایک گفتگو کے دوران میں نے انتظار حسین سے جس پر ناسٹلجیا کا شکار ہونے کا الزام پاکستان میں زیادہ شدّ و مد سے لگایا جاتا ہے، کہا تھا، ہمارے گرد و پیش میں نئی نئی تبدیلیاں بڑی تیزی سے رونما ہو رہی ہیں، وہ بھی ہماری زندگی کا حصّہ ہیں ۔ میری کہانی "آنگن" کا مرکزی کردار نئی نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے آبا و اجداد کی جدّی جائیداد کو جوں کا توں رکھنے پر مُصر ہے جبکہ اس کے آنگن کے چاروں طرف کئی کئی منزلہ عمارتیں تعمیر کر لی گئی ہیں ۔ اس کردار کا ذہنی ٹکراؤ اپنی تعلیم یافتہ بیوی کے ساتھ ہوتا ہے جو وہاں فوری طور پر معاشی نقطۂ نظر سے تبدیلی چاہتی ہے ۔ کہانی دونوں کے درمیان اسی مفاہمت پر ختم ہوتی ہے جو اس کی بیوی چاہتی تھی ۔ لیکن اس کا سبب بیوی کی خوشنودی حاصل کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ اُن پڑوسیوں کا تبدیل شدہ رویّہ تھا ۔ یعنی جب وہ اُس آنگن کے معاشرتی استعمال کو ہی بے معنی سمجھنے لگے تھے ۔

کبھی کبھی کسی کہانی کا بنیادی تصوّر لکھنے والے کے ذہن میں ایک ایسے تناور پیڑ کی مانند آناً فاناً اُگ کر تیار ہو جاتا ہے کہ اُس کا خالق اس میں نظریاتی تضاد کی موجودگی کو بھی نظرانداز کر دیتا ہے ۔ میری کہانی "بھیڑ" پر نظریاتی تضاد کا الزام آج تک نہیں عائد کیا گیا لیکن میں خود اس حقیقت سے کبھی آنکھیں نہیں چرا پایا کہ اس کہانی کے دو مرکزی کردار آتم اور کستی رات بھر گھر سے غائب رہ کر احتجاج پر آمادہ ایک بھیڑ میں صرف اس لیے شامل ہو جاتے ہیں کہ وہ یہی کر کے اپنے گھر والوں کے عتاب سے بچ سکتے تھے ۔ میں اُن کے اس "ایکشن" کو برحق ثابت کرنے کے لیے بڑی آسانی سے اُن کے بائیں بازو کی تحریک کی جانب جھکاؤ کا اشارہ کر سکتا تھا ۔ لیکن اُس صورت میں کہانی کا سارا تاثر ہی زائل ہو جاتا کم سے کم میں یہی سمجھ کر ابھی تک چپ ہوں ۔ ••

فرحت قادری
۱۲۔ سوداگر، گیا (بہار)

مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں

غلغلہ ہے چار جانب جس کی بیباکی کا آج
کانپتا تھا اس کے جوہر سے فرنگی سامراج

وہ کتابِ حرّیت کا ایک زرّیں باب تھا
مادرِ ہندوستاں کا جوہرِ نایاب تھا

اُس کی رگ رگ میں ظفر کی شان تھی، ٹیپو کی آن
وہ تلک کا ہمنوا تھا، گاندھی و نہرو کی جان

وقت کا نبّاض تھا وہ قوم کا "ہمدرد" تھا
مردِ میداں تھا، جہادِ حُرّیت میں فرد تھا

قومِ ہندی کا بڑھایا اک طرف اس نے وقار
اِک طرف کرتا رہا "کامریڈ" سے دشمن پر وار

حُبِّ قومی اور "خلافت" کا علمبردار تھا
بہرِ آزادی ہمہ دم برسرِ پیکار تھا

کاروانِ حُرّیت کا تھا وہ میرِ کارواں
اس کی منزل تھی فقط آزادیِ ہندوستاں

انقلابوں کا وہ پروردہ، مجاہد بے مثال
اس کے ہونٹوں پر شرارے، اس کی آنکھوں میں جلال

وہ حصارِ جبریت میں بھی نوا پیکر رہا
تاجِ شاہی بھی نظر میں اس کی، بے منظر رہا

سحر تھی اس کی زباں، اس کا قلم بیباک تھا
شاطرِ افرنگ کی ہر چال کا ادراک تھا

عمر بھر جس کو رہی آزاد لمحوں کی تلاش
سطوتِ شاہی بھی اس کی ٹھوکروں سے پاش پاش

اس نے تقدیرِ غلامی کو بدل کر رکھ دیا
جابرانہ سطوتوں کا سر کچل کر رکھ دیا

وہ نہ گھبرایا کسی کی توپ اور تلوار سے
آگ برساتا رہا تقریر سے، اشعار سے

ایک ایسا شعلۂ جوّالہ تھی اس کی انا
قیصرانہ دبدبہ بھی راکھ ہوکر رہ گیا

وہ بلائے ناگہاں تھا اپنے دشمن کے لیے
اس کے تیور زلزلے تھے قصرِ لندن کے لیے

سامراجی طاقتوں سے عمر بھر لڑتا رہا
اس کی تقریروں سے رخنہ قصر میں پڑتا رہا

رُعبِ شاہی سے سرِ خوددار ہوتا تھا نہ خم
تازہ دم رہتا تھا میدانِ صحافت میں قلم

اپنی بیباکی سے دُنیا بھر کو حیراں کر دیا
نامِ ہندوستاں زمانے میں درخشاں کر دیا

ہندیوں میں پیکرِ رُوحِ صداقت بن گیا
تیغ کے سائے میں جینے کی علامت بن گیا

اس کے دم سے شمعِ آزادی یہاں تابندہ ہے
وہ شہیدِ قوم ہے اور آج بھی وہ زندہ ہے

آسمانِ حریت پر ہے فروزاں اس کا نام
میں عقیدت میں ادب سے کرتا ہوں اس کو سلام

ڈاکٹر سلمان عباسی
۵۵، ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ لکھنؤ

مجاز
ایک رومانی افسانہ

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ الفت کا طلب گار ہوں میں!

عشق ہی عشق ہے دُنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

چھیڑتی ہے جسے مضرابِ الم
سازِ فطرت کا وہی تار ہوں میں

عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

رشکِ صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

لے کے نکلا ہوں گہرہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

اسرار الحق ایک ایسی پراسرار شخصیت کا نام ہے، جس نے مجاز ہوتے ہوئے ہمیشہ حقیقت کو شرمندۂ وجود کیا۔

لاوجود سے وجود کی دُنیا تک آنے کے لیے حقیقت میں مجاز نے ۱۹۱۱ء کا سال منتخب کیا۔ ٹھیک ۱۹ اکتوبر کی تاریخ کو ـــــ انھوں نے اودھ کے ایک مردم خیز قصبہ رُدولی میں جاگیرداروں اور تعلقداروں کے ایک متمول اور خوش حال خاندان کے فرد چودھری سراج الحق کے گھر آنکھ کھولی۔

ان کی پیدائش پر خوشیوں کے شادیانے بجے، اور خاندانی روایت کے مطابق معاشی خوش حالی، زمیندارانہ جاہ و جلال، نفاست، خوش سلیقگی خوش مزاجی، وضع داری، آن بان اور عیش و عشرت کے مظاہرے کے طور پر بڑی دُھوم دھام سے جشنِ ولادت منایا گیا۔

والدین کی ان سے جذباتی وابستگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان سے پہلے ان کا ایک دو ڈھائی سال کا بچہ کسی بیماری میں مبتلا ہوکر فوت ہوچکا تھا، اسلیے مجاز بڑی منتوں مُرادوں میں پالے گئے۔

چودھری سراج الحق اپنی شادی کے کچھ عرصہ بعد خواجہ ہال والے اپنے آبائی مکان سے منتقل ہوکر سسرالی مکان واقع محلہ ہنی خاں میں رہنے لگے تھے۔ یہیں مجاز اور دوسرے بچے پیدا ہوئے۔ یہ مکان اب ایک زنانہ اسکول کی شکل میں قائم ہے۔ اور دوکانیں اب بھی موجود ہیں جو مجاز کی یاد میں ردولی کے مخدومیہ اسکول کے نام وقف کردی گئی تھیں، اس کے بعد

اس خاندان کا ردولی سے کوئی سلسلہ باقی نہ رہا ۔

یہ ہے اودھ کے مشہور اور مردم خیز قصبہ ردولی کا وہ ناقابلِ فراموش مرکز، جس نے مجاز کو ردولی سے چھڑا کر ساری اُردو دنیا میں "آوارہ" کر دیا۔ ردولی ہی کے کسی ایک مکتب میں مجاز کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا جس کا نام و نشان بھی اب باقی نہیں ہے ۔

مجاز کے والد چودھری سراج الحق اب مستقل بود و باش اختیار کرنے کی غرض سے لکھنؤ آ گئے تھے ۔

کششِ لکھنؤ ارے توبہ
پھر وہی ہم وہی امین آباد

سب سے پہلے پُرانے نظیر آباد میں منشی احترام علی علوی کاکوروی کی "کاکوری کوٹھی" کے سامنے والے مکان میں سکونت اختیار کی۔ پھر امین آباد کے محلہ کچا احاطہ میں قیام کیا۔ یہیں سے مجاز نے امین آباد انٹر کالج سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔

اس زمانے میں انھیں ہاکی سے بہت دلچسپی تھی۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی مشق کے لیے وہ اپنے گھر کے آنگن میں پلنگ کھڑے کر کے برابر مشقیں کیا کرتے تھے ۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے اسی زمانے میں شاعری کا بھی آغاز کر دیا تھا۔

مجاز کے میٹرک پاس کرتے ہی ان کے والد کا تبادلہ لکھنؤ سے آگرہ ہو گیا جس کی وجہ سے مزید تعلیم کے لیے آگرہ ہی کا انتخاب کیا گیا۔ اور سینٹ جانس کالج آگرہ میں ان کا داخلہ ایف. ایس. سی میں ہوا۔

۳۰-۱۹۲۹ء اور ۳۱-۱۹۳۰ء کے دو تعلیمی سال مجاز کی ادبی زندگی کے لیے نہایت اہم سنگِ میل ثابت ہوئے ۔

یہاں معین احسن جذبی ان کے کلاس فیلو اور آل احمد سرور ایک سال سینیئر تھے ۔ دوسری خوش قسمتی فانی بدایونی کے پڑوس میں رہائش اور پھر میکش اکبر آبادی کی ادبی صحبتوں میں شمولیت، حامد حسین قادری سے ادبی ملاقاتیں ۔ ان سب وجوہات نے اسرار الحق کو سب سے پہلے شہید تخلص اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی زمانے میں انھیں اپنی چند غزلوں پر فانی بدایونی سے اصلاح لینے کا موقع بھی ملا۔ اس طرح قیام آگرہ ان کے ادبی ذوق کی تکمیل کا ایک وسیلہ بن گیا۔ دو سال کے مختصر قیام کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے ۔ جہاں گھر کے دوسرے افراد پہلے سے موجود تھے ۔

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پا بستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

اس فرش سے ہم نے اُڑ اُڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، نسرین سے رشتے جوڑے ہیں

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود ہم نے آگ لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے

علی گڑھ میں پانچ سال کے قیام کے دوران مجاز نہایت آسودگی کے ساتھ رہے ۔ دراصل یہی وہ زمانہ تھا جب ان کی زندگی اور شاعری نے اپنی صحیح سمتوں کا تعین کیا۔ مسلم یونیورسٹی کی عام فضا اور اشتراکی ذہن رکھنے والے کچھ نوجوان ساتھیوں نے مجاز کی شاعری اور شخصیت کو "شانِ کجکلاہی" اور "مردِ انقلابی" کا بانکپن عطا کیا۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب مجاز نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے بار بار یہ غلو آمیز اعلان کیا ؎

شراب و شبستاں کا مارا ہوں لیکن
وہ غرقِ شراب و شبستاں نہیں میں

حالانکہ زندگی بھر وہ اسی وادیِ پُرخار کے مسافر رہے اور ہمیشہ گھومتے پھرتے رہنے کے باوجود اس چوراہے کی مسافت طے نہ کر سکے۔

بعد کے چند سال علی گڑھ یونیورسٹی اور ترقی پسند تحریک کے عروج کے آئینہ دار تھے ۔ اس زمانے میں اختر رائے پوری، حیات اللہ انصاری، آل احمد سرور، سبطِ حسن ۔ جذبی ۔ سردار جعفری۔ عصمت چغتائی، جاں نثار اختر، سعادت حسن منٹو جیسے نامور قلمکار علی گڑھ پہنچ چکے تھے ۔ اسی زمانے میں اپنے ابتدائی دورِ شاعری کی کچھ اہم نظمیں لکھیں ہاں ۔ اسی زمانے میں وہ اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری کو اپنا محبوب اور مثالی شاعر تصور کرتے تھے ۔

آخر کار اختر شیرانی کی معصومیت اور رنگینی، جوش کی رندی و بیباکی اور حفیظ کی نغمگی نے مل جل کر ایسا رنگ اختیار کیا کہ ترقی پسند تحریک کے

ابتدائی دور کے نمایاں شاعر کی حیثیت سے مجاز سب سے خوبصورت اور اثر انگیز شاعری کے خالق قرار پائے۔

۱۹۳۵ء میں بی اے کرنے کے بعد ایم اے اُردو میں انھوں نے داخلہ لے لیا۔ شاعری میں بے پناہ مقبولیت اور شہرت کی وجہ سے خلافِ روایت وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس وقت مجاز کا حلیہ کچھ اس طرح تھا:

"جسم پر یونیفارم کے رنگ کی نیلی شیروانی
جس پر سفید بٹنکیوں کی مہین دھاریاں پڑی تھیں اور
شروع سے آخر تک سارے بٹن لگے ہوئے تھے،
علی گڑھ پاجامہ۔ براؤن رنگ کا شو، بغل میں کتابیں
لمبا ساقد، سانولا رنگ، چہرے پر متانت و سنجیدگی ـــ
آپ ہیں اسرارالحق مجاز۔ لکھنؤ کے رہنے والے اور
ایک ہونہار شاعر"

یہ زمانہ مجاز کی شاعری کا زورِ شباب تھا۔ دوستوں کی واہ وا، حسین خواتین کی داد اور مشاعروں کی مقبولیت نے ان پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری کردی تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے زمانۂ قیام میں مجاز یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی صاحبزادی پر عاشق ہو گئے تھے۔ دوسری طرف سے بھی ان کی ہمت افزائی ہوئی تھی اور پروفیسر صاحب کو بھی اس معاملے کا علم تھا۔ صاحبزادی نے مجاز کی چہیتی بہن صفیہ کے ذریعہ اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ مجاز سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن مجاز نے صاف انکار کر دیا ؎

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اُتر آئی ہو

مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رُسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے
خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خوابگاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے

حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

مجاز بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ یہ دلکشی شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ انھوں نے ایسی طبیعت پائی تھی کہ ان کی طرف متوجہ ہونے کے لیے ان کے کلام سے واقف ہونے کی ضرورت نہ تھی

۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آیا تو مجاز بھی ملازم ہو کر دہلی پہنچ گئے۔ وہ ریڈیو کے اُردو رسالے "آواز" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس رسالے کا نام انھیں کا تجویز کیا ہوا تھا۔ ریڈیو کے اُردو پروگراموں کا آغاز بھی مجاز ہی کی غزل سے ہوا ؎

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

آل انڈیا ریڈیو کے مسٹر فیلڈن اور ان کے نائب پطرس بخاری کے ادبی ذوق کی بنا پر مجاز کے علاوہ ن۔م۔ راشد، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ریڈیو کی ملازمت اختیار کر کے دہلی پہنچ گئے۔

ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا حلقہ دہلی میں موجود تھا۔ لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر مجاز ملازمت سے علاحدہ ہو گئے یا علاحدہ کر دیے گئے۔ ایک طرف شغل نا و نوش کی وجہ سے پیدا ہونے والی بے اعتدالیاں، دوسری طرف ایک خاص قسم کی ظرافت، فقرے بازیاں اور جملے کسنے کی عادت۔ انھیں سب نے سنگین صورت اختیار کر لی ؎

دہلی کا حسن تو سب کچھ ہے مانا
مگر خود عشق تو جالندھری ہے

قیامِ دہلی کے درمیان کی دو باتیں بہت اہم ہیں ـــ ایک تو شراب نوشی کی عادت لت کی صورت اختیار کر گئی۔ اور مجاز اس میدان میں بھی اپنے دوستوں اور ہم عصروں سے آگے نکل گئے۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ

انھیں ایک عالی مرتبت "زہرہ جبیں" سے عشق ہوگیا۔

"دلّی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی، چنچل، البیلی، خوبصورت، لاڈ پیار میں پلی ہوئی، عیش و عشرت کی عادی، بھاری بھرکم شوہر کی ملکیت، یا مالک جو بھی سمجھئے۔"

اب تک دل پر جو زخم آئے تھے وہ ہلکے تھے، مگر یہ زخم ایسا کاری لگا کہ اس کی چوٹ عمر بھر نہ گئی۔ شروع میں دلنوازی اور لطف و کرم سب کچھ تھا اور بعد کو آوارہ و مجنوں کا خطاب ملنے لگا، نصیحتیں کی جانے لگیں۔ آخر دربان کو حکم ہوا کہ مجاز پھاٹک میں قدم بھی نہ رکھنے پائیں۔ ؎

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لوں، یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اس حادثے نے مجاز کی ہستی کو پاش پاش کر دیا۔ وہ ریزہ ریزہ بکھر گئے، اور تباہیوں کی آندھی انھیں اڑا لے گئی۔ مجاز اپنے ہی مذاقِ طرب آگیں کا شکار ہوئے یا سماج نے اس ذہین، حساس اور ہونہار شاعر کو توڑ دیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ معصومیت میں "شوق کی بلندی" اور "ہمت کی پستی" کا نشانہ بن کر رہ گئے ؎

رگ رگ میں زمانے کی اتر کیوں نہیں جاتے
جب ٹوٹ گئے ہو تو بکھر کیوں نہیں جاتے

ملازمت ختم ہونے کے بعد کچھ دنوں دہلی ہی میں رہے۔ پھر دوسرے شہروں کے چکر لگاتے رہے۔ یہ طائر آوارہ بے سمت اڑانوں میں کب تک زندگی بسر کرتا، آخر اپنے مرکز کا رخ کیا اور لکھنؤ میں آکر اپنے والدین کے ساتھ محلہ نیو حیدر آباد کے دارالسراج میں قیام کیا۔ اس زمانے میں لکھنؤ ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ سبط حسن، علی سردار جعفری، حیات اللہ انصاری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید احتشام حسین، ڈاکٹر رشید جہاں اور احمد علی وغیرہ سب لکھنؤ ہی میں موجود تھے۔ ایک خاتون نے اپنا لال باغ کا فلیٹ دفتر قائم کرنے کے لیے دے دیا، اور "پرچم" نکلنا شروع ہوا۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز اس کے معاون مدیروں میں شامل تھے۔ ۱۹۳۹ء میں مجاز، سردار جعفری اور سبط حسن نے مل کر "نیا ادب" نکالا۔ اسی سال جوش ملیح آبادی بھی لکھنؤ آگئے اور ان کا رسالہ "کلیم" "نیا ادب" میں ضم ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس حلقے کی چار قسم کی سرگرمیاں تھیں تعلیم، ادب، سیاست اور آوارہ گردی۔ ہر چند کہ یہ حلقہ نوعمر ترقی پسندوں پر مشتمل تھا لیکن ان میں متعدد لوگ ہندستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ خصوصاً مجاز اس حلقہ میں بہت مقبول تھے۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہونے کے بعد یہ حلقہ منتشر ہوگیا۔ اسی زمانے میں حالات سے پست مجاز پر ۱۹۴۰ء میں جنون کا پہلا دورہ پڑا۔ دراصل یہ نروس بریک ڈاؤن کا حملہ تھا۔ دہلی کے معاشقے کی ناکامی اور "نیا ادب" کے ساتھیوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے اندر ہی اندر سلگتے سلگتے آخر یہ آتش فشاں پھوٹ ہی پڑا۔ علاج معالجے سے صحت ٹھیک ہوگئی تو پھر تلاشِ معاش کی فکر لاحق ہوئی۔ کچھ دن بمبئی کے محکمۂ اطلاعات میں کام کرنے کے بعد لکھنؤ واپس آگئے۔ پھر ۱۹۴۲ء میں دہلی کی ہارڈنگ لائبریری میں ایک معمولی سی ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت کے دوران گھر والوں نے مجاز کی شادی ایک برسرِ روزگار خاتون سے طے کر دی۔ وہ دہلی سے لکھنؤ "بر دکھوے" کے لیے آئے۔ لیکن ان خاتون کے والد نے یہ رشتہ نامنظور کر دیا۔ اس رشتہ کے ٹھکرا دیے جانے کا مجاز کے

حساس ذہن پر بہت بُرا اثر پڑا جس کے نتیجے میں ان پر جنون کا دوسرا دورہ پڑا۔ لکھنؤ میں ڈاکٹروں کی کوششوں اور گھر والوں کی دلجوئی سے دھیرے دھیرے طبیعت سنبھل گئی۔ جنون کی اس حالت میں وہ اپنی عظمت پر بہت زور دیتے تھے۔ مشاعروں کی فہرست تیار کرتے تو غالب و اقبال کے بعد اپنا نام لکھتے اور فہرست ختم کر دیتے۔ عالم یہ تھا کہ اب انھیں زندگی بسر کرنے کی فکر نہ تھی۔ زندگی کو خود ضرورت ہو تو انھیں بسر کر لے۔

کھانے والوں کے ساتھ کھا لینا، چلتے دیکھ کر چل پڑنا، بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے سرک جانا، عدم اور وجود کچھ ایک ہی جیسا۔ جسم تو ہے مگر آگے سراغ نہیں ملتا کہ دوسرے لوازمات کہاں بھٹک رہے ہیں۔ مشاعروں میں کھڑا کر دیا تو ہاتھ سوکھے پتوں کی طرح، آواز گویا کوسوں دور سے گرتی پڑتی چلی آ رہی ہے۔

۱۹۴۹ء میں کراچی کے ایک بڑے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ پاکستان سے واپس آئے تو پھر وہی بے اعتدالیوں کا دور شروع ہو گیا۔ شراب، مشاعرے، یارانِ بے ہنگام، شہروں شہروں کی آوارہ گردی اور اپنے آپ سے مجرمانہ حد تک غفلت۔

غرضکہ مختلف علاقوں کی "شہر نوردی" کر کے لکھنؤ واپس ہوئے تو جنون کا تیسرا حملہ ان پر پوری طرح حاوی تھا اور اسی عالم میں وہ جوش ملیح آبادی سے سخت ناراض تھے۔ جوش نے بھی ان کے لیے ایک طویل نظم "پند نامہ برائے اصلاح میاں مجاز" لکھی تھی۔

اس نظم سے مجاز کو ایسی ٹھیس لگی کہ وہ رانچی کے دماغی اسپتال میں اپنی اس جنونی کیفیت میں اکثر اس قسم کے شعر لکھا کرتے تھے:

فراق ہوں اور نہ جوش ہوں میں
مجاز ہوں سرفروش ہوں میں

وہ یہ مطلع بھی بار بار پڑھا کرتے تھے ؎

دعوا زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
تعریفِ بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اس زمانے میں وہ کہتے تھے کہ شاعر صرف دو ہیں فیض اور مجاز۔ بس۔ اُن دنوں ان کے منھ سے اکثر یہ جُملے بھی ادا ہوتے تھے:

"جہاں پناہ! ایران کا شہزادہ مراد حاضر ہے۔
ناشاد و نامراد شہزادہ مراد کو حاضر کیا جائے۔
بس ہو چکے بہانے چلو تھانے۔
اب پھر دلی جانا ہے۔ چار نوکریاں اور دو بیویاں میرے گرد گھوم رہی ہیں اور پھر بھگتنا ہے انھیں۔"

رانچی میں تقریباً چھ ماہ علاج کرنے کے بعد صحت یاب ہو کر گھر لوٹے۔ آل احمد سرور سے ملنے گھر گئے تو کہنے لگے:

"سرور صاحب! رانچی میں ایک ریسرچ کی ہے۔ شراب سے نشہ نہیں ہوتا، آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔"

۳ دسمبر ۱۹۵۵ء کو لکھنؤ میں طالب علموں کی طرف سے ایک اردو کنونشن تھا اور مشاعرہ بھی۔ ملک کے تقریباً سبھی مایۂ ناز ادیب اور شاعر شرکت کے لیے آئے تھے۔ ایسے اجتماعات اور مشاعروں کے موقع پر تجدید دوستی کے ساتھ شراب سب سے موثر ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ مجاز نے مختلف دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کا سلسلہ شروع کیا۔ تو یہ سلسلہ دراز ہوتے ہوتے تین سے چار تاریخ تک چلا۔ تین کی شب میں قیصر باغ بارہ دری میں مشاعرہ ہوا تو مجاز اپنے قابو میں تھے۔ کئی نظمیں اور غزلیں سنائیں اور خوب داد پائی۔ لیکن ان کے اندر کا چھپا ہوا مجاز بول رہا تھا ؎

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

۴ دسمبر کو ساحر لدھیانوی اور سردار جعفری کی کوششوں کے باوجود ان کی غیر موجودگی میں مجاز کے کچھ لتی شرابی دوستوں نے آخر انھیں ہتھیا ہی لیا۔

رات میں ساڑھے نو بجے کے قریب وہ لکھنؤ کے کچھ ادیبوں کو ملے تو نشے میں دُھت تھے اور شراب کے لیے روپے طلب کر رہے تھے

(باقی صـ۳۴ پر)

غزلیں

واقف رائے بریلوی
۲۲۰۔ اتری جہان آباد
تاڑتلہ، رائے بریلی

گل ہیں اور شاخِ گل پہ بار ہیں ہم
جانے کس باغ کی بہار ہیں ہم

باغباں تو ہی فیصلہ کر دے
کیا کہیں پھول ہیں کہ خار ہیں ہم

رنگ ہو، شاعری ہو، نغمہ ہو
اپنے ہی خوں سے لالہ کار ہیں ہم

مے بھلا کیا شعور چھینے گی!
زہرِ غم پی کے ہوشیار ہیں ہم

ہم کو اس طرح خاک میں نہ ملا
اے وطن تیرے شاہکار ہیں ہم

حالِ دل کہہ رہے ہیں غیروں سے
ان دنوں کتنے بے قرار ہیں ہم

اپنا ساحل کہیں نہیں واقف
آج بھی موجِ بے قرار ہیں ہم

حسن نجمی سکندرپوری
[illegible]
[illegible]

جورِ خزاں سے برسرِ پیکار ہم بھی تھے
اے نغمتِ چمن ترے حقدار ہم بھی تھے

دیکھی گلی میں بھیڑ تو قاتل کھسک گئے
پتھر چھپائے ہاتھ میں تیار ہم بھی تھے

یہ اور بات ہے ہمیں سمجھا گیا غلط
صالح روایتوں کے پرستار ہم بھی تھے

عیسیٰ نفس ہزار سہی تنگ دل ہے
اس کو خیال رکھنا تھا، بیمار ہم بھی

پڑھ کر غزل ہماری نئی نسل کے ادیب
لکھیں گے، اک نوشتۂ دیوار ہم بھی تھے

مقتل میں مصلحت کا اندھیرا تھا اس
دیکھا نہیں کسی نے، سرِ دار ہم بھی

نجمی! ہماری بھول تھی لیکن یہ چھپائیں کیوں
مسجد کے زیرِ سایہ قدح خوار ہم بھی تھے

محمد اسحٰق صدیقی
محمودِ نایاب۔ لکھنؤ

حیدرآباد کا

ایک نادرِ روزگار کتب خانہ

مارچ ۱۹۸۹ء کے آخری ہفتے میں سیر و سیاحت کا شوق مجھے حیدرآباد (دکن) لے گیا۔ اپنے دس روزہ قیام میں میں نے وہاں کیا دیکھا، کن لوگوں سے ملا اور کن چیزوں سے متاثر ہوا، اسے بیان کرنے کے لیے ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے۔ فی الحال میں آپ کو ایک ایسے اُردو کتب خانے کی سیر کراتا ہوں جسے ایک گمنام انسان نے تقریباً چالیس سال کی مدّت میں اپنا پیٹ کاٹ کر ایک ایک پیسہ جمع کر کے بنایا اور جس سے آج نہ صرف ہندستان بلکہ دیگر ممالک کے بھی اُردو ادیب اور محقق مستفید ہو رہے ہیں۔

مجھے اس کتب خانے کا کوئی علم نہ تھا اور شاید میں اسے دیکھنے بھی نہ جاتا، اگر میرے عزیز دوست اور کرم فرما جناب اسلم محمود صاحب نے اسے دیکھنے کی تاکید نہ کی ہوتی۔ میری آسانی کے لیے انھوں نے اپنے بزرگ دوست ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب کا پتہ بھی عنایت فرمایا تھا اور چلتے چلتے کہا تھا کہ "میں انھیں خط لکھے دیتا ہوں، آپ چاہیں تو ان کے وہاں ٹھہر بھی سکتے ہیں۔ ان کا مکان بہت بڑا ہے اور وہ بہت عمدہ انسان ہیں۔ ان کے مکان کے نزدیک ہی عبدالصمد صاحب کا کتب خانہ ہے جہاں اُردو رسالوں کا بہترین ذخیرہ ہے وہاں ضرور جائیے گا۔"

اس سے پہلے کہ میں آپ کو کتب خانے کی سیر کراؤں، میں اسلم محمود صاحب اور ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ ان کی بدولت ہی میری اس کتب خانے تک رسائی ممکن ہوئی۔

اسلم محمود صاحب ایڈیشنل ڈویژنل ریلوے مینجر ہیں، اور اپنے عہدے کی مصروفیت کے باوجود انگریزی اور اُردو ادب کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ مانگے کی کتابوں کے قائل نہیں۔ وہ کتابوں کی خریداری پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے ہیں اور ان کے نجی کتب خانے میں ہزاروں کتابیں ہیں، جن میں سے کچھ نادر و نایاب ہیں اور بیشتر جدید ترین۔ شعر و ادب کے علاوہ موصوف کو فنونِ لطیفہ سے بھی خاص شغف ہے۔ اسی لیے ان کے ذخیرہ کتب میں اسلامی خطاطی، مشرقی اور مغربی مصوری اور فوٹوگرافی سے متعلق ایک سے ایک خوبصورت کتابیں موجود ہیں۔ وہ برابر کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بلا مبالغہ شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جب انھیں کوئی نہ کوئی نئی کتاب کہیں نہ کہیں سے دستیاب نہ ہوتی ہو۔ انگریزی اور اُردو کے کتب فروش انھیں اپنا بہترین گاہک مانتے ہیں اور بڑے بڑے ناشر اپنی فہرست مطبوعات ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں لیکن ان کے کتب خانے تک ہر کس و ناکس کی رسائی ناممکن ہے۔ وہ اسے اپنا "حرم" سمجھتے ہیں، جہاں نامحرموں کا کیا کام؟

ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب نومبر ۱۹۸۱ء میں وزارتِ قانون کے شعبۂ اذہان میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے

ہیں (یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اسلم محمود صاحب بھی چند سال اس عہدے پر فائز رہ چکے ہیں) اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ علم و ادب کی مسلسل خدمت کرتے رہے ہیں۔ وہ "سازِ مغرب" کے مصنف ہیں جو دس جلدوں میں ہے۔ اس میں انگریزی شاعری کے ایک ہزار منظوم ترجمے ہیں (ناشر ولا اکیڈمی سن اشاعت ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۱ء) انھوں نے ۱۹۸۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے پی ایچ۔ ڈی کیا۔ ان کی تحقیقات کا موضوع تھا "انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" ان کا علمی مقالہ اسی نام سے ۱۹۸۴ء میں ولا اکیڈمی (حیدرآباد) نے شائع کیا ہے۔ "اُردو الفاظ شماری" ایک دوسرا تحقیقی کارنامہ ہے اور اسی نہج کی ایک زیادہ کارآمد اور مقبولِ عام کتاب "قرآن فہمی" ہے (دو حصے)۔

ہندو مذہب اور فلسفے پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ جس کا ثبوت ان کا اُردو ترجمہ "شریمد بھگوت گیتا" ہے۔ "بزم" (سوانحی خاکوں کا مجموعہ) ادبی شاہکار ہے اور "فطری علاج" انسانی ہمدردی کا ثبوت۔ بلا مبالغہ وہ قدیم و جدید تمدن کے امتزاج کا حیرت انگیز نمونہ ہیں۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب کے والد نواب دین یار جنگ بہادر نظام کے دورِ حکومت میں ڈائرکٹر جنرل پولیس تھے۔ ان کے سوانحِ حیات کے لیے دیکھیے "دین یار جنگ: زندگی اور کام" مصنفہ برق موسوی (ناشر ولا اکیڈمی عزیز باغ، عزیز جنگ روڈ محلہ سلطان پورہ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۲۴)۔

وِلا اکیڈمی حسن الدین احمد صاحب کے رہائشی مکان میں ہے۔ اکیڈمی کا نام ان کے دادا شمس العلماء نواب عزیز جنگ وِلا کے نام پر ہے۔ نواب عزیز جنگ تعلقدار تھے اور فارسی کے جیّد عالم۔ انھوں نے فارسی کا ایک مستند لغت "آصف اللغات" مرتب کیا تھا (۱۷ جلدوں میں حرف "ج" تک غیر مکمل) "داستانِ غم" (فارسی مرثیہ) اور "تاریخ النوائط" (خاندان نائط کی تاریخ اور معاشرتی حالات) فارسی زبان میں دوسری اہم تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ قانون مال گزاری کی تدوین کی تھی۔

بہ ظاہر حسن الدین احمد صاحب کے بارے میں یہ تفصیلات غیر ضروری معلوم ہوں گی لیکن چونکہ موصوف کا عبدالصمد صاحب کے کتب خانہ سے خاص تعلق ہے اس لیے میں نے ان کا ذکر تفصیل سے کرنا ضروری سمجھا۔

۴ اپریل کو میں نے اپنی قیام گاہ سما اہج معظم جاہی مارکیٹ سے انھیں ٹیلی فون کیا۔ میرے پروگرام کا لحاظ کرتے ہوئے انھوں نے ۱۲ بجے ملنے کا وقت مقرر فرمایا اور میں سالار جنگ میوزیم کو تیسری بار دیکھنے کے بعد ان سے ملنے کے لیے وقت کے مطابق روانہ ہوا۔ ایسے اعلا نسب والاحسب ادیب اور عالم سے ملنا میرے لیے بڑے فخر کی بات تھی۔ انھیں اور ان کے مکان کو دیکھ کر مجھے نظام کے زمانے کے طبقۂ امراء کی شان و شوکت کا اندازہ ہوا۔

صدر دروازے میں داخل ہونے کے بعد ایک خوش نما باغ نظر آتا ہے (اسی کا نام عزیز باغ ہے) جس کے دونوں طرف متعدد کمرے ہیں (جن میں ولا اکیڈمی کی مطبوعات کا ذخیرہ ہے۔ پہلے ان میں نواب عزیز جنگ کا پریس تھا جہاں وہ اپنی کتابیں طبع کراتے تھے) سامنے ایک شان دار عمارت نظر آتی ہے جس کا کچھ حصہ دو منزلہ ہے اسی عمارت کے ڈرائنگ روم میں حسن الدین احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت اخلاق سے پیش آئے چائے بسکٹ کی رسمی تواضع کے درمیان ہماری گفتگو کے خاص موضوع تھے اردو الفاظ کی تاریخ اور ہندستان کے پیغمبر۔ موصوف نے مجھے اپنا انگریزی زبان میں ایک تحقیقی مقالہ دکھایا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ قرآن مجید میں ذوالکِفل کے نام سے جس ہستی کا ذکر ہے (سورہ ۲۱ آیت ۸۵ اور سورہ ۳۸ آیت ۴۸)۔ اس سے مراد گوتم بدھ ہیں جو کپل وستو کے رہنے والے تھے۔ عربی کا لفظ کِفل "کپل" کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ان کے خیال میں مہاتما بدھ، مہابیر، رام اور کرشن ہندستان کے پیغمبر تھے۔ وہ رام چندر جی پر ایک لکچر دینے وشاکھاپٹنم جانے والے تھے۔ انھوں نے اپنے مقالے کی ایک ٹائپ شدہ کاپی، اپنی کتاب "بزم" "قرآن فہمی کا دوسرا حصہ"، "انگریزی شاعری کے منظوم اُردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" اور انگریزی کے تین کتابچے عنایت کیے جو اسلامیات سے متعلق تھے۔

کمرے میں ایک نہایت بارعب اور وجیہ شخص کی تصویر لگی ہوئی تھی جسے دیکھ کر یہ جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے دادا مرحوم شمس العلماء نواب عزیز جنگ وِلا

کی ہے جنھوں نے موجودہ عمارت بنوائی تھی۔ جیساکہ میں پہلے بتا چکا ہوں وہ جید عالم تھے۔ انھوں نے اپنی ساری کتابیں خود ہی شائع کرائی تھیں ان کی تصانیف ایک خوش نما لکڑی کی الماری میں سجی ہوئی تھیں جو پچھلے کمرے کے شروع میں رکھی ہے، اس لیے اندر داخل ہونے پر پہلی نظر اسی پر پڑتی ہے۔ حسن الدین احمد صاحب نے میری درخواست پر ان کی فارسی لغت کی ایک جلد باہر نکال کر دکھائی۔ الماری کے بائیں طرف دروازے کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر نئی وضع کے ٹیلی فون کے پہلو میں پرانی وضع کا ایک چاندی کا ٹیلی فون رکھا ہوا تھا جو خاندانی شان و شوکت کا مظہر تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے عبدالصمد صاحب کا کتب خانہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، فرمایا:

"قریب ہی ہے۔ میں ایک ضرورت سے باہر جارہا ہوں ایک آدمی ساتھ کیے دیتا ہوں، وہ آپ کو وہاں تک پہونچا دے گا۔"

صمد صاحب کا کتب خانہ عزیز جنگ روڈ پر باغ نور خاں کی جس عمارت میں ہے اس کا نام بیت المدینہ ہے۔ یہ عمارت وقف کی ہے جسے حسن الدین احمد صاحب کے چچا نواب غازی یار جنگ (جج ہائی کورٹ) نے قائم کیا تھا۔ یہ عمارت ۱۹۸۳ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ پانچ بجے کے قریب میں وہاں پہنچ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب پہلی منزل پر پہنچا تو دیکھا سلاخوں والے آہنی دروازے پر تالا پڑا ہے۔ جو شخص میرے ساتھ آیا تھا اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ قمیص پاجامے میں ملبوس ایک دوہرے بدن کے سانولے انسان نے تالا کھولا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی صمد صاحب ہیں میں نے اپنے ہمراہ آئے رہبر کو رخصت کیا اور وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ ایک چھوٹی میز کے آمنے سامنے بیٹھنے کے بعد میں نے اپنا نام بتایا اور کہا۔ "لکھنؤ سے آرہا ہوں۔ "فنِ تحریر کی تاریخ" کا مصنف ہوں۔"

فوراً بولے: "تو پھر یوں کہیے کہ آپ نگار کے اسحاق صاحب ہیں کیوں کہ کتاب سے پہلے آپ کے مضامین اسی عنوان سے نگار میں شائع ہوتے تھے۔"

میں نے کہا۔ "آپ بجا فرماتے ہیں۔ آپ کا حافظہ قابلِ رشک ہے۔"

میں نے دیکھا کہ سامنے دیوار پر دو تصویریں لگی ہوئی ہیں، جن میں سے ایک حسن الدین احمد صاحب کی ہے اور دوسری ان کے چچا نواب غازی یار جنگ کی۔ صمد صاحب کی میز اُردو کتابوں اور رسالوں سے ڈھکی ہوئی تھی، اس کے ایک کونے میں بہت سے انڈیکس کارڈ رکھے ہوئے تھے۔ جلد ہی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے کتب خانے کی سیر کرائی کئی کمروں میں لے گئے۔ بیشتر کتابیں اور رسالے فرش پر رکھے نظر آئے۔ کچھ ریک پر قرینے سے آراستہ تھے۔ معلوم ہوا کہ کتابوں اور رسالوں کی درجہ بندی اور ترتیب کا کام جاری ہے۔ ایک کمرے میں ویکیوم کلینر نظر آیا۔ میں نے کہا:

"آپ کے پاس ویکیوم کلینر بھی ہے؟"

فرمایا: "اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ گرد بہت ہے۔"

ایک دوسرے کمرے میں ایک صاحب نظر آئے جو فرش پر بیٹھے قلم کاغذ لیے رسالوں کی فہرست تیار کر رہے تھے۔ معلوم ہوا وہ اسی کام کے لیے ملازم ہیں۔ پہلے وہ کتب و رسائل کا معائنہ کرنے کے بعد ان کی فہرستیں تیار کرتے ہیں اور پھر صمد صاحب ان فہرستوں کی مدد سے انڈیکس کارڈ بناتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ رسالوں اور کتابوں کی مرمت اور جلد سازی کے لیے ایک دفتری بھی ملازم ہے۔

باتیں کرتے ہوئے ایک اور کمرے میں لے گئے جہاں ان کا کھانا پکانے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ خود اسٹوو پر چائے بنا کر پلائی اور ایک بڑا سا ڈبہ کھول کر سامنے رکھا جو نہایت لذیذ میٹھے بسکٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے دریافت کیا:

"کیا آپ خود کھانا پکاتے ہیں؟"

بولے "جی ہاں۔"

پوچھا "کیا آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں؟"

بولے۔ "بیوی امریکہ میں ہے۔ کوئی بچہ نہیں ہے۔"

یہ بھی معلوم ہوا کہ صمد صاحب کی ایک بہن بھی ہیں جو امریکا کی شہریت رکھتی ہیں۔

اس کے بعد اُن کے کتب خانے کے بارے میں باتیں شروع ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے کتب خانے میں ۹۰۰ مختلف ناموں کے قریباً پچاس ہزار اُردو رسالے موجود ہیں جن رسالوں کی مکمل فائلیں موجود ہیں ان میں اُردوئے معلیٰ، تہذیب الاخلاق، دل گداز، الہلال، البلاغ، نگار، زمانہ، ہمایوں، ساقی، نیرنگِ خیال وغیرہ نہایت بیش قیمت ہیں۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے کتب خانے میں رسالوں کے علاوہ

تقریباً پندرہ ہزار کتابیں ہیں جن میں سے ۳۵۰۰ نایاب یا کمیاب ہیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان کے کتب خانے میں تقریباً ۳۰۰ سفرنامے ہیں، اتنے ہی تذکرے ہیں، ۱۶۸ خودنوشت سوانح عمریاں ہیں، ۱۶۶ سوانحی خاکے ہیں۔ مکتوبات کے مجموعوں کی تعداد ۸۷ ہے۔ مشاہیر کے بارے میں ۷۰۰ کتابیں ہیں۔ فن صحافت پر ۲۲، ۲۳ کتابیں، ڈھائی سو کے قریب طنز و مزاح کی کتابیں ہیں۔ شکسپیر کے ترجمے ۳۲ کے قریب ہیں پچاس لغات اور بے شمار کتابچے ہیں۔

ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ اُردو زبان میں مختلف موضوعات پر کتنا زیادہ کام ہو چکا ہے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کے کتب خانے میں غالبؔ کے بارے میں رسالوں کے تقریباً ۱۵۰ خاص نمبر ہیں۔ غالبؔ کے کلام کی ۵۲ شرحیں ہیں۔ اقبالؔ کے بارے میں تقریباً ۲۵۰ کتابیں ہیں۔ افسوس کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں کوئی بھی کتاب نہ دیکھ سکا۔

صمد صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُردو زبان میں سائنس پر ہزاروں کتابیں ہیں۔ پہلے رُڑکی انجینئرنگ کالج کا پورا نصاب اُردو میں تھا۔ غالباً اُردو میں سب سے پُرانی سائنس کی کتاب "بحرِ حکمت" ہے جو ۱۲۱۴ ہجری میں یعنی اب سے تقریباً دو سو سال پہلے چھپی تھی اور اسٹیم انجن کے بارے میں ہے۔

ان کے کتب خانے میں ہندو مذہب کی مقدس کتابوں کے اُردو ترجمے بھی ہیں اور عیسائی مذہب کے بارے میں تبلیغی ادب بھی۔ ان کے علاوہ عربی، فارسی کتابیں اور پانچ سو کے قریب قلمی نسخے ہیں۔ یہی نہیں ہندستان اور پاکستان کے سبھی تاجرانِ کتب اور ناشرین کی شائع کردہ فہرستِ کتب بھی موجود ہیں۔ سب سے پُرانی فہرست ۱۸۸۲ء کی ہے۔

مجھ سے نہ رہا گیا اور پوچھا "آپ نے اندازاً اب تک کتنا روپیہ اردو کتابوں اور رسالوں کی خریداری میں صرف کیا ہوگا؟"

فرمایا "ساڑھے تین لاکھ"۔ (اس وقت بلاشبہ ان کے ذخیرے کی قیمت اس کی دس گنا ہوگی)۔ فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا اور ان کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟

یہاں سے ہماری گفتگو کا رُخ کتابوں اور رسالوں سے خود اُن کی ذات کی طرف مڑ گیا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کا ذریعہ معاش موٹر کاروں کی مرمت ہے تو میں دنگ رہ گیا اور سوچنے لگا کہ موٹروں کی مرمت سے اتنا روپیہ کیسے فراہم ہوا کہ وہ ایسا نادر روزگار کتب خانہ بنا سکے۔

دریافت کرنے پر بتایا کہ ان کا پورا نام محمد عبدالصمد خاں ہے۔ سنہ پیدائش ۱۹۳۰ء عیسوی ہے (بہ مقام پربھنی، مہاراشٹر جہاں والد سروس میں تھے) جامعہ ملیہ دہلی میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۲ء تک تعلیم پائی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ ان کے والد حامد علی خاں حیدرآباد (دکن) میں غالباً محکمۂ پولیس میں ملازم تھے اور ۱۹۶۲ء میں موضع شاہ نگر ضلع فتحپور (یوپی) میں انتقال ہوا

صمد صاحب کو لڑکپن سے مشینوں میں دلچسپی تھی، خاص کر موٹروں میں، اسی لیے جلد ہی ایک ماہر موٹر مکینک بن گئے۔ ۱۹۵۵ء سے موٹروں کی مرمت اور پُرانی موٹروں کی مرمت کر کے انھیں فروخت کرنے کا کام شروع کیا۔ ان کی ورک شاپ حیدرآباد اور ضلع نظام آباد میں تھی، انھیں کتابیں اور رسالے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ اسکول میں جو کتابیں انعام میں ملی تھیں وہ موجودہ کتب خانے کی بنیاد بن گئیں اور آج تک محفوظ ہیں۔ جیسے جیسے آمدنی بڑھتی گئی کم سے کم پر گزارہ کر کے زیادہ سے زیادہ روپیہ کتابوں اور رسالوں کی خریداری پر خرچ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک قابلِ فخر کتب خانہ بن گیا۔

چند سال کلکتہ میرین انجینئرنگ کمپنی کے فلائی ایش ڈویژن میں ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ اپنی دن رات کی محنت سے کمپنی کو بہت فائدہ پہنچایا۔ پانچ چھ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ دو دو موٹریں ان کے آنے جانے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ سیکڑوں مزدوروں کی نگرانی کرتے تھے اور کلکتہ ایسے شہر میں انھیں شکایت کا موقع نہ دیا اور اتنا مطمئن رکھا کہ ان کی ملازمت کے دوران مزدوروں کی یونین بننے اور ہڑتال کی نوبت نہ آئی۔ پھر یہ سوچ کر ملازمت کی وجہ سے وہ اپنی کتابوں اور رسالوں کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ دیمک لگنے اور بارش میں برباد ہونے کا اندیشہ ہے، ملازمت چھوڑ دی اور ستمبر ۱۹۸۶ء میں اپنا کتب خانہ ٹیٹا گڑھ (کلکتہ) سے لے کر حیدرآباد چلے آئے۔

پہلے ان کا کتب خانہ پبلک گارڈنس (Public Gardens) کے سامنے والی گلی کی پرانی عمارت فیض بلڈنگ میں تھا۔ پھر اکتوبر ۱۹۸۸ء میں

بیت المدینہ میں منتقل ہوگیا۔ یہ وقف کی عمارت ہے، جس کی پہلی منزل کے پانچ کمرے اور دو بڑے ہال کتب خانے کے لیے کرائے پر حاصل کیے گئے ہیں۔ صمد صاحب نے مجھے بتایا کہ کرائے کی رقم (برائے نام) حسن الدین احمد صاحب مقامی چندوں اور عطیوں سے بہ دقت تمام فراہم کرتے ہیں۔ کتب خانے کا مکمل پتہ یہ ہے:

اردو ریسرچ سنٹر
بیت المدینہ، عزیز جنگ روڈ، نور خاں بازار
حیدرآباد - ۲۴...۵

میں نے دریافت کیا کہ آپ نے کتب خانے کا نام اپنے نام پر کیوں نہ رکھا۔؟ خدابخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رامپور کی طرح؟

فرمایا: "ڈاکٹر گیان چند جین اور دیگر احباب کی رائے سے یہ نام رکھا گیا۔ اپنے نام کی شہرت کا کوئی شوق نہیں۔"

اُردو ریسرچ سنٹر نے (جو رجسٹرڈ ہے) چند اہم کتابیں بھی شائع کی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

سلسلہ مطبوعات نمبر ا : فقرات سرسید۔ سرسید احمد خاں کی ۱۸۵۸ء کی مؤلفہ نایاب درسی کتاب۔ مرتبہ حکیم محمد حسین خاں شفا
صفحات ۱۶ - ۱۹۸۸ء قیمت ۳ روپے

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲: ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال۔ ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر اُردو یونیورسٹی آف حیدرآباد
صفحات ۴۶۰ + ۱۶، ۱۹۸۸ء قیمت ۱۲۵/ روپے

صمد صاحب نے ازراہ کرم مجھے دونوں کتابیں عنایت کیں۔ ان کے علاوہ ماہنامہ "شاداب" (حیدرآباد) کا ستمبر ۱۹۸۰ء کا شمارہ بھی عنایت فرمایا جس میں "وہ مکینک صاحب" کے عنوان سے رضا علی عابدی صاحب کا ایک مضمون صمد صاحب کے بارے میں ہے۔

مضمون کے پہلے صفحہ کے نیچے بی۔ بی۔ سی لندن اور آخری صفحہ پر "ماخوذ" لکھا ہے لیکن مکمل حوالہ نہیں دیا۔ لکھنؤ واپس آنے کے بعد میں اپنے کرم فرما اور دوست ڈاکٹر نیر مسعود رضوی سے ملا۔ اور حیدرآباد کے اس اہم کتب خانے اور اس کے حیرت انگیز بانی کا حال بیان کیا۔ موصوف نے فرمایا کہ وہ صمد صاحب کے بارے میں مذکورہ بالا مضمون پڑھ چکے ہیں اور انھوں نے حوالے کے لیے اصل کتاب لا کر دکھائی، جس کی تفصیل یہ ہے:

کتب خانہ
پاکستان اور ہندوستان میں ہماری قدیم کتابیں
کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں۔
بی، بی، سی، لندن کی اُردو سروس کے سلسلے وار
پروگرام "کتب خانہ" پر مبنی دستاویز
رضا علی عابدی
سعد پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۸۵ء

رضا علی عابدی صاحب نے اپنے مقالے کی ابتداء اتنے دل کش انداز میں کی ہے کہ جی چاہتا ہے پورا اقتباس نقل کر دوں:

"پرانی داستانوں میں ہم نے ایسے قصے بارہا پڑھے ہیں جن میں لوگ اندھیرے غاروں اور سُرنگوں میں چلتے گئے، چلتے گئے ۔۔ اور اچانک ایک چمکتے جگمگاتے محل میں نکلے جس کے طاقوں میں ہیروں کے، نیلم، پکھراج اور زمرد کے اتنے ڈھیر لگے تھے کہ ہوا کے ذرا سے جھونکے سے بھی یہ ہیرے اور موتی فرش پر یوں گرنے لگتے تھے جیسے بہت بڑے نقارے پر بارش کی موٹی موٹی بوندوں کے ساتھ چھوٹے بڑے اولے بھی گرا کرتے ہوں۔

کچھ ایسا ہی منظر ہم نے دکن کی سطح مرتفع پر آباد گنبدوں میناروں، فصیلوں، محرابوں، باغوں اور فواروں کے شہر حیدرآباد میں بھی دیکھا۔

باغ عامہ کے سامنے ایک گلی میں پہنچ کر ہم ایک ٹوٹی پھوٹی ادھوری اور پرانی عمارت میں داخل ہوئے۔ بالٹیوں کے بھرنے والی ٹونٹیوں سے ٹکراتے اور ربر کے پائپ کو پھلانگتے، بوسیدہ اور پُرپیچ سیڑھیوں

پر چڑھتے، نیچی چھتوں سے سر ٹکرا جانے کے خوف سے جھکے جھکے ہم اس آدھی پکّی آدھی کچّی عمارت کی چھت پر پہنچے اور وہاں بعد میں تعمیر کیے گئے نسبتاً نئے اور کشادہ کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مچانوں پر اور طاقوں میں کتابیں ہی کتابیں چُنی ہیں۔ رسالوں دستاویزوں، قلمی نسخوں، بھاری بھرکم جلدوں اور وزنی مطبوعات کے وہاں ڈھیر لگے ہیں، اور ان کو چُن چُن کر سجانے والا ایک شخص سہما بیٹھا ہے کہ کہیں ہوا کا کوئی ذرا سا جھونکا انھیں اڑا نہ لے جائے۔ یہ اسی سہمے ہوئے شخص کی داستان ہے۔

محمد عبدالصمد خاں پیشے کے اعتبار سے موٹر مکینک تھے مگر ذوق کے اعتبار سے کتابوں کے شیدائی تھے ہفتے بھر موٹروں کی مرمت کرتے تھے اور چھٹی والے دن نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان کر کتابیں جمع کیا کرتے تھے۔ آخر میں یہ ہوا کہ اس دوڑ میں زمانے کی تیز رفتار کاریں پیچھے رہ گئیں اور پرانے زمانے کی بوجھل کتابیں آگے نکل گئیں ــــــ عبدالصمد خاں نے اپنا موٹر گیرج بند کیا اور اپنے کتب خانہ کو ریسرچ سنٹر کا نام دے کر اسے تحقیق اور مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے عام لوگوں کے لیے کھول دیا۔"

اس تمہید سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رضا علی عابدی صاحب صمد صاحب کے کتب خانے سے کتنا زیادہ متاثر ہوئے۔

میرے دل پر صمد صاحب کے اس بیان کا، جسے رضا علی عابدی صاحب نے نقل کیا ہے، بڑا اثر پڑا کہ :

"کتابیں میں اس طرح خریدتا ہوں کہ میں اگر کھانا کھانے جا رہا ہوں اور راستے میں کوئی کتاب فروخت ہو رہی ہے تو سوچتا ہوں کہ چلو بھئی آج رات کا کھانا نہ سہی، کل ناشتہ ہی کرلیں گے، یہ سوچ کر کتاب خرید لیتا ہوں۔"

افسوس کہ فاضل مقالہ نگار نے یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے صمد صاحب کا کتب خانہ کب دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنی کتاب کی اشاعت یعنی ۱۹۸۵ء سے قبل دیکھا ہوگا۔ اب اس کتب خانہ کا مقام بھی بدل گیا ہے، وہ باغ عامہ کے سامنے گلی میں نہیں ہے بلکہ عزیز جنگ روڈ پر ہے۔

یہاں یہ بتانا میرے لیے باعثِ مسرّت ہے کہ رضا علی عابدی صاحب کی نہایت دل چسپ کتاب میں صفحات ۸۲ - ۸۱ پر ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی کے حوالے سے لکھنؤ کے محمد رشید صاحب اور اسلم محمود صاحب کے نجی کتب خانوں کا نیز میرے مختصر ذخیرۂ کتب کا بھی ذکر ہے۔ رشید صاحب اسلم محمود صاحب کے اور میرے مخلص دوست ہیں۔ اگست ۱۹۸۲ء میں سول سکریٹریٹ کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں) اپنے کتب خانے کا ذکر (اور وہ بھی بی۔ بی۔ سی لندن سے) دیکھ کر مجھے جو حیرت اور خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن صمد صاحب کے بارے میں "وہ مکینک صاحب" کا عنوان دیکھ کر دُکھ ہوا۔ آخر آدمی کو پیشے کے لحاظ سے ہندستان میں کیوں جانچا جاتا ہے۔

صمد صاحب سے معلوم ہوا کہ ان کے کتب خانے کے بارے میں بعض محققین کی رائے ہے کہ اُردو پر کوئی تحقیقی کام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کتب خانے سے استفادہ نہ کیا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے کتب خانے سے ہندستان کے علاوہ پاکستان، انگلستان اور امریکا کے ادیب و عالم بھی مستفید ہوتے رہے ہیں۔ بتیس لوگوں نے ان کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ تحقیقات کے موجودہ پست معیار پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا:

"آج کل سب سے آسان کام پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا ہے۔ بعض ایسے بھی محقق ہیں، جو دس دس چیزوں کے بارے میں تحقیق میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ تحقیق کا حق تبھی ادا ہو سکتا ہے کہ زندگی میں کسی ایک موضوع پر تحقیق کی جائے۔"

صمد صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ضرورت مندوں کو کتابوں اور رسالوں کے مطلوبہ صفحات کی فوٹو کاپیاں بھی فراہم کرتے ہیں اور اس کے لیے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ کبھی کبھی وہ آنے والوں کو کاغذ اور قلم تک فراہم کرتے ہیں۔ خلاف کتابت اور فوٹو کاپیاں تیار کرنے کا خرچ وہ خود برداشت کرتے ہیں۔ ریسرچ سنٹر کے پاس نہ تو اپنا اُردو ٹائپ رائٹر ہے اور نہ زیراکس

(ZEROX) مشین۔

میں نے دریافت کیا کہ آخر آپ کو ان خدمات کے صلے میں کیا ملتا ہے؟ فرمایا: "گالیاں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں صرف میکنک ہوں مجھے کچھ آتا جاتا نہیں۔ صرف کتابیں اور رسالے جمع کر لیے ہیں"۔ یہ جان کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اب میں ناظرین سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا وہ شخص جس کی نگرانی میں درجنوں طالب علم پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کریں اور وہ انھیں گائیڈ کرے اور جس کی معلومات سے یونیورسٹی کے بڑے بڑے پروفیسر صاحبان اور نامور محققین مستفید ہوں۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنی یونیورسٹی سے انھیں ان کی خدمات کے صلے میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دلوادیں تاکہ "میکنک صاحب" ایسے خطاب سے انھیں احساس کمتری میں مبتلا نہ کیا جا سکے۔ میکنک ہونا یا اپنی روزی روٹی کے لیے کوئی بھی پیشہ اختیار کرنا برا نہیں۔ سوال اس بات کا ہے کہ انسان اپنی ذات سے سماج کو کتنا فائدہ پہنچاتا ہے صمد صاحب نے بلاشبہ اُردو زبان کی جو بے لوث خدمت کی ہے اور اس کے قیمتی سرمائے کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے جتنی تکلیفیں برداشت کی ہیں اس کا صلہ ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ہی ہو سکتی ہے۔

میں نے صمد صاحب کو دل برداشتہ پایا۔ وہ اس لیے پریشان ہیں کہ کتابیں اور رسالے تو انھوں نے بہت جمع کر لیے ہیں لیکن ان کی خاطر خواہ حفاظت نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے کئی ہزار روپے ماہوار کی مستقل ضرورت ہے۔ وہ وسائل کی کمی، اُردو والوں کی بے حسی اور زبانی جمع خرچ کے شاکی تھے۔

میں شام کو ساڑھے چھ بجے ان کے یہاں سے واپس ہوا اور راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ صمد صاحب کے بعد ان کے کتب خانے کا کیا ہوگا؟ اسے کون چلائے گا؟ کیا دوسرے کتب خانوں کی طرح یہ کتب خانہ بھی دستبرد زمانہ کی نذر ہو جائے گا؟

کیا اچھا ہوتا اگر حیدرآباد کی اُردو یونیورسٹی یا کوئی اُردو اکادمی یہ بیش بہا کتب خانہ معقول معاوضہ دے کر صمد صاحب سے خرید لیتی تاکہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہوتی رہتیں۔

**

مجاز: ایک رُومانی افسانہ ۔۔۔ صد ۲۶ کا بقیہ

آخر ایک "نودولتیا" دوست انھیں مل ہی گیا۔ یہ لوگ لال باغ کے ایک شراب خانے میں پہنچے۔ اور رات ۲ بجے تک شراب نوشی کا سلسلہ جاری رہا۔ بقیہ لوگ تو دامن بچا کر کھسک لیے اور مجاز وہیں کھلی چھت پر سردی میں پڑے رہے۔

۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو دن میں شراب خانے والوں نے جب انھیں بے ہوش پڑا پایا تو بلرامپور اسپتال پہنچایا۔ ڈاکٹروں نے ڈبل نمونیہ تجویز کیا۔ کسی طرح جب ان کے گھر اور گنگا پرشاد ہال میں خبر پہنچی، جہاں اُردو کنونشن ہو رہا تھا، تو سب ہی پر جیسے ایک بجلی گر پڑی ہو سب فوراً اسپتال پہنچے تو آکسیجن دی جا رہی تھی اور دماغ کی رگیں پھٹ چکی تھیں۔ آخر رات کو دس بجکر بائیس منٹ پر ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

۶ر دسمبر کی شام کو ۵ بجے جنازہ دارالسراج سے اٹھ کر روانہ ہوا اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں نشاط گنج کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ اس سے قبل نہ تو لکھنؤ میں کسی شاعر کی موت پر اتنا سوگ منایا گیا اور نہ اتنی کثیر تعداد میں مختلف مذہبوں کے لوگ کسی کے جنازے میں شریک ہوئے۔

۷ر دسمبر ۱۹۵۵ء کی شام کو رفاہِ عام کلب کے وسیع و عریض ہال میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب سے موثر تقریر عصمت چغتائی کی تھی:۔

"میں نے اکثر مجاز کو اس کی بعض عادتوں پر ڈانٹا اور کبھی غصے میں کہا کہ۔ اس سے بہتر ہے مجاز کہ تم مر جاتے۔ مجاز نے جیسے منہ پر طمانچہ مار دیا اور کہا۔ لو مر گیا۔ تم اس کو اتنا بڑا کام سمجھتی تھیں"۔

فردوسِ حسن و عشق ہے دامانِ لکھنؤ　　آنکھوں میں بس رہے ہیں غزالانِ لکھنؤ
ہر سمت اک ہجوم نگارانِ لکھنؤ　　اور میں کہ اک شوخ غزلخوانِ لکھنؤ

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

غزلیں

سیّد حیات وارثی
باغ مولوی انوار۔ لکھنؤ

میرے دل پر جب کوئی زخمِ ستم تازہ لگا
مجھ کو اپنی ہی وفاداری کا خمیازہ لگا

ٹوٹ سکتا ہی نہیں باتوں سے موجوں کا حصار
ناخدا ساحل سے مت طوفاں کا اندازہ لگا

چھُو نہ پائی دامنِ مظلومیت صدیوں کی گرد
جب بھی دُہرایا گیا وہ واقعہ تازہ لگا

ریت پر خیمے لگا کر ہم نے کیں حد بندیاں
منتشر اے زندگی جب تیرا شیرازہ لگا

لے کے آنسو دوسروں سے مُسکراہٹ ان کو دی
ہو سکے تو میری دُشواری کا اندازہ لگا

رنگ خاکے میں نہ بھر تو دوسروں کو دیکھ کر
اپنے قد کو ناپنے کے بعد دروازہ لگا

کیا شکایت دوسروں سے عکس بھی اپنا نہیں
آئینے کو غور سے دیکھا تو اندازہ لگا

سعید اختر نظامی
اوستھی ہوزری۔ نخاس، لکھنؤ

نام سنتے ہی ترا جیسے ٹھہر جاتی ھیں
یہ ہَوائیں جو اِدھر آتی، اُدھر جاتی ھیں

ایک دو پل کی مسرّت کے لیے دُنیا میں
آفتیں کتنی اک انساں پہ گزر جاتی ہیں

کبتک اس آس پہ تدبیر کے ناخن رکھیں
سنتے آئے ہیں کہ تقدیریں سنوَر جاتی ہیں

راز مضمر ہے توانائی کا یک جہتی میں
پتّیاں ٹوٹ کے شاخوں سے بکھر جاتی ہیں

ہم بھی لوٹ آئے جہاں سے غمِ نظارہ لیے
حسرتیں جا کے اسی در پہ ٹھہر جاتی ہیں

مچھلیاں سانس زمیں پر نہیں لیتیں اختر
اپنے ماحول سے ہٹتی ہیں تو مر جاتی ہیں

ایم کوٹھیاوی راہی
ایڈیٹر: اشتراک ویکلی، قاضی پور خورد گورکھپور

افسانہ

مٹی بنے نہ راکھ

دریا کا ٹھنڈا پانی اس کے اجلے تلووں کو چوم رہا تھا۔ وہ ایک بھوری چٹان پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی سرمئی آنکھوں میں کسی کا انتظار تھا شام ڈھل رہی تھی۔ اس نے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالنی شروع کی۔ پُل کے نیچے والی خالی جگہ جو چتا جلانے کے لئے مخصوص تھی، اسے کچھ عجیب سی لگی۔

دوسرے کنارے پر کھڑے ببول کے درخت اور ان کی سوکھی شاخوں سے جھانکتے ہوئے نکیلے کانٹے شفق کو گھور رہے تھے، پیچھے ساحل تک آکر ختم ہو جانے والی پیچ روڈ سنسان ہو چکی تھی اسے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ کوئی اگر آکر اس وقت اس پر ہاتھ ڈال دے تو؟ جسم میں جھرجھری محسوس ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگی کس کا انتظار ہے؟ کس کے لئے شہر سے کٹ کر وہ اس بھوری چٹان پر آبیٹھی ہے۔ اچانک اسے پیچ روڈ پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سر گھمایا اور خوشی سے جھوم اٹھی ہاں، اسی کا انتظار تھا۔ مگر وہ اسکے پاس آنے کے بجائے شیشم کے اس سوکھے پیڑ کے پاس چلا گیا تھا جو ساحل کی اس ڈھلان پر برسوں سے کھڑا پانی میں جھانک رہا تھا۔ وہ اس کی جڑ سے لگے پتھر پر جا بیٹھا۔ اور سگریٹ سلگانے لگا وہ اس کا نام سوچنے لگی، اور پھر یہ سوچنے لگی کہ جس گلی میں اس کا مکان ہے، اس گلی میں اب وہ کیوں نہیں رہتا؟ وہ کبھی اس کے پڑوس ہی میں تو رہتا تھا۔ اور نام اس کا ہری کرشن تھا۔ پھر وہ اپنے موجودہ نام کے بارے میں سوچنے لگی، تب اس کا نام صبیحہ تھا۔ مگر اب وہ کرن کہی جاتی تھی۔

اب وہاں شام کی جگہ رات نے لے لی تھی۔ وہ چٹان کو چھوڑ کر پل پر چلی گئی تھی۔ اور ریلنگ سے لگی نیچے پانی کے پاس والی اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں چتا جلائی جاتی ہے اور پھر ڈھلان والے اس سوکھے شیشم کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی جڑ سے لگے پتھر پر وہ ابھی تک بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا جس کی وہ منتظر تھی، اور یہ منظر صاف صاف اس لئے نظر آرہا تھا کہ آسمان پر چاند نکل آیا تھا جس کی روشنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ خزاں کی شام جیسی خزاں کی رات بھی ہوتی ہے، دھندلی دھندلی سی گرد آلود رات ہلکی خنکی کے باوجود اس کا بدن جل رہا تھا۔ ادھر، وہ بے پروا سا بیٹھا دھواں اڑائے جا رہا تھا۔ پل سے شیشم کی دوری کچھ زیادہ نہ تھی۔ مشکل سے چالیس پچاس قدم۔ وہ سوچنے لگی، تب وہ ہری کرشن تھا اور وہ صبیحہ۔ اس کے رونگٹے جلنے سے لگے۔ اب وہ کرن ہو چکی تھی۔ اس لحاظ سے وہ خوش تھی اس کے اور ہری کرشن کے بیچ اب کسی دیوار کا معاملہ نہیں کھڑا ہو سکتا ہے، مگر آخر وہ اس سے بے نیاز سا کیوں ہے؟ پھر وہ سوچنے لگی، صبیحہ سے کرن وہ کس کے لئے بنی تھی؟ ہری کرشن کے لئے تو نہیں؟ تو پھر —— اُسے یاد کرنا پڑا۔ سنگھ جی کتنے اچھے تھے، گھر کا سارا خرچ اپنے سر رکھا تھا انھوں نے اور پھر اس کی پڑھائی بھی اُنہی کی مرہونِ منت تھی۔ اس کے باوجود وہ کھڑ پینتی تھے تھی تو اسے صبیحہ کا گلا گھونٹ کر کرن بننا پڑ گیا تھا۔ مگر در پردہ بات اور ہی کچھ تھی۔ کوئی اپنے مذہب یا دھرم کا گلا تن آسانی کے لئے نہیں گھونٹتا اس قسم کے "قتل" محبت ہی کراتی آئی ہے اب تک ۔ مگر ہری کرشن کو کیا پتہ اس کے لئے کبھی اس نے کہا بھی تو نہیں تھا۔ اور نہ ہی محبت کی بات آئی تھی، رسمی تعلقات کے بیچ۔

ریلنگ سے لگی کرن سوچتی رہی۔

پتھر پر بیٹھا وہ سگریٹ پھونکتا رہا۔ شاید اُس نے اس طرف کوئی

دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ شاید اس نے کرن کو دیکھا بھی نہیں تھا کہ ابھی کہاں بیٹھی تھی، ابھی کہاں کھڑی ہے، اس نے سوچا ہری کرشن کی محویت کیسے ختم کی جاسکتی ہے۔ آواز دے کر؟ پانی پر کنکر اچھال کر، خود اس کے پاس جا کر؟ مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیوں ؟ یہ اسے خود بھی نہیں معلوم۔

سنگھ جی سے شادی کرنے کے لئے وہ صبیحہ سے کرن نہیں بنی تھی۔ حالانکہ سنگھ جی بہت خوش ہوئے تھے، اور اب جلد ہی اس سے شادی کرنے والے تھے۔ اور اس نے سوچا تھا کہ عین موقع پر مکر جائے گی۔ سنگھ جی اپنی راہ لیں گے۔ اور پھر...... کتنا رسک لیا تھا اس نے یہ سوچ کر کسی روٹھے ہوئے کو منانا اُسے خوب آتا تھا۔ اسے یقین تھا، ہری کرشن کو منالے گی منٹوں میں۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ ایسا کرنے سے بات الٹ بھی سکتی ہے۔ جب یہ خبر اڑتی ہوئی اس کے پاس پہونچی کہ سنگھ جی کی محبت میں صبیحہ کرن بن گئی ہے تو اس نے راتوں رات مکان بدل دیا۔ گلی چھوٹ گئی۔ نہ جانے کہاں، کس محلے میں جا بسا۔ اور پھر وہ بہت روئی، سنگھ جی اس کے آنسو نہ پونچھ سکے........ ریلنگ سے کرن نے پل کے نیچے جھانکا اور اس جگہ کو گھورنے لگی جہاں چتا جلائی جاتی ہے۔ اسے لگا اچانک ایک چتا کہیں سے آگئی جس کے شعلے پل کے پتھروں کو چھو رہے ہیں۔ اس نے یاد کیا۔ سنگھ جی کا اچانک ہارٹ فیل ہوگیا تھا، وہ یہیں لائے گئے تھے۔ ان کے مردہ جسم کو جلتے دیکھ کر اس نے سکون سا محسوس کیا تھا۔ اور تبھی سے ہری کرشن کا انتظار شروع ہوگیا تھا۔

ہری کرشن، ہری کرشن

اچانک وہ پکار اٹھی، مگر ادھر سے کوئی آواز نہیں ابھری

وہی ڈھلان کا سوکھا شیشم، جس کی جڑ سے لگے پتھر پر بیٹھا ایک دھواں اُگلتا خاموش سایہ۔

کیا ہوگیا ہے اُسے۔ شاید میرا چہرہ بدل گیا ہے، اس نے شاید پہچانا نہیں، شاید میری آواز بھی بدل چکی ہے، اس سے پہچانی نہیں گئی اس نے سوچا سنگھ جی کی چتا بجھی ہوئی محسوس ہوئی ایک دوسرا سایا پل پر، اس کے برابر سے گذرتا نظر آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ چاند جیسے اُتر آیا ہو۔ وہ کانپ سی گئی۔ وہ سایا پل سے اترتا ہوا ڈھلان والے سوکھے شیشم کی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ سنگھ جی کی چتا میں ایک آدھ چنگاری بچی رہ گئی تھی شاید جو چمک اٹھی تھی۔ اس نے دیکھا وہ چاند سا نقرئی سایا، اس دھندلے سائے سے لپٹ گیا ہے۔ وہ بوکھلا سی گئی بے اختیارانہ اس کے قدم بھی چل پڑے۔ ڈھلان والے سوکھے شیشم کی جانب جلدی جلدی تیز تیز سنگھ جی کی چتا میں بچی چنگاری چمکی گئی۔

"معاف کرنا اختر! ذرا دیر ہوگئی"

"کوئی بات نہیں ناصرہ ڈارلنگ" یہ ہری کرشن کی آواز تھی جسے اس نے اختر کہہ کر پکارا تھا۔

اُف! مذہب اور دھرم کا یہ پھیر؟

کرن چکرا کر گر پڑی۔ اسے لگا، چتا بن گئی ہے چٹاخ چٹاخ چنگاریاں اڑنے لگیں۔

اور وہ دونوں دریا کو پار کرتے ہوئے اب ان پرسکون (قبروں) سے گذر رہے تھے جن میں ایک اس کی بھی ہوسکتی تھی جو راکھ بھی نہ بن سکی!

انور لاری

غزل

افق پہ اک نیا سُورج نکلنے والا ہے
کہ زندگی کا صحیفہ بدلنے والا ہے

فقیرِ شہر نے تلوار ہاتھ میں لے لی
مزاجِ شہر کا شاید بدلنے والا ہے

تمام لوگ کسی مشورے میں اُلجھے ہیں
گمان ہوتا ہے پتھر پگھلنے والا ہے

میں جانتا ہوں مگر پھر بھی گھر سے نکلا ہوں
تمہارے ہاتھ سے پتھر اُچھلنے والا ہے

جہاد میں نہ مصلّیٰ پلٹ کے دیکھ انورؔ
وہاں سے پانی کا چشمہ اُبلنے والا ہے

غزلیں

رئیس انصاری

امین آباد - لکھنؤ

میں حرفِ ابتدا وہ انتہا تھا
سخن میں میرؔ غالبؔ سے بڑا تھا

یگانہؔ کی طرح اس لکھنؤ میں
میں نقادوں سے تنہا لڑ رہا تھا

ہوائیں سر برہنہ پھر رہی تھیں
یہاں اک معرکہ ایسا ہوا تھا

اسے ڈھونڈھا گیا آبادیوں میں
جو اک صحرا میں تنہا جل رہا تھا

مری باتوں میں جتنی تلخیاں تھیں
مری غزلوں میں اتنا ذائقہ تھا

○

حسرت سہروردی

۱۹ - ڈاس [illegible] کچھا ملائی
تروچراپلی (تمل ناڈو)

درد نے کتنے شہر بسائے چاروں اور ہیں درد کے سائے
خوشیوں کی چاہت ہے جس کو اس نگری میں کبھی نہ آئے

ہم کو چاہو ہم سے مل بیٹھو ہم کوئی غیر نہیں ہیں
ہم دیوانے ہم فرزانے ہم اپنے ہیں نہیں پرائے

ان کے غم کی بات چلی ہے اپنے غم کو بھول گیا ہوں
دونوں غم یکساں ہیں یارو چندا تارے چند کنائے

بھیڑ ہے ہنسنے والوں کی مجھ پہ لیکن اب بھی باقی ہے
ایسی آنکھ جو میرے رستے زخموں پر دو اشک بہائے

کون ہمارا کون تمہارا کون ہے اپنا کون پرایا
دل بہلانے کی باتیں ہیں کوئی کسی کے کام نہ آئے

بادل چھائے پانی برسا لیکن اپنا کھیت نہ بھیگا
ایسے بادل سے کیا لینا، برسے نہ برسے چھائے نہ چھائے

میں نے میرؔ کے رنگ کو حسرتؔ اک نیا انداز دیا ہے
کوئی مجھ کو شاعر مانے یا کوئی مجھ سے کترائے

○

شعیب شمس

پورٹ بلیر

حوصلے یوں تو بہت ہیں دلِ ناداں کے مگر
شام آتی ہے تو کھو جاتے ہیں سپنے اکثر

خوف کی تنگ حویلی سے نکلنا بہتر
ہاتھ میں اپنے صلیبوں کو لیے گھوما کر

موم کے بت کی طرح خود کو بچا کر رکھنا
کانچ کا گھر ہے تو آئیں گے یقیناً پتھر

یہ بھی ممکن ہے کوئی ساعتِ رنگیں آئے
خواب کے بند دریچوں کو کبھی کھولا کر

منزلیں کھو گئیں جب راہ کے پتھر کھسکے
راہیں دشوار تھیں تب منزلیں آئی تھیں نظر

○

ساہرت ارماں
ادبستان دین دیال روڈ، لکھنؤ

افسانہ

آدھا گنبد

"ــــ سنو، اگر میں تم سے کہوں کہ میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں تو یقین کرو گے ــ ؟"

ــ اور میں دم بخود سا اسے دیکھتا رہ گیا ــ یہ کمسن، بھولی بھالی لڑکی ــ کتنی ناتجربہ کار، دنیا کے طریقوں سے کتنی ناواقف ہے ــ کتنا بےتکا انداز ہے بات کہنے کا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بےبسی سے بولی۔

"مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا ــ یہ جذبات بھی تم ہی نے دیے ہیں ــــ میرے اندر تو کوئی احساس ہی نہ تھا ــ مجھ میں یہ نئے احساسات جگا کر اب تم میرے ساتھ کیوں نہیں ہو ــ دیکھو میرا پیار صرف تمھارے لیے جاگا ہے ــ میں نے تمھارے ہی لیے پیار کرنا سیکھا ہے ــ کیا واقعی تم اپنا تھوڑا سا بھی پیار مجھے نہیں دے سکتے۔"

"ــ میں ــ میں تمھیں کیسے سمجھاؤں ــ یہ غلط ہے، نہیں ہو سکتا۔"

"کیا غلط ہے، کیا نہیں ہو سکتا۔"

مجھے حیرت ہو رہی تھی اس کی بےباکی پر ــ آج سے پہلے اس نے کبھی مجھ سے پورے جملوں میں بات نہیں کی تھی ــ بس ہاں، نہیں میں اور آپ آپ کرتے ــ یہ تم کا تخاطب ــ اور یہ انداز، میرا سر گھومنے لگا ــــ آج وہ کمسن بچی سی نہیں لگ رہی تھی ــــ میں نے غور سے دیکھا ــ کانوں کی لووں پر ہلکی سی سرخی، آنکھوں میں بےچینی، سانسوں میں تیزی ــ چہرہ تمتمایا ہوا ــ ایک اجنبی صورت، اجنبی انداز ــ ان چند لمحوں میں کتنی بڑی ہو گئی تھی وہ ــ

"ــــ میری شادی ہو چکی ہے ــ بچے ہیں میرے ــ"

اور اچانک وہ پھر وہی کمسن بچی سی دکھائی دینے لگی ــ چہرے کی رنگت پر وہی بےنیازی آ گئی ــ مگر اس تبدیلی سے پہلے اس نے بس ایک بات کہی۔

"ــ تم نے مجھے غلط سمجھا ــ میں شادی کی بات نہیں کر رہی تھی ــ میں نے پوچھا تھا ــ کیا واقعی تم اپنا تھوڑا سا بھی پیار مجھے نہیں دے سکتے ــ ؟"

یہ واقعہ کئی سال پہلے میرے ایک عزیز دوست نے مجھے بتایا تھا ــ بلکہ لکھ کر بھیجا تھا۔ آج پرانے کاغذات چھانٹنے میں یہ واقعہ دوبارہ میرے سامنے آیا ــ میرا وہ عزیز دوست اب اس دنیا میں نہیں ہے ــ سنا تھا کہ اپنی نجی الجھنوں میں اتنا الجھ گیا تھا کہ تناؤ سے دماغ کی رگ پھٹ گئی ــ انھیں الجھنوں کی وجہ سے وہ میری شادی میں بھی نہ آ سکا تھا ــ بہت بہت معذرت لکھی تھی ــ اور میں بظاہر اس سے ناراض ہو کر روٹھ گیا تھا ــ عرصے تک اس کا بھی کوئی خط نہیں آیا ــ اور پھر یہ اطلاع ملی ــ میں اس سے اس کی الجھنوں کے بارے میں بھی نہ پوچھ سکا ــ بہت کوفت ہوئی ــــ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس لڑکی سے ملوں ــ ظاہر ہے اب وہ اتنی کمسن نہ رہی ہو گی ــ شاید کئی بچوں کی ماں ہو ــ گھر ہو گا، شوہر، ذمہ داریاں ــ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس سے اپنے دوست کے حادثے کی بات کروں ــ میں اس کے تاثرات جاننا چاہتا تھا ــ بس یوں ہی ــ کئی اور بھی خطوط ملے مجھے اپنے دوست کے، لیکن کسی میں بھی اس لڑکی کا نام یا پتہ نہیں تھا۔

حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں کئی سال بڑا تھا، اس کی شادی بھی

بہت پہلے ہوگئی تھی، میں اس کی شادی میں شریک نہیں تھا۔ اس وقت ہماری دوستی اتنی گہری نہیں تھی۔ یہ تو بعد میں ہوئی جب ایک روز ایک تقریب سے واپسی پر اس کا ایک ہلکا سا ایکسیڈنٹ ہو جانے سے ٹخنے کی ہڈی میں ضرب آگئی تھی۔ غلطی اس کی نہیں تھی، کسی کی بھی نہیں تھی۔ کبھی ہوتی بھی نہیں۔ میں نے اپنی سواری پر اسے ڈاکٹر کے یہاں پہنچایا اور پھر کئی دن خیریت پوچھنے اس کے گھر جاتا رہا۔ بہت پیاری اور دلچسپ شخصیت تھی۔ دوستی بڑھتی گئی اور پھر اس کا کوئی راز راز نہ رہ گیا۔ پھر وہ تبادلے پر دوسرے شہر چلا گیا، اور دوستی خطوں تک محدود رہ گئی۔

ایک خط میں دیگر باتوں کے علاوہ بیچ میں لکھا تھا۔

"۔۔۔ میں تمھارے راستے کی رکاوٹ بننا نہیں چاہتی ۔۔۔ میرا یقین کرو۔ مگر بس یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میرے دل میں پیار کی شمع تم نے روشن کی ہے۔ اور وہ صرف تمھارے لیے ہے۔ اگر ہو سکے تو یہ احساس میرے دل میں جلائے رکھنا۔" تم سوچ نہیں سکتے پیارے دوست کہ میں کتنی الجھن میں پڑ گیا ہوں ۔۔۔ اس کے یہ جذبات میرے لیے بہت تکلیف دہ ہیں۔ تم تو جانتے ہو میرا مزاج، میں کسی سے پیار کر ہی نہیں سکتا۔ میں اسے اپنی اوقات سے بہت اونچی چیز مانتا ہوں۔ مگر میں اس کے جذبات کی قدر ضرور کرتا ہوں اور اسے ہر طرح کی اذیت سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں اب کسی نہ کسی بہانے سے اس سے نہیں ملتا ہوں مگر اس کے چھوٹے چھوٹے خط آتے رہتے ہیں۔

"۔۔۔ آج بھی تم نہیں آئے۔ میں ایک بجے ہی فری ہو گئی تھی۔ حالانکہ تم نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ مگر پھر بھی۔"

"۔۔۔ آج میرا کوئی کلاس نہیں تھا۔ اور کچھ بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر میں کالج گئی۔ تمھیں نہ پا کر بہت بہت رونا آیا۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔"

"۔۔۔ کہاں ہو تم ۔۔۔؟؟ میں تو جیسے اپاہج ہو گئی ہوں ۔۔۔ نہ تم سے کچھ کہتے بنتا ہے، نہ خود کو سمجھاتے ۔۔۔ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے اب تو لگتا ہے میرا اپنا پن ہی مرتا جا رہا ہے۔ تم سمجھو گے نہیں، میں کہہ نہیں سکوں گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ کیا یہی کہ یوں ہی مر جاؤں۔ کھوکھلی۔ پیاسی۔"

"۔۔۔ اب میں تمھیں نہیں بلاؤں گی۔ تمھیں غلط بھی نہیں کہوں گی۔۔۔ تم تو بہت پیارے ہو۔ بس ایک بار ایک بار اپنے منہ سے کہہ دو کہ یہ انت ہے اور میں مان لوں گی۔ ایک بار مل لو۔ پلیز، میرے لیے۔"

"۔۔۔ ابھی تمھیں دور سے دیکھا۔ یقین نہیں ہو رہا ہے ۔۔۔ ہاتھوں سے تمھیں چھو کر یقین کرنا چاہتے ہیں۔ بس من کر رہا ہے جلدی سے پاس آجاؤ ۔۔۔ ایک بار تمھیں چھو کر دیکھ لیں کہ تم ہی ہو یا وہ کل والا سپنا ۔۔۔ پتہ نہیں کیوں آج اتنی تڑپ کا احساس ہے۔ لگتا ہے دل میں کئی خاص طرح کے ملے جلے احساس ڈول رہے ہیں۔ ۔۔۔ تمھیں کیا کہہ کر سمجھائیں ۔۔۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہم تمھاری دھڑکن کو محسوس کر کے یہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ، تم حقیقت ہو ۔۔۔ یا وہ کل والا سپنا ۔۔۔!"

اس وقت میرے دوست کی عمر کوئی تینتیس سال کی رہی ہوگی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ بچے بھی تھے ۔۔۔ عرصہ پہلے جب وہ اپنی پڑھائی ختم کر رہا تھا تو اس کی دوستی ایک نوعمر لڑکی سے ہو گئی تھی۔ دونوں کی دوستی بڑھتے بڑھتے جلد ہی نوجوانی کی کچی اور الھڑ محبت میں بدل گئی۔ مگر ایسے واقعات کا جو انجام ہوتا ہے وہی ہوا۔ سال ختم ہوئے۔ کوئی کہیں کوئی کہیں۔ مگر اس کچی محبت کی چھاپ میرے دوست کی نفسیات کا جز بن گئی۔ اور جب شروع شروع میں وہ نوکری میں آیا تو اس کے افسر نے اس کی سادگی اور شرافت سے متاثر ہو کر اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اور پھر اپنی نوعمر لڑکی کی پڑھائی میں مدد کرنے کے لیے اصرار کیا۔ پہلے ہی روز جو کتابوں پر نظر پڑی تو اسے اپنی بچھڑی محبت کا بستہ یاد آگیا۔ وہی کتابیں، ویسا ہی بستہ، وہی سن، اسے لگا کہ اس کی وہی دوست دوسرا روپ بنا کر اس کے سامنے ہے۔ اور وہ بالکل غیر ارادی طور پر اس کی طرف جھکتا چلا گیا۔ ہوش تب آیا جب اچانک اس افسر کی لڑکی نے پوچھا کہ "۔۔۔ اگر میں تم سے کہوں کہ میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں، تو یقین کرو گے ۔۔۔؟" اور اس نے گھبرا کر اپنا تبادلہ کروا لیا۔۔۔ پھر کوئی

سال کے بعد اس کے پڑوس میں اسی سن اسی کلاس کی ایک اور لڑکی رہنے لگی — ایک دن وہ میرے دوست کی بیوی سے ملنے گھر آئی کمرے میں کورس کی کتابیں دیکھ کر بے اختیار مانگ بیٹھی — میرا ست عجیب نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو وہ کچھ گھبرا سی گئی — اسے پتہ تھا کہ میرا دوست اچانک اس کمرے کی چار دیواری سے نکل کر کالج پتھریلی سیڑھیوں پر پہنچ چکا ہے۔ آج کوئی آٹھ سال بعد پھر وہی لڑکی ن سے کتابیں مانگ رہی تھی ——— اور اسے پھر بھاگنا پڑا —

حالانکہ میرا دوست اب کافی سن کا ہو گیا تھا — سوسائٹی میں اچھی یثیت تھی، مگر اس سن کی لڑکی کو دیکھ کر وہ پھر اپنے کو اتنا ہی بڑا محسوس نے لگتا اور جیسے فطرتاً اس کی طرف بڑھنے لگتا — وہ اپنی اس زوری سے بہت پریشان ہو گیا تھا — پہلے خود بڑھتا اور جب اس کچے جذبات کی لڑکی کے دل میں شعلہ بھڑک اٹھتا اور اس کی ملنے کی مانگیں، خط لکھنے کی مانگیں، زیادہ سے زیادہ وقت اس پر صرف کرنے کی مانگیں بڑھنے لگتیں تو وہ گھبرا جاتا — کیونکہ وہ تو کمسن، ناتجربہ کار لڑکی ہوتی اور یہ اپنی دنیاوی ذمہ داریوں میں گھرا ہوا آج کا انسان ——— وہ اپنے بیوی بچوں سے بہت پیار کرتا تھا ——— بس وہ اس پہلے پیار کی چھاپ سے مجبور تھا۔

"— اب ایسا بھی کیا ضروری کام لے بیٹھے اس کباڑ میں کہ کھانے کا بھی ہوش نہیں "

اور میں چونک پڑا، واقعی وقت کا اندازہ ہی نہ ہوا، میں نے نظر اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا — وہ دروازے سے ٹکی کھڑی مسکرا رہی تھی — میری بیوی کی مسکراہٹ بڑی خوبصورت تھی —

عجیب بات ہے، میں نے کبھی اپنے اس دوست کا ذکر اپنی بیوی سے نہیں کیا — شاید اس کا ذکر اس کے ان رازوں کے علاوہ کچھ تھا ہی نہیں، اور میں اپنے دوست کی کمزوریاں بتانا نہیں چاہتا تھا —

میرا دوست بہت اچھے کردار کا، باظرف آدمی تھا — اس نے کبھی کسی لڑکی سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ——— بس اس سن کی لڑکی دیکھ کر اس کا پورا انداز بدل جاتا — چہرے پر ایک تناؤ پیدا ہو جاتا آنکھوں میں عجیب طرح کی بیلی کیفیت نمایاں ہوتی کہ دیکھنے والے بھی یہ فرق محسوس کرنے لگتے ——— اور وہ مسحور سا اس لڑکی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ——— وہ یہ بھی بھول جاتا کہ اس کی بیوی ہے، بچے ہیں — بلکہ بھولتا بھی نہیں، کیونکہ وہ اپنے بیوی بچوں کو بہت چاہتا تھا — اسے لگتا کہ اس کی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے ——— ایک موجودہ ذمہ داریوں سے بھری ہوئی مکمل زندگی، دوسری بے فکر، آج سے بارہ پندرہ سال پیشتر کی، ادھوری زندگی ——— اور وہ بار بار اس ادھوری زندگی کی تکمیل چاہتا تھا — اس وقت کے ادھورے پن نے اس کی زندگی میں ایک نفسیاتی تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ ان دو زندگیوں میں کوئی کش مکش یا تصادم نہ محسوس کرتا — بالکل فطری طور پر دونوں زندگیاں جی رہا ——— اور یہ بار بار ہوتا۔

اس لڑکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا — کچی عمر کی یہ لڑکی اس کے سحر انگیز جذبات میں دھیرے دھیرے بہتی گئی — سال، ڈیڑھ سال، ڈھائی سال ——— اور جب اس کے شعور میں پختگی آنے لگی تو میرے دوست کا ذہن اپنی موجودہ ذمہ داریوں کی طرف زیادہ مائل ہونے لگا کیونکہ سحر تو اس مخصوص سن کا تھا — لڑکی کی بڑھتی عمر کے ساتھ اس کی دلچسپی گھٹنے لگی مگر تب تک لڑکی اپنے کو پوری طرح اس سے وابستہ سمجھنے لگی تھی ——— ایسا ہی ہر بار ہوتا تھا۔ مجھے ساری باتیں تو وہ لکھا کرتا تھا مگر کبھی کسی لڑکی کا نام یا پتہ نہیں بتایا، نہ ہی میں نے کبھی پوچھا، نہ ہی کبھی خواہش ہوئی اس لڑکی سے ملنے کی — آخری بار جس لڑکی کے بارے میں اس نے لکھا وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جذباتی ثابت ہو رہی تھی — اور میرا دوست بہت زیادہ نروس دکھائی دے رہا تھا — "میں تمہارے علاوہ کسی کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتی — تم میرا پہلا اور آخری پیار ہو۔ بتاؤ مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے — مگر نہیں، تمہارے سر بہت ذمہ داریاں ہیں، میں تمہیں اپنے ساتھ باندھوں گی نہیں — تمہیں میں کچھ نہیں کہتی، اتنا اختیار نہیں سمجھتی — مگر ایک بات آج پورے اعتماد کے ساتھ کہتی ہوں ——— میں تمہارے پیار کی ٹھنڈی آنچ

و، یہ، یہ اپنے ہیے میں جلا ہوں گی ــــ ہاں' آج میں اپنے دل کی گہرائیوں سے کہہ سکتی ہوں ــــ میں تمھاری ہوں' تمھاری ہوں' تمھاری ہوں ــــ ایک بار تم بھی کہہ دو نا ــــ تم میرے ہو ــــ!"

ایسی بچکانی' پاگل پن کی باتیں ــــ یہی انداز' یہی جملے کتنے قلموں سے' کتنی زبانوں میں دیکھے ــــ اب یہ جملے معمول سا لگنے لگے تھے' جو وقت کے ساتھ ساتھ دھندلے ہوتے جاتے ــــ اور جب کسی کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ــــ تم نے تو کہا تھا کہ میں زندگی کے ہر موڑ پر تمھاری راہ دیکھوں گی ــــ یہ جانتے ہوئے کہ تم نہیں آؤ گے ــــ؟"

"ــــ تھی نہ بیوقوفی کی بات ــــ وقت اور حالات آنکھیں کھول دیتے ہیں۔"

"ــــ یا یہ کہو کہ بند نہیں ہونے دیتے ــــ" اور بس کہانی ختم ــــ کیونکہ اس کے بچے کو اچانک کھانسی اٹھی اور اس نے دودھ اگل دیا ــــ وہ بہت انہماک سے اس کی پیٹھ سہلانے لگی اور پاس پڑے تولیے سے اس کا منہ پونچھنے لگی ــــ میرے اس عزیز دوست کی موجودگی سے بے نیاز جو ــــ "تم کیسے ہو گئے ہو ــــ آج دوسرا دن بھی بیت رہا ہے تمھیں دیکھے بنا۔ آجاؤ نا ــــ ٹھیک ہے بات نہ کرنا ــــ بس ایک بار تمھیں جی بھر کے دیکھ تو لوں ــــ کتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے ــــ سورج تھک کر اپنی تیزی کھو چکا ہے ــــ میرے چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا ہے ــــ میں تو یہاں ہوں ــــ تم کہاں ہو جان ــــ اب یہ تڑپ میرے لیے ناقابل برداشت ہو چلی ہے ــــ کہیں پڑھا تھا

THE PAIN OF LOVING YOU, MY DEAREST, IS ALMOST MORE THAN I CAN BEAR.

پر یہ درد مجھے پیارا ہے کیونکہ وہ تم سے وابستہ ہے ــــ"

میرے دوست نے دو بار ان جملوں کو پڑھا ــــ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا ــــ جیسے وہ کسی نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں لکھے ہوں ــــ اور پھر دھیرے سے انھیں ماچس کی جلتی تیلی سے ہمکنار کر دیا ــــ مگر آخری بار جس لڑکی کا ذکر میرے دوست نے کیا اس نے واقعی میرے دوست کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"ــــ دیکھو' میری بات غور سے سنو ــــ میں تم سے پیار کرتی ہوں ــــ صرف تم سے ــــ مجھے کوئی فلسفہ مت سمجھانے لگنا' کہ پیار دو روحوں کے ملن کا نام ہے' یہ آتماؤں کا میل ہے' جسموں کا ساتھ تو واسنا ہے' جو انسان کے اندر چھپے حیوان کی خصوصیت ہے ــــ یہ میں بار بار سن چکی ہوں ــــ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میری زندگی میں تم پہلے اور آخری مرد ہو میں کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی ــــ میں کسی کے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ نہیں کر پاؤں گی ــــ تمھیں شاید معلوم نہ ہو مجھے بھی رات ہی کو پتہ چلا ہے ــــ میری شادی کی بات چل رہی ہے ــــ مگر میں یہ شادی نہیں کر سکتی ــــ میں ساری زندگی تمھارے خیالوں میں تنہا جی لوں گی ــــ مگر کسی اور کا ہاتھ اپنے بدن پر گوارہ نہیں کروں گی میرے سامنے اب اور کوئی چارہ نہیں ہے ــــ میں جلد بازی نہیں کر رہی ہوں ــــ بہت پرسکون ہوں' بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھا رہی ہوں دیکھو تمھیں میری قسم ہے میری خاطر اپنی زندگی کو اداس مت کرنا' نہ ہی اپنے کو الزام دینا ــــ تمھاری زندگی سے وابستہ کئی زندگیاں ہیں ــــ تم بہت اچھے ہو' بہت سویٹ ــــ میری زندگی کی آخری سانس میں تمھارا ہی نام رہے گا ــــ میرے آخری شعور میں تمھارا تصور ــــ اب بس' میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے ــــ میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔"

وہ بہت ہنس مکھ تھی ــــ میرے دوست کو اس کی ہنسی بہت پسند تھی اور وہ اسے ہنستا دیکھ کر عجیب کیفیت محسوس کرتا ــــ شاید اس ہنسی میں اسی بارہ پندرہ سال پرانی ہنسی کی جھلک ملتی تھی ــــ بہت بچپنا تھا اس کی باتوں میں ــــ ایک بار اسکول کی ٹیم کے ساتھ آگرے جانے لگی تو بضد ہوئی کہ میرا دوست بھی جائے ــــ میرے دوست نے مجھے بھی اسی بار بلایا مگر میں جا نہ سکا ــــ بعد میں اس نے بتایا کہ بہت بور ہوتی رہی ــــ وہ تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ رہتی بس مڑ مڑ کر' یا کن انکھیوں سے دیکھتی ــــ اگر کسی جگہ نظر نہ آ پاتا تو ایک دم سے اس کا چہرہ اترنے لگتا ــــ پھر جب نگاہ پڑتی' ایک دم چہرے

رونق آجاتی ــ وہ بہت خوش تھی، سب میں شوخ، سب میں چنچل دکھائی دیتی تھی ــ ایک دن نہ معلوم کیسے موقع نکال کر، تفصیل مجھے نہیں، اس نے میرے دوست کے ساتھ تاج محل کے سامنے تصویر کھنچوالی ــ میرا دوست ڈر رہا تھا کہ اس کی بیوی یہ تصویر نہ دیکھ لے ــ اس کی جھجھک دیکھ کر وہ شوخی سے بولی ــ گھبراؤ مت، میں تمھیں بلیک میل نہیں کروں گی ــ نہ ہی تمھاری چہیتی بیگم کو خبر ہوگی ــ ارے واہ تم تو مجھ سے زیادہ شرمارہے ہو ــــ

اور جب فوٹو بن کر آیا تو اس نے قینچی نکالتے ہوئے کہا ــــ "لو تمھاری الجھن دور کیے دیتے ہیں ــ ڈرپوک کہیں کے ــ"

اور اس نے بہت صفائی کے ساتھ تصویر کے دو ٹکڑے کر دیے ــ بائیں طرف کے دو مینار اور آدھا گنبد اس کے حصے میں آیا اور داہنی طرف کے دو مینار اور آدھا گنبد میرے دوست کے حصے میں ــــ الگ الگ ٹکڑے عجیب مضحکہ خیز لگ رہے تھے ــ اور اپنی اس حرکت پر دیر تک ہنستی رہی ــ میرا دوست وہ آدھی تصویر لیے اس کی شوخ دلآویز ہنسی میں کھو گیا کتنی بے ساختگی تھی اس کی خوشی میں ــ

حالانکہ میرا دوست اپنے کو اس ماحول سے ہم آہنگ نہ محسوس کر رہا تھا ۔ اسے اپنے دفتر کے کئی اہم کام یاد آ رہے تھے ــــ ایک بچے کے داخلے کے سلسلے میں دو ایک لوگوں سے ملنا تھا ــ

کافی عرصے تک میرے دوست کا خط نہ آیا ــ بلکہ شاید وہ آخری خط تھا ــ کیونکہ مجھے پھر پتہ نہیں چل سکا کہ اس لڑکی کا کیا بنا ــــ میرے دوست نے کیسے حالات کو سنبھالا، سنبھال بھی سکا یا وہ لڑکی اپنے شدید جذبات میں کوئی حماقت کر بیٹھی ــ میرے دوست کی محبوبا ؤں میں یہ پہلی لڑکی تھی جس سے بات کرنے کا، جس کی ہنسی دیکھنے کا اشتیاق مجھے پیدا ہوا ــ مگر میں اپنے دوست کا اصول نہیں توڑنا چاہتا تھا ۔ اس لیے میں نے اس سے پوچھا نہیں ــ یوں بھی میں کسی بھی لڑکی کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا ــ میرا دوست خود ہی جو مناسب سمجھتا بتا دیتا تھا ــ پھر بھی کافی عرصے بعد میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ایک خط میں اس کا ذکر کیا ــ مگر کوئی جواب نہ آیا ــ یا آیا ہو مگر ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے مجھ تک نہ پہنچا ہو ــ آج اتنے عرصے بعد ان پرانے کاغذوں میں یہ خطوط دیکھ کر مجھ میں پھر اس جذباتی لڑکی کے بارے میں جاننے کی خواہش بیدار ہوئی ــ مگر اب تو میرا وہ پیارا دوست بھی نہیں رہا ــ

"آج پتہ نہیں یہ کن خیالوں میں غرق ہیں، کسی بات پر توجہ ہی نہیں دے رہے ہیں ــ بس پرانے کاغذوں کو لے کر بیٹھ گئے ہیں ــ میں ان کا موڈ جانتی ہوں ــ اب یہ گھنٹوں کے لیے بیکار ہو گئے ــ کوئی بات کہو تو لگے گا کسی اجنبی شخص سے کسی اجنبی زبان میں کی ہو ــ بچے بھی اس وقت کھیل میں لگے ہیں ــ چلو کیوں نہ میں بھی اپنی الماری صاف کر ڈالوں، کتنی گڑبڑ ہو رہی ہے ــ افوہ ــــ کتنے کاغذ اکٹھا ہو گئے ہیں ــ ان کو زمین پر ڈھیر کر کے چھنٹائی کر ڈالوں ــ لو بس ہو چکا کام، آگیا شرارت کا پتلا ــ ارے ارے ہٹو کنا ہے ــ یہ کاغذ مت پھیلاؤ ــ چلو باہر چلو، ہر چیز میں دخل ہے ــ ابھی سارے گھر میں کوڑا ہو جائے گا۔"

"ــ ممی، یہ آپ کا فوٹو ہے نا ــ؟ دو چوٹیوں میں کتنی چھوٹی سی لگ رہی ہیں آپ ــ"

"ــ چلو رکھو اسے اور جاؤ کھیلو باہر ــ"

"ــ لیکن ممی یہ کیسا تاج محل ہے، میری کتاب میں تو اس میں چار لمبے لمبے مینار بنے ہیں، اس میں دو ہی کیسے ہیں ــ دو کیا ہوئے ــ؟

"اس ادھورے تاج محل کے دو مینار ہیں۔" ماں نے پیار سے بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ایک تم اور ایک ممی۔"

"اور ممی اس کا آدھا گنبد ــ؟"

"ــ وہ تیرے پاپا ہیں ــ!" ماں کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی ــ اور اس نے بچے کو پیار کر کے اس کے ہاتھ سے تصویر لے لی ۔ یہ بچے بھی اسکول میں جانے کیا کیا سیکھ کر آتے ہیں ۔ ابھی ابھی میرا بیٹا دوڑتا ہوا باہر گیا ہے ۔ مجھے لگا جیسے کہہ رہا ہو ممی، ممی۔ پاپا آدھے گنبد ہیں ــ نہ معلوم کون سا نیا کھیل سیکھ کر آئے ہیں ــ وہ جذباتی لڑکی ۔ پتہ نہیں، زندہ بھی ہے ــ!

■ ■ ■

غزلیں

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

کٹرہ پُردل خاں۔ اٹاوہ

سارے جسم پہ کانٹے ہوں گے
لیکن پھول سے چہرے ہوں گے

سات سمندر پینے والے
پیاسے ریت پہ بیٹھے ہوں گے

رات کی رانی سوچ رہی ہر
روشن کب سورج کے ہوں گے

دن میں سپنے دیکھنے والے
رات میں کیسے سوتے ہوں گے

بستی میں سناٹا ہوگا
آسیبوں کے پہرے ہوں گے

راز ترقی ناممکن ہے!
جب تک ملک میں دنگے ہوں گے

اقبال ٹانڈوی

حیات گنج۔ ٹانڈہ ضلع فیض آباد

اُٹھے ہے زخمِ تمنّا میں ٹیس کم کم پھر
بناؤ میرے رفیقو نمک کو مرہم پھر

کسی کی شوخ ادائی کا ہے وہ عالم پھر
نکالا جائے گا جنّت سے کوئی آدم پھر

پھر آج میری کئی حسرتوں نے دم توڑا
بلند ہوگیا ان کی انا کا پرچم پھر

بسنت رُت میں پپیہے ضرور آئیں گے
قریب ہے مری رُسوائیوں کا موسم پھر

بتا رہے ہیں یہ تیرے بہ جبر ہنستے لب
بھگوئے گی ترے تکیے کو آج شبنم پھر

بھروسہ کرکے تو دیکھ ہماری باہنوں پر
مجال ہے تمھیں چھو لے کبھی کوئی غم پھر

ضرور اس میں زمانے کی مصلحت ہے کوئی
تمھاری ضد سے ہماری انا کا سنگم پھر

یہ وقت چہروں سے پہچان چھین لیتا ہے
مجھے تو شک ہے کبھی مل کے بھی ملیں ہم پھر

بہ غور دیکھیے اک بار میرے چہرے کو
پلٹ کے دیکھیے ماضی کا اپنے البم پھر

غزل نہ کہیے جو کہیے تو اس طرح اقبال
فضا میں گونج اُٹھے زندگی کا سرگم پھر

مست حفیظ رحمانی

پُرانا سیتاپور

پھر حصارِ کربلا ہے اور میں
ہر قدم اک حادثہ ہے اور میں

دوسرے سے کون پوچھے گا مزاج
ہر طرف بس اک صدا ہے اور میں

عکس کوئی بھی نظر آتا نہیں
محوِ حیرت آئینہ ہے اور میں

ذرّے ذرّے کی زباں پر اس کا نام
کائناتِ بے نوا ہے اور میں

ہر نئی ایجاد ہے تیرا وجود
ایک دردِ لا دوا ہے اور میں

اپنے دل کی فکر سب کی فکر ہے
مست فن کا معجزہ ہے اور میں

غزلیں

ڑ نعیم شباب کاس گنجوی

لھڑائے ہیں قدم پاؤں نے لغزش کی ہے
اکہ زندگی کی نہ گر جائے یہ کوشش کی ہے

ب تو امکانِ تلافی بھی نہیں ہے یارو!
ں تو انساں نے ہر اک دور میں لغزش کی ہے

نکھ بھر آئی اُبھر آئے نقوشِ ماضی
زرہ لطف کبھی اس نے جو پرسش کی ہے

ب یہ قسمت ہے سفینے کی کہ ڈوبا ہی نہیں!
رنہ موجوں نے تو جی توڑ کے کوشش کی ہے

یارہ گر لذتِ ایذا کو بھلا کیا جانے
دہی زخموں نے نمکداں کی گزارش کی ہے

ج پھر آپ کی محفل میں غزلخواں ہے شباب
ل کے رستے ہوئے زخموں کی نمائش کی ہے

غفران سحر

معرفت نظر صاحب۔ احاطہ دلاور علی
نیا گاؤں۔ لکھنؤ

نہ راتوں کا سکوں میرا نہ صبحوں کی خوشی میری
مجھے بھولی ہوئی ہے مدتوں سے زندگی میری

مری تنہائیاں کچھ رنگ لا کر ہی رہیں آخر
سنا ہے اب اسے محسوس ہوتی ہے کمی میری

مری خود داریوں نے بارہا روکے قدم لیکن
تمہاری بزم میں لے آئی آخر بیخودی میری

میں اک جلتا دیا ہوں اور جلنا میری قسمت ہے
مگر پھیلی ہوئی ہے تیرگی میں روشنی میری

سحر میرے لبوں پر یہ تبسم تو نہ تھا پہلے
کسی چشمِ نوازش نے بنادی زندگی میری

سہیل کاکوروی

۲۶۔ قندھاری لین۔ لالباغ
لکھنؤ

ہزاروں بار ہم نے ایک رکھا دوسرا رکھا
بہت مجبور ہو کر نام تیرا بے وفا رکھا

تڑپ دے کر گیا ہے مجھ کو کوئی چاہنے والا
تڑپ کو اسلیے میں نے کلیجے سے لگا رکھا

ستم فطرت ہے اس کی اور وہ مجبور ہے خود سے
ستم کرنے کی خاطر اس نے ہم سے واسطہ رکھا

یہ ہمت تھی ہماری مسکرا کر زخم سہتے تھے
مٹانے کا دقیقہ کون سا اس نے اٹھا رکھا

چلیے آؤ تمہاری زندگی کردیں گے ہم روشن
ستاروں کا سماں پلکوں پہ ہے ہم نے سجا رکھا

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "احساس کا کرب" (شعری مجموعہ)
شاعر: مہدی پرتاپ گڑھی قیمت: بیس روپے
ملنے کے پتے: (۱) اُردو بزم ادب. پرتاپ گڑھ
(۲) مکتبۂ دین و ادب امین الدولہ پارک لکھنؤ

مہدی پرتاپ گڑھی کا یہ کرب یقیناً ایک نعمت ہے جو ایسی صحت مند تخلیق سے صفحۂ قرطاس کو مزین کرتا ہے اور قلب و نظر کو نور بخشتا ہے۔ یہی کرب احساس، یہی اضطراب۔ خراشِ خار بن کر شاعر کو بے کل کرتا ہے۔ رموز و حقائق، ذات و کائنات کی تہ در تہ محرکات کو مہدی صاحب بصد اخلاص منکشف کرنے کے ماہر ہیں۔ وہ آج کی سائنسی ترقیات سے باخبر ضرور ہیں لیکن مرعوب نہیں۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی قندیل کو بادِ تند کے باوجود روشن رکھنے کا عزم و عمل ہی ان کی شاعری کا ماحصل ہے۔ ان کی غزلوں کا حصّہ تین سالہ مسافت کے بعد اور نکھر آیا ہے (تین سال پیشتر غزلوں کا مجموعہ "نئے آسمان" شائع ہو چکا ہے)۔
رنگِ تغزل اور رومانیت کی ہریالی سے آپ بھی لطف لیجئے ؎

کون جانے وہ بھی بچوں کے بہانے آ ہی جائے
چل دلِ بیتاب جب اس گاؤں میں میلہ لگے

کیا اس پہ گھنی چھاؤں کی راحت کا کھلے راز
جس شخص نے اس زلف کا سایہ نہیں دیکھا

مہدی ایسا مہرباں ہے موسمِ عہدِ شباب اسکے ہر غنچے کو حُسنِ خوش لباسی دے گیا

وہ رسمسا بدن بھیگی بھیگی ساری میں
ہزار رنگ کے جلوے دکھا گیا بادل

مہدی صاحب کی آزاد نظمیں، فکری توانائی، احساس کی شدت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی قندیلیں ہیں۔ شدتِ احساس کی موج در موج لہریں ردیف قافیے کی فصیل کو منہدم کر کے آزاد نظموں میں ڈھل جاتی ہیں۔

اسلم واحدی

نام کتاب: "گرداب" (ڈرامے)
مصنف: کمال احمد قیمت: ۱۶/- روپئے
ملنے کا پتہ: عثمانیہ بک ڈپو ۱۰۴ لوور چیت روڈ. کلکتہ

تمثیل اور رہس نے ہندستانی تہذیب میں رچ بس کر جب ارتقی کی تو وہ اُردو ڈرامہ کہلایا۔ اردو ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنا رشتہ قدیم ہندستانی ڈرامے سے استوار کر کے اپنی الگ شناخت بنائی۔ آزادی سے قبل اور اس کے کچھ برس بعد تک اردو ڈرامہ ترقی کی راہ پر گامزن رہا پھر جیسے جیسے دوسرے ماس میڈیا سامنے آتے گئے اُردو ڈرامہ کمزور پڑتا گیا۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو میں ڈرامہ لکھا نہیں جا رہا ہے یا اردو اسٹیج سے وابستہ لوگ جدید تکنیک سے واقف نہیں ہیں بلکہ سچائی یہ ہے کہ اُردو والوں نے کبھی ڈرامہ کو اہمیت نہیں دی، جہاں اس ملک میں ہر سال سینکڑوں مشاعرے اور سیمینار ہوتے ہیں وہاں اردو ڈرامے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔

اب ایسے میں کمال احمد جیسے کچھ لوگ اپنی بساط بھر اردو ڈرامے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں تو وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کمال احمد کا تازہ مجموعہ "گرداب" ان کے دو مختصر ڈراموں گرداب اور پد یاترا پر مشتمل ہے جن کو بار بار اسٹیج کیا جا چکا ہے۔

گرداب اخبار میں کام کرنے والے عام آدمی کی مجبوریوں اور لاچاریوں کی جیتی جاگتی عکاسی ہے۔ اس کے چاروں طرف جو معاشرہ ہے وہ گندی سیاست اور مکاریوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایسے معاشرے میں سانس لینے والے جو زندگی جیتے ہیں کیا اصل میں یہی زندگی ایک عام آدمی کی زندگی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس سے مفر کی وہی صورت ہے جو اس شخص کے بیٹے کے ہاتھوں میں خنجر بن کے نمودار ہوئی۔؟ یہی وہ سوال ہے جو ڈرامے کا اختتام ہے مگر یہ ڈرامہ ختم کہاں ہوا، یہ تو جاری و ساری ہے اور تب تک جاری و ساری رہے گا

جب تک اسحاق اور نیتا جیسے لوگ معاشرے میں غلاظت پھیلاتے رہیں گے اور عام آدمی کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

پدیاترا اس مجموعے کا دوسرا ڈرامہ ہے۔ اس میں یاتری کسی منزل کی جستجو میں نہیں ہے بلکہ وہ تو جہاں پہنچتا ہے دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بظاہر دیکھنے میں بے گھر و بے دیار ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ اچھے معاشرے اور اعلیٰ زندگی کا دشمن ہے۔ وہ بہتر آبادیوں کو ویرانے میں اس لیے تبدیل کرنا چاہتا ہے کہ اس کے بعد تباہ و برباد لوگ اس کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ وہ لوگوں کو بھڑکاتا ہے، فرقہ وارانہ تصادم کو ہوا دیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ یہ بستی بھی ویسی ہی ہو جائے جیسی بستیاں اس کے اشاروں پر آباد و برباد ہوا کرتی ہیں۔ لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہتا ہے۔

کمال احمد نے خیر و شر کی کشمکش کو مستقبل کے حوالے کر کے ان امیدوں کی بشارت دی ہے جو روزِ ازل سے زندگی کا مقصود ہے: ایک بہتر سماج اور امن پسند لوگوں کے خوابوں کی تعبیر کیا ہے۔ ایک ایسی ہی بستی جہاں کھیتوں میں استادہ بجوکا تک زندگی کی سچائیوں سے عبارت ہے اور یہ بجوکا ہم اور آپ بھی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم میں حوصلہ اور عمل ہو۔

—————— وقار ناصری

نام کتاب: "جدید اُردو شاعری اور خلیل الرحمن اعظمی"

مصنف: مظہر احمد　　　　قیمت: پچاس روپئے

ملنے کا پتہ: شبانہ پبلی کیشنز ۲۰۱۳، محلہ قبرستان، دہلی-۶

خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری، ان کی شخصیت، ان کی تنقید نگاری اور آزادی سے قبل چالیس برس کی اردو شاعری نیز اس کے بعد جدیدیت کے زوال تک کا مکمل منظر نامہ زیرِ نظر کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری کی کلاسیکی بنیاد، ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور جدیدیت کی جانب ان کا متوجہ ہونا "اینٹی غزل" سے ان کا انحراف نیز ان کی شاعری پر میرؔ کے اثرات، ان کا بحیثیت غزل گو زیادہ کامیاب شاعر ہونا، جدید تر غزل اور جدید تر نظم کا پیش رو ہونا وغیرہ پر مدلل بحث اس کتاب میں شامل ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں اُردو ادب کے رجحانات، داخلی و خارجی اثرات اور خاص طور پر آزادی کے بعد اُردو کی ترقی پسند شاعری، اس کے اثرات، اس کی انتہا پسندی، اس کا زوال، اس کے بعد جدیدیت کے رجحانات کا سماجی پس منظر، ادبی پس منظر اور پھر اس کا زوال اور بعض دوسرے مختلف قسم کے اثرات مثلاً وجودیت، فرائڈ کے اثرات وغیرہ کے بارے میں بھی علمی انداز میں اور سادہ زبان میں لکھا گیا ہے۔

مصنف نے خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری کو واضح طور پر موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ ان کی زندگی، ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نظم گوئی کے معاملے میں وہ "شخصی واردات" اور اپنی زندگی کے مختلف واقعات کو شاعری میں عملی جامہ پہناتے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے ذہنی رویہ کو ان کی شاعری کے پس منظر میں جانچا پرکھا گیا ہے جو اس کتاب کا سب سے جامع حصہ ہے۔

—————— سہیل وحید

نام کتاب: "محمد شاہی عہد کی ایک نایاب مثنوی"

مرتب: ڈاکٹر عبدالرؤف　　　　قیمت:

ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ

بنگال کے جن محققین کی کتابوں سے باہر کے لوگوں نے استفادہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ زیرِ نظر کتاب "محمد شاہی عہد کی ایک نایاب مثنوی" سے قبل بھی مخلص مرشد آبادی پر انھوں نے گراں قدر تحقیقی کام کیا ہے۔

زیرِ نظر مثنوی محمد شاہی عہد یعنی اٹھارھویں صدی کے شاعر جعفر علی خاں ذکیؔ کی تخلیق ہے۔ اس کی بازیافت ڈاکٹر صاحب نے ایشیاٹک سوسائٹی کے وسیلے سے کی ہے۔ کتاب میں پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی صاحب کا پیش لفظ بعنوان "قابلِ قدر تحفہ" بھی شامل ہے جو تحقیق کی اہمیت اور رؤف صاحب کی تلاش کی قدر و قیمت کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ 'عرضِ مرتب' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب نے اپنا موقف نہایت خوبصورتی سے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"یہ ڈھائی سو سال پرانی مثنوی ہندستانی طرزِ فکر کلچر اور قومی یک جہتی کی کامیاب ترجمان نظر آتی ہے۔ عہدِ محمد شاہ صرف رنگ رلیوں سے عبارت نہیں ہے، اس عہد نے ہندستانی فنون بالخصوص اُردو شعر و ادب میں اختراع اور ایجاد کی وہ سکت پیدا کر دی جس کے اظہار کا سلسلہ فکر و فن کے توسط سے آج بھی جاری ہے۔"

مندرجہ بالا سطور اس بات کی غماز ہیں کہ مرتب نے نہ صرف ایک پرانے دفینے کو تلاش کیا ہے بلکہ تحقیق کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ رؤف صاحب نے مختلف زاویوں سے جعفر علی خاں ذکی کی اہمیت اور ادب میں ان کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے ان کے معروضات ٹھوس تحقیق پر مبنی ہیں۔

مختصر یہ کہ رؤف صاحب کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ وہ اُردو ادب کو اسی طرح مالا مال کرتے رہیں گے۔

ـــــــــ **ظہیر انور** (کلکتہ)

نام کتاب: **"مہابھارت"** (مثنوی)

شاعر: جلال افسر سنبھلی　　　قیمت: دس روپئے

ملنے کا پتہ: اُردو تعلیمی جائزہ کمیٹی۔ سنبھل، مراد آباد

جلال افسر سنبھلی، سنبھل کے خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کی کئی کتابیں اس سے قبل منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب "مہابھارت" ایک طویل رزمیہ مثنوی ہے۔ جلال افسر نے اس مثنوی میں مہابھارت کے تمام واقعات کو بڑی عام فہم زبان میں بہت اختصار کے ساتھ نظم کیا ہے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسی صنف میں طبع آزمائی کی ہے جس کی طرف سے شعراء کی توجہ ہٹتی جا رہی ہے۔ اس کتاب میں جناب رئیس امروہوی (مرحوم)، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، رضی بدایونی اور اختر الاسلام کی تقاریظ بھی شامل ہیں۔

قدیم ہندستان کے اساطیری ادب کو اُردو کے قالب میں ڈھالنا اور اُردو شاعری کو وسعت عطا کرنا اس دور کا اہم تقاضا ہے۔ جلال افسر نے 'مہابھارت' لکھ کر اس تقاضے کو کافی حد تک پورا کیا ہے۔ مہابھارت طویل رزمیہ نظم ہے۔ اس مصروف زمانے میں جب کہ انسان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ ضخیم کتابوں کا مطالعہ کر سکے، مہابھارت کے تمام واقعات کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے جلال افسر کی مثنوی، جو تقریباً سوا چار سو اشعار پر مشتمل ہے، کافی حد تک مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جلال افسر نے اس طویل نظم کو اُردو میں اتنے اختصار کے ساتھ پیش کر کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

'مہابھارت' کی زبان بہت عام فہم اور اندازِ بیان نہایت موثر ہے۔ اگر اس کی کتابت اور طباعت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہوتی تو اس کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

ـــــــــ **مخمور کاکوروی**

نام کتاب: "ناشنیدہ" (شعری مجموعہ)

شاعر: طفیل احمد مدنی　　　قیمت: ۱۲/ روپئے

ملنے کے پتے: (۱) ۱۸۷۔ منہاج پور، الہ آباد　(۲) ماہنامہ "رضوان" گوئن روڈ لکھنؤ

مولانا طفیل احمد مدنی کی غزلوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل مولانا کی نعتوں کے دو مجموعے "گلدستۂ حرم" اور "گلزارِ حرم" طبع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔

مولانا ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نوح ناروی سے تعلق اور پروفیسر شمیم حنفی و عمیق حنفی سے قربت ان کی ادبی و تخلیقی سرگرمیوں میں معاون ثابت ہوئی ہے۔

مولانا نے شاعری کو ذریعۂ عزت یا ذریعۂ معاش نہیں بنایا بلکہ ایک حساس دل پر جو کچھ گزرتی رہی اسے صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے رہے۔ "ناشنیدہ" مولانا کی ۲۵، ۳۰ سال کی ذہنی کاوش کا ماحصل ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اس کے مقدمے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> "ہر مجموعے میں مولانا نے اپنی طبع قلندری اور رنگارنگی کی مناسبت سے ہر طرح کا مال جمع کر دیا ہے جو کچھ، جیسا کچھ، جب بھی کہا، ٹھیک ہے۔ عشقیہ، سماجی، تہذیبی طنزیہ، روایتی غیر روایتی اشعار کا ایک گنجینہ ہے کہ سارے کا سارا کھلا ہوا ہے۔ جس کا جو جی چاہے اپنے ذوق و ضرورت کے مطابق چن لے۔"

ـــــــــ **ڈاکٹر رفیق احمد خاں**

نیا دور

جلد ۴۴ نمبر ۱۰

جنوری سنہ ۱۹۹۰ء

(ایکٹنگ) ایڈیٹر شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون: ۴۳۰۵۹ / ۴۷۱۰۸

پبلشر اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ: یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پبلک انفارمیشن
پبلسٹی ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ماہ و سال کے تیز رفتار سفر نے ایک منزل اور طے کرلی۔ ۱۹۹۰ء نئی امنگوں اور نئی امیدوں کے ساتھ آگیا۔ یہ سال کئی اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سال تمام دنیا کے لیے نئی تبدیلیوں اور نئے امکانات کا نقیب بن کر آیا ہے۔ تمام دنیا میں شخصی اقتدار اور نظامِ جبر کے خلاف بیداری کی ایک طاقت ور لہر نے جمہوریت کے لیے نئے امکانات پیدا کردیے ہیں۔ اب کوئی ایسا سماجی اور سیاسی نظام جو عوام کو نظر انداز کرے یا ان پر جبر روا رکھے، قائم نہیں رہ سکتا۔ سب سے زیادہ خوش آئند بات یہ ہے کہ اب نئی تبدیلیوں کو ہر خطے میں قبول کیا جارہا ہے اور ان کا استقبال ہو رہا ہے۔

جہاں تک ہمارے ملک ہندستان کا تعلق ہے، بغیر کسی خون خرابے کے، پُرامن طریقے سے اقتدار کی منتقلی یہاں ایک بار پھر عمل میں آگئی ہے۔ یہاں کے عوام نے ایک بار پھر ثابت کردیا ہے کہ یہاں تشدّد اور تصادم کے بغیر سیاسی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اس تبدیلی سے ہندستانی جمہوریت بلاشبہ اور مستحکم اور طاقتور ہوئی ہے۔ اس طرح یقینی طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں جمہوریت کی جڑیں بہت گہری ہیں اور جمہوریت یہاں کی زندگی میں رچ بس گئی ہے۔ اس سال ہم اپنا یومِ جمہوریہ جمہوریت کے استحکام نو کے جذبے اور بلاشبہ نئی امنگوں اور امیدوں کے ساتھ منائیں گے۔

جمہوریت کی راہ پر ہمارے پُراعتماد سفر نے چالیس منزلیں طے کرلی ہیں اور اس سفر میں ہم اتنے آگے جاچکے ہیں جہاں سے ہمیں برابر آگے ہی بڑھنا ہے اب ہمارے لیے جمہوریت کا راستہ ترک کرنا ممکن ہی نہیں رہا ہے۔

اس وقت ہمارے ملک اور ہماری ریاست اترپردیش میں اقتدار جن عناصر کے ہاتھوں میں ہے، وہ عوام کے دکھ درد سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ عوام کی دشواریوں، ان کی مشکلات اور مسائل سے بھی بخوبی واقف ہیں کیونکہ وہ عوام کے درمیان سے ہی اٹھے ہیں چنانچہ عوام کی دشواریوں، ان کی مشکلات اور مسائل کے حل کے لیے یقیناً تیز رفتاری کے ساتھ مؤثر اقدامات کیے جائیں گے اور ایسے اقدامات کی ابتدا بھی ہوگئی ہے۔

سالِ نو، جسے نئے جمہوری امکانات کا سال کہنا چاہیے، اس کی آمد پر ہمیں اس عزم و عہد کا اعادہ بھی کرنا ہے کہ ہم ان طاقتوں سے ہوشیار رہیں گے جو علاحدگی پسندی، منافرت، تنگ نظری اور تعصّب، فرقہ پرستی اور علاقائیت نیز تشدد اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہمیں پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ یہ کوشش کرنا ہے کہ یہ طاقتیں نہ صرف یہ کہ بے اثر رہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے بے دست و پا ہوجائیں۔

جہاں تک ہمارے سماج، ہمارے معاشرے کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی سبھی فرقوں اور طبقوں کے لوگ تعلیمی اداروں، دفتروں، کارخانوں، بازاروں، تفریح گاہوں اور تجارتی اداروں میں ہر جگہ ایک ساتھ نظر آتے ہیں، ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں، ایک دوسرے کے معاون و مددگار بنتے ہیں، ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ فرقہ وارانہ اور طبقاتی امتیاز روزمرہ کی عملی زندگی میں کہیں رکاوٹ نہیں بنتا۔ یہ بعض عناصر اور بعض طاقتیں ہیں جو منافرت اور تشدد کا ماحول پیدا کردیتی ہیں۔ لیکن اس ماحول میں بھی مختلف مقامات پر ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں کو بچاتے ہیں، ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں برابر سننے میں آتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے واقعات کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جائے۔ اس سے منافرت اور تشدد کی گرم بازاری کم ہوگی نیز ہم آہنگی اور یگانگت کو فروغ ملے گا۔

——— شین قاف

ڈاکٹر مظفّر حنفی
اقبال پروفیسر
شعبۂ اردو
کلکتہ یونیورسٹی۔ کلکتہ

اُردو ادب اور مذہبی رواداری

اس بات میں اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ اُردو کسی خاص فرقے یا مذہب کی زبان نہیں ہے اور اس کی ابتداء و ارتقاء میں مختلف مذہبوں کے ماننے والے برابر کے شریک رہے ہیں چنانچہ اس قسم کی مستقل تصنیفات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی ترقی میں کس کس مذہب اور کس کس علاقے کے لوگوں نے حصّہ لیا ہے۔ دوسری جانب اُردو زبان نے بھی ہر دَور میں وسیع النظری اور کشادہ قلبی کا ثبوت دیا ہے اُردو کے دامن میں نہ صرف مذہب اسلام سے متعلق کتابوں کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے بلکہ ہندو مذہب اور اس کے تمام اصلاحی فرقوں مثلاً کبیر پنتھ، دیوسماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، برہمو سماج، رادھا سوامی مت اور آریہ سماج کے ماننے والوں نیز جین دھرم، سکھ مذہب، عیسائیت اور بہائی عقیدے کے پیروکاروں نے اپنے مذہب اور اخلاق کے بارے میں اُردو میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں یا ترجمہ کر کے شائع کیں۔ اُردو کی مذہبی رواداری اور وسیع المشربی کا اندازہ اس طرح بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ انڈیا آفس لائبریری کے کیٹلاگ میں ۱۳، کتابیں ایسی موجود ہیں جو غیر مسلموں نے اپنے مذہب سے متعلق اُردو میں لکھی ہیں۔ اسی طرح جب تقسیم ہند سے قبل ڈاکٹر محمد عُزیر نے اپنے تحقیقی مقالے "اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصّہ" کے لیے مواد فراہم کرنا شروع کیا تو انھیں صرف پندرہ کتب خانوں میں ہی کم و بیش چار سو غیر اسلامی مذہبی اور اخلاقی کتابیں مل گئیں۔

بات یہ ہے کہ اُردو زبان ہندستان میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے اور ہندستانی مزاج میں مذہبی رواداری رچی بسی ہے۔ چونکہ ہر زبان کا ادب اپنے آس پاس بکھری ہوئی زندگی کا آئینہ دار اور مزاج داں ہوتا ہے اسلیے مذہبی رواداری بھی اُردو ادب کا جز لاینفک بن گئی ہے۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام سے لے کر دکنی دور کے شعراء کی تخلیقات تک اس مذہبی رواداری کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میر کی مثنویاں ہوں یا سودا کے قصائد، نظیر اکبرآبادی کی نظمیں ہوں یا واجد علی شاہ کا رہس، قدم قدم پر اُردو کی وسیع المشربی کے شواہد بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گیتا اور رامائن کے نثری اور منظوم تراجم کی جتنی بڑی تعداد اُردو میں موجود ہے، دنیا کی کسی دوسری زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مہابھارت اور رام چرت مانس سے متعلق ضمنی داستانوں پر مشتمل منظومات کی بڑی تعداد اُردو ادب کے ذخیرے میں موجود ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تخلیقات کے مصنفین و مترجمین میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش ہیں۔ اُردو میں مہدی نظمی نے رامائن کا منظوم ترجمہ پیش کیا تو جعفر علی خاں اثر نے گیتا کو اُردو نظم میں منتقل کیا۔

ظفر علی خاں نے "ایک رشی کے داغِ جگر کی کہانی؛ راجہ دشرتھ کی زبانی" پیش کی تو شاد عارفی نے "ہولی"۔ "دیوالی" اور "دسہرہ اشنان" جیسی لازوال نظمیں تخلیق کیں۔ نظیر اکبرآبادی نے تو خیر سے تمام ہندو تیوہاروں اور دیوتاؤں پر نظمیں لکھی ہیں۔ علامہ اقبال جیسے فلسفہ طراز شاعر نے رام چندر جی پر "امامِ ہند" کے عنوان سے طبع آزمائی کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

نظم گویوں کی طرح اُردو کے غزل گویوں نے بھی ابتدا تا حال وسیع المشربی اور مذہبی رواداری کا سبق دیا ہے۔ مثلاً میر تقی میر نے کہا ہے ؎

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو لوگو! اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

مرزا غالب کا قول ہے ؎

وفا داری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

آمنگر گونڈوی فرماتے ہیں :

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و بند نے جیسے ایماں بنا دیا

حسرت موہانی کے بقول ؎

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے اُنس
دُنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا

اور مظفر حنفی کا خیال ہے ؎

روشنی کا سبب ہے تاریکی
سرحدیں صاف کفر و دیں میں نہیں

موجودہ دور میں نئی غزل کہنے والے اکثر شعرا اپنے اشعار میں ہندو مائتھولاجی سے استفادہ کرتے ہیں اور دیوی دیوتاؤں سے متعلق تلمیحات کو خوبصورتی کے ساتھ برت کر غزل میں نئے ذائقے کی آمیزش کرتے ہیں مثلاً جان نثار اختر کا شعر ہے ؎

ٹوٹی ٹوٹی سی ہر اک آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

اور منور رانا نے کہا ہے ؎

غم سے لچھمن کی طرح بھائی کا رشتہ ہے مرا
مجھ کو جنگل میں اکیلا نہیں رہنے دیتا

عہدِ حاضر کی نئی نظم میں بھی اُردو مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے جس کا اندازہ کاوش بدری کی "کاوشم" حرمت الاکرام کی "اماوس کا جادو" مظفر حنفی کی "لچھمن ریکھا" مظہر امام کی "سرسوتی" فرحت کیفی کی "مرلی منوہر" عمیق حنفی کی "منتھن گندھا" جیسی نظموں کے محض عنوانات سے کیا جا سکتا ہے۔

اُردو نثر میں بھی اس مذہبی رواداری کے مرقعے کم نہیں ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاء کی "رانی کیتکی کی کہانی" ہو یا رجب علی بیگ سرور کا "فسانۂ عجائب" قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ہو یا صلاح الدین پرویز کی "نمرتا" یا سریندر پرکاش کا افسانہ "بجوکا" ہر جگہ کشادہ قلبی، وسیع المشربی اور مذہبی رواداری کا جذبہ کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔

اس نکتے پر بھی ہماری توجہ ہونی چاہیے کہ اُردو زبان و ادب میں مذہبی رواداری کا یہ عمل یکطرفہ ہرگز نہیں ہے۔ اگر اقبال "ہمارا وطن" نظم میں گرونانک اور گوتم بدھ کی تقدیس کے ثنا خواں ہیں تو تلوک چند محروم "حضرت علی کی زندگی کا ایک واقعہ" نظم کرتے ہیں۔ صفدر آہ نے "رام چرت مانس" کا ترجمہ کیا تو کنہیا لال شاد نے "رسالہ علم تصوف" قلم بند فرمایا۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے گیتا کا اُردو ترجمہ منظوم کیا تو بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے کلام پاک کی آیات کے ترجمے کیے۔ محمد حسین آزاد نے بقائے دوام کے دربار میں رام چندر جی کو عظیم ترین مسند پر بٹھایا تو ہر گوپال تفتہ، کشن پرشاد شاد، پیارے لال رونق، دوارکا پرشاد افق اور مہاراج بہادر برق وغیرہ نے شہدائے کربلا کی شان میں سلام لکھے اور مرثیے کہے۔ اگر حسن نظامی نے "قلمی چہرے" میں کرشن جی کو شامل کیا تو مالک رام نے "عورت اور اسلام" جیسا تحقیقی مقالہ رقم کیا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی شان میں نعتیں کہنے والے لاتعداد غیر مسلم شعرا گزرے ہیں جن میں لچھمی نرائن شفیق، درگا سہائے سرور جہان آبادی، راجندر بہادر موج، سکھدیو پرشاد بسمل، لال چند فلک، دتاتریہ کیفی، آنند نرائن ملا، نریش کمار شاد، لبھو رام، جوش ملسیانی، امر چند قیس، دھرم پال گپتا وفا، ہری چند اختر، رگھوپتی سہائے فراق، مہندر سنگھ بیدی سحر، جگن ناتھ آزاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ غیر مسلم شعرا کے چند نعتیہ اشعار بطور مثال پیش خدمت ہیں۔

منشی روپ چند رقمطراز ہیں ؎

آیا جو نامِ پاک محمد زبان پر
صلِ علیٰ کا شور اُٹھا آسمان پر

گوری پرشاد ہمدم اکبر آبادی کو فخر ہے ؎

کیوں نہ ہو فخر یہ توقیر ہے کیا کم ہمدم
بخش دی نعت کی جاگیر نبی نے مجھ کو

روشن لال نعیم لکھتے ہیں ؎

اے شیخ تجھی کو رہے فردوس مبارک
کافی ہے مجھے گوشۂ گلزارِ مدینہ

بال مکند عرش ملسیانی نے نعت میں کیا خوبصورت مطلع کہا ہے ؎

حاملِ جلوۂ ازل، پیکرِ نورِ ذات تو
شانِ پیمبری سے ہے سرورِ کائناتؐ تو

پنڈت ہری چند اختر فرماتے ہیں ؎

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عربؐ نے آدمی کا بول بالا کر دیا

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کہا ہے ؎

سمٹ کر دو جہاں کی وسعتیں آئیں تخیّل میں
تصوّرِ سرورِ لولاکؐ کا معلوم ہوتا ہے

اور جگن ناتھ آزاد محبوبؐ کبریا کی خدمت میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

سلام اس ذاتِ اقدس پر سلام اس فخرِ دوراں پر
ہزاروں جس کے احسانات ہیں دُنیائے امکاں پر

پیش کردہ حقائق کی موجودگی میں کوئی بھی اُردو کی مذہبی رواداری پر شک نہیں کرسکتا۔

بشیر فاروقی
۵۱۵۔ مراد علی لین
عقب رائل ہوٹل۔ لکھنؤ

نیا سال

یہ آرزو ہے نیا سال ہم کو راس آئے — بہار بن کے گلوں کی ادا شناس آئے
نفس نفس ہمیں پیغامِ شادمانی دے — دلوں کو صبحِ وطن جوشِ زندگانی دے
حسین کلیوں کی صورت ہمارے خواب کھلیں — مہک اُٹھے یہ چمن یوں نئے گلاب کھلیں
تعصّبات کی پرخوف ظلمتیں مٹ جائیں — وطن میں پھیلی ہوئی ہیں جو وحشتیں مِٹ جائیں
ہمارے ملک میں دَورِ ستمگری نہ رہے — یہ شر پسندی و ہنگامہ پروری نہ رہے
رہِ حیات میں افسُردگی کی گرد نہ ہو — مثالِ برگِ خزاں کوئی چہرہ زرد نہ ہو
کدورتیں دلِ انساں سے دُور ہو جائیں — اندھیرے صحنِ گلستاں سے دُور ہو جائیں
سروں میں فرقہ پرستی کا یہ جنوں نہ رہے — فضا میں آگ دھواں رنگ زہر و خوں نہ رہے

نہ دل جلے نہ زباں اور نہ دل کے داغ جلیں
جہاں جہاں ہیں اندھیرے وہاں چراغ جلیں

اسد مرزاپوری
مالوی نگر۔ مرزاپور

ارتقا

دوستو! چاک دامانِ شب ہوگیا
جگمگانے لگی، زندگی کی فضا
صورتِ شمعِ دل اپنا روشن ہوا
نور کا پیرہن آرزو کو ملا
آج درماں ہوا وقت کے درد کا

اب وہ زخمِ جگر ہے نہ وہ چشمِ تر
نخلِ ارماں کی ہر شاخ ہے بارور
زندگی سے ہوئی زندگی باخبر
جھلملانے لگی منزلِ ارتقا
آج درماں ہوا وقت کے درد کا

ہر گرہ زلفِ پیچاں کی کھولی گئی
ہر مسرت نظر میں سمولی گئی
روح میزانِ عشرت میں تولی گئی
قطرہ قطرہ بنا ہے گہر آشنا
آج درماں ہوا وقت کے درد کا

کشتگانِ ستم مسکرانے لگے
سازِ محنت پہ مزدور گانے لگے
کھیت پھر جاگ اٹھے لہلہانے لگے
خاکِ پامال بننے لگی کیمیا
آج درماں ہوا وقت کے درد کا

بے زمیں کو زمیں بے مکاں کو مکاں
ہوگئی صبح ٹوٹا وہ خوابِ گراں
کتنے درماندہ لوگوں نے پائی اماں
دوشِ ہستی سے بارِ گراں اٹھ گیا
آج درماں ہوا وقت کے درد کا

سیّد حبابؔ ترمذی
(کے ۴۳ ماڈرن کالونی منگھوپیر روڈ۔ کراچی (پاکستان)

غزل

وہ گہوارۂ علم و فن دیکھ آئے
کبھی تھا جو اپنا وطن دیکھ آئے

روانیٔ گنگ و جمن دیکھ آئے
محبّت سے دل موج زن دیکھ آئے

جو صبحِ بنارس کا منھ چومتی تھی
وہ سُورج کی پہلی کرن دیکھ آئے

نگاہِ عقیدت سے محنت کشوں کے
سُنہرے سُنہرے بدن دیکھ آئے

گلوں کی نزاکت جو پیشِ نظر تھی
تو کانٹوں کا بھی بانکپن دیکھ آئے

مرے حق میں زنجیرِ پا بن گئی جو
وہ زُلفِ شکن در شکن دیکھ آئے

غزل خواں تھے ہر شاخِ گُل پر عنادل
گلستانِ شعر و سخن دیکھ آئے

نظر آئی اک روز قوسِ قزح بھی
جبینِ فلک پر شکن دیکھ آئے

ترستی تھیں آنکھیں جسے دیکھنے کو
وہ ہم رونقِ انجمن دیکھ آئے

روش در روش وہ نظاروں کا منظر
تبسّم چمن در چمن دیکھ آئے

وہ اک خلدِ حُسنِ نظر اللہ اللہ
وہ اک جنّتِ حُسنِ ظن دیکھ آئے

شہیدوں کی دل میں ہوئی یاد تازہ
مقاماتِ دار و رسن دیکھ آئے

ستارے تصدّق تھے افشاں پہ جس کی
وہ روشن جبینِ سخن دیکھ آئے

وہ پھولوں کی چادر وہ سبزے کا بستر
وہ باغاتِ سرو و سمن دیکھ آئے

حبابؔ آہ غالبؔ سے لے کر جگرؔ تک
مزاراتِ اربابِ فن دیکھ آئے

میر انیس : نادر معلومات

مذکورہ بالا عنوان پر عرصہ سے کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن معروفیات کے سبب اس منزل تک پہنچنے میں کافی وقت گزر گیا۔ یہ یادیں کسی اور کی نہیں بلکہ اس شخصیت سے وابستہ ہیں جس نے خانوادۂ انیس کا ایک دور دیکھا تھا اور وہ ذات جناب سید محمد ہادی لائق فرزند جناب عارف مرحوم کی تھی۔ اور جن کے لیے سرکار سید العلماً سید علی نقی صاحب مجتہد طاب ثراہ کا یہ فرمانا تھا کہ "ہادی صاحب کو بات کرنے کا سلیقہ اپنے والد سے ورثہ میں ملا۔ وہ مرحوم جہاں بیٹھ جاتے تھے محفل گلزار ہو جاتی تھی۔" سید العلماء نے خاندان انیس کے مختلف شعرا کو قریب سے دیکھا تھا اور وہ ان افراد کی بہ اعتبارِ فن ہمّت افزائی بھی کرتے تھے۔ زیر نظر مضمون سیّد محمد ہادی لائق مرحوم کی زبانی سنی ہوئی اور کچھ تحریری یادداشتوں پر مبنی ہے۔ اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں راقم ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی صاحب کے تعاون کا شکر گذار ہے۔

مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب ..." کی تصنیف

میر علی محمد عارف (نبیرۂ نفیس) کی ایک تحریری یادداشت کے مطابق میر انیس نے ۱۸۵۵ء کے بعد ــــ جب محلہ سبزی منڈی عقب چوک میں سکونت اختیار کر لی تو یہ مرثیہ

'جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'

ایک شب میں تصنیف فرمایا اور اپنے گھر کے منعقدہ عشرۂ عزا میں سب سے پہلے پڑھا۔ اس کے بعد شہر کے دیگر مومنین کی منعقد کردہ مجلسوں میں خوانندگی فرمائی۔

میر انیس کی غزل گوئی

میر انیس اوائل عمر میں غزل کی طرف مائل تھے اور فیض آباد کے مشاعروں میں اکثر پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی میں منعقدہ بزم مشاعرہ میں ان کی غزل کا درجِ ذیل شعر کافی دلچسپی کا باعث ہوا ع

اشکِ غم دیدۂ پُرنم سے سنبھالے نہ گئے
یہ وہ بچّے ہیں جو ماں باپ سے پالے نہ گئے

کسی نے انیس کے والد میر خلیق کے سامنے ان کے اس شعر کی تعریف کی۔ میر خلیق خاموش رہے اور گھر میں داخل ہوئے تو میر انیس سے مخاطب ہو کر غزل گوئی ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا "ایسا کام کرو جو عقبیٰ میں کام آئے"۔ میر انیس والد کے اس جملے سے پریشان ہو گئے یہاں تک کہ رات کی تاریکی آئی اور وہ اسی اندوہ پیشانی میں مبتلا رہے۔ پھر سپیدۂ سحر نمودار ہوئی گذشتہ رات کی ساری کیفیت کو شعری پیکر میں ڈھال دیا۔ فرماتے ہیں ؎

الجھا رہا میں زلف کے مضموں میں رات بھر
تاریک شب میں ذہن گیا ہے کدھر کدھر
باریک راہ بال سی اور طول اس قدر
کس پیچ کی تہم تھی مگر کی خدا نے سر
سمجھے تھے ہم کہ عمر اسی میں بسر ہوئی
یاد آ گیا جو رُخ تو یکا یک سحر ہوئی

اس کے بعد آپ نے جس مرثیے کو تصنیف فرمایا اس کا مطلع یہ ہے ؏

'پھاڑا جو گریباں شبِ آفت کی سحر نے'

لفظ "قرق" کا تلفظ

میر انیس نے ۲۵ رجب کی مجلس جو دلارام کی بارہ دری میں ہوتی تھی اس میں نیا مرثیہ پڑھا جس میں مصرعہ "پانی پہ قرق کھوتے ہو کیوں اپنی آبرو" نظم فرمایا تھا۔ کچھ لوگوں نے مندرجہ مصرعہ پر اعتراض کیا۔ جب اس کی خبر میر انیس کو ہوئی تو انھوں نے قریب کی ایک مجلس میں اسی مرثیے کو پڑھا اور خصوصیت سے یہ بند پڑھنے سے قبل حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ لوگوں کو لفظ "قرق" پر اعتراض ہے اور وہ یہ کہ لفظ ساکن الاوسط نہیں بلکہ متحرک الاوسط ہے۔ خاص طور پر محمد جعفر امید کو متوجہ کیا اور کہا کہ لفظ "قُرُق" متحرک الاوسط ہے لیکن کوئی شخص متحرک الاوسط نہیں بولتا اور مسکرا کے فرمایا کہ آج سے میں اسے ساکن الاوسط کیے دیتا ہوں۔ اب کبھی کوئی متحرک الاوسط نہیں بولے گا۔ امید[۱] صاحب ہاتھ جوڑ کے کہنے لگے کہ نہ میں معترض ہوں نہ میرا اعتراض ہے۔

میر انیس اور تحفظِ زبان

نجم الغنی نجمی رام پوری کا بیان ہے کہ میرے پاس ایک صاحب آئے جو اپنے کو لکھنوی بتاتے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آج کل میر صاحب کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ اپنے فرزندوں کو پوٹے میں لیے گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس کا یہ عمل تحفظِ زبان کی خاطر تھا کہ وہ عام لوگوں میں بیٹھ کر بدل نہ جائے۔ ان کے سامنے اگر کوئی غریب الفاظ کا استعمال کرتا تھا تو فوراً ٹوک دیتے تھے چاہے وہ خورد ہو یا بزرگ۔

میر انیس کے تلامذہ میں ایک صاحب سید مظفر حسین بھی تھے جو ان سے فارسی پڑھنے آیا کرتے تھے اور لکھنؤ کے محلہ شاہ گنج میں مولوی سید حامد حسین صاحب کنتوری (صاحبِ عبقات الانوار) کے گھر کے برابر رہتے تھے۔ ان کے والد کسی ضرورت سے دلّی جانے لگے تو سید مظفر حسین اپنے استاد میر انیس سے ان کے گھر ملنے آئے اور دورانِ گفتگو یہ کہا کہ میں دلّی جا رہا ہوں دیکھیے کب آنا ہو۔ میر انیس چپ ہو گئے اور کچھ دیر سکوت کے بعد افسوسناک لہجے میں فرمایا کہ "افسوس تم دلّی جاتے ہو زبان بگڑ جائے گی۔ واپس آؤ گے تو 'ورے اور پرے' بولنے لگو گے اور میری ساری محنت رائیگاں جائے گی"[۲] انیس کو اپنے گھرانے کی زبان پر ناز تھا وہ بر سرِ منبر کہتے تھے ؎

بس اے انیس بس کہ نہیں طاقتِ بیاں
ہر بند زخمِ دل پہ ہے گویا نمک فشاں
یہ بول چال اور یہ رنگینیٔ زباں
کیونکر نہ ہو بھلا کہ یہ ہے طرزِ خانداں
بس یہ کلام ہے مددِ کبریا نہیں
جب تک نمک نہ ہو تو سخن کا مزا نہیں[۳]

میر انیس کے ایک مصرعہ پر اعتراض اور اس کا جواب

میر انیس صاحب کا مصرعہ ہے ؏

'جس طرح کہ نغمے کی صدا تار پہ دوڑے'

اعتراض ہوا کہ نغمے کی صدا کا دوڑنا درست نہیں ہے۔ میر انیس حسبِ دستور خاموش رہے اور ایک مجلس میں اس مصرعہ کے پڑھنے سے قبل فرمایا کہ بعض حضرات کو میرے اس مصرعہ پر اعتراض ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فارسی شعرا نے 'صدائے نغمہ' کو اسی طریقے پر نظم کیا اردو فارسی کی تتبع ہے اور مثال میں فارسی کا ایک شعر پڑھا جس کا مصرعہ ثانی یہ ہے ؎

'صدائے نغمہ می دود بہ بنگِ تار تارہا'

میر انیس کا ایک فی البدیہہ مصرعہ

میر انیس صاحب سخت بیمار تھے ان کو دیکھنے کے لیے آنے والوں کا سلسلہ جاری تھا کہ آنے والوں میں سے کسی صاحب نے کہا:

'کہیے میاں انیس طبیعت بخیر ہے'

میر انیس پر مرض کا پورا غلبہ تھا مگر خاموش نہ رہ سکے اور

فی البدیہہ کہہ کر دوسرا مصرع پڑھا ع

'پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے'

اہلیہ میر انیس کا دیا ہوا مصرع

میر انیس کا طریقہ تصنیف یہ تھا کہ پہلے مختلف مطلعے کہتے اور ان میں سے کسی کا انتخاب کر کے مرثیہ مکمل کر لیتے تھے، وقت گزر جانے کے بعد اگر نیا مرثیہ کہنے کا موڈ نہ ہوا تو اسی مرثیے کو اٹھا لیتے تھے اور مصرعوں کو بلند تر کرنے کی فکر میں کھو جاتے تھے جب انھوں نے درج ذیل مرثیہ :

'جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'

نظم فرمایا تو حسب عادت اسی اُدھیڑ بُن میں مبتلا تھے اور جو مصرعے پیش نظر تھے وہ یہ ہیں ؎

یا توئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
'قائم سہاگ مانگ رہے برتری رہے'

مصرع ثانی زیر غور تھا کہ ان کی اہلیہ فاطمہ بیگم ادھر آ نکلیں انیس نے وہ بیت پڑھ کر ان کو سنائی، بیوی نے فی البدیہہ کہا اس طرح کر دیجئے ؎

یا توئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
'صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے'

میر انیس اکثر اپنی اہلیہ سے ادبی مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے کے مروجہ اصول تعلیم سے خوب واقف تھیں۔ ان کے والد مولوی سید احمد علی (شاگرد مولوی دلدار علی غفرانمآبؒ) مستند علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔

مرثیہ خوانی کی تعلیم

میر انیس عموماً رات کی تاریکیوں میں تصنیف مراثی کا کام انجام دیتے تھے یعنی دنیا سوتی تھی وہ جاگتے تھے، چہرہ زردی مائل ہو گیا تھا۔ ایک دن صبح کو برابر والے گھر سے مشق کرانے کی آواز آ رہی تھی۔ میر انیس اُٹھ بیٹھے اور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے میر محمد سلیس سے پوچھا کہ یہ کون مرثیہ پڑھ رہا ہے۔ میر محمد نے جواب دیا کہ بڑے بھیا (مراد میر نفیس) جعفر صاحب کو مرثیہ پڑھنے کی مشق کرا رہے ہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اسی دن سہ پہر کو جب میر نفیس اپنے والد میر انیس کے پاس بغرض اصلاح کلام تشریف لائے تو انھوں نے نفیس سے پوچھا "خورشید علی آج تم کس کو مشق کرا رہے تھے۔ نفیس نے جواب میں کہا کہ محمد جعفر آئے تھے انھیں کو بتا رہا تھا۔ میر انیس کچھ دیر چپ رہے اور پھر کہا کہ "خیر میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم انھیں نہ سکھاؤ مگر اس بات کا خیال رکھو کہ گھر والوں اور باہر والوں میں امتیاز رہے یہ نہ ہو کہ منبر پر جانے کے بعد گھر والا کمتر اور باہر والا برتر ٹھہرے"۔ میر نفیس باپ کی اس بات پر خاموش رہے اور اپنے مرثیہ کو وہیں رکھ کر اپنی نشست گاہ کی جانب چلے گئے۔

تحسین گنج کا عشرہ

میر انیس جب حیدر آباد تشریف لے گئے تو محمد علی خاں 'سالار جنگ اودھ' کے پوتے نواب فدا علی خاں کے یہاں کا عشرہ خورشید علی نفیس فرزند انیس کے سپرد ہوا۔ اس عشرے کی خصوصیت یہ تھی کہ شہر میں مشہور تھا کہ اگر رونا ہو تو تحسین گنج کے امام باڑے میں میر صاحب کے فرزند سے مرثیہ سنو اور شبیہیں دیکھنا ہو تو سید تقی صاحب (حفیدۂ جنت مآب) کے امام باڑے چلو۔

فیض آباد میں میر انیس کی خواندگی

میر انیس جب تک فیض آباد میں رہے وہاں علی مدد اور مدد علی دونوں بھائیوں کے یہاں مجلس پڑھا کیے۔ جب فیض آباد کی سکونت ترک کر دی اور لکھنؤ میں رہنے لگے تو مقررہ تاریخوں میں فیض آباد جاتے تھے۔ اس مجلس کا سلسلہ سید ظفر حسین عرف بابو صاحب فائق تک قائم رہا۔ اب مدد علی کا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا ہے۔

سنیاں شہدا اور میر انیسؒ

شہر کے شہدے "سنیاں" نے اپنے گھر کی مجلس کا اعلان کر دیا اور میر صاحب سے اس کے پڑھنے کا وعدہ بھی نہیں لیا۔ یہ بات جب میر انیس کو معلوم ہوئی تو بہت برہم ہوئے اور لوگوں سے کہا کہ میں تو اس کے یہاں مجلس نہیں پڑھوں گا۔ یہ خبر جب "سنیاں" تک پہنچی تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اس پردہ

بہت شرمندہ ہوا اور مجلس سے قبل محل سرائے انیس آیا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے میر انیس کے گھر کی ماما بُدبُدی بیگم آئیں "کون ہے"۔ جواب میں اس نے کہا کہ میر صاحب کا پرانا خدمتگار آیا ہے اور میر صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ اطلاع جب انیس کو ہوئی تو خود دروازے کی طرف بڑھے، وہ ڈیوڑھی میں چھپ کر چپکا کھڑا ہو گیا تھا۔ میر انیس اسے اس انداز میں دیکھ کر کچھ گھبرا سے گئے اور بولے ...." کیا کہتے ہو"؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میر صاحب گستاخی معاف ہو میں نے آپ سے پوچھے بغیر مجلس کا اعلان کر دیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ اس غریب کے یہاں مجلس نہیں پڑھیں گے۔ انیس کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ "ستیاں" نے جھٹ دروازے کی دہلیز نانگ کر میر انیس کو گود میں اٹھا لیا انیس بہت برہم ہوئے اور کہتے رہے ارے چھوڑ ارے چھوڑ مگر وہ انھیں گود میں لیے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ جب انھوں نے محسوس کر لیا کہ یہ نہیں مانے گا تو اس کی گدّی پر اس زور کا ہاتھ مارا کہ وہ تلملا گیا اور گھبرا کر انیس کو چھوڑ دیا۔ وہ کہنے لگا میر صاحب آپ آج ہماری چاہے جان لے لیں مگر میں آپ کو پڑھواؤں گا ضرور .... انیس نے کہا تم باہر بیٹھو میں تیار ہو کر آتا ہوں، تھوڑی دیر میں تیار ہو کر باہر آئے اور اس کے یہاں جا کر مجلس پڑھ دی۔ وہاں سب منتظر بیٹھے تھے، لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ یہ "ستیاں" کے بلانے پر آ گئے۔ انھیں کیا پتہ کہ ماجرا کیا ہوا۔ بہر حال میر انیس جب تک زندہ رہے اس کے یہاں سالانہ مجلس پڑھا کیے۔

ایک اور واقعہ

اسی طرح کا ایک واقعہ اور ہوا جس کی تفصیل یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں کوئی معظمہ جو پاندان کی درستی کے عہدہ پر معیّن تھیں ان کی صاحبزادی کے ساتھ بادشاہ نے متعہ فرمایا میر انیس اس زمانے میں مرثیہ خوانی ترک کیے ہوئے تھے، ممتوعۂ شاہ نے بھی یہی حرکت کی کہ بغیر مرضی انیس مجلس کا اعلان کر دیا اور اس کی اطلاع جب انیس کو ہوئی تو انھوں نے کہا ؎

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے انیس
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے

لوگوں نے کہا کہ اس کے سپاہی آپ کو پکڑ لے جائیں گے تو آپ کیا کریں گے تب تو جانا ہی ہوگا۔ غیور شاعر نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ جب تک انیس کی جان میں جان ہے کوئی اسے زندہ نہیں لے جا سکتا۔

پانی کا اہتمام

میر انیس کی بیٹی مہدی بیگم کی شادی محمد میرزا انس کے فرزند احمد میرزا صابر سے ہوئی۔ جب وہ رکاب گنج بیاہ کر گئیں تو انھوں نے وہاں کے دروازے پر موجود کنوئیں کے پانی کی بہت تعریف سنی۔ جب یہ بات میر انیس کو معلوم ہوئی تو وہ وہاں سے پانی منگوا کر استعمال کرنے لگے۔ کبھی نجف علی کبھی راحت علی جا کر پانی لاتے۔ وہ پانی "آہن تاب" میں ڈال دیا جاتا اور نیچے ایک صراحی لگا دی جاتی تھی اس میں قطرے قطرے پانی گرا کرتا تھا۔ ضرورت کے وقت وہی پانی میر صاحب استعمال کرتے تھے۔ وہ آہن تاب گھر میں محفوظ ہے۔

چھوٹی بیٹی کی شادی

میر انیس کی سب سے چھوٹی بیٹی آغائی بیگم کی نسبت فیض آباد میں طے ہوئی۔ انیس لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے، گرمی کا زمانہ تھا جب برات میر انیس کے گھر پہنچی، براتیوں کے لیے شربت کا انتظام کیا گیا۔ کسی نے کہہ دیا کہ شربت میں شکر کم ہے۔ یہ خبر جب میر انیس تک پہنچی تو انھوں نے مٹکوں میں کثیر شکر ڈلوا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم کیا کہ اب شکر ٹھیک ہے، لوگ خاموش رہے۔ میر انیس نے انھیں بیٹی کی رخصتی کے بعد درج ذیل رباعی کہی ؎

اب ہند کی ظلمت سے نکلتا ہوں میں — توفیقِ رفیق ہو تو چلتا ہوں میں
تقدیر نے بیڑیاں تو کاٹی ہیں انیس — کیوں رک گئے پاؤں ہاتھ ملتا ہوں میں

میر انیس نے جب یہ رباعی منبر پر پڑھی تو تیسرا مصرعہ پڑھنے

کے ساتھ اپنی تین انگلیوں سے سامعین کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میرے پیروں میں جو تین بیڑیاں تھیں وہ کٹ گئیں یعنی یہ کہ تینوں بیٹیوں کی شادی سے فراغت پائی۔

گوشت اور تمباکو سے دلچسپی

میر انیس بڑے وضعدار انسان تھے جو سامان جس سے خریدتے بس اسی کے یہاں سے آتا تھا۔ حقّہ کے لیے تمباکو عمر بھر فیض آباد سے منگوا کر استعمال کرتے رہے۔ چوک میں مسجد تحسین علی خاں کے نیچے گرگی نامی قصائی تھا وہاں سے میر صاحب کے لیے روزانہ گوشت آتا تھا۔ کبھی نجف علی کبھی راحت اس کام کو انجام دیتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ نجف علی گوشت لے کر آتے تو میر انیس اس کی مختلف بوٹیاں الگ الگ چھانٹ کر رکھ دیتے تھے اور کہتے کہ "بھئی نجف علی تم گرگی کے پاس چلے جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ میری اہلیہ کو کیوں پریشان کرنا چاہتے ہیں اگر وہ ایک ہی طرح کا گوشت دیدیں تو کیا مضائقہ ہے۔ نجف علی واپس جاتے اور میر صاحب کے حسب منشا بدل کر لادیتے تھے۔

کبوتروں کا شوق

میر انیس کو کبوتروں کا شوق تھا۔ ان کے پاس زیادہ تر نکھی اور گلی (خال) کبوتر تھے۔ ان کی تعداد چھ یا آٹھ عدد سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ سہ پہر کو باہر کی نشست گاہ میں آنے سے قبل وہ اپنے ہاتھ سے اس آٹے کی ٹکیہ کو توڑ کر دیتے تھے جو ان کی اہلیہ کھانا پکنے کے بعد کبوتروں کے لیے بنا دیتی تھیں۔ وہ ٹکیہ نرم ہوتی تھی جسے کبوتر شوق سے کھا لیتے تھے۔ اسی وقت ان کی اہلیہ دن بھر کی سرگذشت اور مطالبات پیش فرما دیتی تھیں۔

رات کے معمولات

مغرب کے وقت کبھی مسجد تحسین علی خاں تشریف لے جاتے کبھی باہر اپنی نشست گاہ میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ اس کے بعد آنے والوں کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد کھانا نوش فرماتے اور کچھ دیر نشست گاہ کی طرف ٹہلتے رہتے تھے۔ اس کے بعد اپنے اس کمرے میں چلے جاتے جو مطالعہ اور تصنیف کا مرکز تھا اور فرماتے تھے کہ "وہ شاعر ہی کیا جو تین شمعیں جلا کر روزانہ مشق سخن نہ کرے" میں نے والد مرحوم سے سوال کیا کہ وہ شمعیں کیسی ہوتی تھیں انھوں نے جواب دیا کہ ان کی روشنی بہت صاف ہوتی تھی اور وہ شمع دان ان کے آگے رکھا رہتا تھا اور وہ صبح تک طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ گھر میں موجود بچوں یعنی پوتوں اور نواسوں مثلاً ابو محمد (ابو صاحب جلیس) علی میاں (علی محمد عارف) محمد نواب غیور وغیرہ کو تاکید رہتی کہ ان کے کمرے کی طرف نہ جائیں — وہ اکثر و بیشتر صبح کی نماز پڑھ کر آرام فرماتے تھے۔ انھوں نے خود کہا ہے ؎

'وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں'

میر انیس کے دو ملازم علی حسین اور نجف علی

میر انیس غدر کے بعد جب حیدرآباد گئے تو اپنے ہمراہ دو بیٹوں (میر عسکری رئیس اور میر محمد سلیس) کو ساتھ لیتے گئے، ان کے علاوہ دو خدمت گاروں علی حسین اور نجف علی کو بھی اپنے ہمراہ لیا۔ میر انیس کے انتقال کے بعد ان کے بڑے فرزند میر نفیس نے علی حسین کو اپنے ہاں رکھ لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ مجالس میں جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ میر نفیس کے فرزند (دولھا صاحب عروج) کے ساتھ محمود آباد جارہے تھے کہ راستے میں لو لگ گئی اور محمود آباد میں بیمار رہ کر وہیں انتقال کیا۔ درگاہ محمود آباد میں دفن ہوئے۔

نجف علی نے طویل عمر پائی۔ میر نفیس کے انتقال کے بعد راجہ امیر حسن خاں والیِ محمود آباد نے اپنے یہاں بحیثیت فراش روضۂ حضرت عباسؑ اور روضہ امام حسینؑ مقرر کر لیا تھا۔ ان کی بقیہ ساری زندگی وہیں گذری۔ زیارتِ کربلا کا شرف حاصل تھا۔ کبھی کبھی لکھنؤ آتے تھے۔ خانوادۂ انیس کے پرانے کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس کافی روپیہ تھا جو وقتاً فوقتاً خاندان انیس کے مختلف افراد کو حسب ضرورت قرض دیا کرتے تھے اور بڑے محبت کرنے والوں میں تھے۔ انھیں انیس کے دروازے کی خاک اٹھا کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے مُسن افراد نے دیکھا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں محمود آباد ہی میں انتقال ہوا اور وہیں کربلا میں سپرد لحد کیے گئے۔

میر انیس زید پور میں

زید پور ضلع بارہ بنکی کا ایک قدیم قصبہ ہے ۔ لکھنؤ کے شرفاء سے یہاں کے رشتے ہمیشہ استوار رہے ۔ یہاں کے عوام و خواص ہمیشہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی طرف مائل رہے ۔ وہاں کے بعض افراد تو مرزا دبیر کی طرف مائل تھے مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں انیس کے ماننے والے نہ ہوں۔ خصوصاً میر فضل علی وقار تلمیذ انیس وہاں کے ممتاز شعراء میں شمار کیے جاتے تھے ۔ انھیں کی وجہ سے میر انیس سفر کی زحمت اٹھاتے اور وہاں مجلس پڑھنے جاتے تھے ۔

جناب چودھری محمد علی زیدی زید پور کی یادگار شخصیتوں میں ہیں ۔ موصوف کا بیان ہے کہ "... میر انیس صاحب ایک بار اس قصبے میں تشریف لائے تھے ۔ یہ بات انھوں نے اپنے بزرگوں سے سُنی تھی ۔ اس زمانے میں نشست و برخواست کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور آدابِ مجلس و محفل متعین تھے ۔ چودھری محمد علی صاحب کے جدّ بزرگوار حکیم اتحاد حسین صاحب کا بیان تھا کہ میر انیس اس دیوان خانے میں ٹھہرے جہاں میر علی صغیر صاحب کا مکان واقع تھا ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ میر انیس اپنی تین گھنٹے کی نشست میں جس انداز سے تشریف فرما تھے اسی طرح بیٹھے رہے ۔ قصبے کے ایک بزرگ اقدس حسین صاحب تھے جو متعدد مرتبہ حج و زیارت سے بہرہ مند ہو چکے تھے ۔ میر انیس ان سے حج کی تفصیلات معلوم کرتے رہے مگر اس گفتگو کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ میر انیس حاجی صاحب سے اس طرح بات کر رہے تھے جیسے وہ وہاں کی جگہوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں حالانکہ میر انیس نے حج نہیں کیا تھا اور نہ زیارت کربلا سے مشرف ہو سکے ' اس بات کا اظہار انھوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ کیا ہے ۔ ڈاکٹر محمد علی زیدی کا بیان ہے کہ میر انیس نے شاہ جی کے امام باڑہ کی تعمیر کے سلسلے میں " تاریخ " کہی تھی ؎

" امام باڑہ فرزند شاہ قلعہ شکن "

لیکن راقم السطور نے مصرعہ کے اعداد جوڑے تو پندرہ سو کے قریب برآمد ہوئے ۔ ظاہر ہے کہ تعمیر جس سن کی ہو سکتی ہے یہ عدد اگر عیسوی مانے جائیں تو بہت کم ہوں گے اور ہجری ہونے کا تو سوال نہیں ۔ اگر دوسرا مصرعہ ہوتا تو ممکن تھا کہ پورے عدد صحیح برآمد ہو سکتے ۔ بہرحال زید پور کو یہ شرف حاصل ہے کہ میر انیس دولھا صاحب عروج اور عارف صاحب مرحومین تشریف لے جاتے تھے اور امام باڑہ گڑھی میں مرثیہ خوانی فرماتے تھے [6]

کوٹھری کی پریاں

غدر ۱۸۵۷ء میں جب میر انیس خلائق باغ میں رہتے تھے ۔ ہنگامے کے دوران ان کی دو پھوپھیاں جن کی شادیاں بھی نہ ہوئی تھیں بے حد پریشان ہوئیں ۔ حالات اس قدر پر آشوب تھے کہ عزت و ناموس کا بچانا دشوار تھا ۔ دونوں بہنوں نے مصلّا بچھا کر خدائے بزرگ و برتر کے حضور دعائیں کیں اور بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑا کر رونے لگیں ۔ ابھی نماز میں مصروف تھیں کہ زمین شق ہوئی اور دونوں بہنیں اس میں دھنس گئیں ۔ خاندان کی فاتحہ کی کتاب میں انھیں " کوٹھری کی پریاں " کے نام سے یاد کیا گیا ہے ۔

میر انیس کی قیام گاہیں

میر انیس جب محلہ سہٹی (متصل خلائق باغ) میں رہتے تھے ۔ ہنگامہ غدر رونما ہوا ، میر صاحب مع اہل و عیال کاکوری ملیح آباد تشریف لے گئے ۔ وہاں فقیر محمد خاں گویا کے فرزند محمد احمد خاں احمد نے لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست کیا تھا اور اپنے باغوں میں کیمپ بھی لگوا دئے تھے ۔ انیس مع فرزندوں کے وہاں اس وقت تک قیام پذیر رہے جب تک کہ حالات معمول پر واپس نہ آئے ۔ حالات پرسکون ہوئے تو کچھ دن محلہ منصور نگر میں نواب سید آغا کے یہاں کرایہ پر رہے اس کے بعد "راجہ کی بازار" میں ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا تھا اور جب وہاں سے محلہ سبزی منڈی والے مکان میں آئے تو پہلے والے مکان کو تلسی رام کوہلی کے ہاتھ فروخت کر دیا ۔ وہ مکان اب بھی اسی حالت میں راجہ کی بازار کے چوراہے پر موجود ہے ۔

مرثیہ مونس حوض میں ڈبونے کا واقعہ

شہر کے نامی رئیس نواب محمد حسین خاں صاحب کے یہاں مشاعروں اور مجلسوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ وہیں کے کسی مشاعرے میں جبکہ شہر کے نامی اساتذہ موجود تھے، میر مونس برادر انیس بھی شریک تھے اور ان کے ساتھ میر انیس کے نواسے جناب سید علی مانوس بھی گئے تھے۔ مشاعرہ رات گئے تک جاری رہا اور ہر شاعر نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ علی الصباح تمام سامعین اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوئے۔ میر مونس میر انیس کے گھر آئے اور اوپر کے کمرے میں سو گئے۔ اتفاقاً میر انیس نے اپنے نواسے مانوس سے مشاعرہ کا حال دریافت کیا تو انھوں نے وہاں کے شعری ماحول کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ چھوٹے نانا (مراد میر مونس) نے کل رات جلال صاحب سے یہ کہا کہ "اچھے شاعر کے لیے سو پچاس بند کہنا کوئی بڑی بات نہیں...." میر انیس یہ بات سن کر چپ ہو گئے اور نواسہ انیس تیز قدم چل کر اپنے مکان کی طرف چلے گئے۔

اسی دوران انھیں نواب صاحب کے یہاں مونس کو مجلس پڑھنا تھی اور نیا مرثیہ کہہ کر اپنے ساتھ لائے تھے جو حضرت حر کے حال میں نظم کیا گیا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ وہ جب سو کر اٹھے اور اوپر سے مکان کے نیچے حصے میں آئے میر انیس غوطہ کے لیے حوض میں اتر چکے تھے۔ حوض کے قریب تخت بچھا تھا مونس اس پر بیٹھ گئے اور پھر میر انیس نے ان سے کہا سناؤ۔ وہ اس مرثیہ کے بند پڑھ کر سناتے رہے، میر انیس ہونھ ہونھ کرتے رہے اور اچانک میر مونس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مرثیہ لے کر حوض میں ڈبو دیا۔ میر مونس کا منھ فق ہو گیا —— میر مونس گھبرائے ہوئے مکان انیس میں جو نشست گاہ سے متصل تھا۔ داخل ہوئے۔ اہلیہ میر انیس نے دیور کا چہرہ اترا دیکھ کر کہا "میر نواب خیریت تو ہے" انھوں نے جواب میں کہا کہ بھیا نے ہمیں قتل کر دیا اور تیز قدم چلتے ہوئے اوپر کوٹھے پر چلے گئے اور چادر اوڑھ کر لیٹ رہے۔ ان کے بھتیجے میر عسکری رئیس نے لاکھ لاکھ پوچھا کہ کیا ہوا مگر وہ چپ بُت بنے پڑے رہے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آیا۔ اہلیہ میر انیس نے دسترخوان بچھوایا اور گھر کے تمام خورد و بزرگ کھانا نوش کرنے کے لیے اکٹھا ہوئے مگر میر مونس نہیں آئے تو میر انیس خود انگنائی میں کھڑے ہوئے اور آواز دی "میر نواب، میر نواب .... انھوں نے اوپر سے جواب دیا حاضر ہوا.... جب وہ اوپر سے آئے اور کھانا شروع ہوا تو میر انیس کا حال یہ تھا کہ اپنے پیالے سے بوٹیاں نکال نکال کر بھائی کی طرف بڑھا رہے تھے، پھر کہا کہ پریشان کیوں ہوتے ہو" ایک اچھے شاعر کے لیے سو پچاس بند کہہ لینا کوئی بڑی بات نہیں......"

میر انیس سے اس بات کو سن کر میر مونس ششدر رہ گئے، کہنے لگے کہ بھیا خدانخواستہ میرا کسی کی طرف روئے سخن نہ تھا بلکہ گفتگو کے دوران ضمناً کہہ دیا تھا۔ صاحب واقعاتِ انیس سید مہدی حسن احسن لکھنوی نے میر انیس سے منسوب کرتے ہوئے یہ جملہ تحریر فرمایا ہے کہ "میر انیس نے میر نواب مونس سے یہ کہا کہ اگر تمھاری یہی تعلیاں ہیں تو خورشید علی (نفیس) کی جوتیاں ہوں گی اور تمھارا سر" جناب احسن کی یہ بات میر انیس ایسے با اخلاق صاحب کمال کے لیے زیب نہیں دیتی۔ معلوم نہیں انھیں یہ روایت کس سے معلوم ہوئی، اس کے برخلاف سید محمد ہادی لائق مرحوم کا بیان سنیے:

"..... میر مونس نے کہا کہ بھیا جلد ہی ہمیں اس مرثیے کو پڑھنا تھا... میر انیس نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہم تم مل کر پھر کہہ لیں گے۔ یہاں تک کہ عصر کا وقت آیا دونوں بھائیوں نے نماز پڑھی، میر انیس نے گھر کی ماما کو بھیج کر اپنے فرزند میر خورشید علی نفیس کو بلایا اور بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میر نفیس بیٹھ گئے، بجو مصرعہ کاغذ ان کو دے دیا گیا۔ جناب نفیس کا بیان ہے کہ باباجان اور چھوٹے چچا میں مرثیہ شروع کرنے سے پہلے "پہلے آپ" کی لفظی تکرار ہوئی۔ میر مونس نہ مانے، پھر میر انیس نے مطلع کہا اور اس کے بعد اشعار اس روانی سے کہے کہ ہمیں لکھنے میں دشواری ہو رہی تھی یہاں تک کہ ۵۶-۵۷ بند مکمل ہوئے، اس کے بعد میر انیس خاموش ہو گئے اور میر مونس کی طرف اشارہ کیا۔ میر مونس نے

اپنی روانی و برجستگی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ والد ماجد سید محمد ہادی لائق مرحوم بیان فرماتے تھے کہ میر مونس کو ترک ملانے میں دشواری ہو رہی تھی میر انیس نے ان کے ہاتھ سے تمام اوراق لے لیے اور ایک آدھ بند کو نظری قرار دے کر سلسلہ ملا دیا، جب یہ مرثیہ مکمل ہو گیا تو میر نفیس کو میر انیس نے حکم دیا کہ تم اسے آج شب میں صاف کر دو۔ میر نفیس نے اسی رات اسے صاف کیا اور دوسرے دن صبح کو اپنے چچا کو دے دیا۔ مرثیے کا مطلع بند یہ ہے ؎

مجلس افروز ہے مذکورِ وفاداریِ حُر
دل پہ ہر گل کے ہویدا ہے ہواداریِ حُر
کس پہ ثابت نہیں سرداری یا داریِ حُر
وجہ آزادیِ دوزخ ہے عزاداریِ حُر
قید پھر کیسی جو حامی وہ بہادر ہوگا
حرمتِ حُر کو جو سمجھے گا وہی حُر ہوگا

میر انیس اور مرزا غالب

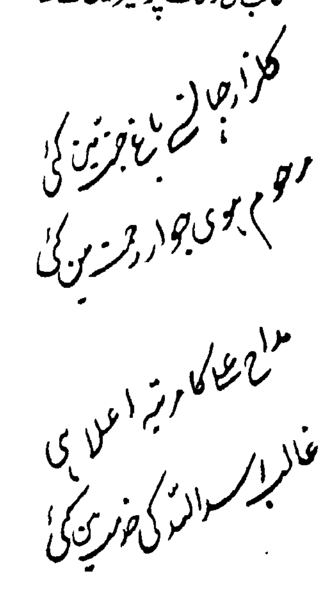
میر انیس اور مرزا غالب میں براہِ راست خط و کتابت نہ تھی۔ مگر میر انیس کے ہم عصر اور دوست جناب مفتی میر عباس شوستری سے مرزا صاحب کی مراسلت رہتی تھی۔ ان خطوط کی کیفیت سے میر انیس بھی لطف اٹھایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا غالب نے مرثیہ کہنے کی کوشش کی اور چند بند کہہ کر مولانا سید محمد صاحب مجتہد العصر (رضواں مآب) کو لکھنؤ روانہ کیے۔ میر انیس کے لیے مرزا غالب کا قول تھا کہ "ہندوستان میں انیس.... جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ مرزا غالب کا حیاتِ انیس میں ۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ کو انتقال ہوا۔ میر انیس نے باقاعدہ کسی مرثیے میں ان کی وفات کا حال تو نظم نہ کیا البتہ ایک رباعی ضرور کہی جو درج ذیل ہے ؎

گلزارِ جہاں سے باغِ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوارِ رحمت میں گئے
مداحِ علی کا مرتبہ اعلا ہے
غالب اسداللہ کی خدمت میں گئے

قبرستان کے لیے زمین کی خریداری

میر انیس نے ۲۳ جولائی ۱۸۷۱ء کو اپنے خاندانی قبرستان کے لیے شیخ ہینگا سے مبلغ سو روپے کی زمین خریدی اور اپنے وارثان کے لیے حکومت سے دفن اموات کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ اور اس میں ایک مالی جس کا نام "کسیا" تھا مقرر کیا۔ "کسیا" نے وہاں مختلف قسم کے پھولوں کے درخت لگائے اور روزانہ تاحیاتِ انیس وہ پھول توڑ کر میر صاحبان کو پہنچایا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں میر مونس زیارت کربلا کے لیے گئے اور واپسی پر ایک کھجور کا درخت وہاں سے لائے، وہ درخت بھی کسیا نے بو دیا، اسی بنا پر اس قبرستان کا نام "میر انیس کی بغیا" مشہور ہو گیا۔ اتفاق یہ دیکھیے کہ زمین کی خریداری کے بعد میر انیس کی بڑی بہن اور میر محمد رضا رضا کی والدہ کا انتقال ہوا۔ میر انیس نے انھیں اپنے سامنے وہاں دفن کرایا۔ اکثر صبح یا مغرب کے وقت فاتحہ پڑھنے جاتے تھے۔

عکسِ تحریر میر انیس
غالب کی وفات پر میر انیس نے لکھا



میر انیس کی بیٹی عباسی بیگم کی وفات

میر انیس جب غدر کے زمانے میں سکونتی دارالامان چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو ان کی بیٹی عباسی بیگم جو میر ضامن علی کو منسوب تھیں وہ بھی ان کے ساتھ کاکوری چلی گئیں۔ جانے سے پہلے گھر کا قیمتی سامان انگنائی میں دفن کرا دیا۔ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد جب وہ اپنے مکان واپس گئیں تو گورے سپاہی زمین کھود کر سارا سامان لے جا چکے تھے۔ اس واقعہ کا ان کے ذہن پر اتنا اثر ہوا کہ خفقانی کیفیت پیدا ہو گئی اور کچھ دن بعد پیٹ میں پھوڑا ابھی نکل آیا جس سے ان کی موت واقع ہوئی۔

میر انیس کی تدفین

میر انیس نے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء مطابق ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو بوقت عصر انتقال فرمایا۔ خبر پھیلتے ہی عقیدتمندانِ انیس جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جن میں علماء، حکماء، شعرا اور مختلف صنعت و حرفت

سے وابستہ اکابرین تھے۔ ایک عجیب غم انگیز منظر تھا۔ باہر کی نشست گاہ میں میر انیسؔ کے خاندان کے دیگر شعرائے کرام جمع تھے اور آنے والے انھیں دلی تعزیت پیش کر رہے تھے۔ جنازہ اٹھ کر دریائے گومتی لے جایا گیا۔ ہزاروں سوگواروں کا مجمع تھا۔ غسل کے بعد جنازہ کو امامباڑہ غفراں مآب لایا گیا۔ نماز میت مولوی سید بندہ حسین مجتہد نے پڑھائی، پھر جنازہ مقبرۂ انیسؔ لایا گیا، اک کہرام بپا تھا۔ سلیمان قدر برادر واجد علی شاہ نے میر انیسؔ کے بڑے فرزند میر نفیسؔ کے کندھے پر سیاہ "شالِ عزا" ڈالی۔ بڑا دردناک منظر تھا۔ ہائے میر صاحب ہائے میر صاحب کی صدائیں فضا کو غم انگیز بنائے ہوئے تھیں۔ پڑوس کے گھروں سے بھی مستورات کے گریہ کی ہلکی ہلکی صدائیں آ رہی تھیں جو اس ماحول میں تازیانہ کا کام انجام دے رہی تھیں، مرزا دبیرؔ کے شاگرد احمد حسن فرقانی میرٹھی اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مسدس میں اس ساری کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ یہ مسدس دبیرؔ اور انیسؔ کے سلسلہ میں اہمیت کا حامل ہے۔ صرف ایک بند ملاحظہ فرمائیں ؎

اکیانوے (۱۲۹۱ھ) بارہ سو پہ جو سال آیا ناگہاں
تاریخ بست و ہفتم شوال تھی عیاں
افسوس ناپسند ہوا مسکنِ جہاں
ہستی سے میر انیسؔ عدم کو ہوئے رواں
ہر دل کو داغ لالہ کے مانند دے گئے
باغِ جہاں سے خلد کو تشریف لے گئے

محمد حسین آزاد اور حالاتِ میر انیسؔ

آزاد صاحب نے آبِ حیات لکھنے کی ابتدا کی تو جناب نفیسؔ کو میر انیسؔ کی وفات کے سلسلے میں تعزیتی خط بھیجا اور اس کے بعد ایک خط اور آیا جس میں جناب انیسؔ کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام طلب فرمایا تھا۔ جناب نفیسؔ نے تعزیتی خط کا جواب لکھوا دیا مگر حالات و کلام کے سلسلے میں خاموشی اختیار کر لی، یہاں تک کہ تیسرا خط آیا اور پھر وہی بات دہرائی۔ جناب عارفؔ سب خط پڑھتے رہتے اور جواب اپنے نانا میر نفیسؔ سے پوچھ کر لکھ دیتے تھے، ایک دن انھوں نے اپنے نانا سے کہا..." نانا ابا، مولوی آزاد صاحب دہلوی کے کئی خط آ چکے ہیں اور وہ آپ کے والد مرحوم (مراد میر انیسؔ) کے حالات زندگی اور نمونہ کلام شامل کتاب کرنا چاہتے ہیں، اب آپ جیسا فرمائیں ویسا جواب دیا جائے۔ جناب نفیسؔ نواسے کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا... علی کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مولوی آزاد کی چند سطریں لکھ دینے سے میرے باپ کا نام زندہ رہے گا، ارے بھئی میرے باپ کے سید الشہداؑ ذمہ دار ہیں....." اس جواب کو سن کر عارفؔ مجبور ہو گئے اور محمد حسین آزاد کو جواب نہ دیا۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی کتاب آبِ حیات کے مقدمے میں بہ طور شکایت یہ تحریر فرمایا ہے کہ میر صاحب کے فرزند ارجمند کو کئی خط لکھے مگر انھوں نے جواب سے سرفراز نہ فرمایا۔"

★

حواشی :- ۱؎ محمد جعفر صاحب اثیمؔ بندے کاظم جاویدؔ کے والد، مولانا دلدار علی نصیر آبادی (غفراں مآبؒ) کی اولاد ذکور میں تھے۔ ۲؎ اس روایت کے لیے راقم جناب محمد صادق صفوی رئیس شمس آباد کا ممنون ہے۔ موصوف اکثر و بیشتر ایسے بیش بہا ادبی نوادر ہمیں بھیجتے رہتے ہیں جو عام طور سے آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ ۳؎ مندرجہ مقطع میر انیسؔ کے ایک غیر مطبوعہ مرثیے سے نقل کیا گیا۔ ۴؎ مصرعہ ثانی "قائم سہاگ مانگ رہے ...الخ" راقم کو ایک قلمی مخطوطے سے دریافت ہوا۔ ۵؎ مذکورہ واقعے کو دوسری طرح بھی بیان کیا جاتا ہے کہ "...... میر انیسؔ وزیر گنج کے محلہ چاندی خانہ میں مجلس پڑھ رہے تھے۔ وہیں قریب ہی ستیاں شہدے کا مکان تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ یہاں کے بعد میر صاحب میرے غریب خانہ پر مجلس پڑھیں گے۔ مجمع اس کے یہاں جمع ہو گیا۔ میر انیسؔ جب وہاں پہنچے تو منبر کا اہتمام نہ تھا۔ اسی وقت اس نے وہاں موجود ایک مٹکا الٹ کر رکھ دیا اور اس پر دوشالہ ڈال دیا۔ میر صاحب نے اس پر بیٹھ کر پورا مرثیہ پڑھ دیا۔ ۶؎ میر انیسؔ اور زید پورؔ والی روایت کے لیے راقم سید محمد حیدر رضوی زید پوری کا ممنون ہے، انھوں نے چودھری محمد علی صاحب رئیس بارہ بنکی سے نقل لے کر پہنچائی۔ ۷؎ مولانا حامد حسن قادری مصنف "مختصر تاریخ مرثیہ گوئی" اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ پر رقم فرماتے ہیں کہ "میر مونسؔ اور میر انسؔ میں بنتی نہ تھی۔ فتنہ پردازوں نے ان میں سخت اختلاف پیدا کرا دیے تھے۔" معلوم نہیں اس روایت کو قادری صاحب نے کہاں سے لے کر تحریر فرما دیا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگوں نے میر انیسؔ اور میر انسؔ کے مابین چشمک کرا دی تھی۔ میر مونسؔ سے تو دونوں بھائیوں (انیسؔ اور انسؔ) کے تعلقات بڑے مشفقانہ تھے۔ ۸؎ انیسؔ کے انتقال پر ان کے ہمعصر مرزا سلامت علی دبیرؔ نے طویل تاریخ کہی تھی۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

آسماں بے ماہِ کامل سدرہ بے روح الامیں = ۱۸۷۴ء
طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ = ۱۲۹۱ھ

غزلیں

بشیر بدر
۴۴ مالی پورہ روڈ، پیر گیٹ
بھوپال

مری زندگی بھی مری نہیں یہ ہزار خانوں میں بٹ گئی
مجھے ایک مٹھی زمین دے یہ زمین کتنی سمٹ گئی

تری یاد آئے تو چپ رہوں، جو میں چپ رہوں تو غزل کہوں
یہ عجیب آگ کی بیل تھی مرے تن بدن سے لپٹ گئی

مجھے لکھنے والا لکھے بھی کیا، مجھے پڑھنے والا پڑھے بھی کیا
جہاں میرا نام لکھا گیا وہیں روشنائی الٹ گئی

نہ کوئی خوشی نہ ملال ہے کہ سبھی کا ایک سا حال ہے
ترے سکھ کے دن بھی گزر گئے مرے غم کی رات بھی کٹ گئی

مری بند پلکوں پہ ٹوٹ کر کوئی پھول رات بکھر گیا
مجھے سسکیوں نے جگا دیا مری کچی نیند اچٹ گئی

ڈاکٹر کرامت علی کرامت
کھلی کوٹ کالج - برہم پور
اڑیسہ

دل کی خلش کے اور ابھرنے کا وقت ہے
لب پر تبسّموں کے بکھرنے کا وقت ہے

کیوں تم اڑان بھرتے ہو آکاش کی طرف
یہ تو سمندروں میں اترنے کا وقت ہے

بھوری سی چاندنی میں سلگتی ہے غم کی شاخ
جینے کا وقت ہے نہ یہ مرنے کا وقت ہے

آگے ہے ریت اور سرابوں کا سلسلہ
سائے میں آسماں کے ٹھہرنے کا وقت ہے

کیوں تم سمیٹتے ہو اسے اپنی ذات میں
کرچوں کی طرح دل کے بکھرنے کا وقت ہے

پھوٹے کسی طرف سے کرن آفتاب کی
دل کا چراغ امید سے بھرنے کا وقت ہے

وہ تجربے جو دفن تھے صدیوں کی قبر میں
اب تو کرامت ان کے ابھرنے کا وقت ہے

یسم. جمال علوی
شیانہ - ۲۹۹/۹۵ پُرانا نخاس
لکھنؤ

دورِ حاضر کی نمائندہ پاکستانی شاعرات

اُردو زبان و ادب کے فروغ میں خواتین کی کاوشات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ آزادی سے قبل مشاعروں میں خواتین کی شرکت، ادبی نشستوں میں ان کی شمولیت، یہاں تک کہ رسائل میں شائع ہونے کا رجحان بھی قدیم دور کے تقاضوں کی وجہ سے بے حد معیوب سمجھا جاتا تھا اور یہی سبب تھا کہ بیشتر خواتین ادبی ذوق رکھنے کے باوجود اپنی تخلیقات منظرِ عام پر نہیں لا پاتی تھیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ، عوامی خیالات میں بالیدگی، وسعت، آزادیٔ نسواں اور عورتوں کے تعلیمی و تنقیدی شعور میں اضافہ ہوا۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت نے جہاں ہمیں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، امرتا پریتم، صالحہ عابد حسین، اے سارہ خاتون، زبیدہ خاتون، رضیہ بٹ، واجدہ تبسم، زرینہ صابر، عطیہ نسرین علوی، نرگس جمیل، شاہدہ شاہ، فروزیں جمال، وسیلہ خاتون، نسیم سحر، ڈاکٹر زینت ساجدہ، سعدیہ دہلوی، یاسمین قریشی، رابعہ سعید، فرحت صدیقی، شائستہ وحید، کلثوم واحد، ریاض فاطمہ، زاہدہ حنا، صبیحہ بانو، نرجس سلطانہ، ساجدہ حبیب، مینا ناز، رخسانہ سہام، منورہ نوری، شاہین مرزا، شمع خالد، نیلم صدیقی، پروین سعید، وحیدہ نسیم، زرینہ ضمیر، عذرا بیگ، شہناز بٹ، ماہ منیر، میمونہ انصاری، فردوس حیدر، شکیلہ رفیق، یاسمین کوثر، مسرور جہاں، آمنہ ابوالحسن، بشریٰ رحمٰن، فرخندہ لودھی، اسما اعجاز، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، رفیعہ منظور الامین، عطیہ پروین اور عفت موہانی وغیرہ سے روشناس کرایا، وہیں اس دور نے شاعرات میں ہمیں ادا جعفری، بسمل صابری، نسرین انجم، سارہ شگفتہ، یاسمین حمید، ظہیر النساء نگار، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، مسعودہ حیات، ساجدہ زیدی، عائشہ حبیب، تنویر انجم، ناظمہ طالب، زہرہ نگاہ، نیر جہاں، زاہدہ زیدی، فاطمہ شفیق شعری، عزیز بانو داراب وفا، رفیعہ شبنم عابدی، زرینہ ثانی، ممتاز مرزا، جمیلہ بانو، صدف جعفری، روحی کنجاہی، شاہجہاں بانو یاد، ممتاز صنم، سیدہ عنوان چشتی، سیدہ اختر، پروین کیف، عارفہ کمال، بشریٰ زیدی، نعیمہ اختر، ضو فشاں انجم، نجیبہ خانم نرگس، سیدہ ضیا احتشام، رئیسہ صبا، شاہدہ حسن، پر تبھا نسیم، انجمن آرا شمیم، نسرین نقاش، حمیدہ سیما خان، آمنہ ابوالحسن، افسانہ نگار، نجمہ سلطانہ، شبنم کاکوروی اور اُمّ ہانی جیسے معتبر نام بھی عطا کیے۔

ان تمام شاعرات میں پاکستانی خواتین اپنی سیاسی بصیرت اور بیباکیٔ اظہار کے ضمن میں ہندستان کی تمام شاعرات پر فوقیت لے گئیں۔ اگرچہ غزل اور نظم میں یہ لب و لہجہ نسائیت کے لیے کچھ نامانوس اور انجانا تھا، نیز خواتین کے نام کے ساتھ اس کا تصور ہی قدیم غزل کے رنگ و نزاکت کو اک دم مجروح کرتا ہوا نظر آرہا تھا، لیکن ایک دن اس قدیم پیکرِ تخیل کو بھرپور توانائی کے ساتھ رجائی لب و لہجہ میں رونما ہونا تھا۔

ہندستانی شاعرات کے لب و لہجہ میں یک گونہ ٹھہراؤ ہے اور یہ اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے نسوانی روایات اور اخلاقی توقعات پر انحصار

اور حقیقت نگاری کے مظاہرے میں بیباکی و بے حجابی سے پرہیز کرتا ہوا
آتا ہے لیکن جس طرح نثر میں حقیقت کے پردے چاک کرتے ہوئے،
بت کو توڑنے والی پہلی خاتون عصمت چغتائی تھیں، اسی طرح دورِ حاضر
ں پاکستان میں جذبات کی بے حجابی اور شاعرانہ بیباکی کی علمبردار فہمیدہ
ض، ادا جعفری، کشور ناہید اور پروین شاکر ہیں۔ اس ضمن میں فہمیدہ ریاض
نظم "خود احتسابی" کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں ؎

جب آخری بوسہ، زندگی رقم کرے گا
جب نسلیں اپنے خوف کو لذت سمجھ کر
برداشت کرنا سیکھ لیں گی
اور خلا بھی تصنع کی تصویر ہوگا
میں اپنا سر تکیے سے اٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی!

———— (خود احتسابی)

بغرض موازنہ اور بطورِ نمونہ ساجدہ زیدی کو، جو ہندستان کی نمائندگی کر رہی ہیں،
نظر فرمائیں ؎

میں اس آتش کی خالق ہوں
مرے احساس کی بھٹی
مرے جذبوں کے آتش داں
مرے افکار کے شعلوں نے
اس آتش کو ڈھالا ہے

———— (آتشِ سیال)

پاکستانی شاعرات میں سب سے سینئر ادا جعفری ہیں، جنھیں بجا طور پر پاکستان
امریتا پریتم کہا جاتا ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور پانچواں
طبع ہے۔ "سازِ سخن بہانہ ہے" (۱۹۸۲ء)۔ "غزالاں تم تو واقف ہو"
۱۹۷۴ء) "شہرِ درد" (۱۹۶۸ء) اور "میں ساز ڈھونڈتی رہی" (۱۹۶۴ء)
ئع ہو چکے ہیں۔ ان چاروں میں ان کے یہاں ترنم کے ساتھ ساتھ لطافت
رالفاظ کو بے حد خوبصورتی سے برتنے کا سلیقہ ہے۔ وہ نہ تو روایتی شاعری
ے مکمل طور پر انحراف کرتی ہیں اور نہ ہی کلی طور پر صرف علامتی شاعری کے
ندگی۔ وہ ہائیکو بھی لکھتی ہیں اور قدیم طرز کی نظمیں بھی۔ اور اس پیمانہ ادبی میں
ادا بے حد کامیاب ہیں۔ ان کے یہاں سیاست پر تنقید، زندگی کا حقیقی کرب، ہجر کا
درد، عورت کے استحصال کے خلاف احتجاج اور عصری تقاضوں سے آگہی کا
احساس بڑے ہی مناسب الفاظ میں، جمالیاتی حسن کے ساتھ اشعار کے قالب
میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم اور غزل دونوں میں تاثر ہے، فن کی بلندی
ہے، شگفتگی، سلاست اور روانی ہے لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے بھی
ان کا کلام نسوانیت سے عری نظر آتا ہے ؎

ہزار دشت اس مختصر سی راہ میں ہیں
شمیم جاں کو نہ بھولے سے مرحبا کہنا
نہ جانے کتنے چراغوں کا خوں ہوا ہوگا
نہیں ہے سہل کسی دل کو بے وفا کہنا

———

دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اک آشنا سی ضو
سوچو تو آس پاس کوئی راز داں نہیں

———

خود اپنی ذات سے ہیں، شناسائیاں تو ہیں
صحرا میں ہم سفر مری تنہائیاں تو ہیں
پتھر بھی برگ و گل ہیں کہ اپنی گلی کے ہیں
آخر بہ قدرِ ظرف پذیرائیاں تو ہیں
گل پیرہن ہے آج بھی اندازِ نقشِ پا
یعنی دلوں کی حوصلہ افزائیاں تو ہیں
جگنو تتلیوں کو ترستا رہا ہے جی
کاغذ کے برگ و گل میں بھی رعنائیاں تو ہیں

———

دیوارِ شب وہی ہے جمالِ سحر وہی،
شیشے نہیں رہے ہیں کہ سنگِ گراں نہیں

———

فہمیدہ ریاض کو پاکستانی شاعرات کی نمائندہ کہا جاتا ہے۔ وہ گورنمنٹ
کالج ساہیوال میں لکچرر ہیں۔ ان کے اشعار میں جذبوں کی جو بے حجابی
ہے، اس کی توقع صنفِ نازک سے تو کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ ان کا دیوان

"پتھر کی زبان" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ افکار کی عُریانی کے ساتھ ساتھ سیاسی خیالات کی افراط اور حقوقِ نسواں کی بلند آوازنے بھی ان کے اشعار کا حُسن کم تو نہیں کیا ہے، اسے بیباکانہ نسائی لب و لہجہ ضرور عطا کر دیا ہے، لیکن اس بے حجابانہ نسوانیت میں لذت و حسن کا احساس، ان کے یہاں اپنی پُوری شدت سے انگڑائیاں لیتا نظر آتا ہے، البتہ ان کی شہرت میں ان کی تشنہ لب نظموں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ زبان سادہ اور جدید اصطلاحات سے پُر ہے۔ نمونۃً چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

پتھر سے وصال مانگتی ہوں
میں آدمیوں سے کٹ گئی ہوں
شاید پاؤں سُراغِ اُلفت
مٹھی میں خاک بھر رہی ہوں
وہ خواہشِ بوسہ بھی نہیں اب
حیرت سے ہونٹ کاٹتی ہوں

یہ مری سوچ کی انجان کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے
اپنی مبہم سی عبارت کے ڈوپٹے میں چھپی
سر جُھکائے ہوئے کترا کے نکل جاتی ہے

جو مجھ میں چھپا، میرا گلا گھونٹ رہا ہے
یا وہ کوئی ابلیس ہے، یا میرا خدا ہے

ہاں مرے خیمہ میں کجی تھی
اب خوش ہوں کہ بھٹک رہی ہوں
اس گریۂ زار پر نہ جاؤ
میں دل ہی دل میں ہنس رہی ہوں

کشور ناہید اگرچہ یو۔پی سے تعلق رکھتی ہیں اور پاکستان میں آباد ہیں اس لیے ان کی نظموں کی زبان بھی بے حد پُرکشش ہے۔ اس میں ترنم ہے، موسیقیت ہے۔ لیکن ان کے اشعار پر بہر حال رنگِ تغزل غالب نظر آتا ہے ان کا دیوان "فتنہ سامانیِ دل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نظموں میں تنوع ہے تشنگی، کرب، اداسی اور مردوں کی بالادستی کے خلاف ایک خوبصورت احتجاج ہے، جس میں عشق کی لطافت بھی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ کلام میں نُدرت اور سلیقہ ہے۔ "گلیاں، دھوپ اور دروازے" (۱۹۷۸ء) اور "میرے لوگ زندہ ہیں" (۱۹۸۰ء) سے انھیں شہرت ملی۔ انھوں نے سائمن ڈی بوائر کی کلاسک کا اُردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ "ملامتوں کے درمیان" (۱۹۸۱ء) اور "بے نام مسافر" (۱۹۷۱ء) ان کے دوسرے شعری مجموعے ہیں۔ "خود کلامی" "خود احتسابی" اور "میں کون ہوں" ان کی مشہور نظمیں ہیں، لیکن ان پر غزل کا رنگ بہر طور حاوی ہے، جس میں نسوانی سوز و گداز، والہانہ پن، تراکیب کا دلکش استعمال، الفاظ کی میناکاری اور تراش خراش، تفکر، لطافت اور وارفتگی موجود ہے۔ انوکھے انداز میں لہجہ کا ترنم کرب آمیز کروٹیں لیتا ہوا صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے ؎

ہر ایک لفظ تھا منسوب جو کسی نے کہا
نہ کام آئیں کبھی بے زبانیاں اپنی

یہ میری ذات تو مجھ میں سما کے رہ نہ سکے
وہ دشت ہوں کہ سمندر چھپا کے رہ نہ سکے

کبھی نظر تو آ، تسکینِ اضطراب تو دے
مری کھلی ہوئی آنکھوں کو کوئی خواب تو دے

دُعا سے تزکیۂ نفس تک سفر ہے بہت
لباس بدلو گے کتنے بھی اب ضرورت کے

سنبھل ہی لیں گے، مسلسل تباہ ہوں تو بھی
عذابِ زیست میں رشکِ گناہ ہوں تو بھی

قبروں کو بہن بنانا سیکھیں   بالوں پہ نئی رُتیں سجا کر

وہ شخص جس کی آنکھ سے ہے رنگ دبے طلب
پہلے پہل ملا تو بہت مہربان لگا!

حیا سے سرخ ہوا رنگ تو کھلے گل بھی
دکھا گئی تری صورت حجاب کی چلمن
سنی ہے ایک زمانے کے بعد سرگوشی
مہک اٹھی ہے تمنا، بہک اٹھی دھڑکن

جس نے بھی حالِ غمِ دل پوچھا
ہم نے اس کو ہی مسیحا سمجھا

تین نظموں کے ایک ایک بند ملاحظہ فرمائیں ؎

بارود جو قوموں کی تقدیریں
سرحدوں پر بدلتا تھا
اسے میری دہلیز پر لانے والوں کو
میں کیسے بتاؤں
میرا اس زمین سے رشتہ کیا ہے
(ڈومیسائل)

پہلے تم نے میری شرم و حیا کے نام پر خوب تجارت کی تھی
میری تمنا، میری وفا کے نام پر خوب تجارت کی تھی
اب گودوں میں اور ذہنوں میں، پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے

پوسٹروں پر نیم برہنہ
موزے بیچتی، جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں
(میں کون ہوں)

اندھیری گلی میں رونے والی بلی کی طرح
گھروں میں بلکتی عورتوں کی سی زندگی
مجھے پسند نہ تھی
مجھے یہ بھی پسند نہ تھا
کہ اندر سے تو میں زرد ا جاؤں
اور باہر سے نکھری نکھری نظر آؤں
(بند دروازے سے جھانکتی چیخ)

پروین شاکر بھی خواتین کی نئی نسل کی نمائندہ بن کر ابھری ہیں، اور رومانیت سے اظہاریت کی جانب مائل بہ سفر ہیں اور اس طرح انہوں نے رنگِ تغزل کو بینائی عطا کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ "خوشبو" ۱۹۷۶ء میں، "صد برگ" ۱۹۸۰ء میں اور "خود کلامی" ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروین شاکر کے کلام میں رات کی رانی کی مہک تو ہے لیکن گلِ عباس کا پھیکا پن بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں ببول کے کانٹوں کی چبھن، نسوانی عریانیت اور کریلے جیسی مزیدار تلخی بھی جلوہ گر ہے۔ تازگی و شگفتگی، سادگی و پرکاری اور موسیقیت ان کا طرۂ امتیاز ہے، ساتھ میں عشقیہ جذبات کا بے باکانہ اظہار بھی کہیں رنگ آمیزی اور کہیں بے حجابی کا مظاہرہ کرتا نظر آتا ہے۔ نظیر صدیقی فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر کا موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"پروین شاکر کی شاعری لڑکی کی ترجمان ہے۔ کشور ناہید کی شاعری عورت کی اور فہمیدہ ریاض کی شاعری جدید عورت کی۔ ان تینوں میں جہاں تک شعری تکمیل کا تعلق ہے، پروین شاکر اپنی ہم عصر شاعرات پر فوقیت لے گئی ہیں۔"
(جدید اردو غزل)

"وصال"، "ہنی مون" اور "سپردگی" وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ پروین شاکر کا رنگِ تغزل بھی داد و دہش کا مستحق ہے ؎

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن مور بن کر ناچتا ہے
کسی کے دھیان میں ڈوبا ہوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

عکسِ خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

جانتی ہوں کہ بچھڑنا تری مجبوری ہے
پر مری جان ملے مجھ کو سزا آہستہ

رات جب پھول کے رُخسار پہ دھیرے سے جھکی
چاند نے جھک کے کہا اور ذرا آہستہ

تو مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

ہمیں خبر ہے ہَوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا کہ ذرا دیر کو رُکے بھی نہیں

وہ رُت بھی آئی کہ میں پھول کی سہیلی ہوئی
مہک میں چمپا کلی، روپ میں چنبیلی ہوئی

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سُراغ ہے

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہوئی جیسے دُلہن کی خوشبو

میں بچ بھی جاؤں تو
تنہائی مار ڈالے گی
میرے قالب کا
ہر فرد

قتل گاہ میں ہے

آدم و حوّا
بہشت سے جب بھی نکلے ہوں گے
سپردگی کی اس حسیں انتہا پہ ہوں گے
اسی طرح
ہم بدن، ہم خواب، ہم تمنّا

(وصال ۔ صد برگ)

بسمل صابری بھی گورنمنٹ کالج ساہیوال میں لیکچرر ہیں۔ حالاتِ حاضرہ اور سیاست پر بے حد کھل کر قلم اُٹھاتی ہیں۔ زورِ بیان اور الفاظ کا بے حد مناسب استعمال انھیں اپنے دور کی شاعرات میں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے ــــ "روشنیوں کے رنگ" میں آپ اُن کا مخصوص رنگ ملاحظہ فرمائیں ؎

نکل کے آ تو گئے
گہرے پانیوں سے مگر
کئی طرح کے سرابوں نے
مجھ کو گھیر لیا

آگے رقمطراز ہیں ؎

نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں بسمل
ہر ایک سانس میرا اب سفر میں رہتا ہے

زہرہ نگاہ نے بھی پاکستانی شاعرات پر طاری جمود توڑنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ان کی مشہور نظم "ایران" کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں ؎

میری زمیں بھی تمھاری زمیں سے ملتی ہے
دریدہ پیرہن ہستی
دبے بسی بھی
اک سی ہے

نیر جہاں کا انداز بھی زہرہ نگاہ کے انداز سے مماثلت رکھتا ہے، وہ لاس اینجلس میں مقیم ہیں۔ بڑی مختصر اور خوبصورت نظمیں لکھتی ہیں۔ ان کی جدید اصطلاحات، نادر افکار اور منفرد اندازِ بیان نے انھیں دورِ حاضر کی مقبول شاعرات کی صف میں لا کھڑا کیا ہے ؎

"..... میری آنکھیں وہ کھلی قبریں ہیں
جن کو مُردہ شعلے..."

پاکستان میں اس قبیل کی شاعرات کی فہرست کافی طویل ہے۔ سارہ شگفتہ، تنویر انجم، ناظمہ طالب، عائشہ حبیب اور نسرین انجم بھٹی وغیرہ بھی ادبی حلقوں کے بیحد معروف نام ہیں۔ ان میں سارہ شگفتہ جو ایک ٹرین ایکسیڈنٹ میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکی ہیں، بے حد عُریاں لکھتی رہی ہیں، جن کے مفہوم کچھ اس قسم کے ہیں:

"میں نے اپنی بند آنکھوں اور مُردہ ضمیر سے جبراً
تمھاری عصمت دری کی ہے"

تنویر انجم کراچی یونیورسٹی میں انگلش کی پروفیسر ہیں اور ان کا مجموعہ کلام "ان دیکھی لہریں" ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ وہ بے حد چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھتی ہیں جن میں "کھلی آنکھیں" اور "بھیگے ہوئے پیر" کافی مشہور ہیں۔ وہ پس ماندہ، بے یار و مددگار اور مایوسیوں کی شکار نئی نسل کو موضوعِ سخن بناتی ہیں۔

ناظمہ طالب "کرن ڈائجسٹ" کی ایڈیٹر ہیں اور جدید لب و لہجہ میں اشاراتی اور علامتی نظمیں لکھتی ہیں اور خصوصیت سے نثری نظموں کی دلدادہ ہیں "تم بچی نہیں ہو" سے انھیں شہرت ملی اور جدیدیت کے مقلدین میں یہ نام جانا پہچانا محسوس ہونے لگا۔

یہ تمام شاعرات اپنے مترنم و منفرد لب و لہجہ اور جذبات کے بے حجابانہ اظہار کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی لیکن ان کے علاوہ وہ شاعرات جو نسوانی حسیات کو ادب و ثقافت کے پس منظر میں پیش کر رہی ہیں اور جن کے یہاں بدن دریدگی سے زیادہ لباس کی تراش خراش ملتی ہے، ان میں سب سے معتبر لیکن نیا نام یاسمین حمید کا ہے۔ جن کے یہاں ساز و آواز کی ہم آہنگی ہے، موسیقی اور شعریت کا امتزاج ہے، صناعی اور فنکارانہ چابکدستی ہے۔ دراصل ان کی مقبولیت کا اصل سبب ان کی شاعری کا بازبانِ حرف گفتنی نہ ہونا ہی ہے۔ ان کا مجموعہ "پسِ آئینہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام پیشِ خدمت ہے

صدا بلند ہے اتنی کہ کان پھٹتے ہیں
ہے اذن ایسا کہ گونگا بھی بولتا چاہے

ہم نے کسی کو عہدِ وفا سے رہا کیا
اپنی رگوں سے جیسے لہو کو جُدا کیا

کھو گیا کثرتِ گویائی کے ہنگامے میں
ایک جو حرف تھا گفتار میں دانائی کا

اشعر علیگ

۵/۸ بادشاہ نگر کالونی لکھنؤ

غزل

حادثے آنکھوں پہ ہیں گزرے بہت
بِک رہے تھے آدمی سستے بہت

مات دے دے کون کس رُخ سے، کسے
ہر کوئی رکھتا ہے اب چہرے بہت

اجنبی ہے شہر اچھا ہی ہوا!
کوئی مِل جاتا تو ہم روتے بہت

جانے والا آ گیا ہے لوٹ کر
خواب آنکھوں نے مری دیکھے بہت

اک نظر نے کر دیا بے دست و پا!
ہاتھ پاؤں ہم نے گو مارے بہت

عشرت ظفر
روزنامہ "انوار قوم"
۱۰۵/۱۵۴ نسیم آباد، کان پور

مناؤ جشن کہ چھبیس (۲۶) جنوری آئی

روش روش پہ محبّت کے دیپ جلتے ہیں
دلوں میں چاند ستاروں کے رنگ پلتے ہیں
خوشی کا لمحہ ہے سائے غموں کے ڈھلتے ہیں
دلوں میں نور نگاہوں میں روشنی آئی
مناؤ جشن کہ چھبیس (۲۶) جنوری آئی

بہار آئی یہ دن بھی ہمیں نصیب ہوا
خزاں نے کوچ کیا گلستاں قریب ہوا
چمن میں چاروں طرف جشنِ عندلیب ہوا
نئے لباس میں ہر سمت زندگی آئی
مناؤ جشن کہ چھبیس جنوری آئی

ہمارا فرض ہے ہم اپنے گلستاں کو سجائیں
گلی گلی میں محبت کے دیپکوں کو جلائیں
بڑے خلوص سے جمہوریت کا جشن منائیں
تھا انتظار ہمیں جس کا وہ گھڑی آئی
مناؤ جشن کہ چھبیس (۲۶) جنوری آئی

مشتاق کھیم پوری
مہاراج نگر
کھیم پور کھیری

یومِ جمہور

جس کی آمد پہ ہر شخص مسرور ہے
جس کے جادو سے ہر ایک مسحور ہے
جس نے بخشا ہمیں ایک دستور ہے
یوم جمہور ہے یوم جمہور ہے

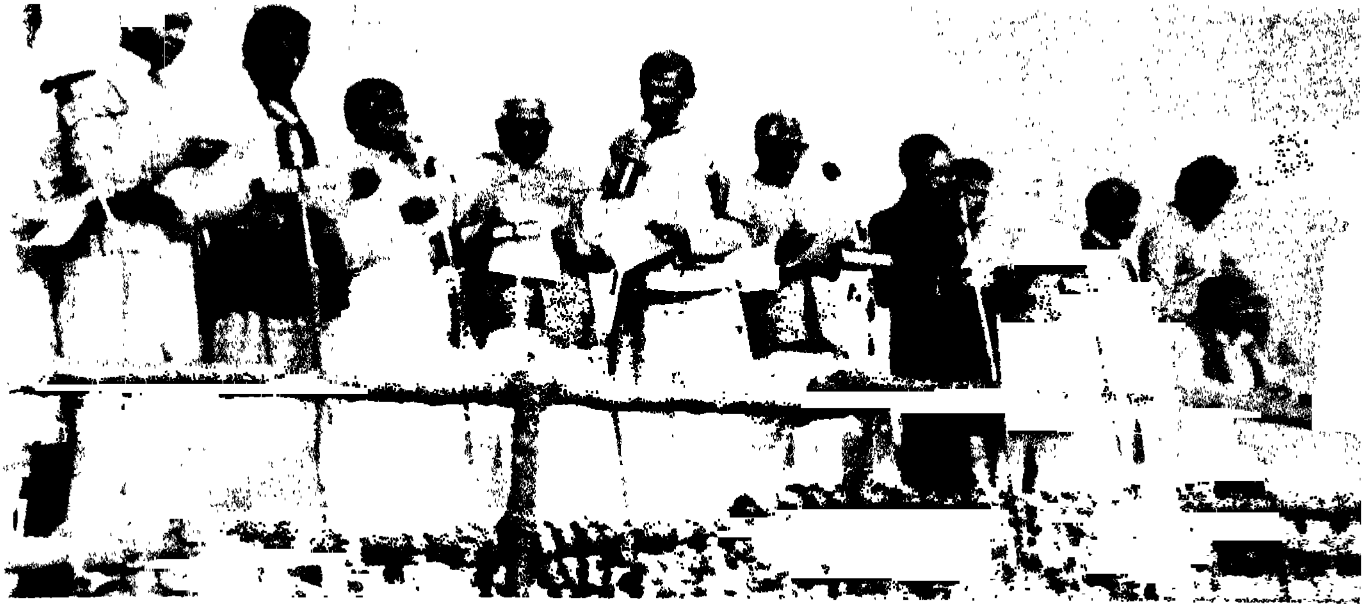
جس نے دی ہے غلامی سے ہم کو نجات
جس نے بخشی ہے آزادیوں کو حیات
جس کے چرچے لبوں پر ہیں دن اور رات
یوم جمہور ہے یوم جمہور ہے

فرق جس سے مٹا دھرم اور ذات کا
جو پیامی بنا اچھے حالات کا
درس جس نے دیا ہے مساوات کا
یوم جمہور ہے یوم جمہور ہے

دل اُمیدوں کی خوشیوں سے مہکائے ہیں
خواب جس نے بہاروں کے دکھلائے ہیں
جام جس نے مسرّت کے چھلکائے ہیں
یوم جمہور ہے یوم جمہور ہے







گورنر اترپردیش شری محمد عثمان عارف نے ۵ر دسمبر کو اترپردیش کی نئی حکومت کے وزراء کو بھی ان کے عہدے کا حلف دلایا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے جس میں نئی کابینہ کے اراکین حلف لیتے ہوئے نظر آرہے ہیں

وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو ۵ر دسمبر کو لکھنؤ میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ شری متر سین کی عیادت کرتے ہوئے









وزیر چھوٹی صنعت شری ریوتی رمن سنگھ ۱۱ دسمبر کو کھادی گرام ادیوگ بورڈ (لکھنؤ) میں تیل گھانی صنعت کا معائنہ کرتے ہوئے

وزیر صحت شری مختار انیس ۲۰ دسمبر کو محکمۂ صحت کے افسران کو خطاب کرتے ہوئے۔



زین الدین حیدر
مولانا محمد علی میموریل اسکول
بیکن گنج ۔ کانپور

زینت محل

اس مختصر ڈرامہ میں آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ ظفر کی رنگون کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سزا دے کر رنگون بھیج دیا تھا، جہاں انھوں نے زندگی کے آخری ایام گزارے اور وہیں انتقال کیا۔

(ز۔ ح)

کردار

۱. بہادر شاہ ظفر
۲. مرزا جواں بخت : بہادر شاہ ظفر کے فرزند ارجمند
۳. سائیں سبیل شاہ : ایک بزرگ جو بادشاہ سے ملنے آئے ہیں
۴. میجر : ایک انگریز افسر جو بادشاہ پر نگراں مقرر ہے
۵. ملکہ زینت محل
۶. شاہ زمانی : مرزا جواں بخت کی بیگم
۷. ملازم

(پردہ اٹھتا ہے۔ بادشاہ اور سائیں سبیل شاہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ بادشاہ سلامت اپنی ایک غزل شاہ صاحب کو سنا رہے ہیں۔)

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
بلبل کو باغباں سے نہ صیّاد سے گلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں
عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ملازم : ظلِّ الٰہی زندہ باد۔ ظلِّ الٰہی زندہ باد۔ میجر صاحب بہادر تشریف لائے ہیں۔

شاہ صاحب : لاحول ولاقوۃ۔ اس مردود کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ خیر! حضورِ والا اس سے بات کریں۔ میں ذرا اپنی بچی شاہ زمانی کو دیکھ لوں۔

(شاہ صاحب اُٹھ کر جاتے ہیں)

بادشاہ : (ملازم سے) آنے دو۔

(میجر ایک اور انگریز افسر کے ساتھ داخل ہوتا ہے دونوں سیلوٹ کرتے ہیں۔ بادشاہ انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں اور وہ بیٹھ جاتے ہیں)۔

میجر : بادشاہ کا مزاج کیسا ہے؟

بادشاہ : اللہ کا شکر ہے۔

میجر صاحب وہ ہماری درخواست کا کیا ہوا؟ جواں بخت کہہ رہے تھے ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔

میجر: بادشاہ!

بات یہ ہے کہ مکان تو یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوسرا مکان کیسا یہاں آئے گا۔ سب لوگ ایسا ہی مکان میں رہتا ہے۔ اب وہ بات آپ کا یہاں کیسا ہوگا..... وہ دلّی تھا..... لال قلعہ تھا.... آپ بادشاہ تھا۔ آپ کا حکومت تھا، وہ.....

بادشاہ: (بات کاٹتے ہوئے) یہ لال قلعہ۔ لال قلعہ آپ لوگ کیا کرتے ہیں۔ اس درخواست میں لال قلعہ کا ذکر کہاں تھا۔ اس میں تو صرف یہ تھا کہ تھوڑی مرمّت کرادی جائے۔ برسات میں پچاس جگہ سے ٹپکتا ہے۔ بیٹھنے تک کی جگہ نہیں رہتی۔ آخر کسی چیز کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

میجر: بادشاہ!

ہم اس میں کیا کرسکتا ہے۔ ہم بالکل مجبور ہے۔ یہاں اس سے اچھا مکان تو ملے گا نہیں۔

(ملکہ زینت محل داخل ہوتی ہیں۔ دونوں افسر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ملکہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے)

ملکہ: میجر!

تم مجبور ہو، بالکل مجبور ہو۔ یہاں ایسے ہی مکانات ہوتے ہیں۔ میں نے تمھاری ساری باتیں سُنی ہیں.. سب دُرست ہیں —— لیکن تمھیں بات کرنے کا سلیقہ بھی ہے؟ بادشاہ سے بات کرنے کا یہی طریقہ ہے —؟ تم اپنی حیثیت بھول کر بات کرتے ہو۔ تم جس سے بات کررہے ہو وہ تیمور کی اولاد ہے —— وہ تیمور جو دُنیا کے عظیم فاتحین میں سے ہے

یہ بوڑھا جو تمھارے سامنے بیٹھا ہے اور جس سے بات کرتے وقت تم اپنی حیثیت بھول رہے ہو، یہ ان شہنشاہوں کی اولاد ہے جنھیں دُنیا ظہیرالدین محمد بابر، نصیرالدین محمد ہمایوں جلال الدین محمد اکبر، نورالدین محمد جہانگیر، شہاب الدین محمد شاہجہاں اور محی الدین اورنگ زیب کے نام سے جانتی ہے —— جن کا نام سُن کر بڑے بڑے جری اور بہادروں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ جنھوں نے ہندستان جیسے ملک پر تین سو سال تک اس آن بان سے حکومت کی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی —— تم اس سے اس طرح بات کر رہے تھے جیسے تم اس کے برابر کے یا اس سے کچھ بڑے ہو ——

تم یہ بھول رہے ہو کہ جوتا جوتا ہے ٹوپی ٹوپی ہے۔ جوتا ہزار اشرفیوں کا ہو تو بھی پیر میں ہی رہے گا اور ٹوپی تین کوڑی کی ہو پھر بھی سر پر رہے گی۔ تم تم ہو اور ہم ہم ہیں — آخر تم سمجھتے کیا ہو —؟

میجر: ملکۂ عالم!

ہم سمجھتے ہیں، یہ ہندستان کا بادشاہ تھے ——

ملکہ: تم یہ نہیں سمجھتے۔ تم اسے بے کس اور مجبور سمجھتے ہو۔ لیکن جس کو تم بے کس اور مجبور سمجھتے ہو اور اپنی حقیقت بھول کر گستاخانہ گفتگو کرتے ہو اس کے دربار میں حاضری دینے کے لیے — اس کو سلام کرنے کے لیے تمھارے بزرگ ہماری جوتیاں چاٹتے تھے ——

وہ بے حقیقت فرنگی، جن کی تم اولاد ہو، اس کے دربار میں صرف کھڑے ہونے کی جگہ پا کر اپنی گردنیں فخر سے اونچی کر لیتے تھے... جو بادشاہ کے درشن کر لینے کے بعد اپنے دوسرے ساتھیوں سے سینہ پُھلا کر یہ کہتے تھے کہ ہم باریاب ہوچکے ہیں — ہم نے بادشاہ کو دیکھا ہے —....

بادشاہ: (تیز آواز میں — بات کاٹتے ہوئے)

ملکہ ان باتوں سے کیا فائدہ —— (کھانسی کا دورہ پڑتا ہے)

میجر: ہم کیا کرسکتا ہے۔ ہمارا کیا قصوُر ہے۔ ہم لوگوں نے کیا کیا ہے؟

ملکہ: تم لوگوں نے کیا کیا ہے!

تم لوگوں نے ہم کو گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔

وطن سے بے وطن کر دیا ہے۔

حکومت سے بے حکومت کر دیا ہے۔

سلطنت سے بے سلطنت کر دیا ہے —— لیکن یہ سب

کب تک ؟

ں: مکہ عالم .....

ـہ : خاموش رہو ـــــ تم نہیں جانتے کہ اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ ذرا سوچو ـــ جب ہم اپنے وطن میں نہیں رہ سکے تو تم کیا ہمارے وطن میں رہ سکو گے۔

شاہ : ملکہ !

(کھانسی کا دَورہ پڑتا ہے۔ تنفّس کا زور بڑھ جاتا ہے)۔

ـہ : وہ ہندستان ہے !

اسے بھارت ماتا کہتے ہیں !

اور یہ ماں صرف انھیں کو اپنی گود میں جگہ دیتی ہے جو اسے ماں سمجھتے ہیں۔

جو اسے ماں جانتے ہیں۔

جو اسے ماں مانتے ہیں۔

ہم بھی تمھاری طرح سے بدیسی تھے لیکن ہم نے اسے ماں سمجھا

اسے ماں جانا۔

اسے ماں مانا۔

تب اس نے ہمیں اپنی آغوش میں جگہ دی۔

ہم نے اس کی اولاد کو سچے دل سے بھائی بنایا۔

انھیں بھائی سمجھا۔

انھیں بھائی جانا۔

انھیں بھائی مانا ـــ تب انھوں نے ہمیں گلے سے لگایا۔

ہم ان کے ہو گئے ـــــ وہ ہمارے ہو گئے

ہمارا ظرف تھا ـــــ ہم نے انھیں اپنایا۔

یہ ان کی شرافت تھی ـــ انھوں نے ہمیں گلے سے لگایا۔

یہ جو کچھ ہے صرف وقت کا ہیر پھیر ہے ـــ ہم اللہ سے ناامید نہیں۔ ہم ہوں یا نہ ہوں ـــــ لیکن ـــــ یہ کان کھول کر سن لو . . . .

شاہ : ملکہ !

(کھانسی کا دورہ پھر پڑتا ہے)

ملکہ : یہ کان کھول کر سُن لو ـــــ ہندستان جن کا ہے اس پر

وہی حکومت کریں گے ـــــ تم نہیں !

ہم ہم تھے۔ تم تم ہو

ہمارا ظرف تھا

ہماری بات تھی۔

تمھارا کوئی ظرف نہیں

تمھاری کوئی بات نہیں

نہ تم ہندستان کے ہو سکتے ہو ـــــ نہ ہندستان تمھارا ہو سکتا ہے

ہندستان وہاں کے ہندوؤں کا ہے

وہاں کے مسلمانوں کا ہے۔

ہندستان میں وہی ہندو مسلمان رہیں گے ـــــ اور وہی ہندو مسلمان

اس پر حکومت کریں گے ـــ تمھارا وجود ختم ہو جائے گا۔

(بادشاہ کو تنفّس کا زور بڑھ جاتا ہے۔ سینہ ہاتھوں سے ملتے ہیں ـــ دبلتے ہیں ـــ بے تا.بو ہو رہے ہیں)

ملکہ : تم کو بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔

تم اپنا منھ نوچو گے ـــــ اور ساری دُنیا تمھارے منھ پر تھوکے گی۔

(بادشاہ پر بڑے زور کی کھانسی کا دورہ پڑتا ہے وہ اپنے کو سنبھال نہیں پاتے ہیں)

[ملکہ اُٹھتے ہوئے چیختی ہیں]

جواں بخت !

(جواں بخت دوڑ کر آجاتے ہیں۔ ملکہ اور جواں بخت بادشاہ کو سنبھالتے ہیں ـــ شاہ صاحب بھی آجاتے ہیں ـــ شاہ زمانی بھی بھاگ کر آتی ہیں ـــ بادشاہ کی حالت غیر ہونے لگتی ہے ـــ دونوں انگریز افسر گردنیں جھکائے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں)

ملکہ : بادشاہ سلامت !

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

نغمۂ وطن

مھدی پرتاپگڑھی
معرفت ایگزیکیٹو انجینیر
اریگیشن ڈویژن
پرتاپ گڑھ

اے وطن، میرے وطن، میرے وطن

تیری گود میں ہمکتی ہیں ہزاروں ندّیاں!
جن کے باعث بن گئی دھرتی تری رشکِ جناں
تیرے پھولوں کے تصدّق، تیری کلیوں کے نثار
تیرے بازاروں کے صدقے، تیری گلیوں کے نثار
تیرے موسم رُوح پرور، ہیں ہوائیں جانفزا
تری صبحیں پُرمسرت، تیری شامیں کیف زا
تیرے کھیتوں میں ہمکتی، گنگناتی بالیاں
تیرے باغوں میں پھلوں سے لہلہاتی ڈالیاں
تیرے دریاؤں پہ منڈلاتی ہے بگلوں کی قطار
اک طرف اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی قازوں کی ڈار

یہ منادر، یہ مساجد اور گرودوارے ترے
ہیں رواداری کے شاہد سب کے سب یہ میکدے
جب فضا میں گونجتا ہے شورِ ناقوس و اذاں
قومی یک جہتی کا جذبہ دل میں ہوتا ہے جواں
تیری گنگا ہے کہ امرت کا چھلکتا جام ہے
یہ ہمالہ تجھ کو قدرت کا حسیں انعام ہے
دے گئے تاج و اجنتا تجھ کو تیرے حسن کار
یہ محبت اور فن کاری کے زندہ شاہکار
لال قلعہ سے عیاں ہے تیری سطوت کا نشاں
بھاکڑہ ننگل سے ظاہر تیری رفعت کا نشاں
اے وطن میں تیری مٹی میں ہوا پل کر جواں
ایک دن تیری نگہداری میں دوں گا اپنی جاں
تجھ پہ آنچ آئے گوارا ہو نہیں سکتا مجھے
کاٹ دوں وہ ہاتھ جو شر سے تری جانب اٹھے

اے وطن، میرے وطن، میرے وطن

ماسٹر عبدُ المنّان صدیقی
محلہ بنگلہ ۔ پرانا سیتاپور

نیا سال

کچھ عجب انداز کی ہیں ہر طرف نیرنگیاں
سالِ نو لایا ہے پیغام خوشی باعزّ و شاں

سالِ نو آیا مبارک ہو تمھیں اہلِ وطن
غنچۂ خاطر کھلے شاداب ہیں دل کے چمن

فرطِ عشرت سے ہیں شاداں کس قدر سب مرد و زن
ہو گئے ان کے دلوں کے دور سب رنج و محن

شادماں آتے نظر ہیں کس قدر پیر و جواں
راگ خوشیوں کے ہوئے ہر ایک کے وردِ زباں

اک نئے انداز کی چلنے لگی بادِ بہار
غنچہ غنچہ کھل گیا ہر پھول پر آیا نکھار

سرو اور شمشاد پر نغمہ سرا ہیں قُمریاں
منظرِ دلکش بنا ہے جن کے باعث گلستاں

کاش اے منّان سالِ نو سے ہوں سب باکمال
اتحادِ باہمی کا بھی رہے دل میں خیال

ہند کے بچّے بڑے ہو کر بلند اقبال ہوں
دولتِ عزّ و شرف سے بھی وہ مالا مال ہوں

طنز و مزاح

یوسف اقبال
۲۵/۲۳۔ کٹرہ گریبان
آگرہ

غالب کی تلاش

میں ایک لمبے عرصہ تک غالب کی تلاش میں اکبر آباد (آگرہ) کے گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر ان کا کہیں پتہ نشان نہیں ملا۔ غالب کو تلاش کرتے کرتے جب میں بہت تھک گیا تو غالب پورہ (آگرہ کے ایک محلے کا نام) کے ایک ٹوٹے ہوئے مکان کی دیوار کے سائے میں گھڑی بھر دم لینے کے لیے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ غالب کو کہاں تلاش کروں؟ اکبر آباد کا تو چپہ چپہ میں نے چھان مارا۔ خدا جانے غالب کہاں ملیں گے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک مرد ضعیف، پیر نحیف جس کی آنکھیں تجربات کے گرد و غبار سے دھند لاگئی تھیں، میرے قریب آیا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا۔

"برخوردار! کس پریشانی میں بیٹھے ہو اور کس سوچ میں ڈوبے ہو اپنی بپتا بیان کرو، شاید میں تمھارے کچھ کام آسکوں۔"

میں یہ آواز سن کر چونک پڑا، سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں بڑی کمزور اور دھیمی آواز میں بولا —

"میں تقریباً پچاس سال سے اس شہر میں غالب کو تلاش کر رہا ہوں لیکن ابھی تک کامیابی نصیب نہیں ہوئی"۔ وہ بوڑھا آدمی میری تھکن اور تگن دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ بڑی شفقت کے ساتھ اس نے اپنا لکڑی جیسا کھردرا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور کہنے لگا۔

"بھئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم غالب پورہ کے نام کی ترکیب سے غلط فہمی کا شکار ہو گئے، اسی لیے غالب کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اس بستی میں آگئے۔ غالب تو ڈیڑھ سو برس پہلے آگرہ چھوڑ کر دلی چلے گئے تھے۔ نواب الٰہی بخش معروف کوئی دلی کا رئیس تھا جو اپنی بیٹی امراؤ بیگم کا نکاح مرزا غالب کے ساتھ پڑھوا کر انھیں دلی لے گیا تھا۔ مرزا غالب دلی بیاہ کر گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ اگر تمھارے سر میں غالب سے ملنے کا خناس بھرا ہوا ہے تو دلی چلے جاؤ، وہاں پہنچ کر کسی سے بھی غالب کا ٹھیا ٹھکانہ معلوم کر لینا"۔

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

میں نے اس پیر جہاں دیدہ و سال خوردہ کی بات بڑے دھیان سے سُنی اور اس کا شکریہ ادا کر کے بذریعہ ٹرین دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ چار گھنٹے میں آگرہ سے نئی دہلی اسٹیشن جا پہنچا۔ اسٹیشن سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھا تھا کہ ایک فقیر نظر پڑا جو بازار کے ایک نکڑ پر کھڑا ہوا تان سینی لحن میں یہ شعر گا رہا تھا ؎

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

مجھے خیال آیا کہ جب مرزا غالب کی جوانی ابتدائی منزل میں تھی تو وہ اکبر آباد کے کلاں محل (جو اب کالا محل کہلاتا ہے) کی چھت پر کنکوے لڑایا کرتے تھے اور انہی دنوں جب انھیں شاعری کا شوق چرّایا تھا تو انھوں نے بطور تخلص اپنے نام کے آگے اسدؔ کا اضافہ فرمایا تھا۔ یہ فقیر چونکہ اسد اللہ خاں اسدؔ کا شعر الاپ رہا ہے ضرور غالب سے واقف ہوگا اور غالب کا ٹھکانہ جانتا ہوگا۔ یہ سوچتے سوچتے میں فقیر کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی شخصیت میں مجھے کچھ عجیب و غریب مقناطیسیت محسوس ہوئی۔ دراز قامت

گندمی رنگ، نشیلی بڑی بڑی آنکھیں۔ ایک میلی سی اچکن پہنے ہوئے، سر پر بالوں دار ایک اونچی ٹوپی، فرنچ کٹ داڑھی، داڑھی کے بال روئی کے گالے کی طرح سفید، چوڑی دار پاجامہ، پاؤں میں نری کا ناگرہ ...... فقیر کیا تھا مغلیہ دور کا کوئی بگڑا ہوا رئیس معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے بڑی عقیدت سے سلام کیا۔ اس نے کہا جیتے رہو۔

میں نے اس قلندر سے مصافحہ کے بعد عرض کیا: "شاہ صاحب! ابھی جو شعر آپ گا رہے تھے مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے وہ شعر دیوانِ غالب میں 'الف' کی ردیف میں پڑھا ہے۔ غالب ہمارے اکبرآباد کے کلاں محل کے رہنے والے تھے، ڈیڑھ سو برس پیشتر آگرہ سے رخصت ہو کر دلی اپنی سسرال میں آبسے تھے۔ آپ انھیں ضرور جانتے ہوں گے!"

یہ سن کر فقیر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں کچھ اور سرخ ہوگئیں۔ اس پر ایک جلالی کیفیت طاری ہوئی جو ایک لمحہ بعد جمالی رنگ میں تبدیل ہوگئی۔ درویش خدامست مسکرایا۔ زیرِ لب کچھ گنگنایا پھر بآوازِ بلند جھوم کر یہ شعر پڑھا ؎

گرچہ دلّی بخوبیٔ شہر است
اکبرآبادِ ما عجب شہر است

میں نے کہا: "شاہ جی! میں فارسی زبان نہیں سمجھتا ہوں بلکہ اب تو اُردو زبان یعنی ریختہ بھی سمجھنے میں مجھے دشواری پیش آتی ہے کیونکہ ہمارے ملک کی قومی زبان ہندی ہے۔ آپ ذرا اس شعر کا مطلب بیان کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

فقیر: "برخوردار! میں تمھیں کیا سمجھاؤں اور کس طرح بتاؤں، معاملہ کچھ ایسا ہے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

یہ شعر پڑھ کر فقیر نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس کھینچی۔ مجھے ایک کونے میں لے گیا اور بولا:

"برخوردار! تم اکبرآباد سے آئے ہو—؟ اکبرآباد .... جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ پلا، بڑھا اور جوان ہوا، جس کی خوش گوار ہواؤں میں میں نے کنکوے اڑائے، عشق کی پینگیں بڑھائیں۔ گنجفہ، شطرنج اور چوپڑ کی بازیاں بچھائیں، کلاں محل کی چھتوں پر دھماچوکڑیاں مچائیں، یہاں تک کہ پاس پڑوس کا ہماری شرارتوں سے ناک میں دم آگیا تھا۔ ہائے اکبرآباد اور اکبرآباد کی رنگا رنگ بزم آرائیاں ... اب وہ سب کی سب نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں۔ صاحبزادے! میں ہی اسداللہ خاں غالب ہوں، تم نے جو اکبرآباد کا ذکر کیا .... تو اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن کا ابتدائی زمانہ یاد آگیا ....

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

میں نے جب اچھی طرح یقین کر لیا کہ یہی فقیر غالب خستہ حال ہے تو میں نے بڑے ادب و نیاز کے ساتھ مرزا غالب کی قدم بوسی کی اور تعجب سے پوچھا

"آپ نے یہ فقیرانہ اور قلندرانہ بہروپ کب سے دھار لیا۔ آپ کو اکبرآباد والوں نے نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی امراؤ بیگم کے ساتھ بیاہ کر دلی رخصت کر دیا تھا کہ آپ آرام سے رہیں گے، شعر و شاعری کر کے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھریں گے۔ آپ نے یہ کیا حالت بنائی۔ اور آپ کے ذہنِ رسا میں یہ کیا دیوانگی سمائی۔؟"

غالب: "جو کچھ تم نے کہا سب درست ہے۔ میں اپنی سسرال ہی کی حویلی میں رہتا ہوں ... لیکن کبھی کبھی ؎

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مَیں: "استادِ محترم! اس جگہ زیادہ دیر تک بیٹھ کر بات چیت کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا ہے۔ چلیے کسی پارک میں چل کر اطمینان سے بیٹھیں گے، مجھے آپ سے تفصیلی انٹرویو بھی لینا ہے جو اخبارات میں چھپوانا ہے۔"

یہ سُن کر غالب کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے۔ بڑے اداس ہو کر بولے ؎

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ب : "اگر ایسی بات ہے اور باغ میں جاکر آپ کی طبیعت زیادہ
پریشان ہوجاتی ہے۔ ہاں مجھے یاد آیا، آپ نے اپنے مرضِ
خفقان کا بھی پہلے کہیں ذکر کیا تھا اور اس عارضہ کا اثر اس
طرح بیان کیا تھا کہ

سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

تو پھر چلیں کسی اچھے بار میں ... وہاں ایک دو پیک وہسکی
یا برانڈی کے ہوجائیں۔ اس طرح موڈ بھی بنے گا اور میں آپ
سے انٹرویو پُرکیف ماحول میں لے سکوں گا۔"
یہ سُن کر غالب کی آنکھوں میں مسرّت کی چمک پیدا ہوئی ... مگر وہ جلد
سنجیدہ ہوگئے اور کہنے لگے۔ "کبھی جب سے کھانے پینے کی
ں میں ملاوٹ ہونے لگی ہے، میں نے شراب نوشی بہت کم کردی
بہ تریب قریب چھوڑ دی ہے۔"

ے : "حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کا مسلک و مشرب
کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے، آپ تو بڑے اعتماد کے
ساتھ کہا کرتے تھے ؎

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

ب : میاں۔ میں تمھیں کس طرح سمجھاؤں کہ میں نے مغلوں کے دور
حکومت میں، پھر اس کے بعد انگریزوں کے راج میں بڑی
عمدہ اور اعلیٰ قسم کی مصفّا شرابیں پی ہیں ... آج کل شراب
میں بہت ملاوٹ پائی جاتی ہے ... ملاوٹ کے خوف سے
میرا تو اب یہ عالم ہے کہ

غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

برخوردار بلکہ شاگردِ سعادت اطوار۔ یہ جو فی زمانہ ملک میں
جگہ جگہ شراب کی دکانیں اور بھٹیاں کھُل گئی ہیں، مجھے بالکل
ناپسند ہے، بلکہ انھیں دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے، کیونکہ
نئی نسلوں کے اخلاق، کیریکٹر اور صحت پر اس کا بہت بُرا
اثر پڑے گا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے نئی نسل کو نشیات
کے استعمال سے باز رکھنے کے لئے اس طرح متنبہ کیا تھا:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

میرے : "گستاخی معاف ہو تو کچھ عرض کروں؟"
غالب : کہو بیٹا۔ جو کچھ کہنا ہے، کھل کر کہو، میں بالکل بُرا نہیں مانوں گا۔"
میرے : "لوگ آپ کے بارے میں ایسا کہتے پھرتے ہیں ؎

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

یہ سُن کر وہ رندِ میخانۂ ازل مسکرا دیا۔
میرے : "قبلہ آج مطلع ابر آلود ہے، پینے کے لیے دن بڑا مسعود ہے
موسم بھی دعوت نائے و نوش دے رہا ہے۔ میں وہسکی کا ایک ادّھا
لے کر ابھی حاضر ہوا۔ یہیں کسی کونے میں بیٹھ کر تھوڑا بہت
شغل کرلیں گے۔"
غالب : اچھا میاں۔ صلاح تو تمھاری مناسب ہے ؎

جب میکدہ چھُٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

تو ایسا کرو، میرا پانی پینے کا جو کوزہ ہے اسی میں وہسکی کا ایک ادّھا
بھروا لاؤ، دونوں آدھی آدھی کرلیں گے۔
میرے : "پیرِ خرابات! اگر گر کر ٹوٹ گیا تو؟"
غالب : "کوئی بات نہیں ..... ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

ایک سعادت مند شاگرد کی طرح میں نے استاد کی دلجوئی کی خاطر
کوزہ لے لیا اور شراب کی ایک دکان پر جاکر نصف بوتل شراب کوزہ میں بھروالایا
غالب نے اس میں سے آدھی پی کر، کوزہ میری طرف بڑھا دیا۔
میرے : "اُستاد! تھوڑی اور۔"
غالب : نہیں ..... اک تو ملاوٹ کے نقصان کا اندیشہ دامن گیر ہے،

ہے۔ دوسرے اب اس مقدار میں نہیں جھیل سکتا، جتنی عالمِ شباب
میں پیتا تھا، اور ڈنکے کی چوٹ پر ساقی سے جا کر کہتا تھا ے

پیوں میں شوق سے گر تم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

غالب نے اپنے کوزہ میں جو شراب بچا کر مجھے دی، میں نے اُسے تبرک سمجھ کر ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتار لیا۔ اور اس عارف ذات سے یوں انٹرویو لینا شروع کیا:

میں: قبلہ، تو بتائیے کہ آپ نے اپنا تخلص غالب کیوں رکھا، کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

غالب: چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

میں: آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی، کون کون سے مکتب اور دار العلوم میں پڑھے، اور آپ کے اساتذہ کون کون تھے؟

غالب: فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اس زمانہ سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

مکتب اور اساتذہ کے بارے میں یوں سمجھ لیجئے ے

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

اور انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے .... میرا بھی یہی حال ہے

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

میں: آپ اکبر آباد کی سکونت ترک کر کے دلی میں کیوں رہ پڑے ... کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

غالب: وجہ تو کوئی خاص نہیں۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

میں: میر اکبر آبادی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کی نگاہ میں شاعری میں ان کا کیا مقام ہے؟

غالب: غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

میں: سنا ہے جنت کے بارے میں آپ عامۃ المسلمین اور مذہب اسلام سے جداگانہ کوئی خاص نظریہ رکھتے ہیں؟

غالب: ایسے سوالات نہ کرو۔ تم اخبارات میں انٹرویو شائع کراؤ گے ... موجودہ دور کے مولوی مُلّا میرے خلاف ہو جائیں گے اور میرا یہاں رہنا دشوار ہو جائے گا۔

میں: قبلہ آپ کے بارے میں تو یہ مشہور ہے کہ آپ بڑے بیباک، انقلابی اور ترقی پسند شاعر ہیں۔ پھر آپ جنت کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہوئے کیوں جھجک رہے ہیں، پہلے بھی آپ ایک دو بار جیل جا چکے ہیں ...... ایک بار اور سہی۔

غالب: خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

میں: تو پھر ارشاد فرمائیے نا جنت کے بارے میں۔

غالب: کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت
یہی نقشہ ہے مگر اس قدر آباد نہیں

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا ہوا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

میں : کچھ دوزخ کے بارے میں ارشاد فرمائیے۔

غالب :۔ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

طاعت میں تا رہے نہ مئے انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

میں : یہ سننے میں آیا ہے کہ آپ کے مذہبی عقائد اور خیالات بھی عام مسلمانوں سے مختلف ہیں۔ نہ آپ شیعہ ہیں، نہ سُنّی، نہ بریلوی نہ دیوبندی، نہ کتابی، نہ وہابی۔ کیا آپ کا کوئی منفرد مذہب و مسلک ہے؟

غالب : ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

میں : قبلۂ عالم! کچھ نیشنل انٹی گریشن (National Integration) کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں آجکل یہ موضوع ہمارے ملک میں بڑا پاپولر ہے۔

غالب :۔ برخوردار میں فرنگیوں کی زبان سے بالکل ناواقف ہوں، اُردو میں بولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟

میں : اُف فوہ ... معاف فرمائیں ۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ آپ اتنے مشہور اور عظیم شاعر ہو کر، انگریزی جیسی بین اقوامی زبان سے ناواقف ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہاں تو حضرت یہ فرمائیں کہ قومی یک جہتی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

غالب : قومی یک جہتی کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ اس کے بانی اور سب سے بڑے علمبردار میرے بچپن کے استاد نظیر اکبرآبادی تھے جنھوں نے اپنی بیشتر عوامی نظموں میں قومی یک جہتی کے احول، میلوں اور تیوہاروں کے مناظر کی بڑے دل کش اور سادہ الفاظ میں تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی محمد معظم اور عبدالصمد ایرانی بھی میرے خصوصی معلموں میں رہے ہیں۔ میرے تمام عقائد، تصورات اور خیالات انھیں حضرات کے فیضِ تربیت و تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ آجکل لوگوں نے ان مسائل کو کچھ عجیب نزاعی شکل دے دی ہے اور سیاسی استعمال کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ میرے نظریات تو یہ ہیں ؎

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

زنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

میں : اچھا۔ میں نے آپ کا بڑا قیمتی وقت برباد کیا، اس کے لیے آپ سے معافی مانگنے سے پہلے ایک آخری سوال اور کرتا ہوں جو میرے ذہن میں کئی برس سے کلبلا رہا ہے وہ یہ کہ بعض لوگوں کا دعوا ہے کہ آپ ترقی پسند شاعر ہیں، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

غالب : بھئی ہمارے زمانے میں بھی یہی مسائل تھے جو آج ہیں۔ فرق صرف اصطلاحوں کا ہے۔ امیری، غریبی کے فرق کو دیکھ کر میرا دل بھی بُری طرح کُڑھتا تھا جس کو کم کرنے یا ختم کرنے کے لیے موجودہ دَور کے دانش ور کوشاں ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک مکتوب میں کچھ اس طرح لکھا ہے:

"اگر میرا بس چلے تو کم از کم دلّی، اس کے قرب و جوار اور گرد و نواح تک کسی کو بھی بھوکا ننگا نہ رہنے دوں گا" اسی قبیل کے شعر ہیں:

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

میں: استاد! ذرا یہ تو بتایئے کہ آپ نے مذکورہ تینوں اشعار میں فرہاد، بُت شکنی، سنگِ گراں، کوہکن اور پیرزن سے کیا معانی مُراد لیے ہیں۔

غالب: عجیب ناسمجھ آدمی ہو.... اتنا نہیں سمجھتے کہ فرہاد سے مراد "محنت کش لوگ" ہیں۔ بُت شکنی کا مفہوم ہے "دیرینہ اور فرسودہ رسم و رواج کی بیخ کنی"۔ سنگِ گراں ہیں" ماضی کی وہ روایات جو ہٹائے نہیں ہٹتیں اور مٹائے نہیں مٹتیں"۔ کوہکن "پرولتاری" اور پیرزن کا استعارہ سامراجیت اور سرمایہ داری کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مزید براں آپ لوگ جو آجکل اپنی تنخواہوں میں اضافہ کے لیے اور مہنگائی بھتہ بڑھوانے کے لیے ہڑتالیں اور احتجاج کرتے رہتے ہیں، اس زمانہ میں ہڑتال یا بھوک ہڑتال کا تو کوئی تصور نہ تھا، البتہ تمام سرکاری اور درباری ملازمین اور مزدوروں کی نمائندگی کرتے ہوئے تنخواہوں اور اُجرتوں میں اضافہ کے لیے میں نے ایک منظوم عرضداشت بادشاہ وقت کے سامنے پیش کی تھی، جو اس طرح ہے ؎

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار
کچھ خریدا نہیں ہے ابکی سال
کچھ بنایا نہیں ہے ابکی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

اس کے علاوہ اُردو شعر و ادب کے کارواں کا رُخ زندگی کی فطری راہوں، صحت مند رُجحانات، اصلاحِ ملک و قوم برائے عوام و برائے حیات اور ترقی پسندی کی طرف ابتداءً موڑنے والا آپ کو معلوم ہے کون ہے؟ میرا شاگردِ رشید حالی پانی پتی اور دوسرا شاگرد سر سید بانی علی گڑھ یونیورسٹی۔ ان دونوں شخصیتوں کے ذہن و فکر کی روشنی و رہنمائی میں جدید ادب و شعر کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اب آپ خود ہی انصاف سے کہیں کہ شعر و ادب کے نئے دھارے کس کے ذہن و فکر کے سرچشمہ سے اوّل اوّل پھوٹے ہیں اور یہ اعزاز صحیح معنوں میں کسے ملنا چاہیے؟"

میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر زور سے نعرہ لگایا ــــ

"غالب زندہ باد! ــــ زندہ باد مرزا اسد اللہ خاں غالب!"

میرا یہ نعرہ سن کر اس قلندر کے چہرہ پر خوشی کی موج رقص کرنے لگی اور وہ با آوازِ بلند یہ شعر گانے لگا ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

زینت محل
۲۷ کا بقیہ

شاہ زمانی: بابا حضور!

شاہ صاحب: ظلِّ سبحانی!

جواں بخت: ظلِّ الٰہی!

(سب بادشاہ کو سنبھالتے اور پکارتے ہیں لیکن بادشاہ نڈھال ہو جاتے ہیں)

(پردہ گرنے لگتا ہے اور پس منظر سے یہ غزل گانے کی آواز آتی ہے:)

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے
ترے پہ دامنِ صحرا نے پردہ پوشی کی
برہنہ آئے تھے لپٹے ہوئے کفن سے چلے

غزلیں

شاہد میر
گورنمنٹ کالج - بانسوارہ
راجستھان

برسرِ محفل کسی کا تذکرہ روشن ہوا
جگمگا اٹھیں ردیفیں قافیہ روشن ہوا

شام آئی اور دل میں اک دیا روشن ہوا
بھولی بسری ساعتوں کا سلسلہ روشن ہوا

یہ سفر نکلا روایاتِ گزشتہ کی مثال
قافلے گم ہو گئے جب نقشِ پا روشن ہوا

وہ مکمل جسم تھا اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جس کو چھونے سے مرے دل کا خلا روشن ہوا

تیرہ و تاریک رستے ضو فشاں سے ہو گئے
پاؤں میں جس وقت اپنے آبلہ روشن ہوا

چاند تارے سے نظر آنے لگے ذرات میں
پتھروں کا لمس پا کر آئینہ روشن ہوا

سُرخ رُو ہونے لگے شاہد دسمبر کے گلاب
برف رت آئی لہو کا ذائقہ روشن ہوا

صلاح الدین نیّر
۴-۶-۲۰ - ۳۴۴ - بازار روپ لال
حیدر آباد

صدیوں کا یہ جھگڑا ہے آپس میں ملا دیجے
بارش کا ہواؤں سے سمجھوتہ کرا دیجے

پھر آپ کی چوکھٹ پر اک پل بھی نہ ٹھہروں گا
مجھ کو مرے ماضی سے اک بار ملا دیجے

خود غور سے پڑھ لیجے احباب کے چہروں کو
دشمن کی طرح ہوں تو رستے سے ہٹا دیجے

میں دخل نہیں دوں گا جب آپ کی مرضی ہے
دل ٹوٹ گیا ہے تو آئینہ بنا دیجے

سمجھوتہ کی منزل ہے ملنے سے تامل کیوں
دل صاف اگر ہے تو پھر ہاتھ بڑھا دیجے

بدلے ہوئے موسم کا ہم کو بھی ہو اندازہ
روٹھی ہوئی کلیوں کو شبنم سے ملا دیجے

تہذیبِ نظر مجھ کو ورثے میں ملی نیّر
گستاخ نظر ہوں تو محفل سے اٹھا دیجے

سید احتشام حسین ٹانڈوی
میران پورہ، ٹانڈہ، فیض آباد

ہر پل کا شاعر
ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی کی شاعری انسانی زندگی کے ہر پل پر محیط ہے ان کی شاعری بظاہر دو حصوں میں منقسم ہے غیر فلمی اور فلمی ۔۔ شاید کچھ لوگ محسوس کریں کہ میں نے ادبی کی جگہ لفظ غیر فلمی استعمال کیا ہے تو میرا واضح جواب یہ ہے کہ میں ساحر کی فلمی شاعری کو بھی ادب کا ایک حصہ مانتا ہوں ۔ غیر فلمی شاعری کے ذریعہ اگر کسی مکتبۂ فکر، کسی طبقہ خیال کی زندگی کی عکاسی، ان کے جذبات وکیفیات وتاثرات کی ترجمانی میں کوئی کسر رہ بھی گئی تھی تو وہ کمی ان کی فلمی شاعری نے پوری کر دی ہے ۔ کیونکہ ساحر نے مختلف موضوعات پر بے شمار فلموں میں گیت، غزلیں نظمیں لکھی ہیں اور ہر طرح کے کرداروں کے مختلف النوع پس منظر کے تناظر میں مکمل اور کامیاب ترین ترجمانی کی ہے ۔ غم جاناں کے ساتھ غم زمانہ، آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی داخلی وخارجی کیفیات وتاثرات ۔ سماجی اور سیاسی مسائل پر اپنی گرفت ہمیشہ قائم رکھی ہے اور اپنے مخصوص لب ولہجہ اور منفرد والہانہ انداز میں ان کو اس طرح اپنے اشعار میں سمویا ہے کہ آمد ہی آمد محسوس ہوتی ہے آورد کا کہیں شائبہ بھی نظر نہیں آتا ۔ ساحر کے یہاں یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ادب کے تئیں ان کا نظریہ ہر حال اور ہر عالم میں مثبت اور تعمیری رہا ہے ۔ بجا طور پر فخر کے ساتھ کہا جا سکتا ہے "ہر جذبہ تعمیر لئے ہے" ہمیشہ تخریب استحصال اور جسارت بیجا کی کڑے تیوروں کے ساتھ سخت الفاظ میں مذمت کی ہے ۔ میں آپ کی پہلی ملاقات ساحر سے اس پل میں کرانا چاہتا ہوں جب وہ اپنے ماحول اور اپنے آبا واجداد پر نگاہ ڈالتا ہے اور یہ پل ایسا نازک پل ہوتا ہے جس کے ساتھ بڑے بڑے معلم اخلاق بھی انصاف نہیں کر پاتے ۔

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے دل پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

☆☆☆

ہائے وہ گرم دل آویز ابلتے سینے
جن سے ہم سطوت آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

☆☆☆

یہ لہکتے ہوئے پودے یہ دہکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں سب میرے ہیں سب میرے ہیں

☆☆☆

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے

غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

یہ ہے اپنی نظم "جاگیر" کے آئینہ میں جبر و استحصال کا مخالف ساحر جس نے اپنے آبا و اجداد کے استحصال کو بھی نہیں بخشا اور نہ صرف استحصالِ زمین و زر بلکہ استحصالِ عصمت کو بھی بے جھجک بڑے سلیقے سے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ سبز کھیتوں میں دبکی ہوئی دوشیزاؤں کے ساتھ یہ کہنا کہ ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے جاگیردارانہ عیاشیوں کی پوری تاریخ چند الفاظ میں بیان کر دی ہے مزید برآں جاگیردارانہ ہیبت کا فسوں اس طرح طاری ہے کہ کسی میں جرأت لب کشائی نہیں، کہہ کر جاگیردارانہ نظام کی تصویر بالکل مکمل کر دی۔ گرم و دل آویز دہکتے سینے سے سطوت آبا کا صلہ لینا اتنے سنگین موضوع کو اتنے شاعرانہ ڈھنگ سے کہہ کر طنز کرنا ساحر ہی کا حصہ ہے پھر نہایت بدوضع ایاغ میں حسن و شباب کی شراب جیسی بات، یہ دہقاں ان مرمریں جسموں کو ان تاریک گھروندوں میں کیسے جنم دیتے ہیں، نظم میں غزل کہنے کے مترادف ہے۔ سلطان ابن سلطان ہونے کا دعویٰ جاگیر کی ہر شئے کو اپنی ملکیت سمجھنا تو خیر عام جاگیردارانہ ذہنیت ہے لیکن ایک ہی مصرعے میں یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان کہہ کر ساحر نے یہ تاثر دینے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ جاگیردار اپنے مزارعہ (انسانوں) کو بھی جانور سمجھتے تھے اس نظم کا خاص حصہ یہ بند ہے جس میں ساحر سلطان ابن سلطان کی روایت سے بغاوت کرکے اپنا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔ میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک اجنبی قوم کی سرپرستی میں نہ صرف رہنا قبول کیا بلکہ ہر کڑے وقت میں (ظاہر ہے کڑا وقت ان کے لئے وہی ہو سکتا ہے جب سرفروشانِ وطن نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہو) غیر ملکی سرکار کی خدمت کی ہے۔ معاملہ چونکہ ان کے اپنے اجداد کا تھا۔ اسی لئے یہ تقاضائے تہذیب بالواسطہ انھیں غدّارِ وطن یا ننگِ وطن نہ کہہ کر اس ساعت کو جب ان سے یہ حرکتِ مذمومہ سرزد ہوئی ساعتِ ناپاک کہہ کر گویا اس فعل کو مذموم قرار دے دیا ساتھ ہی جاگیردارانہ نظام میں جکڑے زمین پر رینگتے ڈھانچوں کی بے بسی اور بے حسی کی تصویر کھینچ کر اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

آئیے! ساحر سے اُس پل میں ملا جائے، جب عظیم مقاصد اور انسان کی ناپائیداری اور نہایت مختصر زندگی اس کے پیشِ نظر ہے، اور وہ نظم "پل دو پل کا شاعر" میں کہہ رہا ہے۔ ؎

پل دو پل میں کچھ کہہ پایا اتنی ہی سعادت کافی ہے
پل دو پل تم نے مجھ کو سنا اتنی ہی عنایت کافی ہے

اس مہلتِ یک نفس میں جتنا بھی کہہ پایا یہ سعادت بھی میرے لئے کم نہیں ہے اور آپ نے پل دو پل بھی میری بات توجہ سے سن لی آپکی اتنی ہی عنایت میرے لئے بہت ہے ؎

کل اور آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے

تقریباً ہر شاعر نے اپنے آپ کو شعری ادب کا آخری امام سمجھا ہے کچھ نے کھل کر کہہ دیا ہے، بقیہ حضرات نے اشاروں کنایوں سے یہ تاثر دیا ہے لیکن اس ضمن میں حقیقت پسند ساحر نے بڑی فراخ دلی سے زمانے کی ترقی پذیری کو پیشِ نظر رکھ کر نیک تمناؤں کے ساتھ کہا ہے۔ ہمارے اور تمہارے نہ رہنے سے حیات جاری و ساری میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں بلکہ گمان غالب ہے کہ مجھ سے بہتر کہنے والے اور تم سے بہتر سننے والے آئیں گے۔ ؎

کل کوئی مجھ کو یاد کرے کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لئے کیوں وقت اپنا برباد کرے

دیکھا آپ نے مقصدیت کے دیوانے ساحر کو مصروف عمل زمانے کے لئے اپنی یاد آوری تعریف و توصیف کو بھی تضیع اوقات قرار دیتا ہے۔

آئیے! اب ذرا پیچھے لوٹ کر ساحر سے اُس خوبصورت اور نوجوان پل میں ملاقات کریں جب وہ دنیا کی خوبصورت ترین اور سیاحوں کی جنت نگاہ مشہور زمانہ عمارت تاج محل کے سائے میں اپنی محبوب سے ملتا ہے۔ فطری طور پر محبوب کے عنبریں گیسوؤں کی چھاؤں میں عشاق دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور شوقِ بیتاب جذبات میں ایسی ہلچل مچا دیتا ہے کہ وہ وہ باتیں بھی بھول جاتے ہیں جو ملاقات سے

قبل محبوب سے کہنے کے لئے ترتیب دئے ہوتے ہیں۔ شدتِ جذبات سے مغلوب لہجے میں لرزتے ہونٹوں سے اگر کچھ کہتے ہیں تو محبوب کے تعریفی اور توصیفی الفاظ، عمر بھر وفا کی قسمیں کھاتے ہیں، ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے وعدے کرتے ہیں لیکن حد سے زیادہ حساس شاعر ساحرؔ کو تاج محل کی مرمریں دیواروں سے خون مزدور کی بو آتی ہے اور مشہور زمانہ نظم "تاج محل" تخلیق کرتا ہے ساحرؔ اپنے محبوب کو حدیثِ دل سنانے کے بجائے جذبات سے مغلوب ہوکر یوں مخاطب کرتا ہے۔ ؎

تاج تیرے لئے اک مظہرِ اُلفت ہی سہی
تجھکو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی کہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

عام طور پر لوگ تاج کو شاہ جہاں کے ممتاز محل سے بے پناہ عشق کی یادگار سمجھ کر اس سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے "تاج" کے لئے یہی جذبہ ساحرؔ کی محبوب کا بھی ہوگا۔

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اُس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

ساحرؔ کا احساس شاہِ جہاں اور ممتاز محل کا خیال آتے ہی تاج محل کو بزم شاہی میں تبدیل کر دیتا ہے لہٰذا جمہور کے شیدائی کی روح چیخ پڑتی ہے "میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے"۔ بزمِ شاہی میں غریبوں کا وجود کیا معنی رکھتا ہے۔ چونکہ سطوتِ شاہی کے تصوّر کے ساتھ ہی جبر واستحصال، جلال وجبروت کا تصوّر لازمی ہے۔ لہٰذا ساحرؔ کا یہ کہہ اٹھنا بھی لازمی تھا کہ جن راہوں پر سطوتِ شاہی کے نشاں ثبت ہوں، اُن پر الفت بھری روحوں کا سفر تو کیا قدم رکھنا بھی ممنوع ہے۔ ؎

میری محبوب پسِ پردہ تشہیرِ وفا
تونے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

اختیار واقتدار کی نمائش، عشق کی سادگی اور اس کے خلوص کی سطوتِ شاہی کی نشان اس شاندار عمارت کو جو اس کی مردہ محبوب کی آخری آرام گاہ، جو صرف شاہ جہاں کی جنبشِ لب سے وجود میں آگئی تھی اس میں اس کی اور کسی طرح کی کسی کاوش کا کوئی دخل نہیں تھا، شاہی سطوت کا یہ نشان جو نشان وفا کے طور پر تشہیر پا گیا تھا اس کے مقابلے میں وہ جس سے وہ بھرپور محبت کرتا تھا اس محبوبہ کے تاریک مکان کا خیال اسے اپنی بے مائیگی کا احساس دلاتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے: ؎

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن انکے لئے تشہیر کا سامان نہ تھا
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

دنیا میں ان گنت لوگوں نے محبت کی ہے بعض لوگوں نے تو اتنی شدید محبت کی ہے کہ اگر کسی وجہ سے اُن سے پہلے محبوبہ کی نبض رُک گئی تو ساتھ ہی ان کے دل کا دھڑکنا بھی بند ہو گیا ہے لیکن لاکھوں، کروڑوں محبت کرنے والوں کی بے مائیگی محبوب کی قبر پر محبت کی یادگار تو درکنار، سلیقے کے کفن کی بھی متحمل نہیں ہوئی ہے لیکن ان کے جذبوں کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

میری محبوب انھیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

جن معماروں کے ہُنر، محنت شاقّہ اور صنّاعی نے اس عمارت کو شکلِ جمیل بخش کر اسے تاج محل بنا دیا وہ بھی تو کسی سے محبت کرتے رہے ہوں گے جن کے محبوب کے مقابر بے نام ونمود ہیں۔ تاج محل کو تو ان کی صناعی نے آج بھی منور بنا کر رکھا ہے۔ ؎

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

ساہ جہاں نے نہ تو محبوب کی خوشی کے لئے فرہاد کی طرح پہاڑ کاٹ کر
ہے ئے شیر نکالی، نہ ہی قیس کی طرح لیلیٰ کے لئے صحرا کی خاک چھانی
لمہ شاہی جبر و استحصال سے حاصل کی گئی دولت کے صرف پر تاج محل
ی عمارت تعمیر کر کے غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے۔

آیئے! اب ساحر سے اس پل میں ملئے، جب وہ اپنی محبوب
ے ساتھ "نورجہاں کے مزار پر" کھڑا ہوا، شاہی جلال و جبروت
ور حقائق کے درمیان پڑے ہوئے پردے اٹھا رہا ہے۔

پہلوئے شاہ میں یہ دخترِ جمہور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خوں ریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

پہلے شعر کا پہلا ہی مصرعہ اہلِ قلب و نظر کے لئے پوری نظم کا مجمل خاکہ ہے اور ساحر کے حد سے زیادہ حساس ہونے کا ثبوت ہے نورجہاں کے لئے دخترِ جمہور سے بہتر کوئی لفظ علامت کے لئے استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا تھا، اور شاہ کے پہلو میں دخترِ جمہور کی قبر کا وجود ہی واقعات و حالات گذشتہ پر پڑے ہوئے سطوتِ شاہی کے پردے اٹھاتا نظر آتا ہے اور جبر و استحصال کا خاکہ ذہن میں ابھرنے لگتا ہے

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لئے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لئے
سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

ساحر کا سحر کہہ لیجئے یا اس کے کلام کی خصوصیت کہ اس کا ایک پل ایک زمانے پر محیط ہو جاتا ہے چونکہ واقعہ نگار جلال و جبروتِ شاہی کے خوف سے کھل کر اصل واقعات رقم نہیں کر سکے، ہاں کچھ اشارات و کنایات ضرور ملتے ہیں، اس لئے تصویر کو واضح کرنے کے لئے بھی پس منظر بیان کرنا ضروری تھا اور اس کے لئے ساحر کی جواں جسموں کے انبار کی ترکیب اس کے شدید محسوسات کی غماز ہے۔ لفظ انبار بے جان اشیاء کے لئے مستعمل ہے۔ ساحر اس لفظ کے تعلق سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ شاہوں کے لئے صرف سامانِ تعیش ہوتے تھے۔ ان کو جب اور جیسے چاہیں استعمال کریں۔ ان کی اپنی مرضی اور خواہشات کی کوئی حیثیت نہیں تھی، گویا وہ بے جان شئے تھے۔

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
توڑی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر

ساحر دورِ شاہی کے استحصال کی ایک جھلک پیش کر رہا ہے کہ شاہی حرم کی تزئین کی خاطر ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں نوچ لی جاتی تھیں۔ اہتمام ملاحظہ ہو نوچ لینے کا واضح مفہوم ہے، بہ جبر چھین لینا اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ حرم میں داخل ہو جانے کے بعد اگر وہ شاہ کی نظر سے اتر بھی جاتی تھیں تو ظلِ سبحان کی الفت کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر ہمیشہ کے لئے حرم میں مقید رہنا ان کا مقدر بن جاتا تھا اور دستِ جبروت شاہی ان کی تمناؤں، آرزوؤں اور خواہشات کا گلا گھونٹ دیتا تھا۔ ان کی حیثیت بے جان کھلونوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی تھی

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے
سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

صاحبِ سطوت و جبروت شہنشاہوں کے سامنے بے بس، بے کس اور مجبور انسانوں کی خاموشی ہی فریاد ہوا کرتی ہے۔ اسی خیال کے تحت ساحر کو پہلوئے شاہ میں دخترِ جمہور کا سہمی سہمی فضاؤں میں ویران اور خاموش مرقد فریاد کناں نظر آتا ہے۔ اور سرد شاخوں کے درمیان سسکتی ہوا کی آواز، روحِ تقدیس و وفا مرثیہ خواں محسوس ہوتی ہے۔ یہ بند جہاں ساحر کے حد سے زیادہ حساس ہونے کا ثبوت ہے وہیں پہلے مصرعے میں سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد کو نظم کے پہلے مصرعے "پہلوئے شاہ میں یہ دخترِ جمہور کی قبر" کو ذہن میں رکھ کر پڑھا جائے تو بقیہ تینوں مصرعے لازم کے ساتھ ملزوم کی صفت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ ساحر کی قادر الکلامی اور برمحل و صحیح الفاظ کے استعمال کی انکی سلیقہ مندی کا ثبوت بن جاتے ہیں۔

تو میری جان مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرا ہاتھ ہے زنجیر نہیں

کس طرح کی خلاف روایت باتیں ساحر نے کیں اس کی محبوب کو حیرت و حسرت سے اُسے دیکھنا ہی چاہیئے اور اس کے حیرت سے دیکھنے پر اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہنا کہ نہ تو مجبور بے بس دختر جمہور نور جہاں ہے نہ ہی میں با جبروت شہنشاہ جہانگیر، اگر تو میرا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتی ہے تو جا سکتی ہے کیونکہ تیرے ہاتھوں میں میرا ہاتھ ہے، کوئی جبر کی زنجیر نہیں۔ یہ اعلیٰ ظرفی۔ فراخ دلی، وسیع النظری اور ندرت بیانی صرف اور صرف ساحر کا ہی حصہ ہے

آئیے ! اب ساحر سے ایسے پل میں ملئے جب وہ قوم کی تذلیل پر خون کے آنسو بہا رہا ہے اور ان آنسوؤں سے آزاد نظم " اجنبی محافظ " مرتب ہو رہی ہے

اسی ہوٹل کے قریب
بھوکے مجبور غلاموں کے گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اُس ساعتِ نایاب کے جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیش کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکّہ، کوئی سگریٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے چھوٹے ٹکڑے
چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزا لینے کو
پالتو کتّوں کے احساس پہ ہنس دینے کو

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب کہ اجنبی محافظ (کرایے کے سپاہی) اس ملک کی (در پردہ اپنے مفاد کی حفاظت) کے لئے یہاں آئے تھے ایک ہوٹل میں مقیم ہیں اور اسی ہوٹل کے قریب کا یہ منظر ہے۔ نظم کی ہیئت ترکیبی اس طرح کی ہے جس سے مفہوم بالکل واضح ہے، کسی تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی علاوہ ایک خاص اشارتی ترکیب " ساعتِ نایاب " کے جس کا مفہوم قوم کی انتہائی زبوں حالی ہے، یعنی ایسی ساعتیں بھی نایاب ہیں جب اس طرح کی ذلت آمیز بھیک بھی میسر آ سکے، نظم میں چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزا لینے کو پالتو کتّوں کے احساس پہ ہنس دینے کو حالات کی بھرپور عکاسی ہے۔ رکھوالی اور حفاظت کے لئے انسان کتے پالتا ہے، اور جو کرائے کے سپاہی اس ملک کی محافظت کے لئے آئے تھے اصولاً حیثیت تو ان کی کتّوں جیسی ہونی چاہیئے تھی لیکن ستم ظریفیِ حالات کہ وہ سکے کیک اور ڈبل روٹی کے چھوٹے ٹکڑے پھینک کر اس ملک کے بدحال اور بھوکے عوام کو کتوں کی طرح جھپٹتے دیکھ کر ہنستے اور مزہ لیتے تھے۔

آئیے ! اب ساحر سے ایسے پل میں ملاقات کریں جب وہ قحطِ بنگال کی ہلاکت خیزی سے متاثر ہو کر چیخ اٹھتا ہے :

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو !
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا   کہ اس پہ دیش کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا   کہ نسلِ آدم و حوّا بلک بلک کے مرے

ایک مخصوص موسم میں جس طرح پتنگے اسٹریٹ لائٹوں کی طرف اُمنڈ پڑتے ہیں اور اپنی لاحاصل جدوجہد کے بعد دم توڑ دینا ہی ان کا مقدر ہوتا ہے۔ اور صبح کے وقت لاتعداد مردہ پتنگے بجلی کے کھمبوں کے قریب نظر آتے ہیں۔ اسی طرح قحط بنگال کے وقت بھوک سے بے حال عوام بنگال کے مرکزی شہر کلکتہ کی طرف امنڈ پڑتے تھے اور کلکتہ کی سڑکوں کے کنارے بلا مبالغہ کیڑے مکوڑوں کی طرح بھوک سے سسک سسک کر مر رہے تھے، بھوک سے بے حالی کا عالم یہ تھا کہ وہ مذہبی جنون جو مذہب (خدا اور بھگوان) کے نام پر آگ اور خون کی ہولیاں کھیل جاتے ہیں ان کے عالم نزع میں اگر کوئی بھگوان کا نام لینے کو کہتا تھا تو ان کے منہ سے بھگوان نہیں "بھات" (چاول) بنگال کی خاص غذا) نکلتا تھا اس سے ساحر کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ اور اس نے متاثر ہو کر نظم قحط بنگال کہہ کر نہ صرف حالات کی صحیح عکاسی کر کے شاعر کا فرض انجام دیا بلکہ ایک مفکر بن کر جہانِ کہنہ کے روایات کے حمایتی فلسفہ دانوں سے تقاضۂ انقلاب کے تعلق سے بڑے چبھتے سوالات قائم کئے شاہراہیں

چلنے کے لئے بنی ہیں نہ کہ دم توڑدینے کے لئے ۔ زمین اس لئے اناج اگلتی ہے کہ بھوک مٹائی جائے نہ کہ بھوک پیدا کرنے کے لئے نظم میں آگے بھی اسی انداز میں سوالات پیدا کئے گئے ہیں کیا ملیں ریشم کے ڈھیر اسی لئے لگاتی ہیں کہ دخترانِ قوم تار تار کو ترسیں، کیا چمن کو مالی اسی لئے اپنے خون پسینے سے سینچتا ہے کہ اس کی نگاہیں بہار کو ترسیں اور پھر ساحر آخر میں اپنے اصل لب و لہجہ میں کھل کر کہتا ہے ؎

زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو !
ملوں کے منتظمو ! سلطنت کے فرزندو !
پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

نظامِ زر کے خلاف احتجاج کی بات سے وہ بات بھی سامنے آجاتی ہے جس کا فسانے میں کہیں ذکر نہیں ہے یعنی یہ قحط دراصل اتنا سخت نہیں تھا جتنا نظامِ زر (غلط نظام تقسیم) نے اسے خطرناک اور ہلاکت خیز بنا دیا تھا کہ پچاس لاکھ انسانوں نے بھوک سے دم توڑ دیا، ظاہر ہے اُس وقت کے چالیس کروڑ آبادی والے اس ملک میں اگر ہر انسان کی خوراک سے ایک ایک تولہ کم کر دیا جاتا تو اُن پچاس لاکھ انسانوں کے بھوک سے مرنے کا سوال پیدا نہ ہوتا اور نہ ہی دوسرے لوگوں کی صحت پر کوئی اثر پڑتا۔ یہ غلط نظام تقسیم ہی تھا جس نے ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کی حوصلہ افزائی کر کے قحط بنگال کو جنم دیا تھا۔ نظم سلاست۔ روانی۔ الفاظ کے برمحل استعمال حالات کی صحیح عکاسی۔ اندازِ تخاطب، اندازِ فکر، غرض کہ ہر اعتبار سے یہ نظم شاہکار ہے۔

آیئے! اب آپ کو ساحر سے ایک ایسے پل میں ملاؤں جب سامراجی طاقتیں اپنی غاصبانہ فطرت سے مغلوب ہو کر باہم دست و گریباں ہو رہی ہیں اور وہ اپنی قوم کو بہ عنوان "لمحہ غنیمت" گراں مایہ مشورہ دے رہا ہے ؎

مسکرا اے زمینِ تیرہ و تار
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے
کوئی تیری طرف نہیں نگراں یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں۔ آہنی ہی سہی آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

زیر نظر مضمون چونکہ بہ عنوان "ہر پل کا شاعر" لکھا جا رہا ہے اور ساحر ہمیشہ صرف اپنے لیے جئے تو کیا جئے اور صرف اپنی فکروں میں مرے تو کیا مرے کا قائل رہا ہے اس لئے ملک، قوم جبر و استحصال کے شکار عوام۔ سماج کی ٹھکرائی ہوئی مخلوق حتیٰ کہ ہر مظلوم و مجبور کا درد اس کا اپنا درد رہا ہے۔ اور ہر پل اس نے اپنے قلمی فرائض کی انجام دہی بجا طور پر کی ہے اسی ضمن میں اس نظم کو بھی شاملِ مضمون کرنا پڑا۔ حالانکہ اس نظم میں کوئی خاص شاعرانہ اُپج "پرانے قمار خانے" اور "کہنہ شاطر" کے علاوہ نہیں ہے لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ہر پل کا احاطہ کیا ہے اور حسبِ ضرورت اپنے قلم کا استعمال کیا ہے۔ ساحر کے دل میں ملک، قوم کی غلامی کا کتنا درد تھا کہ جیسے ہی اس نے کہنہ سامراجی شاطروں کو اقتدار کے پرانے قمار خانے میں باہم دست بگریباں دیکھا فوراً دبی ہوئی مخلوق کو سر اٹھانے اور آہنی زنجیروں کو توڑ دینے کا مشورہ دیتا ہے اور حوصلہ افزائی یہ کہہ کر کرتا ہے کہ زنجیریں آہنی سہی مگر زنگ خوردہ ہیں، اگر تم چاہو تو توڑ سکتے ہو مزید آں یہ بھی کہ تم جن سے خوف کھاتے ہو وہ ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔ اس وقت تمہاری طرف کوئی نگراں بھی نہیں ہے۔ اس پل کو غنیمت جانو۔

مردوں کے بنائے ہوئے سماج میں محبت کے نام پر مکر و حیلہ سے یا بہ جبر ہوس پرستوں کی کچلی اور مسلی ہوئی عورتیں ایک مستقل مسئلہ ہیں جو ہر منصف مزاج اور حساس دل کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ ساحر نے بھی مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر اس موضوع پر کئی نظم اٹھایا ہے۔

آیئے ! اب ایسے ہی پلوں میں ساحر سے ملاقات کی جائے نظم "چکلے" کی تخلیق ہو رہی ہے۔ ساحر اپنے سحر آفریں انداز میں "یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے" سے نظم کا آغاز کر کے اپنے مخصوص انداز میں بازارِ حسن کی تمام جزئیات کے ساتھ منظر کشی کرتے کرتے بالآخر اس کا قلم چیخ اٹھتا ہے ؎

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

وہ لوگ جو دن رات مشرق کی مقدس روایات کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں کہاں ہیں۔ کیا یہی ہے مقدس مشرق جہاں اس طرح کے بازار لگتے ہیں، جہاں جوانیاں رقص تو کرتی ہیں لیکن وصال محبوب کی خوشی میں سرشار ہو کر نہیں بلکہ ہوس پرست تماش بینوں کو خوش کرنے کے لئے جہاں کسی کا شباب کسی کی باہوں میں کسمسا کر نذرانہ دل نہیں پیش کرتا بلکہ اپنی بے قدری اور مجبوری کے احساس سے تڑپتا ہے۔ آخر یہ بھی یشودا کی ہم جنس اور زلیخا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ حوّا کی بیٹیاں جنس کے اس جہنم سے نجات اور اپنا صحیح مقام پانے کے لئے مدد چاہتی ہیں۔

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ
یہ کوچے یہ منظر یہ گلیاں دکھاؤ
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

اصلاح بنی نوعِ انساں کے ٹھیکیدار خدایانِ دیں کو لاکر یہ مناظر دکھاؤ، ہوس کے جہنم میں آتشِ جنس کے عذاب سے تڑپتی ہوئی روحوں پر شاید انھیں کچھ رحم آجائے اور اپنے خلد حرم میں داخلے کا پروانہ عطا کردیں۔ شاید تقدیسِ مشرق کی ثناخوانی کرنے والوں کو یہ منظر دیکھ کر کچھ شرم آجائے اور جن سماجی قوانین کے تحت اپنی نسائیت کے جرم میں انھیں ہوس کار مردوں کا یہ عذاب بھگتنا پڑ رہا ہے اس میں کچھ ترمیم کردیں۔

آئیے! اب ایک اور ایسے ہی پل میں ساحر سے ملیں جب وہ پھر اسی موضوع پر قلم اٹھائے ہوئے ہے۔ ایسی ہی ایک عورت جو کسی فریب کار مرد کی ہوس کا شکار ہو کر ایک بچے کی ماں بن چکی ہے اور ممتا سے مجبور ہو کر اسے دودھ پلا رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اس ماں کے جذبات و تاثرات کی کتنی صحیح عکاسی اپنے گیت میں کی ہے۔

پوچھے کوئی تجھ سے تو کسے باپ کہے گا
یہ جگ تو تجھے بھٹکا ہوا پاپ کہے گا
بن کے رہے گی شرمندگی، تیری زندگی
جب تک تو جیئے گا
آج پلاؤں تجھے دودھ بس کل زہر پیئے گا

ماں اپنی ممتا سے مجبور ہو کر بچے کو پالنے کا عزم کرتی ہے لیکن مجبورِ عمل اور خوف ردِّ عمل کی کشمکش سے پریشان ہے۔ ساحر نے جذبات کی اس کشمکش کا کتنے عام فہم الفاظ میں کس خوبصورتی سے اظہار کیا ہے قابلِ داد ہے۔ آئیے ایک ایسے پل میں ساحر سے ملاقات کیجئے جب وہ سماج میں مردوں کی بالادستی کی وجہ سے عورت کے استحصال کا تجزیہ ایک فلمی گیت لکھتے ہوئے کرتا ہے۔

جبر سے نسل بڑھے ظلم سے تن میل کرے
یہ عمل ہم میں ہے بے علم پرندوں میں نہیں
ہم جو انسانوں کی تہذیب لئے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں

ملاحظہ کیا آپ نے عورتوں کی عصمتوں کے لیٹیرے سماج کو کتنے مدلل اور کیسے سخت الفاظ میں سرزنش کی ہے نیز اس مظلوم و مجبور مخلوق کے لئے ساحر کے دل میں کتنا درد تھا۔ عیاری، مکاری ظلم جبر سے کئے گئے اتصال جسمانی کے نتائج کے طور پر جو جیتے جاگتے مسائل (بچے) پیدا ہو جاتے ہیں، اور اُن پر باپ کے نام کا لیبل نہ ہونے کے بنا پر ہمارے ذات پات، برادری، مذہب، فرقہ پر مشتمل سماج میں کوئی تشخص اور کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ایک بچے کو جو سماج کی نگاہوں میں "گناہوں کی پوٹ" ہے جس کا تشخص اور دنیا و سماج میں جس میں حیثیت کا تعین ساحر کے قلم کی ذمہ داری بن چکا ہے۔

آئیے! اب ایک ایسے ہی پل میں اُس سے ملئے جب وہ اپنی اس ذمہ داری سے یہ کہہ کر عہدہ برآ ہو رہا ہے۔

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

وہی بچہ جسے سماج نے اپنی چشمِ حقارت سے دھکّا دے کر قعرِ ذلت میں گرا دیا تھا۔ ساحر نے اسے آدمیت کی ساری بلندیاں یہ کہہ کر عطا کردیں کہ خواہ یہ ہندو یا مسلمان نہ بن سکے لیکن چونکہ انسان

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

غزلیں

پیام فتحپوری

۲۰/۶ مہاپالیکا کالونی - نسیم آباد
چمن گنج - کان پور

فقیر ہوں میں مرا کام ہے صدا دینا
مرا شعار ہے قاتل کو بھی دُعا دینا

غمِ فراق میں جینا بھی اک قیامت ہے
مرے خدا مجھے جینے کا حوصلہ دینا

فرازِ دار ہو، صحرا ہو یا کہ مقتل ہو
جہاں ہو میری ضرورت مجھے صدا دینا

کہاں میں گم ہوں مجھے دوستو تلاش کرو
اگر ملوں تو مجھے بھی مرا پتہ دینا

انا بہت ہے میں سرکش بھی ہوں بہت لیکن
خدا کے نام پہ آتا ہے سر جھکا دینا

ہمیں غرض نہیں اس سے کہ کون کیسا ہے
ہمارا کام ہے ہر شخص کو دُعا دینا

تمام عمر گزاری ہے یاد میں جس کی
پیام سہل نہیں ہے اسے بھُلا دینا

شاہجہاں بانو یادؔ دہلوی

سحر و منزل - گولا گنج
لکھنؤ

ہم نے مانا کہ ستم جُزوِ کرم ہوتا ہے
لیکن اس دور میں یہ حادثہ کم ہوتا ہے

اپنی ہستی میں جو محدود ہیں وہ بھی مجرم
اپنی ہستی سے گزرنا بھی ستم ہوتا ہے

یہ حقیقت ہے کہ تقدیر کے ہم قائل ہیں
پھر بھی ناکامیِ تدبیر کا غم ہوتا ہے

کیا بُرا ہے کہ ہو تعمیر وہاں مے خانہ
جس جگہ معرکۂ دیر و حرم ہوتا ہے

رائیگاں کیجیے کیوں اپنا متاعِ غمِ دل
چند اشکوں سے وہ دامن کہیں نم ہوتا ہے

وقت کے ساتھ تو چلنا ہی پڑے گا اے یادؔ
ہاں مگر وقت بہت تیز قدم ہوتا ہے

اندر سروپ سریواستوا

(ریٹائرڈ پرنسپل)
۷۰، مسوانی - فتح پور

کوئی تو منظر بھی ہو بے منظری کے ساتھ ساتھ
کس طرح کوئی جیے بے چہرگی کے ساتھ ساتھ

ایک کربِ بے کراں ہے زندگانی کا سفر
سانس لیتے ہیں مگر رنج و خوشی کے ساتھ ساتھ

دل میں سب کے ہے ہزاروں آرزوؤں کا ہجوم
کس قدر بیچارگی ہے آدمی کے ساتھ ساتھ

اک طرف دشتِ تذبذب اک طرف بحرِ سکوت
جانے کتنی گردشیں ہیں زندگی کے ساتھ ساتھ

اس طرح میری انا کا ٹوٹنا ممکن نہ تھا!
خود شناسی تھی ملی وارفتگی کے ساتھ ساتھ

اس سفر کو آخرش میں کون سا عنوان دوں
ایک دریا بھی رواں ہے تشنگی کے ساتھ ساتھ

چل رہے ہیں منزلِ امکاں کی جانب ہم سروپؔ
تیرگی کے ساتھ ساتھ اور روشنی کے ساتھ ساتھ

افسانہ

ظفر اقبال
۱۷۰۔ خیلدار، فتح پور

لہو کا آخری قطرہ

وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا۔ کیا نام اور کس مذہب سے اس کا تعلق تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا۔ بس اتنا ہی سب جانتے تھے کہ وہ ایک مفلوج اور ناکارہ انسان ہے، جو دونوں ٹانگوں سے محروم ہے۔ اور ایک بے جان مجسمے کی مانند خاموشی سے آنے جانے والوں کو تکتا رہتا ہے اور زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ صرف اشارے سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ کسی نے کبھی اسے بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے لوگ اسے گونگا سمجھتے تھے۔

اس کی شخصیت میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ راہ گیر اس کے پیالے میں سکہ ڈالے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اس طرح شام تک اس کے پیالے میں اتنے پیسے آجاتے تھے کہ وہ آسودہ ہو کر کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کر لیتا تھا۔

اس نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ ایک ایسی شاہراہ تھی جہاں سورج کے طلوع ہوتے ہی انسان چیونٹیوں کی طرح نکل پڑتے اور پھر کافی رات تک یہ ہنگامہ قائم رہتا۔ جو بھی اسے دیکھتا تھا، اس کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ ضرور اُبھر آتا اور وہ اس کے پیالے میں سکّہ ڈال کے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس میں کسی فرقہ یا مذہب کی قید نہ تھی۔ اس کے پیالہ میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ہر مذہب و طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سکّے پڑتے تھے، جیسے کہ اس کا پیالہ کسی بزرگ کی خانقاہ ہو جہاں ہر قسم کے لوگوں کو پناہ میسّر تھی۔

اس شاہراہ سے میرا بھی روز گزرنا ہوتا تھا، اور میں اکثر اس کے پیالے میں سکّہ ڈالتے ہوئے چند لمحہ کے لیے اس کے پاس ٹھہر کر اسے بغور دیکھنے لگتا تھا، بس اتنی دیر کہ وہ مجھے اور میں اسے ایک بھرپور نظر سے دیکھ لیں۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا اور پھر رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے سے آشنا ہوتے گئے اور ہماری یہ ملاقات اجنبیت کے دائرے سے نکل کر اپنائیت کے زمرے میں داخل ہو گئی، اور میں اس کے اندر چھپے ہوئے انسان کا مطالعہ کرنے لگا۔ تب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ شخص گونگا نہیں ہے۔

پھر میرا روز کا یہ معمول بن گیا کہ میں آتے جاتے ہوئے اس کے پاس رُکنے لگا۔ اس طرح مجھ پر اس کی زندگی کے پوشیدہ گوشے روشن ہوتے گئے اور میں ہی وہ شخص تھا کہ اس کے نام، مذہب اور ٹانگ کٹنے کے راز سے واقف ہوا۔

اس کی پیدائش ایک مسلم گھرانے میں ہوئی تھی، جہاں اس کا نام رحیم رکھا گیا تھا، لیکن سب گھر والے اسے رحمو کہہ کر پکارتے تھے۔ ابھی وہ صرف چھ سال کا تھا کہ اس کے ماں باپ سیلاب کی نذر ہو گئے۔ تو اس کی پرورش راما کاکا کرنے لگے، اس طرح اس کا نام رحمو سے بگڑ کر رامو پڑ گیا۔ ابھی وہ دس بارہ سال ہی کا تھا کہ راما کاکا بھی دُنیا سے چل بسے، تو وہ گاؤں کو چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ کچھ دن تو وہ ہوٹل میں نوکری کر کے گزر بسر کرتا رہا، پھر رکشہ چلا کر اپنا پیٹ پالنے لگا۔

اس طرح کئی سال اس نے اس شہر میں رہ کر گزار دیے کہ اچانک ایک دن سارا شہر فساد کی لپیٹ میں آ گیا۔ سیکڑوں گھر جل کر راکھ ہو گئے، بازار دُوکانیں لُٹ گئیں۔ پیراہن عصمت تار تار ہو گیا۔ انسان کا خون پانی کی طرح بہنے

لگا۔ آدمی جانور بن گیا اور ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔

وہ اپنے رکشہ سے کالج کی لڑکیوں کو پہنچانے اور پھر انھیں لینے جایا کرتا تھا۔ جس دن شہر میں فساد کی آگ بھڑکی وہ اپنے رکشہ سے کالج کی چند لڑکیوں کو لے کر آ رہا تھا کہ راستے میں چند غنڈوں نے اسے گھیر لیا اور چاہا کہ ان معصوم کلیوں کو مسل ڈالیں، لیکن وہ ان کے سامنے سینہ سپر ہو گیا اور اپنی جان پر کھیل کر کسی طرح انھیں بحفاظت ان کے گھر تک پہنچا دیا۔ اس کے جسم پر کافی زخم آئے تھے اور سب سے زیادہ زخم اس نے ران پر کھائے تھے، جس کے باعث ڈاکٹر کو اس کی ٹانگ کاٹنی پڑ گئی تھی۔

اس حادثہ نے اسے بالکل بکھیر دیا تھا۔ وہ عرصہ سے معطل زندگی گزار رہا تھا۔ جسم سے زیادہ مقدار میں خون نکل جانے اور ٹانگ کٹ جانے کی وجہ سے وہ محض ایک ناکارہ شخص بن کر رہ گیا تھا۔ جن لڑکیوں کی عزت و ناموس کو اس نے بچایا تھا، ان کے والدین کافی احسان مند تھے۔ اس کے علاج کے سلسلے میں وہ لوگ برابر اس کی مدد کرتے رہے۔ پھر ایک ایک کر کے وہ لوگ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے اور بجز خدا کے اس کا کوئی سہارا نہ رہ گیا تھا۔ نقاہت و کمزوری کے باعث بیماری نے پھر اس پر حملہ کر دیا تھا اور جب وہ کسی طرح موت کے ظالم پنجے سے بچ گیا تو اسے اپنے شہر سے شدید نفرت ہو گئی۔ اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں منتقل ہو گیا اور تب سے وہ اسی شاہراہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا پیالہ انسانی ہمدردی کے سکوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کی مفلوج زندگی سے دو مجبور و کمزور انسان اور وابستہ تھے۔ ایک اندھا و لاغر ٹی بی کا مریض مُجَن اور دوسری فالج زدہ ادھیڑ عمر کی سُکھ رانی — جس کا نام سُکھ رانی ضرور تھا لیکن اس کا پورا جیون دکھ کے انگارے چبتے ہوئے گزرا تھا۔ گویا وہ ایک اکائی ہو کر بھی مثلث بن گیا تھا۔

ایک عرصہ تک اس کے خدوخال پڑھنے اور اس کے اندر کا کرب جاننے کے بعد مجھے ایک ادھورا خاکہ حاصل ہو گیا تھا جسے مجھے کہانی کا روپ دینا تھا۔ اس کی یہ کہانی ایک بھرپور تاثر کے ساتھ میرے ارد گرد بکھری ہوئی تھی، جس کا ہر حصہ غم انگیز ہونے کے باوجود انجام کی کسک سے محروم تھا۔ میں ان بکھرے ہوئے لمحوں کی کہانی جو رحیم سے شروع ہو کر راموں کے ارد گرد پھیل کر رک گئی تھی، کوئی انجام دینا چاہتا تھا۔

زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی کہ ایک دن اس پُرسکون شہر میں بھی فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور تمام شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہر شخص ایک دوسرے کی عزت اور جان و مال کا لٹیرا بن گیا۔ اور انسان ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھانے لگے۔ یہ آگ تقریباً چوبیس گھنٹے تک پھیلی رہی۔ پھر فوجی دستے مسلط ہوتے ہی شہر میں امن و امان کی فضا ہموار ہونے لگی اور ڈرے سہمے لوگ اپنی اپنی ضرورت کے لیے گھروں سے نکل پڑے۔ پورا شہر کسی لٹی ہوئی مظلوم بیوہ کی طرح لگ رہا تھا۔

جب سڑکوں پر زندگی رواں دواں دیکھی تو میں بھی اپنے گھر سے نکل پڑا۔ اور ادھر اُدھر سڑکوں پر گھومنے کے بعد میرے قدم بے اختیار اس راستے کی طرف اٹھ گئے جہاں رحیم کا ٹھکانہ تھا۔ جب میں اس جگہ پہنچا تو انسانوں کے مجمع کے ساتھ ساتھ پولیس اور فوج کے جوان بھی کافی تعداد میں نظر آئے۔

میں کسی طرح انسانوں کے حصار کو توڑتا ہوا اندر پہنچا تو دیکھا کہ رحیم کا مُردہ جسم اوندھا پڑا ہے اور اس کی پیٹھ پر متعدد لاٹھیوں اور چاقوؤں کے زخم نمایاں ہیں اور کچھ فاصلے پر ایک دس بارہ سال کی معصوم لڑکی بیہوش پڑی ہے جسے کچھ ہی دیر پہلے فوجی جوانوں نے رحیم کے مردہ جسم کے نیچے سے نکالا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ وہ میرے ہی پڑوس کے کشور بابو کی لڑکی الپنا تھی۔ جسے اکثر و بیشتر میں نے رحیم کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ اسے چاچا کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ اس کے چاچا کہنے سے رحیم کے چہرے پر ایک عجیب سی مسرت و طمانیت کی لہر دوڑ جاتی تھی۔

اور آج اسی کو بھیڑیا نما انسانوں سے بچانے میں رحیم نے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ ہر شخص تحسین آمیز نظروں سے اس کی لاش دیکھ رہا تھا میں بھی سینکڑوں لوگوں کے بیچ کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ رحیم کے لہو کا آخری قطرہ بھی انسانیت کے کام آ گیا۔ ✱✱

ہر پل کا شاعر

ص ۴۴ کا بقیہ

کی اولاد ہے اس لئے انسان ضرور بنے گا۔ اور آدمی کے لئے انسان بن جانے سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے، بقول غالب " آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"۔ ساحر جیسے حساس و عظیم شاعر صرف اپنی ہی زندگی نہیں جیتے بلکہ اپنے عصر کا ہر پل جیتے ہیں، اور تمام عصری مسائل پر ان کی شاعری محیط ہوتی ہے

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے

دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "اپنی تصویر"

شاعر: اظہر عنایتی قیمت -/۵۰ روپئے

ملنے کا پتہ: شیخ کا پھٹر۔ رامپور (یو۔پی)

غزل، اُردو ادب کے ارتقائی سفر کے ہر موڑ پر ایک خاص منظر بن کے ابھری ہے۔ آج کی نئی غزل بھی اپنے تازہ آب و رنگ۔ اور توانا فکر و احساس کے نو وارد اور آنے والے موسموں کی آہٹوں کا پتہ دیتی ہے ادھر غزل کی پذیرائی کے سلسلے میں گزشتہ دو تین دہائیوں میں نئے در۔یچے کھلے اور نئی راہیں روشن ہوئی ہیں۔

اظہر عنایتی کا "خود کلامی" (۱۹۸۰ء) کے بعد دوسرا مجموعہ غزلیات "اپنی تصویر" اسی سلسلے کی ایک خوبصورت اور اہم کڑی ہے۔ اس میں اُردو ادب کے تخلیقی سرمائے کی صالح روایات اور اقدار کی پاسداری بھی ہے اور جدید حسیت و تفکر کی کرنوں کی چمک بھی۔ تخلیقی کردار کی حسن کاری بھی ہے اور ارتقائی عمل کی چابکدستی بھی اور یہی تمام عناصر مل کر اظہر عنایتی کی غزل کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی اور زندگی کے شعور کی ایسی وجاہتیں ملتی ہیں جن میں خوابوں اور حقیقتوں کی قربتوں کا لمس مہکتا ہے اظہار و بیان کے قرینوں کی خوشبو سفر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بہ قول فیض اظہر زندگی کی سچائیوں کے شاعر ہیں۔

انگلیاں مضبوط ہاتھوں سے چھٹیں
بھیڑ میں بچے اکیلے ہو گئے

رُت بھی سردی کی ہے اور یہ بھی نہیں ہے ممکن
رات کے واسطے کچھ دھوپ بچا کر رکھ لوں

توڑنے نکلا تھا جو شخص سہاروں کا طلسم
آج گھر تک وہی دیوار پکڑ کر آیا

نہ جانے شہر میں کس کس سے جھوٹ بولوں گا
میں گھر کے پھولوں کو شاداب دیکھنے کے لیے

ادھوری گھر میں تصویریں بہت ہیں
مرے پیروں میں زنجیریں بہت ہیں

جدید رنگ کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اظہر عنایتی غیر ضروری جدّت، ندرت طرازی، ناہموار، ناپسندیدہ اور کھُردرے پن کے معائب سے بھی پاک ہیں ؎

پڑوس میں بڑا ہمدردیوں کا چرچا ہے
اندھیری رات میں اک چیخ مار کر دیکھوں

سنا ہے میں نے یہاں سُرخ گھاس اُگتی تھی
وہ بادشاہ یہیں اپنی جنگ ہارا تھا

اظہر عنایتی کے یہاں لب و لہجہ کی شگفتگی بھی ہے اور احساس و فکر کی تازگی اور نادرہ کاری بھی اور یہی منفرد اور خوبصورت شاعری کی پہچان ہے

ضدیں تو شان ہوا کرتی ہیں رئیسوں کی:
جو چوتھی سمت نہ جائے وہ شاہزادہ کیا

تمام شہر میں کس طرح چاندنی پھیلی کہ ماہتاب تو کل رات میرے گھر میں تھا

ٹوٹ کر چبھ رہا ہے آنکھوں میں آئینہ تو نہیں تھا خواب مرا

ڈاکٹر ابوالفیض سحر

نام کتاب: "سبب"

مرتبین: مناظر عاشق ہرگانوی - نیّر حسین نیّر

قیمت: پچیس روپئے

ملنے کے پتے (۱) مکتبۂ کوہسار، برہ پورہ۔ بھاگل پور (بہار)

(۲) مکتبۂ توازن ۴۵۴ نیاپورہ، مالی گاؤں (ناسک)

مناظر عاشق ہرگانوی شعری انتخاب میں کس قدر فعال ہیں اس سے تو اُردو کا ہر قاری واقف ہے۔ "سبب" اس سلسلے کی وہ چوتھی کڑی ہے جس کے وہ مرتب ہیں۔ اپنے وسائل بھر رسائل کی فراہمی اور ان میں سے شعرا اور ان کی غزلوں کا انتخاب دیکھنے میں بہت آسان ہے۔ لیکن جب اس آسانی کو نئے سرے سے کاغذی پیرہن دیا جاتا ہے تو ترتیب دینے والا جس کشمکش سے گزرتا ہے اسے وہ ہی جان سکتا ہے۔ کسی شاعر کی غزل کو فوقیت دینا اور کسی کی تخلیق کو نظر انداز کرنا اپنے آپ میں وہ مشکل عمل ہے کہ جس سے عہدہ برآ ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

کوئی بھی انتخاب اپنے آپ میں مکمل نہیں ہوتا لیکن اس سے کم سے کم مجموعی صورت تو نظر آتی ہے جو اس عہد اور عہد کے شعری رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کی یہ سال بہ سال کوششیں آنے والے کل میں اس عہد کے شعری رجحانات کو مکمل طور پر واضح نہ کر سکنے کے باوجود اس شعری رجحان کی نشان دہی تو کر سکتی ہیں اور یہ سلسلہ ایسا سلسلہ ہے جس کے وسیلے سے کل ہمارے آج کے اس ادب کی شناخت آسانی سے ہو سکتی ہے۔

اس شعری انتخاب سے قطع نظر ایک بات اور ہے وہ یہ کہ شعری انتخاب کو غزل / آزاد غزل تک محدود نہ کر کے اگر اسے شاعری کے دوسرے اصناف تک پھیلا دیا جائے تو یہی انتخاب ایسی دستاویز بن سکتا ہے جس کے حوالے سے وہ اردو ادب کی تاریخ میں معتبر ہو سکتے ہیں۔

________ وقار ناصری

نام کتاب: "آخری زیور"

مصنف: سلمان علی خاں   قیمت: ۹/ روپئے

ملنے کا پتہ: دانش محل، امین آباد۔ لکھنؤ

اُردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں سلمان علی خاں کا نام غیر معروف اور بالکل نیا ہے حالانکہ ان کے زیر تبصرہ افسانوی مجموعے کے سبھی افسانے کم و بیش پچیس برس قبل کے لکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ابتدا میں افسانہ نگاری شروع کی تھی لیکن اس میں نام پیدا کرنے سے پہلے ہی دوسری راہ اختیار کر لی۔ اب عرصۂ دراز کے بعد ان کو اپنی سابقہ تحریروں کو یکجا کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے ان کو کتابی شکل دے دی۔ یہ ہے وجہ تسمیہ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ "آخری زیور" کی اشاعت کی۔

"آخری زیور" میں شامل سبھی افسانے سلمان علی خاں کی ابتدائی کوششیں ہیں اور اب ابتدا کو کافی عرصہ گزر چکا ہے اس لیے اس سلسلے میں کچھ کہنا ایک طرح سے بے سود ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اب انھوں نے پھر افسانے کی طرف توجہ دی ہے۔ امید ہے کہ وہ خود اپنے موجودہ افسانوی مجموعے سے ہرگز مطمئن نہ ہو کر اس سے کہیں بہتر مجموعہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم کو ان سے اچھے افسانے ملیں گے۔ ان کے موجودہ افسانوی مجموعے کو نیک شگون سمجھنا چاہیے اور ان سے بہتر افسانے کی توقع رکھنا چاہیے۔

"آخری زیور" میں تیرہ افسانے شامل ہیں جو دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ ان کے پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سلمان کوشش کریں اور میدان میں ڈٹے رہیں اور نئے افسانوں کا مطالعہ جاری رکھیں تو وہ اچھے افسانے لکھ سکتے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ سلمان علی خاں "آخری زیور" کی اشاعت سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھیں بلکہ جب تک اس سے کہیں بہتر دوسرا مجموعہ پیش نہ کر دیں، انھیں اچھے سے اچھے افسانے لکھنے کی تمنا بے چین رکھے۔

________ احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: "ہندستان کی جنگِ آزادی کے مسلمان مجاہدین"

مصنف: میوا رام گپت ستوریا   قیمت: ۳۵/ روپئے

ملنے کے پتے: (۱) معرفت راجندر پرتاپ گپت ۳/۳۰ بی انڈین ایرلائنز کالونی کالینہ۔ بمبئی۔ ۴۰۰۰۲۹ (۲) چھوٹے لال گپت ۱۱۹/۲۱۶ خلاصی لائن، کان پور۔ (یوپی)

آزاد ہندستان میں رہنے والے مختلف فرقوں کے درمیان غلط فہمیوں اور

بدگمانیوں کو دور کرنے کے لیے جناب میوالال گپت نے جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ گپت جی کی یہ کوشش انتہائی مستحسن اور قابل قدر ہے۔

مسلمان مجاہدین کے کارناموں اور قربانیوں پر مشتمل ہندستان کی جنگِ آزادی کا یہ تاریخی تذکرہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ کتاب میں بہت سے مجاہدین آزادی کے نام جانے پہچانے ہیں جبکہ بیشتر نام عام لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے ابتدائی ابواب میں ۱۸۵۷ء سے تحریکِ آزادی کے آغاز کا خاکہ اور تجزیہ نیز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ باقی کتاب مسلم مجاہدوں اور شہیدوں کے حالات اور وطن کی آزادی کے لیے ان کی قربانیوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ گپتا صاحب کا اندازِ بیان سلیس، رواں اور مؤثر ہے۔

امید ہے کہ گپت جی کی یہ کوشش قبول عام حاصل کرے گی۔

ــــــــ ڈاکٹر تسخیر فہمی

نام کتاب: "روتے پھول"

شاعر: مطلوب احمد خاں طالب قیمت: ۲۵/- روپے

ملنے کے پتے: (۱) شمع ادب لائبریری، نیا دھرم شالہ۔ بارہ بنکی

(۲) نہرو میموریل لائبریری۔ موئی۔ ضلع بارہ بنکی

اردو غزلیہ شاعری کے ایک کہنہ مشق شاعر مطلوب احمد طالب بارہ بنکوی کا پہلا شعری مجموعہ "روتے پھول" پیشِ نظر ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً ۱۱۶ غزلیں اور بعض متفرق قطعات شامل ہیں۔ مجموعہ کے آخر میں ایک نظم بہ عنوان "ہمارا وطن" بھی درج ہے۔

مجموعہ کی ابتدا میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، عزیز بارہ بنکوی، ڈاکٹر سلمان عباسی اور آذر بارہ بنکوی صاحبان نے طالب کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ "عرضِ حال" کے عنوان کے تحت شاعر نے خود اپنے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔

"روتے پھول" میں شامل غزلوں کے مطالعہ سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ خالقِ حقیقی نے شاعر کو غزلیہ شاعری کی شان دار روایتوں کی پاسداری کے لیے بہترین صلاحیت ودیعت کی ہے۔ فن میں خلوص و صداقت، نظر میں وسعت، تخیل میں گہرائی و گیرائی اور زبان و بیان پر قدرت جناب طالب کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دل گیا، دل کی کائنات گئی خواہشِ چشمِ التفات گئی

فصلِ گل کے آتے آتے اس قدر وحشت ہوئی
ہاتھ دامن پر جہاں رکھا، گریباں ہو گیا

وہی تجلی، وہی مناظر، مگر وہ ذوقِ نظارہ نہیں ہے
بنے گا کیا عارفِ حقیقت جسے خود اپنی خبر نہیں ہے

ــــــــ انور حسین خاں

نام کتاب: "کلیات اشعر ملیح آبادی"

مرتب: اسمار رفعت حسین قیمت ۳۰/- روپے

ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

کسی شاعر کے کلام کا انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں کیونکہ مرتب کو انتخاب صرف اپنے نظریے سے نہیں بلکہ قاری کے نظریے سے بھی کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے کہ شاعر کی شاعری کا ہر پہلو منتخب اشعار میں اجاگر ہو جائے۔ اشعر کے کلام میں زندگی کے متعدد پہلوؤں کی ترجمانی ہے ان کا بیان سادہ مگر پُراثر ہے۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ ان کی شاعری دل کے تاروں کو چھو کر جھنکار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ؎

کون بولے گا غم کے ماروں سے کیوں کریں بات چاند تاروں سے
کب شبِ ہجر کی سحر ہو گی پوچھتا پھر رہا ہوں تاروں سے

اوّل اوّل ان سے چُھٹ کر کتنا گھبراتا تھا دل
رفتہ رفتہ غم سے پھر مانوس ہو جانا پڑا

اور اشعر کا یہ مخصوص انداز بھی دیکھیں، ان کے یہاں سوز بھی اور ساز بھی کیف بھی ہے اور گداز بھی اور جذبات کی بے ساختگی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے

دل میں غم کا ہے یہ حال جیسے شیشے میں ہو بال

غزلوں کے علاوہ ان کی نظموں میں بھی ایک حساس دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔

راجندر بہادر موج

عنوانات

نیا دور

جلد ۴۴ | نمبر ۱۱، ۱۲

فروری، مارچ سنہ ۱۹۹۰ء

(ایکٹنگ) ایڈیٹر : شاہ نواز قریشی

ٹیلیفون ——— ۸ ۰ ۱ ۷ ۴ ۳ ۲

پبلشر : اشوک پریہ درشی
(ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش)

مطبوعہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ : محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ
سالانہ : دس روپے

[illegible]

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

سن ۱۹۸۹ء کے جاتے جاتے اُردو زبان وادب کی بعض اہم شخصیتیں بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ ان میں معروف شاعر عالم فتحپوری کا انتقال ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو آگرہ میں ہوا۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کی طویل نظم "شعلۂ طور بجھا" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ نظم ماہنامہ "فروغ اُردو" لکھنؤ کے جگر نمبر میں شامل اشاعت تھی (یہ نمبر مارچ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا) اس طویل نظم میں غزل کی داستان ارتقا بڑے دلکش افسانوی انداز میں غزل کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی بہت سی نظمیں ہیں جو انتہائی خوبصورت اور متاثر کن ہیں۔ عالم صاحب شاعروں میں بہت مقبول تھے۔ ہندستان کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں وہ متعدد بار جیل بھی گئے۔

جلیل فتحپوری کا انتقال ۷ نومبر ۱۹۸۹ء کو ہوا۔ وہ ایک ایسے خوش فکر شاعر تھے، جس کے لہجہ میں بڑی شگفتگی تھی۔ وہ جگر اکیڈمی کان پور کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بھی ہمیشہ فعال اور سرگرم رہے۔ وہ علامہ شارق ایرایانی کے تلامذہ میں سے تھے اور شعری اظہار کی ان روایات کے امین تھے، جو جگر اسکول سے عبارت ہیں۔

دیوان برنیدر ناتھ کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۹۸۹ء کو ہوا۔ وہ ظفر پیامی کے نام سے لکھتے تھے۔ ان کی شخصیت اور تحریر دونوں میں بڑی کشش تھی۔ وہ صحافی بھی تھے اور ادیب بھی۔ ان کا ایک ناول "فرار" اور کئی دوسری کتابیں شائع ہوئیں۔ انھوں نے ایک اُردو خبر رساں ایجنسی "پریس ایشیا انٹرنیشنل" قائم کی تھی جسے انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ چلایا۔

ان شخصیتوں نے اُردو زبان وادب کی جو خدمت انجام دی ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اُردو زبان وادب کے مخلص خادم یکے بعد دیگرے اُٹھتے جارہے ہیں، اور المیہ یہ ہے کہ ان کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہورہا ہے اس کے پُر ہونے کے امکانات نظر نہیں آرہے ہیں۔

○ ہم اپنے قارئین اور معاونین سے انتہائی معذرت خواہ ہیں کہ بعض وجوہ کی بنا پر نیا دور انھیں تاخیر سے مِلتا رہا ہے۔ لیکن اب نیا دور کی اشاعت بہرحال معمول پر آگئی ہے اور آئندہ ماہ سے نیا دور کی اشاعت اور پہلے عمل میں آجائے گی۔ یعنی اپریل کا شمارہ ۱۵ مارچ تک شائع ہوجائے گا اور ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ یہ سلسلہ بہرحال قائم رکھا جائے گا لیکن بعض انتظامی مسائل بھی درپیش ہیں، جن کے باعث نیا دور آپ تک وقت پر نہیں پہنچ پاتا ہے۔ لیکن بہت جلد یہ انتظامی مسائل بھی حل ہوجائیں گے چنانچہ پرچہ آپ کو پابندی کے ساتھ وقت پر مل جایا کرے گا۔ اس سلسلے میں ہمارے قارئین اور معاونین کو جو زحمتِ انتظار اٹھانا پڑتی ہے، ہم اس کے لیے بھی معذرت خواہ ہیں۔

ہم یہاں یہ بھی واضح کردینا چاہتے ہیں کہ نیا دور کسی ادبی رُجحان یا تحریک کا علمبردار نہیں ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ شعر وادب کے تمام رنگ وآہنگ اور تمام رجحانات کی اس میں عکاسی ہو چنانچہ اس میں کلاسیکی مزاج، ترقی پسند انداز فکر اور جدید رجحان سبھی طرح کی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔ اور اس سلسلے میں صرف فنی اور تخلیقی معیاروں کو ہی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ نئے قلم کاروں کی فنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کو بھی ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہر شمارے میں آپ کو نئے نام ضرور ملیں گے۔

شین قاف

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
پروفیسر شعبۂ اردو
سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

مرزا شوق لکھنوی

اس وقت راقم حروف کے پیش نظر مرزا شوق لکھنوی کی مثنویات ہیں، جو مطبع نول کشور لکھنؤ میں اپریل ۱۸۷۱ء میں چھپی تھیں۔ چاروں مثنویاں ایک ہی جلد میں مجلد ہیں اور یہ جلد ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود ہے۔ فریب عشق کے خاتمے میں صفحہ ۱۰۰ میں عبارت ذیل بھی درج ہے اور یہ منشی محمود علی صاحب تخلص افسر کی ہے:

" قابلِ مدح وہ معشوقِ حقیقی رنگین مزاج ہے جس نے گل رخوں کے حسن سے فریب عشق کا دام بچھایا اور بہار عشق سے گلستانِ عالم کو سرسبز و شاداب فرمایا زہر عشق اس کی محفل میں آبِ حیات ہے۔ لذتِ عشق رشکِ حلاوت ہے، شاخ نبات ہے۔ معشوق پن میں یہ عاشق مزاجی کا تقاضہ ہے کہ وہ جمیل حسن احمدی کا شیدا ہے سبحان اللہ حسن مصداق جمیل عشق پر نور ہے۔ یہ صلِ علیٰ وہ نور، علیٰ نور ہے۔ یہ قصۂ طول ہے۔ سخن آرائی فضول ہے۔ اب مطلب کا بیان ہے عشقِ مجازی کی داستان ہے۔ بہارِ عشق، لذتِ عشق، فریبِ عشق، زہر عشق کا مطالعہ کیجیے۔ اس رباعی کے پردے میں نیرنگ جمال حقیقی کا مشاہدہ کیجیے۔ واقع میں یہ محبت کا مجموعہ ہے حسن و عشق کا خاتمہ ہے جکیم نواب مرزا صاحب لکھنوی شوق تخلص نے تصنیف کیا ہے۔ عاشق مزاجوں کے اہتمام سے مطبع نولکشور واقع لکھنؤ میں اپریل ۱۸۷۱ء مطابق صفر ۱۲۸۸ ہجری دوبارہ چھپا ہے۔"

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد میں زہر عشق کا ایک اور مطبوعہ نسخہ ہے جو ۱۹۲۰ء میں ڈپٹی کمشنر صاحب ضلع ہردوئی کی اجازت اور محمد فہیم خاں تاجر کتب کی فرمائش سے محمد عبدالباقی خلف مولانا مولوی عبدالعلی صاحب آسی نے مطبع اصح المطابع آسی پریس واقع لکھنو میں شائع کیا تھا۔ دیباچہ میں محمد فہیم خان صاحب لکھتے ہیں:

" مثنوی زہر عشق کے مختلف ایڈیشن ہمارے یہاں سے نکل چکے ہیں لیکن یہ اخیری اور سب سے اچھا خوش نما ایڈیشن نہایت آب و تاب کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں اس وجہ سے پیش کیا جاتا ہے کہ ہم کو آئندہ اس خدمت کی تکلیف نہ دی جائے گی اور ہماری لٹریری خدمت کو استحسان اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مثنوی زہر عشق کوئی نئی مثنوی نہیں ہے بلکہ شوق مرحوم کی قدیم مثنوی ہے۔ اس کے مصنف حکیم تصدق حسین خاں ہیں۔ نواب مرزا عرف سے مرزا آغا علی خاں لکھنوی ان کے والد کا نام تھا اور حضرت خواجہ حیدر علی صاحب آتش مرحوم سے آپ اصلاح لیتے تھے۔ شوق مرحوم کی دیگر مثنویاں یعنی بہار عشق، فریب عشق، لذتِ عشق ان کی تصنیف سے ہیں۔"

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ چاروں مثنویاں مطبع نول کشور میں پہلی مرتبہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) اور دوسری مرتبہ ۱۲۸۸ھ (۷۱-۱۸ء) میں شوق کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں۔ چونکہ چاروں مثنویاں ایک ہی جلد میں "مثنویاتِ شوق"

کے عنوان سے چھپی ہیں اس لیے حالی (مقدمہ شعر وشاعری) سید امداد امام اثر (کاشف الحقائق) سرراس مسعود (انتخاب زریں) علامہ دتاتریہ کیفی (خم خانۂ جاوید) خواجہ احمد فاروقی (مرزا شوق لکھنوی) مجنوں گورکھپوری (دیباچہ زہر عشق) اور فراق گورکھپوری (اردو کی عشقیہ شاعری) وغیرہ نے غلطی سے مثنوی لذت عشق کو شوق کی تصنیف قرار دیا ہے۔ تعجب اس بات پر ہورہا ہے کہ ناصر لکھنوی نے بھی خوش معرکۂ زیبا (نسخۂ پٹنہ) میں اسے شوق کی مثنوی بتایا ہے۔ لذت عشق دراصل مرزا شوق کے بھانجے آغا حسن تخلص نظم کی تصنیف ہے۔ راقم حروف کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ اس کے آخر میں "نظم" تخلص موجود ہے۔ یہ تخلص مطبع نول کشور کے نسخے میں بھی اس طرح درج ہے ؎

کرے نظم اب یہ کہاں تک بیاں
ہے کوتاہ عمر اور بڑی داستاں

یہ شعر مطبوعہ نسخے میں بھی موجود ہے۔

آج سے کوئی تیس تبیس سال قبل عطاء اللہ پالوی کی کتاب "تذکرۂ شوق" مکتبۂ جدید لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں بھی شوق کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے ہیں۔ شوق کا ذکر جن تذکروں میں ملتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا — از ناصر لکھنوی — ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء)
۲۔ سراپا سخن — از محسن لکھنوی — ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء)
۳۔ سخن شعراء — از عبدالغفور نساخ — ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء)
۴۔ انتخاب زریں — از سرراس مسعود — ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء)
۵۔ قاموس المشاہیر — از نظامی بدایونی — ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴ء)
۶۔ خم خانۂ جاوید (جلد پنجم) — از کیفی دہلوی — ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء)

شوق کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ بقول عطاء اللہ پالوی اودھ اخبار مطبع نول کشور کے مطابق مرزا شوق نے ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ مطابق ۳۰ جون ۱۸۷۱ء بروز جمعہ لکھنؤ میں بہ عمر ۹۱ سال انتقال کیا۔ اس حساب سے ان کی ولادت ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ ان کا نام تصدق حسین تھا اور ایرانی مغل تھے۔ نواب مرزا کے عرف سے مشہور تھے۔ کچھ لوگ ان کو حکیم نواب مرزا بھی کہتے ہیں۔ ان کا خاندان حکمت میں بہت ہی مشہور تھا۔

ان کے والد آغا علی خاں اور چچا مرزا علی خاں لکھنؤ کے مشہور اطباء میں شمار کیے جاتے تھے۔ حکیم مرزا علی خاں شاہان اودھ کے دربار میں بڑے مرتبے پر فائز تھے اور انھیں حکیم الملک کا خطاب بھی حاصل تھا۔ ان کے بعد اس عہدے پر حکیم مسیح الدولہ بہادر کو جگہ ملی اور وہ اس عہدے پر مدت العمر قائم رہے۔

شوق شکلاً بہت وجیہ واقع ہوئے تھے۔ بھرے بھرے گال، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، سرخ و سپید رنگ، کشادہ سینہ غرض اچھے خد و خال، بلند قامت اور دہرے جسم کے بزرگ تھے۔ جوانی میں شہر کے خوبصورت لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پیرانہ سالی میں آثار جمال موجود تھے، البتہ کمر کسی قدر جھک گئی تھی۔ گرمیوں میں سر پر چکن کی چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے اور اس پر جالی کا رومال ہوتا تھا۔ اور جاڑوں میں یہ ٹوپی شال کی ہوتی تھی جس پر رو پہلی فیتوں کا کام ہوتا تھا اور اس پر شالی رومال خواہ دوشالہ اوڑھتے تھے۔ پاؤں میں برابر زرد مخملی گھیتلا جوتا ہوتا تھا جب یہ مخملی جوتا کمیاب ہوگیا تو زرد مخملی زیر پائی پہننے لگے تھے۔ سفید نین سکھ اور زیادہ تر آدھے گلبدن کا پاجامہ پہنتے تھے۔ جاڑوں میں روئی دار دگلہ سوزنی کا خواہ گرنٹ یا پاپلین کا پہنتے تھے اور گرمیوں میں باریک ململ یا شربتی کا انگرکھا جس میں دردامن گوٹ لگی ہوتی تھی۔ کرتا پہننا اس زمانے میں معیوب تھا۔ بنیائن اس عہد تک رائج نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کبھی خاص مواقع پر نیم آستین شلوکہ جالی کے کپڑے کا، چکن یا کسی سوئی کا کام، انگرکھے کے نیچے پہنتے تھے۔

شوق وکٹوریہ اسٹریٹ کے پرانے محلے بزازہ میں رہتے تھے۔ اس محلہ میں شیعہ کالج اور ناظم صاحب کا امام باڑہ بھی ہے۔ بزازہ سے متصل نخاس بھی ہے۔ یہ سڑک دو میل سے زائد طویل ہے اور تال کٹورہ کی کربلا پر ختم ہوتی ہے۔ اس علاقہ میں زیادہ تر شیعہ لوگ رہتے ہیں۔ شوق بھی مذہباً شیعہ تھے۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں اس عقیدے کا اظہار بھی کیا ہے۔ بہار عشق میں حمد و نعت کے بعد کہتے ہیں ؎

ہے علی نے وہ مرتبہ پایا — ہل اتیٰ جس کی شان میں آیا
کیا بشر پھر کرے ثنائے علی — مدح جب خود کرے خدائے علی
خاتم الانبیاء کا نائب ہے — بخدا مظہر العجائب ہے
بعد حیدر کے اور ہیں جو امام — بخدا نور کبریا ہیں تمام

کوئی ان میں نہیں علی سے جُدا
تا بہ مہدی ہیں سب امام ہُدا

بقول عطاء اللہ پالوی شوق نے ابتداءً گھر پر تعلیم حاصل کی اس کے بعد اپنے شوق سے تمام علوم متداولہ حاصل کیے تھے۔ یہاں تک کہ حکمت بھی پڑھی تھی اور دیگر مروجہ فنون مختلفہ میں بھی ان کا ذوق بہت اچھا تھا۔ وہ فطرتاً خوش اخلاق، خوددار، غیرت مند، حساس اور شریف النفس اور طبعاً بہت ہی بذلہ سنج، خوش مذاق اور ظریف تھے۔ علم مجلس میں طاق اور لطیفہ گوئی میں شاق تھے جس کی بنا پر متوسط طبقے کی صف اعلیٰ اور ارکانِ شہر میں شمار کیے جاتے تھے۔ اعلیٰ سوسائٹی کے ممبر تھے اس لیے کوئی محفل کوئی مجلس اور کوئی مجمع شرفائے شہر کا ایسا نہ تھا جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو۔ اور اندازہ ہے کہ بیگمات لکھنؤ بھی ان سے خوب واقف تھیں۔ کیونکہ جس وقت فریب عشق کی ہیروئن نے نام سُنا تو فوراً کہا ؎

اے لو! میں بھی کہوں سبب کیا ہے
ارے! تو ہی "نواب مرزا" ہے

اک ہی مرشد ہو تم قصور معاف
سُن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف

ذکر تیرا تو ہر بیان میں ہے
تو تو ضرب المثل جہان میں ہے

شوق صاحبِ ثروت اور آسودہ حال تھے۔ حکمت بھی پڑھی تھی۔ فریب عشق میں کہتے ہیں ؎

زر دیا تھا خدا نے کثرت سے
مالِ دُنیا ملا تھا حکمت سے

خوش گزرتے تھے اس طرح ایام
عیش رہتا تھا صبح سے تا شام

شوق فطری شاعر تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی تھیں۔ افسوس کہ یہ غزلیں اب نہیں مل پا رہی ہیں۔ "سراپا سخن" میں ان کی یہ غزل ملتی ہے ؎

خوش چشم ہے تجھ سے زمانے کی لڑی آنکھ
کس کس کی تری آنکھ کے اوپر نہ پڑی آنکھ

جب آنکھ سے اس ترکِ ستم گر کے لڑی آنکھ
نرگس پہ پڑی آنکھ نہ آہو پہ پڑی آنکھ

چیتے کی کمر سے کمرِ یار ہے نازک
اور دیدۂ آہوئے حرم سے ہے بڑی آنکھ

کیا آئینے کا منھ ہے کہ ہو اس کے مقابل
فولاد بھی ہو نرم جو دکھلائے کڑی آنکھ

گل برگ ہیں لب، سیب ذقن بال ہیں سنبل
چھوٹا ہے دہن غنچۂ نرگس سے بڑی آنکھ

بے یار گیا ہوں جو کبھی سیرِ چمن کو
کانٹا سا چبھا دل میں اگر گُل پہ پڑی آنکھ

جل جل کے دُھواں نکلا ہے پہروں مرے دل سے
زلفوں کے تصور میں جو سنبل پہ پڑی آنکھ

وہ بھی ہے کوئی حُسن جسے صُورتِ تصویر
حیراں نہ رہی دیکھ کے دو چار گھڑی آنکھ

دم لینے کی بھی رونے سے فرصت نہیں ملتی
دیکھا تجھے کیا یار مصیبت میں پڑی آنکھ

ہرگز نہ کرے پھر گلِ سوسن کا نظارہ
اے حور جو دیکھے تری مِسّی کی دھڑی آنکھ

نالے جو ہوئے کم تو ہوئی شدّتِ گریہ
صحت ہوئی گر دل کو تو بیمار پڑی آنکھ

صورت جو تری صانعِ قدرت نے بنائی
یاقوت کے لب رکھے تو نیلم کی جڑی آنکھ

ہے حُسنِ خداداد کی اک یہ بھی کرامات
دکھلائی ترے چھوٹے سے سن میں یہ بڑی آنکھ

منظور تھا اے حور نہ دیکھوں تجھے لیکن
انسان جو تھا رہ نہ سکا جا ہی پڑی آنکھ

دیکھا نہ کرو میری طرف آنکھ دبا کر
ناقص ہوا چہرہ جو ہوئی چھوٹی بڑی آنکھ

اک ایک سے دلچسپ ہے جو عضوِ بدن ہے

رہ رہ گئی سہروں وہیں جس جا پہ پڑی آنکھ
نظارہ کیا شوقؔ نے اس رشکِ چشم کا جب سے
نرگس پہ پڑی آنکھ نہ آہو پہ پڑی آنکھ

شوقؔ کی مثنویات فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق تینوں میں سے کسی کا سالِ تصنیف بہ تحقیق معلوم نہیں ہوسکا۔ جناب عطاء اللہ پالوی صاحب نے ان کا سالِ تصنیف اس طرح درج کیا ہے :

(۱) فریبِ عشق ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۶ء) اور ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) کے درمیان
(۲) بہارِ عشق ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) اور ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) ״
(۳) زہرِ عشق ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) اور ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) ״

ذیل میں ان تینوں مثنویوں پر ایک اجمالی نظر ڈالی جاتی ہے :

فریبِ عشق

فریبِ عشق کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوقؔ کی پہلی تصنیف ہے اس میں کسی بادشاہ یا رئیس کی تعریف نہیں کی گئی ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی عہد امجد علی شاہ بادشاہِ اودھ (۱۲۵۸–۱۲۶۳ھ) میں لکھی گئی ہے۔ حمد و نعت اور منقبت امیر المومنین علی ابن طالب کے بعد شاعر نے معاملاتِ عشق کے سلسلے میں اپنے معاشقے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ذیل کے اشعار قابلِ غور ہیں ؎

مدحِ حیدر نہیں بشر کی مجال
اب سنو عشقِ جاں گداز کا حال

داغِ الفت ہر اک کے دل میں ہے
عشق انساں کے آب و گِل میں ہے

اس میں ڈوبا ہوا ہے سر تا سر
خالی اس سے نہیں ہے کوئی بشر

میں بھی تھا کم سنی سے عاشق تن
پائی طفلی میں کھیلنے کو ہرن

دل سے چالاکی اس کی بھاتی تھی
پیاری آنکھوں پہ جان جاتی تھی

کھیلتا تھا اسی سے میں غمگیں
کوئی بھولی ہوتی تھی جو حسیں

دیکھ کر پھر یہ داں سے ٹلتا تھا
اچھی صورت پہ دم نکلتا تھا

رفتہ رفتہ جو میں جوان ہوا
اور ہی اور دل میں دھیان ہوا

زر خدا نے دیا تھا کثرت سے
مالِ دنیا ملا تھا حکمت سے

خوش گزرتے تھے اس طرح ایّام
عیش رہتا تھا صبح سے تا شام

جمع رہتے تھے بزم میں وہ حسیں
نہ ہوئے ہیں نہ ہوئیں گے جو کہیں

خوبرو کوئی نازنین کوئی
مہروش کوئی مہ جبین کوئی

شوخ چالاک خوش مزاج ذہین
سن جوانی کا سب کے سب شوقین

خوش نما خوش مزاج خوش اسلوب
ایک ایک اپنی طرز پر محبوب

عاشقی کے فنون سے ماہر
سب کے سب خوش جمال خوش ظاہر

آشنا دوست سب کے سب ہمراز
خوش بیاں کوئی، کوئی خوش آواز

ایک دن سیر کو اٹھے ناگاہ
کربلا پہنچے ہو کے ہم درگاہ

خیمہ استادہ ایک نظر آیا
میں ٹہلتا ہوا ادھر آیا

دیکھا اس میں ہے ایک مہ پارہ
خیمہ روشن ہے حسن سے سارا

بیٹھی ہے وہ قریب چلمن کے
باہر آتا ہے نور چھن چھن کے
نورِ حسن وجمال سے اس کے
لَو نکلتی ہے گال سے اس کے
ہنس کے جس سمت آنکھ پھرتی تھی
جانِ عاشق پہ برق گرتی تھی

بہارِ عشق

پالوی صاحب اور دوسرے لوگوں کا جنھوں نے اُردو مثنوی پر کام کیا ہے، یہ کہنا درست نہیں ہے کہ بہارِ عشق کا سب سے پہلا اور پُرانا ایڈیشن ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) کا ہے جو کان پور سے چھپا ہے۔ ہمارے پاس اس وقت بہارِ عشق کے تین مختلف ایڈیشن ہیں۔

نُسخۂ اوّل

(۱) قدیم ترین ایڈیشن مطبع "کثیر المنافع المسمیٰ بہ سلطان المطابع" یہ ۱۲۶۶ھ شہر شوال یعنی آج سے ۱۴۳ سال قبل چھپا تھا۔ یہ نسخہ نایاب ہے اور پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کا سائز ۶½"×۹" ہے فی صفحہ ۱۲ شعر، کل صفحات ۴۲۔ پہلا صفحہ کتاب کے سرورق سے شروع ہوتا ہے، جس کے بیچ میں مثنوی کا عنوان" بہارِ عشق "نمایاں ہے اس کے اوپر شاہی مہر ہے۔ "بہارِ عشق" کے نیچے گول دائرے میں یہ عبارت درج ہے:

"حسب الحکم مہر ذیل مطبع کثیر المنافع المسمیٰ سلطان المطابع"

دوسرے صفحے کے بیچ میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بعد مثنوی حمد و نعت کے ان اشعار سے شروع ہوتی ہے ؎

کس زباں سے کروں صفاتِ خدا
کیا بشر سمجھے کُنہِ ذاتِ خدا
جب نبیؐ یوں کہیں کہ اے مالک
ما عرفناک حق معرفتک
نعتِ احمدؐ لکھے گا کیا مدّاح
خلق کا جس کے ہو خدا مدّاح

ان اشعار کے بعد ائمہ معصومینؑ کی مدح میں ۵ شعر ہیں۔ پھر سلطان واجد علی شاہ کی تعریف میں ذیل کے اشعار درج ہیں ؎

نوبتِ مدحِ شاہ آئی ہے
اے قلم وقتِ جبہ سائی ہے
کر رقم اب دعائے شاہِ زماں
کہ وہ ہے ملکِ ہند کا سلطاں
آفتابِ سپہر جاہ و حشم
شاہ واجد علی شہِ عالم
خلق پر سایۂ الٰہی ہے
مالکِ تاج و تختِ شاہی ہے
اس کی طاعت کو حکم ہے آیا
ہے اولی الامر حق نے فرمایا
ہے بشر، پر خدا کی قدرت ہے
نیک سیرت ہے خوبصورت ہے
سرورِ خسروانِ عالم ہے
سچ تو یہ ہے کہ جانِ عالم ہے

مدحِ سلطانِ عالم کے بعد شوق اپنی داستانِ عشق یوں بیان کرتے ہیں ؎

اب سنیں حالِ عشقِ خانہ خراب
جتنے عاشق مزاج ہیں احباب
نامِ اُلفت سے ہم نہ تھے آگاہ
کسی یوسف کی تھی نہ ہرگز چاہ
عیش و عشرت سے کٹتے تھے اوقات
چہچوں میں گزرتے تھے دن رات
عشق کا سُنتے تھے نہ افسانہ
شمع رویوں پہ تھے نہ پروانہ
جان دیتے نہ تھے کسی گل پر
ہنستے تھے نالہائے بلبل پر

اس طرح شاعر نے کیفیاتِ عشق کے سلسلے میں متعدد اشعار لکھے ہیں۔ آخر وہ بھی کسی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوتا ہے۔ دیکھیے اس ماہ لقا

چندے آفتاب، چندے ماہتاب کا سراپا کس طرح کھینچتے ہیں ؎

ایک دن جو برائے سیر اٹھا
دیکھی کوٹھے پہ ایک ماہ لقا!
بام روشن تھا طور کی صورت
سر سے پا تک تھی نور کی صورت
حسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند
چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
گل سے رخسار گول گول بدن
گال جس طرح قمقمے روشن
جلوۂ حسن رشکِ شعلۂ طور
چشم بد دور آنکھیں موتی چور
رخ پہ وہ بکھری بکھری زلف کے بال
رگِ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال
بے مسّی کے وہ دانت رشکِ گہر
جانِ عاشق نثار ہو جس پر
لب وہ نازک کہ جان دے دیجے
دہن ایسا کہ چھیاں لیجے
ناک میں نیم کا فقط تنکا
شوخی چالاکی مقتضیٰ سن کا
آستینوں کی وہ پھنسی کرتی
جسم میں وہ شباب کی پھرتی
قد میں آثار سب قیامت کے
گوری گردن میں طوق منت کے
رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم
جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم
عکسِ رخ موتیوں کے دانوں میں
بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رگِ گل سے کمر لچکتی ہوئی
چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

سرو سا قد تو گل سے رخسارے
شانے بازو بھرے بھرے سارے
کیا خداداد حسن پایا تھا
آپ اللہ نے بنایا تھا

معشوق کا یہ حسنِ خداداد دیکھ کر عاشق بے چارہ غش کر گیا۔ اس کے دوست احباب یہ حال دیکھ کر اس کے شباب پر رنج کرنے لگے۔ اتنے میں خویش و اقارب بھی آ گئے اور اس کی تجہیز و تکفین کے بارے میں سوچنے لگے ؎

اقربا دوست جان کھونے لگے
غیر بے اختیار رونے لگے
سب میں آخر یہ مشورہ ٹھہرا
کہ یہ مہماں ہے کوئی دم کا
جلد خاکِ شفا نکال رکھو
کفنِ کربلا نکال رکھو
آدمی بھیجو گورکن کو بلاؤ
جلد تابوت و شامیانہ منگاؤ
سب نے رو رو کے یہ کہا جس دم
ہوا کہرام پڑ گیا ماتم
شورِ ماتم سے مجھ کو آیا ہوش
پوچھا سب سے یہ کیا ہے جوش و خروش

"بہارِ عشق" کا پہلا ایڈیشن (۱۲۶۶ ہجری) ص۱۴ میں ذیل کے اشعار پر ختم ہوتا ہے ؎

کیسی قسمت پلٹ گئی ہے ہے
ناک کٹنے میں کٹ گئی ہے ہے
ہے یہ سب تیرھویں صدی کا اثر
کیا پڑے ہیں زمانے پر پتھر
کر کے آپس میں اس طرح کے کلام
بھیجے شادی کے پھر پیام و سلام
تھی جو قسمت میں ہونی آبادی
ہو گئی دھوم دھام سے شادی

اس کے بعد اسی صفحہ ۱۴۱ میں نثر مصنف ہے۔ بعد کے نسخوں میں
شوق کا یہ نمونۂ نثر نہیں ملتا ہے :-

"نثر مصنف"

"اس ذرۂ بے مقدار کو منظور یہ تھا کہ محاورات صاحبانِ محل اور نوچندی کے لوگوں کے کچھ بیان کرے۔ لہٰذا یہ مثنوی اسی واسطے کہی اور الفاظ غلط کہ ان لوگوں کے محاورات میں جاری تھے، موزوں کیے اور موافق قول اساتذہ کے ان کو صحیح سمجھ کر جاری رکھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ لفظ منحصر کو اگر ان کے محاورات میں لکھے تو منتصر لکھے بلکہ اگر منحصر لکھے تو غلط ہے۔ لہٰذا اربابِ فہم و کمال پر پوشیدہ و مخفی نہ رہے کہ یہ حقیر بھی اس مثنوی میں جابجا موافق اقوال اساتذہ کے عمل میں لایا اور ان کے الفاظ غلط کو صحیح جان کر موزوں کیا اور علاوہ اس کے جو غلطی ہوئی ہو معاف فرمائیں۔"

اس "نثر مصنف" کے بعد مطبع کی طرف سے ص۱۴۲ میں "نثر خاتمہ" الفاظِ ذیل میں درج ہے :-

"نثر خاتمہ"

"الحمدللہ یہ نسخہ معجون محبت، دافع خفقان عاشقان اور مرہم زخم داغ دلِ پریشان، منظومہ حکیم ارسطوئے زمان افلاطونِ دوران کہ نام نامی اور اسم گرامی تصدق حسین خان اور عرف سامی حکیم نواب مرزا صاحب شاعر شیریں زبان سر دفتر سخنورانِ جہان، طوطی ہندوستان، بلبل خوش الحان نے حسب استدعائے دوستان اور بہ فرمائش عمدۃ الاکابر، نواب ابو تراب خان صاحب بہادر دام اقبالہ کے بحر تفکر میں غواصی کر کے اس دُرِ شاہوار اور گوہر آبدار کو رشتۂ نظم میں منسلک کیا اور بہارِ عشق نام رکھا۔ اگر چشم انصاف سے بغور سیر کیجیے تو حق یوں ہے کہ ابتدائے اُردوئے معلیٰ سے آج تک ایسی نظم مسلسل شعرائے سابق و حال کی نظر سے بہت کم گزری ہوگی اور کسی نے ایسے محاورات مستوراتِ محل کے بایں لطافت و فصاحت کبھی نہ سُنے ہوں گے۔ حسب فرمان واجب الاذعان

نواب صاحب ممدوح یہ نسخۂ حیرت افزا
بیچ شہر شوال ۱۲۶۶ھ کے قالب طبع میں آیا

نسخۂ دوم

راقم حروف کی نظر سے مثنوی بہار عشق کا وہ نسخہ بھی گزرا ہے جو مطبع محمدی کانپور میں ۱۲۷۸ھ میں چھپا تھا۔ یہ نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ اس کے آخر میں اصل قصے کے خاتمے پر "ترغیب عشق حقیقی" کے ۲۳ اشعار ہیں جو مرزا شوق نے بعد کو بڑھائے تھے اور جو پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۲۶۶ھ میں نہیں ہیں۔ ذیل میں چند شعر درج کیے جاتے ہیں :-

اب سنیں صاحبانِ عقل و شعور
ہے یہ دُنیا تمام مکر اور زور

شہد ظاہر میں زہر اندر ہے
جس قدر اس سے بھاگے بہتر ہے

صاحب عقل کو نہیں ہے زیب
کہ اٹھائے جہاں میں رہ کے فریب

سب یہ دُنیا سرائے فانی ہے
عشقِ معبود جاودانی ہے

کہتے ہیں صوفیانِ صافی دل
کہ ہے عشقِ خدا بہت مشکل

اب یہ لازم ہے جو کہ ہے انساں
ترکِ دُنیا کرے بہر عنواں

کوئی الفت نہ بے وفا سے کرے
عشق کرنا ہے تو خدا سے کرے

چار دن کی یہ زندگانی ہے
جو ہے اس کے سوا وہ فانی ہے

ہے وہ مستجمع جمیع صفات
لائق سجدہ ہے اسی کی ذات

وہی اوّل میں ہے وہی آخر

وہی باطن میں ہے وہی ظاہر
پردے اُٹھ جائیں جب جُدائی کے
حال اس دم کھُلیں خُدائی کے

نسخۂ سوم

بہارِ عشق کا تیسرا ایڈیشن مطبع گلزارِ اودھ میں ربیع الاوّل ۱۲۸۳ھ کو شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بھی اب مثل اول و دوم کے نایاب ہے اور پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس نسخے میں کل تمیش صفحات ہیں۔ ہر صفحے میں ۵۰ شعر ہیں۔ نسخے کی خاص بات یہ ہے کہ باتصویر ہے۔ سرورق پر یہ عبارت ہے:-

"بہارِ عشق مع تصویر"

" در مطبع گلزارِ اودھ لکھنؤ باہتمام خدابخش خان بہ سالہ تازہ یافت"۔

آخری صفحہ میں "ترغیب عشق حقیقی" کے اشعار کے بعد ذیل کا خاتمہ درج ہے:

" الحمدللہ والمنۃ کہ ان دنوں مثنوی بہارِ عشق تصنیف بلبل شیوا زبان طوطی ہندوستان، شاعر یکتا حکیم نواب مرزا حسب فرمائش محمد عبدالستار خان کارندۂ محمد عبدالرحمٰن خان صاحب مہتمم .... ربیع الاول ۸۳ ۱۲ ہجری کو مطبع گلزارِ اودھ لکھنؤ باہتمام خدابخش خان میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر پسندِ خاطرِ نازک خیالان باریک بین ہوئے۔ فقط ۵ "

اس نسخہ میں نسخۂ اوّل کی طرح غلطیاں نہیں ہیں، اور غلطیوں سے پاک وصاف ہے۔ اس کی ابتدا میں ایک سادہ ورق پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم کا ایک نوٹ بھی درج ہے جو انھوں نے ۲۲ رجون ۴۳ ۱۹ ء کو اپنے دستخط کے ساتھ لکھا تھا اور وہ یہ ہے:-

" میں نے مثنوی بہارِ عشق کا وہ نسخہ عبدالباری صاحب آسی کے پاس دیکھا ہے جو مطبع محمدی کان پور میں ۱۲۶۸ھ میں چھپا تھا۔ اس میں اصل قصے کے خاتمے پر "ترغیب عشق حقیقی" کے عنوان سے وہ ابیات درج ہیں جو اس نسخے کے آخر میں بھی موجود ہیں۔ اس نسخے کے خاتمے کی نثر سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے وہ اشعار بعد کو بڑھا دیئے تھے

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ میرے پاس اس مثنوی کا وہ نسخہ جو پہلی مرتبہ ۱۲۶۶ھ میں چھپا تھا، موجود ہے اور اس میں یہ ابیات درج نہیں ہیں"۔

بہارِ عشق کے دوسرے ایڈیشن کا ایک اچھا اور مکمل نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ سرورق کی عبارت اس طرح ہے:

" تصنیفات سخندانِ جادو بیان حکیم تصدق حسین خان ہے
یہ نظم نمونہ سحر کلام مثنوی زبان اردو
بہارِ عشق
نام۔ شوال کی بیسویں ۱۲۶۸ھ کو شہر کان پور چھپر محال سیتارام
ٹھٹھیرے کے مکان میں مالک مطبع محمدی حاجی حرمین ....
محمد حسین لکھنوی نے اپنے کارخانے میں چھاپی"۔

یہ نسخہ ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ فی صفحہ ۲۱ شعر ہیں۔ آخری صفحہ ۲۴ میں "نثر خاتمہ" کے تحت وہی عبارت حرف بہ حرف درج ہے جو نسخۂ اول کے خاتمے میں موجود ہے۔

مثنوی زہرِ عشق

اس میں ساڑھے پانچ سو سے زائد شعر ہیں، اور یہ شوق کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ایک مضمون "اردو کا بدنام شاعر" میں اس مثنوی کو شوق کا ماسٹر پیس کہا ہے۔ مولانا کا یہ مضمون قابلِ مطالعہ ہے۔ مثنوی زہرِ عشق کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اسی کی وجہ سے شوق کو حیاتِ جاودانی مل گئی ہے۔ انھوں نے اس میں بیگماتی زبان و محاورات جس اسلوب سے بیان کیے ہیں اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی ہے۔ حسین تشبیہات اور دلپذیر استعارات مثنوی کی جان ہیں۔ ابتدا سے آخر تک یہ شاہکار پاکیزگی اور بلند خیالی کا مخزن ہے۔ جن لوگوں نے مثنوی پر کام کیا ہے ان میں خواجہ احمد فاروقی بھی قابلِ ذکر ہیں۔ موصوف اور دوسرے لوگوں نے زہرِ عشق کی بنیاد اس شعر پر قائم کی ہے ؎

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی
دل دیا غم سے آشنائی کی

یہ شعر زہرِ عشق کے بازاری ایڈیشنوں میں آخر میں درج کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ ان اساتذہ نے کسی پُرانے نسخے کی تلاش نہیں کی۔ زہرِ عشق کے پُرانے ایڈیشنوں میں یہ شعر کہیں درج نہیں ہے۔ ہمارے پیشِ نظر اس مثنوی کا جو پرانا مطبوعہ نسخہ (مطبع نول کشور ۱۸۷۱ء) اور مخطوطہ ہے اس میں آخری شعر یہ ہیں۔

اقربا اس کے سب ہوئے دل شاد
آ کے دینے لگے مبارکباد
حاصل اتنا تھا کچھ کہانی سے
ہم رہے جیتے سخت جانی سے

دراصل اوپر کا یہ شعر الحاقی ہے اور جلال الدولہ نواب مرزا مہدی علی خاں تخلص مہدی کی غزل کا شعر ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ ریاض الفصحا[۲۸۵] میں مہدی کی یہ غزل درج کی ہے ؎

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی
دل دیا غم سے آشنائی کی
حسن و خوبی نے تیرے اے دلدار
سربسر ہم سے بے وفائی کی
عہد میں تیرے اب ہے دل شکنی
تو نے کیسی صنم خدائی کی
دل مرا لے کے یوں خراب کیا
واہ! کیا خوب دلربائی کی
آہ! مہدی سے اے صنم تو نے
وصل ہوتے ہی پھر جُدائی کی

زہرِ عشق میں بھی فریبِ عشق اور بہارِ عشق کی طرح محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے ہیرو خود مرزا شوق ہیں لیکن ہم نے ابھی کچھ دن ہوئے لکھنؤ میں معتبر آدمیوں سے یہ پہلی مرتبہ سنا ہے کہ شوق لکھنوی نے زہرِ عشق میں میر مونس کی داستانِ محبت کو بیان کیا ہے۔ اس بارے میں راقم حروف کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ فی الحال اس کی تحقیق جاری ہے۔

ذیل میں چند شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

دنیا کی بے ثباتی

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگِ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
ایک دنیا میں نام باقی ہے
تھے جو خود سر جہان میں مشہور
خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتا
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
بوئے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان
پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَان
موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

زندگی بے ثبات ہے اس میں
موت عین حیات ہے اس میں

ہیروئن کا جنازہ

شامیانہ نیا زری کا ہے
نیچے تابوت اس پری کا ہے
سہرا اس پر بندھا ہے اک زرتار
جیسے گلشن کی آخری ہو بہار
تھی پڑی اس پہ ایک چادرِ گل
جس سے خوشبو تھی راہ میں بکل
عود سوز آگے آگے روشن تھی
مرگئی پر بھی لاکھ جوبن تھی
بھیڑ تابوت کے تھی ایسے ساتھ
جیسے آئے کسی دُلہن کی برات
سب وضیع و شریف تھے ہمراہ
بھیڑ تھی اس قدر کہ بند تھی راہ
ساتھ تھے خویش و اقربا سارے
رو رہے تھے غریب بیچارے
پیچھے پیچھے تھا سب کے سوداگر
مُو پریشان اُداس خاک بسر
آگے آگے جنازہ جاتا تھا
غش اُسے ہر قدم پہ آتا تھا
ہاتھ تھامے تھے اقربا سارے
تا کسی جا پہ سر نہ دے مارے
حال اس درجہ ہو رہا تھا زبوں
بہتا جاتا تھا سر کے زخم سے خوں
سب فقیر و امیر روتے تھے
دیکھ کر راہ گیر روتے تھے
پیچھے سب کے فینس میں تھی مادر
کہتی جاتی تھی اس طرح رو کر

تیری میت پہ ہوگئی میں نثار
کم سخن اے میری غیرت دار
دل پہ جو گزری کچھ بیان نہ کی
کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
کچھ نہیں ان کی اب خبر تم کو
کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں
بیٹا اس ماں کو کس پہ چھوڑ گئیں
تازہ پیدا جگر پہ داغ ہوا
گھر مرا آج بے چراغ ہوا
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے
جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
زہر دے دے کوئی میں کھا جاؤں
یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں
داغ تیرا جگر جلاتا ہے
چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے
مٹ گیا لطف زندگانی کا
دل کو غم ہے تری جوانی کا
بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں
کوئی منت بڑھانے پائی نہ میں
تیری صورت کی ہوگئی قرباں
چلیں دُنیا سے کیسے پُر ارماں
ہوئیں کس بات پر خفا بولو
اماں واری ذرا جواب تو دو
بولتیں تم نہیں پکارے سے
اب جیوں گی میں کس سہارے سے
کیا فضا نے جگر پر داغ دیا
آج گھر میرا بے چراغ کیا
نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارمان

ہائے بیٹا : تم پڑھیں پروان
ایسی اس ماں سے ہوگئیں بےزار
لی نہ خدمت بھی پڑکے کچھ بیمار
نہ جیوں گی ترے فراق میں مَیں
دل تڑپتا ہے آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں
کس مصیبت میں پڑگئی بیٹا
کوکھ میری اُجڑگئی بیٹا
عمر کٹتی تھی ایسے صدمے بیں
ٹھوکریں تھیں بُری بڑھاپے میں

ب امداد امام صاحب اثر اپنی کتاب کاشف الحقائق میں لکھتے ہیں کہ :۔

" شوق لکھنوی نے چار مثنویاں تصنیف فرمائی ہیں مگر یہ سب مثنویاں پایۂ اخلاق سے گری ہوئی ہیں یہاں تک کہ حکم گورنمنٹ سے ان کی اشاعت روک دی گئی ہے ؟

جلال الدین زینبی (تاریخ مثنویات اردو) ، علامہ کیفی (خم خانۂ جاوید) ر سر رضا علی خاں (اعمال نامہ جلد اوّل صد ۴۴۶) لکھتے ہیں کہ شوق کی مثنویو ں واقعات وحالات بہت عُریاں ہیں اس لیے کل مثنویاں عریانیت کے بب ممنوع الاشاعت قرار دے دی گئی ہیں۔

بہار عشق اور فریب عشق اپنے زمانۂ تصنیف سے آج تک کبھی بھی ممنوع الاشاعت " نہ تھیں، البتہ زہر عشق کی عام اشاعت کچھ دنوں کے لیے انوناً ممنوع ضرور قرار دے دی گئی تھی۔ اس کی ممانعت اس کی عریانیت نہ تھی ر نہ اس کا پایۂ اخلاق سے گرا ہونا تھا ، بلکہ بقول پالوی صاحب اس کی وجہ رف شوق کے جذباتِ دلی کی وہ کسک ، تاثراتِ ذہنی کی وہ تڑپ اور واردا ت کی وہ ٹیس تھی جسے شوق نے اشعار کی صورت میں منتقل و متشکل کر دیا تھا ، اور جس کے دیکھنے پڑھنے اور سننے کی لوگ تاب نہ لاتے تھے۔ نچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں صحیح فرمایا ہے کہ :

" لکھنؤ میں جب شروع شروع تھیٹر کا رواج ہوا تو ایک کمپنی نے اس تماشے کو بھی اسٹیج کیا۔ پُرانے لوگوں سے یہ روایت سننے میں آئی ہے کہ جنازہ کا منظر اور اس کے پیچھے پیچھے غمزدہ والدین کا ماتم کرتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے چلنا جب دکھایا گیا تو تماشا گاہ ایک بزم عزا بن گئی ـــ ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں تو ہر طرف سے آرہی تھیں مگر بعض کو غش بھی آگئے اور ایک آدھ نے شاید خودکشی بھی ٹھان لی۔ اس پر تماشا دکھانا ممنوع کر دیا گیا اور کتاب کی اشاعت بھی عرصہ تک بند رہی ؟

راقم حروف ان دنوں مرزا شوق لکھنوی کی تینوں مثنویاں فریب عشق ، بہار عشق ، اور زہر عشق ترتیب دینے میں مصروف ہے۔ انشاءاللہ تینوں مثنویاں ایک ہی جلد میں منظر عام پر آئیں گی۔ **

جمیل مہدی کے اداریے .... صد ۱۵ کا بقیہ

آبادی ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد سے کہیں کم ہے لیکن اتنی بڑی اور عظیم الشان تعداد رکھنے کے باوجود اُن کی سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور روزگاری حالت اتنی دگرگوں اور خراب ہے کہ ان کے مقابلے میں سکھوں اور عیسائیوں کی حالت کہیں زیادہ بہتر ہے جو مسلمانوں کے عددی تناسب کے مقابلے میں مجموعی آبادی کا بالترتیب دو اعشاریہ پانچ (۲٫۵) اور ایک اعشاریہ پینسٹھ (۱٫۶۵) کا تناسب رکھتے ہیں ـــ اتنی بڑی تعداد نے جو عقائد اور تہذیبی پس منظر میں اتحاد کے ٹھوس اور بنیادی عناصر کی حامل بھی ہے، سارے ملک میں ایک منتشر اور غیر منظم بھیڑ کی صورت اختیار کر رکھی ہے تو اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ کوئی مشترک منزل، کوئی منفعتہ نصب العین اور کوئی مشترکہ مقصد اس کے سامنے نہیں ؟

میں نے جمیل مہدی کے صرف ایک ہی اداریے کو اتنی تفصیل سے (اگرچہ اسے میں مختصر ہی کہنے پر اصرار کروں گا) اظہار خیال کیا ہے لیکن ان دیگر اداریوں میں تاریخ کی سبق آموزی، حب الوطنی کے بدلتے معیار اور فرقہ وارانہ فسادات کا تجزیہ ـ اور بھی تفصیلی تجزیے کے متقاضی ہیں لیکن انھیں میں خود قارئین کے بھرپور مطالعے اور سنجیدہ فیصلے کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔

رام لعل
ڈی ۔ ۲۲۹ اندرا نگر، لکھنؤ

جمیل مہدی کے اداریے

اس مختصر سے تبصرے میں مجھے جمیل مہدی صاحب (مرحوم) کے ساتھ ہوئی اپنی اُن ملاقاتوں کا گوشوارہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے جو یقینی طور پر بے شمار ہیں۔ بعض نزاعی مسائل پر انھوں نے میرے ساتھ کہاں کہاں اختلاف کیا یا میری پُرزور حمایت کی، اس کی تفصیل میں جانا بھی اس لیے ممکن نہیں ہے کہ اُن کے وہ اداریے جو مجھ سے متعلق تھے میری فائیلوں میں دبے پڑے ہیں جنھیں ڈھونڈ نکالنا اس وقت بہت مشکل ہے ان کے اداریوں کا ایک جامع انتخاب بھی جو آل انڈیا میرا اکادمی کے زیرِ اہتمام کتابی صورت میں شائع کیا جا چکا ہے میرے سامنے نہیں ہے۔ لیکن چونکہ میرے پیشِ نظر اس وقت اُن کے بعض اداریوں کی تلخیص ہے جسے مذکورہ بالا ادارے نے ہی "مسلمان کیا کریں" کے عنوان سے شائع کیا تھا اور جس میں جمیل مہدی نے بعض اہم مسائل پر اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کیا تھا اسی کے بارے میں چند سطور لکھ کر میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں جو مجھے ہمہ وقت کچھ کہنے کے لیے ہمیشہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔

بطور صحافی جمیل مہدی کا مرتبہ میرے نزدیک مولانا ابوالکلام آزادؔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اور بعض دوسرے دانشوروں کے بعد خاصا اہم رہا ہے۔ جمیل مہدی صاحب کے بارے میں میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ ایک چھوٹے اخبار کے بڑے ایڈیٹر تھے۔ لیکن بعض کم تعداد میں چھپنے والے اور بظاہری شان و شکوہ سے عاری اخبار بھی محض اپنے اداریوں کی وجہ سے اہم تصوّر کئے جاتے رہے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان اخبارات کی فائلیں عرصہ دراز تک مختلف کتب خانوں اور ذاتی لائبریریوں میں محفوظ رکھی جاتی ہیں اور ان کے انتخابات بھی وقتاً فوقتاً شائع کر دیے جاتے ہیں۔ جمیل مہدی کے اداریوں کے مذکورہ بالا دو انتخابات کا ذکر تو میں کر ہی چکا ہوں۔ میں نے اُن کے اداریوں میں اٹھائے گئے بعض اہم مسائل کے اقتباسات کے حوالے سید میر قاسم (سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر) کی خود نوشت سوانح میں بھی جا بجا دیکھے تھے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے فکر و نظر کی اہمیت کا احساس اُس اعلیٰ سیاسی حلقے میں بھی کیا جاتا تھا جس سے وہ اکثر و بیشتر اختلاف بھی کرتے تھے۔

"مسلمان کیا کریں"۔ انتخاب میں کتاب کے عنوان کے ذیل میں لکھے گئے اداریے کے علاوہ نظریاتی عدم توازن کا پس منظر، خوابوں کی دنیا کا سفر، اسلامی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب، تقسیم ہند اور مسئلہ اقلیت، تاریخ کی سبق آموزی، حب الوطنی کے بدلتے معیار، فرقہ وارانہ فسادات کا تجزیہ، واضح نصب العین سے مسلح قومی سیاسی تنظیم (ضرورت اور امکانات) اور ایک مخلص کاوش جیسے اداریوں کا انتخاب اور اُن کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔

'تقسیم ہند اور مسئلہ اقلیت' کے باب میں انھوں نے مسلمانوں کے لیے جو راہِ عمل پیش کی ہے اس میں انھوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو سیاست اور سماج میں ایک باعزّت مقام حاصل کرنے کے لیے بڑی زبردست جدوجہد اور اپنے وجود کے تحفّظ کے لیے ایک عظیم اور منظم کوشش کرنی ہوگی اور اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے، جو تاریخ نے اُن پر مسلط کی ہے، اس درجہ فہم و فراست اور دانش و تدبیر سے کام لینا ہوگا جو انتھک محنت و مشقّت اور ٹھنڈے دل و دماغ کے بغیر ممکن نہیں۔

تقسیم کے بعد کے حالات کا تجزیہ ایک سے زائد مسلم رہنماؤں نے بارہا کیا ہے اور اُن میں بیشتر اس خیال کے حامی ہیں کہ تقسیم کے لیے اکثریت ہی ذمہ دار تھی۔ مولانا آزاد تک اپنی کتاب 'انڈیا ونس فریڈم' میں کانگریس کے بڑے رہنماؤں پر اس کی پوری ذمہ داری ڈال چکے ہیں۔ جمیل مہدی نے مسلمانوں

کی نئی نسل کے حوالے سے کہا ہے۔ (۵۵) "قدرتی طور پر اس منطق کا سہارا لیتی ہے کہ وہ اپنے آباواجداد کے جرائم کی پاداش میں خود پھانسی پر چڑھ جانے کو قطعی تیار نہیں ہے۔ ان ہی میں کچھ دانشور نوجوان تاریخی واقعات کے حوالوں کی بنیاد پر مسلم لیگ کے بجائے کانگریس کو بہ الفاظ دیگر مسلمانوں کے بجائے قومی قیادت پر تقسیم کی ذمہ داری ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس کی منظوری کے بغیر تقسیم کا مطالبہ منظور کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔"

یہ سارے مباحث اس "سرد جنگ" جیسی کیفیت سے نکلنے کے لیے اٹھائے گئے ہیں جو ہندوستانی معاشرے میں آزادی کے بعد ابھی تک موجود ہے۔ جمیل مہدی بھی اس کیفیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے۔ "ملک کی تقسیم کی وجہ سے نفسیاتی فضا مسلمانوں کے خلاف ہوگئی۔" وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا موازنہ بین الاقوامی صورت حال سے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "اگر وسیع تر تناظر میں دنیا کے نقشے پر نظر ڈالی جائے تو ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ کوئی انوکھا نہیں ہے۔ کم ہی ملک ایسے ہیں جہاں اقلیتوں کا یہ مسئلہ موجود نہیں ہے۔ امریکہ میں رنگ دار سیاہ فام اقلیت میں ہیں۔ روس اور چین میں مسلمان اقلیت میں ہیں ملیشیا میں چینی نسل کے لوگوں کے ساتھ یہی مسائل درپیش ہیں۔ نائجیریا میں مسلمانوں اور قبائلی عیسائیوں کے درمیان اکثریت اور اقلیت کی یہ کش مکش موجود ہے۔ سائپرس، فجی، فلپائن، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، ترکی اور دوسرے چھوٹے ممالک میں بھی یہ کش مکش پوری شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔"

انھوں نے آگے چل کر لکھا ہے۔ "وہاں کے لوگ برسوں سے محض دستوری ضمانت حاصل کرنے کے لیے ایسی شدید جاں کاہ اور حوصلہ آزما جدوجہد سے گذر رہے ہیں جن کا ہندوستان کی مسلم اقلیت تصور بھی نہیں کرسکتی۔ اس لیے ہندوستان میں دستور کی وہ لفظی ضمانت ہی، جسے مسلم رہنما ناکافی اور غیر موثر قرار دیتے ہیں، ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک نعمت نظر آتی ہے کہ انھیں روز اوّل سے ہی یہ درجہ حاصل ہے جس کے حصول کے لیے دنیا کے اکثر ملکوں کی اقلیتوں کو سیکڑوں برس طویل جدوجہد کرنی پڑی تھی۔"

جمہوریت کی طرفداری اور وفاداری میں جمیل مہدی کا یہ اظہار بے حد قابل تعریف اور قابل تقلید کہا جاسکتا ہے۔ مولانا آزاد نے بھی جمہوری رائے عامہ کا احترام کرنے اور اس کے فیصلوں کے آگے سر جھکانے پر خاص زور دیا تھا۔

جمیل مہدی نے مذکورہ بالا اداریے میں دنیا کے مختلف مذہبی گروہوں کے اعداد و شمار کے گوشوارے میں یہودیوں کی تعداد ایک کروڑ چالیس لاکھ لکھی ہے جو دنیا کی مجموعی آبادی کا اعشاریہ پانچ (۰.۵) ہے۔ اُن کے مقابلے میں مسلمان ۱۹۸۶ء کے عالمی تخمینہ کی بنیاد پر ایک ارب سے کچھ زیادہ ہیں جو دنیا کی چوتھائی آبادی سے کچھ اوپر ہے۔ یعنی اُن کا درجہ عیسائیوں اور بودھوں کے بعد تیسرا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "یہودی قوم نے صرف ایک یا ڈیڑھ صدی کی تعمیری جدوجہد اور انقلاب حال کی کوشش کے نتیجے میں سیاسی سطح پر اتنی قوت حاصل کرلی ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ایک ارب سے زیادہ مسلمان صرف پچیس لاکھ کی آبادی رکھنے والی اسرائیلی حکومت کا بال تک بیکا نہیں کرسکتے اور وہ عالم اسلام کے قلب میں خنجر کی صورت اپنی ریاست کے تحفظ میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ انھوں نے اپنے اصل رقبے سے سات گنا عرب سرزمین پر بھی طاقت کے ذریعے قبضہ کر رکھا ہے اور ساری دنیا کی کوشش اور مخالفت کے باوجود اس قبضہ سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں ہے۔"

ہندوستانی مسلمانوں نے موجودہ ہندوستان کو بنانے میں ہر میدان میں ایک قابل ذکر کردار نبھایا ہے۔ سیاست، سائنس، انڈسٹری، انتظامیہ، انجینئرنگ، آرٹ اور ادب، تعلیم، صحافت، فلمسازی، کھیل کود غرض کوئی ایسا شعبہ نہیں نظر آتا جہاں انھوں نے اپنی انمٹ چھاپ نہ چھوڑی ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اس کنٹری بیوشن (CONTRIBUTION) کو اس صورت میں ابھی تک کیوں تسلیم کیا جاتا کہ انھیں آزادی کے بعد کے قومی معاشرے میں ایک قابل احترام مقام حاصل ہوا۔ اس بارے میں جمیل مہدی مسلم طرز فکر ہی کو بنیاد بناکر ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ "اس (یہودی قوم) کے مقابلے میں ہندوستان کی صورت حال یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان ملک کی مجموعی آبادی کا تقریباً پندرہ فیصدی ہیں لیکن کثرت تعداد کے اعتبار سے وہ انڈونیشیا کے علاوہ دنیا کے ہر مسلم اکثریت رکھنے والے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کے مقابلے میں ایک جگہ آباد قوم کی حیثیت سے زیادہ ہیں۔ برطانیہ، جرمنی، مصر، ایران، ویت نام، کوریا، عراق، شام، سعودی عرب سوڈان، الجزائر، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ملیشیا کی مجموعی

(باقی صـ۱۳۱ پر)

دلکش آفریدی
باکواسٹریٹ، مرادآباد

شہرِ جگر

اک مغنی کے فسوں کار ترنم کا شباب
اک محقق کے خیالوں کی حسیں تر تحقیق
اک جواں سال مصور کا کوئی جاگتا خواب
یا کسی شاعرِ رُومان زدہ کی تخلیق

کتنے بانکوں کا سجیلوں کا جیالوں کا جہاں
کتنے پیغامبرِ علم و ہُنر کی بستی
گُل رخوں، غنچہ لبوں، زہرہ جمالوں کا جہاں
اہلِ دل اہلِ وفا اہلِ نظر کی بستی

امبا پرشاد کا گہوارۂ درسِ الفت
دُرگا دت جی کوی سمراٹ کے خوابوں کا وطن
ہے کوی راج ویاس اہلِ قلم کی جنّت
اور اختر کے خیالوں کا مہکتا گلشن

قاضی غفار سے ہم رُتبہ حالی کا وطن
بادشاہانِ غزل کیفؔ و قمرؔ کی دُنیا
نازشِ شعر و سخن بدرِ جلالی کا وطن
ہند کے حافظ و خیام جگرؔ کی دُنیا

مرحبا شہرِ تمنا یہ مُرادوں کا نگر
جس کے آغوش میں فردوس بداماں ہے حیات
جس کی ہر صبح چمن زاروں کی پُرنور سحر
الف لیلیٰ کی ہر اک رات ہے جسکی ہر رات

جگمگاتی ہوئی سڑکیں یہ دمکتے محلات
یہ دکانوں کی سجاوٹ یہ نظر کش بازار
ہر گلی کوچے میں ٹھہری ہوئی جلووں کی برات
ہر در و بام کے آغوش میں رقصیدہ بہار

ہر قدم جلوہ فگن لالہ نگاروں کے ہجوم
اور ہر گام پہ خوابوں کے حسیں رنگ محل
ذرّے ذرّے پہ محبت کے فسانے مرقوم
غنچے غنچے کے تکلّم میں صدا ریز غزل

رام گنگا کا لبِ شہر سُہانا منظر
جل پری جیسے ہو موجوں میں ترنم بہ کنار
جیسے رادھا کی صداؤں پہ لبِ جمنا پہ
زمزمہ بار ہوں گوپال کی مُرلی کے ملہار

چمنیوں سے یہ اُبلتا ہوا خمدار دُھواں
بال بکھرائے ہوئے کوئی حسینہ جیسے
بن برستی ہوئی گھنگھور گھٹاؤں کا سماں
خشک ایام میں ساون کا مہینہ جیسے

یہ حسیں شہر یہ گلزار یہ یُوپی کا جمال
رقص فرما ہے ترقی کی گزرگاہوں پر
اور پیتل کے سالہا سال فنکاروں کا کسب و کمال
جلوہ افروز ہے اس شہر کے چوراہوں پر

اک خوش ظرف کی صنعت کا یہ معراجِ کمال
ساری دنیا سے یہاں بنتے ہیں بہتر برتن
آج تک جن کی زمانے میں نہیں کوئی مثال
ہیں وہ مضبوط چمکدار حسیں تر برتن

کہتے ہیں سختِ دلِ شاہجہاں نے اے دوست
یہ حسیں شہر بصد شوق کیا تھا آباد
اب بھی سُنتے ہیں کہ دریا کے کنارے اے دوست
گشت کرتا ہے شبِ ماہ میں شہزادہ مُراد

مرحبا شہرِ تمنا یہ مُرادوں کا نگر
جس کے آغوش میں فردوس بداماں ہے حیات

**

ڈاکٹر سیّد سراج الاسلام
صدر شعبۂ اردو
راونشا کالج ۔ کٹک
(اڑیسہ)

خلیلُ الرّحمٰن اعظمی بحیثیت شاعر

خلیل الرحمٰن اعظمی کا شمار جدید ادب کی چند نمائندہ اور برگزیدہ شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ اعظمی کی ادبی شخصیت اور خدمات کے کئی واضح پہلو ہیں وہ بیک وقت ناقد بھی تھے اور شاعر بھی اور انھوں نے ان دونوں حیثیتوں سے بڑے اہم اور نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اور اُردو کے جدید ادب پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں اپنے انداز میں منفرد ہیں۔ ان کے شعر کی سادگی اور معصومیت اور نثر کا لوچ اور دل کشی ہمارے ادب میں خاصے کی چیزیں ہیں۔ اعظمی نے اپنے تنقیدی شعور اور تخلیقی بصیرت سے اردو ادب اور شاعری کو ایک نیا ذہن اور نئی روشنی دی اور اسے نئی سمتوں اور جہتوں سے آشنا کیا۔ وہ دراصل جدید ادب کے ایک پیش رو اور معمار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اُردو شاعری خصوصاً غزل میں ۱۹۶۰ء کے بعد جو نئے رجحانات ابھرے ان کی ابتدا اعظمی ہی کی غزلوں سے ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور تبصروں کے ذریعے ان رجحانات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا، اور اپنی شاعری کو ان رجحانات سے بڑی حد تک ہم آہنگ رکھا۔

اعظمی ایک منفرد شعری مزاج اور شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو نئی نسل کے شعراء کے جمگھٹ میں شریک نہیں کیا، بلکہ نئے انداز کی غزلیں اور نظمیں لکھتے ہوئے اپنے انفرادی مزاج اور لب و لہجہ کو برقرار رکھا۔ وہ ادب میں فیشن پرستی اور فارمولا بازی کے ہمیشہ مخالف رہے۔ اور ادیب کی شخصیت اور تجربات میں ہم آہنگی پر برابر زور دیتے رہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اعظمی ابتدا میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ مگر وہ ترقی پسندی کا زیادہ دور اور دیر تک ساتھ نہ دے سکے۔ ترقی پسندی کے نام پر جس نظریاتی گروہ بندی اور تنگ نظری کو رواج دینے کی کوشش کی گئی، اعظمی اسے برداشت نہ کر سکے۔ دراصل یہ چیزیں ان کی طبیعت کے اقتضا کے خلاف تھیں، اسی لیے ترقی پسندی ان کے ذہن اور مزاج کا جزو نہ بن سکی اور وہ جلد ہی اس کے خلاف بغاوت کر بیٹھے۔ اعظمی کی کتاب 'ترقی پسند ادبی تحریک' ترقی پسندی کے باب میں ان کا موقف واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ کتاب ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک بے لاگ اور معروضی جائزہ ہے جس میں ترقی پسندی کی پرکھ میں سیاسی نظریے کو کام میں لانے کے بجائے ادبی مطالعہ کی تکمیل پر اصل زور دیا گیا ہے اور اجتماعی ادب کے تصور سے اختلاف کرتے ہوئے ادبی تخلیق میں آزادیِ فکر و نظر سے کام لینے پر اصرار کیا گیا ہے۔ ترقی پسندی کے سلسلے میں اعظمی کے اس رویے اور نظریے نے انھیں ترقی پسند حلقوں میں بالکل ہی نامقبول بنا دیا۔

اعظمی ادب میں دراصل کسی نظریے اور ازم کی پابندی کے قائل نہ تھے ان کی نظر میں اصل اہمیت فن کار کی انفرادی نظر اور پرائیوٹ وژن کی ہے جس کے ذریعے ایک تخلیق کار اپنے منصب کی تکمیل کرتا ہے۔ اعظمی اگر ادب میں کسی ازم کے قائل کہے جا سکتے ہیں تو اسے لبرل ازم کا نام دیا جا سکتا ہے وہ ادبی ذہن، مزاج اور اظہار میں آزادی کے عنصر پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہ چیز انھیں کبھی کبھی ذہنی سطح پر تنہائی کے احساس سے دوچار کرتی ہے جو ہر سوچنے والے دماغ اور ہر حساس فن کار اور ادیب و شاعر کا مقدر ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو اعظمی کی شاعری میں جو درد و کرب اور بے چینی کا اظہار پایا جاتا ہے اس کا اصل محرک دراصل ان کا احساسِ تنہائی اور آزادیِ اظہار کی خواہش ہی ہے جس نے ان کے جذبات کی صداقت اور واقعیت سے مل کر ان کی شاعری میں غیر معمولی حسن اور دل کشی پیدا کر دی ہے۔

اعظمی کی شخصیت اور کارناموں کی دو بنیادی جہتیں ہیں تنقید نگاری اور شاعری ۔ اعظمی نے اپنی تنقیدی نگارشات کے ذریعے ادب کی جانچ میں جمالیاتی اور فنی معیاروں کو بنیادی اہمیت دی ہے ۔ اعظمی کی بحیثیت ایک تنقید نگار کی حیثیت سے مسلم ہے ۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا صحیح مقام اب تک متعین نہیں کیا جا سکا ۔ ایسا نہیں ہے کہ انھیں شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا ہو اور اردو شاعری کے کسی جائزے میں ان کا نام نہیں لیا جاتا ہو ۔ واقعہ یہ ہے کہ نئی نسل کے جن شعرا کو قابل ذکر سمجھا جاتا ہے ان میں اعظمی کا نام معروف اور نمایاں ہے ۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کے ساتھ اب تک پوری طرح انصاف نہیں کیا جا سکا ہے ۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کی شاعری ان کی تنقید نگاری کے بوجھ سے دب گئی ہو اور وہاں تک آسانی سے نگاہیں نہ پہنچ پاتی ہوں ۔ ایسے میں ضروری ہے کہ اعظمی کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور اس کی حقیقی قدر و قیمت متعین کی جائے ۔ اعظمی کی تنقید نگاری حقیقتاً ان کی شعر گوئی کے تقاضوں کی تکمیل کے طور پر وجود میں آئی اور ان کی شاعری کے تخلیقی محرکات اور شاعرانہ عمل کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہے ۔

اعظمی اپنی شاعری کو اسی لیے اہم قرار دیتے ہیں کہ اس میں ان کی شخصیت کے سوز و ساز اور درد و داغ کا بہترین اظہار ہوا ہے ۔ ان کی نظمیں اور غزلیں بقول نظیر صدیقی ان کے سوانح حیات کے مختلف ٹکڑے ہیں جنھیں انھوں نے بڑی خوبی سے محسوس پیکر عطا کر دیا ہے ۔ اور ان میں ایک تخلیقی شان پیدا کر دی ہے ۔ اعظمی خود اپنی شاعری کو اپنی روح کی دلدوز پکار اور آپ بیتی نیز مرثیہ خوانی سے تعبیر کرتے ہیں ۔ ان کے یہاں جذبات میں جو واقعیت اور صداقت کا پہلو ہے جس کی اساس ان کی نجی زندگی کے واردات و کوائف پر ہے اس کی مثال اردو شاعری میں کمیاب ہے ۔ اردو شاعری اور نثر کے اسلوب میں ان کے زمانے میں انقلاب آ چکا تھا ۔ مولانا محمد شفیع اس سے اچھی طرح واقف تھے ۔ مولانا محمد شفیع خلیل صاحب کے والد بزرگوار تھے ۔ یہ ایک ممتاز اور جید عالم دین تھے جنھوں نے اپنے علاقے میں مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے لیے انجمن اصلاح المسلمین کے نام سے ایک تنظیم قائم کی ۔ سرائے میر میں ایک عظیم الشان عربی درس گاہ مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد ڈالی جس کو اس زمانے کی ممتاز اور دینی شخصیتوں کا تعاون حاصل رہا ۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس کی خاص طور پر سرپرستی فرمائی آج یہ درس گاہ ایک اہم علمی اور دینی مرکز بن گئی ہے ۔ مولانا شفیع نے اپنے صاحبزادوں کو غالب کے خطوط ، محمد حسین آزاد ، نذیر احمد دہلوی ، سرسید احمد خاں ، حالی و شبلی کی تصنیفات پہلے پہل پڑھائیں ۔ خلیل صاحب نے مسدس حالی بھی پڑھی اور اس کا تقریباً نصف حصہ انھیں یاد تھا ۔ فارسی اور عربی کی تعلیم مولانا شفیع نے اپنے بچوں کو گھر ہی پر دلائی اور ادبی ذوق کو پروان چڑھایا ۔ یہ ہے خلیل الرحمن اعظمی کے خاندانی ماحول کی ہلکی سی جھلک جس میں ابتداءً ان کی پرورش و پرداخت ہوئی اور ان کے ذہنی و ادبی نشو و نما کی راہیں ہموار ہوئیں ۔

ان کی تعلیم ان کے گاؤں کے ایک مکتب میں شروع ہوئی جہاں انھیں قرآن پڑھانے بٹھا دیا گیا ، اور انھوں نے قلیل مدت میں قرآن ختم کر لیا ۔ انھیں ایک قریب کے گاؤں بنیاپارہ کے اسکول میں داخل کر دیا گیا ۔ وہ ہمیشہ اول درجے میں پاس ہوتے رہے ۔

۱۹۴۱ء میں انھوں نے شبلی کالج اعظم گڑھ میں داخلہ لے لیا ۔ اعظم گڑھ پہنچنے کے بعد انھیں دارالمصنفین سے استفادہ کا خاصا موقع ملا ۔ انھیں کھیل کود سے خاص دلچسپی نہ تھی اور ہمہ وقت کتابوں کی دنیا میں کھوئے رہتے تھے ۔ راشدہ خلیل جو مرحوم کی رفیق حیات ہیں ایک انٹرویو میں خلیل صاحب کی کتب بینی پر اس طرح روشنی ڈالتی ہیں کہ ان کے مطالعہ کا شوق حد سے بڑھا ہوا تھا ۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ کتاب میں ڈوب جاتے تھے اور اگر انھیں کچھ لکھنا ہے تو پھر انھیں یاد نہیں رہتا کہ انھوں نے کھانا کھایا یا نہیں ۔ بار بار کہنے سے مجھ سے لڑائی ہو جاتی ۔

ان کے مطالعے کے جنون کو دیکھ کر شبلی اکیڈمی کے ناظم کتب خانہ مولوی عبدالباری صاحب جن کے نام خلیل کی آخری کتاب "مضامین نو" معنون ہے یہ کہا کرتے تھے کہ اس لڑکے کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ آئندہ چل کر یہ علم و ادب کی دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا ۔ خلیل صاحب نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میری ابتدائی تربیت مولوی عبدالباری صاحب کی مرہون منت ہے ۔ اعظم گڑھ میں اعظمی کا قیام کوئی چار سال رہا ۔ جہاں سے انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کر کے علی گڑھ جانے کا منصوبہ بنایا ۔ انھیں علی گڑھ جانے اور وہاں اپنے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ۔

اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے والد کا انتقال ہوچکا تھا اس وقت ان کا خاندان زمین وجائداد کے جھگڑے اور بھائیوں کے آپس کے اختلافات اور کئی طرح کے مقدمات کی وجہ سے خاصا زیربار ہوچکا تھا ایسے میں ان کے گھر کے بعض افراد نے ان کے علی گڑھ جانے کی مخالفت کی اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ شبلی کالج میں داخلہ لے لیں۔ مگر خلیل صاحب نہ مانے اور علی گڑھ جانے پر مصر رہے۔ خلیل صاحب کا کہنا تھا کہ جاؤں گا تو علی گڑھ ورنہ پڑھنا چھوڑ دوں گا۔ بہرحال ان کے لیے کچھ رقم فراہم ہوگئی اور انھیں علی گڑھ بھیج دیا گیا۔

راشدہ خلیل کے بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خلیل کے گھر کے لوگ انھیں آگے پڑھانے پر رضامند نہ تھے۔ کیونکہ ان کے گھرانے میں انگریزی تعلیم بےکار تصور کی جاتی تھی۔ ان کے منجھلے بھائی طبیب الرحمٰن ان کی اعلیٰ تعلیم سے سخت ناراض تھے۔ اور ان کی ملاقات خلیل صاحب کے گھر سے نکلنے کے بعد پھر کبھی نہیں ہوئی اور نہ انھوں نے کبھی خط بھیجا یہاں تک کہ ان کے انتقال پر تعزیتی خط بھی نہیں لکھا۔ وہ اپنی تعلیمی دور کی پریشانیوں کا تذکرہ کرتے تھے کہ کس مصیبت سے انھوں نے تعلیم جاری رکھی گھر والوں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ انھوں نے یونیورسٹی سوسائٹی سے قرض لیے اور اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اس قرض کی ادائیگی تنخواہ سے میری شادی کے بعد تک ہوتی رہی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اعظمی صاحب کا گھرانہ کٹر مذہبی قسم کا تھا جہاں جدید علوم کے بجائے قدیم علوم کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اسکول کی طالب علمی کے بعد اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھانے میں جو رکاوٹیں پیش آئیں ان کا اصل سبب ان کے والد کا سانحۂ ارتحال تھا، جس کے بعد ان کے گھر کا شیرازہ بکھر گیا اور ان کی مدد کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ خلیل صاحب کے مزاج میں خود بھی استغنا تھا۔ وہ گھر کے لوگوں سے اپنی تعلیم کے دوران خصوصاً بی۔ اے سے ایم۔ اے تک کسی بھی مدد کے خواستگار نہ ہوئے۔

اعظمی علی گڑھ آتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ایک تعارفی خط حاصل کر چکے تھے جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام تھا۔ سید صاحب نے اپنے خط میں اعظمی صاحب کی خداداد صلاحیت، ذہانت اور ان کے علمی، ادبی ذوق کی کھل کر تعریف کی تھی اور یہ لکھا کہ ایسا طالب علم آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں جو آگے چل کر نہ صرف علم وادب میں ممتاز مقام حاصل کرے گا بلکہ اس کے ذریعہ یونیورسٹی کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا اور ایک وقت آئے گا کہ وہ آپ کی کرسی پر بیٹھے گا۔ اس خط کا حسب خواہ اثر ہوا اور اعظمی صاحب کا بآسانی داخلہ ہوگیا اور ان کے لیے وظیفہ بھی مقرر ہوگیا۔

علی گڑھ کی فضا اعظمی کے لیے سازگار ثابت ہوئی اور یہاں انھیں اپنے علمی اور ادبی ذوق اور شعور کو جلا دینے کا خاطر خواہ موقع ملا۔ انھیں علی گڑھ میں بڑا خوش گوار ذہنی اور ادبی ماحول میسر آیا۔ مگر تقسیم ہند کے حادثے نے اس ماحول کو درہم برہم کردیا۔ اعظمی ان دنوں شدید بحرانی حالت سے گزر رہے تھے۔ اتفاق سے ۱۹۵۳ء میں ان کے شفیق اُستاد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے انھیں علی گڑھ بلالیا اور ان کا تقرر بہ حیثیت لکچرر ہوگیا۔ ان کی زندگی میں اس کے بعد سکون وٹھہراؤ آگیا۔ بہرحال علی گڑھ دوبارہ قدم رکھنے کے بعد ایک نئی ذہنی کروٹ اور بیداری کا احساس ہوا۔ ایک طرح سے یہ ان کی ادبی زندگی کا ایک نیا دور اور باب تھا، جس کی ابتدا ان کی نظم "نیا جنم" سے ہوئی۔ لکچرارشپ ملنے کے تقریباً چار سال بعد ۱۹۵۷ء میں انھوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی، جسے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور استاد محترم مجنوں گورکھپوری نے بےحد سراہا۔

خلیل صاحب کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا اور ان کے یہاں ادیبوں اور شاعروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان کے احباب میں وحید اختر، شمیم حنفی، محمود ہاشمی، شہاب جعفری، وقار جعفری وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کا ان کے یہاں برابر آنا جانا ہوتا تھا۔ خلیل صاحب کی زندگی میں اب بہ ظاہر کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر ایک احساس انھیں زندگی بھر کچوکے دیتا رہا اور وہ تھا وطن اور گھربار چھٹنے کا غم۔ انھوں نے وطن کو صرف اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے خیرباد کہا تھا۔ خلیل صاحب گھر چھوڑنے کے بعد اپنے وطن اور گھر کے افراد سے تقریباً بالکل الگ تھلگ ہوگئے۔ اس طرح کہ انھوں نے اپنے علی گڑھ کے ۳۳ سالہ قیام کے دوران سوائے دو مرتبہ کے کبھی گھر کا منہ نہیں دیکھا۔

اعظمی کی غم پسندی یقیناً ان کا ایک انفرادی میلان ہے اس میں ان کے تنہائی کے احساس کو بڑا دخل ہے جس سے وہ زندگی بھر دوچار رہے چنانچہ وہ اپنی غزل میں اپنے درد وکرب کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں۔

۵

خوار ہوئے بدنام ہوئے، بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے

بات تو کوئی ہوگی مگر مت پوچھو اے یارانِ وطن
اپنے گھر کو چھوڑ کے کیوں ہم دیوانے مسرور ہوئے

تجھ سے کم کم واقف تھے تو روز کا ملنا ہوتا تھا
تجھ کو جانا تجھ کو چاہا وقفِ شبِ دیجور ہوئے

دل ٹوٹا پر ہم سے نہ یہ زنجیرِ تعلق ٹوٹ سکی
صحرا صحرا گھوم کے بھی کب تیرے در سے دور ہوئے

ہائے وہ کالی کالی آنکھیں ہائے وہ بھیگے بھیگے ہونٹ
ہائے وہ تیرے چاہنے والے جو پی کر مخمور ہوئے

خلیل الرحمٰن اعظمی راقم الحروف کے استاد رہ چکے ہیں اور اس نے دو سال تک مرحوم کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بہت سی صفات اور خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے اندر سنجیدگی، شائستگی، متانت اور مخصوص انداز کی مشرقیت تھی۔ وہ بحیثیت استاد بہت کامیاب تھے۔ ان کے لکچرز سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا تھا۔ طالب علموں کو ان کے اندر ادب فہمی کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چاہے اکبر و اقبال ہوں یا غالب پڑھائیں یا تنقید پر درس دیں وہ اس بات کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ طالب علم ان کی علمی فضیلت سے مرعوب نہ ہوں۔ ان کے لکچرز محض درسی کتب یا تنقیدی جائزوں کی تلخیص نہیں ہوتے تھے بلکہ ان سے وہ بصیرت ملتی تھی جو ہونہار طالب علموں کے لیے ذہنی سرمایہ تھی۔

کتبے کے عنوان سے کئی چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی ہیں جن میں زندگی سے مایوسی کی گہری کیفیت اور موت کے بڑھتے اور تیز ہوتے ہوئے قدموں کی آہٹ کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ خلیل صاحب نے اپنے آخری دور کی ذہنی کیفیت کو بالکل ہی بے نقاب کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمتوں سے مایوس نہیں ہوں، مگر اس کے بلاوے اور اس کی پکار پر لبیک کہنے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہوں۔ آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں بقیہ عمر اس منزل سے گزر رہی ہے جہاں اپنے آپ کو فریب کی خواہش بھی نہیں رہی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ؎

پانی وضو کو لاؤ رُخِ شمع زرد ہے
مینا اٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا

۲۹ مئی ۱۹۷۸ء کو ان پر بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ اسپتال لے جایا گیا اور اسی دن واپس کر دیے گئے۔ اس کے بعد حالت سدھر نہ سکی۔ یکم جون ۱۹۷۸ء کو پونے دو بجے دن میں اپنے مکان ''اُردو باغ'' میں رحلت کر گئے۔ الغرض صناعِ حقیقی نے اس کارگاہِ عالم کا سلسلہ فنا و بقا کے رشتے سے قائم کیا ہے علامہ اقبال نے اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے ؎

زندگی آغازِ موت اور موت انجامِ حیات
یہ تو نے کیا کیا اے نے نوازِ زندگی

علاج اور تیمار داری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا مگر مشیتِ الٰہی غالب آئی۔ غرض کہ شربتِ موت کا ذائقہ ہر متنفس کے لیے ضروری ہے اور یہ مشکل کسی تدبیر و حیلہ سے حل نہیں ہو سکتی۔ شیخ بو علی سینا جس نے طبِ یونانی کی تکمیل کی اور ارسطو کے فلسفہ کو از سرِ نو دنیا میں زندہ کیا فرماتے ہیں ؎

از قعرِ گلِ سیاہ تا باوجِ زحل
کردم ہمہ مشکلاتِ گیتی را حل
بیروں جستم زقیدِ ہر مکر و حیل
ہر بند کشادہ شد مگر بندِ اجل

★★

ایجنٹ حضرات سے

نیا دور کی مطلوبہ کاپیاں ایجنٹ صاحبان کو بذریعہ وی۔پی ارسال کی جاتی ہیں لیکن اکثر بعض ایجنٹ وی۔پی نہیں چھڑاتے۔ جس کے سبب ادارے کو کافی مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اس لیے وی۔پی ضرور چھڑا لیا کریں۔ وی۔پی نہ چھڑانے پر ایجنسی ختم بھی کی جا سکتی ہے۔

———— ادارہ

انیس انصاری
۳ ۔ گلستاں کالونی ۔ لکھنؤ

سب نے چُرا لی ہے تمھاری صورت

شہر میں سب نے چُرالی ہے تمھاری صُورت
لیے پھرتا ہے کوئی آنکھوں کا زہری جادُو
جو دل و جسم کو ڈستا بھی ہے تریاق بھی ہے
کوئی چمکاتا ہے دانتوں کی شرارت بھری دھوپ
جیسے بچّوں نے جما رکھا ہو آئینے کا کھیل
اگ رہے ہیں کئی چہروں پہ تمھارے لبِ سُرخ
جن کے چھونے سے بکھرتی ہے حنا کی خوشبُو
کوئی عارض پہ سجائے ہے وہ ننھا گڈھا
جو سمندر بھی ہے ساحل بھی ہر، آفاق بھی ہے
کوئی زلفوں کو بکھیرے ہے تمھاری صورت
جن کے کاٹے کا نہ منتر نہ دوا نہ دارو
کوئی قامت لئے پھرتا ہے تو کوئی رفتار
کوئی اسلوب کوئی دھج کوئی آواز کا میل
شہر میں رنگ جمائے ہے تمہاری صُورت

ایک ہم ہیں کہ اسی بات پہ کھل جاتے ہیں
کہ تمھیں عشق میں جلنے کا چلن آتا ہے
کہ تمھیں زندگی کرنے کا جتن آتا ہے
تم اسی شہر میں بس جاؤ یہیں رہ جاؤ
کہ تمھیں ہجر میں بھی وصل کا فن آتا ہے

وقار طاہری
۲۳۳/۹۹ نالہ روڈ ۔ چمن گنج کان پور

دشتِ لا عبُور

دیکھتے ہی دیکھتے جادوئی نگاہ نے
تیرہ تیرہ دشت میں اک دیا جلا دیا
وہ دیا جو دوستو تھا طلسم کا چراغ
دیکھتے ہی دیکھتے
اس کی لَو کچھ اس قدر ہوگئی بلند تر جیسے رقص میں شرر
پھر شرر ہی پیکرِ رنگ و حسُن ہوگیا
مرتعش فضا ہوئی نکہتیں بکھر گئیں
جلترنگ بج اُٹھا گھنگھروں کی تال پر
برق سی چمک گئی مطلعِ خیال پر دیکھتے ہی دیکھتے
دفعتاً مری طرف سیلِ مشکبو سا وہ خود اُمڈ کے آگیا
اور غرق ہوگیا جب میرا وجود تو مجھ کو ہوش آگیا
میں تڑپ کے رہ گیا اس عجب وصال پر
اپنے اس زوال پر خود سے ہی لپٹ کے میں رو رہا ہوں آج بھی
اب طلسم کا چراغ یا وہ پیکرِ جمال
دسترس سے دُور ہے
میں ہوں میرے ساتھ بس دشتِ لا عبور ہے!!

ڈاکٹر محمد ایمن انصاری
رسول پور، گورکھ ناتھ
گورکھ پور

رتن ناتھ سرشار کے چند اہم ناول

ایک جائزہ

رتن ناتھ سرشار کے تمام ناول زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انگریزی ناولوں کے عمیق مطالعے کی وجہ سے ان کے تمام ناولوں میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور کارفرما ہے۔ فسانۂ آزاد، سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، پی کہاں، ہشو، کرم دھم، طوفان بے تمیزی، چنچل نار وغیرہ ناولوں کا بنیادی مقصد معاشرے کی اصلاح ہے۔

سرشار نے لکھنؤ کے اس ماحول میں آنکھ کھولی جب لکھنوی تہذیب اپنے بام عروج پر پہنچ کر زوال آمادہ ہو چکی تھی۔ ان کے ناولوں کا پس منظر انتزاع سلطنت اودھ کے بعد کا لکھنؤ ہے۔ لیکن ابھی نوابین اودھ کے عہد کی تہذیب کے اثرات پوری طرح باقی تھے۔ اس زمانے میں بھی عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ طوائف اور شراب زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھے اور لکھنؤ کا چوک اس تہذیب کا مرکز ثقل تھا۔ بقول ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب:

"غدر کے بعد زندگی کا اتار چڑھاؤ طوفان میں اٹھتی ہوئی موجوں کی طرح واضح ہے۔ نوابی ہو یا افلاس، دونوں کا رقص بالکل عریاں ہے۔" [1]

سرشار نے لکھنؤ کے گلی کوچوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ سیر و تفریح کے دلدادہ تھے۔ یہ سیر و تفریح انھیں لکھنؤ کے معاشرے کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوئی۔ اس کا اثر ان کے تمام ناولوں میں نمایاں ہے۔ انھوں نے اس دور کے رسم و رواج تیوہاروں اور میلوں ٹھیلوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے معاشرے کے عیوب کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس طرح ان کے ناول اپنے عہد کے لکھنوی سماج کا نگار خانہ بن گئے ہیں۔ سید لطیف حسین ادیب کے الفاظ میں:

"سرشار سمجھدار انسان تھے۔ لکھنؤ میں پلے۔ بڑھے ہر گلی، ہر کوچہ دیکھا، طبیعت کے لاابالی پن نے زیادہ گھومنے، زیادہ حظ اٹھانے کا موقع دیا۔ یہ غیر سنجیدہ مقصد، مشاہدہ گھوم گھوم کر جاننا ان کی تصانیف کی جان ہیں..... ان کی کتابوں میں لکھنؤ کی سماجی زندگی کے بھرپور نقشے ہیں۔" [2]

سرشار کے پہلے ناول "فسانۂ آزاد" (۱۸۸۰ء) کا پیرایۂ بیان ایک سفرنامے کا سا ہے۔ انھوں نے چند کرداروں کے ذریعہ اپنے عہد کے معاشرے کی سیر کرائی ہے۔ فسانۂ آزاد کا ہیرو ایک مہم جو اور ترقی پسند انسان ہے۔ وہ ابتدا ہی سے تعلیم نسواں کا حامی اور مبلغ ہے۔ عورتوں کی ترقی اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لیے وہ انھیں گھر کی چہار دیواری سے باہر نکالنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں عورتوں کو تعلیم دینا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ عملی زندگی میں ایک بہترین بیوی اور ماں بن سکیں اور اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور پرداخت کر سکیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

"جہاں ہم نے اپنے وطن کی کسی تعلیم یافتہ لکھی پڑھی کا حال سنا اور بس باچھیں کھل گئیں۔ خدا کرے تعلیم نسواں

اس ملک میں روز بروز ترقی پائے اور ہر ایک لڑکی فارسی

یا ناگری پڑھ جائے۔" ۴۳

فسانۂ آزاد کی ہیروئن حسن آرا بھی آزاد کی طرح ایک نئے اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے تعلیم نسواں کو ضروری سمجھتی ہے۔ وہ تعلیم کے ذریعے عورتوں میں پھیلی ہوئی ہر طرح کی جہالت کو دور کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ وہ بھی آزاد کی طرح تعلیم کی مبلغ ہے۔ اس عہد میں عورتوں کے لیے نہ مدرسے تھے نہ کالج اور نہ ہی ان کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی۔ حسن آرا گھر کی چہار دیواری میں قید عورتوں کو تعلیم دینے کے لیے مدرسہ نسواں قائم کرنا چاہتی ہے اور اس کے لیے وہ عورتوں میں تبلیغ کرنا اور انھیں تعلیم کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتی ہے:

"ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ ہم مدرسہ نسواں قائم
کریں۔ میں نے ایک لکچر لکھا ہے۔ میاں آزاد اگر اصلاح
دے دیں تو میں کسی دن یہاں کی شریف زادیوں کو
جمع کرکے لکچر دوں۔ شاید کسی کے دل پر اثر کرے اور
کوئی نتیجہ نکلے۔" ۴۴

حسن آرا اپنی اصلاح پسند طبیعت کی وجہ سے تعلیم نسواں کی تحریک کو فروغ دیتی ہے تاکہ ہر لڑکی تعلیم یافتہ ہوکر اپنی ازدواجی زندگی میں ایک کامیاب بیوی اور ایک اچھی ماں بن سکے۔ وہ معاشرے میں کسی بھی لڑکی کو جاہل نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس کے خیال میں تعلیم یافتہ عورتیں معاشرے کو سماجی خرابیوں سے پاک کرنے میں معاون ہوں گی۔

تعلیم نسواں کی اہمیت جتانے کے علاوہ حسن آرا سماج کی کہنہ اور فرسودہ روایات کی مخالفت میں بھی آواز بلند کرتی ہے۔ وہ عورتوں میں پھیلے ہوئے غلط قسم کے رسم و رواج اور توہم پرستی کے خلاف ہے۔ اس کے خیال میں توہم پرستی لوگوں کی قوت ارادی کو کمزور کر دیتی ہے اور جہد و عمل کی طاقت چھین لیتی ہے اور ایسی حالت میں ان کا شکست خوردہ ذہن عمل سے فرار کی راہیں تلاش کرتا ہے۔

سرشار نے فسانۂ آزاد میں معاشرے کی اصلاح کے پیش نظر توہم پرستی، شگون اور مافوق الفطرت عناصر پر اعتقاد کو خاص طور سے ہدف تنقید بنایا ہے تاکہ یہ چیزیں لوگوں کی قوت ارادی کو کمزور نہ کریں اور معاشرے کو صحت اور سماج بنائیں۔ اس موضوع پر سرشار نے آزاد، حسن آرا، بڑی بیگم اور دیگر کرداروں کے ذریعہ کافی روشنی ڈالی ہے۔

فسانۂ آزاد میں سرشار نے عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے لکھنؤ کے شرفا کی زندگی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ لکھنؤ کے شرفا منشیات، طوائف پرستی، مرغ، تیتر، بٹیر اور پتنگ بازی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ طوائف پرستی کا تو یہ عالم تھا کہ شرفا طوائفوں کے یہاں جانا اپنی شان سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے لڑکوں کو ان کے یہاں تعلیم و تربیت کے لیے بھیجتے تھے۔

سرشار نے طوائف کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے سماج کی ان خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے جو عورتوں کو طوائف بننے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ سماجی اور معاشی نابرابری، بردہ فروشی اور مرد کی خود غرض فطرت کو طوائف بننے کا سبب قرار دیتے ہیں۔

فسانۂ آزاد میں سرشار نے قاری کو اپنے معاشرے کے ہر طبقے سے روشناس کرایا ہے اور ان میں پھیلی ہوئی برائیوں کو اجاگر کیا ہے۔ لکھنؤ میں اس زمانے میں نشہ خوری عام تھی جس سے متوسط طبقے کی مالی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف شراب، چانڈو اور افیون کا بول بالا تھا۔ لوگ ان چیزوں کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ ان میں خیر و شر کی تمیز باقی نہ رہی تھی۔ سرشار نے فسانۂ آزاد میں اس بات پر زور دیا ہے کہ نشہ صرف فرد ہی کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو نحیف و ناتواں بنا دیتا ہے۔ ایک جگہ خوجی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"خواجہ صاحب شام تک اور بھی ضعیف سے اضعف
ہو گئے، مگر مالوے کی پرانی افیم کا ذائقہ چکھا تو چھوڑنے کا
جی نہ چاہا۔ خاں صاحب سے سن چکے تھے کہ بارہ برس
پرانی افیم ہے۔ دو دن میں سوا پاؤ افیم پی گئے، اس کے علاوہ
دس تولے چانڈو اڑا دیا۔ شام کو پینک میں موجیں
لینے لگے۔" ۴۵

علاوہ ازیں فسانۂ آزاد میں چور، اچکے، شرابی، جواری، بد معاش، دھوکے باز، جعلیے، افیمچی وغیرہ سماج کے تمام ناقص عناصر کا ذکر ملتا ہے، جو اس معاشرے کو گھن کی طرح تباہ و برباد کر رہے تھے۔ سرشار نے ان کمزوریوں اور عیوب کو خالص اصلاحی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ المختصر

"فسانۂ آزاد" اگر ایک طرف لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کا آئینہ دار ہے تو دوسری طرف سرشار کی سماجی بصیرت کا بھی مظہر ہے۔

رتن ناتھ سرشار کے دوسرے اہم ناول "جام سرشار" (۱۸۸۷ء) کا موضوع شراب اور شباب ہے۔ جام سرشار نے اس عہد کے لکھنؤ کے نوابین اور امرا کی شراب نوشی اور عیش کوشی کو جو لکھنوی معاشرے کے زوال کا اصل سبب تھیں، ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ جام سرشار کے متعلق بدر عالم لکھتے ہیں:۔

" دراصل پورا ناول صرف عیش و عشرت اور آوارگی کے بُرے نتائج پر مبنی ہے۔ شراب اور شباب عیاشی کے دو اہم جزو ہیں۔ سرشار نے ان دونوں سے کام لیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ناول میں شراب سے زیادہ شباب تباہی و بربادی کا سبب بنتا رہا۔" ۵۵

جام سرشار میں ایک ایسے نواب کی داستان بیان کی گئی ہے جنھیں ان کے مصاحب اور احباب، شراب اور شباب کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار نواب امین الدین حیدر کو ان کے مصاحب دو یہودی طوائفوں سے متعارف کراتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ رنگ رلیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کے شہر سے چلے جانے کے بعد بھی نواب صاحب کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ دوسری عورتوں کے ساتھ دادِ عیش دینے لگے اور اسی عیش کوشی اور شراب نوشی میں اپنی ساری دولت گنوا بیٹھے۔ امین الدین حیدر کبھی دیہاتی کسبیوں اور کبھی گھر پر کام کرنے والی عورتوں پر ہاتھ صاف کرتے رہے۔ ایک دن انھوں نے اپنی ملازمہ ظہورن سے نکاح کر لیا۔ پھر انھوں نے اپنے ایک دوست سیٹھ گوجرل کی داشتہ مس للی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ ظہورن نواب صاحب کے للی سے تعلقات برداشت نہ کر سکی۔ انتقاماً وہ لائسنس لے کر چوک میں بیٹھ گئی۔ نواب صاحب کو جب اس امر کا علم ہوا تو انھوں نے ظہورن کو قتل کر دیا اور خود بھی خودکشی کر لی۔

اس عہد کے نوابین اور امرا اسی طرح کی گھناؤنی عیاشیوں میں مصروف تھے۔ یہ عیاشیاں صرف اعلیٰ طبقے تک محدود نہ تھیں بلکہ متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ بھی ان کی تقلید میں اسی راہ پر چل رہے تھے۔ نوابین اور امرا نے اپنی منکوحہ عورتوں کی زندگی تباہ کر رکھی تھی، بیوی کی موجودگی میں گھر کی ملازمہ اور طوائفوں سے تعلق رکھنا اور انھیں اپنی بوالہوسی کا نشانہ بنانا ایک عام بات تھی۔

اس عہد کے لکھنوی معاشرے میں شراب نوشی بھی عام تھی۔ اسی لیے سرشار نے اس ناول میں شراب کی بھی دل کھول کر مذمت کی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود شراب کے عادی تھے اور کثرتِ شراب نوشی نے ان کو بالکل نحیف و لاغر کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں شراب کے نقصانات سے ان سے زیادہ کون واقف ہو سکتا تھا۔ وہ جام سرشار کی تمہید میں لکھتے ہیں:

" اُٹھائی گیرا، لُقا، لُچا، شہدا، دغاباز، جعل ساز گرہ کٹ، چور، اُچکا، ڈاکو، بدمعاش، اوباش۔ یہ سب بُرے مگر شرابی ان سب کا گرو گھنٹال۔" ۵۶

نوابین اور امرا کے علاوہ متوسط طبقے اور نچلے طبقے کے افراد بھی شراب نوشی میں مبتلا تھے۔ اور اس میں اپنی صحت، دولت اور عزت برباد کر رہے تھے۔ سرشار نے شراب نوشی کی جملہ خرابیوں کو جام سرشار میں اجاگر کیا ہے۔ نواب امین الدین حیدر نے ظہورن کا قتل اور خودکشی شراب کے نشے میں ہی کی تھی۔

المختصر جام سرشار میں سرشار نے نوابین کی گھناؤنی عیاشیوں شراب نوشیوں اور دیگر کمزوریوں کا ذکر کیا ہے۔ مفت خور مصاحب ان کی زندگی کس طرح تباہ کر رہے تھے۔ فاحشہ عورتیں ان پر کس قدر اثر انداز تھیں۔ چوک نے ان کی تہذیبی قدریں کس حد تک متعین کی تھیں۔ بادہ و ساغر کا ان کی زندگی میں کتنا دخل تھا۔ ان سب پر سرشار نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس طرح انھوں نے لکھنوی معاشرے کے زوال کے اسباب کی نشان دہی کی ہے۔

سیر کہسار (۱۸۹۰ء) بھی جام سرشار کی طرح لکھنوی معاشرے میں پھیلی ہوئی عیاشیوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اس صورتِ حال کا ذمہ دار نوابوں اور امرا کو ٹھہرایا ہے جن کی وجہ سے لکھنؤ کی سماجی اور تہذیبی زندگی انتشار کی شکار تھی اور لکھنوی معاشرہ نحیف و ناتواں ہوتا جا رہا تھا۔

سیر کہسار کے نواب عسکری نے، جو لکھنؤ کے نواب زادے تھے نخاس اور حسین آباد کے باہر کبھی قدم نہیں رکھا تھا، کسی محفل میں بیٹھے بیٹھائے دورانِ گفتگو پہاڑ کا ذکر نکل آتا ہے۔ نواب صاحب کو بھی نینی تال جانے کا

اشتیاق ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں ان کے یہاں ایک تقریب میں چوڑی پہنانے کے لیے ایک چوڑی فروش قمرن آتی ہے۔ نواب صاحب اپنی عزت اور شان و شوکت کو بالائے طاق رکھ کر اس پر دل و جان سے فدا ہو جاتے ہیں۔ قمرن اپنے شوہر قادر کو چھوڑ کر نواب صاحب کے ساتھ نینی تال فرار ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی آوارہ مزاجی یہاں بھی چین نہیں لینے دیتی اور وہ فضلے نامی ایک برف والے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ بعد میں فضلے اسے دھوکا دیتا ہے اور اس کی دولت اور جوانی نچوڑ لینے کے بعد اس کو چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔ بالآخر قمرن نواب صاحب کے یہاں واپس آکر دم توڑ دیتی ہے۔ یہ ہے سیر کہسار کا خلاصہ۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جب کسی معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے افراد عیاشیوں میں ڈوب جاتے ہیں تو وہ معاشرہ زوال کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

سرشار نے "کامنی" (۱۸۹۴ء) میں بھی لکھنوی معاشرے کی عیاشیوں کی عکاسی کی ہے۔ لیکن اس ناول کے مرکزی کردار کامنی کو پیش کر کے انھوں نے عورتوں کو اپنی عصمت کی حفاظت کا درس دیا ہے۔ کامنی کی شوہر پرستی عورتوں کے جذبات و احساسات میں رفعت و بلندی پیدا کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی با عصمت عورت ہے جو دولت مند اوباش اور عیاشوں کے ڈورے ڈالنے کے باوجود متزلزل نہیں ہوتی اور مختلف پریشانیوں اور مراحل سے گزر کر بھی اپنے شوہر رنبیر سنگھ کا انتظار کرتی ہے۔

لکھنؤ کے اسی معاشرے میں گورا ایک ایسی عورت ہے جو کامنی کی طرح شادی شدہ ہونے کے باوجود دولت اور جنسی بھوک کی خاطر خود کو سرن نامی ایک دولت مند عیاش کے حوالے کر دیتی ہے۔ لیکن یہی سرن جب کامنی پر ڈورے ڈالتا ہے تو کامنی اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ سرشار نے کامنی اور گورا کی شکل میں دو متضاد کرداروں کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عورت اپنی عصمت کی حفاظت خود کر سکتی ہے اور بغیر اس کی مرضی کے سماج کا کوئی فرد اسے اپنی گھناؤنی عیاشیوں کا شکار نہیں بنا سکتا۔

لکھنؤ کے معاشرے کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہاں عورتوں کا ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو جسم کی تجارت کرتا تھا اور اپنے آپ کو رئیسوں اور نوابوں کے حوالے کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا تھا۔ عورتوں کا یہ وہ طبقہ تھا جو خوش حال ہونے کے باوجود محض عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے جسموں کی تجارت کرتا تھا۔ علاوہ ازیں کچھ عورتیں اقتصادی مجبوری کی بنا پر اس راہ پر گامزن تھیں۔ سرشار نے اس ناول میں ان دونوں طرح کی عورتوں کو پیش کیا ہے اور کامنی کا مثالی کردار پیش کر کے انھوں نے عورتوں کو عصمت فروشی سے گریز کرنے کا درس دیا ہے۔

سرشار کے دوسرے ناول جیسے "کڑم دھم"، "بچھڑی ہوئی دلہن"، "پی کہاں؟"، "ہشو" وغیرہ بہت مختصر ہیں اور کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں۔ ان میں بھی سرشار نے لکھنوی معاشرے کی خرابیوں کو اجاگر کیا ہے اور انھیں ہدفِ طنز بنایا ہے۔ ان کا موضوع بھی کم و بیش وہی ہے جو مذکورہ بالا ناولوں کا ہے جن کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھنوی معاشرے کی مذموم رسموں پر نہ صرف عملِ جراحی کیا بلکہ زخم بھرنے اور آسودہ زندگی گزارنے کے طریقے بھی بتائے ہیں۔ وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے معاشرتی زندگی کی بے راہ روی پر روشنی ڈالی ہے اور از کار رفتہ تہذیب سے علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔ غدر کے بعد لکھنؤ میں ہر طرح کی برائیاں موجود تھیں۔ سماج کے تقریباً ہر طبقے کی زندگی وحشیانہ جذبات سے لبریز تھی۔ جہالت، لوٹ کھسوٹ، بے ایمانی، اور عیاشی کا بازار گرم تھا۔ اس عہد کے لکھنوی معاشرے میں زندگی کا نہ تو کوئی نصب العین تھا اور نہ کوئی معیار۔ سرشار نے ان تمام سماجی برائیوں بالخصوص شراب نوشی، طوائفوں کی گرم بازاری اور توہم پرستی کو ہدفِ طنز و تعریض بنایا ہے۔ پنڈت بشن نرائن در کے الفاظ میں:

"وہ سماج کے بدترین پہلوؤں کی عکاسی کر دیتے ہیں
اور نفرت اور بے اطمینانی کے اظہار کو پوشیدہ نہیں رکھتے۔"[۵]

اس عہد کے لکھنؤ میں نشہ آور چیزوں کا استعمال آزادانہ طور پر ہوتا تھا۔ شراب، افیم وغیرہ کا استعمال عام تھا۔ یہ زہر نوابوں اور امرا کے درباروں سے ہو کر جب معاشرے کی فضا میں تحلیل ہوا تو اسے ہر طبقے نے امرت سمجھ کر اپنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنھیں کھانا تک میسر نہ تھا وہ بھی منشیات کے عادی ہو چکے تھے۔ بالآخر لکھنؤ کی آبادی کا ایک بڑا حصہ شراب نوشی کی وجہ سے جسمانی اور اقتصادی طور پر نحیف و لاغر ہو چکا تھا۔ لکھنوی تہذیب و تمدن کے زوال میں اس بادہ گساری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سرشار نے اپنے ناول فسانۂ آزاد، سیر کہسار، جامِ سرشار اور ہشو وغیرہ میں اس موضوع پر خاص طور سے قلم اٹھایا ہے اور اس کے نتائج کو قصے کے پیرایے میں بیان

کیا ہے۔

لکھنؤ کے نوابین اور امرا کی عیش کوشی اور تعیش پسندی نے طوائفوں کی گرم بازاری کو فروغ دیا۔ رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ سرشار نے اپنے ناولوں میں چوک کی باوقار طوائفوں سے لے کر دیہات کی کسبیوں اور نوچیوں تک کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ گورا، قمرن اور ظہورن وغیرہ ایسی عورتیں ہیں جو ماحول کے زیر اثر جائز اور محدود آمدنی پر قانع نہ رہ کر جسم فروشی میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتیں۔ لکھنؤ میں عصمت فروشی کی وبا اتنی عام تھی کہ اسے کوئی حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا سرشار کے خیال میں لکھنوی معاشرے کے زوال کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا اور انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اس کے خلاف جد و جہد بھی کی ہے۔

سرشار نے ایک حقیقت پسند فن کار کی طرح عوام کی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ انھوں نے توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے محل کو مسمار کر کے عوام کو شکست خوردہ ذہنیت سے نجات دلانے کی سعی مشکور کی ہے۔ ان کے ناولوں کے تمام اہم کردار اپنے معاشرے کی سماجی برائیوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بقول پروفیسر سید احتشام حسین:

> "ان کرداروں کے ذریعے انھوں (سرشار) نے روایت اور تغیر، قدیم اور جدید، بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں، تعلیمی مسئلوں، مذہبی اور سماجی اداروں، رسموں اور رہن سہن کے طریقوں کے راز فاش کیے ہیں۔" ۹

المختصر سرشار کے تمام ناول مقصدی ہیں اور وہ کسی نہ کسی سماجی مسئلے کے گرد گھومتے ہیں۔ سرشار انتزاع سلطنت کے بعد کے لکھنؤ کی سماجی اور تہذیبی زندگی کے مؤرخ ہی نہیں بلکہ مفسر اور ناقد بھی ہیں۔

حواشی:

۱،۲ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب۔ رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری ص ۴۸

۳ رتن ناتھ سرشار فسانۂ آزاد جلد اول ص ۲۲۸

۴ رتن ناتھ سرشار " " " ص ۳۲۲

۵ " " " فسانۂ آزاد جلد چہارم ص ۲۷۱

۶ رتن ناتھ سرشار جام سرشار مقدمہ بدرعالم ص ۵

۷ رتن ناتھ سرشار جام سرشار ص ۴۷

۸ پریم پال اشک۔ سرشار، بشن نرائن کی نظر میں ص ۸۳

۹ احتشام حسین۔ ذوق ادب اور شعور ص ۴۰

اختر کاشی پوری
۴۳، قانون گویان۔ کاشی پور
(نینی تال)

قطعات

سرِ شعر و شراب ہوتا ہے
خلدِ تخیل و خواب ہوتا ہے
دل کے مذہب میں اک حسیں چہرہ
آسمانی کتاب ہوتا ہے

کل نہ آئے مگر اسی کے لیے
فصل پرچھائیوں کی بوتا ہے
دن سرابوں کا، رات خوابوں کی
آدمی جاگتا نہ سوتا ہے

لطفِ کیف و سرور سحر آگیں
فاصلوں کے شباب روسائے
آج جنگل کی شام کی مانند
آنکھ کو اجنبی نظر آئے

جلوتِ سوگوار دیتی ہے
خلوتِ دل نگار دیتی ہے
فکر پیشہ حیات شاعر کی
تلخ نیل و نہار دیتی ہے

قمر ادیب
۱۴۔ ادریس گنج۔ ہردوئی

زوالِ بہاراں

یہ زوالِ بہاراں
کے دن ہیں
ہرے لان کے وسط میں
سرنگوں فلسفی
نیند میں مست ہے

لان کے اس طرف
نیم کی شاخ پر
شہد کی مکھیاں
شہد تخلیق کرنے میں
مصروف ہیں

●

موسمِ سرما

کہرے کی چادر میں لپٹی
صبح سرما
پھر آئی ہے
املی کی شاخوں پر
بھیگے طوطے
دھوپ کا رستہ دیکھ رہے ہیں

●

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۹۵۶ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جارہی ہیں: ــــــــ

(۱) مقام اشاعت: ــــــ لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت: ــــــ ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ: ــــ شری راجیو اروڑا، ہندستانی۔ یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس۔ لاٹوش روڈ، لکھنؤ
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ: ــــ شری اشوک پریہ درشی، ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش۔ لکھنؤ
(۵) ایڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ: ــــ شری شاہنواز قریشی، ہندستانی، ایڈیٹر نیا دور، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش۔ لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمائے کے ایک فیصدی سے زیادہ حصہ دار ہیں: نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا، جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں، یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں اشوک پریہ درشی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) اشوک پریہ درشی (پبلشر)

نیاز سلطانپوری
بھیتی جرولی، کٹاواں
سلطان پور

نکات الشعرا : ایک جائزہ

اُردو تذکروں کی دنیا میں نکات الشعرا مصنفہ خدائے سخن میر تقی میر نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ اردو شاعروں سے متعلق پہلا تذکرہ ہے جسے اُردو کے کسی بڑے شاعر نے تحریر کیا ہے اور جس میں شمالی ہندستان کے شاعروں کے ساتھ ساتھ دکن کے شعرا کو بھی موضوع فکر بنایا گیا ہے۔

اگرچہ نکات سے کہیں بھی سن تصنیف کا پتہ نہیں چلتا لیکن اندرونی شہادت کی بنا پر یہ کامل یقین ہوجاتا ہے کہ یہ ۱۱۶۵ھ کی تصنیف ہے[1]۔ میر نے آنند رام مخلص کے بیان میں لکھا ہے کہ ان کے انتقال کو ایک سال ہو رہا ہے چونکہ مخلص کا سنِ انتقال حتمی طور پر ۱۱۶۴ھ ہے اس لیے نکات یقیناً ۱۱۶۵ھ کی تصنیف ہے۔ قائم چاندپوری نے بھی اپنے تذکرہ الموسوم بہ "مخزن نکات" کو اُردو کا پہلا تذکرہ کہا ہے جو از روئے تحقیق غلط ہے کیونکہ "مخزن نکات" ۱۱۶۸ھ کی تصنیف ہے[2] اور اس سے پہلے دو تذکرے نکات الشعرا اور تذکرہ ریختہ گویان عالم وجود میں آچکے تھے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی کے مطابق "نکات الشعرا اور تذکرۂ ریختہ گویان دونوں بیک وقت زیر تسوید تھے اور دونوں کے مصنفین کو ایک دوسرے کے مجوزہ مشمولات کا کسی نہ کسی ذریعے سے علم ہوتا رہتا تھا۔ نکات الشعرا کو تذکرہ ریختہ گویان پر چار پانچ یوم کا تقدم زمانی حاصل ہے۔"[3]

اُردو کی ادبی تاریخ میں نکات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی وہ تذکرہ ہے جسے میر کی زندگی ہی میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے بعد اردو تذکروں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ بعد کے اُردو شعرا نے بھی نکات کے نمونے پر اپنا تذکرہ تصنیف کیا۔ نکات کے اثرات کو میر کے معاصرین اور بعد کے اُردو شعرا کے تذکروں میں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

میر نے اس تذکرہ میں کم و بیش ایک سو تین شعرا کے حالات، شخصیت احوال اور کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی کی تحقیق کے مطابق نکات کے دو نسخے ملتے ہیں ایک انجمن ترقی اُردو، دوسرا نسخہ پیرس[4]۔ نسخۂ پیرس میں صرف ۷۷ شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ نکات پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں مولوی عبدالحق کے حواشی و حوالے کے ساتھ دوبارہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا۔ بعد ازاں ۱۹۶۲ء میں جناب مصطفےٰ کمال فاطمی نے اس کا بامحاورہ اُردو ترجمہ اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ سے "تذکرۂ میر" کے نام سے شائع کیا۔ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر محمود الٰہی کے حواشی و مقدمہ کے ساتھ دانش محل لکھنؤ نے اسے دوبارہ شائع کیا۔

نسخۂ انجمن ترقی اُردو میں ایک سو تین شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ میر نے جن شعرا کی تعریف کی ہے یا جن کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ہے انھیں حسبِ ذیل زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے[5]

اول۔ خانِ آرزو کے تلامذہ، دوم۔ میر کے اعزا و تلامذہ، سوم۔ میر پر جن کے احسانات تھے، چہارم۔ جن سے میر کے ذاتی تعلقات تھے اور جو میر تقی میر کے مداح تھے۔

اس تذکرہ سے معاصرانہ چشمک کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ میر نے جہاں خان آرزو اور ان کے ارشد تلامذہ کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے وہیں مظہر جانِ جاناں کے ارشد تلامذہ جن کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہوچکی تھی کے ساتھ







وزیر اعلا اتر پردیش شری ملائم سنگھ یادو لکھنؤ میں عازمین حج کی قرعہ اندازی کرتے ہوئے۔ تصویر میں وزیر محنت و اوقاف شری اعظم خاں بھی نظر آ رہے ہیں۔

وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو ۱۴ر جنوری کو اعلا پولیس افسران کو خطاب کرتے ہوئے۔









وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو ۳ جنوری کو کانپور میں

وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو ضلع ہردوئی کے موضع



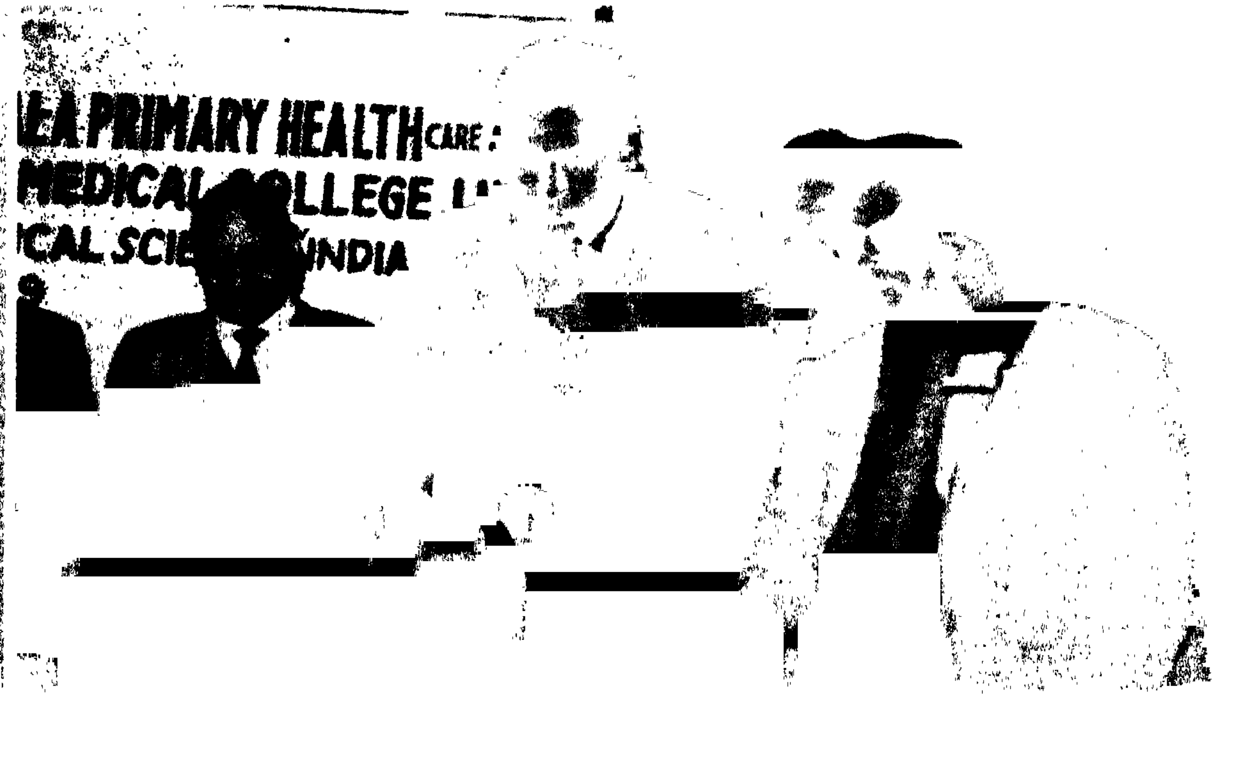






وزیر تعلیم شری سچدانند باجپئی تعلیم بالغان ڈائرکٹریٹ لکھنؤ میں عالمی خواندگی سال تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے

وزیر صحت شری مختار انیس میڈیکل کالج لکھنؤ میں پرائمری ہیلتھ کیئر کے موضوع پر منعقدہ ورکشاپ
کا افتتاح کرتے ہوئے









اردو اکادمی

انصاف نہیں کیا ہے ۵۳

یقین کے متعلق میر رقمطراز ہیں :

" انعام اللہ یقین تخلص ۔ شاعر ریختہ، صاحب دیوان (بہت) از بسکہ اشتہار دارد، محتاج تعارف و توصیف نیست ۔ تربیت کردہ مرزا جان جاں مظہر است۔" ۵۴

میر نے اپنے تذکرہ میں ان شعرا کو بھی اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا جن سے وہ ناخوش تھے یا جن سے ان کی نہیں بنتی تھی ۵۵ میاں کمترین سے ان کی نہیں بنتی تھی اس لیے میر کا عتاب ان پر بھی نازل ہوا۔ ۵۶ واضح رہے کہ میاں کمترین نے میر کی ہجو بھی لکھی تھی ۔

میر نے بعض اہم شعرا کی شخصیت کو مسخ کرنے کی بھی کوشش کی ہے ۔ بندرابن راقم چونکہ ان کی شاگردی سے نکل گئے تھے اس لیے ان پر سرقہ کا الزام عائد کیا ہے ۵۷

نکات الشعرا کی وجہ تالیف کے متعلق ڈاکٹر محمود الٰہی کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ معاصرانہ چشمک کی وجہ سے منصۂ شہود پر آیا ۔ ورنہ میر کی تنقیدی بصیرت ایسی نہیں تھی کہ وہ میاں جگن اور میر گھاسی کی تعریف کرتے اور بندرابن راقم اور قدرت اللہ قدرت کی تنقیص ۵۸

اس تذکرے کی اس وجہ سے بھی بڑی اہمیت ہے کہ محمد حسین آزاد نے اس کے متعلق جو گمراہ کن اور بے سروپا باتیں کہی تھیں وہ سب اس کی اشاعت سے لغو اور غلط ثابت ہوئیں ۔ اس میں نہ تو ایک ہزار شعرا کا تذکرہ ہے اور نہ ولی کی نسبت شیطان سے زیادہ مشہور ہونے والا فقرہ ہم کو ملتا ہے ۔ قرائن بتاتے ہیں کہ نکات الشعرا آزاد کی نظر سے نہیں گزرا تھا ورنہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکت آزاد جیسا بلند پایہ محقق ہرگز نہ کرتا ۔ قاسم اور گردیزی کے تذکروں سے آزاد کو غلط فہمی ہوئی ۔

اس تذکرہ کی اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت ہے کہ یہ اُردو کے عظیم المرتبت شاعر، خدائے سخن میر تقی میر کی تصنیف ہے جو اس عہد میں لکھا گیا جب اُردو تنقید کے اصول واضح طور پر مرتب اور متعین نہیں ہوئے تھے ۔ البتہ شاعروں کی بیاضوں میں تنقیدی بصیرت کے نمونے مل جاتے تھے ۔ اس تذکرہ سے میر کے حسن انتخاب، تنقیدی شعور اور ادبی ذوق کا کسی قدر پتہ چلتا ہے ۔ میر کی تنقید وجدانی اور ذوقی ہے ۔ میر نے مسلمان شعرا کے ساتھ ساتھ ہندو شاعروں کو بھی اپنے تذکرہ میں جگہ دی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کس قدر خوش گوار تھے اور دونوں مل کر اپنے خون جگر سے چمنستان اُردو کی آب یاری کر رہے تھے ۔

اس تذکرہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میر نے بعض شعرا کی بیاضوں اور تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ میر نے خان آرزو اور ان کے تلامذہ مرزا محمد رفیع سودا اور مرزا مظہر جان جاں کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے ۔ انھوں نے مرزا مظہر جان جاں کو " مریدیت مقدس، مظہر عالم، صاحب کمال، شہرہ عالم، بے نظیر معز و مکرم ۵۹ جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے حالانکہ ان کے ارشد تلامذہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے ۔ اسے میر کی مصلحت پسندی پر محمول کیا جا سکتا ہے ۔ سراج الدین علی خاں آرزو کی بابت میر رقمطراز ہیں :

" باغ نکتہ دانی کے آب و رنگ، گلزار معنی کی چمن بندی کرنے والے، زور طلب، بلاغت کے ملک کے حاکم، میدان فصاحت کے پہلوان شاعر اور گفتگو کی صفائی کے خاندان کے چراغ یعنی سراج الدین علی خاں آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ان کے خاندانوں کی زندگی کے چراغ کو ہمیشہ روشن رکھے ۔ ان کا سا زبردست شاعر، قادر الکلام اور عالم فاضل اب تک ہندستان میں پیدا نہیں ہوا، یہی نہیں بلکہ ان کی شہرت کا چرچا ایران تک ہے ۔ ساری دنیا میں مشہور اور سخن فہمی میں کامل ہیں .... ان کے کمالات کا تفصیلی ذکر احاطہ بیان سے باہر ہے ۔ فن ریختہ کے تمام بڑے بڑے اساتذہ ان بزرگ کے شاگرد ہیں ۔ آپ نے بھی تفریح طبع کے طور پر کبھی کبھی دو تین شعر کہہ کر اس بے حقیقت اور بے اعتنا فن کو جسے ہم لوگوں نے اپنا رکھا ہے، اہمیت اور اعتبار بخشا ۔" ۶۰

مرزا محمد رفیع سودا کو بھی میر نے اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے ۔ ان کے متعلق میر لکھتے ہیں :

" ایک نہایت خلیق، نیک خصلت، پُرجوش، دوست نواز اور شگفتہ رو جوان ہیں .... آپ ہندی شاعروں کے سرتاج ہیں اور نہایت خوش گو ۔ ان کے ہر شعر میں

بلا کا لطف بھرا ہوا ہے اور ان کے الفاظ کی چمن بندی میں گلِ معنی کے دستے کے دستے لگے ہوئے ہیں۔ سروِ آزاد ان کے ہر برجستہ مصرع کا غلام ہے اور ان کی فکرِ عالی کے سامنے ہر کسی کی طبعِ عالی بھی شرمندہ ہے۔ ریختہ کے شاعر ہیں۔ چنانچہ ان کو ملک الشعراء کا خطاب زیب دیتا ہے۔"[13]

ظاہر ہے کہ ان بزرگ شعرا پر تنقید کا جو انداز ہے اس میں ایک عقیدت سی ٹپکتی ہے۔ میر کی رائے ذوقی، وجدانی اور بے لاگ ہوتی ہے وہ شاعروں پر صاف اور سادہ الفاظ میں تنقید کرتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ کے الفاظ میں، اس کتاب کی عبارت نہایت سلیس اور مبالغہ اور استعارہ وغیرہ سے بالکل پاک و صاف ہے۔ تنقید بھی نہایت مختصر اور زوردار الفاظ میں ہے۔[14]

میر کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ ان کو فارسی نثر نگاری پر بھی قدرتِ کاملہ حاصل تھی۔ نکات الشعراء اور ذکرِ میر ان کی انشا پردازی کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کے ہمعصر شعرا بھی ان کی نثر نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کی نثر کی بڑی تعریف کی ہے[15]

میر عام طور پر مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں لیکن قافیہ کے التزام سے عبارت کی شگفتگی، بے ساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ ان کے یہاں جوابی فقرے اور جملے بھی چست ہوتے ہیں اور اپنا الگ لطف رکھتے ہیں۔ میر کے یہاں چھوٹے چھوٹے جملوں بلکہ دو لفظی فقروں کے بعد قافیہ آتا ہے تو عجب بہار دکھاتا ہے[16]

نکات کی تمہید (مقدمۂ مصنف) اور خاتمہ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔[17] میر نے ریختہ کی ابتدا سرزمین دکن سے ہونا تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے شعرائے دکن کے اکثر شعرا کی تذکرہ میں عدم شمولیت کا سبب بھی بتایا ہے[18]

میر کو نکات کی قدر دانی کا بھی احساس تھا[19]

نکات میں میر نے بعض مقام پر اپنے عظیم المرتبت ہونے کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر بھی ہم عصر شعرا کی طرح خود ستائی کے مرض میں مبتلا تھے۔ چنانچہ میر درد کے تذکرہ میں میر نے اپنے بارے میں میر درد کی رائے لکھی ہے:

"اے میر تقی میر! تم میرِ مجلس ہو جاؤ گے۔"[20]

نکات کی اس وجہ سے بھی بڑی اہمیت ہے کہ اس میں میر نے بعض شکوک کا ازالہ بھی کر دیا ہے۔ عام طور پر لوگ سعدی دکھنی اور سعدی شیرازی کو ایک ہی شخصیت سمجھتے تھے۔ اور بعض اُردو شعرا نے سعدی شیرازی کے بارے میں غلط روایات اپنے تذکروں میں درج کی ہیں۔ میر نے شیخ سعدی شیرازی کا ہندوستان آنا اور دکھن میں چند سال رہنے کی روایت کو لغو قرار دیا ہے۔

چنانچہ سعدی دکھنی کے تذکرے میں انھوں نے لکھا ہے:

"سعدی دکھنی آنچہ بعض ایں را شیخ سعدی رحمت اللہ علیہ گماں بردہ اند خطا است"[21]

اسی طرح مظہر جانِ جاں کو اکثر لوگ مظہر جانِ جاناں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ میر نے مظہر جانِ جاں کو صحیح اور جانِ جاناں کو بہ وجوہ غلط قرار دیا ہے۔ میر نے نکات میں مظہر جانِ جاں کی اصلیت بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"پدر او[22] مرزا جان جاں نام درشت از فرطِ شفقت (پدری) مرزا جان جاں می گفت ازیں سبب بہمیں اسم موسوم است۔"

نکات کا خاتمہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ میر نے شعرائے ریختہ کی زمرہ بندی کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں ریختہ کی چھ قسمیں تھیں اول۔ ریختہ کی پہلی قسم وہ ہے جس میں ایک مصرع ہندی اور ایک فارسی ہوتا ہے۔ دوسری قسم میں نصف مصرعہ ہندی اور نصف فارسی ہوتا ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں فارسی الفاظ و افعال استعمال کرتے ہیں۔ چوتھی قسم وہ ہے جس میں فارسی کی تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ پانچویں قسم ایہام ہے جس میں شعر کے دو معنی ہوتے ہیں ایک معنی قریب اور دوسرا معنی بعید۔ شاعر کی غرض معنی بعید سے ہوتی ہے۔ چھٹی قسم وہ ہے جسے میر نے خود اختیار کیا تھا۔ تشبیہ، استعارہ، صفائی گفتگو، فصاحت و بلاغت، ادا بندی اور خیال وغیرہ کو اس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

نکات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میر ہم عصر شعرا کی طرح زبان و ادب کو سماج کے اونچے طبقے یا طبقۂ اشراف کی جاگیر سمجھتے تھے۔ نکات میں میر نے بعض شعرا کے کلام پر اصلاح بھی دی ہے جس سے میر کی شعر فہمی، اندازِ فکر اور تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اصلاح زیادہ تر ان شاعروں کے اشعار پر دی گئی ہے جن سے میر کی نہیں بنتی تھی یا جو میر سے معاصرانہ چشمک رکھتے تھے۔

نکات کی اسلیے بھی بڑی اہمیت ہے کہ اس سے جہاں میر کے عہد کے سماجی، ثقافتی حالات کا اندازہ ہوتا ہے وہیں میر کی افتادِ طبع پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ میر اپنے تخلص کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کجھتے تھے۔ ایک دوسرے شاعر کے میر تخلص اختیار کرنے پر وہ ان سے ناخوش تھے۔ چنانچہ محمد میر کے تذکرے میں میر نے لکھا ہے:

"میر تخلص ہے۔ نہایت لائق اور خوش طبع جوان ہیں
حالانکہ ان کا اپنا الگ انداز ہے۔ لیکن میرے تخلص لے لینے
کی وجہ سے ان پر میرا دل آدھا خوش ہے۔" [۲۴]

لسانیات کی رو سے بھی اس تذکرے کی بڑی اہمیت ہے۔ تے، سوں، ہور وغیرہ دکنی الفاظ دہلوی شعراء نے بھی استعمال کئے ہیں جس سے اس عہد شاعری میں لسانیات کی نشاندہی ہوتی ہے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں ہندی عروض (پنگل) کا بھی بڑا رواج تھا اور بڑے سلیقے کے ساتھ ریختہ کے شاعر اسے برتتے تھے۔

نکات کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میر نے اس میں چار قسم کے شعراء کو جگہ دی ہے:

(۱) استادِ فن (۲) شاعر (۳) مصرعہ موزوں کرنے والے، (۴) سرقہ کرنے والے۔

جہاں تک میر کی اصلاحوں کا سوال ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جن شاعروں پر انھوں نے مصرعہ موزوں کرنے یا سرقہ کرنے کا الزام عائد کیا ہے ان میں اکثر و بیشتر شعراء سے میر کی نہیں بنتی تھی یا میر سے ان کی معاصرانہ چشمک تھی۔

نکات میں شاعروں کی ترتیب حروفِ تہجی کے لحاظ سے بھی نہیں کی گئی ہے۔ اس میں کئی ایسے شعراء کا بھی کلام شامل ہے جن کے حالاتِ زندگی، شخصیت اور شاعری پر میر نے کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔

نکات کو میر کی زندگی ہی میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ یہ تذکرہ میر کے عہد اور اس کے بعد بھی سب سے زیادہ بحث کا موضوع رہا ہے۔ متقدمین نے جہاں اسے نمونہ بناکر اپنے تذکرے مرتب کیے وہیں میر کے معترضین نے بھی اسے تنقیص، خردہ گیری اور عیب جوئی کا مجلہ قرار دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر شارب ردولوی:

"نکات الشعراء میں پایا جانے والا تنقیدی شعور اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت اہم ہے اس میں اعتدال و توازن کی کمی ہو سکتی ہے۔ اس پر جانبداری کا الزام بھی درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اپنے عہد کی فکر اور شعری بے راہ روی پر تازیانے کا کام کیا۔ میر کے سخت یا بے رحمانہ اعتراضات سے غیر معیاری شاعری کو زبردست دھکا لگا اور شعراء نے خود بھی اپنے کلام کے نقائص اور معائب پر غور کرنا شروع کر دیا، یعنی ایک صورت میں میر نے اپنی بے لاگ تنقید سے لوگوں میں تنقیدی شعور کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کیا اور انھیں عمل کے راستہ پر لگایا۔" [۲۵]

حواشی:

[۱] [۲] [۱۱] [۱۲] [۱۳] [۲۰] [۲۳] [۲۴] تذکرہ میر۔ از ایم کے فاطمی دانش محل لکھنؤ

[۵] [۶] [۳] [۴] [۷] [۸] [۹] [۱۰] [۱۵] [۱۶] [۱۸] [۱۹] [۲۱] [۲۲] نکات الشعراء مطبوعہ دانش محل لکھنؤ

[۱۴] تاریخ ادب اُردو۔ از رام بابو سکسینہ

[۱۶] فیضِ میر۔ مترجمہ سید مسعود حسن رضوی ادیب

[۲۵] جدید اُردو تنقید۔ از ڈاکٹر شارب ردولوی

■ ■

اپنے معاونین سے

* اشاعت کی غرض سے اپنی شعری و نثری تخلیق کی اصل کاپی ہی ارسال کریں، فوٹو اسٹیٹ یا کاربن کاپی نہیں۔
* جواب طلب امور کے لیے اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ ضرور ارسال کریں۔
* اشاعت کے لیے جو بھی شعری یا نثری تخلیق ارسال کریں، اس کی نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

ادارہ

غزلیں

اختر لکھنوی
ریڈیو پاکستان، کراچی

نہ تم وہ تم، نہ وہ ہم ہم ہیں یار، دیکھو تو
مذاقِ گردشِ لیل و نہار دیکھو تو

تم اپنے ہو نہ سکے پھر بھی تم کو اپنا کہا
مرا خلوص، مرا اعتبار، دیکھو تو

کھلی کتاب ہوں میں، آئینہ مثال ہوں میں
مری طرف بھی کبھی ایک بار دیکھو تو

نہ جانے کیسے گزاری تھی ایک ایک گھڑی
نہ آئی اب کے برس بھی بہار دیکھو تو

وہاں بھی تھے تو غریب الوطن تھے ہم اختر
یہاں بھی ٹھہرے غریب الدیار دیکھو تو

شاکر جرولی
اونچا مکان، قصبہ جرول
بہرائچ

فقط حروف، خالی زباں ڈھونڈتے ہیں
کتابوں میں چھپ کر کہاں ڈھونڈتے ہیں

خیالوں کے پیکر جہاں گم ہوئے تھے
وہی خواب سی بستیاں ڈھونڈتے ہیں

میں گر چپ رہوں تو مجھے پڑھنے والے
خموشی میں بھی داستاں ڈھونڈتے ہیں

لباسِ نزاکت میں رنگوں سے بوجھل
ہر اک موڑ پر تتلیاں ڈھونڈتے ہیں

بھرے شہر میں کچھ تکلم کے ترسے
خود اپنی ہی پرچھائیاں ڈھونڈتے ہیں

کہاں حادثے ہیں کہ پھر روزنامے
سلگتی ہوئی سرخیاں ڈھونڈتے ہیں

انھیں کو جلاتے ہیں شعلے جو شاکر
بھڑکنے سے پہلے دھواں ڈھونڈتے ہیں

ڈاکٹر علی باقر زیدی
۱۲- مقبرہ گولہ گنج، لکھنؤ

"لندن کی ایک رات": — ایک جائزہ

اردو فکشن کا آغاز اساطیر اور داستانوں سے ہوتا ہے ان کہانیوں میں محیر العقل مافوق الفطرت واقعات ملتے ہیں، لیکن کہیں کہیں چوتھے درویش، میاں آزاد، اور خوجی کی شکل میں جاندار کیرکٹر بھی سیاہ رات میں جگنو کی طرح چمک جاتے ہیں۔

داستانوں کے بعد انیسویں صدی کے اوائل سے ناول کا دور شروع ہوا۔ ابتدائی زمانے میں ڈپٹی نذیر احمد، منشی سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا، فیاض علی، اور راشد الخیری وغیرہ نے ناول لکھے۔ اس دور کے ناولوں میں "امراؤ جان ادا" واحد ناول ہے جس کو فن کے لحاظ سے اعلاترین ناول کہا جا سکتا ہے، یکایک ۱۹۰۱ء میں فکشن کے آسمان پر ایک ماہتاب طلوع ہوا جس کو ہم پریم چند کہتے ہیں۔ پریم چند نے ۱۹۰۲ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک یعنی "اسرار معابد" سے لے کر "منگل سوتر" تک تقریباً چودہ ناول لکھے۔ اس میں شک نہیں کہ پریم چند نے اردو فکشن کو ایک نیا موڑ دیا، حسن کو نئے زاویئے سے دیکھنے کی کوشش کی اور ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنا کر پیش کیا۔ سماجی حقیقت نگاری کے لحاظ سے بھی پریم چند کے ناولوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ان سب کے باوجود ان کے ہاں حالات کا منطقی تجزیہ اور سائنسی انداز فکر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں سماجی برائیاں، چھوٹے کسانوں اور ہریجنوں پر زمینداروں اور اونچی ذات والوں کے مظالم، اور غریبوں کا دکھ درد تو ملتا ہے لیکن ان سب کی تان قضا و قدر پر ٹوٹتی نظر آتی ہے۔

۱۹۳۸ء میں سجاد ظہیر کا ایک مختصر ناول "لندن کی ایک رات" منظر عام پر آتا ہے۔ یہ ناول بہت مختصر ہے لیکن جدید فکشن میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کو انھوں نے ۱۹۳۶ء میں لندن سے واپسی کے دوران لکھا تھا۔ وہ ناول کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> "اس کا بیشتر حصہ لندن، پیرس، اور ہندستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا۔ آج اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے ..... یورپ میں کئی برس طالب علم کی حیثیت سے رہ چکنے کے بعد اور تعلیم ختم کرنے کے بعد چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر ایک مخصوص جذباتی کشمکش سے متاثر ہو کر سو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندستان میں ڈھائی سال مزدوروں کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔"

"لندن کی ایک رات" ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ناولٹ ہے اس کا کینوس بہت وسیع ہے، یہ ناول ہندوستان اور لندن کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات پر محیط ہے اس کے علاوہ اس میں نفسیات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے، جب یہ ناولٹ لکھا گیا اس وقت سامراجی نظام کا پایۂ تخت ڈگمگا رہا تھا، ہندستان میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی اور روس کے اشتراکی نظام سے ہندستانی ادب اور کلچر نیز یہاں کا دانشور طبقہ متاثر ہو رہا تھا۔ زندگی کی نئی قدریں جنم لے رہی تھیں اور سماج کا ایک بڑا طبقہ سرمایہ، محنت، استحصال، حکومت، عوام اور جمہوریت کے موضوع پر سوچنے لگا تھا۔ چنانچہ "لندن کی ایک رات" میں اس دور کی زندگی کے مختلف النوع مسائل بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔

ٹکنک کے اعتبار سے بھی اردو ادب میں یہ ناول اولیت اور ادیت کا حامل ہے۔ اس کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے۔ تو جیمس ائس کے ناول یولیسس سے۔ وہاں ڈبلن کے ایک دن کی کہانی ملتی ہے یہاں لندن کی ایک رات کی داستان۔ ناول میں Sequence of time place and action کا بھی خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ نعیم کا کمرہ لندن میں مقیم طالب علموں کا ایک طرح سے کلب تھا جہاں شام کو سبھی دوست اکٹھا ہوتے تھے۔ چنانچہ جس رات کی یہ کہانی ہے اس روز نعیم کے یہاں ایک مخصوص پارٹی تھی جس میں اعظم، مس جین، راؤ عارف، احسان، شیلا گرین، اور کریمہ وغیرہ اکٹھا ہوتے ہیں۔ کہانی نعیم کے کمرے میں آٹھ بجے شب کو شروع ہوتی ہے اور صبح ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ جب کئی دوست ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں تو اہم اور سلگتے ہوئے مسائل پر گفتگو تقاضائے فطرت ہے چنانچہ یہ سارے دوست بھی جب اکٹھا ہوتے ہیں تو مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ اس طرح کہانی اپنے دور کے سماجی، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی دائروں کی طرف فطری انداز میں آگے بڑھنے لگتی ہے۔ اور کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف شعوری طور پر کہانی کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ان طالب علموں کے اپنے اپنے الگ مسائل ہیں جو ایک کردار کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً نعیم لندن جانے والے ان امیر طلبہ کی نمائندگی کرتا ہے جو صرف تفریح کی غرض سے لندن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک نفسیاتی مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔ وہ جوان ہے اور اس کے دل میں بھی کسی لڑکی کو اپنا دوست بنانے کی خواہش ہے لیکن اپنے بھدّے جسم کی وجہ سے وہ اس ذہنی کرب میں مبتلا رہتا ہے کہ کوئی لڑکی اس پر عاشق نہیں ہو سکتی۔ لاشعور کی یہ خواہش اس وقت سامنے آتی ہے جب ایک حسین لڑکی شیلا گرین کو اپنے قریب پا کر وہ اپنے دل میں سوچتا ہے۔

"خوبصورت لڑکی ہے۔ خوبصورت۔ لیکن میں! مجھے کوئی خوبصورت کہہ سکتا ہے؟ مجھ پر کوئی لڑکی عاشق نہیں ہوئی۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے میں موٹا بہت ہوں۔ میرے عشق کے درمیان میری توند حائل ہے۔ معلوم نہیں یہ لڑکی مجھے کیا سمجھتی ہے۔ توند سے کیا ہوتا ہے۔"

ایک نوجوان کی فطری، جنسی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے، جب نعیم مس شیلا گرین کے حسن سے متاثر ہو کر اپنے دل میں سوچتا ہے۔

" اس لڑکی کے لب کتنے اچھے ہیں، اور بغیر لالی لگائے ہوئے عنابی ہیں...... اس کے بال کاش کہ میں انھیں چھو سکتا۔"

کچھ طالب علم لندن آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے اور وہاں سے واپس آ کر حاکم بن کر حکومت کرنے کا خواب دیکھتے تھے، اس جذبے کا جیتا جاگتا نمونہ عارف کا کردار ہے۔

مس شیلا گرین جب کوششوں کے باوجود ملتفت نہیں ہوتی تو عارف دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اس کیفیت کا اظہار اس طرح ملتا ہے:

" وہ جو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کر کے ہندستان کے سیکڑوں ہزاروں انسانوں پر حکومت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ جس کی ایک نظر خشمگیں سے غریب ہندستانیوں کے دل لرز جائیں گے۔ عارف ابھی سے اس حاکمانہ طاقت کی، شراب کے مزے لینے لگا تھا۔"

کچھ طالب علم لندن جا کر انگریز بننے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ انھیں میں عارف بھی تھا۔ سجاد ظہیر اس کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں۔

" عارف لیلائے سول سروس کا مجنوں تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی سما گئی تھی کہ انگریزی کپڑے اچھی طرح پہننا، انگریزی زبان انگریزی لہجہ میں بولنا...... کلکٹری کے امیدوار کا فرض ہے۔ انھیں پکے صاحب لوگوں میں ایک مسلمان کلکٹر صاحب تھے، جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے بقرعید کے دن اپنے مسلمان منشی سے پوچھا "ویل منشی کیا آج تم لوگوں کا بڑا دن ہے۔"

ان طالب علموں میں کچھ ذہین اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً راؤ ایک ذہین طالب علم ہے جو ہندستان کی جنگِ آزادی کی تحریک سے متاثر ہے اور ہندستان واپس آ کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ احسان مارکسی فلسفہ سے متاثر ہے۔ اور ہندستان آ کر وہ غیر استحصالی، سماج اور سوشلزم کی بنیاد پر حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی عکاسی اس وقت ہوتی ہے، جب دورانِ گفتگو احسان اپنے دوستوں سے کہتا ہے:

" تم سب کے سب رئیس، بنیئے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر،

پروفیسر، انجینیئر، سرکاری نوکر جونک کی طرح ہو اور ہندستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت ہمیشہ قائم نہیں رہیگی۔"

دوسری جنگِ عظیم کے بعد فاشزم کو شکست تو ضرور ہوگئی تھی، لیکن سامراج وا د سرمایہ دارانہ نظام کی شکل میں ابھر کر سامنے آگیا تھا۔ جس کے نتیجے میں لندن میں بھی مہنگائی، مفلسی اور بیکاری بڑھنے لگی تھی، اور حکومت زوال پذیر تھی۔ اس حقیقت کو سجاد ظہیر ناول میں اس طرح بے نقاب کرتے ہیں:

" تم کرتی کیا ہو۔ عارف نے انگریز لڑکی سے پوچھا۔ کون — ! میں۔ میں کیا کرتی ہوں۔ لڑکی قہقہہ مار کر ہنسی۔ اکثر تو میں فاقہ کرتی ہوں گو کہ میری شکل دیکھ کر لوگوں کو وہم وگمان تک نہ ہوگا۔ آپ نوکری کیوں نہیں کرتیں۔ ملتی ہی نہیں، لڑکی نے جواب دیا۔ "

ہندستان کی جنگِ آزادی کی تحریک کے اثرات لندن میں مقیم ہندستانیوں پر بھی پڑنے لگے تھے۔ ہندستانی طلبے نے لندن میں انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ قائم کر دی تھی۔ اور ہائیڈ پارک میں آئے دن جلسے اور مظاہرے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انگریز ہندستانیوں کو کس حقارت سے دیکھتے تھے اور اس کا وہاں کے مقیم نوجوان طلبہ پر کیا اثر ہوتا تھا، اس کی عکاسی اعظم کے الفاظ میں اس طرح ملتی ہے:

" بیکار مزدوروں کا ہائیڈ پارک میں جلسہ۔ دس انگریز سپاہیوں نے دس ہزار ہندستانی نیٹیوز (Natives) کو فساد کرنے سے روکا۔ ایک گورا زخمی ہوا۔ پندرہ نیٹیوز کی جان گئی۔ اعظم کا خیال ایک لمحے کے لئے اپنے دوست کے انتظار سے ہٹ کر وطن کی طرف گیا۔ یہ کمبخت انگریزی اخبار کتنی حقارت سے ہم ہندستانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ نیٹیوز ہم نیٹیوز ہیں۔ اور یہ لال منہے بندر جو اس ملک میں رہتے ہیں کون ہیں۔"

انگریزوں کے ذلت آمیز برتاؤ کی مثال ایک دوسری جگہ اس طرح ملتی ہے:

" ہیلو بلیکی۔ اس نے اعظم اور راؤ کو پکار کر کہا میں تین برس ہندستانی فوج میں تھا۔ میں کلکتہ، دہلی، آگرہ، میرٹھ پشاور سب دیکھا۔ کلکتہ اچھا شہر ہے۔ میں نے خوب مزہ کیا۔ ہندستان میں لڑکیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

اعظم کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا، اور اپنے شراب کے گلاس پر نظر جما کر اس نے آہستہ سے کہا " سور کا بچہ"۔

ہندستان کی جنگِ آزادی اور اس کے نتائج پر لندن میں بھی کچھ لوگ ایمان داری سے سوچ رہے تھے۔ اس کی مثال ہمیں اس وقت ملتی ہے، جب جیم اپنے دوست ٹام سے کہتا ہے:

" ہم انگریز ہندستان میں جا کر بغیر فوج کی روزانہ مدد کے حکومت نہیں کر سکتے، تو میں یہ کہتا ہوں کہ اب اس بات کا وقت آگیا ہے کہ ہم ہندستان سے اپنا بوریا بستر سنبھال کر واپس چلے آئیں اور ہندستانیوں کو ان کا ملک حوالے کر دیں۔"

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹکنک، سماجی حقیقت نگاری، منطقی تجزیہ سائنسی اندازِ فکر اور تحلیل نفسی کی بنیادوں پر ایک بہت بڑے کینوس پر یہ ناولٹ ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آیا۔ سجاد ظہیر نے کردار نگاری، زبان اور مکالمہ نگاری کو بھی مناسب طریقے پر استعمال کیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں اردو کے مشہور ناول نگار علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

" سجاد ظہیر کا ناول " لندن کی ایک رات" گو اس وقت کی پیداوار ہے جب وہ اشتمالی مصنفین کے دوش بدوش انگلستان و فرانس میں کام کر رہے تھے .... سجاد ظہیر فطری طور پر ایک آرٹسٹ کا دل و دماغ لائے تھے، اگر سیاست نے انھیں ادب سے چھین نہ لیا ہوتا تو ممکن تھا کسی دن وہ ہندستان کے گورکی بن جاتے"

✡

غزلیں

احمد جلیلی

۲۲-۱-۰ سلطان پورہ
آباد

کو پہچان لینے کا ہنر کب آئے گا
نظر کے سامنے ہے وہ نظر کب آئے گا

شنی پہنچے گی جس کی ہر درو دیوار تک
ت لے کر وہ چراغ رہ گزر کب آئے گا

ادثہ بھی جیسے اب میری ضرورت ہے کوئی
منتظر ہوں دیر سے پھر لوٹ کر کب آئے گا

لف کے بادل جو لہرائے تو آیا یہ خیال
یہ بکھرنے کو ہمارے دوش پر کب آئے گا

جانے کب تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی
دور پھر میرا مری دہلیز پر کب آئے گا

کارواں والے لیے پھرتے ہیں پتھر ہاتھ میں
جستجو میں ہیں کہ شیشے کا نگر کب آئے گا

ہم کھڑے ہیں پھول لے کر اسکے استقبال کو
راہ میں کانٹے بچھانے وہ ادھر کب آئے گا

جو مرے اشعار میں جھلکے ہے وہ جانِ غزل
پردۂ الفاظ سے باہر نظر کب آئے گا

یوں پھریں گے دربدر اہلِ قلم کب تک علی
ان ہنرمندوں کو جینے کا ہنر کب آئے گا

تسنیم فاروقی

تلسی داس مارگ
نزد اسپتال۔ لکھنؤ

ہوا کدھر کی ہے کیسی ہے کیا جھونکا ہے
جو رُخ کو جان لے اس کا چراغ جلتا ہے

خدا نے اس کو اُجالا دیا ہے چہرے کا
وہ آئینے کو اندھیرے میں دیکھ لیتا ہے

سبھی نے پہنیں تری دلکشی کی زنجیریں
تری نظر سے جو بچ جائے وہ فرشتا ہے

یہ سرزمین سجی ہے ہمارے چہروں سے
ہمارے خون کا اس پر حساب لکھتا ہے

گھٹا چھپائے کہاں تک گھٹا چھپائے گی
چمکنے والا ستارہ چمکتا رہتا ہے

کچھ اور اس کی ہنسی میں خدا اضافہ کرے
ہمارے حال پہ اکثر وہ مسکراتا ہے

بچھی ہیں جال کی صورت لہو کی تحریریں
وطن بھی اب مرے دل کی طرح دھڑکتا ہے

تمام شہر اُجالے میں غرق ہے تسنیم
مگر اُجالے کے اندر بڑا اندھیرا ہے

قمر قدیر ارم
بارہ دری، مراد آباد

سجنی مر کر ریختی کی مانگ سونی کر گیا

کبھی ریختی کا بھی زمانہ تھا۔ کیا ادائیں تھیں، کیا جوانی تھی کہ اچھے اچھے ہوش والے اس کے آگے پانی بھرا کرتے تھے۔ بقاؔ، ذلیلؔ، محکوقؔ، نسبتؔ، امجد علی خاں عصمتؔ، ہدایتؔ، علی بیگ دہلوی نازنینؔ، تصورؔ، آفاقؔ، نکتہ چینؔ، نازکؔ، عابدؔ، مرزا بیگم، محمد محسن خاں عنقاؔ، شیداؔ، خانم خاں، آشفتہؔ، بے چینؔ، قدرتؔ، بہادرؔ، ثریاؔ، پریؔ، رقاصہؔ، فناؔ، تسکینؔ، جولاںؔ، دگانہ حزیںؔ، آشوبؔ، راحتؔ، عشرتؔ، مکینؔ، عاشقؔ، یک رنگؔ، شبنمؔ، رونقؔ، قریںؔ، رنجورؔ، مجیدؔ، عارفیؔ، خواصیؔ، اشرفؔ، رحیمؔ، رحمٰنؔ اور انشاؔ ــــ یہ تو تھے وہ سب جو کھلم کھلا ریختی کے دیوانے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو بظاہر تو زاہد خشک تھے، خالص دیجی ٹیرین تھے لیکن بہ باطن اسی گوشت پوست کی، جذبات سے چھلکتی منچلی حسینہ کے رسیا تھے۔

لیکن اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اس حسینہ پر ایسی جوانی پھوٹی کہاں سے اور پھر چلی کہاں گئی؟ ایک طرف سعادت یار خاں رنگینؔ کا یہ دعویٰ کہ وہی اس کو منظر عام پر لائے ہیں اور دوسری طرف اس کو رحیمؔ کا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے دوسری دلیل ہی چاہے درست ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ رنگینؔ نے ہی ریختی کو اس کی بے مہار جوانی کا احساس کرایا اور اس کی صبح و شام کو قوس قزح کے رنگوں سے بھر دیا۔ یہاں ہم میر یار علی جانؔ کی جانبازیاں بھی فراموش نہیں کر سکتے جنھوں نے اس کو اور ہوش ربا بنا دیا۔ قدم قدم پر جان و دل صدقے کیے۔ جب وہ اس کو پہلو سے لگا کر روسا اور نوابین کی مخصوص محافل میں اس کی ہمجولی بن کر پورے ساج و سنگار اور غرارے دوپٹے میں ناچا کرتے تھے تو چلمن کے پیچھے بیٹھی بیگمات لوٹ پوٹ ہو جایا کرتی تھیں

ریختی کے نشیب و فراز اور اس کی چال ڈھال نے کچھ ایسا جادو پھونکا کہ واجد علی شاہ کی بیگم رشک محل تک اس کے سحر میں آگئیں اور ریختی گو بن بیٹھیں۔ لیکن جو مزہ اور رس لوگوں کو جانؔ کی ریختی میں محسوس ہوتا تھا وہ بھلا اور کہاں تھا۔ بقول آغا صاحب ؎

مزا ہے ریختی میں مردووں کے شعر کہنے کا
موا اپنے موافق جانؔ صاحب خوب کہتا ہے

یہ صنف اردو منظومات میں ایک عرصہ تک اپنا لوہا منواتی رہی۔ قصیدے اور مثنوی کی طرح یہ بھی درباروں میں پلی بڑھی، جوان ہوئی تھی۔ اسی لیے اس کا زمانہ بھی درباروں کے ساتھ ختم ہو گیا۔

جانؔ نے ایک مطلع واجد علی شاہ کے معزول ہونے پر کہا تھا لیکن واجد علی شاہ کی گدی کیا گئی، ریختی کے نیچے سے زمین سرک گئی اور اس کی بلاخیزی کی بھی کمر دُکھنے لگی۔ شاہوں کی منھ چڑھی، نوابوں کی منھ لگی اور درباریوں کے سر چڑھی یہ پرکشش گڑیا ایسے یکایک چھن سے نیچے گری کہ سہاگ کی تمام چوڑیاں توڑ بیٹھی۔ تمام طمطراق جاتا رہا، سر پر سفیدی چھانے لگی، چہرے پر جھرّیاں اُبھر آئیں اور اپنی اس ہیئت کذائی کے ساتھ یہ گوشہ نشین ہو کر رہ گئی۔ اب کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ

"بوا کس حال میں ہو۔ نوج! یہ بیوگی کیوں طاری کر لی
تم نے۔ اٹھو اور اس موئے زمانے کی ناک میں
پھر سے نکیل ڈال دو۔"

پتہ نہیں کتنے عرصے تک یہ ریختی یونہی کسمپرسی کے عالم میں پڑی رہتی کہ اچانک اُسی کے وطن سے ایک نئی صبح کا طلوع ہوا۔ ایک انقلاب جاگا۔

پیدا ہوئی تھی اور اب جہاں ایڑیاں رگڑ رہی تھی اسی زمین سے ایک چشمہ پھوٹا ایک مسیحا نمودار ہوا۔ اور پھر اس نے اس کی دُنیا بسا دی۔ اس کی کشتی کو پار لگانے کا سودا سر میں لیے اس کو پستی سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اس نے نہ صرف یہ کہ اس کو نئی زندگی دی، اس کی مانگ میں نیا سیندور بھرا اور اپنے محلاتِ شاعری کی دلہن بنایا بلکہ اس کو سوقیانہ پن، جنس زدگی ابتذال اور برہنگی سے بچانے کے لیے اس کے بدن پر اپنے لطیف اور باوقار اندازِ بیان کی چادر ڈال دی۔ اور اس طرح ریختی کو اس لائق بنا دیا کہ مخصوص قسم کی محفلوں کی ناپاک گھٹن سے نکل کر یہ ایک عزت دار خاندان کی وارث اور ولی بن گئی۔ وہ مسیحا تھا ساجد لکھنوی، جو ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوا اور اچھی خاصی غزل سے آشنائی چھوڑ کر اس کے فراق میں ۱۹۵۳ء میں ساجد سے سجنی بن گیا۔

ایسا نہیں ہے کہ ساجد سجنی کے یہاں ذومعنی کیفیت بالکل نہیں ہے یا اشارے کنائے نہیں ہیں کیونکہ ریختی کے خمیر میں جو شامل کیا گیا تھا وہ تو عین اس کی فطرت تھا۔ اپنی مٹی کی صداقت سے وہ کیسے مکرتی۔ اس کے بغیر تو ریختی ریختی ہی نہ رہتی، لیکن یہ دوہری معنویت، یہ اشارے کنائے، سپاٹ پن، ابتذال اور سوقیانہ پن سے دُور ہیں اور اس کے باوجود ساجد سجنی کے اشعار میں ریختی کا تمام تر حسن و شباب ہے۔ بھرپور نسائیت ہے سجنی کی ریختی درباری رقاصہ نہیں ہے بلکہ وہ عصرِ حاضر کی ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے، بہو ہے اور اس دور کے مسائل سے دوچار بھی ہے۔ وہ سیاست میں بھی دلچسپی لیتی ہے، اسکول اور دفتر بھی جاتی ہے اور ساتھ ہی بھرے پڑے کنبہ کی فرد بھی ہے جس پر شوہر، بچوں، بھائیوں، بھابیوں، بہنوں، دیوروں اور نندوں وغیرہ کے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں ؎

فرض کیونکر نہ ہو شوہر کی اطاعت مجھ پر
یہ بہنا دوسرے درجہ پہ خدا ہوتا ہے

بچوں کی دیکھ بھال، بھرے گھر کا کام کاج
رہتی ہوں بدحواس سویرے سے شام تک

کہیں نازو بھی اپنے گھر کی ہولے
یہی ہے فکرِ صبح و شام بھابی!

دیورانیاں، جٹھانیاں، نندیں ہیں ساس ہے
سسرال آکے گھر گئی کتنی بلاؤں میں

میری بچی رو رہی ہے، میں ابھی سُلا کے آئی
ذرا بھابی دیکھے رہنا، کہیں دُودھ اُبل نہ جائے

رات کو دفتر سے گھر پہنچی تو بھابی نے کہا
کچھ بتاؤ تو مری جاں، دیر سے آنے کا راز

اُردو شاعری میں رقیب کو تو قدم قدم پر زچ کیا ہی گیا ہے اور سجنی رقیبن کے درپے آزار ہیں۔ اس خاص رشتے اور کیفیت کی عکاسی میں سجنی طاق ہی نہیں بے باک بھی ہیں۔ یہ کٹیلا پن ریختی کو ان سے پہلے کہاں ملا تھا ؎

وہ رقیبن کے گھر جا کے سوئے
رات بھر میں نے تکیے بھگوئے

دُعا یہ اپنی پڑوسن کو آج دی میں نے
کہ ان کی شکل کا اللہ تجھ کو بھائی دے

میری مہندی رچی دیکھ کر!
ہاتھ سوتن نے کیا کیا ملے

تیر کی مانند کرچیں میرے دل میں چُبھ گئیں
ان کے بستر پر جو اک چوڑی ملی ٹوٹی ہوئی

بس اک آگ سی لگ گئی تن بدن میں
سویرے جو آکر وہ گھر میں نہائے

ہائے رے بیلیں پا پڑ تو ہستم
اور نگوڑی رقیبن تلے

رقیبن کو ہوئی دق کیوں میں صحت کی دُعا مانگوں
موئی وہ کل کی جو مرتی ہوئی ہو آج مرجائے

تجمّی کے یہاں ریختی کو تکرار کا ایک نیا لہجہ ملا ہے جو کانوں میں سرگوشیاں بھی کرتا ہے اور جاکر سینے میں ٹوٹتا بھی ہے ؎

اب نہ مانوں گی نہ مانوں گی کوئی آپ کی بات
کہے دیتی ہوں کہ کل سے مرا روزہ ہوگا

اب ایک جو کہے گا تو ستّر سناؤں گی
اب تک جو کچھ کسی نے کہا ٹالتی رہی

گھورتا ہے عورتوں کو کیوں موئے
تیرے گھر تیری نہیں ہیں مائیں کیا

چو پٹے درزی نے سب کپڑا مٹا کر رکھ دیا
نوج سلوائے کوئی شلوار تیرے شہر میں

تمھیں نوازا ہے سب میرے میکے والوں نے
تمھارے گھر میں یہ سب تام جھام کس کا تھا

ساجد تجمّی نے ریختی کو انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ برتا اور اس کی ازلی معصومیت اور معنویت میں کہیں کمی نہ آنے دی ؎

بدگمانی کی کوئی حد ہے الٰہی توبہ!
دولھا بھائی سے وہ کہتے ہیں کہ پردہ ہوگا

وہ اب بھی میرے دوپٹہ کی تہ میں رکھا ہے
جو اس نے پیش کیا تھا گلاب عید کے دن

تجمّی کی ریختی اب وہ پہلے جیسی ریختی نہ تھی جو دوسروں کے اشاروں پر ناچتی۔ اس کی سوجھ بوجھ اور موقع شناسی نے اب اس کے ذہن کا کینوس حد درجہ وسیع کر دیا تھا ؎

میرے بستر پہ تم نہ سو بھابی
ان کو میرا گماں نہ ہو جائے

طلاق رے تو رہے ہو عتاب و قہر کے ساتھ
مرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ [۳]

اللہ میں دو دو کو کس طرح نباہوں گی
اک وہ ہے مرا عاشق اک اس کا بڑا بھائی

سُرخ چولی، سُرخ ساڑی، سُرخ چپّل، سُرخ پرس
اُوئی اللہ تم تو بھابی کا مرڈن ہو گئیں

لیکن زمانہ کب ایک سا رہتا ہے۔ ریختی کی قسمت ایسی کہاں تھی کہ سدا سہاگن رہتی۔ بالآخر ایک طوفان بلا آیا۔ اور بھوپال گیس سانحہ نے اس کی مانگ سونی کر دی۔ ایک عرصہ تک اس زہریلی گیس کے اثرات سے لڑتے لڑتے کے بعد آخر کار ۱۵ر اگست ۱۹۸۹ء کو ریختی کا یہ محسن دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ ایک بار پھر اس بھرے جہاں میں ریختی تن تنہا رہ گئی۔ لیکن وہ ایک شہید کی ریختی ہے اسی لیے تو ببانگِ دہل کہہ رہی ہے ؎

رکھوں گی زندگی بھر میں سہاگ اپنے بڑھاپے کا
رہیں گی جھرّیاں ہاتھوں کی میرے چوڑیاں ہو کر

حواشی:

[۱] رنگین نے اپنے دیوان کے دیباچے میں یہ دعویٰ کیا ہے۔
(دیوانِ رنگین و انشا مرتبہ نظامی بدایونی)

[۲] خزینۃ العلوم فی متعلقات [۳] ساجد تجمّی لکھنوی کے اس شعر کو اکثر ادبا و شعرا نے پروین شاکر یا دیگر کسی شاعرہ کا شعر سمجھتے ہیں جبکہ یہ پوری غزل ساجد تجمّی کی ہے اور ان کے مجموعہ "نگوڑیات" کے صفحہ ۲۳ پر موجود ہے۔

غزلیں

مظہر احمد
۳۰۱۴، محلہ قبرستان
ترکمان گیٹ، دہلی

چاہتوں کا ایک دریا موجزن آنکھوں میں تھا
اس کے پیکر کا تو سارا بانکپن آنکھوں میں تھا

زندگی صحرا کی آندھی تھی، نظر ویران تھی
اس سے ملتے ہی چمن اندر چمن آنکھوں میں تھا

زندگی ہم نے لٹا دی، آگہی کے نام پر
خواب جب ٹوٹا تو اک دیوانہ پن آنکھوں میں تھا

مصلحت کے شہر میں کیسے جئیں کیونکر جئیں
حسرتوں کا ایک لاشہ بے کفن آنکھوں میں تھا

بارشوں کی ہر تمنا اب کے دل میں رہ گئی
چرخِ نیلی فام کا رنگِ کہن آنکھوں میں تھا

اب کے مظہر ہر چمن کے رنگ پھیکے پڑ گئے
اس کے رنگ و بو کا سادہ پیرہن آنکھوں میں تھا

مہدی حیدر زیدی
۵۴۔ نیو بلڈنگ ہائی کورٹ
الہ آباد

روشنی پھیلنے والی تھی کہ گھر سے نکلے
اپنے اجداد کی رسوائی کے ڈر سے نکلے

ہر قدم راہ میں دیوارِ انا حائل ہے
کیسے پھر کوئی تری راہ گزر سے نکلے

ہم نے چاہا تھا ذرا پاس سے دنیا دیکھیں
عمر بھر پھر نہ سرابوں کے سفر سے نکلے

یاد آ جاتا ہے حیدر ہمیں بانی اکثر
جب کہیں کوئی گھنا سایہ شجر سے نکلے

روشن لال روشن
ڈی ۴۷/۱۱ اے راناپورہ
وارانسی

عجب منظر فضا کا
لہو پانی ہوا کا

فضائیں پانی پانی
ہنر ریگِ انا کا

مراحل سر بہ خم ہیں
سفر مردِ خدا کا

شفق مژدہ مناظر!
لہو چہرا فضا کا

زمیں شاداب تازہ
اثر میری دعا کا

افق کی راہ روشن
کرشمہ نقشِ پا کا

سکینہ زیدی
م خضر راہ ۱۲/۱ گوالٹولی
ن پور

افسانہ

اندھیرے کی چادر

"میاؤں۔ میاؤں" پوسی کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ نیند سے چونک پڑیں.

"آ گئی تو گھوم پھر کر" وہ لیٹے لیٹے بڑبڑائیں.

"میاؤں — میاؤں" پوسی نے انھیں گھور کر دیکھا. جیسے کہہ رہی ہو "جی دادی اماں"

"کیا بھوکی ہے؟" انھوں نے پوچھا

اور میاؤں میاؤں کر کے وہ ان کے پیروں کو چاٹنے لگی.

انھوں نے اٹھ کر الماری سے دودھ کا گلاس اٹھایا جس میں صبح کا بچا ہوا دودھ پڑا تھا، اسے انھوں نے پوسی کے پیالے میں پلٹ دیا اور وہ سپڑ سپڑ کر کے سارا دودھ پی گئی۔ پھر اپنے ہاتھ پیروں سے منھ کو پونچھ کر ان کے پیروں سے لپٹ گئی.

اس اندھیرے کمرے میں یہی پوسی ان کی مونس و غم خوار تھی جس کی موجودگی سے انھیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں. روشنی سے انھیں خوف معلوم ہوتا تھا اور انھیں اپنی آنکھیں زخمی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں. کمرے کی تاریک فضا سے انھیں ذہنی سکون حاصل ہوتا کیونکہ وہ بہوؤں کی نفرت بھری خشمگیں نگاہوں سے محفوظ رہتیں اور بیٹوں کے بے رخی کے جذبات والے چہرے نہ دیکھ پاتیں اور اس سے ان کو طمانیت ملتی.

کم از کم ان لمحوں میں تو انھیں عافیت اور سکون ملتا، جب تک اندھیرے کی حکمرانی ان کے کمرے میں رہتی اور جیسے ہی سورج کی کرنیں پھیلتیں ان کی آنکھیں زخمی ہونا شروع ہو جاتیں۔ وہ تمام دن اس نفرت و بے رخی کی تمازت میں جلتی رہتیں. ملحقہ کمروں میں ان کے بیٹے اپنی چہیتی بیویوں سے ہنستے بولتے رہتے اور وہ تنہائی کی آگ میں جلتی رہتیں. محبت کے بول کو ترستی رہتیں۔ اس ناروا سلوک کی ابتدا پہلے بڑے بیٹے اور بہو سے ہوئی پھر رفتہ رفتہ چھوٹے لڑکے انور اور اس کی بیوی نے بھی اسی روش پر چلنا شروع کر دیا..... خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے.

طنز کے تیر، چبھتے جملے۔ پھر ان کی عیب جوئی۔ بہتان۔ ان کی بیماری کو ہدف ... کام چور، بے مصرف۔ ناکارہ ہیں — وغیرہ وغیرہ جیسے جملے ان کی سماعت میں زہر بھرتے رہتے.

وہ سوچتیں کہ اولاد تو ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے لیکن ایک ان کے بیٹے ہیں کہ بیویوں کا منھ دیکھتے ہی ماں کو ناکارہ و بے مصرف سمجھ بیٹھے. کاش لڑکوں کے بجائے لڑکی کوکھ سے جنم لیتی تو انھیں آرام و آسائش ملتی — پڑوس کے خاں صاحب کی لڑکی نے بیماری میں ان کی کس قدر خدمت کی۔ اور ایک وہ ہیں کہ اولاد ہوتے ہوئے بھی بے اولاد لگتی ہیں — کتنی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کر کے گوشت کے لوتھڑوں کو پروان چڑھایا. اپنا خون پلا پلا کر ان کو اس قابل کیا۔ آج ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا اٹھے — انور کا چہرہ ان کے سامنے آ گیا جو بڑے بھائی اور بھاوج سے غصے میں کہہ رہا تھا —

"میری اماں کو کچھ نہ کہنا" اور پھر ان سے بولا "اماں! تم گھبراؤ

نہیں۔ میں سروس میں آتے ہی الگ مکان لے کر رہوں گا اور وہ آرام دوں گا کہ جس سے آپ کو سکون ملے گا۔ بیویاں بہت خراب ہوتی ہیں اماں! میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔" لیکن شادی ہوتے ہی اس نے ایسے کل پرزے نکالے کہ وہ یہ فیصلہ نہ کرسکیں کہ کون سا بیٹا اچھا ہے۔

ملازمت ملتے ہی اس نے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی رچالی اور پھر اس نے ماں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ آزاد ماحول کی پروردہ چست و چالاک بیوی نے وہ جادو کیا کہ ان کا بیٹا ایک پالتو کتے کی طرح دم ہلانے لگا پھر ان کی گود میں ایک کلی مہک اٹھی اور وہ اس میں ایسے کھو گئے کہ ماں کی طرف نگاہ بھی نہ کی۔

وہ اپنے گھر، اپنے بہو بیٹوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اس طرح جی رہی تھیں جیسے کوئی مالی اپنے چمن میں رہ کر اس کی خوشبو اور شادابی سے محروم ہو۔

انھیں ڈسنے والے لمحوں میں ایک دن ان کے بھائی گاؤں سے آگئے اور بہن کی حالت زار دیکھ کر کافی کبیدہ خاطر ہوئے اور چاہا کہ بہن کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ لیکن وہ دوزخ میں رہنے کے باوجود بولیں۔

"نہیں بھائی! میں اس گھر کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں جہاں تمہارے بہنوئی کی یادیں خوشبو بن کر میرے احساسات کو مہکاتی رہتی ہیں۔ اب مر کر ہی اس چوکھٹ سے نکلوں گی!"

اور وہ بہن کے اس جواب سے افسردہ ہو کر چلے گئے۔

اکثر وہ اس گھٹن سے فرار حاصل کرنے کے لیے سوچتیں کہ کچھ دن کے لیے بھائی کے گھر چلی جائیں۔ لیکن اس گھر سے برسوں کی وابستگی انھیں اس خیال سے باز رکھتی اور وہ اپنے پیروں میں زنجیریں محسوس کرتیں۔ جس گھر میں ان کی حکمرانی تھی آج وہ گھر ان کے لیے زنداں بنا ہوا تھا۔ نہ معقول غذا نہ دوا، نہ تیمارداری نہ محبت نہ توجہ۔ نفرت، بیگانگی بے رخی، بے اعتنائی ـــــ ایک پوسی ہی تھی جو ان سے ہر وقت چمٹی رہتی اور ان کی غم گسار تھی۔ میاؤں میاؤں کر کے انھیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی، اور وہ محسوس کرتیں جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

"دادی! تم گھبراؤ نہیں۔ تمھیں کوئی نہیں پوچھتا تو کیا ہوا میں تو ہوں!"

وہ تمام دن مصلوب ہوتی رہتیں۔ لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لاتیں ایک خادمہ سے بھی بدتر زندگی وہ گزار رہی تھیں۔ نہ وقت پر ناشتہ نہ کھانا، نہ چائے۔ جب بڑی بہو کا جی چاہا نوکر کے ہاتھ بھجوا دیا، بچا کھچا، باسی تو اسی چاہے حلق سے اترے یا نہ اترے۔ دونوں بہویں انھیں ستانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچتی رہتی تھیں اور شوہروں کے کان بھرتی رہتیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ انھوں نے برابر کے کمرے سے سنا۔ بڑی بہو کہہ رہی تھی۔ "اجی سنا تم نے۔ تمھاری ماں کے پاس کوئی کام تو رہ نہیں گیا ہے سوائے نکتہ چینی کے...... یا ہمارے کام میں کیڑے نکالنے کے۔"

بیٹا بولا۔ "چھوڑو جی۔ ان کا بڑھاپا ہے۔"

"آپ کو کیا۔ بڑھاپا کہہ کر ٹال دیا۔ ان کی کڑوی کسیلی تو ہم کو سننا پڑتی ہیں۔"

"اچھا سن لیا۔ باقی کل بات کریں گے۔ آج میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

پھر دوسرے کمرے سے انھیں چھوٹی بہو کی آواز سنائی دی۔

"ڈیر انور! تمھاری ماں تو بیمار بن کر دن بھر پلنگ کے بان توڑا کرتی ہیں اور سب آنے جانے والوں سے شکایت کرتی رہتی ہیں۔ کہتی ہیں لڑکے تو جورو کے غلام ہیں۔ پہلے تو میں بھابی کی بات کو سچ نہیں مانتی تھی مگر اب تو اپنے کانوں سے سنتی ہوں۔"

"ٹال جاؤ بیگم۔ وہ کچھ دن کی مہمان ہیں۔ پھر تم اپنی من مانی کرنا۔" انور خوشامدانہ انداز سے بولا۔

"مگر کچھ ہی دنوں میں یہ ہماری زندگی جہنم بنا دیں گی۔ اب یا تو تمھاری ماں یہاں رہیں گی یا میں۔" چھوٹی بہو فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو بیگم! جذبات میں نہ بہو۔ صبر و تحمل سے کام لو۔"

"بس ہو چکا میں اب صبر کرنے والی نہیں۔ اگر ماں اتنی ہی عزیز تھیں تو پھر مجھ سے شادی کیوں کی؟"

دوسری صبح دونوں بیٹوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے اور وہ ان سے مخاطب ہوئے بغیر آفس چلے گئے۔

اور وہ سوچنے لگیں — دونوں بہوؤں کی سازش کامیاب ہوگئی۔ ان کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ انور کی تو انھوں نے ہمیشہ طرفداری کی۔ لیکن وہ بھی منحرف ہوگیا۔ انھیں اپنی زندگی بوجھ معلوم ہونے لگی۔ فجر کی نماز کے بعد انھوں نے خدا سے دعا کی کہ

"رب العالمین! دنیا میں اب میرے لیے کوئی خوشی
نہیں رہ گئی۔ ان بکھرتی، الجھتی سانسوں کو تو سمیٹ لے
اور میرے اس وجود کو، جو میرے بیٹے اور بہو کی نظروں میں
مٹی کے ڈھیر کی مانند ہے اس خمیر سے ملا دے جس سے
یہ بنا ہے۔"

جب وہ دعا مانگ کر اٹھیں تو آنسوؤں سے ان کا چہرہ تر تھا۔ تمام دن ان پر ہیجانی کیفیت طاری رہی۔ دنیا انھیں ایک لق و دق صحرا نظر آ رہی تھی جس کی تپتی ہوئی ریت پر وہ ننگے پاؤں بھٹک رہی ہوں۔ ان کے ذہن و دل میں رات کے خواب کا بھی زبردست تاثر تھا۔ خواب میں انھوں نے شوہر کو دیکھا کہ وہ ان کے سرہانے کھڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر اضمحلال طاری ہے اور کہہ رہے ہیں کہ "تمھیں بہت ستایا جا رہا ہے۔ تمھارے دل کو بہت تکلیف پہنچ رہی ہے وہ بھی اپنے جگر گوشوں سے۔"

"ہاں میرے مجازی خدا! مجھے اس دنیا سے اپنے پاس بلالو، یہاں کا ہر پل مجھے سانپ بن کر ڈس رہا ہے۔ بہو بیٹے سب مجھے دشمن سمجھتے ہیں۔" اور وہ خواب ہی میں بلک بلک کر رو پڑی تھیں۔

دوسری شب انھوں نے پھر وہی خواب دیکھا اور گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہی اندھیرا گھپ کمرا تھا اور اس میں قبرستان جیسا سناٹا تھا۔ کمرے کا بلب جب سے فیوز ہوا تھا کسی نے اسے بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ پاس کے دونوں کمرے ٹیوب لائٹ سے جگمگا رہے تھے اور کبھی کبھار روشنی کی کرن ان کے کمرے میں بھی اُجالا بکھیر دیتی۔ جب کبھی بہوؤں کو اس اسٹور سے کچھ سامان نکالنا ہوتا تو ٹارچ کی روشنی سے کام لے لیا جاتا۔ اندھیرے ان کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ انھیں وہ لمحہ پھر یاد آیا جب اس گھر میں ان کی حیثیت مالکہ کی تھی۔ ان کے شوہر حیات تھے دو دو نوکران کی خدمت کے لیے لگے ہوئے تھے۔ وہ کسی ملکہ کی طرح مسہری پر پڑی پڑی حکم چلاتی رہتی تھیں۔ نوکروں کو ڈانٹتی رہتیں۔ بڑی عیش و عشرت کی زندگی گزر رہی تھی۔ لڑکے ناز و نعم میں پرورش پا رہے تھے۔ بڑا بیٹا اچھی تعلیم حاصل کر کے گزیٹیڈ افسر بن گیا تھا۔ چھوٹا بیٹا ابھی تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ شوہر کا ریٹائرمنٹ ہوگیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی مگو نہیں کسی بیٹے کی خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی اور ایک دن ان پر دل کا ایسا جانکاہ دورہ پڑا کہ اسپتال جانے سے قبل ہی وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

ان کے جاتے ہی ان کی زندگی کی ساری خوشیاں روٹھ گئیں۔ سارا سکونِ قلب لُٹ گیا۔ شوہر کے مرنے کے بعد ان کی بینک کی پاس بک بڑے بیٹے کے پاس پہنچ گئی اور سارا پیسہ بہو بیٹے اپنی مرضی سے خرچ کرنے لگے

انور — بھائی بھاوج کی بڑی عزت کرتا تھا مگر ادھر ان کے بدلتے ہوئے رویے سے اس کا برتاؤ بھی نازیبا ہوگیا تھا۔ انور کو جب پیسے کی ضرورت ہوتی تو اسے مشکل ہی سے کچھ مل پاتا تھا۔ وہی پنشن کے روپیوں میں سے کچھ دے دیتی تھیں۔ اس بات پر کئی بار دونوں بھائیوں میں جھگڑا بھی ہوا مگر انھوں نے کسی طرح صلح کرا دی۔ وہ دونوں کو سمجھاتیں۔ انور سے کہتیں

"یہ تمھارا بڑا بھائی ہے باپ کی جگہ ہے اس کی عزت کرو۔"

اور بڑے سے کہتیں۔ بیٹے! انور تمھارا چھوٹا بھائی ہے تمھیں اس کا اولاد کی طرح خیال رکھنا چاہیے۔"

بڑا جواب دیتا۔" ممی! تم اس کی حرکتیں نہیں دیکھتیں۔ وہ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہی نہیں۔ ہر وقت برابری کرنا چاہتا ہے اور اپنی بھابی سے بھی تلخ گفتگو کرتا ہے۔ آپ کی بے جا ہمدردیوں نے اسے بگاڑ دیا ہے، انتہا کا فضول خرچ ہوگیا ہے۔ دس بیس روپے روز اپنی بھابی سے لے جاتا ہے اور دن بھر آوارہ گردی کیا کرتا ہے۔ نوکری کی اس کو کوئی فکر نہیں ہے۔ کمپیٹیشن میں بیٹھنے کا اچھا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں کب تک اسے سہارا دوں —؟ میرے بھی بچے ہیں، ذمہ داریاں ہیں۔"

اور انور اس سے کہتا۔" اور ڈیڈی جو روپیہ چھوڑ گئے ہیں — اس میں میرا بھی حق ہے"۔

"جی ہاں — قارون کا خزانہ چھوڑ گئے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوگا — اب بینک میں کچھ نہیں بچا ہے۔ اب نوکری تلاش کرو۔ بیکار بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔"

اور وہ سوچتیں کہ بیس ہزار کیا اتنی جلدی ختم ہوگئے اور وہ این ایس سی

…کے وہ کیا ہوئے؟ ابھی جو گاؤں کے مکان کے حصے کا روپیہ ...کیا ہوا؟ شاید اسی سے یہ اسکوٹر اور فریج خریدا گیا ہے۔ ابھی حال ...سا بیوی نے ضد کر کے کلر ٹی۔وی بھی منگا لیا — یہ سب کہاں سے ...ن پوچھ کر جھگڑا مول لے — بہو کی گالیاں اور کوسنے کون سُنے۔؟

جب انور کہتا کہ اماں! تم بھائی سے حساب کیوں نہیں طلب کرتیں اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتیں۔

پتہ نہیں ان کی زبان کیوں گنگ ہو گئی ہے۔ جس کے دو بیٹے ...رہے ہوں ان کی ماں کی یہ حالت ہو کہ جسم پر سوائے دو پرانی ساڑیوں ...اور کچھ نہیں۔ ہر سال عید بقرعید پر اور بچوں کی سال گرہ پر سب کا کپڑا ...کر ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ تمھیں کچھ چاہیے۔ کس چیز کی ...رت ہے۔ وہی لے دے کے دو سفید سوتی ساڑیاں ان کے جسم پر باقی ... — بچے بھی بڑے شریر ہیں۔ ماں کے بہکانے پر ہر وقت دادی کو پریشان ...تے رہتے — دن بھر سونے نہیں دیتے۔ سبھی ان کے دشمن ہو گئے ...ا۔ پوسی کو بھی تنگ کرتے ہیں اور اس کی دُم پکڑ کر گھسیٹتے اور پوسی ہر چیخ ...کر فریاد کرتی جیسے کہہ رہی ہو —

"دادی! مجھے ان شیطانوں سے بچاؤ۔"

اور وہ بے بس پڑی رہتیں۔ ان کی کون سنتا ہے۔ ان کے کمرے ...ے ارد گرد اتنی دھما چوکڑی ہوتی کہ الامان والحفیظ — ہر وقت چور سپاہی ...ے کھیل نے ان کا سکون برباد کر دیا ہے۔ کبھی وہ کچھ کہتیں تو بڑا پوتا پتو ...ہتا:

"بڑھیا! چُپ چاپ پڑی رہ پلنگ پر۔ اگر تو نے پاپا سے میری یا ...کی شکایت کی تو ہم تجھے کھانا نہیں دیں گے۔ بھوکا ماریں گے۔ چائے ...ھی نہیں ملے گی۔"

کل تو لڑکی نے ان کے سر پر گیند مار دی اور ان کا چشمہ ٹوٹ کر چکنا چور ...ہو گیا۔ بالکل ان کے دل کی مانند — اور تب سے وہ بالکل اندھی سی ہو ...گئیں۔ کمرے کا اندھیرا اور گہرا ہو گیا اور ان کا دل دہشت زدہ ہو گیا۔

نوکر نے جب بہو کو بتایا تو وہ اپنی لڑکی کی طرفداری میں بڑبڑانے لگی۔ "اماں! آپ تو ہمارے بچوں کی دشمن ہیں۔ انھیں ذرا بھی کھیلنے نہیں ...دیتیں۔ اب کیجیے اپنے بیٹے سے شکایت۔ پھر دیکھیے اپنا حشر۔"

وہ ہمیشہ کی طرح خاموش اور ساکت ہو گئیں۔ پھر سوچنے لگیں۔ کون کس کا دشمن ہے؟ کوئی ماں اپنی اولاد اور اس کے جگر گوشوں کی بھی دشمن ہو سکتی ہے؟ انھوں نے بچوں کو کتنا چاہا۔ کتنا پیار دیا۔؟ پنشن کے آدھے روپئے ان پر خرچ کیے۔ کبھی مٹھائیاں، کبھی ٹافیاں اور کبھی ان کی سال گرہ پر کپڑے بنوا کر دیئے — اور اب انھیں ہی بچوں کا دشمن کہا جا رہا ہے۔ ان کو سخت اذیت پہنچی۔ چشمہ ٹوٹنے سے ان کو کافی پریشانی ہو گئی تھی — دوسرے دن انھوں نے بڑے بیٹے کو بلوایا۔

"کیا ہے اماں جی! میں جلدی میں ہوں۔ دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔" بیٹے نے بے رخی سے کہا۔

اور انھوں نے اسے چشمہ دکھاتے ہوئے کہا "اسے بنوا دو۔"

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ کیسے ٹوٹا؟ آپ نے بھی حد کر دی۔ اماں جی! آجکل سو روپے میں چشمہ بنتا ہے۔"

"میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ کمرے میں اندھیرا جو تھا۔" انھوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

ٹھیک ہے دیکھوں گا۔ ابھی تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" وہ ٹال کر آفس چلا گیا۔

وہ اس کے تغافل سے اور بھی افسردہ ہو گئیں۔ پھر سوچنے لگیں "کتنا بدل گیا ہے یہ۔"

شام کو بیٹے نے بیوی سے چشمہ کا ذکر کیا تو وہ بولی۔

"وہ کون سا لکھتی پڑھتی ہیں جو چشمہ ضروری ہے۔ ہمارے بچوں کی ہی ضرورتیں پوری نہیں ہو پاتیں۔ ان کے لیے سو روپیہ کہاں سے لائیں۔ تم خاموش بیٹھو۔ آخر انور کا بھی تو کچھ فرض ہے۔"

بہو کو اب پوسی سے بھی نفرت ہوتی جا رہی تھی کیونکہ وہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی تھی وہ اسے دیکھ کر کہتی۔

"دودھ کے لالچ میں یہاں پڑی رہتی ہے۔"

اور وہ سوچتیں کہ اگر کچھ بچا کھچا دودھ اسے ڈال دیتی ہیں تو کیا بُرا کرتی ہیں۔ غریب کا اسی میں بھلا ہو جاتا ہے۔ ایسے انسانوں سے تو یہ جانور اچھے — وفادار تو ہیں۔ ہمدرد تو ہیں۔

بہو اس کو بھی ستانے سے باز نہیں آتی۔ کل جب وہ کچھ سامان

نکالنے اس اندھیرے کمرے میں ٹارچ لے کر آئی تو پُوسی سے ٹکرا گئی اور پوسی بھی اس پر" خُو۔ خُو" کر کے جھپٹی ــــ شاید اس کا پیر دب گیا تھا۔

بہو کا پیر اس کی کھر دیرے پنجوں سے زخمی ہو گیا تھا اور وہ بڑبڑائی۔

"کم بخت! تو ہمیشہ یہیں پڑی رہتی ہے۔ دودھ پی پی کر شیرنی ہوتی جا رہی ہے۔ کل ہی تجھے بوری میں بند کروا کر باہر پھنکواتی ہوں۔"

پھر وہ چپل لے کر اس کو مارنے دوڑی۔ پوسی نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، دادی پر ظلم بند کرو اب مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔ میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔"

اس دن بہو کچھ سراسیمہ ہو کر باہر چلی گئی۔ پوسی پھر آکر ان کے قدموں میں لیٹ گئی جیسے ان کی محافظ ہو۔

ادھر وہ تین ماہ سے پنشن کے پیسے لینے بھی نہ جا سکی تھیں۔ بیماری نے چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا۔ ہر وقت بخار رہنے لگا تھا۔ دوا بھی پابندی سے نہیں مل پا رہی تھی۔ لڑکوں کو کچھ فکر نہ تھی۔ بس شام کو آکر بیویوں سے پوچھ لیتے۔

"اماں کیسی ہیں۔ کچھ کھایا۔ دوا دی؟

اور وہ کہتیں۔" ٹھیک ہیں۔ ہر وقت آرام کرتی رہتی ہیں۔ بیماری کے بہانے دن بھر میں ایک کلو دودھ پی جاتی ہیں"۔

یہ سُن کر وہ بڑبڑائیں۔" اتنا جھوٹ۔ اتنا بہتان۔ صبح سے ایک کھیل بھی منہ میں نہیں گئی۔ خالی پیٹ ہی دوا پی لی۔ طبیعت اور بگڑ گئی۔ کاش کہ تھوڑا دودھ ہی مل جاتا۔"

نوکر بولا۔" سب چھوٹی میم صاحب نے بے بی کو پلا دیا۔ آپ کہیں تو باہر سے لا دوں۔

" ہاں لا دو ــ یہ لو پیسے۔" باہر کھڑا انور سب کچھ سن کر نوکر سے بولا اس وقت گھر میں سناٹا تھا۔ انور لنچ لینے گھر آیا تھا۔ ماں کی یہ حالت دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ گیا اور ان کا سر دبانے لگا۔

"ارے اماں! آپ کو تو سخت بخار ہے۔ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ماں نے اداس لہجے میں کہا۔" تم اپنی مصروفیت میں گھرے رہتے ہو۔ میں تمھیں پریشان کرنا نہیں چاہتی۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں ایسے ہی اچھی ہو جاؤں گی۔"

نوکر جب دودھ کا گلاس لے کر داخل ہوا تو انور ڈاکٹر کو لینے جا چکا تھا۔ بڑی بہو سامنے ہی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

"یہ کیا چھپا کر لایا ہے دکھا مجھے۔"

نوکر نے دودھ کا گلاس دکھاتے ہوئے کہا۔" ماں جی کے لیے لایا ہوں۔"

" اچھا۔ اب انھوں نے باہر سے بھی دودھ منگانا شروع کر دیا ہے ایک دن دودھ نہ ملے تو ہمیں یوں بدنام کرتی ہیں۔ اور تیری یہ ہمت کیسے پڑی کہ تو مجھے بغیر بتائے دودھ لینے باہر چلا گیا۔ تو میرا نوکر ہے یا ان کا؟"

نوکر سہمے ہوئے لہجہ میں بولا۔" چھوٹے صاحب نے منگوایا تھا۔"

" وہ کون ہوتا ہے منگوانے والا۔ کیا اب اس گھر میں اس کا حکم چلے گا۔" پھر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور دودھ کا گلاس نوکر کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ فرش پر سفید دودھ کی چادر پھیل گئی اور وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئیں۔ آج انھیں اپنی بے بسی کا شدّت سے احساس ہو رہا تھا۔ بہو کا ظالمانہ رویّہ ان کے دل پر تیر بن کر لگا اور ان کا دل بیٹھنے لگا۔ سینے میں آگ اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور پھر وہ چارپائی پر ایک سمت ڈھیر ہو گئیں۔

کچھ لمحے بعد انور ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر آ گیا۔

ڈاکٹر نے جلدی سے نبض دیکھی اور پھر اداسی سے کہا۔

"آئی ایم سوری ــ آپ لوگوں نے مجھے بلانے میں دیر کر دی ـــ اب صبر کیجئے۔"

انور نے بھاوج کو خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم بڑی ظالم ہو تمھیں میری ماں کی موت کی ذمّہ دار ہو۔

بڑا بیٹا بھی ماں کے قریب گم صم کھڑا تھا ــ دونوں نے ماں کے بے جان اور سفید چہرے کی جانب دیکھا۔ پھر ان کی نظریں ملیں اور جھک گئیں ان کی آنکھوں میں پشیمانی کا درد نمایاں تھا۔

غزلیں

شاعر فتحپوری
۹۸/۸۸ جگر اکاڈمی
چمن گنج۔ کانپور

صدائیں آرہی ہیں ہر طرف سے انقلاب کی
نہ جانے کیوں رکی رکی ہیں دھڑکنیں شباب کی

ہیں جس قدر عنایتیں جمالِ بے نقاب کی
دلیل بن گئی ہیں میرے عشقِ کامیاب کی

ہوئی ہیں میرِ میکدہ کی مستقل نوازشیں
ہمیں نہ راس آئیں پھر بھی لذتیں شراب کی

چمک رہا ہے ذرہ ذرہ آج کائنات کا
یہ برکتیں تو دیکھئے نمودِ آفتاب کی

اگر ہے پوچھنا تمہیں تو یہ صبا سے پوچھ لو
کدھر سے آرہی ہیں آج نکہتیں گلاب کی

ٹھہر گئی ہے نبضِ کائنات مجھ کو دیکھ کر
نظر کے سامنے جبیں ہے رشکِ ماہتاب کی

جوابِ شاعر اس کا تو جو لا سکے تو لا ذرا
کوئی مثال بھی ہے اسکے حسنِ لاجواب کی

ڈاکٹر معراج احمد
شعبۂ سماجیات۔ لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

ادھر بھی بے قراری ہے مگر سربستہ سربستہ
کھلے گی ان کی چاہت بھی مگر آہستہ آہستہ

چھپائیں حالِ دل وہ لاکھ لیکن کیفیت یہ ہے
ادا آشفتہ آشفتہ، نظر وارفتہ وارفتہ

بنا رکھا ہے ان کو ہم نے موضوعِ سخن اپنا
بس اتنی سی خطا پہ ہم سے ہیں برگشتہ برگشتہ

چھوا تھا ایک دن چپکے سے اس دستِ حنائی کو
ابھی تک دل میں وہ احساس ہے پیوستہ پیوستہ

اُدھر آنکھوں میں وہ مستی کہ میخانے بھی جھوم اٹھیں
اِدھر آنکھوں کا یہ عالم کہ ہیں خوں بستہ خوں بستہ

سجی ہیں دل کی محرابوں میں یوں اسکی حسیں یادیں
کہ جیسے رقص کرتی تتلیاں گلدستہ گلدستہ

الگ ہی شخصیت معراج کی تھی اہلِ محفل میں
زباں برجستہ برجستہ، نظر شائستہ شائستہ

واصف اسعدی
سن زئی نزد گیٹ کناری بی بی
شاہجہاں پور

جسے مست کر گئی ہو کسی گلبدن کی خوشبو
اسے کیا پسند آئے گلِ نسترن کی خوشبو

یہ ترا حسین چہرا، یہ ترا بہار پیکر
کوئی اڑ نہ جائے لیکر ترے بانکپن کی خوشبو

یہ نفس نفس معطر مرا کون کر گیا ہے
مجھے چھو گئی تھی اک دن ترے پیرہن کی خوشبو

میں اسیرِ رنگ و بو ہوں مجھے آکے چھیڑتی ہے
کبھی اس چمن کی خوشبو کبھی اس چمن کی خوشبو

یہ جو مسکرا رہے ہیں گل رنگ رنگ گلچیں
یہی حسن ہیں چمن کا، یہی ہیں چمن کی خوشبو

جو وطن کی یاد بن کر کسی بے وطن کے دل میں
ہمہ تن مہک رہی ہو وہی ہے وطن کی خوشبو

کہیں کھو نہ جائے واصف تو جہانِ شاعری میں
کہ مہک رہی ہے ہر سو ترے فکر و فن کی خوشبو

شاہد رضا
پمنڈ جنگلہ۔ شاہجہاں پور (یوپی)

افسانہ

بلینک البم

کل رات میں لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر تھا۔ کسی حادثہ کے سبب گاڑیوں کی آمدورفت بند ہو گئی تھی۔ بہت بھیڑ تھی۔ ویٹنگ روم سے لیکر پلیٹ فارم تک میری نظریں کسی ویران گوشے کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے کنارے تک جاتا، اور پھر ایک جگہ پر کچھ دیر ٹھہر جاتا تھا۔ پھر میں آدھے پلیٹ فارم کا چکر لگانے لگا۔ ہر بار دائرہ کچھ اور سمٹ جاتا تھا۔ پھر دو ستونوں کے درمیان میں نے کئی چکر لگائے۔ بہت کم فاصلہ تھا دونوں کے درمیان پھر میں رک گیا تھا۔ وہ بچہ بھی ایک جگہ پر بیٹھ کر کسی چیز سے کھیلنے لگا تھا۔ بہت دیر کے بعد بیٹھا تھا وہ۔ میں بھی اس کا تعاقب کرتے کرتے تھک گیا تھا، میں بہت دیر سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ بھیڑ میں نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا وہ ذرا دیر کے بعد وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ ستانے کے لئے ہی بیٹھا تھا، کیونکہ کھڑے ہوتے ہی اس نے پھر وہی عمل شروع کر دیا، وہ ہر مسافر کے سامنے ایک لمحے کو ٹھہرتا۔ ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر کسی کے دامن تک پہونچنے کی کوشش کرتا۔ کسی کا پائینچہ پکڑ کر ہلاتا۔ اس کے حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

وہ لمحہ لمحہ میرے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ مشکل سے دو سال کا بچہ تھا وہ شاید ماں کی گود سے الگ ہو کر پہلی مرتبہ کچھ دور آیا تھا، وہ بھوکا بھی نہیں تھا، دودھ تو اس کے ہونٹوں میں ٹھہرا ہوا تھا، وہ بار بار گرتا تھا۔ میرے ضمیر نے کئی بار سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کچھ کہا میرے ہاتھ بھی کئی مرتبہ بڑھے۔ لیکن نہ جانے کیوں زیادہ دور تک نہ جا سکے۔

میرے اندر کسی ویران گوشے سے آہستہ آہستہ ایک شور بلند ہو رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا میں اس کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر آڑ میں ہو گیا۔ میرے کانوں میں نہ جانے کہاں سے آواز آئی تھی کہ "یہ اپنے باپ کو ڈھونڈ رہا ہے"۔ شاید بھیڑ میں سے کوئی بولا تھا۔ یا ہو سکتا ہے میرے اندر کا شور ہو۔ پھر میں بچے کی نظر سے بچنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں ہر حال میں اس کو دیکھتا رہنا چاہتا تھا، پھر نہ جانے کیا ہوا میں نے جیب سے اپنا پرس نکالا۔ کھول کر دیکھا تصویر غائب تھی، میرے بچپن کی تصویر۔ اس وقت کی جب میں دودھ پیتا تھا۔ میں نے بڑے ارمان سے البم سے نکال کر اس کو اپنے پرس میں رکھا تھا۔ میں جب بھی پرس کھولتا اس تصویر پر میری نظر ضرور پڑتی تھی، کچھ دیر پہلے ہی میں نے پرس کھولا تھا۔ اس وقت تک تصویر موجود تھی۔

میں نے چور نظروں سے دیکھا بچہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف منھ کئے، کسی کے پیر دلد کے پاس۔ میں آڑ سے نکل کر اس کے پیچھے چلا گیا تھا، میں اس کو بالکل قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے جب جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تو اچھل پڑا، شاید میرے منھ سے دبی دبی چیخ بھی نکلی تھی، اس بچہ کا چہرہ بدل گیا تھا، چند پلوں میں۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے پرس والی تصویر زندہ ہو گئی ہو۔ میں نے بھیڑ پر نظر ڈالی، ہر طرف سکون تھا۔ کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے فوراً پرس واپس جیب میں رکھا۔ میں وہاں سے ہٹنا ہی چاہتا تھا کہ اس کا چہرہ پھر بدل گیا اور پھر تو ہر پل اس کے جسم پر ایک نیا چہرہ نظر آنے لگا۔ ہر بدلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میرے اندر ایک چھناکا ہوتا تھا۔ جیسے کوئی چیز گر کر ٹوٹی ہو۔

اگر میں دیوار کا سہارا نہ لیتا تو شاید گر ہی پڑتا۔ مجھے شناسا سا چہرے اپنے آس پاس نظر آنے لگے تھے۔ ہر وہ چہرہ جو میرے ذرا سا بھی قریب آیا تھا۔ اس وقت پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ باری باری ہر جسم سے سر الگ ہوتا ہے۔ اور اس بچے کے جسم پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔

بس ایک لمحے کے لئے پھر واپس اپنی جگہ پر چلا جاتا ہے۔

میں پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے پلیٹ فارم پر سب اجنبی تھے۔ بے تعلق۔ لیکن ہوا میں اڑتا ہوا ہر چہرہ کسی اپنے کا ہی ہوتا تھا چہرے بدلنے کا عمل جاری تھا۔ ہاں رفتار مدھم ہو گئی تھی۔ شاید چہرے پلیٹ فارم کے دوسرے سرے سے اڑ کر آنے لگے تھے یا دوسرے پلیٹ فارم سے۔

پھر میں قریب کی ایک بنچ پر تقریباً گر پڑا تھا۔ میری سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں۔ جیسے کہ بھاری بوجھ کو اٹھا کر لمبا راستہ طے کیا ہو تھوڑی راحت پا کر میں نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ کسی کی آہٹ پا کر فوراً کھول دیں۔ کوئی عورت بچے کو اٹھا کر واپس جا رہی تھی۔ شاید بچہ میرے بالکل قریب آ گیا تھا۔ کیوں کہ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رہی تھی۔ کچھ دور جا کر وہ رکی پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر بھیڑ میں کھو گئی۔ وہ پاگل تھی اس نے رک کر مجھے اس طرح دیکھا تھا جیسے پہچان لیا ہو لیکن وہ مجھے پہچان نہیں پائی ہوگی ہاں میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

میں نے تقریباً تین سال پہلے بھی ایک رات اس اسٹیشن پر گذاری تھی۔ میں اپنی ٹیم لے کر کانپور جا رہا تھا کسی وجہ سے رکنا پڑا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ پلیٹ فارم خود میں سمٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روشنیاں کہرے کی چادر لپیٹے ایک دوسرے کو تک رہی تھیں۔ میں تنہا ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ بالکل اکیلا دور تک صرف سناٹا نظر آ رہا تھا۔ تبھی میری نظر ایک سائے پر پڑی تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے ننگے فرش پر کوئی بیٹھا تھا نہ جانے کیا سوچ کر میں اٹھا اور سائے کی سمت بڑھنے لگا۔ جب قریب پہنچا تو وہی پاگل نظر آئی تھی۔ ملگجی روشنی میں کچھ لکھ رہی تھی زمین پر۔ اس کے ہاتھ میں کوئلے کا ٹکڑا تھا۔ یا شاید کوئی اور چیز مجھے یاد نہیں۔

بے حد سردی تھی لیکن شاید اس کو محسوس نہیں ہو رہی تھی حالانکہ اس کا لگ بھگ آدھا جسم کھلا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ شدید سردی۔ اتنی کہ وہاں کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ اس کا لکھا ہوا پڑھ لوں۔ اس نے بھی ایک بار سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ عجیب نظروں سے جیسے مجھے قریب بیٹھنے کے لئے کہہ رہی ہو۔ چہرے پر بکھرے ہوئے بال۔ ان کے پیچھے اندھیرے میں چمکتی ہوئی اس کی آنکھیں مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔

پھر دھیرے دھیرے سردی کم ہونے لگی تھی۔ جیسے قریب ہی کہیں آگ سلگ اٹھی ہو۔ کہرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ روشنیوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ زمین پر اس کے بنائے ہوئے نقش بھی دھندلے ہو گئے تھے پھر میں جھک کر ان کو پڑھنے لگا تھا۔ میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ اس نے شاید اپنا ہی نام لکھا تھا بے ترتیب سا۔ بکھرا بکھرا۔

اس کے بعد متعدد بار میں لکھنؤ گیا لیکن وہاں ٹھہرنا نہیں ہوا۔ کاش کل بھی کوئی حادثہ نہ ہوا ہوتا — کل آدھی رات کے بعد مجھے گاڑی ملی تھی۔ میں بدحواس سا اس میں سوار ہوا تھا۔ اور جب تک گاڑی وہاں رکی رہی میں سر کو کھڑکی سے باہر نکالے رہا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ بچہ مجھے ڈھونڈ نہ رہا ہو۔ کہیں وہ پاگل مجھ کو تلاش نہ کر رہی ہو۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے پہچاننے کی حالت میں نہیں ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ابھی بھیڑ میں سے نکل کر میرا گریبان پکڑ لے گی، مجھ کو سب کے سامنے ننگا کر دے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

گھر آ کر میں نے سب سے پہلے اس البم کو نکالا جس میں میری ایک تصویر کے ساتھ میرے دوستوں کی تصویریں تھیں۔ نئی اور پرانی۔ لیکن اس کو دیکھنے کے بعد میری بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میری عجیب حالت ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے بالوں کو نوچا تھا۔ سر کو دیوار سے ٹکرایا تھا۔ وہ البم بالکل سادہ تھی۔ ساری تصویریں بے رنگ تھیں۔ میں نے ایک ایک تصویر البم سے نکال کر گھما پھرا کر دیکھی تھی۔ کسی بھی تصویر پر کوئی بھی نقش موجود نہیں تھا۔ پھر میں نے اس کو بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں سو نہیں سکا تھا۔ بستر پر کانٹے بچھے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ آنکھیں بند کرتا تو پلیٹ فارم نظر آتا تھا۔ ہر طرف شناسا چہرے البم کی ساری تصویریں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ صبح اٹھ کر میں نے البم کو بڑی مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے اپنے ہاتھوں میں بہت وزنی محسوس ہو رہی تھی۔

میرے پرس والی۔ میرے بچپن کی تصویر تو واپس آ گئی ہے ہو سکتا ہے البم کی تصویریں بھی واپس آ گئی ہوں۔ دوستوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں اس البم کو دوبارہ دیکھوں۔ میں نے ان تمام مشوروں کو شکریے

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

غزلیں

ظفر اکبرآبادی

۸۸/۷۹ اے۔ چمن گنج
کانپور

دل تڑپ اٹھا مقابل میں وہ چہرا دیکھ کر
بڑھ گئی پیاس بھی کچھ اور دریا دیکھ کر

خوشبوؤں کی زد میں رکھ کر خاک مہکا نا مری
پھر اڑا دینا ہوا کا رخ بدلتا دیکھ کر

وہ نشیبِ کوہ و ساحل ہے نہ وہ آشوبِ بحر
گم ہوا ہوں اپنے چاراطراف چہرا دیکھ کر

اس کی نسبت کا کوئی پہلو نکل آتا ہے اور
دیکھتا ہوں جب بھی پھولوں کو وہ چہرا دیکھ کر

اب سحر کے نام سے دل کانپ اٹھتا ہے ظفر
شہر کی سنسان سڑکوں پر اجالا دیکھ کر

احمد نہال

۲۲۱۔ تحصیلدار
فتح پور

زخم کانٹوں کے سدا سہتا رہا
پھول کی صورت مگر ہنستا رہا

میں کہانی کا کوئی کردار تھا
جو زمانہ غور سے پڑھتا رہا

نامکمل ہی رہی تصویرِ غم
گو زمانے کے ستم سہتا رہا

چار کیا سچائی سے آنکھیں ہوئیں
زندگی بھر خود سے میں ڈرتا رہا

زخم دل کے بھر گئے جب سے نہالؔ
لذتِ غم کا مزا جاتا رہا

مشتاق انجم

آئی۔ ڈبلیو ڈپارٹمنٹ
رائٹرس بلڈنگ کلکتہ

تجھ کو ڈھونڈا جہاں کی محفل میں
تو چھپا تھا مگر مرے دل میں

ناؤ دریا میں اس نے ڈالی ہے
خوشبوؤں کا ہے لمس ساحل میں

منزلوں میں کہاں وہ رعنائی
لطف جو کچھ ہے راہِ منزل میں

مجھ کو مقدورِ گفتگو کب تھا
گرچہ موجود تھا تو محفل میں

میرے ہاتھوں میں اس کا چہرا تھا
عکس کس کا تھا ماہِ کامل میں

پوچھنا ہے تو پوچھ مجنوں سے
کون سی شکل دیکھی محمل میں

عطیہ خاتون
۸۲۔ ڈی سرودے نگر
لکھنؤ

مومن اور اُن کی غزل

مومن کے یہاں غزل کی رنگینی اور خیال کی نزاکت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ جو مومن کا نقطۂ آغاز ہے وہ دوسرے شعراء کا منتہائے رسائی ہے اور یقیناً غزل ہی وہ صنف ہے جہاں ان کا آفتابِ کمال پوری درخشانی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ اردو غزل میں ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں جس کے خود ہی موجد ہیں خود ہی خاتم ہیں۔ اپنے مطلب کو پیچ سے ادا کرنا اور بات کو پھیر سے کہنا اس طرزِ خاص کی خصوصیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ عوام تو درکنار کبھی کبھی خواص بھی ان کے مفہوم تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مومن کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں محصور کر دیا۔ ایسا کرنے سے شاعری کا میدان تنگ تو ضرور ہو گیا، لیکن یہ عیب نہیں بلکہ ہنر ہے۔ ان کی دقیقہ سنج طبیعت نے "ظرفِ تنگنائے غزل" میں ان قیود کے باوجود وہ جولانیاں دکھلائیں اور اس محدود موضوع میں وہ تنوع پیدا کیے کہ تمام معاصرین پر سبقت لے گئے اور نفسِ غزل کے لحاظ سے "بہترین غزل گو" کہے جانے کے مستحق ٹھہرے۔ غزل تو غزل دوسری اصناف میں بھی ان کے یہاں یہی رنگ چڑھا ہے۔[1]

مومن اپنی رنگینیِ طبیعت سے مجبور ہیں۔ ان کی شاعری اکثر اساتذۂ دہلی کی شاعری کی طرح تقریباً تمام تر داخلی ہے۔ لکھنؤ کے شعراء خارجی متعلقاتِ حسن و عشق پر زیادہ زور دیتے تھے اس کے برخلاف مومن کے یہاں مضامین میں وصل، ہجر، اشک، رندی، جنون سب میں داخلی انداز نمایاں ہیں ؎

یارب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناداں یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

غزل ہی مومن کی معراجِ کمال ہے اور اسی کی بدولت وہ صاحبِ طرز مانے گئے۔ مندرجہ بالا قسم کے اشعار پڑھ کر ان کے صدقِ جذبات، جوشِ قلب، سوز و گداز، درد و اثر کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

مومن ۱۸۰۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں کو عبدالعزیز دہلوی سے بڑی عقیدت تھی۔ شاہ صاحب نے ولادت کے وقت مومن کے کان میں اذان دی اور مومن نام رکھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر ایک مشہور اور قابل عالم شاہ عبدالقادر کے شاگرد ہوئے۔ مومن چونکہ شروع ہی سے آزاد خیال اور خوش طبع تھے اس لیے شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی لیکن وہ بڑی ہی سنگلاخ زمین پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ مومن کو ان کا رنگ زیادہ پسند نہ آیا کیونکہ دونوں کا اندازِ طبیعت مختلف تھا۔ مومن کو نجوم، رمل اور موسیقی سے بھی شغف تھا۔ علم نجوم میں قابلیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے احکام سن کر بڑے بڑے منجم حیرت میں پڑ جاتے تھے۔ موسیقی کو بھی انھوں نے بڑی لگن کے ساتھ سیکھا۔ آخر میں رمل کی طرف بھی بڑھے اور اس میں بھی ماہر ہوئے۔ لیکن دراصل یہ سب وقتی دل چسپیاں تھیں۔ ان کا اصل مقصد شاعری تھا۔

مومن فطرتاً شاعر پیدا ہوئے تھے۔ شاعری ان کا پیشہ نہیں تھا اُردو شاعری میں مومن جیسا خوددار شاعر نظر نہیں آتا۔ انھوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارہ نہ کیا اور نہ کسی بادشاہ یا امیر کی مدح میں قصیدے لکھے اور نہ ہی کسی سے خفا ہو کر اس کی ہجو میں اپنی زبان آلودہ کی۔ خود فرماتے ہیں ؎

ہجو گوئی نہیں ہمارا کام
ایسی باتوں سے خامشی بہتر

مومن طبیعت سے نہایت غیور اور بے پروا واقع ہوئے تھے بہت سے امرا نے چاہا کہ یہ دربار سے وابستہ ہو جائیں مگر ان سے یہ پابندیاں نہ ہو سکیں اور نہ ہی انھوں نے اس کو پسند کیا وہ کسی دربار سے وابستہ ہونے کے آرزومند نہ تھے۔ حالانکہ ذوق اور غالب بھی جو کہ آزاد رہنا پسند کرتے تھے، اس معاملے میں مجبور تھے۔ مومن نے کبھی کسی کی بے جا خوشامد نہیں کی اور نہ ہی کسی کے سامنے دستِ طمع دراز کیا۔

مومن ایک کامیاب غزل گو ہیں۔ غزلیں بھی کیسی؟ سیاسی یا اخلاقی نہیں بلکہ عشقیہ اور سو فی صد عشقیہ غزلیں لکھی ہیں ان کا رنگ غزل نمایاں پُرتاثیر اور دل نشیں ہے وہ دنیاوی عشق و محبت کی باتیں کرتے ہیں۔

مومن پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ زلف پُر پیچ کی پیچیدگی میں اس طرح الجھ رہے کہ دوسرے معاملات زندگی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، مگر یہ چیز اُن کے محدود ہونے میں بھی ایک عظمت پیدا کرتی ہے ان کی دنیا محدود سہی مگر وہ اس محدود دنیا کے گوشے گوشے سے واقف ہیں۔ یہاں کی رعنائیوں نزاکتوں، الفتوں اور صبر آزمائیوں کا بھی انھیں علم ہے۔ عشق ایک گُلِ صد برگ ہے اور مومن اس گلِ صد برگ کی ایک ایک پنکھڑی سے واقف ہیں۔

عالمِ عشق میں انسان پر مختلف کیفیتیں گزرتی ہیں اور مومن کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں عشق کی ہر کیفیت کا بیان مل جاتا ہے۔ ان کے یہاں روایت پرستی کے باوجود انفرادیت پائی جاتی ہے۔ جن تجربوں کا بیان ان کے یہاں ہوا ہے وہ ان کے اپنے تجربے ہیں جنھیں انھوں نے جذبہ کی آنچ میں پگھلایا ہے اور ان پر اپنا لہو چھڑکا ہے اور سوز دروں بخشا ہے۔ محبت کے سارے احوال و کوائف ان پر گزرے ہیں۔ ان کی محبت غیر فطری ہے نہ ان کا محبوب خیالی ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ مومن کا محبوب خلافِ روشِ زمانہ صنفِ نازک کا ہی ایک فرد ہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو شاعری میں پہلی مرتبہ مومن ہی کے توسط سے عشقِ پردہ نشین کا ذکر آیا اور عشقِ پردہ نشین نے ہی محبت کو پاکیزگی بخشی جس سے اُردو شاعری ابھی تک ناآشنا تھی ؎

عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

یارب کوئی معشوقہ دلجو نہ ملے اب
جو اُن کی دُعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

مومن کا اندازِ سخن ان کے ہمعصروں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ غالب کو "تنگنائے غزل" کا شکوہ رہا۔ انھوں نے کائنات کی تمام وسعتوں کو غزل میں سمو دینے کی کوشش کی۔ منطق اور فلسفہ کی باریکیوں کو غزل کی زبان میں بیان کرنا یقیناً کمالِ فن ہے لیکن ان کے کمالِ فن کے اظہار میں انھوں نے منطق کا انداز اختیار کیا ہے۔ مومن کے کلام میں منطق اور فلسفہ کا گزر نہیں۔ انھوں نے غزل کو پوری رعنائی کے ساتھ سنوارا ہے۔ وہ سمندِ عشق کے شہسوار ہیں، دل کی بات کرتے ہیں۔ دماغ کی نہیں کیونکہ عشق کا تعلق محسوسات سے ہے۔ مومن کے اشعار کو سمجھنے کے لیے اپنے دل کی آواز کو سننا اور دل کی دھڑکنوں سے جذبات کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے

مومن نے تقریباً ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی غزلیں سامنے رکھ کر ان کے کلام کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ غزل کے علاوہ کسی دوسری صنفِ سخن کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے جس طرح سودا قصیدہ کے لیے اور میر حسن مثنوی کے لیے۔ مومن نے مثنویاں بھی لکھیں جو سرتاپا عشقیہ ہیں۔ مومن کی عشقیہ مثنویوں میں اثر تو ضرور ہے لیکن مثنوی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ یہاں بھی ان کے مخصوص تغزلانہ سوز و گداز کی جھلک نمایاں ہے۔ عشقیہ مثنویوں کے علاوہ مومن کی کچھ مثنویاں مذہبی بھی ہیں ان میں وہ جہاد کرنے اور شہادت کے متمنی نظر آتے ہیں۔

★★

محمد قمر الدین قمر
ساہتیہ سدن ۔ رام نگر
وارانسی

انقلابِ نو

سوبھاگ کی پریاں اُتریں گی پربت کی کالی چٹانوں سے
پانی کے سوتے پھوٹیں گے اب بنجر ریگستانوں سے
پھولوں کی برائیں گزریں گی اب اُجڑے ہوئے میدانوں سے
جھلکے ہے روشن مستقبل فردا کے آئینہ خانوں سے
اس دیس کی قسمت جاگے گی مزدوروں اور کسانوں سے

○

دیہات کی اجڑی دُنیا میں اب اور ہی ہلچل دیکھو گے
اب گاؤں کی ہر اک بگیا پر چھائے ہوئے بادل دیکھو گے
جو بھومی پڑی ہے بنجر اب تم اس کو جل تھل دیکھو گے
خوشحالی کا سورج چمکے گا اب کھیتوں سے کھلیانوں سے
اس دیس کی قسمت جاگے گی مزدوروں اور کسانوں سے

○

بھارت کی کنواری دھرتی کا ہر ٹکڑا اک گلشن ہوگا
جو بیج بھی کھیتہر ڈالے گا وہ اُگ کر اک خرمن ہوگا
دُکھیارا نہ ہوگا اب کوئی سب کا سُکھ مے جیون ہوگا
دولت کے خزانے اُمڈیں گے گھر آنگن اور مکانوں سے
اس دیس کی قسمت جاگے گی مزدوروں اور کسانوں سے

○

شوہر بیوی بچے مل کر سب محنت کو اپنائیں گے
ہر گھر میں صنعت و حرفت کے ابھیان چلائے جائیں گے
کم محنت سے کم لاگت سے سامان بنائے جائیں گے
کرنی ہے ترقی جنتا کو اب نئے نئے عنوانوں سے
اس دیس کی قسمت جاگے گی مزدوروں اور کسانوں سے

○

دو چار برس کی بات ہے اب بیکاری مٹنے والی ہے
ہوگا نہ کہیں اب داس کوئی بیگاری مٹنے والی ہے
سرداری مٹنے والی ہے زرداری مٹنے والی ہے
اب کھیل نہ کھیلا جائے گا بیکس کی دُکھیا جانوں سے
اس دیس کی قسمت جاگے گی مزدوروں اور کسانوں سے

○

کچھ اور سماں ہو جائے گا اب منڈی کا بازاروں کا
ہر داؤں پڑے گا اب اُلٹا ظالم سرمایہ داروں کا
سکّہ نہ چلے گا اب ہرگز پونجی وادی بیوپاروں کا
آواز زمانہ دیتا ہے اپنی خاموش زبانوں سے
اس دیس کی قسمت جاگے گی مزدوروں اور کسانوں سے

○

نِردھن کی اُجڑی کٹیا میں رُوٹھی خوشحالی آئے گی
بچوں کے سوکھے چہروں پر پھولوں سی لالی آئے گی
اک رنگ البیلا آئیگا اک جیوتی نرالی آئے گی
کِھل جائیں گے سب کے دل کے کنول دلکش رنگیں مسکانوں سے
اس دیس کی قسمت جاگے گی مزدوروں اور کسانوں سے

○

بے ایمانوں کی بے ایمانی سے ایمان رہائی پائے گا
اب لوٹ کھسوٹ کے دھندے سے دھنوان رہائی پائے گا
اب پونجی واد کے چکر سے انسان رہائی پائے گا
اب کام وہ ہونے والے ہیں جو ہوئے نہیں بھیانوں سے
اس دیس کی قسمت جاگے گی مزدوروں اور کسانوں سے

ادارہ

اترپردیش: نیا سیاسی منظر نامہ

اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ اُبھری کرن ساقی

یہ عوام کے فیصلے کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف اترپردیش بلکہ سارے دیش کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔ یہ تبدیلی بنیادی نوعیت کی تھی۔ ملک کی نویں لوک سبھا اور اترپردیش کی دسویں ودھان سبھا کی تشکیل کے لیے جو عام انتخابات ہوئے ان میں عوام نے اپنے حق رائے دہی کا استعمال کرتے ہوئے اس وقت کے سیاسی بندوبست کو مسترد کر دیا اور آئین کے تحت نظم و نسق کے ذمہ داروں کو عوامی فیصلے کے مطابق ایک نیا نظام، ایک نیا بندوبست قائم کرنے کا کام سونپا گیا۔

نئی امنگوں اور نئی ذمہ داریوں کے پس منظر میں اترپردیش کی صورت حال کو بہتر بنانے اور اسے نکھارنے، سنوارنے کا کام بھی شروع ہوا۔ لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ اترپردیش کل ہند سطح پر فی کس آمدنی کے اعتبار سے دیگر ریاستوں سے کہیں زیادہ پس ماندہ تھا۔ لیکن غریبی کے نقشے میں اس کا جو مقام تھا وہ اپنی قریبی ریاستوں کے مقابلے بہتر صورت حال کا آئینہ دار تھا۔ کل ہند سطح پر فی کس آمدنی ۳۲۸۴ روپے تھی، جبکہ اترپردیش میں یہ آمدنی ۲۴۸۸ روپے تھی۔ اسی طرح قومی سطح پر ۳۷٫۴ فی صد آبادی خط افلاس سے نیچے گزر بسر کر رہی تھی، جبکہ اترپردیش میں ۴۵٫۳ فی صد عوام خط افلاس سے نیچے زندگی گزار رہے تھے۔

یہ بات بغیر کسی پس و پیش کے کہی جا سکتی ہے کہ ریاست کے نئے انتظام کاروں کو جو چیلنج درپیش ہیں وہ زیادہ سنگین نوعیت کے ہیں۔ انھیں نہ صرف بے جہت معیشت کو جہت اور منظم شکل دینا ہے بلکہ غریبوں میں یہ یقین بھی پیدا کرنا ہے کہ بُرے دن گئے اور ان کی بہتری و ترقی کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ یہ یقین ریاستی نظم و نسق اور نئے انتظام کاروں کو اپنے مثبت اقدامات اور مثبت طرز عمل کے ذریعہ پیدا کرنا ہے اور یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ اترپردیش کا نیا منشور غریبوں کے لیے ہے۔

گزشتہ ۵ دسمبر کو نئی کابینہ نے اپنی ذمہ داری سنبھالی تھی اور بغیر کسی تاخیر کے نئی حکومت نے زبردست حوصلے، لگن اور خلوص کے ساتھ سنگین مسائل حل کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اتنے تشویش ناک مسائل کو ڈیڑھ دو ماہ کی مدت میں حل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس مدت میں عوامی نقطۂ نظر سے عوام کے مفاد میں جو کام شروع کیے گئے اور جس طرح شروع کیے گئے ان سے ریاست کی منصوبہ بند ترقی کے تصور کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے سنجیدگیٔ فکر اور ندرتِ کار کی نشان دہی ہوتی ہے اور اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والا دور کیسا ہوگا۔

منصوبے اور ترقی دونوں کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ موجودہ صورت حال کو کس طرح غریبوں کے لیے سازگار اور فلاحی بنایا جائے، جس سے انھیں آگے بڑھنے کی تحریک ملے۔ موجودہ حالات میں نئی حکومت نے اپنی ذمہ داریاں سنبھالتے وقت یہ محسوس کر لیا کہ ترقیاتی پالیسیوں کو عملی شکل دینے کا جو طریقہ رہا ہے اس سے نابرابری اور عدم توازن میں اضافہ ہوا ہے۔

اگرچہ آٹھواں پنج سالہ منصوبہ ابھی تیاری کے مراحل میں ہے لیکن موجودہ حکومت کی توجہ بنیادی مسائل پر پوری طرح مرکوز ہے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ دیہی معیشت کی متوازن ترقی کو یقینی بنانے کے لیے منصوبے کے مصارف کا ۵۰ فی صدی زراعت پر خرچ کیا جائے گا۔

▢

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

نام کتاب: "رات کی دھوپ"

شاعر: وید دیوانہ قیمت: آٹھ روپے

ملنے کا پتہ: (۱) نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

(۲) وید دیوانہ۔ کھرڑ نزد چنڈی گڑھ

رات کی دھوپ وید دیوانہ کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ وید کا تعلق پنجاب کی مردم خیز زمین سے ہے، پنجاب کی سرزمین کو زراعت میں انقلاب لانے کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرنے کا فخر حاصل ہے۔

دیوانہ پیشے کے اعتبار سے ایک مل میں سپروائزر ہیں مگر چونکہ شاعری خمیر میں رچی بسی ہے اس لیے اس غیر شاعرانہ ماحول میں بھی شاعری کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز مشاعروں سے کیا اور اپنے ترنم اور کلام کی پختگی کی وجہ سے مشاعروں کے مقبول شاعر بن گئے۔ جہاں تک فن اور حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالنے کا سوال ہے ان کا یہ شعر ان کے کلام کا حسین عکاس ہے ؎

میں اسی موڑ پہ برسوں سے کھڑا ہوں کہ جہاں
ایک آواز یہ آئی تھی کہ ہم آتے ہیں

غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اس کی خصوصیتیں ہر نگاہ کو اپنی طرف کھینچتی اور ہر دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے غزل کو مجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ بنایا، مگر غزل کسی حصار میں قید نہ رہ سکی اور اپنے عہد کے تہذیبی اور ملکی رجحانات کی ترجمان بن گئی۔ وید دیوانہ نے بھی غزل کو اپنے دلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ لیکن جدیدیت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی روایت سے بے بہرہ نہیں ہے اب غزل محبوب کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر نہ رہ کر زندگی سے بہت قریب آگئی ہے ؎

میں فضا کی مٹھیوں میں اک اکیلا لفظ ہوں
اپنے ہونٹوں پر سجا لے داستاں ہوجاؤں گا

نکلے تھے خود کو ڈھونڈھنے چہروں کی بھیڑ میں
قصے ہمارے شہر میں مشہور ہو گئے

گھر کی تعمیر کرتے کرتے لوگ
آپ اندر سے ٹوٹ جاتے ہیں
آپ کو شوقِ سنگ باری ہے
اور ہم آئینے سجاتے ہیں

اب تجھ سے میرا کوئی نہیں واسطہ مگر
رکھے ہوئے ہوں اب بھی ترے خط سنبھال کے

وید دیوانہ نے 'حرفِ آخر' میں لکھا ہے:

"فیکٹری کی ملازمت، احباب کی ملاقاتیں، پتہ نہیں چلتا دن کب آیا اور کب گزر گیا۔ مگر رات میں نے اتنی روشن اور اتنی تپتی ہوئی کبھی نہیں دیکھی تھی جتنی اب دیکھ رہا ہوں — آئے دن کے دھماکے، قتل و آتش زنی کے واقعات۔ دن سے زیادہ رات اپنے دامن میں تمازت لیے ہوئے ہے۔ اس مجموعے کا بیشتر حصہ رات کی دھوپ میں لکھا گیا ہے۔"

لیتھو کی چھپائی کے باوجود کتاب دیدہ زیب ہے۔ وید دیوانہ کے اس مختصر مجموعہ کلام سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

—— ڈاکٹر رفیق احمد خاں

نام کتاب: **تحفہ**

مصنف: سید احتشام حسین ٹانڈوی قیمت: ۳۰/. روپے

ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ امین آباد، لکھنؤ

۱۸۱ صفحات میں ۵۰ عنوانات کے تحت سید احتشام حسین نے ساحر لدھیانوی

کی حیات اور شاعری کا جائزہ لے کر گویا ساحر کے اس شعر کی تفسیر لکھ دی ہے ۔

مرے ساتھ رہنے والو، مرے بعد آنے والو
مرے دور کا یہ تحفہ تمہیں سازگار آئے

ساحر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ ناز صدیقی، مخمور سعیدی، کرشن ادیب وغیرہ نے کتابیں بھی مرتب کیں ۔ علمی و ادبی کارناموں میں سب سے بڑی دشواری نثر حوالوں کی ہوا کرتی ہے ۔ حوالہ جات اور اخذ و سرقہ کی متنوع بحثوں میں پڑنے کے بجائے احتشام حسین نے بڑی بیباکی سے اور براہ راست شاعر کی شخصیت اس کے کارنامے کو صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا ہے ۔ ایک اچھا تنقید نگار ہونے کی دلیل وہ اس طرح فراہم کرتے ہیں ،

" جب شاعر کے طریقۂ فکر میں عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کی تشریح اور انسانیت کی فلاح و بقا کا جذبہ زیادہ ابھر آتا ہے تو اس وقت شاعر کی زبان کی خامیوں کو نظر انداز کر دینا اچھا تنقید نگار ہونے کی دلیل ہے ۔"

پوری کتاب حسین و جمیل الفاظ کی رنگ آمیزی سے قوس قزح بنی ہے ۔ جابجا ساحر کے وہ اشعار درج کیے گئے ہیں جو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے گئے ہیں اور عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں " رموز ساحر" عنوان کے تحت احتشام صاحب ص۵۲ پر فرماتے ہیں ،

" نغمہ گو، نغزگو، نغمہ سنج، عندلیب شاخ ادب ہوکر ساحر نے انسانوں کو ہماری سنو کے سننے پر اکسایا اور مزے لے لے کر سب کے دلوں کی دھڑکنوں اور حالات کی نئی آواز میں تشریح کی جس کی چاشنی تڑپا تڑپا کر آج بھی لوگوں کو ساحر کے نغموں کو سننے پر آمادہ کیے ہوئے ہے ۔"

یہ کتاب انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے ۔ مکالماتی اسلوب نے مصنف کی تحریر میں زور پیدا کر دیا ہے ۔ الفاظ کی شان و شوکت بھی قابلِ دید ہے ۔ یہی ص۱۳ :

" راہ جیتنے والا ایک انوکھا اور تیز رفتار مسافر بہ انداز رہبری عبدالحیٔ ساحر لدھیانوی ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ سے چلا اور ۱۹۸۰ء تک راہ زندگی کی منزل آخر طے کرکے بمبئی کی سرزمین سے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ۔"

کتاب کے مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ احتشام حسین نے بلاشبہ ساحر کے قدموں میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے ۔ وہ لکھنے پڑھنے میں ذوق و شوق اور ولولہ رکھتے ہیں ۔ ساحر بنام مجروح ۔ ایک مقدمہ ص۱۶۸ کے مضمون سے ان کی ساحر پرستی میں تحقیقی عنصر کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں ۔ اگست ۱۹۸۶ء میں مجروح صاحب نے ایک بیان دیا تھا کہ فلم " بہو بیگم " کے گیت جان نثار اختر نے لکھے تھے ۔ اس بیان پر ردعمل کا ایک سلسلہ شروع ہوا ۔ ماہنامہ " شمع " کے کالم بازگشت " میں فلمی دنیا سے منسلک بیشتر قلم کاروں کے تردیدی بیانات شائع ہوئے ۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے ساحر اور جان نثار اختر کے انداز فکر اور اسلوب کا موازنہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ " بہو بیگم " کے گیت ساحر ہی کے لکھے ہوئے تھے ۔ مختصر یہ کہ کتاب میں شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے ۔ اس میں انھوں نے اپنا سارا زور صرف کر دیا ہے اور بقول ان کے یہ کاوش بھی قلم کے اس طویل سفر میں ایک نشان قدم ہے ۔ اگر یہ وقت کی تیز ہواؤں میں اپنا ثبات باقی رکھ سکا تو آنے والے مسافرانِ راہ فکر کے لیے ایک سنگ میل ہوگا ۔

————— ارشد چودھری

نام کتاب : " دوستی "
مصنف : مناظر عاشق ہرگانوی
قیمت : بارہ روپئے
ملنے کا پتہ : مکتبۂ توازن ۳۵۴ ۔ نیا پورہ ، مالی گاؤں ۴۲۳۲۰۳ (ناسک)

اُردو ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ جہاں ہر طرح کا ادب وافر مقدار میں موجود ہے وہیں بچّوں سے متعلق جو ادب ہے وہ زیادہ نہیں ہے ۔ دنیا کی ہر زبان اور ادب میں بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب بھی برابر لکھا جا رہا ہے ۔ بچّوں کی ذہنی نشوونما اور تربیت کے لیے ایسے ادب کی تخلیق اشد ضروری ہے ۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور ہلکی پھلکی نظمیں علم کے ساتھ ساتھ بچّوں کے دماغ کو روشنی بخشتی ہیں اور یہ ذائقہ دار ادب ان کے لیے ذہنی غذا بن جاتا ہے ۔

پریم چند، اقبال، اسمٰعیل میرٹھی، شفیع الدین نیّر اور حامد اللہ افسر جیسے معدودے چند ہی ادیب ہوں گے جنھوں نے اس ادب کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی ترقی کے لیے برابر کوشاں رہے ۔ انہی چند لوگوں میں مناظر عاشق ہرگانوی

کا نام بھی ہے جو ۱۹۶۴ء سے برابر بچوں کے لیے لکھتے آرہے ہیں۔ 'دوستی' ان کی تیس چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی ہر کہانی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اس کتاب سے بچے تو بچے بزرگ بھی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ یہ کتاب اپنے آپ میں درس گاہ بھی ہے اور ماں کی گود بھی۔ اس میں بچوں کے لیے وہ سب کچھ ہے جسے پڑھ کر بچے زندگی اور خود سے آگاہ ہوسکتے ہیں۔

——— وقار ناصری

نام: ماہنامہ **خرام** کان پور
مدیر اعلیٰ: زبیر احمد فاروقی۔ مدیر: عشرت ظفر
قیمت: سالانہ تیس روپے۔ فی شمارہ تین روپے
ملنے کا پتہ: ۸۸ فہیم آباد۔ کان پور

اتر پردیش کی صنعتی راجدھانی۔ کان پور۔ ایک ادبی پرچے کا اجراء ——— بیسویں صدی کا آخری دہا۔ مادی ترقی کے لیے مسابقت کی نہ ختم ہونے والی دوڑ۔ ——— چند نوجوانوں کا سر جوڑ کر بیٹھنا ——— مثبت اور تعمیری کام کی فکر ——— یہ ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں۔

لیکن آفریں ہے اس مجاہد کو جسے اہلِ کانپور زبیر احمد فاروقی کے نام سے جانتے ہیں اور جس نے اس خواب کو حقیقت میں بدل دیا اور حقیقت بھی کیسی جس کی بنیاد عشرت ظفر کے ہاتھوں رکھی جائے۔ عشرت ظفر ——— دنیائے شعر و ادب کا معتبر نام، صحافت کا معیار، ترجمہ نگاری کی سند — سچ تو یہ ہے کہ پرچے کی کامیابی کے لیے یہی ایک نام کافی تھا۔ لیکن اس ایک نام کے ساتھ چند آشفتہ سر نوجوانوں کی ایک ٹیم بھی ہے جس میں قائد حسین کوثر، محمد رئیس، محمد جرجیس رضا، شفیق اللہ غازی اور سید انور رشید ہاشمی شامل ہیں۔ پرچے کے مشمولات اور شکل و شباہت سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسے بنانے سنوارنے اور نکھارنے میں اس ٹیم کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی کیونکہ اس میں جہاں ایک طرف ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاہ نواز قریشی، ڈاکٹر مجیب اشرف، فضا ابن فیضی، عمر انصاری، کرشن بہاری نور، رباب رشیدی، وقار ناصری جیسے معتبر نام نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف نئے لکھنے والوں کی ایک خاطر خواہ تعداد بھی موجود ہے جس میں نسرین حامد، قمر ادیب، تحسین عابدی، روشن لال وغیرہ شامل ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی دو صرف حوصلہ افزائی کا اس رسالے کا عزم ہے بلکہ انھیں دنیائے ادب میں بھرپور طور پر متعارف کرد ینے کا عزم کیے ہوئے ہیں اس کے چیف ایڈیٹر زبیر احمد فاروقی ——— اب یہ ان فن کاروں کے دم خم کی بات ہے کہ وہ ادب کی دنیا میں اپنی کیا پوزیشن بنا پاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ پرچہ ہر لحاظ سے معیاری اور متوازن ہے۔ کلاسیکی، ترقی پسند اور جدید ہر طرح کی تخلیقات اس میں شامل کرکے مرتبین نے "ازم" کے اس دور میں بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے اور اسی فراخدلی کی وجہ سے امید ہے کہ پرچہ ہر طبقے میں پسند کیا جائے گا۔

فوٹو آفسیٹ کی خوبصورت طباعت میں بھی کتابت کی غلطیاں کیسے رہ گئیں؟ اس پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ لیکن بہر حال یہ نقشِ اول ہے اور امید ہے کہ نقشِ ثانی اس سے کہیں بہتر ہوگا۔

——— مجیب انصاری

بلیک البم .... ص ۴۸ کا بقیہ

کے ساتھ واپس کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ البم کی ہر تصویر واپس آسکتی ہے۔ مگر میری تصویر واپس نہیں آسکتی۔ میں اب اس البم کو کبھی نہیں دیکھوں گا

کل رات گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے میں اس گوشے کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں تین سال پہلے میں نے اس پاگل کو کچھ لکھتے دیکھا تھا مجھے وہ پاگل تو وہاں نہیں ملی تھی۔ ہاں آڑی ترچھی بے شمار لکیریں زمین پر اس وقت بھی موجود تھیں۔ میں نے بہت غور سے دیکھا تھا کسی کی تصویر تھی وہ چکنے فرش پر کوئلے سے بنائی ہوئی مکمل تصویر۔

تصویر کو دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ پیشانی بھیگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس کوشش میں کہ جس قدر جلد ہوسکے میں اس گوشے سے دور چلا جاؤں، میرے قدم تیز تیز اٹھنے لگے تھے۔ گاڑی کے قریب پہونچ کر میں نے اس گوشے کی جانب پلٹ کر دیکھا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ پھر مجھے اس گوشے سے سیاہ غبار اٹھتا دکھائی دیا تھا۔ وہ لمحہ لمحہ میری سمت ہی بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ سارے کا سارا غبار مجھ میں سما گیا تھا ——— مجھ کو ایسا لگا تھا جیسے آنکھوں کے راستے میرے اندر آگ اتر گئی ہو۔ اس کے بعد ایک پل بھی سکون کا میرے قریب نہیں آیا۔



Urdu Monthly

Vol. 44 No. 11-12
February-March, 1990
Rs. 1.00

REGD. NO. L[illegible] 444
Annual S[illegible]
Rs. 10.00

NAYA DAUR

POST BOX NO. 146, LUCKNOW—226001

